کلیاتِ پریم چند

18

مرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

18

آزاد کتھا

مرتبہ

مدن گوپال
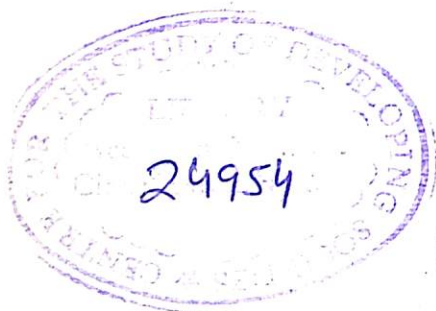
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110 066

Kulliyat-e-Premchand-18
Edited by : Madan Gopal
Project Assistant : Dr. Raheel Siddiqui

سنہ اشاعت : جولائی، ستمبر 2003 شک 1925
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : -/222
سلسلہ مطبوعات : 1096
کمپوزنگ : پرنس گرافک، نئی دہلی

ISBN. 81-7587-009-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر.کے.پورم، نئی دہلی 110066
طابع : لاہوتی پرنٹ ایڈز، 1397 پہاڑی املی، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرِ عام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو ''کلیاتِ پریم چند'' کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سیٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک،
افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،
ڈرامے : جلد 15 و جلد 16،
خطوط : جلد 17،
تراجم : جلد 18 و جلد 19،
متفرقات (مضامین اور اداریے) : جلد 20 سے جلد 22 تک

''کلیاتِ پریم چند'' میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

''کلیاتِ پریم چند'' کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرِ عام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو ''کلیاتِ پریم چند'' کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سیٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان میں ان کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،

ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،

تراجم : جلد 18 و جلد 19، متفرقات (مضامین اور اداریے) : جلد 20 سے جلد 22 تک

''کلیاتِ پریم چند'' میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

''کلیاتِ پریم چند'' کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید

مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

آئندہ اگر پریم چند کی کوئی تحریر/ تحریریں دریافت ہوتی ہیں، آئندہ ایڈیشنوں میں ان کو شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل براے فروغِ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجیکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کر کے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ ''کلیاتِ پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور پروجیکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل براے فروغِ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ''کلیاتِ پریم چند'' کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل براے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

پیش گفتار

''آزاد کتھا'' فسانۂ آزاد کی تلخیص اور ہندی روپ ہے۔ فسانۂ آزاد کو اردو ادب میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ اس کتاب کے مصنف پنڈت رتن ناتھ سرشار کی پیدائش لکھنؤ کے ایک کشمیری پنڈت خاندان میں 1845 میں ہوئی۔ عربی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ادب میں وہ صحافت کے راستے سے داخل ہوئے۔ ان کی صلاحیت کو دیکھ کر منشی نول کشور نے انھیں اودھ اخبار کا مدیر مقرر کیا۔ اسی اخبار میں ان کی مشہور زمانہ تصنیف ''فسانۂ آزاد'' قسط وار شائع ہوئی۔ یہ ایک سال دسمبر 1878 سے دسمبر 1879 تک مسلسل اودھ اخبار میں ضمیمے کے طور پر نکلا۔ کتابی شکل 1880 میں منظرِ عام پر آیا۔

پریم چند کی پیدائش اسی سال ہوئی جس سال فسانۂ آزاد کتابی شکل میں شائع ہوا۔ بچپن سے پریم چند ناول اور افسانوں کے پریمی تھے۔ انھوں نے کم عمری ہی میں سرشار کی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں اور فسانۂ آزاد سے اتنا متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس کتاب کی تلخیص ہندی میں آزاد کتھا کے عنوان سے پیش کی۔

یہاں اس ہندی تلخیص (آزاد کتھا) کو اردو رسمِ خط میں پیش کیا جارہا ہے۔

مدن گوپال

(1)

میاں آزاد کے بارے میں ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ آزاد تھے۔ ان کے خاندان کا پتہ نہیں، گاؤں گھر کا پتہ نہیں، خیال آزاد، رنگ ڈھنگ آزاد، لباس آزاد، دل آزاد اور مذہب بھی آزاد۔ دن بھر زمین کے گز بنے ہوئے ادھر ادھر گھومنا، جہاں بیٹھنا وہاں سے اٹھنے کا نام نہ لینا اور ایک بار اٹھ کھڑے ہوئے تو دن بھر مٹرگشتی کرتے رہنا ان کا کام تھا۔ نہ گھر نہ دوار، کبھی کسی دوست کے یہاں ڈٹ گئے، کبھی کسی حلوائی کی دکان پر اڈا جمایا اور کوئی ٹھکانا نہ ملا تو فاقہ کر گئے۔ سب گن پورے تھے، کشتی میں۔ لکڑی بنوٹ میں، گدکے پھکری میں، پٹے بانک میں استاد، غرض عالموں میں عالم، شاعروں میں شاعر، رنگیلوں میں رنگیلے، ہر فن مولا آدمی تھے۔

ایک دن میاں آزاد بازار میں سیر سپاٹا کر رہے تھے کہ ایک بڈھے نے ایک بانکے سے کہا کہ میاں بیدھے آئے ہو، یا جان بھاری ہے، یا چھینکتے گھر سے چلے تھے؟ یہ اکڑتے کیوں چلتے ہو؟ یہاں گردن جھکا کر چلا کیجیے، نہیں تو کوئی پہلوان گردن ناپے گا، ساری شیخی کرکری ہوجائے گی، ایڑنا بھول جایئے گا۔ اس سے کیا واسطہ؟ یہ شہر کشتی، پٹے بانک اور لکڑی کی ٹک سال ہے۔ بہت سے لڑتیے آئے مگر پٹکنی کھا گئے۔ ہاتھ ملاتے ہی پہلوانوں نے مارا چاروں شانے چت۔ یہ سنتے ہی وہ میاں بانکے آگ بھبوکا ہوگئے۔ بولے۔ جی، تو کہیں اس بھروسے میں نہ رہیے گا، یہاں پٹکنی کھانے والے آدمی نہیں ہیں، بیچ کھیت پچھاڑیں تو سہی، بنے رہیں ہمارے استاد، جنھوں نے ہمیں لکڑی سکھائی۔ ٹالوں کی لکڑی پھینکنا تو سبھی جانتے ہیں۔ میدان میں ٹھہرنا مردوں ہی کا کام ہے۔ ہمارے استاد تیس تیس آدمیوں سے گوہار لڑتے تھے اور کون لوگ؟ گنوار گھامڑ نہیں۔ پلے ہوئے پٹھے، جن پر ان کو غرور تھا۔ پھر یہ خیال کیجیے کہ تیس گد کے برابر پڑتے تھے، مگر تیسوں کی خالی جاتی تھی۔ کبھی آڑے ہوگئے، کبھی گد کے سے چوٹ کاٹ دی، کبھی بن کو سمیٹ لیا، کبھی پینترا بدل دیا۔ شاگردوں کو للکارتے جاتے تھے کہ لگادے بڑھ کے ہاتھ، آگھوم کے۔ اور وہ جھلا جھلا کر چوٹیں لگاتے تھے۔ مگر منہ کی کھاتے تھے۔ اور جب سب کے دم ٹوٹ گئے اور لگے ہانپنے، تو گدکے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ پڑے۔ مگر

واہ رے استاد! ان کے وہی خم دم، وہی تاؤ بھاؤ، پہروں لکڑی پھینکیں مگر دم نہ پھولے اور جو کہیں بھڑ پڑے تو بات کی بات میں پرے صاف تھے۔ کس پر پالٹ کا ہاتھ جمایا، کسی کو چاکی کا ہاتھ لگایا، پھر یہی معلوم ہوتا تھا کہ پھلجھڑی چھوٹ رہی ہے یا آتش بازی کی چھچھوندر ناچ رہی ہے یا چرخی چکر میں ہے۔ جنیوا کا ہاتھ تو آج تک کوئی روک ہی نہ سکا۔ وہ تلا ہوا ہاتھ پڑتا تھا کہ ادھر اشارہ کیا ادھر تڑ سے پڑ گیا۔ بس موت کا تیر تھا۔ گدکا ہاتھ میں آیا اور معلوم ہوا کہ بجلی لو نکلنے لگی۔ ممکن نہیں کہ آدمی کی آنکھ جھپکنے پائے۔ للکار دیا کہ روک چاکی، پھر لاکھ جتن کیجیے بھلا روک تو لیجیے۔ نشانہ تو کبھی خالی جانے ہی نہیں پاتا تھا۔ پکھری عمر بھر نہ چھوٹی۔ ایک انگ ہی لڑا کیے۔ چھریرہ بدن، سیدھے سادھے آدمی، صورت دیکھیے تو یقین نہ آئے کہ استاد ہیں، مگر ایک ذرا سی بانس کی کھپاچ دے دیجیے، پھر دل لگی دیکھیے، کیسے جوہر دکھاتے ہیں۔ ہم جیسے استادوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں کسی سے دبنے والے نہیں۔

میاں آزاد تو ایسے آدمیوں کی ٹوہ میں رہتے ہی تھے، بانکے کے ساتھ ہو لیے اور دونوں شہر میں چکر لگانے لگے۔ چوک میں پہنچے تو جس پر نظر پڑتی ہے، بانکا ترچھا، چٹ دار، انگرکھے پہنے، ٹکے دار ٹوپیاں سر پر جمائے، چست گھٹنے ڈاٹتے ٹھاٹھے باندھے ہوئے تنے چلے جاتے ہیں۔ طمنچے کی جوڑی کمر سے لگی ہوئی دو دو ولائتیاں پڑی ہوئی، باڑھے چڑھی ہوئی، پیش قبض، کٹاریں سرو ہی، شیر بچہ سب سے لیس۔ بانکے کو دیکھ کر ایک دکاندار کی شامت آئی، ہنس پڑا بانکے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دن سے طمنچہ داغ دیا۔ سنیوگ تھا خالی گیا۔ لوگوں نے پوچھا، کیوں بھائی بگڑ گئے؟ تیکھے ہوکر بولے۔ ہم کو دیکھ کر بچا جی مسکرائے تھے ہم نے گولی لگائی کہ دانت پر پڑے اور ان کے دانت کھٹے ہوجائے۔ مگر زندگی تھی بچ نکلے، میاں آزاد نے اپنے دل میں سوچا یہ بانکے تو عافت کے پرکالے ہیں ان کو نیچا نہ کیا تو کچھ بات نہیں۔ ایک تنبولی سے پوچھا، کیوں بھائی یہاں بانکے بہت ہیں؟ اس نے کہا، میاں بانکا ہونا تو دل لگی نہیں۔ ہاں بے فکرے بہت ہیں اور ان سب کے گرو گھنٹال وہ حضرت ہیں۔ جنھیں لوگ ایک رنگ کہتے ہیں۔ وہ سندلی رنگا ہوا جوڑا پہن کر نکلتے ہیں مگر مجال کیا کہ شہر بھر میں کوئی سندلی جوڑا پہن تو لے۔ ایک رنگ سندلی جوڑا کوئی پہن نہیں سکتا۔ کوئی پہنے تو گولی بھی سر کردیں، اس کے ساتھ یہ بھی ہے۔

میاں آزاد نے سوچا کہ اس ایک رنگ کا ٹیٹوا نہ لیا تو کھانا حرام، دوسرے دن آپ بھی سندلی بوٹ، سندلی گھٹنا، سندلی انگرکھا اور ٹوپی ڈاٹ کر نکلے۔ اب جس گلی کوچے سے نکلتے ہیں انگلیاں اٹھتی ہیں کہ یہ آج اس ڈھپ سے کون نکلے ہیں بھائی۔ ہوتے ہوتے ایک رنگ کے چیلے، چاپڑوں نے ان کے کان میں بھی بھنک ڈال دی۔ سنتے ہی منھ لال چقندر ہوگیا۔ کپڑے پہن، ہتھیار لگا، چل کھڑے ہوئے۔ آزاد تبولی کی دکان پر ٹک گئے۔ ان کا بھیس دیکھتے ہی ہوش اس کے اڑ گئے۔ لگا ہاتھ جوڑنے کہ بھگوان کے لیے میری ہی ٹوپی دے لیجیے، یا جوتا بدل ڈالیے، نہیں تو وہ آتا ہی ہوگا۔ مفت کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا واسطہ؟ ان کو تو کچے گھڑے کی چڑھی تھی، کب مانتے تھے کہ گیلوری لی اور اکڑ کر کھڑے ہوئے۔ شہر میں دھوم ہوگئی کہ آج آزاد اور ایک رنگ میں تلوار چلے گی۔ تماشہ دیکھنے والے جمع ہوگئے۔ اتنے میں میاں ایک رنگ بھی دکھائی دیے۔ ان کے آتے ہی بھیڑ چھٹ گئی۔ کوئی ادھر کترا گیا۔ کوئی گلی میں گھسا، کوئی کوٹھے پر چڑھ گیا۔ ایک رنگ نے جوان کو دیکھا، تو جل مرا۔ بولا ابے وہ خبطی، اتار ٹوپی، بدل جوتا، ہمارے ہوتے تو سندلی جوڑا پہن کر نکلے۔ اتار، اتار، نہیں تو میں بڑھ کر کام تمام کردوں گا۔ میاں آزاد پینترا بدل کر تیر کی طرح جھپٹ پڑے اور بڑی پھرتی سے ایک رنگ کی توند میں طمنچہ رکھ دیا۔ بس ہلے اور دھواں اس پار۔ بولے اور لاش پھڑکنے لگی۔ بے ایمان، بڑا بانکا بنا ہے۔ سیکڑوں بھلے آدمیوں کو بے عزت کیا۔ اتنے چابک ماروں گا کہ یاد کرے گا۔ ابھی اتار ٹوپی اتار، اتار، نہیں تو دھواں اس پار۔ سنیوگ سے ایک درزی ادھر سے نکلا۔ اس نے ایک رنگ کی ٹوپی اتار جیب میں رکھی۔ ایک رنگ کی ایک نہ چلی۔ آزاد نے للکارا، حوصلہ ہو تو آؤ، دو دو ہاتھ بھی ہوجائیں۔ خبردار جو آج سے سندلی جوڑا پہنا۔

شہر بھر میں دھوم ہوگی۔ میاں آزاد نے ایک رنگ کے چھکے چھڑا دیے۔ چپ چاپ درزی سے ٹوپی بدلی۔ سچ ہے دبے پر بلی چوہے سے کان کٹاتی ہے۔ میاں آزاد کی دھاک بندھ گئی۔ ایک دن انھوں نے منادی کردی کہ آج میاں آزاد چھ بجے سے آٹھ بجے تک اپنے کرتب دکھائیں گے، جنھیں شوق ہو آئیں۔ ایک بڑے لمبے چوڑے میدان میں آزاد اپنے جوہر دکھانے لگے۔ لاکھوں آدمی جمع تھے۔ میاں آزاد نے نیبوں پر نشان بنایا اور تلوار سے اڑایا تو نشان کے پاس کھٹ سے دو ٹکڑے۔ کسیرُ و اچھالا اور پانچ چھ بار میں چھیل ڈالا۔ تلوار کی

باڑ سے دس بارہ کی آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ چراغ جلایا اور کھانڑا پھینکتے پھینکتے گل کاٹ ڈالا۔ لو الگ، بتی الگ، ایک پیالے میں دس کوڑیاں رکھی اور دو پر نشان بنا دیا۔ دونوں کو تلوار سے پیالے ہی میں کاٹا اور باقی کوڑیاں بلوہ بچ نکلی۔ لکڑی ٹیکی اور بیس ہاتھ چھت پر ہو رہے۔ گدکے کا ذرا اشارہ کیا اور بیس ہاتھ اڑ گئے۔ چالیس چالیس آدمیوں نے گھیرا اور صاف یہ نکل بھاگے۔ پلنگ کے نیچے ایک جنگلی کبوتر چھوڑ دیا گیا۔ انھوں نے اس کو نکلنے نہ دیا۔ ایک پھکیت نے یہ کرتب دیکھے تو بولا اجی یہ سب نٹ ودیا ہے، میدان میں آئیں تو معلوم ہوں۔

آزاد۔ اچھا! اب تمھیں بھی میدان میں آنے کا دعویٰ ہوا! تمھارے ایک رنگ کا تو رنگ پھیکا ہوگیا اب تم منہ چڑتے ہو، تمھیں بھی دیکھوں گا۔

پھکیت۔ چونچ سنبھالو۔

آزاد۔ تمھاری شامت آ ہی گئی ہے تو میں کیا کروں، آج کل میں تمھاری بھی قلعی کھل جاتی ہے۔ تم لوگ بانکے نہیں، بدمعاش ہو، جدھر سے نکل جاؤ۔ ادھر آدمی کانپ اٹھے کہ بھیڑیا آیا۔ کوئی ہنسا اور تم نے بندوق چھتیائی۔ کسی نے بات کی اور تم نے چوٹ لگائی۔ بھائی واہ اچھا بانکپن ہے! تو بات کیا، جہاں دس دن ڈنڈ پیلے اور ابل پڑے۔ دو چار دن لکڑی پھینکی اور محلے والوں پر شیر ہوگئے۔ گنی لوگ سر جھکا ہی کے چلتے ہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے ایک پہلوان اکڑتے ہوئے نکلے، لنگوٹ باندھے، ململ کی چادر اوڑھے، دو تین پٹھے ساتھ۔ ایک کسیرو والے کے پاس کھڑے ہوگئے اور اس کے سر پر ایک دھونپ لگا دی۔ وہ پیچھے پھر کر دیکھتا ہے تو ایک دیو کھڑے ہیں۔ بولے تو پٹھا جائے۔ کان دبا کر، دھپ کھا کر، دل ہی دل میں کوستا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں میاں پہلوان نے ایک خونچے والی کا خونچہ اُلٹ دیا۔ تین چار روپے کی مٹھائی دھول میں مل گئی۔ جب اس نے غل غپاڑا مچایا تو پٹھوں نے دو تین گدے، گھونسے مکے لگا دیے۔ دو چار لپّڑ جما دیے۔ وہ بیچارہ روتا چلاتا، دہائی دیتا چلا گیا۔

آزاد سوچنے لگے کہ یہ تو کوئی بڑا ہی شیطان ہے کسی کے لپّڑ کسی کے تھپّڑ، اچھی پہلوانی ہے! سارے شہر میں تہلکہ مچا دیا۔ اس کی خبر نہ لی۔ تو کچھ نہ کیا۔ یہ سوچتے ہی میرا شیر جھپٹ پڑا اور پہلوان کے پاس جا کر گھٹنے سے ایسا دھکا دیا کہ میاں پہلوان نے اتنا بڑا ڈیل ڈول رکھنے پر بھی بیس لڑھکنیاں کھائیں! مگر پہلوان سنبھلتے ہی ان کی طرف جھپٹ پڑا۔ تماشائی تو

سمجھے کہ پہلوان آزاد کو چر مر کر ڈالے گا۔ لیکن آزاد نے پہلے ہی سے وہ داؤ پیچ کیے کہ پہلوان کے چھکے چھوٹ گئے۔ ایسا دبایا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ اس نے جیسے ہی آزاد کا بایاں ہاتھ گھسیٹا انھوں نے داہنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ باندھا اور اپنا چھڑا، چٹکیوں میں کولے پر لاد، گھٹنا ٹیک کر مارا، چاروں شانے چت۔ پہلوان اب تک کورا تھا۔ کسی دنگل میں آسمان دیکھنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ آزاد نے جو اتنے آدمیوں کے سامنے پٹکنی بتائی۔ تو بڑی کرکری ہوئی اور تمام عمر کے لیے داغ لگ گیا۔

اب تو میاں آزاد جگت گرو ہوگئے۔ ایک رنگ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پہلوان نے پٹکنی کھائی۔ شہر بھر میں دھوم ہوگئی۔ جدھر سے نکل جاتے لوگ ادب کرتے تھے، جس سے آنکھیں چار ہوئیں اس نے زمین چوم کر سلام کیا۔ اچھے اچھے بانکوں کی کور دبنے لگی۔ جہاں کسی شہ زور نے کمزور کو دبایا اور اس نے غل مچایا، دہائی میاں آزاد کی اور یہ بانڑی لے کر آ پہنچے۔ کسی بدمعاش نے کمزور کو دبایا اور اس نے ڈانٹ بتائی؟ نہیں مانتے بلاؤں میاں آزاد کو، شہدے لچے ان سے ایسے تھراتے تھے جیسے چوہے بلّی سے یا مریض تلی سے۔ نام سنا اور بغلیں جھانکنے لگے۔ صورت دیکھی اور گلی کوچوں میں دبک رہے۔ شہر بھر میں ان کا ڈنکا بج گیا۔

ایک دن آزاد سرو ہی لیے اینڈتے جا رہے تھے کہ ایک درزی کی دکان کے پاس سے نکلے۔ دیکھتے کیا ہیں، رنگیلے چھیلے، بانکے جوان چھوٹے پنجہ کا مخملی جوتا پہنے، زلفیں لٹکائے، چھری کمر سے لگائے درزی سے تکرار کر رہے ہیں واہ میاں خلیفہ! تم نے تو ہمیں الٹے چھرے مونڈا، خدا جانے، کس کتر بیونت میں رہتے ہو۔ سینا پرونا تو نام کا ہے ہاں زبان البتہ کترنی کی طرح چلا کرتی ہے تم سے کپڑے سلوانا اپنی مٹی خراب کرنا ہے۔ دم دھاگا دینا خوب جانتے ہو۔ ٹوپی ایسی بھونڈی بنائی کہ پھبتیاں سنتے سنتے ناکوں دم آ گیا۔

درزی۔ اے تو حضور میں اس کو کیا کروں؟ میرا بھلا اس میں کیا قصور ہے؟ آپ کا سر ہی ٹیڑھا ہے۔ میں ٹوپی بناتا ہوں سر بنانا نہیں جانتا۔

بانکے۔ چونچ سنبھال، بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنا۔ بانکوں کے منھ لگتا ہے اور سنیے ہمارا سر ٹیڑھا ہے۔ ابے تیرا سر سانچے کا ڈھلا ہے۔ تیرے ایسے درزی میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ منھ بند کر، نہیں دوں گا الٹا ہاتھ۔ منھ ٹیڑھا ہوجائے گا اور تماشہ دیکھیے، ہمارا سر گویا کدو ہوگیا۔

درزی۔ آپ مالک ہیں مُل میری خطا نہیں۔ جیسا سرویسی ٹوپی۔ ایسا سر تو میں نے دیکھا ہی نہیں یہ نئی گرنٹ کا سر ہے آپ پھرے لیں بس میں سی چکا۔ جب دام دینے کا وقت آیا تو یہ جھمیلا کیا۔

یہ سنتے ہی بانکے نے درزی کو اتنا پیٹا کہ وہ بیچارہ بے دم ہوگیا۔ آخر کفن پھاڑ کر چیخا دُہائی میاں آزاد کی، دُہائی میرے استاد کی۔ آزاد تو دور سے کھڑے دیکھ ہی رہے تھے۔ جھٹ تلوار سینت دکان پر پہنچ گئے۔ بانکے نے پیچھے پھر کر دیکھا تو میاں آزاد۔

آزاد! واہ بھائی بانکے تم سچ مچ رستم ہو بیچارے درزی پر ساری چوٹیں صاف کردی۔ کبھی کسی کڑے خاں سے بھی پالا پڑا ہے کہیں گوہار بھی لڑا ہے۔ یا غریبوں ہی پر شیر ہو۔ بڑے دلیر ہو تو آؤ۔ ہم سے بھی دو دو ہاتھ ہوجائیں تم ڈھیر ہوجاؤ یا ہم چرکا کھائیں، آیئے۔ پھر پینترا بدلیے لگا بڑھ کر ہاتھ، اِدھر یا اُدھر۔

بانکے۔ ہیں ہیں استاد ہمیں پر ہاتھ صاف کروگے۔ ہم نوسکھیے تم گرو گھنٹال۔ مگر آپ اس کمینے درزی کی طرف سے بولتے ہیں اور شریفوں پر تلوار تولتے ہیں۔ سبحان اللہ آیئے آپ سے کچھ کہنا ہے۔

آزاد۔ اچھا، توبہ کرو کہ اب کسی غریب کو نہ دھمکاؤ گے۔

بانکے۔ حضرت دھمکانا کیسا، ہم تو خود ہی بلا میں پھنسے ہیں۔ خدا ہی بچائے تو بچے۔ یہاں ایک پھکیت ہے اس سے ہم سے لاگ ڈاٹ ہوگئی ہے۔ کل نوچندی کے میلے میں ہمیں گھیرے گا۔ کوئی دو سو بانکوں کے جتھے سے ہم حربہ کرنا چاہتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ درگاہ نہ جائیں تو بانکپن میں بٹہ لگتا ہے اور جائیں تو کس برتے پر؟ یار تم ساتھ چلو تو جان بچے نہیں، تو بے موت مرے۔

آزاد۔ اچھا تم بھی کیا کہوگے! لو بیڑا اٹھا لیا کہ کل تم کو لے چلیں گے اور سب سے بھڑ پڑیں گے۔ دو سو ہو چاہے ہزار۔ ہم ہیں اور ہماری کٹار، اتنی کٹاریں بھوکوں کے دم بند ہوجائے۔ مگر یہ بتا دو کہ قصور تمھارا تو نہیں ہے؟

بانکے۔ نہیں استاد قسم لے لو، جو میری طرف سے پہل ہوئی ہو۔ مجھ سے انھوں نے ایک دن اکڑ کر کہا کہ تو تلوار نہ باندھا کر۔ میں بھی آپ جانیے انسان ہوں پتہ تو مچھلی کے بھی ہوتا ہے۔ مجھے بھی غصہ آگیا، میں نے کہا دھت، تو اور ہم سے ہتھیار رکھوالے؟ بس بگڑ

ہی تو گیا اور پندرہ بیس آدمی اس کی طرف سے بولنے لگے۔ میں نے بھی جواب دیا، دبا نہیں مگر لڑ پڑنا مصلحت نہ تھی۔ بانکا ہوں تو کیا ہوا، بنا سمجھے بوجھے بات نہیں کرتا۔ خیر اس نے للکار کر کہا۔ اچھا بچہ درگاہ میں سمجھ لیں گے۔ اب کی نوچندی میں ہمیں نہ ہوں گے یا تمھیں نہ ہوگے۔

آزاد۔ اچھا تم لیس رہنا میں دو گھڑی دن رہے آؤں گا، گھبراؤ نہیں تمھارا بال بانکا ہو، تو مونچھ مونڈوا دوں۔ یہ دو سو آدمی دیکھنے ہی بھر کے ہوں گے، سچے دلیران میں دو ہی چار ہوں گے۔ جو آزاد کی تلوار کا سامنا کریں۔ موت سے لڑنا دل لگی نہیں ہے، کلیجہ چاہیے۔

دوسرے دن آزاد ہتھیار باندھ کر چلے تو راستے میں بانکے مل گئے اور دونوں ساتھ ساتھ ٹہلتے ہوئے درگاہ پہنچے۔

نوچندی جمعرات، بنارس کا بڑھوا منگل مات، چاروں طرف چہل پہل کہیں 'تماشائیوں' کا ہجوم، ہٹو بچوں کی دھوم، آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں، کوسوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ میوے والے آواز لگا رہے ہیں۔ تنبولی بیڑے بنا رہے ہیں گنڈیریاں ہیں کیوڑے کی، ریوڑیاں ہیں گلاب کی۔ آزاد گھورتے گھارتے پھاٹک پر داخل ہوئے تو دیکھا سامنے تیس چالیس آدمیوں کا غول ہے۔ بانکے نے کان میں کہا کہ یہی حضرت ہیں دیکھ لیجیے، دنگے پر آمادہ ہیں یا نہیں۔

آزاد۔ بھلا یہاں تمھاری بھی کوئی جان پہچان ہے؟ ہو تو دس پانچ کو تم بھی بلا لو بھیڑ بھڑکا تو ہوجائے۔ لڑنے والے ہم کیا کم ہے مگر دو چار جمالی خربوزے بھی چاہیے۔ ڈالی کی رونق ہوجائے۔

بانکے۔ ابھی لایا آپ ٹھہریں مگر باہر ٹہلیے تو اچھا ہے، یہاں جوکھم ہے۔

آزاد پھاٹک کے باہر ٹہلنے لگے۔ پھکیت نے جو دیکھا کہ دونوں کھسکے تو آپس میں ہانڈیاں پکنے لگیں۔ وہ بھگایا، وہ ہٹایا! بھاگا ہے! ان کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ آ.جی وہ بھاگا نہیں ہے ایک ہی کائیاں ہے کسی ٹوہ میں گیا ہے۔ ایک بگڑے دل باہر گئے تو دیکھا، بانکے پچھم کی طرف گردن اٹھائے چلے جاتے ہیں اور میاں آزاد پھاٹک سے دس قدم پر ٹہل رہے ہیں۔ الٹے پاؤں آکر خبر دی۔ استاد بس یہی موقع ہے، چلیے مار لیا ہے۔ بائیں پھاٹک سے چڑھ دوڑں۔ ٹھہر بے، ٹھہر۔ بس رک جا آگے قدم بڑھایا اور ڈھیر ہوئے۔ ہلے اور دیا ٹُلا ہوا ہاتھ۔ یاد ہے کہ نہیں آج نوچندی ہے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بانکے کا رنگ

فق کہ غضب ہی ہوگیا۔ اب کتے کی موت مرے، کس کس سے لڑوں گا۔ ایک کی دوا دو، دو کہ سو، میاں آزاد کو کوئی خبر کردیتا، تووہ جھپٹ ہی پڑتے مگر جب تک کوئی جائے جائے ہمارا کام تمام ہوجائے گا۔ ایک یار نے بڑھ کر بیچارے مصیبت کے مارے بانکے کے ایک لٹھ لگا دیا۔ بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ غل غپاڑے کی آواز آزاد نے بھی سنی۔ بھیڑ کاٹ کر پہنچے۔ تو دیکھا بانکے پھنسے ہوئے ہیں۔ تلوار کو ٹیکا اور دن سے اس پار ہوئے۔ خبردار کھلاڑی! ہاتھ اٹھایا اور میں نے ٹیٹوا لیا۔ بانکے کے دل میں ڈھارس ہوا جان بچی نئی زندگی ہوئی۔ اتنے میں میاں آزاد نے تلوار میان سے نکالی اور پل پڑے۔ تلوار کا چمکنا تھا کہ پھکیت کے سب ساتھی ہر ہوگئے۔ میدان خالی، میاں آزاد اور بانکے ایک طرف پھکیت اور دو ساتھی دوسری طرف۔ باقی رفوچکر۔ ایک نے آزاد پر طمنچہ چلایا مگر خالی گیا۔ آزاد نے جھپٹ کر اس کو ایسا چرکا دیا کہ تلملا کر گر پڑا۔ دوسرے جوان دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔ بانکے بھی کھسک گئے اب آزاد اور پھکیت آمنے سامنے رہ گئے۔ وہ کڑک کر جھکا۔ انھوں نے چوٹ روک کر سر پر ہاتھ لگانا چاہا۔ اس نے روکا اور چاکی کا ہاتھ دیا۔ آدھ گھنٹے تک شپاشپ تلوار چلا کی۔ آخر آزاد نے بڑھ کر جنیو کا ہاتھ لگایا کہ 'بھنڈار' تک کھل گیا۔ مگر پھکیت بھی گرتے گرتے 'باہرا' دے ہی گیا۔ ادھر یہ، ادھر وہ دھم سے گرے۔ تب بانکے دوڑے اور آزاد کو اٹھا کر گھر لے گئے۔

(2)

آزاد کی دھاک ایسی بندھی کہ نوابوں اور رئیسوں میں بھی ان کا ذکر ہونے لگا۔ رئیسوں کو مرض ہوتا ہے کہ پہلوان، پھکیت، بن وٹے کو ساتھ رکھیں، بگھی پر لے کر ہوا کھانے نکلے۔ ایک نواب صاحب نے ان کو بھی بلوایا۔ یہ چھیلا بنے ہوئے، دوہری تلوار کمر میں لگائے جا پہنچے۔ دیکھا، نواب صاحب، اپنی ماں کے لاڈلے، بھولے بھالے، اندھیرے گھر کے اجالے، مسند پر بیٹھے پیچوان گڑگڑا رہے ہیں۔ ساری عمر محل کے اندر ہی گزری تھی، کبھی گھر کے باہر جانے تک کی بھی نوبت نہ آئی تھی، گویا باہر قدم رکھنے کی قسم کھائی تھی۔ دن بھر کمرے میں بیٹھنا، یاروں دوستوں سے گپیں اڑانا، کبھی چوسر رنگ جمایا، کبھی بازی لڑی، کبھی پو پر گوٹ پڑی، پھر شطرنج بچھی، مہرے کھٹ کھٹ پٹنے لگے۔ کشت! وہ گھوڑا پیٹ لیا، وہ پیادہ مار لیا۔ جب دل گھبرایا، تب مدک کا دم لگایا، چنڈو کے چھینٹے اڑائے، افیم کی چسکی لی۔ آزاد نے جھک

کر سلام کیا۔ نواب صاحب خوش ہوکر گلے ملے، اپنے قریب بٹھایا اور بولے — میں نے سنا ہے، آپ نے سارے شہر کے بانکوں کے چھکے چھڑا دیے۔

آزاد۔ یہ حضور کا اقبال ہے، ورنہ میں کیا ہوں۔

نواب : میرے مصاحبوں میں آپ ہی جیسے آدمی کی کمی تھی، وہ پوری ہوگئی، اب خوب چھنے گی۔

اتنے میں میر آغا بٹیر کو موٹھ کرتے ہوئے آئے اور سلام کرکے بیٹھ گئے۔ ذرا دیر کے بعد اچھے مرزا گنا چھیلتے ہوئے آئے اور ایک کونے میں جاڈٹے۔ میاں جھمّن انگرکھے کے بند کھولے، گدّی پر ٹوپی رکھے کھٹ سے موجود۔ پھر کیا تھا، تو آ، میں آ۔ دس پندرہ آدمی جمع ہوگئے، مگر سب جھنڈے تلے کے شہدے، چھٹے ہوئے گرگے تھے، کوئی چینی کے پیالے میں افیم گھول رہا ہے، کوئی چنڈو کا قوام بنا رہا ہے، کسی نے گڑیریاں بنائی، کسی نے امیرحمزہ کا قصہ چھیڑا، سب اپنے اپنے دھندے میں لگے۔ نواب صاحب نے میر آغا سے پوچھا : میر صاحب، آپ نے خشکے کا درخت بھی دیکھا ہے؟

میر آغا : حضور، قسم ہے جناب امیر کی، ستر اور دو بہتر برس کی عمر ہونے کو آئی، غلام نے آج تک آنکھوں سے نہیں دیکھا، لیکن ہوگا بڑا درخت۔ ساری دنیا کی اس سے پرورش ہوتی ہے، جسے دیکھو، خشکے پر ہتھے لگاتا ہے۔

اچھے مرزا : قربان جاؤں، درخت کے بڑے ہونے میں کیا شک ہے۔ کشمیر سے لے کر، قربان جاؤں، بڑے گاؤں تک اور لندن سے لے کر ولایت تک، سب کا اسی پر دار ومدار ہے۔

نواب : میرا بھی خیال یہی ہے کہ درخت ہوگا بہت بڑا، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آخر کس درخت سے زیادہ ملتا ہے۔ اگر یہ بات معلوم ہوجائے، تو پھر جانیے کہ ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ اور بھائی، سچ پوچھو، تو چھان بین کرنے ہی میں زندگی کا مزہ ہے۔

اچھے مرزا : سنا، برگد کا درخت بہت بڑا ہوتا ہے۔ جھوٹ سچ کا حال خدا جانے، نیم کا پیڑ تو ہم نے بھی دیکھا ہے، لیکن کسی شاعر نے نیم کے درخت کی بڑائی کی تعریف نہیں کی۔

چھٹن : ہم نے کیلے کا پیڑ، امرود کا پیڑ، خربوزے کا پیڑ، سب انھیں آنکھوں دیکھ ڈالے۔

آزاد : بھلا یہاں کسی نے واہ واہ کی پھلیوں کا پیڑ بھی دیکھا ہے؟

چھٹن : جی ہاں، ایک دفعہ نیپال کی ترائی میں دیکھا تھا، مگر شیر جو ڈکارا، تو میں جھپ سے گینڈے کے درخت پر چڑھ گیا۔ کچھ یاد نہیں کہ پتی کیسی ہوتی ہے۔

نواب : خشکے کے درخت کا کچھ حال دریافت کرنا چاہیے۔

اچھے مرزا : قربان جاؤں، ان لوگوں کا اعتبار کیا؟ سب سنی سنائی کہتے ہیں! قربان جاؤں، غلام نے وہ بات سوچی ہے کہ سنتے ہی پھڑک جایئے۔

نواب : کہیے، کہیے! ضرور کہیے! آپ کو قسم ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ دور کی کوڑی لائے ہوں گے۔

اچھے مرزا : (کٹارے کو کھڑا کر کے) قربان جاؤں، اگر خشکے کا درخت ہوگا، تو اس کٹارے کے برابر ہی ہوگا، نہ جَو بھر بڑا، نہ تل بھر چھوٹا۔

نواب : واہ میر صاحب، واہ، کیا بات نکالی!

مصاحب : سبحان اللہ میر صاحب، کیا سوجھ بوجھ ہے!

آزاد : آپ تو اپنے وقت کے لال بجھکڑ نکلے! معلوم ہوتا ہے، سفر بہت کیا ہے۔

اچھے مرزا : کون، میں نے سفر! قسم لو، جو نخاس سے باہر گیا ہوں۔ مگر قربان جاؤں، لڑکپن ہی سے ذہین تھا۔ ابا جان تو بالکل بیوقوف تھے، مگر اماں جان تو بلا کی عورت تھیں، بات میں بات پیدا کرتی تھیں۔

اتنے غل غپاڑے کے آواز آئی۔ اندر سے مبارک قدم لونڈی سر پیٹتی ہوئی آئی — حضور، میں صدقے، جلدی چلیے، یہ ہنگامہ کہاں ہو رہا ہے؟ بڑی بیگم صاحبہ کھڑی رو رہی ہے کہ میرے بچے پر آنچ نہ آجائے۔

نواب صاحب جوتیاں چھوڑ کر اندر بھاگے۔ دروازے سب بند! اب کسی کو حکم نہیں کہ زور سے بولے۔ اتنے میں ایک مصاحب نے ڈیوڑھی پر سے پکارا — حضور، پھر آخر میاں آزاد کس مرض کی دوا ہے؟ گڑیری چھیلنے کے کام کے نہیں، قوام بنانا نہیں جانتے، بٹیر مٹھیانا نہیں آتا، ان کو بھیج کر دریافت کرائیے کہ دنگا کہاں ہو رہا ہے۔

مبارک قدم : ہاں ہاں۔ بھیج دیجیے۔ کہیے کتے کی چال جائیں اور بلی کی چال آئیں۔

میاں آزاد نے کٹار سنبھالی اور باہر نکلے۔ راہ میں لوگوں سے پوچھتے جاتے رہے کہ

بھائی یہ فساد کیا ہے؟ ایک نے کہا۔ جی چک منڈی میں چھری چلی۔ پانچ چار قدم آگے بڑھے تو دو آدمی باتیں کرتے جاتے تھے کہ پنساری نے پڑیاں میں کدو کے بیجوں کی جگہ جمال گوٹا باندھ دیا۔گاہک نے بگڑ کر پنساری کی گردن ناپی اور دس قدم چلے تو ایک آدمی نے کہا۔ وہ تو کہیے خیریت گزری کہ جاگ ہوگئی نہیں تو بھیڑیا گھر بھر کو اٹھالے جاتا۔ یہ بھیڑیا کیسا جی؟ حضور ایک منیہار کے گھر سے بھیڑیا تین بکریاں، دو مینڈھے، ایک خرہا اور ایک خالی پنجڑا اڑالے گیا۔ اس کی عورت کو پیٹھ پر لاد چکا تھا کہ منیہار جاگ اٹھا اب آزاد چکرائے کہ بھائی عجب بات ہے جو ہے نئی سناتا ہے۔ قریب پہنچے تو دیکھا، پندرہ بیس آدمی مل کر چھپر اٹھاتے ہیں اور غل مچا رہے ہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں اور ہنسی تو یہ آتی ہے کہ نواب صاحب بدحواس ہو کر گھر کے اندر ہو رہے۔ وہاں سے لوٹ کر یہ قصہ بیان کیا، تو لوگوں کی جان میں جان آئی، دروازے کھلے، پھر نواب صاحب باہر آئے۔

نواب : میاں آزاد تمھاری دلیری سے آج جی خوش ہو گیا۔ آج میرے یہاں کھانا کھانا۔ آپ ڈھال نہیں باندھتے؟

آزاد : حضور، ڈھال تو زنانوں کے لیے ہے۔ ہم عمر بھر ایک انگ لڑا کیے، تلوار سے چوٹ لگائی اور اسی پر روکی، یا خالی دی، یا کاٹ گئے، ایک دن آپ کو تلوار کا کچھ ہنر دکھاؤں گا۔ آپ کی آنکھوں میں تلوار کی باڑھ سے سرمہ لگاؤں گا۔

نواب :نا صاحب یہ کھیل اجڈپن کے ہے۔ میری روح کانپتی ہے۔ تلوار کی صورت دیکھتے ہی جوڑی چڑھ آتی۔ ہاں مرزا صاحب جیوٹ کے آدمی ہے ان کی آنکھوں میں سرمہ لگائیے۔ یہ اف کرنے والے نہیں۔

اچھے مرزا: قربان جاؤں حضور اب بال پک گئے ہیں۔ دانت چوہوں کی نظر ہوئے۔ کمر ٹیڑھی ہوئی۔ آنکھوں میں ٹکا سا جواب دیا ہوش حواس چمپت ہوئے۔ کیا کہوں حضور جب لوگوں کو گنڑیاں چوستے دیکھتا ہوں تو منہ دیکھ کر رہ جاتا ہو۔

اتنے میں میاں کمالی میاں جھمن اور میاں دنی بھی آ پہنچے۔

کمالی : خداوند، آج تو عجب خبر سنی۔ حواس جاتے رہے۔ شہر بھر میں کھلبلی مچی ہے اللہ بچائے۔ اب کی گرمی فصل خیریت سے گزرتی نہیں نظر آتی۔ آثار برے ہیں۔

نواب کیوں کیوں؟ خیر تو ہے کیا قیامت آنے والی ہے یا آفتاب سوا نیزے پر ہو رہا۔

آخر ماجرا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔

اچھے مرزا: اے حضور، یہ جب آتے ہیں ایک نیا شگوفہ چھوڑ تے ہیں۔ خداجانے کون ان کے کان میں پھونک جاتا ہے ایسی سنائی کہ نشہ ہرن ہوگیا، جمائیاں آنے لگیں۔

کمالی: اجی، آپ کس کھیت کی مولی ہے، ہم سے تو بڑے بڑوں کے نشے ہرن ہوئے ہیں۔ جب پہلی تاریخ آئے گی تو آنکھیں کھل جائے گی۔ آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا اور دو چار دن میٹھے ٹکڑے اڑا لو۔ واہ صاحب ہم تو ڈھونڈ ڈھانڈ کر خبر لائیں۔ آپ دن بھر پینک میں اونگھا کریں اور ہمیں کو الو بنائیں۔ پہلی کو قلعی کھل جائے گی۔ بجا صورت بگڑ جائے تو سہی۔

نواب: کیا! کیا! پہلی تاریخ کیسی؟ ارے میاں تم تو پہلیاں بجھواتے ہو۔ آخر پہلی کو کیا ہونے والا ہے؟

کمالی: اے حضو یہ نہ پوچھیے بس کچھ کہا نہیں جاتا۔ ایک حلوائن ابھی جوان جہان ہے۔ مارے ہو کے کے اُوٹا دودھ جو پی گئی تو پیٹ پھول کر کُپا ہوگیا۔ کسی نے کچھ بتایا۔ کسی نے کچھ نسخہ پلایا۔ مگر وہ انڈا غفیل ہوگئی۔ اب سنیے کہ جب چتا پر جانے لگی۔ کلبلا کر اٹھ بیٹھی۔ ارے رام۔ ارے باپ رے باپ۔ یوکا بھوا؟ حلوائیوں نے وہ بم چخ مچائی کہ کچھ نہ پوچھیے یو دیکھو لہاس ہلت ہے۔ ارے یوکیا اندھیر بھوا؟ آخر کار دو چار حلوائیوں نے جی کڑا کر کے لاش کو گھسیٹ لیا اور چھٹپٹ کفن پھاڑ کر اسے نکالا۔ تو ٹیاں سی اٹھ بیٹھی۔ حضور قسم ہے خدا کی اس نے وہ وہ باتیں بیان کی کہ کہیں نہیں جاتیں۔ جب مری تو جمراج کے دوتوں نے مجھے اٹھا کر بھگوان کے پاس پہنچایا سیتا جی بیٹھی پوری بیلت رہیں ہم کا دیکھ کے بھگوان بولے کہ اس کو لے جاؤ۔ مجھے اس کی بولی تو یاد نہیں مگر مطلب یہ تھا کہ پہلی کو بڑا اندھیر گھپ چھا جائے گا اور طوفان آئے گا جتنے گنہگار بندے ہے سب جلائے جائیں گے اور اینچی جس گھر میں ہوں گے اس کو فرشتے جلا کر خاک سیاہ کردے گے۔

نواب: مرزا صاحب یہ بوریا بندنا اٹھایئے آپ کا یہاں ٹھکانا نہیں۔ ناحق کہیں فرشتے میری کوٹھی پھونک دیں تو کہیں کا نہ رہو۔ بس قبچا سنبھالیے کہیں اور بستر جمایئے۔

اچھے مرزا: قربان جاؤں حضور یہ بڑا بے ایمان آدمی ہے حضور تو بھولے بھالے رئیس ہیں جس نے جو کہا مان لیا۔ بھلا کہیں فرشتے گھر پھونکا کرتے ہیں؟ مجھ بڈھے کو نہ نکالیے کئی

پشتیں اسی دربار میں گزر گئیں۔ اب کس کا دامن پکڑوں؟ ارے واہ رے جھوٹے۔ اچھی بے پر کی اڑائی۔ حلوائی مری بھی اور جی بھی اٹھی۔ بے سر پیر کی بات۔

نواب : خیر کچھ بھی ہو۔ آپ اپنا سیتا کریں۔ میرے باپ دادا کی ملکیت کہیں فرشتے پھونک دیں تو بس! آپ ہیں کس مرض کی دوا، چار پائیاں توڑا کرتے ہیں،

اچھے مرزا!

واہ ری قسمت یہاں جان لڑادی۔ بکرے کی جان گئی۔ کھانے والے کو مزا نہ آیا، اس شیطان سے خدا سمجھے جس نے میرے حق میں کانٹے بوئے۔ خدا کرے اس کا آج کے ساتویں ہی دن جنازہ نکلے۔ جیسے ہی آکر بیٹھا میری بائیں آنکھ پھڑکنے لگی۔ سو یہ گل کھلا۔

نواب صاحب مصاحبوں کو یہ نادری حکم دے کر زنان خانے میں چلے گئے کہ مرزا کو نکلوادو ان کو جاتے ہی مرزا کی لے دے شروع ہوگئی۔

کمالی۔ مرزا صاحب افیم کا ڈبہ بغل میں دبایئے اور چلتے پھرتے نظر آیئے۔ سرکار کا نادری حکم ہے اور چھوٹی بیگم صاحبہ مہنا متھ مچا رہی ہے اس بڈھے کو کھڑے کھڑے نکال دو۔ سو اب۔ کھسکئے نہیں بری ہوگی۔

جھمن۔ واجبی بات ہے سرکار چلتے چلتے حکم دے گئے تھے۔ ہم لوگ مجبور ہیں۔ اب آپ اپنا سیتا کیجیے ابھی سویرا ہے نہیں ہم پر پٹس پڑے گی اور بھائی جب فرشتوں کے آنے کا ڈر ہے تو کوئی تم کو کیوں کر اپنے گھر میں رہنے دے؟ کہیں ایک ذرا سی چنگاری رکھ دے تو کہیے مکان جل کر خاک سیاہ ہوگیا کہ نہیں پھر کیسی ہوگی۔

اچھے مرزا: ابے تو فرشتے کہیں گاؤں جلایا کرتے ہیں وہ اونٹ پٹانگ باتیں بکتا ہے لو صاحب ہمارے رہنے میں جو کھم ہے جو آٹھوں دیوڑھی پر بنے رہتے ہیں۔ اچھا اڑنگا دیا۔

جھمن : اڑنگا بڑنگا میں نہیں جانتا۔ اب آپ کھسکنت کی ٹھہرایئے۔ بہت دن میٹھے ٹکڑے اڑائے۔ چغلیاں کھا کھا کر رئیس کا مزاج بگاڑ دیا۔ کسی سے ذراسی خطا ہوئی اور آپ نے جڑ دی۔ دبھس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی، پچاسو بھلے مانسوں کی روٹی لی۔ انسان سے غلطی ہوہی جاتی ہے یہ چغلی کھانا کیا معنی۔ اوغفور مرزا نے تمھیں بھی تو اکھاڑنا چاہاتھا؟

غفور : ارے یہ تو اپنے باپ کی جڑ کھودنے والے آدمی ہیں۔ بھیتر سے باہر تک کوئی تو

ان سے خوش نہیں۔

دنی : مرزا اگر کچھ حیا ہے تو اس مصاحبی پر لات مارو جس اللہ نے منہ چیرا ہے وہ روزی بھی دے گا۔

مبارک قدم : غفور۔ غفور چھوٹی بیگم صاحبہ کا حکم ہے کہ اس موے اپنچی کو شہر سے نکال دو۔ کہتی ہے جب تک یہ نہ ٹلے گا داہنے ہاتھ کا کھانا حرام ہے۔

اچھے مرزا : شہر سے نکال دو تمام شہر پر بیگم صاحبہ کا کیا اجارہ ہے؟ وہ ابھی کل آئی۔ یہاں اس گھر میں عمر بیت گئی۔

کمالی : ابے او نمک حرام۔ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بیگم صاحبہ کے کہنے کو ڈلکھتا ہے۔ اتنی پڑے گی بے بھاؤ کی، کہ یاد کروگے۔ چاند گنجی کردی جائے گی۔

اچھے مرزا : اب جو یہاں پانی پئے اس پر لعنت۔

یہ کہہ کر مرزا نے افیم کی ڈبیا اٹھائی اور چلے۔ مصاحبوں نے ان کے جلانے کے لیے کہنا شروع کیا۔ مرزا جی کبھی کبھی آجایا کیجیے گا۔ ایک بولا لائیے ڈبیا میں پہچادوں۔ دوسرا بولا کہیے تو گھوڑا کسوادوں۔ مرزا نے کسی کو کچھ جوب نہ دیا۔ چپکے سے چلے ہی گئے۔

ادھر پہلی تاریخ آئی تو میاں کمالی چکرائے کہ اب میں جھوٹا بنا اور ساکھ گئی لوگوں نے نواب کو چنگ پر چڑھایا کہ حضور جو ہم کہیں وہ کیجیے۔ تو آج کی بلا ٹل جائے۔ نواب نے مصاحبوں کو سارا اختیار دے دیا۔ پھر کیا تھا۔ ایک طرف برہمن دیوتا بیٹھے منتروں کا جپ کر رہے ہیں ہون ہو رہا ہے اور سواہا سواہا کی آواز آرہی ہے دوسری طرف حافظ جی قرآن پڑھ رہے ہیں اور دیوان خانہ میں محفل جمی ہوئی ہے کہ فرشتوں کو جھنجھوٹی کی دھن سنا کر خوش کر لیا جائے۔

جھمن : مرزا جی نہ سدھارتے تو خدا جانے اس وقت کیا کچھ ہو گیا ہوتا۔

نواب : ہوتا کیا، کوٹھی کی کوٹھی بھک سے اڑجاتی۔ اب کسی اپنچی کو آنے تک نہ دوں گا۔

(3)

نواب صاحب کے دربار میں دنوں دن آزاد کو سمان بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ اکثر کھانا بھی نواب کے ساتھ ہی کھاتے۔ نوکروں کو تاکید کر دی گئی کہ آزاد کا جو حکم ہو، فوراً بجا

لائیں۔ ذرا بھی میخ نہ کریں۔ جوں جوں آزاد کے گن نواب پر کھلتے جاتے تھے، اور مصاحبوں کی کرکری ہوتی جاتی تھی۔ ابھی لوگوں نے اچھے مرزا کو دربار سے نکلوایا تھا، اب آزاد کے پیچھے پڑے۔ یہ صرف پہلوانی ہی جانتے ہیں، گدکے اور بنوٹ کی دو چار ہاتھ کچھ سیکھ لیے ہیں، بس اسی پر اکڑتے پھرتے ہیں کہ جو کچھ ہوں، بس میں ہی ہوں۔ پڑھے لکھے واجبی ہی واجبی ہیں۔ شاعری انھیں نہیں آتی۔ مذہبی معاملوں میں بالکل کورے ہیں۔

ایک دن نواب صاحب کے سامنے ایک صاحب بول اٹھے— حضور اس شہر میں ایک عالم آیا ہے۔ جو منطق کے زور سے جھوٹ کو سچ کر دکھاتا ہے مگر خدا کو نہیں مانتا۔ پکا منکر (ناستک) ہے میاں آزاد کو منطقی بننے کا دعویٰ ہے۔ کہیے اس عالم کو نیچا دکھائیں۔

آزاد : ہاں! ہاں! — جب کہیے تب، مجھے تو ایسے منکروں کی تلاش رہتی ہے۔ لائیے منطقی صاحب کو، خدا کا وہ پکا ثبوت دوں کہ وہ خود پھڑک جائے، ذرا یہاں تک لائیے تو سہی، بھاگے راہ نہ ملے۔ جو پھر اس شہر میں منھ دکھائے، تو آدمی نہ کہنا۔

نواب : ہاں! ہاں! میر صاحب، ذرا ان کو پھانس پھونس کر لائیے، تو میاں آزاد کے جوہر تو کھلیں۔

میر صاحب نے زور سے حقے کے دو چار دم لگائے اور جھپ سے اس عالم کو بلا لائے۔ ہزاروں آدمی بحث سننے کے لیے جمع ہو گئے، گویا بٹیروں کی پالی ہے۔ اتنی بھیڑ تھی کہ تھالی اچھالیے تو سر ہی سر جائے۔ عالم نے آتے ہی پوچھا کہ کون صاحب بحث کریں گے؟ میاں آزاد بولے— ہم ہیں۔ اب سب لوگ بے قرار ہو رہے ہیں کہ دیکھیں، کیا سوال جواب ہوتے ہیں، چاروں طرف کھچڑی پک رہی ہے۔

عالم : جناب، آپ تو کسی اکھاڑے کے پٹھے معلوم ہوتے ہیں، صورت سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو منطق چھو بھی نہیں گئی۔

آزاد : جی، صورت پر نہ جائے گا، کوئی سوال کیجیے، تو ہم جواب دیں۔

عالم : اچھا، پہلے ان تین سوالوں کا جواب دیجیے—

(1) خدا ہے، تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟

(2) شیطان دوزخ میں جلایا جائے گا۔ بھلا ناری (آگ سے بنے ہوئے) کو آگ کا کیا ڈر؟ آگ آگ میں نہیں جل سکتی۔

(3) جو کرتا ہے، خدا کرتا ہے، پھر انسان کا قصور کیا؟

چاروں طرف سناٹا پڑ گیا کہ وہاں، کیا عالم ہے، کیسے کڑے سوال کیے ہیں کہ کچھ جواب ہی نہیں سوجھتا۔ بگڑے دل لوگ دانتوں پیس رہے ہیں کہ باہر نکلے تو گردن بھی ناپے۔ میاں آزاد کچھ دیر تک تو چپ چاپ کھڑے رہے، پھر ایک ڈھیلا اٹھا کر اس عالم کی کھوپڑی پر مارا، بیچارہ ہائے کر کے بیٹھ گیا۔ اچھا جنگلی سے پالا پڑا، میں بحث کرنے آیا تھا، یا لپاڈگی۔ جب کچھ جواب نہ سوجھا، تو پتھر مارنے لگے۔ جو میں بھی ایک پتھر کھینچ ماروں، تو کیسی ہو؟ نواب صاحب، آپ ہی انصاف کیجیے۔

نواب : بھائی آزاد، ہمیں یہ تمھاری حرکت پسند نہیں آئی۔ یہ ڈھیلے بازی کے کیا معنی؟ مانا کہ منکر گردن مارنے لائق ہوتا ہے، مگر بحث کر کے قائل کیجیے، یہ نہیں کہ جوتا کھینچ مارا یا ڈھیلا تان کر مارا۔

کمالی : حضور، عالم کا جواب دینا کارے دارد ہے۔ ڈھیلے بازی کرنا دوسری بات ہے۔
جھمن : اجی، اس نے بڑے بڑے عالموں کو سر کر دیا، بھلا آزاد کیا اس کے منھ آئیں گے۔

نواب : یہ پتھر کیوں پھینکا جی، بولتے کیوں نہیں؟
آزاد : حضور، میں نے تو ان کے تینوں سوالوں کا وہ جواب دیا کہ اگر کوئی قدرداں ہوتا تو گلے سے لگا لیتے اور کروڑوں روپے انعام بھی دیتا، سنیے—

(1) خدا ہے سو ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟
جواب : اگر اس ڈھیلے سے ان کے چوٹ لگی، تو چوٹ نظر کیوں نہیں آتی؟
سبحان اللہ کا ڈونگڑا برس گیا۔ واہ استاد! کیا جواب دیا ہے کہ دانت کھٹے کر دیئے۔
(2) شیطان کو جہنم میں جلانا بیکار ہے، وہ تو خود ناری (اگنی مے) ہے۔
جواب — ان سے پوچھئے کہ یہ مٹی کے ہی پتلے ہیں یا نہیں؟ ان کی کھوپڑی مٹی کی بنی ہے یا ربڑ کی؟ پھر مٹی کا ڈھیلا لگا، تو سر کیوں بھنا گیا؟
تماشائیوں نے غل مچایا— سبحان اللہ! واہ میاں آزاد! کیا منہ توڑ جواب دیا ہے!
(3) جو کرتا ہے خدا کرتا ہے۔
جواب : پھر ڈھیلے مارنے کا الزام ہم پر کیوں ہے؟

چاروں طرف ٹوپیاں اچھلنے لگیں— واہ میرے شیر! کیا کہنا ہے! کہیے، اب تو آپ خدا کے قائل ہوئے، یا اب بھی کچھ مین میخ ہے؟ لاکھ باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ جب آپ کا سر مٹی کا ہے اور مٹی ہی کا ڈھیلا مارا، تب آپ کی کھوپڑی کیوں بھنائی؟ میاں منکر بہت جھینپے، سمجھ گیا کہ یہاں شہدوں کا جمگھٹ ہے، چپکے سے اپنے گھر کی راہ لی۔ آزاد کی اور بھی دھاک بندھی۔ اب تک تو پہلوان اور پھکیت ہی مشہور تھے، اب عالم بھی مشہور ہوئے۔ نواب نے پیٹھ ٹھوکی، واہ کیوں نہ ہو! پہلے تو میں جھلایا کہ ڈھیلے بازی کیسی، مگر پھر تو پھڑک گیا۔

مصاحبوں کا یہ وار بھی خالی گیا، تو پھر ہنڈیا پکنے لگی کہ آزاد کو اکھاڑنے کی کوئی دوسری تدبیر کرنی چاہیے۔ اگر یہ یہاں جم گیا تو ہم سبھی کو نکلوا کر چھوڑے گا، یہ رائے ہوئی کہ نواب صاحب سے کہا جائے، حضور، آزاد کو حکم دیں کہ بٹیروں کو مٹھیاں، بٹیروں کو لڑائیں۔ پھر دیکھیں بچہ کیا کرتے ہیں بغلیں نہ جھانکنے لگیں، تو سہی۔ یہ ہنر ہی دوسرا ہے۔

آپس میں یہ صلاح کر ایک دن میاں کمالی بولے— حضور، اگر میاں آزاد بٹیر لڑائیں تو سارے شہر میں حضور کی دھوم ہو جائے۔

نواب : کیوں میاں آزاد، کبھی بٹیر بھی لڑائے ہیں؟

جھمن : آزاد ہماری سرکار میں جتنی بٹیر ہیں، اتنے تو مٹیابرج کے چڑیاں خانے میں بھی نہ ہوں گے۔ ایک ایک بٹیر ہزار ہزار کی خرید کا، نوک دم کے بنانے میں توڑے کے توڑے اڑ گئے، سیروں موتی تو پیس کر میں نے اپنے ہاتھوں کھلا دیئے ہیں، کچھ دنوں روز کھرل چلتا تھا۔ مگر آپ بھی کہیں گے کہ ہم آدمی ہیں۔ اس دیوڑی پر اتنے دنوں سے ہو، اب تک بٹیر خانہ بھی نہ دیکھا؟ لو آؤ، چلو، تم کو سیر کرائیں۔

یہ کہ کر آزاد کو بٹیر خانے لے گئے۔ میاں آزاد کیا دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف کابکیں ہی کابکیں نظر آتی ہیں، اور کابکیں بھی کیسی، ہاتھی دانت کی تیلیاں، ان پر گنگا جمنی۔ کلس، کارچوبی چھتیں، کامدار مخملی غلافیں رنگ برنگی سونے چاندی کی ننھی ننھی کٹوریاں، جن میں بٹیر اپنی پیاری پیاری چونچوں سے پانی پئیں، پانچ پانچ چھ چھ سو لاگت کی کابکیں تھیں، کھونٹیاں بھی رنگ برنگی۔ دنّی میاں ایک ایک کابکیں اتار کر بٹیر کی تعریف کرنے لگے، تو پل باندھ دیئے۔ ایک بٹیر کو دکھا کر کہا —اللہ رکھے، کیا مجھولا جانور ہے! صف شکن (دل سنہار) جو آپ نے سنا ہو تو یہی ہے۔ لندن تک خبر کے کاغذ میں ان کا نام چھپ گیا۔ میری جان کی قسم، ذرا

اس کی آن بان تو دیکھیے گا۔ ہائے کیا بانکا بٹیر ہے! یہ نواب صاحب کے داداجان کے وقت کا ہے۔ ایسے رئیس پیدا کہاں ہوتے ہیں دم کے دم میں لاکھوں پھونک دیئے، روپے کو ٹھیکرا سمجھ لیا۔ پتنگ بازی کا شوق ہوا تو شہر بھر کے پتنگ بازوں کو نہال کر دیا، کنکوے والے بن گئے۔ اجی، اور تو اور لونڈے، جو گلی کوچوں میں لنگر اور لگّے لے لے کر ڈور لوٹا کرتے ہیں، روز ڈور پیچ پیچ کر چکھوتیاں کرتے تھے۔ افیم کا شوق ہوا، تو اتنی خریدی کہ ٹکے سیر سے سولہ روپے سیر بکنے لگی۔ مالوا خالی، چین کھلھل! بمبئ تک کے گنے آتے تھے۔

آزاد : ایسے ہی کتنے رئیس بگڑ گئے۔

کمالی : رئیسوں کے بننے بگڑنے کی کیا فکر۔ یہاں تو جو شوق کیا، ایسا ہی کیا، پھر بھلا بٹیر بازی میں ان کے سامنے کون ٹھہرتا۔ ان کے وقت کا اب یہ ایک صف شکن باقی رہ گیا ہے۔ بزرگوں کی نشانی ہے۔ بس یہ سمجھیے کہ محمد علی شاہ کے وقت میں خریدا گیا تھا۔ اب کوئی سو برس کا ہوگا، دو کم یا دو اوپر، مگر بڑھاپے میں بھی وہ دم خم ہے کہ مرغے کو لپک کر لات دے تو وہ بھی چیں بول جائے۔ پارسال کی دل لگی سنیے، نواب صاحب کے ماموں تشریف لائے۔ ان میں بھی ریاست کی بو ہے، کنکنوا تو ایسا لڑاتے یں کہ میاں ولایت ان کے آگے پانی بھریں۔ دو دو تولے افیم پی جائیں اور وہی دم خم۔ بٹیر بازی کا بھی پرے سرے کا شوق ہے۔ ان کا ظفر پیکر تو بلا کا بٹیر ہے، بٹیر کیا ہے، شیر ہے، میرے منہ سے نکل گیا کہ حضور کو تو بٹیروں کا بہت شوق ہے، کروڑوں ہی بٹیر دیکھ ڈالے ہوں گے، مگر صف شکن سا بٹیر تو حضور نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ بولے، اس کی حقیقت کیا ہے، ظفر پیکر کو دیکھو تو آنکھیں کھل جائیں، بڑھ کر ایک لات دے تو صف شکن کیا، آپ کو نوک دم پالی باہر کردے۔ حوصلہ ہو، تو منگواؤں۔

دوسرے دن پالی ہوئی، ہزاروں آدمی آپہنچے شہر بھر میں دھوم تھی کہ آج بڑے معرکہ کا جوڑ ہے۔ ظفر پیکر اس ٹھاٹ سے آیا کہ زمین ہل گئی، اور میرا تو کلیجہ دہلنے لگا۔ مگر صف شکن نے اس دن آبرو رکھ لی۔ جبھی تو نواب صاحب اس کو بچوں سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ پہلے اس کو دانہ کھلوا لیتے ہیں، پھر کہیں آپ کھاتے ہیں۔ ایک دن خدا جانے بلی دیکھی یا کیا ہوا کہ اپنے آپ پھڑکنے لگا۔ نواب سمجھے کہ بوندا ہو گیا، پھر تو ایسے دھاروں دھار روئے کہ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ میں نے نواب صاحب کو کبھی روتے نہیں دیکھا۔ محرم کی مجلسوں میں

ایک آنسو نہیں نکلتا۔ جب بڑے نواب صاحب سدھارے تو آنسو کی ایک بوند نہ گری، یہ بٹیر ہی ایسا انمول ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اس دن نواب کی سات پیڑھیوں پر احسان کیا۔ واللہ جو کہیں گھٹ جاتا، تو میں تو جنگل کی راہ لیتا۔ میاں جگ میں آبرو ہی آبرو تو ہے، اور کیا، خیر صاحب ، جیسے ہی دونوں چکی کھا چکے، ظفر پیکر بجلی کی طرح صف شکن کی طرف چلا۔ آتے ہی دبوچ بیٹھا، چوٹی کو چونچ سے پکڑ کر ایسا جھپٹا کہ دوسرا ہوتا تو ایک رگڑے میں پھر سے بھاگ نکلتا۔ نواب کا چہرہ فق ہو گیا، منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگیں کہ اتنے میں صف شکن لوٹ ہی تو پڑا۔ واہ میرے شیر ! خوب پھرا!!! پالی بھر میں آواز گونجنے لگی کہ وہ مارا ہے۔ ایک لات ایسی جمائی کہ ظفر پیکر نے منہ پھیر لیا۔ منہ کا پھیرنا تھا کہ صف شکن نے اچک کر ایک جھنجھوٹی بتلائی۔ واہ پٹھے، اور لگا! آخیر ظفر پیکر نوک دام پالی باہر بھاگا۔ چاروں طرف ٹوپیاں اچھل گئیں۔ آج یہ بٹیر اپنا ثانی نہیں رکھتا! میاں آزاد، اب آپ بٹیر خانہ اپنے ہاتھ میں لیجیے۔

نواب : واللہ، یہی میں بھی کہنے والا تھا۔

جھمن : کام ذرا مشکل ہے۔

دآنی : بٹیروں کا لڑانا دل لگی نہیں، بڑے تجربے کی ضرورت ہے۔

آزاد : حضور فرماتے ہیں تو بٹیر خانے کی نگرانی میں ہی کروں گا۔

کہنے کو تو آزاد نے کہہ دیا، مگر نہ کبھی بٹیر لڑائے تھے، نہ جانتے تھے کہ ان کو کیسے لڑایا جاتا ہے۔ گھبرائے، اگر کہیں نواب کے بٹیر ہارے تو ساری بلا میرے سر پڑے گی۔ کچھ ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ یہ بلا ٹل جائے۔ جب شام ہوئی تو وہ سب کی نظریں بچا کر بٹیر کھانے میں گئے اور کابکوں کی کھڑیاں کھول دیں۔ بٹیر سب پھر سے بھاگ گئے۔ پنجڑے خالی ہو گئے۔ کسی پشتوں کی بسائی ہوئی بستی اجڑ گئی۔ بٹیروں کو اڑا کر آزاد نے گھر کی راہ کی۔

دوسرے دن میاں آزاد سویرے منہ اندھیرے بازار میں مٹرگشت کرتے ہوئے نواب صاحب کی طرف چلے۔ بازار بھر میں سناٹا! حلوائی بھٹی میں سو رہا ہے، نانبائی برتن دھو رہا ہے، بجاجا بند۔ کجڑوں کی دوکان پر اروئی نہ شکرقند، جوہریوں کی دوکان میں تالا پڑا ہوا ہے، مگر تمباکو والا جگا ہوا ہے۔ مہتر سڑک پر جھاڑو دے رہا ہے۔ میدے والا پسنہاریوں سے آٹا لے رہا ہے۔ اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ ایک آدمی لنگی باندھے، ہاتھ میں چلم لیے، بوکھلایا ہوا گھوم رہا ہے کہ کہیں سے ایک چنگاری مل جائے تو دم لگے۔ دھواں دھار حقہ اڑے۔ جہاں جاتے

ہیں 'پھر' بھاگ کی آواز آتی ہے۔ بھائی ایسا شہر نہیں دیکھا جہاں آگ مانگے نہ ملے، جانو اس میں بھی چھپن ٹکے خرچ ہوتے ہیں۔ محلے والوں کو گالیاں دیتے ہوئے نانبائی کی دوکان پر پہنچے اور بولے بڑے بھائی ایک ذری آگ تو جھپ سے دے دینا، میرا یار ہو، لاتو جھٹ پٹ۔

نانبائی : اچھا اچھا، تو دوکان سے الگ رہو، چھاتی پر کیوں چڑھے بیٹھتے ہو؟ یہاں سو دھندے کرنے ہیں، آپ کی طرح کوئی بے فکر تو ہوں نہیں کہ تڑکا ہوا۔ چلم لی اور لگے کوڑی دوکان مانگنے۔ مل گئی تو خیر، نہیں تو گالیاں دینی شروع کیں۔ سویرے سویرے اللہ کا نام نہ رام رام! چلم لیے دوکان پر ڈٹ گئے۔ واہ، اچھی دل لگی ہے! ایسی ہی طلب ہے تو ایک کنڈی کیوں نہیں گاڑ رکھتے کہ رات بھر آگ ہی آگ رہے۔ ایسے ہی اُچکّے تو چوری کرتے ہیں۔ آنکھ چوکی اور مال غائب! کیاں سہل لٹکا ہے کہ چلم لے کر آگ مانگنے آئے ہیں۔ کسی دن میں چلم ویلم نہ توڑ تاڑ کر پھینک دوں۔ تم تڑکے تڑکے دوکان پر نہ آیا کرو جی، نہیں تو کسی دن ٹھائیں ٹھائیں ہو جائے گی۔

حضور کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگا، دانت پیس کر رہ گئے۔ یہاں سے چلے تو حلوائی کی دکان پر پہنچے اور بولے— میاں ایک ذرا سی آگ دینا، بھائی ہو نا۔ حلوائی کا دودھ بلی پی گئی تھی، جھلایا بیٹھا تھا، سمجھا کہ کوئی فقیر بھیک مانگنے آیا ہے۔ جھڑک کر بولا کہ اور دوکان دیکھو۔ سویرے سویرے یہاں کی پڑگئی۔ جاتا ہے کہ دوں دھگا۔ رہے کہیں، مرے کہیں، کوڑی مانگنے یہاں موجود۔ دنیا بھر کے مردے، نانا مئو گھاٹ۔ اب کھڑا گھورتا کیا ہے؟

چلم باز— کچھ واہی ہوا ہے بے۔ ابے ہم کوئی فقیر ہیں، کہیں میں آکر ایک دھستا دوں نا۔ لو صاحب۔ ہم تو آگ مانگنے آئے ہیں، یہ ہم کو بھک منگا بناتا ہے۔ اندھا ہے کیا؟

حلوائی : بھک منگا نہیں، تو ہے کون، لنگوٹی باندھ لی اور چلے آگ مانگنے۔ تمھارے بابا کا قرض کھایا ہے کیا؟

بیچارے یہاں سے بھی نراش ہوئے، چپکے سے کان دبائے چل کھڑے ہوئے۔ آج تڑکے تڑکے کس کا منہ دیکھا تھا کہ جہاں جاتے ہیں، جھوڑ ہوجاتی ہے، اتنے میں دیکھا کہ ایک سنار کی دوکان پر آگ دہک رہی ہے۔ ادھر لپکے۔ سنار دوکان پر نہ تھا۔ یہ تو حقے کی فکر میں چوندھیائے ہوئے تھے ہی، جھپ سے دوکان پر چڑھ گئے۔ سنار بھی اسی وقت آگیا اور ان کو دیکھ کر آگ بھبھوکا ہو گیا۔ تو کون ہے بے؟ واہ، خالی دوکان پر کیا مزے سے چڑھ

آئے۔ (ایک دھپ جما کر) اور جو کوئی عدد جاتا رہتا؟ اتنے میں دس پانچ آدمی جما ہو گئے۔ کیا ہے، کیا ہے میاں؟ کیوں بھلے آدمی کی آبرو بگاڑے دیتے ہو۔

سنار : ہے کیا۔ یہ ہماری دوکان پر چوری کرنے آئے تھے۔

چلم باز : میں چور ہوں، چور کی ایسی ہی صورت ہوتی ہے؟

ایک آدمی : کون! تم! تم تو ہمیں پکے چور معلوم ہوتے ہو۔ اچھا، تم پھر ان کی دوکان پر گئے کیوں؟ دوکاندار نہیں تھا، تو وہاں تمھارا کیا کام؟ جو کوئی گہنا لے بھاگتے، تو یہ تمھیں کہاں ڈھونڈتے پھرتے؟

سنار : صاحب، ان کا پھر پتہ کہاں ملتا، جاتے جمنا اس پار۔ چلو تھانے پر۔

لوگوں نے سنار کو سمجھایا، بھائی، اب جانے دو۔ دیکھو جو خبردار، اب کسی کی دوکان پر نہ چڑھنا نہیں پٹتے جاؤگے۔ سنار نے چھوڑ دیا۔ جب آپ چلنے لگے، تو اسے ان پر ترس آ گیا۔ بولا، اچھا آگ لیتے جاؤ۔ حضرت نے آگ پائی اور گھر کی راہ لی۔ تڑکے تڑکے اچھا بوہنی ہوئی۔ چور بنے ، مار کھائی جھڑکے گئے، تھانے جاتے جاتے بچے تب کہیں آگ ملی۔

میاں آزاد یہ دل لگی دیکھ کر آگے بڑھے اور نواب کی ڈیوڑی پر آئے۔

نواب : آج اتنا دن چڑھ گیا، کہاں تھے؟

آزاد : حضور، آج بڑی دل لگی دیکھنے میں آئی، ہنستے ہنستے لوٹ جایئے گا۔ طلب بھی کیا بری چیز ہے۔

یہ کہہ کر آزاد نے ساری داستان سنائی۔

نواب : خوب دل لگی ہوئی، آگ کے بدلے چپتے پڑی۔ ارے میاں ذرا خوجی کو بلانا۔ ہاں، ذرا خوجی کے سامنے سنانا۔ کسی دن یہ بھی نہ پٹے۔

خوجی نواب کے دروازے کے مسخرے تھے۔ ٹھگنا قد، کالے کوے کا سا رنگ، بدن پر ماس نہیں، پر آنکھوں میں سرما لگائے ہوئے۔ لڑھکتے ہوئے آئے اور بولے— غلام کو حضور نے یاد کیا ہے؟

نواب : ہاں، اس وقت کسی فکر میں تھے؟

خوجی : خداوند، افیم گھول رہا تھا اور کوئی فکر تو حضور کی بدولت قریب نہیں پھٹکنے پاتی۔ میں فکر کیا جانوں، جورو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناتا۔

نواب : اچھا خوجی اس حوض میں نہاؤ تو ایک اشرفی دیتا ہوں۔

خوجی : حضور، اشرفیاں تو آپ کی جوتیوں کے صدقے سے بہت سی مل جائیں گی۔ مگر پھر جینا کٹھن ہو جائے گا۔ نہ مرے سہی لیکن، نکلا جیا برے 'حوال'۔ نہ صاحب، مجھے تو کوئی ایک غوطے پر ایک اشرفی دے تو بھی پانی میں نہ پیٹھوں، پانی کی صورت دیکھتے بدن کانپ اٹھتا ہے۔

دتّی : کیسے مرد ہو کہ نہانے سے ڈرتے ہو۔

خوجی : ہم نہیں نہاتے تو آپ کوئی قاضی ہیں؟

آزاد : اجی، سرکار کا حکم ہے۔

خوجی : چلیے، آپ کی بلا سے۔ کہنے لگے سرکار کا حکم ہے۔ پھر کوئی اپنی جان دے؟

آزاد : حضور، جو اس وقت یہ حوض میں دھم سے نہ کود پڑیں، تو افیم انھیں نہ ملے۔

خوجی : آپ کون بیچ میں بولنے والے ہوتے ہیں؟ اڑسٹھ برس سے تو میں افیم کھاتا ہوں۔ اب آپ کے کہنے سے چھوڑ دوں، تو کہیے مرا یا جیا۔

نواب : اچھا بھائی، جانے دو، دودھ کھاؤ گے،

خوجی : واہ خداوند، نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لیکن ذری مٹھاس خوب ہو۔ شاہجہاں پور کی سفید شکر یا کالپی کی مسری گھولیے گا۔ اگر تھوڑا سا کیوڑا بھی گیبڑ دیجیے تو پیتے ہی آنکھیں کھل جائیں۔

اتنے میں ایک چوبدار گھبرایا ہوا آیا اور بولا۔ خداوند، غضب ہو گیا جاں بخشی ہو تو عرض کروں سب بٹیر اڑ گئے۔

نواب : ارے؟ سب اڑ گئے؟

چوبدار : کیا کہوں حضور، ایک کا بھی پتا نہیں۔

مصاحبوں نے ہائے ہائے کرنی شروع کی، کوئی سر پیٹنے لگا، کوئی چھاتی کوٹنے لگا۔ نواب نے روتے ہوئے کہا، بھائی اور جو گئے سو گئے، میرے صف شکن کو جو کوئی ڈھونڈ لائے۔ ہزار روپے نقد دوں اس وقت میں جیتے جی مرمٹا۔ ابھی سانڈنی سواروں کا حکم دو کہ چاروں طرف دورہ کریں۔ جہاں صف شکن ملے سمجھا بجھا کر لے ہی آئیں۔

جھمّن : ان کو سمجھانا حضور، مشکل ہے۔ وہ تو عربی میں باتیں کرتے ہیں۔ سارا قرآن

انھیں یاد ہے۔ ان سے کون بحث کرے گا؟

نواب : مجھے تو اس سے عشق ہوگیا تھا جی، وہ نوکیلی چونچ ، وہ اکڑ اکڑ کر کاکن چننا۔ سیکڑوں پالیاں لڑیں، مگر کورا آیا۔ کس باکپن سے جھپٹ کر لات دیتا تھا کہ پالی بھر تھرا اٹھتی تھی اس کی بساط ہی کیا تھی۔ مجھولہ جانور، لیکن میدان کا شیر۔ یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ یہ بٹیر کی صورت میں کسی فقیر یہ روح ہے۔اب سنا کہ نماز بھی پڑھتا تھا۔

جھمن : حضور کو یاد ہوگا کہ رمضان کے مہینے میں اس نے دن کے وقت دانہ تک نہ چھوا، حضور سمجھے تھے کہ بوندا ہوگیا مگر تاڑ گیا کہ روزے سے ہیں۔

خوجی : خدا وند ، اب میں حضور سے کہتا ہوں کہ دس پانچ دفعہ میں نے افیم بھی پلادی، مگر واللہ، جو ذرا بھی نشہ ہوا ہو۔

کمالی : حضور، یقین جانیے پچھلے پہر سے صبح تک کابک سے حق حق کی آواز آیا کرتی تھی۔ غفور تم کو بھی تو ہم نے کئی بار جگا کر سنایا تھا کہ صف شکن خدا کو یاد کر رہے ہیں۔

نواب : افسوس، ہم نے اسے پہچانا ہی نہیں۔ دل ڈوبا جاتا ہے، کوئی پنکھا جھلنا۔

مصاحب : جلدی پنکھا لاؤ۔

نواب : پریتم جو میں جانتی کہ پریت کیے دکھ ہوے
نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت کرے جنی کوے۔

خوجی : (پینک سے چونک کر) ہاں استاد، چھیڑے جا۔ اس وقت تو میاں شوری کی روح پھڑک گئی ہوگی۔

نواب : چپ ، نامعقول۔ کوئی ہے؟ ان کو یہاں سے ٹہلاؤ۔ یہ رئیسوں کی صحبت کے قابل نہیں۔ مجھکو بھی کوئی گویا سمجھا ہے۔یہاں تو جی جلتا ہے ان کے نزدیک قوالی ہو رہی ہے۔

خوجی : خداوند غلام تو اس دم اپنے آپے میں نہیں۔ ہائے، صف شکن کی کابک خالی ہو اور میں اپنے آپے میں رہوں۔ حضور نے اس وقت مجھ پر بڑا ظلم کیا۔

نواب : شاباش خوجی ، شاباش! معاف کرنا، میں کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ کیوں جی، سانڈنی سوار دوڑایا گیا کہ نہیں؟

سوار : حضور، جاتا تو ہوں مگر وہ میری کیا سنیں گے، کوئی مولوی بھی تو ساتھ بھیجئے۔ میں

تو کچھ اونٹ ہی چڑھنا جانتا ہوں۔ ان سے دلیل کون کرے گا بھلا۔

آزاد : کسی اچھے مولوی کو بلوانا چاہیے۔

مصاحبوں نے ایک مولانا صاحب کو تجویزا۔ مگر یاروں نے ان سے کل داستان نہیں بیان کی۔ چوب دار نے مکان پر جاکر صرف اتنا کہا کہ نواب صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ مولوی صاحب اس کے ساتھ ہو لیے اور دربار میں آکر نواب صاحب کو سلام کیا۔

نواب : آپ کو اس لیے تکلیف دی کہ میری آنکھوں کا نور، میرے کلیجے کا ٹکڑا ناراض ہوکر چلا گیا ہے۔ بڑا عالم اور دیندار ہے، بحث کرنے میں کوئی اس سے پیش نہیں پاتا، آپ جائیے اور اس کو معقول کر کے لے آئیے۔

مولانا : ماں باپ کو کڑا حق ہوتا ہے، وہ کیسے نادان آدمی ہیں؟

خوجی :مولانا صاحب، وہ آدمی نہیں ہیں، بٹیر ہیں۔ مگر علم میں اور عقل میں آدمیوں کے بھی کان کاٹتے ہیں۔

کمالی : صف شکن کا نام تو مولانا صاحب آپ نے سنا ہوگا۔ وہ تو دور دور تک مشہور تھے۔ جناب، بات یہ ہے کہ سرکار کا بٹیر صف شکن کل کابک سے اڑگیا۔ اب یہ تجویز ہوئی ہے کہ ایک ایک سانڈنی سوار جائے اور اسے سمجھا بجھا کر لے آئے۔ مگر اونٹ وان تو پھر اونٹ وان، وہ دلیل کرنا کیا جانے، اس لیے آپ بلائے گئے ہیں کہ سانڈنی پر سوار ہوں اور ان کو کسی تدبیر سے لے آئیں۔

مولانا : ٹھیک، آپ سب کے سب نشے میں تو نہیں ہیں۔ ہوش کی باتیں کرو۔ خود مسخرے بنتے ہو، بٹیر بھی عالم ہوتا ہے، وہ بھی کوئی مولوی ہے، لاحول! اچھے اچھے گاؤدی جمع ہیں، بندہ جاتا ہے۔

نواب : یہ کسی کوڑھ مغز کو لائے تھے جی؟ خاصا جانگلو ہے۔

آزاد : اچھا، حضور بھی کیا یاد کریں گے کہ اتنے بڑے دربار میں ایک بھی منطقی نہ نکلا۔ اب غلام نے بیڑا اٹھا لیا کہ جاؤں گا اور صف شکن کو لاؤں گا۔ مجھے ایک سانڈنی دیجیے، میں اسے خود ہی چلا لوں گا۔ خرچ کے لیے کچھ روپے بھی دلوائیے، نہ جانے کتنے دن لگ جائیں۔

نواب : اچھا، آپ گھر جائیے اور لیس ہوکر آئیے۔

میاں آزاد گھر گئے تو اور مصاحبوں میں کھچڑی پکنے لگی، یار یہ تو بازی جیت لے گیا۔

کہیں سے ایک آدھ بٹیر پکڑ لائے گا اور کہے گا، یہی صف شکن ہے۔ پھر تو ہم سب پر شیر ہو جائے گا۔ ہم کو آپ کو کوئی نہ پوچھے گا۔ خوجی جا کر نواب صاحب سے بولے— حضور، ابھی میاں آزاد دو دن سے اس دربار میں آئے ہیں، ان کا اعتبار کیا۔ جو سانڈنی ہی لے کر رفو چکر ہوں، تو پھر کوئی کہاں ان کا پتا لگاتا پھرے گا۔

کمالی : ہاں خداوند، کہتے تو سچ ہیں۔

جھمن : خوجی، صورت ہی سے احمق معلوم ہوتے ہیں مگر بات ٹھکانے کی کہتے ہیں۔ ایسے آدمی کا ٹھکانا کیا۔

دتی : ہم تو حضور کو صلاح نہ دیں گے کہ میاں آزاد کو سانڈنی اور سفر خرچ دیجیے۔ جوکھم کی بات ہے۔

نواب : چلو، بس بہت نہ بکو۔ تم خود جیسے ہو، ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہو۔ آزاد کی صورت کہے دیتی ہے کہ کوئی شریف آدمی ہے اور مان لیا کہ سانڈنی جاتی ہی رہے، تو میرا کیا بگڑ جائے گا؟ صف شکن پر سے لاکھوں صدقے ہیں۔ سانڈنی کی حقیقت ہی کیا۔

اتنے میں میاں آزاد گھر سے تیار ہو کر آ گئے۔ اشرفیوں کی ایک تھیلی خرچ کے لیے ملی۔ نواب نے گلے لگا کر رخصت کیا۔ مصاحب بھی سلام بجالائے۔ آزاد سانڈنی پر بیٹھے اور سانڈنی ہوا ہو گئی۔

(4)

آزاد یہ تو جانتے ہی تھے کہ نواب کے مصاحبوں میں سے کوئی چوک کے باہر جانے والا نہیں، اس لیے انھوں نے سانڈنی تو ایک سرائے میں باندھ دی اور آپ اپنے گھر آئے۔ روپے ہاتھ میں تھے ہی، سویرے گھر سے اٹھ کھڑے ہوتے، کبھی سانڈنی پر کبھی پیدل، شہر اور شہر کے آس پاس کے حصوں میں چکر لگاتے، شام کو پھر سانڈنی سرائے میں باندھ دیتے اور گھر چلے آتے۔ ایک روز صبح کے وقت گھر سے نکلے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک صاحب کیچولیٹ کا دھانی رنگا ہوا کرتہ،اس پر روپے گز والی مہینی شربتی کا تین کمر توئی کا چست انگرکھا، گل بدن کا چوڑی دار گھوٹنا پہنے مانگ نکالے عطر لگائے، ماشے بھر کی ننھی سی ٹوپی آل پن سے اٹکائے، ہاتھوں میں مہندی، پور پور چھلے، آنکھوں میں سرمہ چھوٹے پنجے کا مخملی جوتا

پہنے ایک عجب لوچ سے کمر لچکائے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے چلے آتے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو خوب زور سے گھورا۔ چھیلے میاں نے مسکراتے ہوئے آواز دی، اے ذری ادھر تو دیکھو، ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ میرا کلیجہ بلیوں اچھلتا ہے۔ بھری برسات کے دن، کہیں پھسل نہ پڑو۔ تو قہقہہ اڑے۔

آزاد : آپ اپنا مطلب کہیے میرے پھسلنے کی فکر نہ کیجیے گا۔

چھیلا : گر پڑیے گا، تو مجھ سے ضرور پوچھ لیجیے گا۔

آزاد : بہت خوب، ضرور پوچھوں گا، بلکہ آپ کو ساتھ لے کر گروں تو سہی۔

چھیلا : خدا کی قسم، آپ کے کالے کپڑوں سے میں سمجھا کہ بنولا کسم کے کھیت سے نکل پڑا۔

آزاد : اور میں آپ کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ کوئی زنانہ مٹکتا جاتا ہے۔

چھیلا : واللہ، آپ کی دھج ہی نرالی ہے۔ یہ ڈبل کوٹ اور لکڑتوڑ بوٹ جانگلو معلوم ہوتے ہو۔ اس وقت ایسے بدحواس کہاں بگ ٹٹ بھاگے جاتے ہو؟ سچ کہیے گا، آپ کو ہماری جان کی قسم۔

آزاد : آج پروفیسر لاک سنسکرت پر ایک لیکچر دینے والے ہیں، بڑے مشہور عالم ہیں، یوروپ میں اِن کی بڑی شہرت ہے۔

چھیلا : بھائی، قسم خدا کی، کتنے بھونڈے ہو، پروفیسر کے مشہور ہونے کی ایک ہی کہی۔ ہم اتنے بڑے ہوئے، قسم لے لو، جو آج تک نام بھی سنا ہو۔ کیا دنّی خان سے زیادہ مشہور ہیں؟ بھائی، جو کہیں، تمھارے گھونگھر والے بال، ایک دفعہ بھی اس کی جان سے سن لو، تو عمر بھر نہ بھولو۔ واللہ، کیا ٹیپ دار آواز ہے، مگر تم ایسے کوڑھ مغزوں کو گلے بازی سے کیا واسطہ، تم تو پروفیسر صاحب کے پھیر میں ہو۔

آزاد : تمھاری زندگی راگ اور لے ہی میں گزرے گی۔ اس ناچ اور رنگ نے آپ کی یہ گتی بنائی کہ مونچھ اور داڑھی کتروائی، مہندی لگوائی اور مرد سے عورت بن گئے ارے، اب تو مرد بنو، ان باتوں سے باز آؤ۔

چھیلا : جی، تو آپ کے پروفیسر لاک کے پاس چلا جاؤں؟ اپنے کو آپ کی طرح گڈّامی بناؤں! کسی گلی کوچے میں نکل جاؤں تو تالیاں پڑنے لگیں۔

آزاد : اب یہ فرمایئے کہ اس وقت آپ کہاں کے ارادے سے نکلے ہیں؟

چھیلا : کل رات کو تین بجے تک ایک رنگیلے کے دوست کے یہاں ناچ دیکھتا رہا۔ وہ پیاری پیاری صورتیں دیکھنے میں آئی کہ واہ جی واہ۔کس کافر کا اٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ جلسہ برخاست ہوا تو بس، کلیجے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر نکلے، لیکن رات بھر کانوں میں چھما چھم کی آواز آیا کی۔پریوں کی پیاری پیاری صورت آنکھوں سے پھرا کی۔ اب اس وقت پھر جاتے ہیں، ذرا سینک آئیں، بھیروی اڑ رہی ہوگی۔

رسیلے نینوں نے پھندا مارا..........

آزاد : کل فرصت ہو ہم سے ملیے گا۔

چھیلا : کل تک تو میری نیند کا خمار ہی رہے گا۔

آزاد : اچھا پرسوں سہی۔

چھیلا : پرسوں؟ پرسوں تو خدا بھی بلائے تو بندہ نہ جانے کا۔ پرسوں نواب صاحب کے یہاں بیٹروں کی پالی ہے،مہینوں سے بٹیر تیار ہورہے ہیں۔

آزاد : اچھا صاحب، پرسوں نہ سہی، منگل کو سہی۔

چھیلا : منگل کو ترکے سے بانے کی کنکیاں لڑیں گی، ابھی بنارس سے بانا منگایا ہے ، ماہی جال کی کنکیاں ایسی سدھی ہے کہ ہر دم قابو میں، موڑو، غوطہ دو، کھینچو، جو چاہے سو کرو، جیسے کھیت کا گھوڑا۔

آزاد : اچھا بدھ کو فرصت ہے۔

چھیلا : واہ واہ، بدھ کو تو بڑے ٹھاٹ سے بھٹیاریوں کی لڑائی ہوگی۔ دیکھیے تو کیسی کیسی بھٹیاریاں کس بانکی ادا ہاتھ چمکا کر، انگلیاں مٹکا کر لڑتی ہیں اور کیسی کیسی گالیاں سناتی ہیں کہ کان کے کیڑے مر جائیں۔

آزاد : برسپت کو ضرور ملیے گا؟

چھیلا : جناب آپ تو پیچھے پڑ گئے، ملوں تو سب کچھ ، جب فرصت بھی ہو۔ یہاں مرنے تک کی تو فرصت نہیں، اب کی نوچندی جمعرات ہے، برسوں سے منتیں مانی ہیں، آپ کو دین دنیا کی خبر تو ہے،نہیں۔

آزاد : تو معلوم ہوا، آپ سے ملاقات نہیں ہوگی۔ آج مرغ لڑایئے گا، کل پتنگ

لڑائیے گا، کہیں گانا ہوگا، کہیں ناچ ہوگا، آپ نہ ہو تو رنگ کیوں کر جمے۔ میلا ٹھیلا تو آپ سے کوئی کاہے کو چھوٹتا ہوگا، پھر بھلا ملنے کی کہاں فرصت؟ رخصت۔

چھیلا : یہ تو اب روٹھے کیوں جاتے ہو؟

آزاد : اب مجھے جانے دیجیے، آپ کا اور ہمارا میل جیسے گنا اور مدار کا ساتھ۔ جائیے دیکھیے، بھیروی کا لطف جاتا ہے۔

چھیلا : جناب، اب ناچ گانے کا لطف کہاں، وہ چمک دمک کہاں، دل ہی بجھ گیا۔ جو لطف ہم نے دیکھے ہیں، وہ بادشاہوں کو خواب میں نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ یہ قیصر باغ عدن کو مات کرتا تھا۔ پریوں کے جھونڈ، حسینوں کے جمگھٹ، رات کو دن کا سماں رہتا تھا۔ اب یہاں کیا رہ گیا۔ گلی کوچوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ سائکوں کے مزاج نہ ملتے تھے۔ بانکے ترچھے رئیس زادے ایک ایک دم کی دو دو اشرفیاں پھینک دیتے تھے۔ اب تو شہر بھر میں اس سرے سے اس سرے تک چراغ لے کر ڈھونڈیے تو میدان خالی ہے۔ کل نئی سڑک کی طرف جا نکلا، تو نکڑ پر ایک ہاتھی بندھا دیکھا۔ پوچھا، تو معلوم ہوا کہ بی حیدر جان کا ہاتھی ہے۔ قسم خدا کی، ایسا خوش ہوا کہ آنکھوں میں آنسو آ گیا۔

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو، پھر غنیمت ہے،
نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آ ہی جاتی ہے۔

آزاد : اچھا، یہ سب جلسے آپ نے دیکھے اور اب بھی آنکھوں سینکا ہی کرتے ہیں، مگر سچ کہیے گا، بنے یا بگڑے، بسے یا اجڑے، نیک نام ہوئے یا بدنام؟ یہاں تو نتیجہ دیکھتے ہیں۔

چھیلا : جناب، یہ تو بڑا کڑا سوال ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ عمر بھر اس ناچ رنگ ہی کے پھندے میں پھنس رہے، دن رات طبلہ، سارنگی، بایاں، ڈھول، ستار کی دھن میں مست رہے۔ خدا کی یاد طاق پر، علم چھپر پر، چھٹے ہوئے شہدے بن بیٹھے، لیکن اب تو پانی میں ڈوب گئے، اوپر ایک انگل ہو تو، اور ایک ہاتھ ہو تو، برابر ہے۔ آپ لوگ اس بھروسے میں ہوں کہ ہمیں آدمی بنائیے تو یہ خیر صلاح ہے۔ بوڑھے طوطے بھی کہیں رام رام پڑھتے ہیں؟

آزاد : خیر، شکر ہے کہ آپ اپنے کو بگڑا ہوا سمجھتے تو ہیں، کڑوے نہ ہو جیے تو کہوں کہ اس زنانے بھیس پر لعنت بھیجیے، یہ لوچ، یہ لچک، یہ مہندی، یہ مسی، کچھ عورتوں ہی کو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ ذرا تو اس داڑھی مونچھ کا خیال کرو۔

چھیلا : یہ بھرّے کسی ایسے ویسے کو دیجیے، یہاں بڑے بڑے کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ آپ کے جھانسے میں کوئی اناڑی آئے، ہم پر چکما نہ چلنے کا۔

آزاد : آپ کو ڈوم ڈاریوں ہی کی محبت پسند آئی یا کسی اور کی بھی؟ لکھنؤ میں تو ہر فن کے آدمی موجود ہیں۔

چھیلا : ہم تو ہمیشہ ایسی ہی ٹکڑی میں رہے، گھر پھونک تماشہ دیکھا۔ لنگوٹی میں پھاگ کھیلا۔ میاں شوری کے ٹپے، قدر پیاں کی ٹھمریاں، گھسیٹ خاں ٹیپ دار آواز، پیارے خاں کا خیال چھوڑ کر جائیں کہاں؟ سارنگی، منجیرے کی آواز سنی تو جھپ سے گھس پڑے؛ مسجد میں اذان ہوا کرے، سنتا کون ہے۔ بہت گذر گئی تھوڑی باقی ہے۔

آزاد : لکھنؤ میں ایسے ایسے عالم پڑے ہیں کہ جن کا نام آفتاب کی طرح ساری خدائی میں روشن ہے۔ کربلا اور مدینہ تک کے سمجھدار لوگ ان بزرگوں کا کلام شوق سے پڑھتے ہیں۔ مفتی سعداللہ صاحب، سید محمد صاحب وغیرہ علماء کا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اب شاعروں کو دیکھیے، خواجہ حیدر علی آتش، شیخ ناسخ اپنے فن کے خدا تھے۔ مرثیہ کہنا تو لکھنؤ والوں کا حصہ ہے۔ میر انیس صاحب کو خدا بخشے، زبان کی صفائی تو یہاں ختم ہوگئی۔ مرزا دبیر تو گویا اپنے فن کے موجد تھے۔ نسیم اور صبا نے آتش کو بھڑکا دیا۔ گویا تو گویا شاعری کے چمن کا بلبل تھا۔ مرزا رجب علی بیگ سرور نے وہ نثر لکھی کہ قلم توڑ دیے۔ یہاں کے کاریگروں کے بھی جھنڈے گڑے ہیں۔ کمہار تو ایسے دنیا کے پردے پر نہ ہوں گے۔ مٹی کی مورتیں ایسی بنائیں کہ مصوروں کی کرکری ہوگئی۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ مورت بولا ہی چاہتی ہے۔ جس عجائب گھر میں جایئے گا، لکھنؤ کے کمہاروں کی کاریگری ضرور پایئے گا۔ خوش نصیبوں نے وہ کلام پیدا کیا کہ ایک ایک حرف کی پانچ پانچ اشرفیاں لیُں۔ بانکے ایسے کی شیر کا پنجہ توڑ ڈالے۔ ہاتھی کو ڈپٹیں تو چنگھاڑ کر منزلوں بھاگے۔ رستم اور اسفندیار کو چٹکیوں میں لڑا دیں۔ استاد محمد علی خاں پھکیت، چھریرا بدن، لیکن گدکا ہاتھ میں آنے کی دیر تھی۔ پرے کے پرے دم میں صاف کر دیئے۔ کڑک کر طمانچے کا تلا ہاتھ لگایا، تو دشمن کا منہ پھر گیا۔ اکھاڑے میں گدکا لے کر کھڑے ہوئے تو معلوم ہوا، بجلی چمک گئی۔ ایک دفعہ للکار دیا کہ روک، بیٹھ گئی! دیکھ سنبھل۔ خبردار یہ آئی، وہ آئی، وہ پڑ گئی! واہ واہ کی آواز ساتویں آسمان جا پہنچی۔ بلا کی صفائی، غضب کی صفائی تھی۔ جو منہ چڑھا، اس نے منہ کی کھائی۔ سامنے گیا اور شامت آئی کامدانی وہ

ایجاد کی کہ اڑیسہ اور کوچین تک دھوم ہو گئی۔ لیکن آپ کو تو نہ علم سے سرو کار، نہ فن سے مطلب، آپ تو تال سر کے پھیر میں پڑے ہیں۔

چھیلا : حضرت، اس وقت بھیروی سننے جاتا تھا اور 'جاگے بھاگ پیارا نظر آیا' سننے کا شوق چرایا تھا، لیکن آپ نے پادریوں کی طرح بکواس کر کے کایا پلٹ دی۔ آپ جو ہمیں راہ پر لاتے ہوں، تو اتنا مان جاؤ کہ ذرا قدم بڑھائے ہوئے، ہمارے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیے ہوئے، پاٹے نالے تک چلے چلو، دیکھوں تو پرستان سے کیوں کر بھاگ آتے ہو؟ انھیں حسیناؤں کا سجدہ نہ کرو، تو کچھ جرمانہ دوں، اس اندر کے اکھاڑے سے کورے نکل آؤ، تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔

آزاد : (گھڑی جیب سے نکال کر) ایں! آٹھ پر اکیس منٹ! اس خوش گپی نے آج بڑا ستم ڈھایا، لیکچر سننے میں نہ آیا۔ مفت کی بک بک جھک جھک! لیکچر سننے قابل تھا۔

چھیلا : اللہ جانتا ہے، اس وقت کلیجے پر سانپ لوٹ رہے ہیں! نہ جانے تڑکے تڑکے کس منحوس کا منھ دیکھا ہے کہ بھیروی کے مزے ہاتھ سے گئے۔

آزاد : آپ بھی نرے چونچ ہی رہے۔ اتنی دیر تک سمجھایا سر مغزن کی، مگر واہ رے کتے کی دم، بارہ برس بعد بھی وہ ٹیڑھی ہی نکلی۔

چھیلا : تو میرے ساتھ آیئے نا، بغلیں کیوں جھانکتے ہو؟ جب جانیں کہ بلوہ نکل آؤ۔

آزاد : اچھا چلیے۔ دیکھیں کون سا حسین اپنی نگاہوں کے تیر سے ہمیں گھائل کرتا ہے۔ برسوں کے خیالوں کو کوئی کیا مٹا دے گا؟ ہم، اور کسی کے تھرکنے پر فدا ہو جائیں! توبہ! کوئی ایسا معشوق تو دکھایئے، جسے ہم پیار کریں۔ ہمارا معشوق وہ ہے جس میں کمال ہو۔ زلف اور چوٹی پر کوئی اور سر دھنتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ آزاد چھیلے میاں کے ساتھ حافظ جی کے مکان میں جا پہنچے۔ محفل سجی ہوئی تھی۔ تین چار حسینیں مل کر مبارک باد گاتی تھیں۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی ہاتھ باندھے کھڑی ہیں۔ جسے دیکھو، گردن ہلاتا ہے۔ پازیب کی چھما چھم دل کو روندتی ہے، کوئی ادھر سے ادھر چمک جاتی ہے، کوئی اونچے سروں میں تان لگاتی ہے، کوئی سینے پر ہاتھ رکھ کر 'گہری ندیاں' بتاتی ہے، کوئی نشیلی آنکھوں کے اشارے سے 'نینا رسیلے' کی چھوی دکھاتی ہے، دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ چھیلے میاں نے ایک حسینہ سے فرمائش کی کہ حضرت میر کی یہ غزل گاؤ۔

غیر کے کہنے سے مارا اس نے ہم کو بے گناہ

یہ نہ سمجھا وہ کہ واقعہ میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

یاد ایام کی اپنی روز شب کی جائے باش

تھا درے بازِ بیاباں، یا درِ میخانہ تھا

اس غزل نے وہ لطف دکھایا اور ایسا رنگ جمایا کہ میاں آزاد تک 'او ہو!' کہہ اٹھتے تھے، اس کے بعد ایک پری نے یہ غزل گائی۔

حال کھلے تو کس طرح یار کی بزم ناز کا

جو ہے یہاں وہ مست ہے اپنی ہی سوز ساز میں

اس غزل پر جلسے میں کہرام مچ گیا۔ ایک تو غزل حقانی، دوسرے حسینہ کی اٹھتی جوانی، تیسرے اس کی نازک بیانی۔ لوگ اتنے مست ہوئے کہ جھوم جھوم کر یہی شعر پڑھتے تھے۔

حال کھلے تو کس طرح یار کی بزم ناز کا

جو ہے یہاں وہ مست ہے اپنی ہی سوز ساز میں

اب سب کو شک کی جگہ یقین ہو گیا کہ اب کسی کا رنگ نہ جمے گا۔ ہر طرف سے حقانی غزلوں کی فرمائش ہے، نہ دھرپد کا خیال، نہ ٹپّے کی فکر، نہ بھیروی کی دھن، نہ پکے گانے کا ذکر، بس حقانی غزلوں کی دھوم ہے۔

اب دل لگی دیکھیے کہ بڈھے جوان سب کے سب بے دھڑک اس موہنی کو گھور رہے ہیں۔ کوئی اس سے آنکھیں لڑاتا ہے، کوئی سر دھنتا ہے، کوئی ٹھنڈی آہیں کھینچتا ہے۔ دو چار منچلے رئیسوں نے حسینوں کو بلاکر بڑے شوق سے پاس بٹھایا۔ نوک جھونک ہنسی مذاق چہل، دل لگی، دھول دھپّہ، ہونے لگا۔ حافظ جی بھی بے سینگ کے بچھڑے بنے ہوئے مزے سے چوکھی لڑ رہے ہیں۔

بوڑھے میاں : آج کل کے لڑکوں کو بھی ہوا لگی ہے۔

ایک جوان : جناب ، اب تو ہوا ہی ایسی چلی ہے کہ جوان تو جوان، بڈھوں تک کو بڑھ بھُس لگا ہے۔ سو برس کا سن، چار کے کندھوں پر لدنے کے دن، مگر جوانی ہی کے دم بھرتے ہیں۔

بوڑھے میاں : اجی، ہم تو زمانے بھر کے نیارے ہیں، ہمیں کوئی کیا چنگ پر چڑھائے

گی، مگر تم ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، ایسا نہ ہو، ان کے پھیر میں آ جاؤ، پھر دین دنیا دونوں کو رو بیٹھو۔

جوان : واہ جناب، آپ کی صحبت میں ہم بھی پکّے ہوگئے ہیں۔ ایسے کچے نہیں کہ ہم پر کسی کے داؤ پیچ چلے۔

بوڑھے میاں : کچے پکّے کے بھروسے نہ رہیے گا، ان حسینوں کا بڑے بڑے زاہدوں نے سجدہ کیا ہے، تم کس کھیت کی مولی ہو۔

جوان : ان بتوں کو ہم فقیریوں سے بھلا کیا کام ہے یہ تو طالب زر کے ہیں اور یا خدا کا نام ہے۔

حسینہ : ان بڑے میاں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ بال بال گل کر برف سا سفید ہوگیا اور اب تک سیاہ کاری نہ چھوڑی، یہ سمجھاتے کس منھ سے ہیں؟ ان کی سنتا کون ہے! ذرا شیخ جی، بہت بڑھ بڑھ کر باتوں نہ بنایا کیجیے، شاہ چھڑے والی گلی میں روز بیس بیس چکّر ہوتے ہیں، اے تم تھکتے بھی نہیں؟

حافظ جی : شیخ جی جہاں بیٹھتے ہیں، جھگڑا ضرور خریدتے ہیں۔ آپ ہیں کون؟ آئے کہاں سے ناصح بن کے! اچھا، بی صاحب اپنا کلام سنائیے، مگر شرط یہ ہے کہ جب ہم تعریف کریں تو جھک کر سلام کیجیے۔

حسینہ : آپ ہیں تو اسی لائق کی دور ہی سے جھک کر سلام کر لیں۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر دوسری نکری میں گالی اور پھکّڑ کا چھرّا چلتا تھا، تیسرے میں دھول دھپّہ ہوتا تھا۔ لڑکے، جوان، بوڑھے بے دھڑک ایک دوسرے پر پھبتیاں کستے تھے۔ اتنے میں دوپہر کی توپ دغی، جلسہ برخاست، ٹیلیوں نے بوریا بندھنا اٹھایا، چلیے، سناٹا ہوگیا۔

(5)

میاں آزاد کی سانڈنی تو سرائے میں بندھی تھی۔ دوسرے دن آپ اس پر سوار ہو کر گھر سے نکل پڑے۔ دوپہر ڈھلے ایک قصبے میں پہنچے۔ پیپل کے پیڑ کے سائے میں بستر جمایا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہوا کے جھونکوں سے ذرا دل کو ڈھارس ہوئی، پاؤں پھیلا کر لمبی تانی، تو

دین دنیا کی خبر نہیں۔ جب خوب نیند بھر کر سو چکے، تو ایک آدمی نے جگا دیا۔ اٹھے، مگر پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ سامنے اِندارے پر ایک حسین عورت پانی بھر رہی تھی۔ حضرت بھی پہنچے۔

آزاد : کیوں نیک بخت، ہمیں ایک ذرا سا پانی نہیں پلاتیں۔ بھرتے نہ بنتا ہو، تو لاؤ ہم بھریں۔ تم بھی پیو، ہم بھی پئیں، احسان ہوگا۔

عورت نے کوئی جواب نہ دیا، تیکھی چتون سے دیکھ کر پانی بھرتی رہی۔

آزاد : سخی، سے سوم بھلا، جو دیوے تُرنت جواب۔ پانی نہ پلاؤ، جواب تو دے دو۔ یہ قصبہ تو اپنے حق میں کربلا کا میدان ہو گیا۔ ایک بوند پانی کو ترس گئے۔

عورت نے پھر بھی جواب نہ دیا۔ پانی بھر کر چلی۔

آزاد : بھئی، اچھا گاؤں ہے! جو بات ہے، نرالی! ایک لٹیا پانی نہ ملا، واہ ری قسمت! لوگ تو اس بھادوں کی جلتی بلتی دھوپ میں پوسرے بیٹھاتے ہیں، کیوڑا پڑا ہوا پانی پلاتے ہیں، یہاں کوئی بات تک نہیں سنتا۔

میاں آزاد کو حیرت تھی کہ اس کمسن نازنین کا یہاں اس ویرانے میں کیاں کام۔ سائے کی طرح ساتھ ہو لیے۔ وہ کنکھیوں سے دیکھتی جاتی تھی، مگر منہ نہیں لگاتی تھی۔ بارے، سڑک سے دائیں ہاتھ پر ایک پھاٹک کے سامنے وہ بیٹھ گئی اور پیڑ کے سایۂ میں ستانے لگی۔ آزاد نے کہا۔ اگر یہ برتن بھاری ہو، تو لاؤ، میں لے چلوں، اشارے کی دیر ہے۔ قسم لو، جو ایک بوند بھی پیوں، گو پیاس کے مارے کلیجہ منہ کو آتا ہے اور دم نکلا جاتا ہے، لیکن تمھارا دل دکھانا منظور نہیں۔

حسینہ نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ پھر ہمت کر کے اس برتن کو اٹھایا اور پھاٹک کے اندر ہو رہی۔ میاں آزاد بھی چپکے چپکے دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے گئے۔ حسینہ ایک کھلے ہوئے چھوٹے سے بنگلے میں جا بیٹھی اور آزاد درختوں کی آڑ میں دبک رہے کہ دیکھیں، یہاں کیا گل کھلتا ہے۔ اس بنگلے کے چاروں طرف کھائی کھدی ہوئی تھی۔ ارد گرد سرپت بوئی ہوئی تھی، ایسی گھنی کہ چڑیاں تک کا گزر نہ ہو، اور وہ تیز کہ تلوار مات۔ بڑا اونچا محراب دار پھاٹک لگا ہوا تھا۔ وہ جوہر دار شیشم کی لکڑی تھی کہ باید و شاید۔ کیاریاں روز سینچی جاتی تھیں۔ روِشوں پر سرخی کٹی تھی، ہرے بھرے درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ کہیں انار کی قطار،

کہیں لکھوٹ کی بہار، ادھر آم کے باغ، امرود اور چکوتروں سے ٹہنیاں پھٹی پڑتی تھیں۔ نارنگیاں شاخوں پر لدی ہوئی تھی، پھولوں کی بو باس، کہیں گل مہندی، کہیں گلِ عباس، نیواڑی پھولی ہوئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا، اودی اودی گھٹا، کلیوں کی چٹک، جوہی کی بھینی مہک، کنیل کی دمک۔ باغ کے بیچوں بیچ میں ایک تین فٹ کا اونچا پکا چبوترا بنا تھا۔ یہ تو سب کچھ تھا، مگر رہنے والے کا پتہ نہیں۔ اس حسینہ کی چال ڈھال سے بھی بیگانہ پن برستا تھا۔ یکا یک اس نے برتن زمین پر رکھ دیا اور ایک نیواڑ کی پلنگری پر سو رہی۔ ان کو داؤ ملا، تو خوب چھکر میوے کھائے اور برتن کو منھ سے لگایا، تو ایک بوند بھی نہ چھوڑا۔ اتنے میں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ آزاد جھٹ انگور کی ٹٹی میں چھپ رہے، مگر تاک لگائے بیٹھے تھے کہ دیکھیں، ہے کون! دیکھا کہ پھاٹک کی طرف سے کوئی آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ بڑا لمبا تڑنگا، موٹا تازہ آدمی تھا۔ لنگوٹ باندھے، اکڑتا اس بنگلے کی طرح جارہا تھا۔ سمجھے کہ کوئی پہوان اپنے اکھاڑے سے آیا ہے۔ نزدیک آیا تو یہ گمان دور ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی شاہ جی ہے۔ وہ لنگوٹ، جس سے پہلوان کا دھوکا ہوا تھا، تہمد نکلا۔ شاہ صاحب سیدھے بنگلے میں داخل ہوئے۔ عورت کو پلنگ پر سوتا پایا ،تو پلنگ پر ہاتھ مار کر چلا اٹھے۔ اٹھ۔ حسینہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور شاہ جی کے قدم چومے۔ شاہ جی ایک ترپائی پر بیٹھ گئے اور اس سے یوں باتیں کرنے لگے۔ بیٹی، آج تم کو ہمارے سبب سے بہت راہ دیکھنی پڑی۔ یہاں سے دس کوس پر ایک گاؤں میں ایک راجا رہتا ہے۔ اسی برس کا ہو گیا، مگر اللہ نے نہ لڑکا دیا، نہ لڑکی۔ ایک دن مجھے بلوایا۔ میں کہیں آتا جاتا تو ہوں نہیں۔ صاف کہلا بھیجا کہ تمھیں غرض ہو تو آؤ، خدا کے بندے خدا کے سوا اور کسی کے دوار پر نہیں جاتے۔ آخر رانی کو لے کر وہ آپ آیا اور میرے قدموں پر گر پڑا۔ میں نے رانی کے سر پر ایک بنا سونگھا گلاب کا پھول دے مارا۔ پانچویں مہینے اللہ نے لڑکا دیا اور راجا میرے پاس دوڑا آتا تھا کہ میں راہ میں ملا۔ دیکھتے ہی مجھے رتھ پر بیٹھا لیا۔ اب کہتا ہے، روپیہ لو، جاگیر لو، گاؤں لو، ہاتھی، گھوڑے لو، مگر میں کب مانگتا ہوں۔ فقیروں کو دنیا سے کیا کام۔ اس وقت جا کر پیچھا چھوٹا، تم پانی تو لائی ہوگی؟

حسینہ: میں آپ کی لونڈی ہوں، یہ کیاں کم ہے کہ آپ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں۔ وہ پانی رکھا ہوا ہے۔ آپ پھونک ڈال دیں، تو چلی جاؤں۔

یہ کہہ کر وہ اٹھی، مگر برتن دیکھا ،تو پانی ندارد۔ ایں! یہ پانی کیاں ہوا! زمین پی گئی، یا

آسمان! ابھی پانی بھر کر رکھا تھا، دیکھتے دیکھتے اڑ گیا۔ غضب خدا کا، ایک بوند تک نہیں! لبالب بھرا ہوا تھا!

شاہ جی : اچھا ، تو بتا دوں، مجھے جوگ بل سے معلوم ہو گیا کہ تم آتی ہو۔ جب تم سو رہیں تو میں نے آنکھ بند کی، اور یہاں پہنچ گیا۔ پانی پیا، تو پھر آنکھ بند کی اور پھر راجہ صاحب کے پاس ہو رہا۔ پھونک ڈالنے کی ساعت اسی وقت تھی۔ ٹل جاتی تو پھر ایک مہینے بعد آتی۔ اب تم یہ الا ئچی لو اور کل آدھی رات کو مرگھٹ میں گاڑ دو۔ تمھاری مراد پوری ہو جائے گی۔

بُوتی نے الا ئچی لے لی۔ میاں آزاد چپکے چپکے سب سن رہے تھے۔ اب انھیں خوب ہی معلوم ہو گیا کہ شاہ جی رنگے سیار ہیں۔ لوٹے کا پانی تو میں نے پیا اور آپ نے یہ گڑھا کہ آنکھ بند کرتے ہی یہاں آئے اور پانی پی کر پھر کسی ترکیب سے چل دیے۔ خوب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ واہ رے مکار! جالیے! اتنا بڑا جھوٹا نہ دیکھا نہ سنا۔ ایسے بڑے ولی ہو گئے کہ ان کی دعا سے ایک رانی پانچویں ہی مہینے بچہ جن پڑی۔ جھوٹ بھی تو کتنا! حد تو یوں ہے کہ جھوٹوں کے سردار ہیں۔ پٹے بڑھا لیے، تہمد باندھ کر شاہ جی بن گئے۔ لگے پجنے۔ کوئی بیٹا مانگتا ہے کوئی تعویذ مانگتا ہے، کوئی کہتا ہے ، میرا مقدمہ جتوا دو، تو نیاز چڑھاؤں، کوئی کہتا ہے نوکری دلوا دیجیے تو مٹھائی کھلاؤں۔ سنیوگ سے کہیں اس کی مراد پوری ہو گئی، تو شاہ صاحب کی چاندی ہے۔ ورنہ کس کی مجال کہ شکایت کا ایک حرف منھ سے نکالے۔ ڈر ہے کہ کہیں زبان نہ سڑ جائے۔ اللہ ری دھاک، بہت سے عقل کے دشمن ان بنے ہوئے فقیروں کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ آزاد ایسے بنے ہوئے سِدھ اور رنگے سیار فقیروں کی قبر تک سے واقف تھے۔ سوچا، ان کی مرمت کر دینی چاہیے۔

شاہ صاحب نے چبوترے پر لنگی بچھائی اور اس پر لیٹ کر دعا پڑھنے لگے، مگر پڑھے لکھے تو تھے نہیں، شین قاف تک درست نہیں، اناپ شناپ بکنے لگے۔ اب میاں آزاد سے نہ رہا گیا، بول اٹھے۔ کیا کہنا ہے شاہ جی، واللہ ، آپ نے تو کمال کر دیا۔ اب تو شاہ جی چکرائے کہ یہ آواز کس نے کہی۔ یہ دشمن کون پیدا ہوا۔ ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، مگر نہ آدمی ، نہ آدم زاد، نہ انسان، نہ انسان کا سایا۔ یا خدا، یہ کون بولا؟ یہ کس نے ٹوکا؟ سمجھے کہ یہ آسمانی ڈھیلا ہے۔ کسی جن کی آواز ہے۔ ڈرپوک تو تھے ہی، بدن تھر تھرانے لگا، ہاتھ پاؤں پھول گئے، کراماتیں سب بھول گئے، حواس غائب، ہوش قلابازی کھانے لگے۔

قرآن کی آیتیں غلط سلط پڑھنے لگے۔ آخر چلاّ اٹھے۔ مظہر العجائب۔ تو ادھر یہ بول اٹھے۔ لنگی مع شاہ جی غائب۔ اب شاہ جی کی گھبراہٹ کا حال پوچھیے چہرا فق، کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ میاں آزاد نے بھانپ لیا کہ شاہ صاحب پر رعب چھا گیا۔ جھٹ نکل کر پتوں کو خوب کھڑ کھڑایا۔ شاہ جی کانپ اٹھے کہ پریتوں کا لشکر آ کھڑا ہوا۔ اب جان سے گئے۔ تب آزاد نے ایک فارسی غزل خوب لے کے ساتھ پڑھی۔ جیسے کوئی ایرانی پڑھ رہا ہو۔ شاہ جی مست ہو گئے، سمجھے کہ یہ تو کوئی فقیر ہے۔ اب تو جان میں جان آئی۔ میاں آزاد کے قدم لیے۔ انھوں نے پیٹھ ٹھونکی۔ شاہ جی اس وقت نشے کی ترنگ میں تھے، خیال بندھ گیا کہ کوئی آسمان سے اترا ہے۔

آزاد : کیستی اواز کجائی و ومانت چہ کار است

(کون ہے، کہاں سے آتا ہے اور مجھ سے کیا کام ہے؟)

شاہ جی کے رہے سہے حواس اور غائب ہو گئے۔ زبان سمجھ میں نہ آئی۔ سمجھے کہ ضرور آسمان کا فرشتہ ہے۔ ہماری جان لینے کو آیا ہے۔ دبے دانتوں بولے۔ سمجھتا نہیں ہوں گا کہ آپ کیا حکم دیں گے۔ ہم نے بہت گناہ کیے، اب معاف فرماؤ۔ کچھ دن اور جینے دو تو یہ ٹھگ وِدّیا چھوڑ دوں۔ میں سمجھ گیا کہ آپ میری جان لینے آئے ہیں۔

آزاد : یہ بڑھاپا اور اتنی بدکاری، یہ سن اور سال اور یہ چال ڈھال۔ یاد رکھ کہ جہنم کے گڈھے میں گرے گا اور دوزخ کی آگ میں جلایا جائے گا۔ سُن میں نہ آسمان کا فرشتہ ہوں، نہ کوئی جن ہوں، میں حکیم ولی ناس کی پاک روح ہوں، حکیم ہوں، خُدا سے ڈرتا ہوں، میرے قبضے میں بہت سے طِلسم ہیں۔ میرا مزار اسی جگہ پر تھا، جہاں تیرا چبوترا ہے اور جہاں تو ناپاک رہتا ہے اور شوربہ لڑھکاتا ہے۔ خیر تیری جہالت کے سبب سے میں نے تجھے چھوڑ دیا، لیکن اب تو نے یہ نیا پھر پھند سیکھا کہ حسیناؤں کو پھانستا ہے اور ان سے کچھ اینٹھتا ہے۔ اس زمانے میں یہ عورت میری بی بی تھی۔ لے اب یہ ہتھکنڈے چھوڑ، مکر اور دغا سے منھ موڑ، نہیں تو تو ہے اور ہم۔ ابھی ٹھیک بناؤں گا اور ناچ نچاؤں گا۔ تیری بھلائی اسی میں ہے کہ اپنا کچھ حال کہہ چل، نہیں تو جانے گا۔ میرا کچھ نہ جائے گا۔

شاہ جی نے شراب کی ترنگ میں مارے ڈر کے اپنی بیتی کہانی شروع کی۔ چودہ برس کے سن سے مجھے چوری کرنے کی لت پڑی اور اتنا پکّا ہوگیا کہ آنکھ چوکی اور گٹھری اڑائی،

غافل ہوا اور ٹوپی کھسکائی۔ پہلے کچھ دن تو لٹیا چور رہے۔ مگر یہ تو کرتی وِدّیا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہم چوروں کے گرو گھنٹال ہو گئے۔ سیند لگانا کوئی ہم سے سیکھے، چھت کی کڑیوں میں یوں چمٹ رہوں، جیسے کوئی چھپکلی، اچک پھاند میں بندر میرے مقابلہ میں مات ہے، دبے پاؤں کوسوں نکل جاویں کیا مجال کسی کو آہٹ ہو، شہر بھر کے بدمعاش، لکّے، لچے، شہدے، ہماری ٹکڑی میں شامل ہوئے۔ جس نے ہیکڑی کی۔ اس کو نیچا دکھایا، جو ٹیڑھا ہوا، اس کو سیدھا بنایا، خوب چوریاں کرنے لگے۔ آج اس کا مال مارا، کل اس کی چھت کاٹی، پرسوں کسی نواب کے گھر میں سیند دی۔ یہاں تک کہ ڈاکے مارنے لگے، سڑکوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ گول میں دنیا بھر کے بے فکرے، جمع ہیں، کوئی چنڈو اڑاتا ہے، کوئی چرس کے دم لگاتا ہے، گانجے بھانگ ٹھرّے سب کا شوق ہے، تانے اڑ رہی ہے۔ بوتلیں چنی ہوئی ہے، گنڈیریوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کرتی ہیں، سب کو یہی فکر ہے کہ کسی کا مال تاکیں۔ ایک دن شامت آئی ایک نواب صاحب کے یہاں چوری کرنے کا شوق چرایا۔ ان کے خدمت گار کو ملایا، نوکرانیوں کو بھی کچھ چٹایا اور ایک بجے کے وقت گھر سے نکلے۔ اسی محلے میں ایک مہینے پہلے ہی ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ پہلے اسی مکان میں پیٹھے۔ نواب کا مکان کوئی پچاس ہی قدم ہوگا۔ تین آدمی دس قدم پر اور پانچ بیس قدم پر کھڑے ہوئے۔ ہم، خدمت گار اور ایک چور ساتھ چلے کہ گھر میں دھنس پڑے۔ قریب گئے تو دیوڑھی پر چوکیدار نے پکارا کون؟ سن سے جان نکل گئی۔ عمر بھر میں یہی خطا ہوئی کہ چوکیدار کو پہلے سے نہ ملا لیا۔ اب کیا کریں! 'پچھلی بدّھی گنوار کی' پھر چوکیدار نے للکارا کون آتا ہے؟ ہم نے کہا ہم ہیں بھائی۔ چوکیدار بولا ہم کی ایک ہی کہی ہم کا کچھ نام بھی ہے؟ آخر ہم نے چوکیدار کو اسی دم کچھ چٹا کر سیند دی۔ گھر میں گھسے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک پلنگ پر نواب صاحب سوتے ہیں اور دوسری پلنگ پر ان کی بیگم صاحبہ میٹھی نیند میں مست ہیں۔ مگر شمع روشن ہے۔ اپنے ساتھی سے اشارہ کیا کہ شمع کو گل کر دے۔ وہ ایسا گھبرایا کہ بڑے زور سے پھونک ماری۔ میں نے کہا خدا ہی خیر کرے، ایسا نہ ہو کہ نواب جاگ اٹھیں، تو لینے کے دینے پڑیں۔ آگے بڑھ کر میں نے بتی کو تیل میں کھسکا دیا، چلیے چراغ گل پگڑی غائب۔ بیگم صاحبہ کے سرہانے زیور کا صندوق رکھا تھا، مگر آڑ میں۔ ہم تو مہری کی زبانی کچا چٹھا سن چکے تھے، 'گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے' فوراً صندوق اٹھایا اور دوسرے ساتھی کو دیا کہ باہر پہنچائے۔ وہ کچھ ایسا گھبرایا کہ

مارے بوکھلاہٹ کے کانپنے لگا اور دھم سے گر پڑا۔ دھماکے کی آواز سنتے ہی نواب چونک پڑے۔ شیر بچہ سرہانے سے اٹھا، پینترے بدل بدل کر پھکیتی کے ہاتھ دکھانے لگے۔ میں نے ایک چاکی کا ہاتھ دیا اور جھٹ کمرے سے نکل، دیوار پر چڑھ، پچھواڑے کودا اور چور چور چلاتا ہوا ناکے باہر۔ وہ دونوں سر بوجھئے تو سیکھیئے تھے، پکڑ لیے گئے مگر واہ رے نواب! بڑا ہی دلیر آدمی ہے۔ دونوں کو گھیر لیا۔ وے تو جیل خانے گئے اور میں بے داغ بچ گیا۔ اب میں نے یہ پیشہ چھوڑا اور خون پر کمر باندھی۔ ایک مہینے میں کئی خون کیے۔ پہلے ایک سوداگر کے گھر میں گھس کر اسے چارپائی پر ڈھیر کردیا۔ جمع جتھا ہمارے باپ کی ہوگئی۔ پھر ریل پر ایک مالدار جوہری کا گلا گھونٹ ڈالااور جواہرات صاف اڑا لیے۔ تیسری دفعہ دو بنجارے سرائے میں اترے تھے۔ ہمیں خبر ملی کہ ان کے پاس سونے کی اینٹیں ہیں۔ ان کو سرائے ہی میں اَنتا عَفیل کرنا چاہا۔ بھٹیارے نے دیکھ لیا پکڑے گئے اور قیدخانے گئے۔ وہاں آٹھ دن رہے تھے نویں دن رات کو موقع پاکر کال کوٹھری کا دروازہ توڑا ایک برقنداز کا سر اینٹ سے پھوڑا، پہرے کے چوکیدار کو اسی کی بندوق سے شہید کیا اور صاف نکل بھاگے۔ اب سوچا کوئی نیا پیشہ اختیار کریں، سوچتے سوچتے سوجھی کہ شاہ جی بن جاؤ۔ چٹ فقیروں کا بھیس بدل کر ایک پیڑ کے نیچے بستر جما دیا۔ پجنے لگے۔ ایک دن اس گاؤں کے ٹھاکر کا لڑکا بیمار ہوا۔ یہاں حکیم نہ ڈاکٹر! کسی نے کہہ دیا کہ ایک فقیر پکریا کے نیچے بیٹھے خدا کو یاد کیا کرتے ہیں، چہرے سے نور برستا ہے، کسی سے لیتے ہیں نہ دیتے ہیں۔ ٹھاکر نے سنتے ہی اپنے بھائی کو بھیجا۔ ہم ساتھ گئے۔ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے کہ آج پالا ہمارے ہاتھ رہا، تو عمر بھر چین سے گزرے گی۔ ہمارا پہنچنا تھا کہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم کسی سے بولے نہ چالے، جاکر لڑکے کے پاس بیٹھ گئے اور کچھ بدبداکر اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھا، لڑکے کا برا حال ہے، بچنا محال ہے۔ ٹھاکر قدموں پر گر پڑا۔ ہم نے پیٹھ ٹھونکی اور لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے چل دیے۔ سنیوگ سے ایک یورپین ڈاکٹر دورہ کرتا ہوا اس گاؤں میں آیا اور اس کی دوا سے مریض چنگا ہوگیا۔ اب مزہ دیکھیے، ڈاکٹر کا کوئی نام بھی نہیں لیتا، سب ہماری تعریف کرتے ہیں۔ ٹھاکر نے ہمیں ایک ہاتھی اور ہزار روپے دیے۔ یہ ہم نے قبول نہ کیا۔ سبحان اللہ پھر تو ہوابندھ گئی۔ اب چاروں طرف ہم ہی ہم ہیں، کوئی بیمار ہو، تو ہم پوچھے جائیں، کوئی مرے تو ہم بلائے جائیں، میاں بیوی کے جھگڑوں میں ہم قاضی بنتے ہیں، باپ بیٹے کا جھگڑا ہم فیصلہ کرتے ہیں۔ صبح سے

شام تک ڈالیوں پر ڈالیاں آتی رہتی ہیں۔

آزاد نے یہ قصہ سن کر شاہ جی کو خوب ڈانٹا، تو کافر ہے، ملعون ہے، تو اپنی مکاری سے خدا کے بندوں کو ٹھگتا ہے، اب ہماری بات سن، ہمارا چیلہ بن جا، تو تجھے چھوڑ دیں۔ کل تڑکے گجردم گاؤں بھر میں کہہ دے کہ ہمارے پیر آئے ہوئے ہیں۔ دو سو گیارہ برس کی عمر بتانا۔ جسے زیارت کرنی ہو آئے، شاہ جی کی باچھیں کھل گئیں کہ چلو، کسی طرح جان تو بچی۔ نور کے تڑکے گاؤں بھر میں پکار آئے کہ ہمارے پیر آئے ہیں، جسے دیکھنا ہو، دیکھ لے، شاہ جی کی تو وہاں دھاک بندھی ہی تھی، جب لوگوں نے سنا کہ ان کے بھی ولی کھنگڑ آئے ہیں تو شوق چرایا کہ زیارت کو چلیں۔ دو دن اور دو رات میاں آزاد اپنے گھر پر آرام کرتے رہے۔ تیسرے دن فقیرانہ بھیس بدلے ہوئے ہرے ہرے پیڑوں کے سائے میں آ بیٹھے۔ دیکھتے کیا ہیں پو پھٹتے ہی عورت مرد، ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہوگئے۔ ہندو اور مسلمان، جوان عورتیں، گہنوں سے لدی ہوئی آ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ تب آزاد نے کھڑے ہوکر قرآن کی آیتیں پڑھنی شروع کیں اور بولے، اے خدا کے بندو، میں کوئی ولی نہیں ہوں، تمھاری ہی طرح خدا کا ایک ناچیز بندہ ہوں، اگر تم سمجھتے ہو کہ کوئی انسان چاہے کتنا ہی بڑا فقیر کیوں نہ ہو خدا کی مرضی میں دخل دے سکتا ہے، تو تمھاری غلطی ہے۔ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہوتا ہے۔ ہمارا فرض یہی ہے کہ تمھیں خدا کی یاد دلائیں۔ اگر کوئی فقیر، کوئی کرامات دکھا کر، اپنا سکہ جمانا چاہتا ہو تو سمجھ لو کہ وہ مکار ہے، جاؤ اپنا اپنا دھندا دیکھو۔

(6)

میاں آزاد منہ اندھیرے تاروں کی چھاہ میں بستر سے اٹھے تو سوچے، سانڈنی کے گھاس چارے کو فکر کرکے ذرا عدالت اور کچہری کی بھی دو گھڑی سیر کر آئیں۔ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں ایک گھنا باغ ہے اور پیڑوں کی چھاہ میں میلہ سا لگا ہے۔ کوئی حلوائی سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے کوئی مداریوں کو تازہ کر رہا ہے۔ کنجڑے پھلوں کی ڈالیاں لگائے بیٹھے ہیں۔ پان والے کی دکان پر وہ بھیڑ ہے کہ کھڑے ہونے کی جگہ نہیں ملتی۔ چورن والا چورن بیچ رہا ہے۔ ایک طرف ایک حکیم صاحب دواؤں کی پڑیا پھیلائے جریان کی دوا بیچ رہے ہیں۔ بیسوں منشی متصدی چٹائیوں پر بیٹھے عرضیاں لکھ رہے ہیں۔ مستغیث ہیں کہ ایک ایک کے پاس دس دس

بیٹھے قانون چھانٹ رہے ہیں، ارے منشی جی، یوں کا انٹ سنٹ چکٹھیاں سی کھنچایے دہو؟ ہم تو اپنا مضمون بتاوت ہیں، تم اپنے اڑھائی چاؤر الگ چراوت ہو۔ لے مور منشی جی، تنک اس سوچ وچار کے لکھو کہ فریق ثانی کیار مقدمہ ڈھسمسائے جائے۔ لے تو ہار گوڑ دھرت ہے دوئی کچا آوٗر لے لیو۔ آزاد نے جو گواہ گھر کی اُور رخ کیا تو سبحان اللہ، کالے کالے چوغوں کی بہار نظر آئی۔ کوئی ادھر سے ادھر بھاگا جاتا ہے، کوئی مسند لگائے بیٹھا گنواروں سے ڈینگ مار رہا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھے تھے کہ چپراسی نے کڑک کر آواز لگائی، ستار خاں حاضر ہے! ایک فینچی کے پاؤں لڑکھڑائے، سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے دھم سے نیچے۔ ایک ٹھٹھول نے کہا واہ جناب گرے تو مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا؟ آزاد ذرا اور آگے بڑھے تو ایک آدمی نے ڈانٹ بتائی، کون ہو؟ کیا کام ہے؟

آزاد : اسی شہر میں رہتا ہوں، ذرا سیر کرنے چلا آیا۔

آدمی : کچہری میں کھڑے رہنے کا حکم نہیں ہے، یہاں سے جائیے، ورنہ چپراسی کو آواز دیتا ہوں۔

آزاد : بگڑیے نہیں، بس اتنا بتا دیجیے کہ آپ کا عہدہ کیا ہے؟

آدمی : ہم امیدواری کرتے ہیں۔ تین مہینے سے روز یہاں کام سیکھتے ہیں۔ اب فراٹے اڑاتے ہوں، ڈاکیٹ تڑ سے لکھ لوں، نقشہ چٹکیوں میں بناؤں۔ کسی کام میں بند نہیں۔ پندرہ روپے کی نوکری ہمیں ملا ہی چاہتی ہے۔ مگر پہلے تو گھاس چھیلنا مشکل معلوم ہوتا تھا اب لقمان بن گیا۔

آزاد : کیوں میاں، تمھارے والد کہاں نوکر ہیں؟

امیدوار : جناب، وہ نوکر نہیں ہیں دس گاؤں کے زمیندار ہیں۔

آزاد : کیا تم کو گھر سے نکال دیا، یا کچھ کھٹ پٹ ہے؟

امیدوار : تو جناب ہم پڑھے لکھے ہیں کہ نہیں!

آزاد : حضرت جسے کھانے کو روٹیاں نہ ہوں وہ ستو باندھ کر نوکری کے پیچھے پڑے تو مضائقہ نہیں۔ تم خدا کے کرم سے زمین دار ہو، روپے والے ہو، تم کو یہ کیا سوجھی کہ دس پانچ کی نوکری کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہو؟ اسی سے تو ہندستان خراب ہے، جسے دیکھو نوکری پر عاشق۔ میاں کہا مانو اپنے گھر جاؤ گھر کا کام دیکھو، اس پھیر میں نہ پڑو۔ یہ نہیں کہ عمامہ

باندھا اور کچہری میں جوتیاں چٹکاتے پھرتے ہیں۔ محرر پر لوٹ، امانت پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

دوسرے امیدوار کی نسبت معلوم ہوا کہ ایک لکھ پتی مہاجن کا لڑکا ہے۔ باپ کی کوٹھی چلتی ہے۔ لاکھوں کا وارانیارا ہوتا ہے۔ بیٹا بارہ روپے کی نوکری کے لیے سوسو چکر لگاتا ہے۔ چوتھے درجے سے مدرسہ چھوڑا اور اپرینٹس ہوئے۔ کام خاک نہیں جانتے۔ باہر جاتے ہیں تو منصرم صاحب سے پوچھ کر۔ اس وقت جب دفتر والے اپنے اپنے گھر جانے لگے تو حضرت پوچھتے کیا ہیں کیوں جی یہ سب چلے جاتے ہیں اور ابھی چھٹی کی گھنٹی تو بجی ہی نہیں۔ اسکول کی گھنٹی یاد آگئی۔

میاں آزاد دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ یہ کم سن لڑکے، پندرہ سولہ برس کا سن، پڑھنے لکھنے کے دن مدرسہ چھوڑا کالج سے منہ موڑا اور امیدواروں کے غول میں شامل ہوگئے۔ 'الف ب' نگاڑا، علم کو چنے کے کھیت میں پچھاڑا' محنت سے جان نکلتی ہے، کتاب کو دیکھ کر بخار چڑھ آتا ہے۔ جس سے پوچھو کہ بھائی مدرسہ کیوں چھوڑ بیٹھے تو یہی جواب پایا کہ اقلیدس کی عقل سے نفرت ہے۔ تواریخ کسے یاد رہے، یہاں تو گھر کے بچوں کا نام نہیں یاد آتا۔ ہم بھی سوچے، کہاں کا جھنجھٹ، الگ بھی کرو چلتا دھندا کرو، جسے دیکھیے نوکری کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ زمیندار کے لڑکے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کچہری میں گھسوں، سوداگر کے لڑکے کو جی سے لگی ہے کہ کالج سے چپت ہوں اور کچہری کی کرسی پر جا ڈٹوں۔ اور محرر، منشی عملہ تو نوکری کے ہاتھوں بک ہی گئے ہیں۔ ان کی تو گھٹی ہی میں نوکری ہے۔ بابو بننے کا شوق ایسا چراتا ہے کہ عقل کو طاق پر رکھ کر غلامی کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں۔

یہ سوچتے ہوئے میاں آزاد اور آگے چلے، تو چوک میں آ نکلے۔ دیکھتے کیا ہیں پندرہ بیس کم سن لڑکے بستے لٹکائے، سلیٹیں دبائے، پرے جمائے، لپکے چلے آتے ہیں۔ پندرہ پندرہ برس کا سن اُٹھتی جوانی کے دن مگر کمر بہتر جگہ سے جھکی ہوئی، گالوں پر جھریاں، آنکھیں گڈھے میں دھنسی ہوئی۔ یہ جھکا ہوا سینہ، نئی جوانی میں یہ حال! بڑھاپے میں تو شاید اٹھ کر پانی بھی نہ پیا جائے گا۔ ایک لڑکے سے پوچھا، کیوں میاں تم سب کے سب اتنے کمزور کیوں دکھلائی دیتے ہو؟ لڑکے نے جواب دیا جناب طاقت کس کے گھر سے لائیں؟ دوا تو ہے نہیں کہ عطار کی دکان پر جائیں، دعا نہیں کہ کسی شاہ جی سے سوال کریں، ہم تو بنا موت ہی مرے۔ دس

برس کے سن میں تو بیوی چھم چھم کرتی ہوئی گھر میں آئی۔ چلیے اسی دن سے پڑھنا لکھنا چھپر پر رکھا۔ نئی دھن سوار ہوئی۔ تیرھویں برس ایک بچے کے اباجان ہوگئے۔ روٹیوں کی فکر نے ستایا۔ ہم دبلے پتلے نہ ہوں تو کون ہو؟ پھر اچھی غذا بھی میسر نہیں۔ آج تک کبھی دودھ کی صورت نہ دیکھی، گھی کا صرف نام سنتے ہیں۔

میاں آزاد دل میں سوچنے لگے، ان غریبوں کی جوانی کیسی برباد ہورہی ہے۔ اسی دھن میں ٹہلتے ہوئے حضرت گنج کی طرف نکل گئے، تو دیکھا ایک میدان میں دس پندرہ برس کے انگریزوں کے لڑکے اور لڑکیاں کھیل رہے ہیں۔ کوئی پیڑ کی ٹہنی پر جھولتا ہے کوئی دیوار پر دوڑتا ہے، دو چار گیند کھیلنے پر لٹو ہیں۔ ایک جگہ دیکھا دو لڑکوں نے ایک رسی پکڑ کر تانی اور ایک پیاری لڑکی بدن تول کر زمین سے اس پار اچک گئی۔ سب کے سب خوش اور تندرست ہیں۔ آزاد نے ان ہونہار لڑکوں اور لڑکیوں کو دل سے دعا دی اور ہندستان کی حالت پر افسوس کرتے ہوئے گھر آئے۔

(7)

میاں آزاد سانڈنی پر بیٹھے ہوئے ایک دن سیر کرنے نکلے، تو ایک سرائے میں جا پہنچے۔ دیکھا ایک برآمدے میں چار پانچ آدمی فرش پر بیٹھے دھوں دھار حقے اڑا رہے ہیں، گلوری چبا رہے ہیں اور غزلیں پڑھ رہے ہیں۔ ایک کوی نے کہا، ہم تینوں کے تخلص کا قافیہ ایک ہے۔ علاّمی، فہامی، اور حامی، مگر تم دو ہی ہو وقاد اور جواد، ایک شاعر اور آجائے تو دونوں طرف سے تین تین ہوجائیں۔ اتنے میں میاں آزاد تڑ سے پہنچ گئے۔

ایک نے پوچھا: آپ کون؟

آزاد: میں شاعر ہوں۔

آپ تخلص کیا کرتے ہیں؟

آزاد نے کہا: آزاد۔ تب تو ان سب کی باچھیں کھل گئیں۔ جواد، قواد اور آزاد کا تک مل گیا۔ اب لوگ غزلیں پڑھنے لگے۔ ایک آدمی شعر پڑھتا ہے باقی تعریف کرتے ہیں۔ سبحان اللہ، کیا طبیعت پائی ہے واہ واہ! پھر فرمایئے گا، قلم توڑ دیے، کتنی صاف زبان ہے۔ اس بول چال پر قربان، کوئی جھومتا ہے، کوئی ٹوپیاں اچھالتا ہے۔

آزاد : میاں سنو ہم شاعری کے قائل نہیں۔ آپ لوگ تو زبان پر مرتے ہیں اور ہم خیالوں پر جان دیتے ہیں۔ ہمیں تو نیچر کی شاعری پسند ہے۔

فہامی : اخاہ، آپ نیچریے ہیں! انیسے اور دبیریے تو سنتے تھے اب نیچریے پیدا ہوئے۔ غضب خدا کا! آپ کو ان استادوں کا کلام پسند نہیں آتا، جو اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے؟

آزاد : میں تو صاف کہتا ہوں یہ شاعری نہیں خبط ہے، بے تکاپن ہے، اس کا بھی کچھ ٹھکانا ہے، جھوٹ کے چھپر اڑا دیے۔ اب کان کھول کر نیچری شاعری سنو۔

یہ کہہ کر آزاد نے انگریزی کی ایک کویتا سنائی تو وہ قہقہہ پڑا کہ سرائے بھر گونج اٹھی۔

فہامی : واہ جناب واہ، اچھی گٹ پٹ ہے۔ اسی کو آپ شاعری کہتے ہیں؟

آزاد : 'شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ' بھینس کے آگے بین بجائے بھینس کھڑی پگورائے۔

آزاد تو نیچرل شاعری کی تعریف کرنے لگے ادھر وے پانچوں اردو کی شاعری پر لوٹ پوٹ تھے۔ آتش اور میر کی زبان، ناسخ، انیس، ذوق، غالب، مومن جیسے استادوں کے کلام پڑھ پڑھ کر سناتے تھے۔ اب بتائیے فیصلہ کون کرے؟ بھٹیارن جھگڑا چکانے سے رہی، بھٹیارا گھاس ہی چھیلنا جانے، آخر یہ رائے طے پائی کہ شہر چلیے۔ جو پڑھا لکھا آدمی پہلے ملے اسی کا فیصلہ سب کو منظور۔ سب نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ چلنے ہی کو تھے کہ بھٹیارن نے ان کو للکارا اور چمک کر میاں جواد کا دامن پکڑا۔ میاں، یہ بُتے کسی اور کو بتانا، ہم بھی اسی شہر میں بڑھ کر اتنے بڑے ہوئے ہیں۔ ہوں تو ابھی آپ کی لڑکی کے برابر مُل سینکڑوں ہی کنوؤں کا پانی پی ڈالا۔ پہلے کوڑی کوڑی بائیں ہاتھ سے رکھ جائیے پھر اسباب اٹھائیے۔

علامی : نیک بخت، ہم شریف بھلے مانس ہیں، شریف لوگ کہیں دو پیسے کے لیے ایمان بیچا کرتے ہیں؟ چلو دامن چھوڑ دو ابھی دم کے دم میں آئے۔

بھٹیارن : اس دام میں بندی نہ آئے گی۔ ایسے بڑے ساہوکار کھرے اسامی ہو تو ایک گنڈا چپکے سے نکال دو نا؟

وقاد : یہ مُرچیری ہے یا بھٹیارن؟ صاحب اس سے پیچھا چھڑاؤ، ایسی بھٹیارن تو کہیں دیکھی نہ سنی۔

بھٹیارن : میاں کچھ بیدھے تو نہیں ہوئے ہو یا بلی ناندھ کر گھر سے چلے تھے؟ چپکے

سے پیسے رکھ کر تب قدم اٹھائیے۔

میاں جواد سیدھے سادے آدمی تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مفت میں گھیرے گئے تو کہا بھائی تم پانچوں جاؤ، ہم یہاں بی بھٹیارن کی خاطر سے بیٹھے ہیں۔ تم لوگ نپٹ آؤ۔ وہ سب تو ادھر چلے اور جواد سرائے ہی میں بھٹیارن کی حراست میں بیٹھے مگر ایک آنے پیسے نہ دے سکے۔ دو چار منٹ کے بعد پکارا، بھٹیاری بھٹیاری، میں لیٹا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھارے پیٹ میں چوہے دوڑیں کہ رفو چکر ہوئے۔ پھر تین منٹ کے بعد گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے، بھٹیارن ہم بھاگنے والے اسامی نہیں ہیں تم مزے سے اپنی دال بگھارو۔ جب انھوں نے بار بار چھیڑنا شروع کیا تو وہ آگ بھبھوکا ہوگئی اور بولی میاں ایسے دو پیسے سے درگزری تم نے تو گل مچامچا کر میرا کلیجہ پکا دیا۔ آپ جائیں بلکہ کھٹیا سمیت دفن ہوں، تو میں خوش میرا اللہ خوش۔ اے واہ 'دیکھی تیری کالپی اور باون پورے اجاڑ' میاں ہوں تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی مُل ناک پر تو مکھی بیٹھنے نہیں دیتی۔

ادھر میاں جواد بھٹیارن سے چہل کر رہے تھے ادھر وے پانچوں آدمی سرائے سے چلے تو راستے میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔

حامی نے کہا: یا مولانا، ایک مسئلہ حل کیجیے تو احسان ہوگا۔

بزرگ: میاں، میں ایک جاہل، بے وقوف، بے سمجھ، گمراہ آدمی ہوں، مولانا نہیں۔ مولانا ہونا دشوار بات ہے۔ مجھے مولانا کہنا اس لفظ کو بدنام کرنا ہے۔

حامی: اچھا صاحب، آپ مولانا نہ سہی، منشی سہی، میاں سہی، آپ ایک جھگڑے کا فیصلہ کردیجیے، اور گھر کا راستہ لیجیے۔ آپ کا ہمارے بزرگوں پر احسان ہوگا۔ جھگڑا یہ ہے کہ یہ صاحب (آزاد کی طرف اشارہ کرکے) نیچری شاعری کے طرف دار ہیں، اور ہم چاروں اردو شاعری پر جان دیتے ہیں، اب بتلائیے ہم میں سے کون ٹھیک کہتا ہے اور کون غلط؟

بزرگ: یہ تو بہت غور کرنے کی بات نہیں۔ آپ چاروں مفت میں جھگڑا کرتے ہیں۔ آپ سیدھے اسپتال جائیے اور فصد کھلوائیے، شاعری پر جان دینا سمجھداروں کا کام نہیں۔ جان خدا کی دی ہوئی ہے اسی کی یاد میں لگانی چاہیے۔ باقی رہی دوسرے قسم کی شاعری، میں نے اس کا نام بھی نہیں سنا، اس کے بارے میں کیا عرض کروں؟

پانچوں آدمی یہاں سے نراش ہوکر آگے بڑھے تو ایک مکتب خانہ نظر سے گزرا۔ ٹوٹا پھوٹا

مکان، پرانی دھرانی دالان، دیواریں بابا آدم کے وقت کی۔ ایک مولوی صاحب لمبی داڑھی لٹکائے ہاتھ میں چھڑی لیے ہل ہل کر پڑھا رہے ہیں اور بیس پچیس لڑکے جدل قافیہ اڑا رہے ہیں۔ ایک لڑکے نے دوسرے کی چاند پر تڑ سے دھپ جمائی۔ مولوی صاحب پوچھتے ہیں ابے یہ کیا ہوا؟ لڑکے کہتے ہیں جی کچھ نہیں، تختی گر پڑی۔ ابے یہ تختی کی آواز تھی؟ جی ہاں، اور نہیں تو کیا؟ اتنے میں دو چار شریر لڑکوں نے منھ چڑھانا شروع کیا۔ دیکھیے مولوی صاحب، یہ منھ چڑھاتا ہے۔ نہیں مولوی صاحب یہ جھک مارتا ہے، میں تو باہر گیا تھا۔ غل غپاڑے کی آواز ایسی بلند ہے کہ آسمان کی خبر لاتی ہے، کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ جدھر دیکھو چل پوں، جوتی پیزار، مگر سب کے سب ہل ہل کر بڑبڑاتے ہیں۔ کتاب تو دو ہی چار پڑھ رہے ہیں، مگر واہی تباہی، اناپ شناپ بہتوں کی زبان پر ہے۔

ایک : آج شام کو میں بانے کی کن کیا ضرور لڑاؤں گا۔

دوسرا : آغاتقی کے باغ میں کوّا حلال ہے۔

تیسرا : ارے، مالی، تجھے گل بوٹے کی پہچان رہے۔

چوتھا : مولوی صاحب، گو پیر ہوئے، نادان رہے۔

پانچواں : پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب۔ کھیلوگے کودوگے، ہوگے نواب

مگر سب کی آوازیں ایسی مل جل گئی ہیں کہ خاصی سمجھ میں نہیں آتیں، کیا خرافات بکتے ہیں۔ لونڈے تو جدل قافیہ اڑا رہے ہیں ادھر مولوی صاحب مزے سے اونگھتے ہیں۔ جب نیند کھلی تو ایک لڑکے کو بلایا آؤ، کتاب لاؤ، سبق پڑھ لو۔ وہ سر کھجلاتا ہوا مولوی صاحب کے قریب جا بیٹھا، اور سبق شروع ہوا۔ مگر نہ تو لڑکے نہ کچھ سمجھا کہ میں نے کیا پڑھا اور نہ مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے کیا پڑھایا۔ دوپہر کے وقت لڑکے تختی لے کر بیٹھے، کوئی گیندے کی پتی تختی پر ملتا ہے کوئی کوڑی سے تختی کو چکناتا ہے۔ آدھے گھنٹے تک یہی ہوا کیا۔ پھر لڑکے لکھنے بیٹھے، مولوی صاحب کوٹھری سے مکھیوں کو نکال اور دروازہ بند کرکے سو رہے۔ یہاں خوب لپاڈگی ہوئی۔ دو گھنٹے کے بعد مولوی صاحب چونکے۔ کوٹھری کھولتے ہیں تو یہاں دو لڑکوں میں چٹ پٹ ہو رہی ہے۔ دونوں گتھے پڑے ہیں۔ نکلتے ہی ایک کے طمانچے لگانے شروع کیے۔ جو امیر کا لڑکا تھا اور مولوی صاحب کو تہواری اور جمعراتی خوب دیا کرتا تھا، اس سے تو نہ بولے، بیچارے غریب پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ آزاد نے دل میں کہا :

گر ہمی مکتب است و ایں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد
(اگر یہی مکتب ہے اور یہی مولوی تو لڑکے پڑھ چکے)

(8)

ایک دن میاں آزاد سرائے میں بیٹھے سوچ رہے تھے کدھر جاؤں کہ ایک بوڑھے میاں لٹھیا ٹیکتے آ کھڑے ہوئے اور بولے، میاں ذری یہ خط تو پڑھ دیجیے، اور اس کا جواب بھی لکھ دیجیے۔ آزاد نے خط لیا اور پڑھ کر سنانے لگے۔

میرے کھوسٹ شوہر، خدا تم سے سمجھے!

آزاد : واہ! یہ تو نرالا خط ہے، نہ سلام نہ بندگی، شروع ہی سے کوسنا شروع کیا۔

بوڑھا : جناب، آپ خط پڑھتے ہیں کہ میرے گھر کا قضیہ چکاتے ہیں؟ پرائے جھگڑے سے آپ کا واسطہ؟ جب میاں بیوی راضی ہیں تو آپ کوئی قاضی ہیں!

آزاد : اچھا، تو یہ کہیے کہ آپ کی بیوی جان کا خط ہے۔ لیجیے سنائے دیتا ہوں :

'میرے کھوسٹ شوہر، خدا تم سے سمجھے، سکندر پاتال سے پیاسا آیا، مگر تم نے امرت کی دو چار بوندیں ضرور پی لی ہیں جبھی مرنے کا نام نہیں لیتے۔ کچھ اوپر سو برس کے تو ہوئے اب آخر کیا عاقبت کے بوریے بٹوروگے؟ ذرا دل میں شرماؤ، ہزاروں نوجوان اٹھتے جاتے ہیں، اور تم ٹیاں سے موجود ہو۔ ڈنگوفیور بھی آیا، مگر تم مونچھوں پر تاؤ ہی دیتے رہے۔ ہیضے نے لاکھوں آدمی چٹ کیے مگر آپ تو ہیضے کو بھی چٹ کر جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ بخار میں ہزاروں حیادار چل بسے مگر تم اور بھی موٹے ہوگئے۔ تمھیں لقوہ بھی نہیں مارتا، لو کے جھونکے بھی تمھیں نہیں جھلساتے، دریا میں بھی تم نہیں پھسل جاتے اور سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ اگر حیادار ہوتے تو ایک چلّو کافی تھا، مگر تم وہ چکنے گھڑے ہو کہ تم پر چاہے ہزاروں ہی گھڑے پڑیں لیکن ایک بوند نہ تھم سکے۔ واہ پٹھے کیوں نہ ہو! کس بری سائت میں تمھارے پالے پڑی۔ کس بری گھڑی میں تمھارے ساتھ بیاہ ہوا۔ ماں باپ کو کیا کہوں مگر میری گردن تو کُند چھری سے ریت ڈالی۔ اس سے تو کسی کنویں ہی میں ڈھکیل دیتے، قصائی ہی کے حوالے کردیتے، تو یہ روز روز کا کڑھنا تو نہ ہوتا۔ تم خود انصاف کرو۔ تمھارے بوڑھ بھس سے مجھ پر کیا گاج

پڑی۔ ہاتھ تو آپ کے کانپتے ہیں، پاؤں میں سکت نہیں، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، کمر کمان کی طرح جھکی ہوئی، آنکھوں کی یہ کیفیت کہ دن کو اونٹ نہیں سوجھتا۔ لاٹھی ٹیک کر دس قدم چلے بھی تو سانس پھول گئی، دم ٹوٹ گیا۔ ستانے بیٹھے تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ صبح کو ننھی ننھی دو چپاتیاں کھالیں تو شام تک کھٹی ڈکاریں آرہی ہیں، تولہ بھر سکنجبین کا ستیاناش کیا۔ مگر ہاضمہ ٹھیک نہ ہوا۔ حافظے کا یہ حال ہے کہ اپنے باپ کا بھی نام یاد نہیں۔ پھر سوچو تو کہ بیاہ کرنے کا شوق کیوں چرایا۔ ایک پاؤں تو قبر میں لٹکایا ہے اور خیال یہ گدگدایا ہے کہ دلہا بنیں، دلہن لائیں۔ خدا قسم جس وقت تمھارا پوپلا منہ، سفید بھوں، گالوں کی جھریاں، دوہری کمر، گنجی چاند اور منحوس صورت یاد آتی ہے تو کھانا حرام ہوجاتا ہے۔ واہ بڑے میاں واہ! خدا جھوٹ نہ بلائے تو ہمارے اباجان سے پچاس ساٹھ برس بڑے ہوں گے اور اماں جان کو تم نے گود میں کھلایا ہو، تو تعجب نہیں، خدا گواہ ہے تم میرے دادا کے باپ سے بھی بڑے ہو، مگر واہ ری قسمت، کہ آپ میرے شوہر ہوئے، زمین پھٹ جائے، تو میں دھنس جاؤں۔
تمھاری جوان بیوی

آزاد : جناب، اس کا جواب کسی بڑے منشی سے دلوائیے۔

بوڑھا : بڑھاپے میں اب کبھی شادی نہ کریں گے۔

آزاد : واہ کیا ابھی شادی کرنے کی ہوس باقی ہے؟ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔

بوڑھا : اب اس کا ایسا جواب لکھیے کہ دانت کھٹے ہوجائیں۔

آزاد : آپ عورت کے منہ ناحق لگتے ہیں۔

بوڑھا : جناب اس نے تو میری ناک میں دم کر دیا اور سچ پوچھو تو جس دن اس کو بیاہ لائے ناک ہی کٹ گئی۔ ایسی چنچل عورت دیکھی نہ سنی، مجال کیا کہ ناک پر مکھی بیٹھ جائے۔

آخر آزاد نے پتر کا جواب لکھا۔

'میری البیلی، چھیل چھبیلی، نادان بیوی کو اس کے بوڑھے شوہر کی اٹھتی جوانی دیکھنی نصیب ہو۔ وہ جگ جگ جیے اور تم پوتوں پھلو، دودھوں نہاؤ، اٹھارہ لڑکے ہوں اور اٹھارہ دنی چھتیں چھوکریاں۔ جب میں دالان میں قدم رکھوں تو سب بچے ابا آئے، ابا جان آئے، کھلونے لائے، پٹاخے لائے، کہہ کر دوڑیں۔ مگر ڈر یہ ہے کہ تم بھی ابھی کم سن ہو، ان کی دیکھا دیکھی کہیں مجھے ابا نہ کہہ اٹھنا کہ پاس پڑوس کی عورتیں مجھے انگلیوں پر نچائیں۔ مجھے تم

سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی کو اپنی بیٹی سے ہوتی ہے۔ اپنی نانی کو میں ایسا پیارا نہ تھا جتنی تم مجھے پیاری ہو، اور کیوں نہ ہو تمھاری پردادی کو میں نے گودیوں میں کھلایا ہے اور میری بہن نے اسے دودھ پلایا ہے۔ مجھے تمھاری دادی کا گڑیا کھیلنا اس طرح یاد ہے جیسے کسی کو صبح کا کھانا یاد ہو۔ تمھارے خط نے میرے دل کے ساتھ وہ کیا جو بجلی کھلیان کے ساتھ کرتی ہے لیکن مجھ میں ایک بڑی صفت یہ ہے کہ پرلے سرے کا بے حیا ہوں، اور کیوں نہ ہو شرم عورتوں کو چاہیے میں تو چکنا گھڑا ہوں۔ مانا کہ آنکھوں میں نور نہیں مگر نگاہ بڑی باریک رکھتا ہوں، بہرا سہی لیکن مطلب کی بات خوب سنتا ہوں، بڈھا ہوں کمزور ہوں، مگر تمھاری محبت کا دم بھرتا ہوں۔ تمھارا پیارا پیارا مکھڑا رسیلی انکھیاں، گوری گوری بہیاں جس وقت یاد آتی ہیں کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ تمھارا چاندنی رات میں نکھر کر نکلنا، کبھی مسکرانا کبھی کھلکھلانا، کتنا شرمانا؟ کیسا لجانا؟ اور تو اور تمھاری پھرتی سے دل لوٹ پوٹ ہے، کلیجے پر چوٹ ہے۔ تمھارا پھرئی کی طرح چاروں اُور گھومنا، موروں کی طرح جھومنا، کبھی کھیلتے کھیلتے میری چپت گاہ پر ٹیپ جمائی، کبھی شوخی سے وہ ڈانٹ بتائی کہ کلیجہ کانپ اٹھا، کبھی آپ ہی آپ رونا، کبھی دن دن بھر سونا، الھڑپن کے دن، بارہ برس کا سن، بیوی جان تم پر قربان، لے کہا مانو ہمیں غنیمت جانو، میں صبح کا چراغ ہوں، ہوا چلے یا نہ چلے اب گل ہوا، اب گل ہوا۔ ڈوبتا ہوا آفتاب ہوں، اب ڈوبا اب ڈوبا۔ مجھے ستانا، موئے پر سو دُرے۔ تم خوب جانتی ہو کہ میری باتیں کتنی میٹھی ہوتی ہیں۔ ستر برس ہوگئے کہ دانت چوہے لے گئے، تب سے حلوے پر بسر ہے، پھر جو روز حلوہ کھائے گا، اس کی باتیں میٹھی کیوں نہ ہوں گی۔ تم لاکھ روٹھو، پھر بھی ہماری ہو، بیوی ہو، وہ شُبھ گھڑی یاد کرو جب ہم دلہا بنے، پرانے سر پر نئی پگڑی جمائے، سہرا لٹکائے، مہندی لگائے، مرغی کے برابر گھوڑیا پر سوار، میٹھی پوئی، جاتے تھے۔ اور تم دلہن بنی، سولہ سنگار کیے پالکی میں سے جھانک رہی تھیں۔ ہمارے گالوں کی جھریاں، ہمارا پوپلا منھ، ہماری ٹیڑھی کمر دیکھ کر خوش تو نہ ہوئی ہوگی؟ اور کیا لکھوں ایک نصیحت یاد رکھو ایک تو میلے ٹھیلے نہ جانا، دوسرے آس پاس کی چھوکریوں کو گوئیاں نہ بنانا۔ خدا کرے جب تک زمین اور آسمان قائم ہے تم جوان رہو، اور نادان رہو، ہمارے سفید بال تمھیں بھائیں، حاسد کھار کھائیں۔

تمھارا بوڑھا شوہر

بوڑھا: ماشاء اللہ! آپ نے خوب لکھا، مگر اس خط کو لے کون جائے؟ اگر ڈاک سے

بھیجتا ہوں تو گم ہونے کا ڈر، اس پر تین دن کی دیر، اگر آپ اتنا احسان کریں کہ اسے وہاں پہنچا دیں تو کیا پوچھنا۔

آزاد سیلانی تو تھے ہی سمجھے کیا ' ج ہے، سانڈنی موجود ہے، اسی بہانے ذرا دل لگی دیکھ آؤں۔ کچھ بہت دور بھی نہیں سانڈنی پر مشکل سے دو گھنٹے کی راہ ہے۔ بولے آپ بزرگ آدمی ہیں آپ کا حکم بجا لانا میرا فرض ہے، لیجیے جاتا ہوں۔

یہ کہہ کر سانڈنی پر بیٹھے اور چھن چھن کرتے جا پہنچے۔ دروازے پر آواز دی، تو ایک کہارن نے باہر نکل کر پوچھا، میاں کون ہو، کہاں سے آنا ہوا، کس کی تلاش ہے؟

آزاد : بی مہری صاحبہ، سلام، ہم مسافر پردیسی ہیں۔

کہارن : واہ! اچھے آئے میاں، یہ کیا کچھ سرائے ہے؟

آزاد : خدا کے لیے بیگم صاحبہ سے کہہ دو کہ بڑے میاں نے خط بھیجا ہے۔

مہری نے ایک چوکڑی بھری تو گھر کے اندر تھی۔ جا کر بولی بی بی میاں کے پاس سے ایک صاحب آئے ہیں خط لائے ہیں۔

وہ چونک اٹھی : چل جھوٹی، کسی اور کو جا کر اڑانا، یہاں کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میاں کسی قبرستان میں میٹھی نیند سو رہے ہوں گے کہ خط بھیجیں گے؟

مہری : ذرا جھروکھے سے جھانکیے تو، وہ کیا سامنے کھڑے ہیں۔

بیگم صاحبہ جھروکھے کی طرف چلیں تو اپنی بوڑھی اماں کو آئینہ سامنے رکھے بال سنوارتے دیکھا۔ چھیڑ کر بولیں اے اماں، آج تو بے طور چوٹی کنگھی کی فکر ہے۔ کوئی گھورے تو انسان نکھار کرے۔ کوئی مرے تو آدمی شکار کرے۔ تم دو اوپر اسی برس کی ہوئیں مگر جوانی کی ہوس نہ گئی۔ خدا ہی خیر کرے۔

اماں : مجھ نصیبوں جلی کی قسمت میں یہی بدا تھا کہ بیٹی کی زبان سے ایسی ایسی باتیں سنوں۔ کوئی اور کہتی تو اس کی زبان نکال لیتی، لیکن تم تو میری آنکھوں کی پتلی ہو، ہائے ممتا بری چیز ہے! بیٹا تم یہ باتیں کیا جانو ابھی جوان ہو نادان ہو، بناوٹ سجاوٹ تو میری گھٹی میں پڑی تھی، اور میں نہ بنتی ٹھنتی تو تمھاری آنکھوں کو ترچھی چتون کون سکھاتا؟ باہر جاؤ، تمھارے میاں کا آدمی آیا ہے۔

بیوی نے جھروکھے سے جو دیکھا ایک آدمی سچ مچ کھڑا ہے، اور ہے بھی البیلا، چھیلا،

جوان، تو ترنت مہری کو بھیجا کہ جاکر انھیں بیٹھنے کے لیے کرسی نکال دے۔ آزاد تو کرسی پر بیٹھے اور چک کے ادھر آپ جا بیٹھیں۔ آزاد کی ان پر نگاہ پڑی تو تیر سا لگ گیا۔ کمر ایسی پتلی کہ سائے کے بوجھ سے بل کھائے، مکھڑا بن گھنے چاند کو لجائے، اس پر سیاہ ریشمی لباس اور حنا کی بوباس۔ جوبن پھٹا پڑتا تھا، نگاہ پھسلی جاتی تھی۔

مہری نے آزاد سے پوچھا، بڑے میاں تو آرام سے ہیں؟

آزاد : ہاں، میں ان کا خط لایا ہوں، اپنی بیگم صاحبہ سے میرا سلام کہو اور یہ خط ان کو دو۔

مہری : بیگم صاحبہ کہتی ہیں آپ خط لائے ہیں تو پڑھ کر سنا بھی دیجیے۔

آزاد نے خط پڑھ کر سنایا تو اس نازنین کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہوگیا۔ بنا کچھ کہے سنے جھمک کر وہاں سے اٹھیں اور اپنی ماں کے پاس آکر کھڑی ہوگئیں۔ امّی جان اس وقت چاندنی کی بہار دیکھنے میں مصروف تھیں۔ بولیں بیٹی، دیکھ تو کیا نور کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ چاند اس وقت دلہن بنا ہوا ہے؟

بیٹی : امّی جان، تمھاری بھی انوکھی باتیں ہیں۔ سردی کی چاندنی جیسے بوڑھے کی نصیبوں جلی بیوی کی جوانی۔ آج تو آسمان یوں ہی جھک جھک کر رہا ہے آج نکلا تو کیا، جب جانیں کہ اندھیرے گھپ میں شکل دکھائے۔ بوڑھیا تاڑ گئی۔ بولی۔ بیٹی ذری صبر کرو، اپنی جوانی کی قسم بڈھا تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے، آج موا کل دوسرا دن، پھر ہم تم کو کسی اچھے گھر بیاہیں گے۔ اب کی خدائی بھر کی خاک چھان کر وہ ڈھونڈھ نکالوں، جو لاکھوں میں ایک ہو، صبح شام خبر آنا ہی چاہتی ہے کہ بڈھا چل بسا۔

یہ سن کر بیٹی کھلکھلاکر ہنس پڑی۔ بولی اماں جب تم اپنی جوانی کی قسم کھاتی ہو تو مجھے بے اختیار ہنسی آتی ہے۔تم تو اپنے کو بالکل ننھی ہی سمجھتی ہو۔ کروڑوں تو آپ کے گالوں پر جھریاں، بگلے کے پر کا سا سفید جُوڑا، سر گھڑی کا کھٹکا بنا ہوا، کمر ٹیڑھی، مگر مہندی کا لگانا نہ چھوٹا نہ چھوٹا۔ رنگین دوپٹہ ہی عمر بھر اوڑھا، جب دیکھو کنگھی چوٹی سے لیس، خدا قسم ایسی ان گڑھ بوڑھی دیکھی نہ سنی۔

بڑھیا نے ٹوئیاں طوطے کی طرح پوپلے منھ سے کہا۔ پیاری تمھاری باتوں سے مجھے ہول ہوتا ہے، اللہ میری بچی پر رحم کھائے، بوڑھے کے مرنے کی خبر سنائے۔

مہری : بڑی بیگم، آپ کے نمک کی قسم، صاحب زادی کو آپ کا دل و جان سے پیار ہے، مگر بھولی نادان ہیں، جو اناپ شناپ منہ میں آیا کہہ سنایا۔ الّڑھ پن کے تو ان کے دن ہی ہیں، جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، نیک بد اونچ نیچ کیا جانیں۔ جب سیانی ہوں گی تو شعور آپ ہی آپ سیکھ جائیں گی۔ بڑھیا نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہا جو مجھے ان کی باتوں میں رنج ہوا ہو تو خدا مجھے جنت نہ دے۔ مگر کروں کیا برا تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ کو یہ آئے دن طعنے دیتی ہے کہ تم بڑھیا ہو، بڑھاپے میں نکھرتی کیوں ہو؟ میں کس سے کہوں کہ اس کے غم نے میری کمر توڑ ڈالی، اس کو کڑھتے دیکھ کر گھلی جاتی ہوں، نہیں میرا ابھی سن ہی کیا ہے! اچھا تو ہی ایمان سے کہہ کوئی اور بھی مجھے بوڑھی کہتا ہے؟

مہری دل میں تو ہنستی تھی کہ انھیں، جوان بننے کا شوق چرایا ہے، حوّا کے ساتھ کھیلی ہوں گی مگر ابھی ننھی ہی بنی جاتی ہیں لیکن چھٹی ہوئی عورت تھی بات بناکر بولی اے توبہ، بڑھاپے کی آپ میں تو چھاہ بھی نہیں۔ میرا اللہ جانتا ہے جب آپ اور بٹیا کو کوئی ساتھ دیکھ لیتا ہے تو پہلے آپ پر نظر پڑتی ہے پیچھے ان پر۔ بلکہ ایک موئی دل جلی نے پرسوں چٹکی لی تھی کہ 'چھوٹی بی تو چھوٹی بی، بڑی بی سبحان اللہ' لڑکی تو خیر اس کی ماں نے تو خوب کاٹھی پائی ہے۔ آپ کا چہرہ کندن کی طرح دمکتا ہے، جو دیکھتا ہے ترستا ہے۔

بڑھیا تو کھل گئی لیکن بیٹی جل اٹھی۔ کڑک کر بولی چل چپ خوشامدن، اللہ کرے تیرا میاں بھی میرے میاں کا سا بوڑھا ہو جائے۔ اور تم خوشامد نہ کرو تو کھاؤ کیا؟ اماں پر لوگوں کی نظر پڑتی ہے! جھوٹے پر شیطان کی پھٹکار۔ بوڑھی عورت کچھ اوپر سو برس کا سن، لٹھیا ٹیک کر دس قدم چلتی ہیں تو گھٹنوں ہانپا کرتی ہیں۔ دن کو اونٹ اور سارس نہیں سوجھتا، ان کے بوڑھے نخرے دیکھ کر ہم کو ہنسی آتی ہے۔ جی جلتا ہے کہ یہ کس برتے پر اتراتی ہیں، منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، بھلا کمر تو میرے سبب سے جھک گئی اور دانت کیا ہوئے؟

آخر، مہری نے اسے سمجھا بجھا کر بات ٹال دی، اور بولی وہ میاں باہر بیٹھے ہیں ان کے لیے آپ کیا کہتی ہیں۔ اس نے مہری کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہاں سے اٹھ کر بغیچہ میں آئی اور اٹھلا اٹھلا کر ٹہلنے لگی۔ بال بکھرے ہوئے، یہی معلوم ہوتا تھا کہ سانپ لہرا رہا ہے۔ کمر لاکھوں بل کھا رہی ہے۔ میاں آزاد نے چق کی درازوں سے جو اسے بے نقاب دیکھا تو تن سے جان نکل گئی۔ کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔ سنجوگ سے اس رمنی نے ان کو کہیں دیکھ لیا

کہ آنکھیں سینک رہے ہیں اور دور ہی سے جوبن لوٹ رہے ہیں تو بدن کو چھپائے، آنکھیں چرائے، بجلی کی طرح لونک کر نظر سے غائب ہوگئی۔ آزاد حیران کہ اب کیا کروں۔ آخر دل کی بے قراری نے ایسا مجبور کیا کہ آٹھ آٹھ آنسو رو کر یہ غزل گانے لگے۔

کیا جانیے کہ وصل میں کیا بات ہوگئی
آنکھیں نہیں ملاتے ہیں شرمائے جاتے ہیں
دل میرا لے کے کیا کہیں بھول آئے ہیں حضور؟
کھوئے ہوئے سے آپ جو کچھ پائے جاتے ہیں
کالے ڈسیں جو زلف تمھاری کبھی چھوئیں
لو اب تمھارے سر کی قسم کھائے جاتے ہیں

تمکنت کو نہ کام فرماؤ
ایک نظر مڑ کے دیکھتی جاؤ
عاشقوں سے نہ اس قدر شرما
ایک نگاہ کے لیے نہ آنکھ چرا
جانِ جاں، کچھ ترس نہ کھاؤ گی؟
یوں تڑپتا ہی چھوڑ جاؤ گی؟

وہ ان ایسوں کی کب سننے والی تھی، مڑکر دیکھنا گالی تھی، آزاد نے جب دیکھا کہ یہاں دال گلنے کی نہیں۔ کوئی یوں ٹہلتے ہوئے دیکھ لے تو لینے کے دینے پڑیں تو بیچارے روتے ہوئے گھر سے باہر آئے۔

اُدھر اس نازنین نے جوانی کی امنگ میں یہ ٹھمری بھیروی کی دھن میں لہرا لہرا کر گائی :

پیا کے آون کی بھئی بریاں، دروزوا ٹھاڑھی رہوں ۔
مورے پیا کو بیگی لے آؤ ری، نکست جیرا جائے
پیا دروزوا ٹھاڑھی رہوں

اس کے جواب میں ان کی اماں جان ٹیپ دار آواز میں کیا کہتی ہیں :

جوبنواں ہو چار دنا رہیوں ساتھ

جوبن رِتو جات سبھی مکھ مورت، قدر نہ پوچھے بات رے

جوبنواں ہو چار دِنا ڈھوں ساتھ

میاں آزاد نے چلتے چلاتے باہر سے یہ تان لگائی

تیرے نینوں نے مجھے مارا رسیلی متواریوں نے جادو ڈارا۔

مہری نے دیکھا کہ سب نے اپنے اپنے حال کے مطابق ہانک لگائی ایک میں ہی پھسڈی رہ گئی تو وہ بھی کفن پھاڑ کر چیخ اٹھی۔

جاؤ جاؤ، کاہے ٹھاڑھے ڈارے گل باہیں رے؟

گھیرے رہتے نت میرے جیسے چھائی رے

جانت ہوں جو ہم سے چھت ہو

ناحق اتنی ونتی کرت ہو

'قدر' کرت ہو ارے ناہیں ناہیں رے

جاؤ چلو کاہے ٹھاڑھے ڈارے گل باہیں رے

(9)

آزاد کو نواب صاحب کے دربار سے چلے مہینوں گزر گئے، یہاں تک کہ محرم آ گیا۔ گھر سے نکلے تو دیکھتے کیا ہیں، گھر گھر کہرام مچا ہوا ہے، سارا شہر حسین کا ماتم منا رہا ہے۔ جدھر دیکھیے تماشائیوں کی بھیڑ، مجلسوں کی دھوم، تعزیہ خانوں میں چہل پہل اور امام باڑوں میں بھیڑ بھاڑ ہے۔ لکھنؤ کی مجلسوں کا کیا کہنا! یہاں کے مرثیے پڑھنے والے روم اور شام تک مشہور ہیں۔ حسین آباد کا امام باڑہ چودھویں رات کا چاند بنا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک دوست بھی ہو لیے تھے۔ ان کی بے قراری کا حال نہ پوچھیے۔ وہ لکھنؤ سے واقف نہ تھے، لوٹے جاتے تھے کہ ہمیں لکھنؤ کا محرم دکھا دو، مگر کوئی جگہ چھوٹنے نہ پائے۔ ایک آدمی نے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا میاں اب وہ لکھنؤ کہاں ہے، وے لوگ کہاں؟ وے دن کہاں؟ لکھنؤ کا محرم رنگیلے پیا جان عالم کے وقت میں البتہ دیکھنے قابل تھا۔ جب دیکھو بانکوں کی تلوار میان سے دو انگل باہر۔ کسی نے ذرا تیکھی چتون کی، اور انھوں نے کھٹ سے سروہی کا تلا ہوا ہاتھ چھوڑا، بھنڈارا کھل گیا۔ ایک ایک گھنٹے میں بیس بیس وارداتوں کی خبر آتی تھی، دکاندار جوتیاں چھوڑ چھوڑ کر

سنک جاتے تھے۔ وہ دھکم دھکا، وہ بھیڑ بھڑاکا ہوتا تھا کہ واہ جی واہ! انتظام کرتا خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ اب کوئی چوں بھی نہیں کرتا، تب چھوٹے چھوٹے آدمی ہزاروں لٹاتے تھے، اب کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا۔ اب نہ انیس ہیں نہ دبیر، نہ ضمیر ہیں، نہ دلگیر۔

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا باغ، جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

دبیر کا کیا کہنا تھا، ایک بند پڑھا اور سننے والے لوٹ گئے۔ انیس کو خدا بخشے، کیا کمال تھا، گویا جواہرات کے ٹکڑے ہوں۔ لیکن ہاتھی لوٹے گا بھی تو کہاں تک! اب بھی اس شہر کی ایسی تعزیہ داری دنیا بھر میں کہیں نہیں ہوتی۔

آزاد اور ان کے دوست چلے جاتے تھے۔ راہ میں وہ بھیڑ تھی کہ کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ ہوا بھی مشکل سے جگہ پاتی تھی۔ غریب امیر، بوڑھے جوان اُمڈے چلے آتے ہیں۔ جدھر دیکھو، نرالی ہی سج دھج۔ کوئی حسین کے ماتم میں ننگے ہی سر چلا جاتا ہے کوئی ہرا ہرا جوڑا پھڑکاتا ہے۔ حسینوں کی ماتمی پوشاک، بکھرے ہوئے بال، کبھی لجانا، کبھی مسکرانا، شہدوں کا سو سو چک پھیریاں لگانا، تماشائیوں کی باتیں، دیہاتنیں ہندی لگائے، پھریا پھڑکائے، گوند سے پٹیا جمائے باتیں کر رہی ہیں۔ لیجیے آغا باقر کے امام باڑے میں کھٹ سے داخل۔ واہ میاں باقر، کیوں نہ ہو نام کر گئے۔ چکاچوندھ کا عالم ہے۔ لیکن گلی تنگ، تماشائیوں کی عقل دنگ۔ مگر لوگ گھس پیٹھ کر دیکھ ہی آتے ہیں۔ ناک ٹوٹے یا سر پھوٹے آغا باقر کا امام باڑہ ضرور دیکھیں گے۔

دونوں آدمی وہاں سے آگے بڑھے تو کچے پل پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں، ایک بابا آدم کے زمانے کے بوڑھے اگلے وقتوں کے لوگوں کو رو رہے ہیں۔ واہ واہ! لکھنؤ کے کمہار، کیا کمال ہیں؟ بوڑھا ایسا بنایا کہ معلوم ہوتا ہے پوپلے منھ سے اب بولا، اور اب بولا۔ وہی سن کے سے بال، وہی سفید بھوئیں، وہی چتون، وہی ماتھے کی شکن، وہی ہاتھوں کی جھریاں، وہی ٹیڑھی کمر، وہی جھکا ہوا سینہ۔ واہ رے کاریگر، تو بھی اپنے فن میں یکتا ہے۔ وہاں سے جو چلے تو داروغہ واجد علی کے امام باڑے میں آئے۔ یہاں سورج مکھی پر وہ جوبن تھا کہ آفتاب اگر ایک نظر

چھپ کر دیکھ پاتا تو شرم کے مارے منہ چھپا لیتا۔ بے دھڑک جاکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ الاپچی چکنی ڈلی پیش کی گئی۔ وہاں سے حسین آباد پہنچے۔ سبحان اللہ یہ امام باڑہ ہے یا جنت کا مکان! کیا سجاوٹ تھی، برجوں پر قندیلیں روشن تھیں، میناروں پر شمع جلتی ہوئی، چراغوں کی قطار، ہوا کے جھونکوں سے لہرا لہرا کر عجب سماں دکھاتی تھی۔ نہر جو دیکھی تو آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔

اب ان کے دوست کو شوق چرایا کہ طوائفوں کے امام باڑوں کی زیارت کریں۔ پہلے میاں آزاد جھجھکے اور بولے بندہ ایسی جگہ نہیں جانے کا، اپنی شان کے خلاف ہے۔ دوست نے کہا، بھائی، تم بڑے روکھے پھیکے آدمی ہو، حیدر، مشتری، گوہر اور آبادی کے مرثیے نہ سنے، تو کسی سے کیا کہیں گے کہ لکھنؤ کا محرم دیکھا۔ آج کل وہاں جانا حلال ہے۔ ان دس دنوں میں مزے سے جہاں چاہے جایئے، رنگین کمروں میں دو گال ہنس بول آیئے، کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔

آزاد : یہ کہیے تو خیر، بندہ بھی لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہوجائے۔ پہلے گوہر کے یہاں پہنچے۔ اچھے اچھے رئیس زادے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک بڑے مالدار جوہری صاحب مٹکتے ہوئے آئے۔ دس روپے کی کارچوبی ٹوپی سر پر، پیازی اطلس کی بھڑکیلی اچکن پہنے ہوئے، خدمت گار کے کندھے پر قیمتی دوشالہ، یہ ٹھاٹ باٹ، مگر بیٹھتے ہی ٹوکے گئے۔ بیٹھے تو ضریح (تعزیے) کی طرف پیٹھ کرکے! گوہر نے ایک عجیب ادا سے جھڑک دیا، اے واہ، بڑے تمیزدار ہو، ضریح کی طرف پیٹھ کرلی۔ سیدھے بیٹھو، آدمیت کے ساتھ۔

میاں آزاد نے چپکے سے دوست کے کان میں کہا میاں اس ٹیم ٹام سے تو آئے، مگر گھڑکی کھاکر منکے تک نہیں۔

دوست : بھائی جان، گوہر لکھنؤ کی جان ہے لکھنؤ کی شان ہے۔ ایسا خوش نصیب کوئی ہو تو لے کہ اس کی گھڑکیاں سہے۔

لوگ ادب سے گردن جھکائے بیٹھے کنکھیوں سے آنکھوں کو سینک رہے تھے لیکن کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ یہاں سے اٹھے تو فرنگی محل میں حیدر جان کے یہاں پہنچے۔ وہاں مرثیہ ہورہا تھا :

نکلے خیمے سے جو ہتھیار لگائے عباس
چڑھ کے رہ بار پر میدان میں آئے عباس

اس شعر کو ایسی پیاری آواز سے ادا کیا کہ سننے والے لوٹن کبوتر ہوئے جاتے تھے۔ راگ اور راگنی تو اس کی لونڈیاں تھیں۔ سب کے سب سر دھنتے تھے، کیا پیارا گلا پایا ہے! میاں آزاد کی باچھیں کھلی جاتی تھیں اور گردن تو گھڑی کا کھٹکا ہوگئی تھی۔

یہاں سے اٹھے تو مشتری کے کمرے میں پہنچے۔ دیکھنے والوں کا وہ ہجوم تھا کہ تل رکھنے کی جگہ نہیں۔

'خنجر جو بوسہ گاہِ پیمبر پہ چل گیا' اس کو جھنجھوٹی کی دھن میں اس لطف سے پڑھا کہ لوگ پھڑک اٹھے۔

دوست : کیوں یار، کیا لکھنؤ میں زیور پہننے کی قسم ہے؟

آزاد : بھائی، تم بالکل ہی گنوار ہو! ماتم میں زیور کا کیا ذکر؟ گورے گورے کانوں میں کالے کالے کرن پھول، ہاتھوں میں سیاہ چوڑیاں، بس یہی کافی ہے، لیکن یہ سادگی بھی عجیب لطف دکھاتی ہے۔

یہاں سے اٹھ کر دونوں آدمی ماتم کی مجلسوں میں پہنچے۔ جدھر جاتے ہیں، رونے پیٹنے کی آواز آتی ہے، جسے دیکھیے، آنکھوں سے آنسو بہا رہا ہے۔ ساری رات مجلسوں میں گھومتے رہے، صبح اپنے گھر پہنچے۔

(10)

بسنت کے دن آئے۔ آزاد کو کوئی فکر تھی ہی نہیں، سوچے آج بسنت کی بہار دیکھنی چاہیے۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، تو دیکھا کہ ہر چیز زرد ہے، پیڑ پتے زرد، در و دیوار زرد، رنگین کمرے زرد، لباس زرد، کپڑے زرد۔ شاہ مینا کی درگاہ میں دھوم ہے، تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ حسینوں کے جھم کرے، رنگیلے جوانوں کی ریل پیل، اندر کے اکھاڑے کی پریوں کا دنگل ہے، جنگل میں منگل ہے۔ بسنت کی بہار امنگ پر ہے، زعفرانی دوپٹوں اور کیسریا پاجاموں پر عجب جوبن ہے۔ وہاں سے چوک پہنچے۔ جوہریوں کی دوکان پر ایسے سندر پکھراج ہیں کہ پکھراج پری دیکھتی تو مارے شرم کے ہیرا کھاتی اور اندر کا اکھاڑا بھول جاتی۔ میوہ بیچنے والی

زرد آ و، نارنگی امرود، چکوترا، مہتابی کی بہار دکھلاتی ہے، چمپئی دوپٹے پر اتراتی ہے، مالکن گیند، ہزار، زرد گلاب کی بو باس سے دل خوش کرتی ہے۔ اور پکار پکار کر لبھاتی ہے گیندے کا ہار ہے، گلے کی بہار ہے۔ حلوائی کھوپڑے کی زرد برفی، پستے کی برفی، نان ختائی، بیسن کے لڈو، چنے کے لڈو، دوکان پر سجائے بیٹھا ہے۔ خونچے والے پاپڑ، دال موٹھ، سیو، وغیرہ بیچتے پھرتے ہیں۔ آزاد یہی بہار دیکھتے دل بہلاتے چلے جاتے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں، لالہ وسنت رائے کے مکان میں کئی رنگیلے جوان بانکی ٹوپیاں جمائے، بسنتی پگیا باندھے، کیسریے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ ان کے سامنے چندرمکھی عورتیں بیٹھی نوبہار کی دھن میں بسنت گا رہی ہیں۔ قالین زرد ہے، چھت پوش زرد، کمبل زرد، زرد جھالر سے مکان سجایا ہے، بسنت پنچمی نے در و دیوار تک کو بسنتی لباس پہنایا ہے۔ کوئی یہ گیت گاتی ہے:

رتو آئی بسنت عجب بہار
کھلے زرد پھول بروں کی ڈار
چنکیو کسم پھولے لاگی سرسوں
جھومت چلت گیہوں کی بار
ہر کے دوارے مالی کا چھوہرا
گروا ڈارت گیندوں کے ہار
ٹیسو پھولے، انبا بورے
چمپا کے رخ کلین کی بہار
گروا ڈارے استاد کے دوارے
چلو سب سکھیاں کر کر سنگار

کوئی میاں امانت کی طرح یہ غزل گاتی ہے:

ہے جلوۂ تن سے درو دیوار بسنتی
پوشاک جو پہنے ہے میرا یار بسنتی
کیا فصل بہاری میں شگوفے ہیں کھلائے
معشوق ہیں پھرتے سرے بازار بسنتی
گیندا ہے کھلا باغ میں، میدان میں سرسوں

صحرا وہ بسنتی ہے، یہ گلزار بسنتی
منھ زرد دوپٹے کے نہ آنچل سے چھپاؤ
ہوجائے نہ رنگ گل رخسار بسنتی

آزاد چلے جاتے تھے کہ ایک نئی سج دھج کے بزرگ سے مڈبھیڑ ہوئی۔ بڑے تجربے کار، خرّاٹ آدمی تھے۔ آزاد کو دیکھتے ہی بولے۔ آیئے آیئے خوب ملے۔ واللہ شریف کی صورت پر عاشق ہوں۔ چین، ماچین، ہند اور سندھ، روم اور شام، الغرض ساری خدائی کی بندے نے خاک چھانی ہے۔، اور تو یار جانی ہے۔ سفر کا حال سن، گھنگھرو بولے چھن چھن ایسی بات بتاؤں۔ پری کو لبھاؤں، جن کو رجھاؤں، مصر کی داستان سناؤں۔

یہ تقریر سن کر آزاد کے ہوش پیترے ہوگئے، سمجھ میں نہ آیا، کوئی پاگل ہے، یا پہنچا ہوا فقیر۔ مگر آثار تو دیوانے پن کے ہی ہیں۔

خرّاٹ نے پھر بڑبڑانا شروع کیا۔ سنو یار، کہتا ہے خاکسار، ہم سو رہیں تم جاگو، پھر ہم اٹھ بیٹھیں، تم سو رہو، سفر دور کا ہے، سوتے سوتے راہ کاٹیں، سفر کا اندھا کنواں انھیں اینٹوں سے پاٹیں۔

یہ کہہ کر خراٹ نے ایک کھونچے والے کو بلایا اور پوچھا، کھٹیاں کتنے سیر؟ برفی کا کیا بھاؤ؟ لڈو پیسے کے کئے؟ بولو جھٹ پٹ نہیں ہم جاتے ہیں۔ کھونچے والے نے سمجھا کوئی دیوانہ ہے۔ بولا پیسے بھی ہیں یا بھاؤ ہی سے پیٹ بھروگے؟

خراٹ : پیسے نہیں ہیں تو کیا مفت مانگتے ہیں؟ تول دے سیر بھر مٹھائی۔

مٹھائی لے کر آزاد کو ضد کر کے کھلائی، ٹھنڈا پانی پلوایا اور بولے۔ شام ہوئی اب سو رہو ہم اسباب تاکتے ہیں۔ میاں آزاد ایک درخت کے نیچے لیٹے، خراٹ نے ایسی میٹھی میٹھی باتیں کیں کہ انھیں اس پر یقین آگیا۔ دن بھر کے تھکے تھے ہی، لیٹتے ہی نیند آگئی۔ سوئے تو گھوڑے بیچ کر، سر پیر کی خبر نہیں، گویا مردوں سے شرط لگائی ہے۔ وہ ایک کائیاں، دنیا بھر کا نیاریا، ان کو غافل پایا تو گھڑی، سونے کی چین، چاندی کی مٹھ والی گھڑی، چاندی کا گلوری دان لے کر چلتا ہوا۔ آدھ گھنٹے میں آزاد کی نیند کھلی تو دیکھا کہ خراٹ غائب ہے، گھڑی اور چین، ڈبا اور چھڑی بھی غائب۔ چلانے لگے، لوٹ لیا، ظالم نے لوٹ لیا۔ جھانسا دے گیا! ایسا چکما کبھی نہ کھایا تھا۔ دوڑ کر تھانے میں اطلاع کی۔ مگر خراٹ کہاں وہ تو یہاں سے دس کوس پر

تھا۔ بیچارے رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ چوراہے پر ایک جوان کو مشکی گھوڑے پر سوار آتے دیکھا۔ گھوڑا ایسا سرپٹ جارہا تھا کہ ہوا اس کی گرد تک کو نہ پہنچتی تھی۔ اندھیرا ہو ہی گیا تھا ایک کونے میں دبک رہے کہ ایسا نہ ہو کہیں جھپیٹ میں آجائیں۔ اتنے میں سوار ان کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ جھٹ گھوڑے کی باگ روکی اور ان کی طرف نظر بھر کر دیکھنے لگا۔ یہ چکرائے ماجرا کیا ہے؟ یہ تو بے طرح گھور رہا ہے، کہیں ہنٹر تو نہ دے گا۔

جوان : کیوں حضرت، آپ کسی کو پہچانتے بھی ہیں؟ خدا کی شان، آپ اور ہم کو بھول جائیں۔

آزاد : میاں تم کو دھوکا ہوا ہوگا، میں نے تو کبھی تمھاری صورت بھی نہیں دیکھی۔

جوان : لیکن میں نے تو آپ کی صورت دیکھی ہے، اور آپ کو پہچانتا ہوں۔ کیا اتنی جلدی بھول گئے؟ یہ کہہ کر وہ جوان گھوڑے سے اتر پڑا اور آزاد سے چمٹ گیا۔

آزاد : آپ کو سچ مچ دھوکا ہوا۔

جوان : بھئی، بڑے بھلکڑ ہو! یاد کرو، کالج میں ہم تم دونوں ایک ہی درجے میں پڑھتے تھے۔ وہ کشتی پر ہوا کھانے جانا اور دریا کے مزے اڑانا۔ وہ مداری خونچے والا، وہ اقلیدس کے وقت اڑ بھاگنا، سب بھول گئے؟ اب میاں آزاد کو یاد آئی۔ دوست کے گلے سے لپٹ گئے اور مارے خوشی کے رو دیے۔

جوان : تمھیں یاد ہوگا جب میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دینے کو تھا۔ تو میرے پاس فیس کا بھی ٹھکانا نہ تھا۔ روپیے کی تلاش میں ادھر ادھر پھرتا تھا کہ راہ میں اسپتال کے پاس تالاب پر تم سے ملاقات ہوئی اور تم نے میرے حال پر رحم کرکے مجھے روپیے دیے۔ تمھاری مدد سے میں نے بی۔ اے۔ تک پڑھا۔ لیکن اس وقت تم بڑے اداس نظر آتے ہو، اس کا کیا سبب ہے؟

آزاد : یار، کچھ نہ پوچھو، ایک خرانٹ کے چکمے میں آگیا۔ یہیں گھاس پر لیٹ رہا، اور وہ میری گھڑی چین وغیرہ لے کر چلتا ہوا۔

جوان : بھئی واہ! اتنے گھاگھ بنتے ہو، اور ایک خرانٹ کے بھرے میں آگئے! آپ کے بٹن تک اتار لے گیا اور آپ کو خبر نہیں! لے اب کان پکڑیے کہ اب پھر کسی مسافر کی دوستی کا اعتبار نہ کریں گے۔ مٹھائی تو آپ کھا ہی چکے ہیں، چلیے کہیں بیٹھ کر بسنتی گانا سنیں۔

(11)

ایک دن آزادشہر کی سیر کرتے ہوئے مکتب خانے میں جاپہنچے۔ دیکھا ایک مولوی صاحب کھٹیا پر اکڑوں بیٹھے ہوئے لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں۔ آپ کی رنگی ہوئی داڑھی پیٹ پر لہرا رہی ہے۔ گول گول آنکھیں، کھوپڑی گھٹی گھٹائی، اس پر چوگوشیا ٹوپی جمی جمائی۔ ہاتھ میں تسبیح لیے کھٹاکھٹا رہے ہیں۔ لونڈے اردگرد غل مچا رہے ہیں۔ ہوحق مچی ہوئی ہے، گویا کوئی منڈی لگی ہوئی ہے۔ تہذیب کوسوں دور، ادب کافور، مگر مولوی صاحب سے اس طرح سے ڈرتے ہیں جیسے چوہا بلی سے، یا اچھی ناؤ سے۔ ذرا چتون تیکھی ہوئی اور کھلبلی مچ گئی۔ سب کتابیں کھولے جھوم جھوم کر مولوی صاحب کو پھسلا رہے ہیں۔ ایک شعر جو رٹنا شروع کیا تو بلا کی طرح اس کو چمٹ گئے۔ مطلب تو یہ کہ مولوی صاحب منھ کا کھلنا اور زبان کا ہلنا اور ان کا جھومنا دیکھیں، کوئی پڑھے یا نہ پڑھے، اس سے مطلب نہیں۔ مولوی صاحب بھی واجبی ہی واجبی پڑھے لکھے تھے، کچھ شدبد جانتے تھے۔ پڑھانے کے فن سے کورے۔ ایک شاگرد سے چلم بھروائی، دوسرے سے حقہ تازہ کرایا، دم جھانسے میں کام لیا، حقہ گڑگڑایا اور دھواں اڑایا۔ شامت یہ تھی کہ آپ افیم کے بھی عادی تھے۔ چینی کی پیالی آئی، افیم گھولی اور اڑائی۔ ایک مہاجن کے لڑکے نے برفی منگوائی آپ نے خوب ڈٹ کر چکھی، تو پینک نے آدبوچا۔ اونگھے، حقہ ٹیڑھا ہوگیا، گردن اب زمین پر آئی، اور اب زمین پر آئی۔ حقہ گرا اور چکناچور ہوگیا۔ دو ایک لڑکوں کی کتابوں پر چنگاریاں گریں اب پینک سے چونکے تو ایسے جھلائے کہ کسی لڑکے کے چپت لگائی کسی کی کھوپڑی پر دھپ جمائی، ایک کے کان گرمائے۔ پینک میں آکر خود تو حقہ گرایا اور شاگردوں کو بے قصور پیٹنا شروع کیا۔ خیر اتنے میں ایک لڑکا کتاب لے کر پڑھنے آیا۔ اس نے پڑھا:

دلم کشود کشادم چو نامہ ات گوئی
کلیدِ بابِ گلستان دل کسائی بود

(جب میں نے تیرا خط کھولا، تو میرا دل کھل گیا، گویا وہ خط خوشی کے باغ کے دروازے کی کنجی تھی)

اب مولوی صاحب کا ترجمہ سنیے:

ترجمہ: دل تیرا کھلا، کھولا میں نے جو خط تیرا، کہے تو کنجی دروازے باغ دل کھولنے کی تھی۔

ماشاء اللہ، کیا ترجمہ تھا! نہ مولوی صاحب نے خود سمجھا نہ لڑکے نے۔ اور دل لگی سنیے کہ مولوی صاحب بھی شاگرد کے ساتھ پڑھتے جاتے ہیں اور دونوں ہلتے جاتے ہیں۔ جب یہ پڑھ چکے تو دوسرے صاحب کتاب بغل میں دبائے آبیٹھے۔

مولوی صاحب: ارے گاودی، نئی کتاب شروع کی، اور چراغی ندارد، شُکرانہ، چھپر پر! جا دوڑ کر دو آنے گھر سے لے آ۔

لڑکا: مولوی صاحب کل لیتا آؤں گا۔ آپ تو ہتھے ہی پر ٹوک دیتے ہیں۔ آپ کو اپنی مٹھائی ہی سے مطلب ہے کہ مفت کے جھگڑے سے؟

مولوی: یہ جھانسے کسی اور کو دینا۔ اچھا اپنے باپ کی قسم کھا کہ کل ضرور لاؤں گا۔

لڑکا: مولوی صاحب کے بڑے سر کی قسم، چڑھتے چاند تک ضرور لاؤں گا۔

اس پر سب لڑکے ہنس پڑے کہ کتنا ڈھیٹ لڑکا ہے! قسم بھی کھائی تو مولوی صاحب کے سر کی اور سر بھی چھوٹا نہیں بڑا۔

مولوی: چپ گدھے، میرا سر کیا کدو ہے؟ اچھا پڑھ۔

لڑکا تو اوٹ پٹانگ پڑھنے لگا مگر مولوی صاحب چوں بھی نہیں کرتے۔ انھیں مٹھائی کی فکر سوار ہے۔ سوچ رہے ہیں جو کل دو آنے نہ لایا تو خوب کوڑے پھٹکاروں گا، تسمہ تک تو باقی رکھوں گا نہیں۔

دس پانچ لڑکے ایک دوسرے کو گدگدا رہے ہیں اور مولوی صاحب کو دکھانے کے لیے زور زور سے چلا کر کوئی شعر پڑھ رہے ہیں۔

آزاد کو مکتب کی یہ حالت اور لونڈوں کی یہ چل پُوں دیکھ سن کر ایسا غصہ آیا کہ اگر پاتے تو مولوی صاحب کو کچا ہی کھا جاتے۔ دل میں سوچے یہ مکتب خانہ ہے یا پاگل خانہ؟ جدھر دیکھیے غل غپاڑا، ڈھول ڈھپا ہو رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے بھری برسات میں میڈک گاؤں گاؤں یا پچھلے پہر کوّے کاؤں کاؤں کر رہے ہیں۔ گھر پر آتے ہی مکتبوں کی حالت پر یہ کیفیت لکھ ڈالی۔

1۔ نور کے تڑکے جھٹ پٹے تک لڑکوں کو مکتب خانے میں قید رکھنا بیہودگی ہے۔ لڑکے

دس بجے آئیں، چار بجے چھٹی پائیں، یہ نہیں کہ دن بھر داننا بکل بکل پڑھنا بھی اجیرن ہوجائے اور یہی جی چاہے کہ پڑھنے لکھنے کی دم میں موٹا سا رسا باندھیں، مولوی صاحب کو ہوا بتائیں اور دل کھول کر گل چھرے اڑائیں۔

2۔ یہ کیا حماقت ہے کہ جتنے لڑکے ہیں سب کا سبق الگ۔ دو دو چار چار دس دس کا ایک درجہ بنا لیجیے، محنت کی محنت بچے گی اور کام زیادہ ہوگا۔

3۔ جدھر دیکھتا ہوں، ادب (ساہتیہ) کی تعلیم ہورہی ہے۔ تعلیم میں صرف ادب ہی شامل نہیں، حساب ہے، تواریخ ہے، جغرافیہ ہے، اقلیدس ہے، مگر پڑھائے کون؟ مولوی صاحب کو تو سو تک گنتی نہیں آتی۔

4۔ سب لڑکوں کا گل مچا مچا کر آواز لگانا محض فضول ہے۔ کوئی کھونچے والے، گنڈیری والا، چنے پرمل والا، اس طرح چلائے تو مضائقہ نہیں، مٹرسٹر، گول گپے، مسالے دار بیگن، مولی، ترئی، لوترکاری، یہ تو پھیری دینے والوں کی صدا ہے، مکتب کو منڈی بنانا حماقت ہے۔

5۔ ترجمے پر خدا کی مار اور شیطان کی پھٹکار۔ 'جاتا ہوں بیچ ایک باغ کے، واسطے لانے اچھی چیزوں کے، میں نے دیکھا میں نے، تو جاتا ہے تو'۔ واہ کیا تو تو میں میں ہے! ترجمہ صحیح ہونا چاہیے، یہ تو نہ کوئی آواز کسے کہ لڑکے بنگلہ بول رہے ہیں۔

6۔ پڑھتے وقت لڑکوں کا ہلنا عیب ہے۔ مگر کہیں کس سے؟ مولوی صاحب تو خود جھومتے ہیں۔

7۔ مطلب ضرور سمجھانا چاہیے۔ لڑکا مطلب ہی نہ سمجھے گا تو اس کو فائدہ کیا خاک ہوگا؟

8۔ سبق کو برزبان رٹنا بری بات ہے۔ کتاب بند کی اور فر فر دس صفحے سنا دیے۔ حافظہ کچھ مضبوط ہوا صحیح مگر ستم یہ ہے کہ پھر طوطے کی طرح بات کے سوا کچھ یاد نہیں رہتا۔

9۔ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو بڑی بڑی کتابیں پڑھانا ان کی زندگی خراب کرنا ہے۔ ذرا سے ٹٹو پر جب دو ہاتھیوں کا بوجھ لاد دو گے تو ٹٹو بیچارا آنکھیں مانگنے لگے گا یا نہیں؟ ذرا سا بچہ اور پڑھے 'مینا بازار'

10۔ لڑکے کو شروع ہی سے فارسی پڑھانا اس کا گلا گھونٹنا ہے۔ پہلے اردو پڑھائیے، اس کے بعد فارسی، شروع ہی سے کریمہ مقیمہ پڑھانا اس کی مٹی خراب کرنا ہے۔

11۔ مولوی صاحب لڑکوں سے چلم بھروانا، حقہ تازہ کروانا چھوڑ دیں۔ اس کی جگہ ان کو

بات چیت کرنے اور ملنے جلنے کا آداب سکھائیں۔

12۔ اپنچی مولوی چھپّر پر رکھے جائیں۔ مولوی نے افیم کھائی اور لڑکوں کی شامت آئی۔ وہ پینک میں جھوما کریں گے۔

یہ اشتہار موٹے قلم سے لکھ کر میاں آزاد راتوں رات مکتب کے دوازے پر چپکا آئے۔ جھٹ سے نکل کر کے شہر میں بھی دو چار جگہ: چپکا دیا۔ دوسرے دن اشتہار کے پاس لوگ ٹھاٹ کے ٹھاٹ جمع ہوئے۔ کسی نے کہا، سمّن چپکایا گیا ہے، کوئی بولا، تھیٹر کا اشتہار ہے۔ بارے ایک پڑھے لکھے صاحب نے کہا۔ یہ کچھ نہیں ہے، مولوی صاحب کے کسی دشمن کا کام ہے۔ اب جسے دیکھیے قہقہہ اڑاتا ہے، بھائی واللہ، کسی بڑے ہی فقرے باز کا کام ہے۔ مولوی بیچارے کو لے ہی ڈالا، پٹرا کردیا۔ مکتب خانے میں لڑکوں کے چہرے گلنار ہوگئے۔ دھت تیرے کی! بچا روز قمچیاں جماتے تھے، چپتیں لگاتے تھے، افیم گھولی اور سر پر شیخ سدّو سوار۔ اب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ مولوی صاحب تشریف کا بکچا لائے تو لڑکے ان کا کہنا ہی نہیں مانتے۔ مولوی صاحب کہتے ہیں کتاب کھولو، شاگرد جواب دیتے ہیں بس منھ بند کرو۔ فرمایا کہ اب بولا تو ہم بگڑ جائیں گے۔ شاگردوں نے کہا، ہم خوب بنائیں گے۔ تب تو جھلّائے اور ڈپٹ کر کہا میں بڑا گرم مزاج ہوں۔ ایک گستاخ نے مسکرا کر کہا، پھر ہم ٹھنڈا بنائیں گے۔ دوسرا بولا، کسی ٹھنڈے ملک میں جایئے۔ تیسرا بولا دماغ میں گرمی چڑھ گئی ہے۔ مولوی صاحب گھبرائے کہ ماجرا کیا ہے۔ باہر کی طرف نظر ڈالی تو دیکھا غول کے غول تماشائی کھڑے قہقہے لگا رہے ہیں۔ باہر گئے تو اشتہار نظر آیا۔ پڑھا تو کٹ گئے۔ دل ہی دل سے لکھنے والے کو گالیاں دینے لگے۔ پاؤں تو کچّا ہی کھا جاؤں۔ اتنے ڈنڈے لگاؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ بدمعاش نے کیسا خاکہ اڑایا ہے۔ جبھی تو لڑکے اتنے ڈھیٹ ہوگئے ہیں۔ میں کہتا ہوں آم وہ کہتے ہیں املی۔ اب عزت ڈوبی، مکتب خانے میں جاتا ہوں تو خوف ہے کہیں لونڈے روز کی کسر نہ نکالیں اور انجر پنجر ڈھیلے کردیں۔ بھاگ جاؤں تو روٹیوں کے لالے پڑیں۔ کھاؤں کیا انگارے؟ آخر ٹھان لی کہ بوریا بندھنا چھوڑو ملا گیری سے منھ موڑو، بھاگے تو گھر پر دم لیا۔ لڑکوں نے جو دیکھا کہ مولوی صاحب پتّا توڑ بھاگے جاتے ہیں تو جوتیاں بغل میں دبا، تختیاں اور بستے سنبھال دم کے پیچھے چلے۔ تماشائیوں میں باتیں ہونے لگیں۔

ایک: ارے میاں یہ بھاگا کون جاتا ہے بگ ٹٹ؟

دو: شیطان ہے، شیطان، آج لڑکوں کے داؤں پر چڑھ گیا ہے، کیسا دم دبائے بھاگا جاتا ہے۔

اب سنیے کہ محلے بھر میں کھلبلی مچ گئی۔ اجی ایسے مکتب کی ایسی تیسی۔ برسوں سے لونڈے پڑھتے ہیں ایک حرف نہ آیا۔ لڑکوں کی مٹی پلید کی۔ پڑھانا لکھانا خیر صلی اللہ، چلمیں بھروایا کیے۔ سب نے مل کر کمیٹی کی، کہ مولوی صاحب کا عام جلسے میں امتحان لیا جائے اور منادی ہو کہ جن صاحب نے یہ اشتہار لکھا ہے وہ ضرور آئیں۔ ڈھنڈھوریا محلے بھر میں کہتا پھرا کہ خلق خدا کا، ملک سرکار کا، حکم کمیٹی کا کہ آج ایک جلسہ ہوگا اور مولوی صاحب کا امتحان لیا جائے گا۔ جس نے اشتہار لکھا ہے وہ بھی حاضر ہو۔

میاں آزاد بہت خوش ہوئے، شام کو جلسے میں جا پہنچے۔ جب دو تین سو آدمی، اہالی موالی، ڈوم ڈفالی، ایرے غیرے نتھو خیرے سب جمع ہوئے تو ایک ممبر نے کہا حضرت یہ تو سب کچھ ہے، مگر مولوی صاحب اس وقت ندارد ہیں۔ ایک طرفہ ڈگری نہ دیجیے۔ انھیں بلوائیے تب امتحان لیجیے۔ یوں تو وہ آئیں گے نہیں ہم ایک تدبیر بتائیں جو دوڑے نہ آئیں تو مونچھ منڈا ڈالیں، ہاتھ قلم کرا ڈالیں۔ کہلا بھیجئے کہ کسی کے یہاں شادی ہے، نکاح پڑھنے کے لیے ابھی بلاتے ہیں، لوگوں نے کہا خوب سوجھی، دور کی سوجھی۔ آدمی مولوی صاحب کے دروازے پر گیا اور آواز دی، مولوی صاحب اجی مولوی صاحب، کیا مر گئے؟ اس گھر میں کوئی ہے، یا سب کو سانپ سونگھ گیا؟ دروازہ دھم دھمایا، کنڈی کھٹکھٹائی، مگر جواب ندارد۔ تب تو آدمی نے جھلا کر پتھر پھینکنے شروع کیے۔ دو ایک مولوی صاحب کے گھٹے ہوئے سر پر بھی پڑے۔ مولوی صاحب بولے کون ہے؟ آدمی نے کہا بارے آپ زندہ تو ہوئے۔ میں نے تو سمجھا تھا کفن کی ضرورت پڑی۔ چلیے عیدو خاں کے یہاں شادی ہے نکاح پڑھا دیجیے۔ نکاح کا نام سنتے ہی مولانا خمیری روٹی کی طرح پھول گئے، انگرکھے کا بند تڑ سے ٹوٹ گیا۔ کفن پھاڑ کر چلا اٹھے، آیا آیا، ٹھہرے رہو، ابھی آیا۔ شملہ کھوپڑی پر جما، عقیق کا کنٹھا ہاتھ میں لے، سرمہ لگا گھر سے چلے۔ آدمی ساتھ ہے دل میں کہتے جاتے ہیں آج پو بارہ ہیں بڑھ کر ہاتھ مارا ہے، چھپن کروڑ کی تہائی، ہاتھی کے ہودے میں گھٹے۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتے آدمی سے پوچھتے جاتے ہیں کیوں میاں اب کتنی دور مکان ہے؟ پاس ہی ہے نہ، دیکھیں نکاح پڑھائی کیا ملتی ہے؟ سوا

روپے تو معمولی ہے مگر خدا نے چاہا تو بہت کچھ لے مروں گا۔ آدمی پیچھے پیچھے ہنستا جاتا ہے کہ میاں ہیں کس خیال میں۔ بارے خدا خدا کر کے وہ منزل طے ہوئی، مکان میں آئے تو ہوش اڑ گئے۔ یہ کیسا بیاہ ہے بھائی، نہ ڈھول، نہ شہنائی، ہماری شامت آئی۔ کنکھیوں سے ادھر ادھر دیکھ رہے ہیں، عقل دنگ ہے کہ یہ سب کے سب ہمیں کو کیوں گھور رہے ہیں۔ اتنے میں میر مجلس نے کہا جن صاحب نے اشتہار لکھا تھا وہ اگر آئے ہوں تو کچھ فرمائیں۔

آزاد نے کھڑے ہوکر کہا: یہ جو مولوی صاحب آپ لوگوں کے سامنے کھڑے ہیں، ان سے پوچھیے کہ مکتب خانے میں افیم کیوں پیتے ہیں؟ جب دیکھیے پینک میں اونگھ رہے ہیں، یا مٹھائی ٹونگ رہے ہیں۔ لڑکوں کا پڑھانا خالہ جی کا گھر نہیں کہ سر گھٹایا اور ملّا بن گئے، چوڑی نگلی اور پیر جی بن گئے۔

مولوی صاحب تاڑ گئے کہ یہاں میری درگتی ہونے والی ہے۔ بھاگنے ہی کو تھے کہ ایک آدمی نے ٹانگ پکڑ کر آنٹی بتائی، تو پھٹ سے زمین پر آرہے۔ اچھے پھنسے خوب نکاح پڑھایا۔ مفت میں الو بنے، خیر میاں آزاد نے پھر کہا۔

مولوی صاحب کو کسی مزار کا مجاور یا کہیں کا تکیہ دار بنادیجیے، تو خوب میٹھے ٹکڑے اڑائیں اور ڈنڈ پیلیں۔ یہ مکتب خانے میں للو کا دسہرہ ان کو کیوں بنا دیا؟ لڑکوں کی کیفیت سنیے کہ دن بھر گلی ڈنڈا کھیلا کرتے ہیں، چیختے ہیں چلاتے ہیں اور دن بھر میں اٹھارہ مرتبہ پیشاب کرنے اور پانی پینے جاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے مولوی صاحب دیکھیے، یہ ہماری ناک پکڑتا ہے کوئی کہتا ہے یہ ہم سے لڑتا ہے، مولوی صاحب کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ لڑکے پڑھتے ہیں یا نہیں، وہاں تو ہلتے جاؤ اور ایسا گل مچاؤ کہ کان پڑے آواز نہ سنائی دے، اس میں چاہے جو کچھ اول جلول بکو۔

مولوی صاحب پھر رسّی تڑاکر بھاگنے لگے۔ لوگ لینا لینا کر کے دوڑے۔ گئے تھے روزے بخشوانے نماز گلے پڑی۔ چلاّ کر بولے، تم کون ہوتے ہو جی ہمارا عیب نکالنے والے، ہم پڑھائیں یا نہ پڑھائیں، تم سے مطلب؟

آزاد: حضرت آج ہی تو پنجے میں پھنسے ہو روز توند نکالے بیٹھے رہا کرتے تھے، یہ توند ہے یا بے ایمانی کی قبر؟ یا ہوا کا تکیہ؟ اب پچک جائے، تو سہی۔ خدا جانے کہاں کا گنوار بٹھا دیا ہے۔ کل صبح کو ان کا امتحان لیا جائے۔

مولوی صاحب : آپ بڑے شیطان ہیں۔

آزاد : آپ لنگور ہیں، مگر حیرت ہے کہ یہ ٹھڈی سے دُم کی کونپل کیوں کر پھوٹی۔

اس طرح جلسہ ختم ہوا۔ لوگوں نے دل میں ٹھان لی کہ کل چاہے اولے پڑیں چاہے کڑکڑاتی دھوپ ہو، چاہے بھونچال آئے، مگر ہم آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ مولوی صاحب سے تاکید کی گئی کہ حضرت کل نہ آیئے گا تو یہاں رہنا مشکل ہوجائے گا۔ مولوی صاحب کا چہرہ اتر گیا تھا، مگر کڑک کر بولے، ہم اور نہ آئیں، آئیں اور بیچ کھیت آئیں۔ ہم کیا کوئی چور ہیں، یا کسی کا مال مارا ہے؟

مولوی صاحب گھر پہنچے تو آزاد کو لگے پانی پی پی کر کوسنے۔ اس کی زبان سڑے، منھ پھول جائے، ساری چوکڑی بھول جائے، آسمان سے انگارے برسیں، ایسی جگہ مرے، جہاں پانی نہ ملے، ڈنگو فیور چٹ کرے، انجن کے نیچے دب کر مرے۔ مگر ان گالیوں سے کیا ہوتا تھا، رات کسی طرح کٹی، دوسرے روز نور کے تڑکے لوگ پھر جلسے میں آپہنچے۔ مگر مولانا ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ، بارے یاروں نے توتھنبو کرکے سر سہلائے، سبز باغ دکھلاتے گھسیٹ ہی لیا۔ میاں آزاد نے پوچھا۔ کیوں مولوی صاحب کس منصوبے میں ہو؟

مولوی صاحب : سوچتا ہوں کہ اب کون چال چلوں؟ سوچ لیا ہے کہ اب ملّا گیری چھوڑ پیادوں میں نوکری کریں گے۔ بس وطن سے جائیں گے تو پھر لوٹ کر گھر نہ آئیں گے۔ امیر غریب سب پر مصیبت پڑتی ہے۔ پھر ہماری بساط کیا؟ چارخانے کا انگرکھا نہ سہی گاڑھے کی مرزئی سہی۔ مگر آپ ایک غریب کے پیچھے ناحق کیوں پڑے ہوئے ہیں؟ کہاں راج بھوج کہاں گنگوا تیلی؟

آزاد : یہ جھانسے رہنے دیجیے، یہ چکمے کسی اور کو دیجیے۔

مولوی صاحب : خدا کی پناہ، میں آپ کا غلام اور آپ کو چکمے دوں گا؟ آپ سے کیا عرض کروں کہ کتنا جی توڑ کر لڑکوں کو پڑھاتا ہوں، ادھر سورج نکلا اور میں نے مکتب کا راستہ لیا۔ دن بھر لڑکوں کو پڑھایا، کیا مجال کہ کوئی لڑکا گردن تک اٹھا لے۔ کوئی بولا، اور میں نے ٹیپ جمائی، کھیلا، اور شامت آئی۔ سمجھ بوجھ کر چلتا تھا، اگر کوئی لڑکا مکتب میں کھلونا لاتا تو اسے ترت انگیٹھی میں ڈلوا دیتا۔ مگر آپ نے ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ آپ کے سامنے میری کون سنتا ہے۔

میر مجلس نے کہا: میاں آزاد، انھیں بکنے دیجیے، آپ ان کا امتحان لیجیے۔

میاں آزاد تو سوال پوچھنے کے لیے کھڑے ہوئے ادھر مولوی صاحب کا برا حال ہوا۔ رنگ فق، کلیجہ شق، آنکھوں میں آنسو، منھ پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں، کلیجہ دھک دھک کرتا ہے، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کسی طرح کھڑے تو ہوئے مگر قدم نہ جما۔ پاؤں ڈگمگائے اور لڑکھڑا کر گرے۔ لوگوں نے انھیں اٹھا کر پھر کھڑا کیا۔

آزاد: یہ شعر کس بحر میں ہے۔

میں نے کہا جو اس سے ٹھکرا کے چل نہ ظالم

حیرت میں آ کے بولا کیا آپ جی رہے ہیں؟

مولوی صاحب: بحر (دریا) میں آپ ہی غوطے لگائیے اور خدا کرے، ڈوب جائیے، جسے دیکھو ہمیں پر شیر ہے۔ نامعقول اتنا نہیں سمجھتے کہ ہم مولوی آدمی لونڈے پڑھانا جانے یا شاعری کرنا۔ ہمیں شعر سے مطلب؟ آئے وہاں سے بحر پوچھنے۔

آزاد: بشنو از نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

اس شعر کا مطلب بتلائیے!

مولوی صاحب: اس کا بتانا کیا مشکل ہے؟ نے کہتے ہیں چنڈو کی نے کو، بس اس زمانے میں لوگ چنڈو پیتے تھے اور شکایت کرتے تھے۔

آزاد: بکری کی پچھلی ٹانگوں کو فارسی میں کیا کہتے ہیں؟

مولوی صاحب: یہ کسی اپنے بھائی بند، بوچڑ قصاب سے پوچھیے، بندا نہ چھیچھڑے کھائے نہ جانے۔ واہ اچھا سوال ہے، اب ملاؤں کو بوچڑوں کی شاگردی بھی کرنی چاہیے۔

آزاد: ہندستان کے اتر میں کون ملک ہے؟

مولوی: خدا جانے، میں کیا دیکھنے گیا تھا کہ آپ کی طرح میں بھی سیلانی ہوں؟

آزاد: سب سے بڑا دریا ہندستان میں کون ہے؟

مولوی: فرات، نہیں وہ دیکھیے بھولا جاتا ہوں اجی وہی دجلہ، دجلہ، خوب یاد آیا۔

حاضرین: واہ رے گاودی، اچھی الٹی گنگا بہائی، فرات اور دجلہ ہند میں ہیں؟ اتنا بھی نہیں جانتا۔

آزاد: چاند کے گھٹنے بڑھنے کا سبب بتاؤ۔

مولوی: واہ کیا خوب خدائی کارخانوں میں دخل دوں؟ اتنا تو کسی کی سمجھ میں آتا نہیں کہ فری مشن کیا ہے، پھر بھلا یہ کون جانے کہ چاند کیسے گھٹتا بڑھتا ہے، خدا کا حکم ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

آزاد: پانی کیوں کر برستا ہے؟

مولوی: یہ تو دادی جان تک کو معلوم تھا۔ بادل تالابوں، ندیوں، کنوؤں، گڈھوں، حوضوں سے گھس پیٹھ کر دو تین روز خوب پانی پیتا ہے، جب پی چکا تب آسمان پر اڑ گیا، منہ کھولا تو پانی رم جھم برسنے لگا۔ سیدھی سی تو بات ہے۔

حاضرین: واللہ، کیا بے پر کی اڑائی ہے! آدمی ہو یا چونچ؟ کہنے لگے، بادل پانی پیتا ہے۔

آزاد: گنتی آپ کو کہاں تک یاد ہے اور پہاڑے کہاں تک؟

مولوی: جوانی میں روپے کے ٹکے گن لیتا تھا، اب بھی آٹھ آٹھ آنے ایک دفعہ میں گن سکتا ہوں۔ مگر پہاڑے کسی حلوائی کے لڑکے سے پوچھیے۔

آزاد: ایک آدمی نے تین سو پچھتر من غلہ خریدا، رات کو چوروں نے موقع تاک کر ایک سو پچیس من اڑا لیا تو بتاؤ اس آدمی کو کتنا گھاٹا ہوا؟

مولوی: یہ جھگڑا جون پور کے قاضی چکائیں گے۔ میں کسی کے پھٹے میں پاؤں نہیں ڈالتا۔ مجھے کسی کے ٹوٹے گھاٹے سے مطلب؟ چوری چکاری کا حال تھانے داروں سے پوچھیے۔ بندا مولوی ہے ملاّ کی دوڑ مسجد تک۔

آزاد: شاہ جہاں کے وقت میں ہندستان کی کیا حالت تھی اور اکبر کے وقت میں کیا؟

مولوی: اجی، آپ تو گڑے مردے اکھاڑتے ہیں، اکبر اور شاہ جہاں دونوں کی ہڈیاں گل کر خاک ہوگئی ہوں گی اب اس پچڑے سے مطلب؟

آزاد نے حاضرین سے کہا: آپ لوگوں نے مولوی صاحب کے جواب سن لیے، اب چاہے جو فیصلہ کیجیے۔

حاضرین: فیصلہ یہی ہے کہ یہ اسی دم اپنا بوریا بستر سنبھالے۔ یہ چرکٹا ہے۔ اسے یہی نہیں معلوم کہ بحر کس چڑیا کا نام ہے، بادل کسے کہتے ہیں، دو تک کا پہاڑا نہیں یاد، گنتی جانتا

ہی نہیں، دجلہ اور فرات ہندستان میں بتلاتا ہے۔ اور چلا ہے مولوی بننے۔ لڑکوں کی مفت میں مٹی خراب کرتا ہے۔

(12)

آزاد تو ادھر سانڈنی کو سرائے میں باندھے ہوئے مزے سے سیر سپاٹے کر رہے تھے، ادھر نواب صاحب کے یہاں روز ان کا انتظار رہتا تھا کہ آج آزاد آتے ہوں گے اور صف شکن کو اپنے ساتھ لاتے ہوں گے۔ روز فال دیکھی جاتی تھی، سگون پوچھے جاتے تھے۔ مصاحب لوگ نواب کو بھڑکاتے تھے کہ اب آزاد نہیں لوٹنے کے، لیکن نواب صاحب کو ان کے لوٹنے کا پورا یقین تھا۔

ایک دن بیگم صاحبہ نے نواب صاحب سے کہا، کیوں جی تمھارا آزاد کس کھوہ میں دھنس گیا؟ دو مہینے سے تو کم نہ ہوئے ہوں گے۔

مہری : اے وہ چمپت ہوا، موا چور۔

بیگم : زبان سنبھال، تیری انھیں باتوں پر تو میں جھلا اٹھتی ہوں۔ پھر کہتی ہے کہ چھوٹی بیگم مجھ سے تیکھی رہتی ہیں۔

نواب : ہاں، آزاد کا کچھ حال تو نہیں معلوم ہوا مگر آتا ہی ہوگا۔

بیگم : آچکا۔

نواب : چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے میرا آزاد صف شکن کو لا ہی چھوڑے گا۔ دونوں میں علمی بحث ہو رہی ہوگی۔ پھر تم جانو، علم تو وہ سمندر ہے، جس کا اور نہ چھور۔

بیگم : (قہقہہ لگاکر) علمی بحث ہو رہی ہوگی؟ کیوں صاحب، میاں صف شکن علم بھی جانتے ہیں؟ میں کہتی ہوں آخر اللہ نے تم کو کچھ رتی تولہ، ماشہ عقل بھی دی ہے؟ موا بٹیر، ذرا سی جانور، کاکُن کے تین دانوں میں پیٹ بھر جائے، اسے آپ عالم کہتے ہیں۔ میرے میکہ پڑوس میں ایک سڑھی سودائی دن رات واہی تباہی بکا کرتا ہے۔ اس کی اور تمھاری باتیں ایک سی ہیں۔

مہری : کیا کہتی ہو بی بی، اس سودائی نگوڑے کو ان پر سے صدقے کر دوں۔

نواب : تم سمجھی نہیں مہری، ابھی تو الڑھ پنے ہی کے نہ دن ہیں ان کے۔ خدا کی قسم،

مجھے ان کی یہی باتیں تو بھاتی ہیں۔ یہ کم سنی کا سہاؤ ہے اور دو تین برس، پھر یہ شوخی اور چلبلا پن کہاں؟ یہ جب جھڑکتی یا گھڑکتی ہیں تو جی خوش ہو جاتا ہے۔

مہری : ہاں، ہاں، جوانی تو پھر باولی ہوتی ہی ہے۔

بیگم : اچھا، مہری تجھے اپنے بڑھاپے کی قسم جو جھوٹ بولے، بھلا بٹیر بھی پڑھے لکھے ہوا کرتے ہیں؟ منھ دیکھی نہ کہنا، اللہ لگتی کہنا۔

مہری : بڑھاپا، بڑھاپا کیسا؟ بی بی بس یہی باتیں تو اچھی نہیں لگتیں جب دیکھو تب آپ بوڑھی کہہ دیتی ہیں۔ میں بوڑھی کاہے سے ہوگئی؟ برا نہ مانیے تو کہوں آپ سے بھی ٹانٹھی ہوں۔

اتنے میں غفور خدمت گار نے پکارا : حضور، پیچوان بھرا رکھا ہے، وہاں بھیج دوں یا بغیچے میں رکھ دوں؟

نواب : یہ چاندی والی چھوٹی گڑگڑی بیگم صاحبہ کے واسطے بھر لاؤ۔ کل بسواں تمباکو آیا ہے وہی بھرنا، اور پیچوان باہر لگا دو، ہم ابھی آئے۔

یہ کہہ کر نواب نے بیگم صاحبہ کے ہنسی ہنسی میں ایک چٹکی لی اور باہر آئے۔ مصاحبوں نے کھڑے ہو ہوکر سلام کیے۔ آداب بجا لاتا ہوں حضور، تسلیمات عرض کرتا ہوں، خداوند، نواب صاحب جاکر مسند پر بیٹھے۔

خوجی : اف، موت کا سامنا ہوا، ایسا دھکّا لگا کہ کلیجہ بیٹھا جاتا ہے، ہت تیرے گیدی چور کی۔

نواب : کیوں، کیوں خیر تو ہے؟

خوجی : حضور، اس وقت بٹیر خانے کی اُور گیا تھا۔

نواب : اف، بھئی دل بے قرار ہے، خوجی میاں تم کو تو ہماری تسلّی کرنی چاہیے تھی، نہ کہ الٹے خود ہی روتے ہو، جس میں ہمارے ہاتھ پاؤں اور پھول جائیں۔ اب صف شکن سے ہاتھ دھونا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ خدا کے یہاں پہنچ گئے۔

مصاحب : خدا نہ کرے، خدا نہ کرے۔

خوجی : (پینک سے چونک کر) اسی بات پر پھر کچھ مٹھائی نہیں کھلواتے۔

نواب : کوئی ہے، اس مردک کی گردن تو ناپنا۔ ہم تو اپنی قسمتوں کو رو رہے ہیں، یہ

مٹھائی مانگتا ہے۔ بے تکا، نمک حرام۔

خوجی : دیکھیے، دیکھیے، پھر میری گردن کند چھری سے ریتی جاتی ہے۔ میں مٹھائی کچھ کھانے کے واسطے تھوڑے ہی منگواتا ہوں۔ اس لیے منگواتا ہوں کہ صف شکن کا فاتحہ پڑھوں۔

نواب : شاباش، جی خوش ہوگیا۔ معاف کرنا، بے اختیار نمک حرام کا لفظ منہ سے نکل گیا، تم بڑے ......

مصاحب : تم بڑے حلال خور ہو۔

اس پر وہ قہقہہ پڑا کہ نواب صاحب بھی لوٹنے لگے، اور بیگم نے گھر سے لونڈی کو بھیجا کہ دیکھنا تو یہ کیا ہنسی ہورہی ہے۔

نواب : بھئی، کیا آدمی ہو واللہ روتے کو ہنسانا اسی کا نام ہے۔ خوجی بیچارے کو حلال خور بنا دیا۔

خوجی : حضور، اب میں یہاں نہ رہوں گا۔ کیا بے وقت کی شہنائی سب کے سب بجانے لگے! افسوس، صف شکن کا کسی کو خیال تک نہیں۔

نواب صاحب مارے رنج کے منہ ڈھانک کر لیٹ رہے۔ مصاحبوں میں سے کوئی چنڈوخانے پہنچا، کوئی افیم گھولنے لگا۔

(13)

ادھر شوالے کا گھنٹہ بجا ٹھناٹھن، ادھر دو ناکوں سے صبح کی توپ دغی دنادن۔ میاں آزاد اپنے ایک دوست کے ساتھ سیر کرتے ہوئے بستی کے باہر جاپہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں، ایک بیل بوٹوں سے سجا ہوا بنگلہ ہے۔ احاطہ صاف، کہیں گندگی کا نام نہیں۔ پھولوں پھلوں سے لدے ہوئے درخت کھڑے جھوم رہے ہیں۔ دروازوں پر چقیں پڑی ہوئی ہیں۔ برآمدے میں ایک صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں، اور ان کے قریب دوسری کرسی پر ان کی میم صاحبہ براج رہی ہیں۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ نہ کہیں شور، نہ کہیں غل، آزاد نے کہا : زندگی کا مزہ تو یہ لوگ اٹھاتے ہیں۔

دوست : بیشک، دیکھ کر رشک آتا ہے۔

دونوں آدمی آگے بڑھے، کئی چھوٹے چھوٹے ٹٹو تیزی سے دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ ان پر خوبصورت کاٹھیاں کسی ہوئی تھیں اور کئی لڑکے بیٹھے ہوئے ہنستے بولتے چلے جاتے تھے۔ کپڑے سفید، جیسے بگلے کے پر، چہرے سرخ جیسے گلاب کا پھول۔ میاں آزاد کئی منٹ تک ان انگریز لڑکوں کا اچھلنا کودنا دیکھتے رہے۔ پھر اپنے دوست سے بولے، دیکھا آپ نے اس طرح بچوں کی پرورش ہوتی ہے، کچھ اور آگے بڑھے تو سوداگروں کی بڑی بڑی کوٹھیاں دکھائی دیں۔ اتنی اونچی گویا آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ دونوں آدمی اندر گئے، تو چیزوں کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ سبحان اللہ یہ کوٹھی ہے یا شیش محل، دنیا بھر کی چیزیں موجود۔ آزاد نے کہا: یہ تجارت کی برکت ہے۔ واہ ری تجارت! تیرے قدم دھو دھوکر پیجے۔ اتنے میں سامنے سے کئی بگھیاں آئیں۔ سب پر انگریز بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی ہندستانی کا کوسوں تک پتہ ہی نہیں۔ گویا ان کے لیے گھر سے نکلنا ہی منع ہے۔ اور آگے بڑھے تو ایک کتب خانہ نظر آیا۔ لاکھوں کتابیں چنی ہوئی، صاف ستھری سنہری جلدیں چڑھی ہوئیں۔ آدمی اگر سال بھر جم کر بیٹھے تو عالم ہوجائے۔ صبح سے آٹھ بجے تک لوگ آتے ہیں اخبار اور کتابیں پڑھتے ہیں اور دنیا کے حالات معلوم کرتے ہیں مگر ہندستانیوں کو ان باتوں سے کیا سروکار؟

دس بجے کا وقت آگیا۔ اب گھر کی سوجھی، بستی میں داخل ہوئے۔ راہ میں ایک امیر آدمی کے مکان کے دروازے پر دو لڑکوں کو دیکھا۔ نکھ سکھ سے تو درست ہے، مگر کانوں میں بالے، بھدّے بھدّے کڑے پڑے ہیں، انگرکھا، میلا کچیلا، پاجامہ گندا، ہاتھوں پر گرد، منھ پر خاک، دروازے پر ننگے پاؤں کھڑے ہیں۔ مولوی صاحب ڈیوڑھی میں بیٹھے دو اور لڑکوں کو پڑھا رہے ہیں۔ مگر ڈیوڑھی اور پاخانہ ملا ہوا ہے۔

میاں آزاد: کہیے جناب دے ٹٹوؤں پر دوڑنے والے انگریزوں کے بچے بھی یاد ہیں؟ ان کو دیکھیے میلے گندے، دن بھر پاخانے کا پڑوس۔ بھلا یہ کیسے مضبوط اور تندرست ہوسکتے ہیں؟ ہاں، زیور سے البتہ لسے ہوئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چاہے لڑکا جتنے زیور پہنے ہو، اس کو وہ سچی خوشی نہیں حاصل ہوسکتی، جو ان پیارے بچوں کو ہوا کے جھونکوں اور ٹاپوں کی کھٹکھٹ سے ملتی تھی۔ لڑکا تڑکے گجردم اٹھا، حمام میں گیا، صاف ستھرے کپڑے پہنے۔ یہ اچھا، یا یہ اچھا کہ لچکے، پٹے اور بنٹ کے کپڑوں میں جکڑ دیا جائے، زیور سر سے پاؤں تک لاد دیا جائے اور گڑھیا پر بٹھا دیا جائے کہ کوڑے کے ٹوکرے گنا کرے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سات آٹھ جوان سامنے سے گزرے۔ ابھی انیس ہی برس کا سن ہے، مگر گالوں پر جھرّیاں، کسی کی کمر جھکی ہوئی، کسی کا چہرہ زرد۔ سرخ اور سفید رنگ دھواں بن کر اڑ گیا۔ اور طرہٗ یہ کہ الف کے نام ب نہیں جانتے۔ ایک نمبر اول کے چنڈوباز ہیں، دوسرے بلا کے باتونی، وہ فراٹیں بھریں کہ بھلا چنگا آدمی دھن چکر ہوجائے۔ ایک صاحب کالج میں تعلیم پاتے تھے، مگر پروفیسر سے تکرار ہوگئی، جھٹ مدرسہ چھوڑا۔ دوسرے صاحب اپنے داہنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے بائیں ہاتھ پر تال بجا رہے ہیں۔ دِھن تا دِھن تا۔ دو صاحب بہادر نامی بٹیر کے گھٹ جانے کا افسوس کر رہے ہیں۔ کسی کو ناز ہے کہ میں بانے کی کنکیا خوب لڑاتا ہوں، تکّل خوب بڑھاتا ہوں۔

میاں آزاد نے کہا : ان لوگوں کو دیکھیے، اپنی زندگی کس طرح خراب کر رہے ہیں۔ شریفوں کے لڑکے ہیں مگر بری صحبت ہے۔ پڑھنا لکھنا چھوڑ بیٹھے۔ اب مٹرگشتی سے کام ہے۔ کسی کو قلم پکڑنے کا شعور نہیں۔

اتنے میں دو صاحب اور ملے۔ توند نکالے ہوئے، موٹے تھل تھل۔ آزاد نے کہا ان دونوں کو پہچان رکھیے۔ ان عقل کے دشمنوں نے روپے کو دفن کر رکھا ہے۔ ایک کے پاس دو لاکھ سے زیادہ ہیں اور دوسرے کے پاس اس سے بھی زیادہ، مگر زمین کے نیچے۔ بیوی اور لڑکوں کو کچھ زیور تو بنوا دیئے ہیں باقی اللہ اللہ خیر صلی اللہ۔ اگر تجارت کریں تو اپنا بھی فائدہ ہو اور دوسروں کا بھی۔ مگر یہ سیکھا ہی نہیں۔ بنگال بنک اور دہلی بنک تو پہلے سنا کرتے تھے یہ زمین کا بنک آج نیا سنا۔

دونوں آدمی گھر پہنچے۔ کھانا کھا کر لیٹے۔ شام کو پھر سیر کرنے کی سوجھی۔ ایک باغ میں جا پہنچے۔ کئی آدمی بیٹھے حقہ اڑاتے تھے اور کسی بات پر بحث کرتے تھے۔ بحث سے تکرار شروع ہوئی۔ مرزا سعید نے کہا۔ بھئی کل جگ ہے، کل جگ۔ اس میں جو نہ ہو وہ تھوڑا۔ اب پرانے رسموں کو لوگ دقیانوسی بتاتے ہیں، شادی بیاہ کے خرچ کو فضول کہتے ہیں۔ بچوں کو زیور پہنانا گالی ہے۔ اب کوئی ان لوگوں سے اتنا تو پوچھے کہ جو رسم باپ دادوں کے وقت سے چلی آتی ہے اس کو کوئی کیوں کر مٹائے؟

یکا یک پورب کی طرف سے شور و گل کی آواز سنائی دی۔ کسی نے کہا چور آیا، لینا جانے نہ پائے۔ کوئی بولا سانپ ہے۔ کوئی بھیڑیا بھیڑیا چلاّ اٹھا۔ کسی کو شک ہوا کہ آگ لگی۔ سب

کے سب بھڑبھڑا کر کھڑے ہوئے۔ تو چور نہ چکار، بھیڑیا نہ سیار۔ ایک میاں صاحب لنگوٹ کسے لٹھ ہاتھ میں لیے اکڑے کھڑے ہیں، اور ان سے دس قدم کے فاصلے پر کوئی لالہ جی بانس کی کھپاچ لیے ڈٹے کھڑے ہیں۔ اردگرد تماشائیوں کی بھیڑ ہے۔ ادھر میاں صاحب پینترے بدل رہے ہیں، ادھر لالہ انگلیاں مٹکا مٹکا کر غل مچا رہے ہیں۔ مرزا سعید نے پوچھا میاں صاحب، خیر تو ہے؟ میاں کیا عرض کروں مرزا صاحب، آپ کو دل لگی سوجھتی ہے اور یہاں جان پر بن گئی ہے۔ یہ لالہ میرے پڑوسی ہیں۔ ان کا قاعدہ ہے کہ ٹھرا پی کر ہزاروں گالیاں مجھے دیا کرتے ہیں۔ آج کوٹھے پر چڑھ کر خدا کے واسطے لاکھوں باتیں سنائیں۔ اب فرمایئے آدمی کہاں تک ضبط کرے؟ لاکھ سمجھایا کہ بھائی آدمی سے اونٹ اور انسان سے بے دُم کے گدھے نہ بن جاؤ، مگر یہ بادشاہ کی نہیں سنتے۔ میں کس گنتی میں ہوں۔ تال ٹھوک کر لڑنے کو تیار ہوگئے۔ خدا نہ کرے کسی بھلے مانس کو ان پڑھ سے سابقہ پڑے۔

لالہ : اور سنیئے گا، ہم چار پانچ برس لکھنؤ میں رہے، ان پڑھ ہی رہے۔

میاں : بارہ برس دلی میں رہ کر تم نے کیا سیکھ لیا جو اب چار سال لکھنؤ میں رہنے سے فاضل ہوگئے۔

لالہ : یہ ساٹھ برس سے ہمارے پڑوسی ہیں، خوب جانتے ہیں کہ برس دن کا تہوار ہے، ہم شراب ضرور پییں گے، چسکی لگائیں گے، نشے میں گالیاں ضرور سنائیں گے۔ اب اگر کوئی کہے شراب کلیا چھوڑ دو، تو ہم اپنی پرانی رسم کو کیوں کر چھوڑیں؟

مرزا سعید : اجی لالہ صاحب، بہت بہکی بہکی باتیں نہ کیجیے، ہم نے مانا کہ پرانی رسم ہے، مگر ایسی رسم پر تین حرف! آپ دیکھیں تو کہ اس وقت آپ کی کیا حالت ہے۔ کیچڑ میں لپ پت، سر پیر کی خبر نہیں، بھلے مانسوں کو گالیاں دیتے ہو اور کہتے ہو کہ یہ تو ہماری رسم ہے۔

آزاد : مرزا سعید، ذرا مجھ سے تو آنکھیں ملایئے۔ شرمائے تو نہ ہوں گے؟ ابھی تو آپ کہتے تھے کہ پرانی رسم کو کوئی کیوں کر مٹائے۔ یہ بھی تو لالہ جی کی پرانی رسم ہے، جس طرح ہوتی آئی ہے، اسی طرح اب بھی ہوگا۔ یہ دھوپ چھاؤں کی رنگت آپ نے کہاں پائی؟ گرگٹ کی طرح رنگ کیوں بدلنے لگے؟ جناب بری رسم کا ماننا حماقت کی نشانی ہے۔

مرزا سعید بغلیں جھانکنے لگے۔ آزاد اور ان کے دوست اور آگے بڑھے تو دیکھتے کیا ہیں کہ ایک گنوار عورت روتی چلی جاتی ہے، اور ایک مرد چپکے چپکے سمجھا رہا ہے۔ چپائی مار، چپائی

مار۔ میاں آزاد سمجھے کوئی بدمعاش ہے۔ للکارا، کون ہے بے تو، اس عورت کو کہاں بھگائے لیے جاتا ہے؟ اس گنوار نے کہا صاحب بھگائے نہیں لیے جاتے، یو ہماری مہریا آے، ہمرے ایہاں رسم ہے کہ جب مہریا میکہ سے سسرار جات ہے تو دوئی تین کوس لوں روت ہے۔

سعید : واللہ، میں کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ خدا کی پناہ، رسم کی مٹی خراب کردی۔

آزاد : بجا ہے، ابھی آپ اس بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟ بات یہ ہے کہ پڑھے لکھے آدمیوں کو بری رسموں کا ماننا مناسب نہیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ عقل کی آنکھوں کو پاکٹ میں بند کر کے پرانی رسموں کے ڈھرّے پر چلنا شروع کریں۔ اور اتنی ٹھوکریں کھائیں کہ قدم قدم پر منھ کے بل گریں۔ خدا نے عقل اس لیے نہیں دی کہ پرانی رسموں میں سدھار نہ کریں، بلکہ اس لیے کہ زمانے کے مطابق ادل بدل کرتے رہیں۔ اگر پرانی باتوں کی پوری پوری پیروی کی جاتی تو یہ جام دامنی کے کرتے اور شربتی کے انگرکھے نظر نہ آتے۔ لوگ ننگے پھرتے ہوتے۔ گلاب اور کباب کے بدلے ہم پاڑھے اور ہرن کا کچا گوشت کھاتے ہوتے۔ خدا نے آنکھیں دی ہیں، مگر افسوس کہ ہم نے بند کرلیں۔

مرزا سعید : تو آپ ناچ رنگ جلسوں کے بھی دشمن ہوں گے؟ آپ کہیں گے کہ یہ بھی بری رسم ہے؟

آزاد : بے شک بری رسم ہے۔ میں اس کا دشمن تو نہیں ہوں، مگر خدا نے چاہا تو بہت جلد ہو جاؤں گا۔ یہ کتنی بے ہودہ بات ہے کہ ہم لوگ عورتوں کو روپے کا لالچ دے کر اس طرح ذلیل کرتے ہیں۔

مرزا سعید : تو یہ کہیے کہ آپ کورے ملّا ہے۔ یہ سمجھ لیجیے کہ ان حسینوں کا دم غنیمت ہے۔ دنیا کے چہل پہل ان کے دم سے، محفل کی رونق ان کے قدم سے۔ یہاں تو جب تک طبلے کی گمک نہ ہو، چاند سے مکھڑے کی جھلک نہ ہو، کڑوں کی جھنکار نہ ہو، چھڑوں کی چھنکار نہ ہو، چھماچھم کی آواز نہ آئے کمرہ نہ سجے، تال نہ بجے، دھماچوکڑی نہ مچے، منہدی نہ رچے، رنگ رلیاں نہ منائیں، شادیانے نہ بجائیں، آوازیں نہ کریں، عطر میں نہ بسیں، طعنے نہ سنیں، سر نہ دھنیں، گلے بازی نہ ہو، آنکھوں میں لال ڈورے نہ ہوں، شراب کباب نہ ہوں، پریاں بلبل کی طرح چہکتی نہ ہوں، سیوتی کے پھول اور حنا کی ٹٹیاں مہکتی نہ ہوں، قہقہے نہ ہوں، چہچہے نہ ہوں تو کس گوکھے کا دم بھر جینے کو جی چاہے؟ واللہ، محفل باولے کتّے کی طرح کاٹ کھائے

محفل میں گدگداتی ہو، شوخی نگاہ کی
شیشوں سے آرہی ہو صدا واہ واہ کی

ادھر جام مُل (شراب) ہو، ادھر صراحی کی کل کل ہو، ادھر گل ہو، ادھر بلبل ہو، محفل کا رنگ خوب جما ہو، سماں بندھا ہو، پھر جو آپ کی گردن بھی نہ ہل جائے، تو جھک کر سلام کرلوں۔ اب غور فرمائیے کہ ایسے طائفے کو جو ڈبیا میں بند کر رکھنے قابل ہے، آپ ایک قلم مٹا دینا چاہتے ہیں؟

آزاد : جناب آپ کو اپنی طوائفیں مبارک ہو۔ یہاں اس پھیر میں نہیں پڑتے، یہ باتیں کرتے ہوئے لوگ اور آگے بڑھے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ مُست ہاتھی پر ایک مہنت جی سوار گیروئے کپڑے پہنے، بھبھوت رمائے، پالتھی مارے بڑے ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں۔ چیلے چاپڑ ساتھ ہیں۔کوئی گھوڑے کی پیٹھ پر سوار؛ کوئی پیدل، کوئی پیچھے بیٹھا مرچھل ہلاتا ہے، کوئی نرسنگھا بجاتا ہے۔ آزاد بولے۔ کوئی ان مہنت جی سے پوچھے کہ آپ خدا کی عبادت کرتے ہیں، یا دنیا کے مزے اڑاتے ہیں؟ آپ کو اس ٹیم ٹام سے کیا مطلب؟

مرزا سعید : کچھ باپ کی کمائی تو ہے نہیں، احمقوں نے جاگیریں دے دیں، مہنت بنا دیا۔ اب یہ موجیں کرتے ہیں۔

آزاد : جاگیر دینے والوں کو کیا معلوم تھا کہ ان کے بعد مہنت لوگ یوں گلچھرے اڑائیں گے؟ یہ تو ہمارا کام ہے کہ ان مہنتوں کی گردن پکڑیں اور کہیں اتر ہاتھی سے، لے ہاتھ میں کمنڈل۔

یکایک کسی نے چھینک دیا۔ سعید بولے۔ ہت تیرے چھینکنے والے کی ناک کاٹوں۔ یار ذرا ٹھہر جاؤ، چھینکتے چلنا بدشگونی ہے۔

آزاد : تو جناب، ہمارا اور آپ کا ساتھ ہوچکا۔ یہاں چھینک کی پروا نہیں کرتے۔ آپ پر کوئی آفت آئے تو ہمارا ذمہ۔

ابھی دس قدم بھی نہ گئے تھے کہ بلی راستہ کاٹ گئی۔ سعید نے آزاد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ بھئی عجب بے تکے آدمی ہو، بلی راہ کاٹ گئی اور تم سیدھے چلے جاتے ہو؟ ذرا ٹھہرو، پہلے کوئی اور جائے تب ہم بھی چلیں۔

اب سنیے کہ آدھ گھنٹے تک منھ کھولے کھڑے ہیں۔ یا خدا کوئی ادھر سے آئے۔ آزاد نے جھلا کر کہا: بھئی ہم کو آپ کا ساتھ اجیرن ہوگیا۔ یہاں ان باتوں کے قائل نہیں۔ خیر وہاں خدا خدا کرکے چلے تو تھوڑی دیر کے بعد سعید نے پھر آزاد کو روکا۔ ہائیں ہائیں، خدا کے واسطے ادھر سے نہ جانا۔ میاں اندھے ہو، دیکھتے نہیں، گدھے کھڑے ہیں۔ آزاد نے کہا۔ گدھے تو آپ خود ہیں۔ ڈنڈا اٹھایا تو دونوں گدھے بھاگے۔ پھر جو آگے بڑھے تو سعید کی بائیں آنکھ پھڑکی۔ غضب ہی ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے، ساری چوکڑی بھول گئے۔ بولے۔ یار کوئی تدبیر بتاؤ، بائیں آنکھ بے طرح پھڑک رہی ہے۔ مرد کی بائیں اور عورت کی داہنی آنکھ کا پھڑکنا برا شگن ہے۔ آزاد کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ عجیب آدمی ہیں آپ! چھینک ہوئی اور حواس غائب، بلّی نے راستہ کاٹا اور ہوش پینترے، گدھے دیکھے اور اوسان خطا، اور جو بائیں آنکھ پھڑکی تو ستم ہی ہوا! میاں کہنا مانو ان خرافات باتوں میں نہ جاؤ۔ یہ وہم ہے، جس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں، میرا اور آپ کا ساتھ ہو چکا۔ آپ اپنا راستہ لیجیے، بندا رخصت ہوتا ہے۔

(14)

میاں آزاد ٹھوکریں کھاتے، ڈنڈا ہلاتے، مارے مارے پھرتے تھے کہ یکایک سڑک پر ایک خوبصورت جوان سے ملاقات ہوئی۔ اس نے انھیں نظر بھر کر دیکھا پر یہ پہچان نہ سکے۔ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ جوان نے کہا:

ہم بھی تسلیم کی خوں ڈالیں گے
بے نیازی تیری عادت ہی سہی

آزاد نے پیچھے پھر کر دیکھا تو جوان نے پھر کہا:

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

کہیے جناب، پہچانا یا نہیں؟ یہ اڑن گھائیاں، گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ میاں آزاد چکرائے کہ یہ کون صاحب ہیں۔ بولے۔ حضرت میں بھی اس اٹھتی ہی جوانی میں آنکھیں کھو بیٹھا۔ واللہ، کس مردود نے آپ کو پہچانا ہو۔

جوان : ایں کمال کیا! واللہ اب تک نہ پہچانا! میاں ہم تمھارے لنگوٹیے یار ہیں انور۔

آزاد : اخاہ، انور! ارے یار تمھاری تو صورت ہی بدل گئی۔

یہ کہہ کر دونوں گلے ملے اور ایسے خوش ہوئے کہ دونوں کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ آزاد نے کہا : ایک وہ زمانہ تھا کہ ہم تم برسوں ایک جگہ رہے، ساتھ ساتھ مٹر گشتی کی، کبھی باغ میں سیر کر رہے ہیں، کبھی چاندنی رات میں وہاگ اڑا رہے ہیں، کبھی جنگل میں منگل گا رہے ہیں، کبھی علمی بحث کر رہے ہیں، کبھی بانک کا شوق ہے، کبھی لکڑی کی دھن، وہ دن اب کہاں!

انور نے کہا : بھئی، چلو اب ساتھ ساتھ رہیں، جیئیں یا مریں، مگر چار دن کی زندگی میں ساتھ نہ چھوڑیں۔ چلو ذرا بازار کی سیر کر آئیں۔ مجھے کچھ سودا لینا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں چوک چلے۔ پہلے بزازے میں دھنسے۔ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں، آیئے، آیئے، اجی میاں صاحب، کیا خریداری منظور ہے؟ خاں صاحب، کپڑا خریدیے گا؟ آیئے وہ وہ کپڑے دکھاؤں کہ بازار بھر میں کسی کے پاس نہ نکلیں۔ دونوں ایک دکان میں جا کر بیٹھ گئے۔ دکان میں ٹاٹ بچھا ہے، اس پر سفید چاندی، اور لالہ نین سکھ یا ڈوریے کا انگرکھا ڈالے بڑی شان سے بیٹھے ہیں۔ تو ند وہ فرمائشی جیسے روپے کے دو والے تربوز، ایک طرف تن زیب، شربتی اڈھی کے تھانوں کی قطار ہے، دوسری طرف موی چھینٹ اور فلالین کی بہار ہے۔ الگنی پر رومال قرینے سے لٹکے ہوئے، لال بھبھوکا یا سفید جیسے بگلے کے پر، یا ہرے ہرے دھانی، جیسے لہر، دروازہ لال رنگا ہوا، پنّی سے مڑھا ہوا۔ دیوار پر سیکڑوں چڑیاں ٹنگی ہوئیں۔

انور : بھئی، سیاہ مخمل دکھانا۔

بزاز : بدلو بدلو، ذری خاں صاحب کو کالی مخمل کا تھان دکھاؤ، بڑھیا۔

لالہ بدلو کئی تھان تڑ سے اٹھا لائے، سوتی، بوٹی دار، انور نے کئی تھان دیکھے اور تب دام پوچھے۔

لالہ : گزوں کے حساب سے بتاؤں یا تھان کے دام۔

انور : بھئی، گزوں کے حساب سے بتاؤ، مگر لالہ جھوٹ کم بولنا۔

لالہ نے قہقہہ اڑایا، حضور ہماری دکان میں ایک بات کے سوا دوسری نہیں کہتے۔ کون میل پسند ہے؟ انور نے ایک تھان پسند کیا اس کی قیمت پوچھی۔

لالہ : سنیے خداوند، جی چاہے لیجیے، جی چاہے نہ لیجیے، مول دس روپے گز سے کم نہ ہوگی۔

انور : ایں، دس روپے گز! یار خدا سے تو ڈرو، اتنا جھوٹ۔

لالہ؟ اچھا، تو آپ بھی کچھ فرماؤ۔

انور : ہم چار روپے گز سے ٹکا زیادہ نہ دیں گے۔

آزاد نے انور سے کہا : چار روپے گز میں نہ دے گا۔

انور : آپ چپکے بیٹھے رہیں، آپ کو ان باتوں میں ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ 'شیخ کیا جانے صابن کا بھاؤ؟'

لالہ : چار روپے گز تو بازار بھر میں نہ ملے گی۔ اچھا آپ سات کے دام دے دیجیے۔ بولیے کتنی خریداری منظور ہے؟ دس گز اتاروں؟

انور : کیا خوب، دام چکائے ہی نہیں اور گزوں کی فکر پڑ گئی۔ واجبی بتاؤ، واجبی، ہمیں چکما نہ دو، ہم ایک گھاگھ ہیں۔

لالہ : اچھا صاحب، پانچ روپے گز لیجیے گا؟ یا اب بھی چکمہ ہے؟

انور : اب بھی مہنگی ہے، تمھاری خاطر سے سوا چار سہی۔ بس پانچ گز اتار دو۔

لالہ نے ناک بھوں چڑھا کر پانچ گز مخمل اتار دی، اور کہا آپ بڑے کڑے خریدار ہیں۔ ہمیں گھاٹا ہوا، ان داموں شہر بھر میں نہ پایئے گا۔

آزاد : بھئی، قسم ہے خدا کی، میرا ایسا اناڑی تو پھنس ہی جائے اور وہ غچا کھائے کہ عمر بھر نہ بھولے۔

انور : جی ہاں، یہاں کا یہی حال ہے۔ ایک کے تین مانگتے ہیں۔

یہاں سے دونوں آدمی انور کے گھر چلے۔ چلتے چلتے انور نے کہا لو خوب یاد آیا۔ اس پھاٹک میں ایک بانکے رہتے ہیں۔ ذری میں ان سے مل لوں۔ میاں آزاد اور انور دونوں پھاٹک میں ہو رہے، تو کیا دیکھتے ہیں ایک ادھیڑ عمر کا کڑیل آدمی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ گھٹنہ چوڑی دار، چست، ذرا شکن نہیں۔ چنٹ دار انگرکھا ایڑی تک، چھاتا گول کٹا ہوا۔ چڈّی اونچی، نکّے دار ماشے بھر کی کٹی ہوئی ٹوپی۔ سروہی سامنے رکھی ہے اور جگہ جگہ کرولی کٹار، کھاڑا، تلواریں چنی ہوئی ہیں۔ سلام کلام کے بعد انور نے کہا، جناب وہ بندوق آپ

نے پچاس روپے کی خریدی تھی، دو دن کا وعدہ تھا، جس کے چھ مہینے ہوگئے مگر آپ سانس ڈکار تک نہیں لیتے۔ بندوق ہضم کرنے کا ارادہ ہو تو صاف صاف کہہ دیجیے روز کی ٹھائیں ٹھائیں سے کیا فائدہ؟

بانکے : کیسی بندوق، کس کی بندوق؟ اپنا کام کرو، میرے منھ نہ چڑھنا میاں ہم بانکے لوگ ہیں سیکڑوں کے غچے، ہزاروں کو جھانسے دیے، آپ بیچارے کس کھیت کی مولی ہیں؟ یہاں سو پشت سے سپہ گری ہوتی آئی ہے۔ ہم اور دام دیں؟

انور : واہ، اچھا بانکپن ہے کہ آنکھ چوکی اور کپڑا غائب، کمبل ڈالا اور لوٹ لیا۔ کیا بانکپن اسی کا نام ہے؟ ایسا تو لکے لچے کیا کرتے ہیں۔ آج کے ساتویں دن بائیں ہاتھ سے روپے گن دیجیے گا ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

بانکے نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا : معلوم ہوتا ہے تمھاری موت ہمارے ہاتھ بدی ہے۔ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بناؤ۔ بانکوں سے ٹکرانا اچھا نہیں۔

اس تکرار اور توتو میں میں کے بعد دونوں آدمی گھر چلے۔ ادھر ان بانکے کا بھانجہ، جو اکھاڑے سے آیا اور گھر میں گیا، تو کیا دیکھتا ہے کہ سب عورتیں ناک بھوں چڑھائے، منھ، غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔ اے خیر تو ہے؟ یہ آج سب چپ چاپ کیوں بیٹھے ہیں؟ کوئی منکتا ہی نہیں، اتنے میں اس کی ممانی کڑک کر بولی، اب چوڑیاں پہنو چوڑیاں، اور بہو بیٹیوں میں دب کر بیٹھ رہو۔ وہ موا کروڑوں باتیں سنا گیا، پکے پہر بھر تک اول جلول بکا کیا اور تمھارے ماموں بیٹھے سب سنا کیے۔ 'پھیری منھ پر لوئی، تو کیا کرے گا کوئی' جب شرم نگوڑی بھون کھائی تو پھر کیا۔ یہ نہ ہوا کہ موئے کل جیبھے کی زبان تالو سے کھینچ لے۔

بھانجے کو جوانی کا جوش تھا، شیر کی طرح بپھرتا ہوا باہر آیا۔ بولا: ماموجان، یہ آج آپ سے کس سے تکرار ہوگئی؟ عورتیں تک جھلا اٹھیں اور آپ چپکے بیٹھے سنا کیے؟ واللہ عزت ڈوب گئی۔ لو اب جلدی اس کا نام بتائیے، ابھی آنتوں کا ڈھیر کیے دیتا ہوں۔

ماموں : ارے، وہی انور تو ہے۔ اس کا قرض دار ہوں۔ دو باتیں سنائے بھی تو کیا؟ اور وہ ہے ہی بیچارہ کیا کہ اس سے بھڑتا! وہ پدّی میں باز، وہ دبلا پتلا آدمی میں پرانا استاد۔ بولنے کا موقع ہوتا تو اس وقت اس کی لاش نہ پھڑکتی ہوتی؟ لے غصہ تھوک دو، جاؤ کھانا کھاؤ، آج میٹھے ٹکڑے پکے ہیں۔

بھانجہ : قسم خدا کی، جب تک اس مردود کا خون نہ پی لوں، تب تک کھانا حرام ہے۔ بیٹھے ٹکڑوں پر آپ ہی ہتھے لگائیے۔ یہ کہہ کر گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ ماموں نے لاکھ سمجھایا مگر ایک نہ مانی۔

ادھر انور جب گھر پہنچے تو دیکھتے کیا ہیں ان کا لڑکا تڑپ رہا ہے۔گھبرائے، وہ کیا خیریت تو ہے؟ لونڈی نے کہا، بھیا یہاں کھیل رہے تھے کہ بچھو نے کاٹ لیا۔ تبھی سے بچا تڑپ کر لوٹ رہا ہے۔ انور نے آزاد کو وہیں چھوڑا اور خود اسپتال چلے کہ جھٹ پٹ ڈاکٹر کو بلا لائیں۔ مگر ابھی پچاس قدم بھی نہ گئے ہوں گے کہ سامنے سے اس بانکے کا بھانجہ آ نکلا۔ آنکھیں چار ہوئیں، دیکھتے ہی شیر کی طرح گرج کر بولا، لے سنبھل جا ابھی سر خون میں لوٹ رہا ہوگا۔ ہلا اور میں نے ہاتھ دیا۔ بانکوں کے منھ چڑھنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ بیچارے انور بہت پریشان ہوئے۔ ادھر لڑکے کی وہ حالت ادھر اپنی یہ گت۔ جسم میں طاقت نہیں، دل میں ہمت نہیں۔ بھاگیں تو قدم نہیں اٹھتے۔ ٹھہریں تو پاؤں نہیں جمتے۔ سیکڑوں آدمی اردگرد جمع ہوگئے اور بانکے کو سمجھانے لگے۔ جانے دیجیے، ان کے مقابلے میں کھڑے ہونا آپ کے لیے شرم کی بات ہے۔ انور کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لوگوں سے بولے۔ بھائی اس وقت میرا بچہ گھر پر تڑپ رہا ہے، ڈاکٹر کو بلانے جاتا تھا کہ راہ میں انھوں نے گھیرا۔ اب کسی صورت سے مجھے بچاؤ۔ مگر اس بانکے نے ایک نہ مانی۔ پینترا بدل کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ اتنے میں کسی نے انور کے گھر خبر پہنچائی کہ میاں سے ایک بانکے سے تلوار چل گئی۔ جتنے منھ اتنی باتیں۔ کسی نے کہہ دیا کہ چرکا کھایا اور گردن کھٹ سے الگ ہوگئی۔ یہ سنتے ہی انور کی بیوی سر پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ لوگو دوڑو، ہائے مجھ پر بجلی گری۔ ہائے میں جیسے جی مر مٹی۔ پھر بچے سے چمٹ کر ولاپ کرنے لگی۔ میرے بچے، اب تو اناتھ ہوگیا، تیرا باپ دغا دے گیا۔ ہائے میرا سہاگ لٹ گیا۔

میاں آزاد یہ خبر پاتے ہی تیر کی طرح گھر سے نکل کر اس مقام پر جا پہنچے۔ دیکھا تو وہ ظالم تلوار ہاتھ میں لیے مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑ رہا ہے۔ آزاد نے جھٹ سے جھپٹ کر انور کو ہٹایا اور پینترا بدل کر بانکے کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ وہ تو جوانی کے نشے میں مست تھا پہلے ہتھکڑی کا ہاتھ لگانا چاہا مگر آزاد نے خالی دیا۔ وہ پھر جھپٹا اور چاہا کہ چاکی کا ہاتھ جمائے مگر یہ آڑے ہوگئے۔

آزاد : بچا، یہ اڑن گھائیاں کسی گنوار کو بتانا۔ میرے سامنے چکے چھوٹ جائیں تو سہی، آؤ چوٹ پر۔ وہ بانکا جھلا کر جھپٹا اور گھٹنا ٹیک کر پالٹ کا ہاتھ لگانے ہی کو تھا کہ آزاد نے پینترا بدلا اور توڑ کیا، موڑھا، موڑھا تو اس نے بچایا مگر آزاد نے ساتھ ہی جنیوے کا وہ تلا ہوا ہاتھ جمایا کہ اس کا بھنڈارا تک کھل گیا۔ دھم سے زمین پر آگرا۔ میاں آزاد کو سب نے گھیر لیا، کوئی پیٹھ ٹھوکنے لگا کوئی ڈنڈ ملنے لگا۔ انور لپکے ہوئے گھر گئے۔ بیوی کی باچھیں کھل گئیں گویا مردہ جی اٹھا۔

دوسرے دن انور اور آزاد کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ڈاکیہ ہری ہری وردی پھڑکائے لال لال پگیہ جمائے خاصا ٹیاں بنا ہوا آیا اور ایک اخبار دے کر لمبا ہوا۔ انور نے جھٹ پٹ اخبار کھولا، عینک لگائی، اور اخبار پڑھنے لگے۔ پڑھتے پڑھتے آخری صفحہ پر نظر پڑی تو چہرہ کھل گیا۔

آزاد : یہ کیوں خوش ہوگئے بھئی؟ کیا خبر ہے؟

انور : دیکھتا ہوں کہ یہ اشتہار یہاں کیسے آپہنچا؟ اخباروں میں ان باتوں کا کیا ذکر؟ دیکھیے۔

'ضرورت ہے ایک عربی پروفیسر کی نظیر پور کالج کے لیے۔ تنخواہ دو سو روپے مہینہ'۔

آزاد : اخباروں میں سبھی باتیں ہوتی ہیں، یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ اخبار لڑکوں کا استاد، جوانوں کو سیدھی راہ بتانے والا، بڈھوں کے تجربے کی کسوٹی، سوداگروں کا دوست، کاریگروں کا ہمدرد، رعایا کا وکیل سب کچھ ہے۔ کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ، کہیں نوٹس اور اشتہار، انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں، اور دیسی اخبار بھی ان کی نقل کرتے ہیں۔ شطرنج کے نقشے، قومی تمسکوں کا نرخ، گھڑدوڑ کی چرچا، سبھی کچھ ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی عہدہ خالی ہوا اور اچھا آدمی نہ ملا، تو حکام اس کا اشتہار دیتے ہیں۔ لوگوں نے پڑھا اور درخواست لگا دی، لگا تو تیر نہیں تکا۔

انور : تب تو نئے نئے اشتہار چھپنے لگیں گے۔ کوئی نئے گنج آباد کرے، تو اس کو چھپوانا پڑے گا، ایک نوجوان ساکن کی ضرورت ہے، نئے گنج میں دکان جمانے کے لیے، کیوں کہ جب تک دھواں دھار چلمیں نہ اڑیں، چرس کی لو آسمان کی خبر نہ لائے، تب تک گنج کی رونق نہیں۔ افیمچی اشتہار دیں گے کہ ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو افیم گھولنے میں تاک ہو،

دن رات پینک میں رہے، مگر افیم گھولنے کے وقت چونک اٹھے۔ آرام طلب لوگ چھپوائیں گے کہ ایک ایسے قصہ کہنے والے کی ضرورت ہے، جس کی زبان کترنی کی طرح چلی جائے، جس کے امیر حمزہ کی داستان زبان پر ہو، زمین اور آسمان کے کلابے ملائے، جھوٹ کے چھپر اڑائے، شام سے جو بکنا شروع کرے، تو تڑکا کر دے۔ خوشامد پسند لوگ چھپوائیں گے کہ ایک ایسے مصاحب کی ضرورت ہے، جو آٹھوں گانٹھ کمیّت ہو، ہاں میں ہاں ملائے، ہم کو سخاوت میں حاتم، دلیری میں رستم، عقل میں ارسطو بنائے، منھ پر کہے کہ حضور ایسے اور حضور کے باپ ایسے، مگر پیٹھ پیچھے گالیاں دے کہ اس گدھے کو میں نے خوب بنایا۔ بے فکرے چھپوائیں گے کہ ایک بٹیر کی ضرورت ہے جو بڑھ بڑھ کر لات لگاتا ہو، ایک مرغ کی، جو سوائے ڈیوڑھے کو مارے، ایک میڈھے کی جو پہاڑ میں ٹکر لینے سے بند نہ ہو۔

اتنے میں مرزا سعید بھی آ بیٹھے۔ بولے بھئی ہماری بھی ایک ضرورت چھپوا دو۔ ایک ایسی جورو چاہیے جو چالاک اور چست ہو، نکھ سکھ سے درست ہو، شوخ اور چنچل ہو، کبھی کبھی ہنسی میں ٹوپی چھین کر چپت بھی جمائے، کبھی روٹھ جائے، کبھی گدگدائے، خرچ کرنا نہ جانتی ہو، ورنہ ہم سے میزان نہ پٹے گی، لال منھ ہو، سفید ہاتھ پاؤں ہوں، لیکن اونچے قد کی نہ ہو، کیوں کہ میں ناٹا آدمی ہوں، کھانا پکانے میں استاد ہو، لیکن ہاضمہ خراب ہو، ہلکی پھلکی دو چپاتیاں کھائے تو تین دن میں ہضم ہو، سادا مزاج ایسی ہو کہ کہنے پاتے سے مطلب ہی نہ رکھے، ہنس مکھ ہو، روتے کو ہنسائے، مگر یہ نہیں کہ پھٹی جوتی کی طرح بے موقع دانت نکال دے، درخواست کھٹا کھٹ آئیں، ہاں یہ بھی یاد رہے کہ بی بی صاحبہ کے منھ پر داڑھی نہ ہو۔

آزاد : اور تو خیر، مگر یہ داڑھی کی بڑی کڑی شرط ہے۔ بھلا کیوں صاحب، عورتیں بھی مچھکو ہوا کرتی ہیں؟

سعید : کون جانے بھئی، دنیا میں سبھی طرح کے آدمی ہوتے ہیں۔ جب بے مونچھ کے مرد ہوتے ہیں، تو مونچھ والی عورتوں کا ہونا بھی ممکن ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہماری مونچھ اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی ہمارے ہاتھ میں ہو۔

آزاد : اجی، جائیے بھی، عورت کے بھی کہیں داڑھی ہوتی ہے؟

سعید۔ ہو یا نہ ہو، مگر یہ پخ ہم ضرور لگائیں گے۔

آپس میں یہی مذاق ہو رہا تھا کہ پڑوس سے رونے پیٹنے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کوئی

بوڑھا آدمی مر گیا۔ آزاد بھی وہاں جا پہنچے۔ لوگوں نے پوچھا، انھیں کیا بیماری تھی؟ ایک بوڑھے نے کہا، یہ نہ پوچھیے حُمق کی بیماری تھی۔

آزاد : یہ کون بیماری ہے؟ یہ تو کوئی نیا مرض معلوم ہوتا ہے۔ اس کی علامتیں تو بتائیے۔

بوڑھا : کیا بتاؤں، عقل کی مار اس کا خاص سبب ہے۔ اسّی برس کے تھے، مگر عقل کے پورے، تمیز چھو نہیں گئی۔ خدا جانے دھوپ میں بال سفید کیے تھے یا نزلہ ہوگیا تھا۔ حضرت کی پیٹھ پر ایک پھوڑا نکلا۔ دس دن تک علاج ندارد۔ دسویں دن کسی گنوار نے کہہ دیا کہ گل عباس کے پتے اور سرکہ باندھو۔ جھٹ سے راضی ہوگئے۔ سرکہ بازار سے خریدا، پتے باغ سے توڑ لائے، اور سرکے میں پتوں کو خوب تر کرکے پیٹھ پر باندھا۔ دوسرے روز پھوڑا آدھ انگل بڑھ گیا۔ کسی اور گوکھے نے کہہ دیا کہ بھٹ کٹیا باندھو، یہ ٹوٹکا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درد اور بڑھ گیا۔ کسی نہ بتایا کہ املی کی پتی، دھتورا، اور گوبر باندھو۔ وہاں کیا تھا، فوراً منظور۔ اب تڑپنے لگے۔ آگ لگ گئی۔ محلّے کی ایک عورت نے کہا، میں بتاؤں، مجھ سے کیوں نہ پوچھا سَرل ترکیب ہے، مولی کے اچار کے تین کتلے لے کر زمین میں گاڑ دو۔ تین دن کے بعد نکالو، اور کوئیں میں ڈال دو۔ پھر اسی کوئیں کا پانی اپنے ہاتھ بھر کر پی جاؤ۔ اسی دم چنگے نہ ہوجاؤ تو ناک کٹا ڈالوں۔ سوچے، بھئی اس نے شرط بڑی کڑی کی ہے۔ کچھ تو ہے کہ ناک بدل لی۔ جھٹ مولی کے کتلے گاڑے، اور کوئیں میں ڈال پانی بھرنے لگے۔ اس پر طرّہ یہ کہ مارے درد کے تڑپ رہے تھے۔ ڈول تھا بھاری، اس پر طرّہ یہ کہ مارے درد کے تڑپ رہے تھے۔ رسی ہاتھ سے چھوٹ گئی، دھم سے گرے، پھوڑے میں ٹھیس لگی، تلملانے لگے، یہاں تک کہ جان نکل گئی۔

آزاد : افسوس، بیچارے کی جان مفت میں گئی۔ ان عقل کے دشمنوں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ ہرایرے غیرے کی رائے پر کیوں علاج کر بیٹھتے ہو؟ نتیجہ یہ ہوتا ہے یا تو مرض بڑھ جاتا ہے، یا جان نکل جاتی ہے۔

(15)

میاں آزاد ایک دن چلے جاتے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک پرانی دھرانی گڑھیا کے کنارے ایک دڑھیل بیٹھے کائی کی کیفیت دیکھ رہے ہیں۔ کبھی ڈھیلا اٹھا کر پھینکا چھپ۔

بوڑھے آدمی اور لونڈے بنے جاتے ہیں۔ داڑھی کا بھی خیال نہیں۔ لطف یہ کہ محلّے بھر کے لونڈے اردگرد تالیاں بجا رہے ہیں، لیکن آپ گڑھیا کی لہروں ہی پر لٹو ہیں۔ کمر جھکائے چاروں طرف ڈھیلے اور ٹھیکرے ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ایک دفعہ کئی ڈھیلے اٹھا کر پھینکے۔ آزاد نے سوچا کوئی پاگل ہے کیا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے، یہ عمر یہ وضع، اور کس مزے سے گڑھیا پر بیٹھے رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ یہ خبر ہی نہیں کہ گاؤں بھر کے لونڈے پیچھے سے تالیاں بجا رہے ہیں۔ ایک لونڈے نے چپت جمانے کے لیے ہاتھ اٹھایا، مگر ہاتھ کھینچ لیا۔ دوسرے نے پیڑ کی آڑ سے کنکڑی لگائی۔ تیسرے نے داڑھی پر گھاس پھینکی۔ چوتھے نے کہا میاں تمھاری داڑھی میں تنکا، مگر میرا شیر ذرا نہ منکا۔ گڑھیا سے اٹھے تو دور کی سوجھی۔ جھپ سے ایک پیڑ پر چڑھ گئے، پھنگی پر جا بیٹھے اور بندر کی طرح لگے اچکنے۔ اس ٹہنی پر اچکے تو دوسری ڈال پر جا بیٹھے۔ اس پر لڑکوں کو بھی بلاتے جاتے ہیں کہ آؤ اوپر آؤ۔ املی کا درخت تھا، اتنا اونچا کہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ حضرت مزے سے بیٹھے املی کھاتے اور چییں لڑکوں پر پھینکتے جاتے ہیں۔ لونڈے گل مچا رہے ہیں کہ میاں میاں ایک چیاں ہم کو ادھر پھینکو، ادھر، ہاتھ ہی ٹوٹے، جو ادھر پھینکے۔ کیا مزہ سے گپر گپر کرکے کھاتے جاتے ہیں، ادھر ایک چیاں بھی نہیں پھینکتے۔ او کنجوس، او مکھی چوس، او بندر، ارے مچھندر، ایک ادھر بھی تھوڑی دیر میں کھٹ کھٹ کرتے پیڑ سے اترے۔ اتنے میں کمسریٹ کے تین چار ہاتھی چارے اور گنے سے لدے جھومتے ہوئے نکلے۔ آپ نے لڑکوں کو سکھایا کہ غل مچا کر کہو۔ ہاتھی پاتھی گنا دے۔ لونڈوں نے جو اتنی شہہ پائی تو آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سب چیخنے لگے، ہاتھی ہاتھی گنا دے۔ ایکا یک ایک ریچھ والا آ نکلا۔ آپ نے جھٹ ریچھ کی گردن پکڑی اور پیٹھ پر ہو رہے ٹک ٹک ٹک، کیا ٹٹو ہے ریچھ والا چل پوں مچایا ہی کیا، آپ نے دو تین لڑکوں کو آگے پیچھے اگل بغل بٹھا ہی لیا۔ مزے سے تنے بیٹھے ہیں گویا اپنے وقت کے بادشاہ ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکوں کو زمین پر پٹکا، خود بھی دھم سے زمین پر کود پڑے، اور جھٹ لنگوٹ کس، تال ٹھوک، ریچھ سے کشتی لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ تب تو ریچھ والا چلایا، میاں کیوں جان کے دشمن ہوئے ہو! چبا ہی ڈالے گا۔ یہ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے، آؤ دیکھا نہ تاؤ چمٹ ہی تو گئے اور ایک انٹی بتائی، تو ریچھ چاروں شانے چت۔ لونڈوں نے وہ غل مچایا کہ ریچھ پورب بھاگا، اور ریچھ والا پچھم۔ محلے بھر میں قہقہہ اڑنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک بھڈری آ نکلا۔ دھوتی

باندھے، پوتھی بغل میں دبائے، رُدراکش کی مالا پہنے، آواز لگاتا جاتا ہے، سائت بچاریں، سگن بچاریں۔ دڑھیل کے قریب سے گزرا، تو شکار ان کے ہاتھ آیا۔ بولے بھئی ادھر آنا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں کہ پو بارہ ہے۔ اچھی بونی ہوئی۔ دڑھیل نے ہاتھ دکھایا اور پوچھا۔ ہماری کتنی شادیاں ہوں گی؟ اس نے کنیا، مکر، سنگھ، ورشچک کرکے بہت سوچ کے کہا، پانچ۔ آپ نے اس کی پگڑی اچھال دی۔ لڑکوں کو دل لگی سوجھی، کسی نے سر سہلایا تو کسی نے چپت لگایا۔ اچھی طرح بونی ہوئی۔ دھڑیل نے کہا سچ کہنا، آج سائت دیکھ کر چلے تھے، یا یوں ہی؟ اپنی سائت بھی دیکھ لیتے ہو یا اوروں ہی کو راہ بتاتے ہو؟ اچھا، خیر، بتاؤ ہمارے یہاں لڑکا کب تک ہوگا؟ بھڈری نے کہا بس بس آپ اور کسی سے پوچھیے گا۔ بھر پایا۔ یہ کہہ کر چلنے ہی کو تھا کہ دڑھیل نے لڑکوں کو اشارہ کیا۔ وہ تو ان کو اپنا گُرو ہی سمجھتے تھے۔ ایک نے پوتھی لی، دوسرے نے مالا چھپائی، تیسرے نے پگیا ٹہلا دی۔ دس پانچ چمٹ گئے۔ بیچارہ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگا اور قسم کھائی کہ اب اس محلے میں قدم نہ رکھوں گا۔ اتنے میں کھونچے والے نے آواز دی، گلابی ریوڑیاں، کراری کنٹھیاں، دال موٹھ، سلونے، مٹر تکونے۔ لونڈے اپنے اپنے دل میں خوش ہوگئے کہ دڑھیل کے حکم سے خوانچہ لوٹ لیں گے اور خوب مٹھائیاں چکھیں گے۔ مگر انھوں نے منع کردیا، خبردار ہاتھ مت بڑھانا۔ جب خوانچے والا پاس آیا تب انھوں نے مول تول کرکے دو روپے میں سارا خوانچہ مول لے لیا اور لڑکوں کو خوب چھکا کر کھلایا۔ ایک دس منٹ کے بعد آواز آئی کھیرے لو کھیرے، آپ نے اچک کر ٹوکرا الٹ دیا۔ کھیرے زمین پر گر پڑے۔ جیسے ہی لڑکوں نے چاہا، کھیرے بٹوریں کہ انھوں نے ڈانٹ بتائی۔ کھیرے والے کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور لڑکوں سے کہا کھیرے اٹھا اٹھا کر اسی گڑھیا میں پھینکتے جاؤ۔ پچاس ساٹھ کھیرے آناً فاناً گڑھیا میں پہنچ گئے۔ ابھی یہ تماشا ہو ہی رہا تھا کہ ایک چڑی مار کمپا جال لیے ہوئے آ نکلا۔ ہاتھ میں تین چار جانور، کچھ جھولے کے اندر۔ سب پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ کہتا جاتا ہے کالا بھجنگا منگل کے روز۔ دڑھیل نے پکارا، آؤ میاں، ادھر آؤ۔ ایک بھجنگا لے کر اپنے اوپر سے اتار کر چھوڑ دیا۔ چڑی مار نے کہا نکا ہوا۔ دوسرا جانور ایک لڑکے پر سے اتارکر چھوڑا۔ اسی طرح دس پندرہ چڑیاں چھوڑ کر چپ چاپ کھڑے ہوگئے۔ گویا کچھ مطلب ہی نہیں۔ چڑی مار نے کہا حضور، دام، آپ نے فرمایا تمھارا نام؟ تب تو وہ چکرایا کہ اچھے ملے۔ بولا حضور دھیلی کے جانور تھے۔ آپ بولے، کیسی دھیلے اور کیسا دھیلا۔ کچھ گھاس تو نہیں کھا

گیا؟ بھنگ پی گیا ہے یا شراب کا نشہ ہے؟ ادھر لڑکوں نے جال کمپا سب ٹہلا دیا۔ تھوڑی دیر رو پیٹ کر اس نے بھی اپنی راہ لی۔

دڑھیل نے لڑکوں کو چھوڑا اور وہاں سے کسی طرف جانا ہی چاہتے تھے کہ آزاد نے قریب آکر پوچھا۔ حضرت، میں بڑی دیر سے آپ کا تماشہ دیکھ رہا ہوں، کبھی کھیرے گڑھیا میں پھینکے، کبھی املی پر اچک رہے، کبھی چڑی مار کی خبر لی، کبھی بھڈری کو آڑے ہاتھوں لیا۔ مجھے خوف ہے کہ آپ کہیں پاگل نہ ہوجائیں، جلدی سے فصد کھلوائیے۔

دھڑیل: مجھے تو آپ ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ ان باتوں کے سمجھنے کے لیے بڑی عقل چاہیے۔ سنیے، آپ کو سمجھاؤں۔ گڑھیا پر بستر جما کر ڈھیلے پھینکنے اور پیڑ پر اچک کر املی کھانے اور ہاتھی سے گنے مانگنے کا سبب یہ ہے کہ لونڈے بھی ہماری دیکھا دیکھی اچک پھاند میں برق ہوجائیں، یہ نہیں کہ مریل ٹٹو کی طرح جہاں بیٹھے وہیں جم گئے۔ لڑکوں کو کم سے کم دو گھنٹے روز کھیلنا کودنا چاہیے، ورنہ بیماری ستائے گی۔ ریچھ والے کے ریچھ پر اچک بیٹھنے، ریچھ کو بھگا دینے اور چڑی مار کے جانوروں کو مفت بے کوڑی بے دام چھڑا دینے کا سبب یہ ہے کہ جب ہم جانوروں کو تکلیف میں دیکھتے ہیں تو کلیجے پر سانپ لوٹنے لگتا ہے اور ان چڑی ماروں کا تو میں جانی دشمن ہوں۔ بس چلے تو کالے پانی بھجوا دوں۔ جہاں دیکھا کہ دوچار بھلے مانس کھڑے ہیں لگے جانوروں کو زور سے دبانے، جس میں وہ چیخیں، اور لوگ ان کی حالت پر کچھ دے نکلیں، ان کی ہڈیاں چڑھ جائے۔ کھیرے اس لیے گڑھیا میں پھنکوا دیے کہ آج کل ہوا خراب ہے، کھیرے کھانے سے بھلا چنگا آدمی بیمار ہوجائے۔ مگر ان کجڑوں کباڑیوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟ انھیں تو اپنے ٹکوں سے مطلب۔ میں نے سمجھا ایک کباڑیے کے نقصان سے پچاسوں آدمیوں کی جان بچ جائے، تو کیا برا؟ دیکھ لو کھونچے والے کو ہم نے اپنے پاس سے دو روپے کھناکھن گن دیے۔ اب سمجھے اس تماشے کا حال؟

یہ کہہ کر انھوں نے اپنی راہ لی اور آزاد نے بھی دل میں ان کی نیک نیتی کی تعریف کرتے ہوئے دوسری طرف کا راستہ لیا۔ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ سامنے سے ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ انھوں نے آزاد سے پوچھا، کیوں صاحب، آپ افیم تو نہیں کھاتے؟

آزاد: افیم خدا کی مار! قسم لے لیجیے، جو آج تک ہاتھ سے بھی چھوئی ہو، اس کے نام سے نفرت ہے۔

یہ کہہ کر آزاد ندی کے کنارے جا بیٹھے۔ وہاں سے پلٹ کر جو آے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی حضرت زمین پر پڑے آنکھیں مانگ رہے ہیں۔ چہرے پر مردنی چھائی ہے، ہونٹ سوکھ رہے ہیں، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ نہ سر کی فکر ہے، نہ پاؤں کی۔ آزاد چکرائے، کیا ماجرا ہے، پوچھا کیوں بھئی، خیر تو ہے؟ ابھی تو بھلے چنگے تھے، اتنی جلد کایا پلٹ کیسے ہوگئی؟

افیمچی : بھئی، میں تو مر مٹا۔ کہیں سے افیم لے آؤ، پیئوں، تو آنکھیں کھلیں، جان میں جان آئے۔ چھٹ پن ہی سے افیم کا عادی ہوں۔ وقت پر نہ ملے تو جان نکل جائے۔

آزاد : ارے یار، افیم چھوڑو، نہیں، اسی طرح ایک دن دم نکل جائے گا۔

افیمچی : تو کیا آپ امرت پی کر آئے ہیں؟ مرنا تو ایک دن سبھی کو ہے۔

آزاد : میاں، ہو بڑے تیکھے، 'رسی جل گئی مگر بل نہ گیا' پڑے سسک رہے ہو، مگر جواب ترکی بہ ترکی ضرور دوگے۔

افیمچی : جناب، افیم لانی ہو تو لائیے، ورنہ یہاں بک بک سننے کا دماغ نہیں۔

آزاد : افیم لانے والے کوئی اور ہی ہوں گے، ہم تو اس فکر میں بیٹھے ہیں کہ آپ مریں تو ماتم کریں۔ ہاں ایک بات مانو ابھی لپک جاؤں، ذرا لکڑی کے سہارے سے اس ہرے بھرے پیڑ کے تلے چلو، وہاں ہری ہری گھاس پر لوٹ مارو، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ، تب تک میں آتا ہوں۔

افیمچی : ارے میاں، یہاں جان بھاری ہے۔ چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا کیسا!

آخر آزاد نے انھیں پیٹھ پر لادا اور لے چلے۔ ان کی یہ حالت کہ آنکھیں بند، منھ کھلا ہوا، معلوم ہی نہیں کہ جاتے کہاں ہیں۔ آزاد نے ان کو ندی میں لے جا کر غوطہ دیا۔ بس قیامت آگئی۔ افیمچی آدمی پانی کی صورت سے نفرت، لگے چلّانے، بڑا گچا دے گیا۔ مارا پٹرا کر دیا۔ عمر بھر میں آج ہی ندی میں قدم رکھا، خدا تجھ سے سمجھے تن سے جان نکل گئی۔ ٹھٹھر گیا ارے ظالم اب تو رحم کر۔ آزاد نے ایک غوطہ اور دیا۔ پھر تابڑتوڑ کئی غوطے دیے۔ اب ان کی کیفیت کچھ نہ پوچھیے۔ کروڑوں گالیاں دیں۔ آزاد نے ان کو ریتی میں چھوڑ دیا اور لمبے ہوئے۔ چلتے چلتے ایک برگد کے پیڑ کے نیچے پہنچے جس کی ٹہنیاں آسمان سے باتیں کرتی تھیں اور جٹائیں پاتال کی خبر لیتی تھیں۔ دیکھا ایک حضرت نشے میں چور ایک دبلی پتلی ٹٹوئی پر سوار

ٹک ٹک کرتے جا رہے ہیں۔

آزاد : اس ٹٹوئی پر کون لدا ہے؟

شرابی : اچھا جی، کون لدا ہے! ایسا نہ ہو کہ کہیں میں اتر کر انجر پنجر ڈھیلے کر دوں۔ یوں نہیں پوچھتا کہ اس ہوائی گھوڑے پر آن جمائے باگ اٹھائے کون سوار جاتا ہے۔ آنکھوں کے آگے ناک، سوجھے کیا خاک۔ ٹٹو ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟

آزاد : جناب، قصور ہوا، معاف کیجیے۔ سچ مچ یہ تو ترکی نسل کا پورا گھوڑا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، جمنا پار کی بکری اس سے کچھ ہی بڑی ہوگی۔

شرابی : ہاں، اب آپ آئے راہ پر۔ اس گھوڑے کی کچھ نہ پوچھیے۔ ماں کے پیٹ سے پھد کتا نکلا تھا۔

آزاد : جی ہاں، وہ تو اس کی آنکھیں ہی کہے دیتی ہیں۔ گھوڑا کیا اڑن کھٹولا ہے۔

شرابی : اس کی قیمت بھی آپ کو معلوم ہے؟

آزاد : نہ صاحب! بھلا میں کیا جانوں۔ آپ تو خیر گدھے پر سوار ہوئے ہیں، یہاں تو ٹانگوں کی سواری کے سوا اور کوئی سواری میسر ہی نہ ہوئی۔ مگر استاد، کتنی ہی تعریف کرو، میری نگاہ میں تو نہیں جچتا۔

شرابی : اچھا، تو اسی بات پر کڑکڑائے دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر ایڑ لگائی مگر ٹٹو نے جنبش تک نہ کی۔ وہ اور اچل ہوگیا۔ اب چابک پر چابک مارتے ہیں، ایڑ لگاتے ہیں اور وہ ٹسکنے کا نام تک نہیں لیتا۔ آزاد نے کہا۔ بس، زیادہ شیخی میں نہ آیئے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھایئے۔

یہ کہہ کر آزاد تو چلے مگر شرابی کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ باگ اب چھوٹی اور اب چھوٹی۔ دس قدم چلے اور باگ روک لی۔ پوچھا، میاں مسافر میں نشے میں تو نہیں ہوں؟

آزاد : جی نہیں، نشہ کیسا؟ آپ ہوش کی باتیں کر رہے ہیں۔

شرابی اسی طرح بار بار آزاد سے پوچھتا تھا۔ آخر جب آزاد نے دیکھا کہ یہ اب گھڑیا پر سے لڑھکا ہی چاہتے ہیں تو جھٹ گھڑیا کو ایک کھیت میں ہانک دیا اور غل مچایا کہ او کسان، دیکھ، یہ تو کھیت چرائے لیتا ہے۔ کسان کے کان میں بھنک پڑی، تو لٹھ کاندھے پر رکھ، لاکھوں گالیاں دیتا ہوا جھپٹا۔ آج چچا بنا کے چھوڑوں گا۔ روز سوریا چرا لے جاتے تھے، آج بہت دن

کے بعد ہتھے چڑھے ہو۔ نزدیک گیا، تو دیکھتا ہے کہ ٹٹوئی ہے اور ایک آدمی اس پر لدا ہے۔ کسان چالاک تھا، بولا آپ ہیں بابو صاحب! چلیے آپ کو گھر لے چلوں۔ وہیں کھانا کھائیے اور آرام سے سوئیے۔ یہ کہہ کر گھوڑیا کی راس تھامے ہوئے، کانجی ہاؤس پہنچا اور ٹٹوئی کو کانجی ہاؤس میں ڈھکیل کر چمپت ہوا۔ یہ بیچارے رات بھر کانجی ہاؤس میں رہے صبح کو کسی طرح گھر پہنچے۔

(16)

میاں آزاد کے پاؤں میں تو آندھی روگ تھا۔ ادھر ادھر چکر لگائے، راستہ ناپا اور پڑ کر سو رہے۔ایک دن سانڈنی کی خبر لینے کے لیے سرائے کی طرف گئے، تو دیکھا، بڑی چہل پہل ہے۔ ایک طرف روٹیاں پک رہی ہیں، دوسری طرف دال بگھاری جاتی ہے۔ بھٹیاریاں مسافروں کو گھیر گھار لا رہی ہیں، صاف ستھری کوٹھریاں دکھلا رہی ہیں۔ ایک کوٹھری کے پاس ایک موٹا تازہ آدمی جیسے ہی چارپائی پر بیٹھا، پٹی ٹوٹ گئی۔ آپ گڑاپ سے جھلنگے میں ہورہے۔ اب بار بار اچکتے ہیں، مگر اٹھا نہیں جاتا۔ چلا رہے ہیں کہ بھئی مجھے کوئی اٹھاؤ۔ آخر بھٹیاروں نے داہنا ہاتھ پکڑا، بائیں طرف میاں آزاد نے ہاتھ دیا اور آپ کو بڑی مشکل سے کھینچ کھانچ کے نکالا۔ جھلنگے سے باہر آئے تو صورت بگڑی ہوئی تھی۔ کپڑے کئی جگہ مسک گئے تھے۔ جھلا کر بھٹیاری سے بولے، واہ اچھی چارپائی دی! جو میرے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے یا سر پھوٹ جاتا تو کیسی ہوتی؟

بھٹیاری : اے واہ میاں، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ ایک تو چھپر کھٹ کو چکنا چور کر ڈالا، پٹی کے بہتر ٹکرے ہوگئے، دیں گے ٹکا اور چھ روپے پر پانی پھیر دیا، دوسرے ہمیں کو للکارتے ہیں۔

آزاد : جناب، ان بھٹیاریوں کے منھ نہ لگیے کہیں کچھ کہہ بیٹھیں تو مفت کی جھینپ ہو۔ دیکھ بھال کر بیٹھا کیجیے۔ کہاں سے آرہے ہیں؟

حکیم : یہیں تک آیا ہوں۔

آزاد : آپ آئے کہاں سے ہیں؟

حکیم : جی گوپامئو مکان ہے۔

آزاد : یہاں کس غرض آنا ہوا؟

حکیم : حکیم ہوں۔

آزاد : یہ کہیے کہ آپ طبیب ہیں۔

حکیم : طبیب آپ خود ہوں گے ہم حکیم ہیں۔

آزاد : اچھا صاحب، آپ حکیم ہی سہی، کیا یہاں حکمت کیجیے گا؟

حکیم : اور نہیں تو کیا، بھاڑ جھونکنے آیا ہوں؟ یا سنیچر پیروں پر سوار تھا؟ بھلا یہ تو فرمائیے کہ یہ کیسی جگہ ہے؟ لوگ کس فیشن کے ہیں؟ آب و ہوا کیسی ہے؟

آزاد : یہ نہ پوچھیے جناب، یہاں کے باشندے پورے گھٹے ہوئے، آٹھوں گانٹھ کمیت ہیں۔ اور آب و ہوا تو ایسی ہے کہ برسوں رہیے پر سر میں درد تک نہ ہو۔ پاؤ بھر کی خوراک ہو تو تین پاؤ کھائیے۔ ڈکار تک آئے تو مجھے سزا دیجیے۔

یہ سن کر حکیم صاحب نے منہ بنایا اور بولے : تب تو برے پھنسے!

آزاد : کیوں برے کیوں پھنسے؟ شوق سے حکمت کیجیے۔ آب و ہوا اچھی ہے، بیماری کا نام نہیں۔

حکیم : حضرت، آپ نرے بدّھو ہیں۔ ایک تو آپ نے یہ گولا مارا کہ آب و ہوا اچھی ہے۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ آب وہوا اچھی ہے تو ہم سے کیا واسطہ، ہمیں کون پوچھے گا؟ بس ہاتھ پر ہاتھ رکھے مکھیاں مارا کریں گے۔ ہم تو ایسے شہر جانا چاہتے ہیں جہاں ہیضے کا گھر ہو، بخار پیچھا نہ چھوڑتا ہو، دست، اور پیچش کی سب کو شکایت ہو، چیچک کی وہ زور ہو کہ خدا کی پناہ۔ تب البتہ ہماری ہنڈیا چڑھے۔ آپ نے تو واللہ آتے ہی گولا مارا۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہاں پاؤ بھر کے بدلے تین پاؤ غذا ہضم ہوتی ہے۔ آمدنی ٹکا نہیں اور کھائیں چوگنا۔ تو کہیے مرے یا جیے؟ بندا سویرے ہی بوریاں بندھنا اٹھا کر چلپت ہوگا۔ ایسی جگہ میری بلا رہے جہاں سب ہٹے کٹے ہی نظر آتے ہیں۔ بھلا کوئی خاص مرض بھی ہے یہاں؟ یہاں مرض کا اس طرف گزر ہی نہیں ہوا؟

آزاد : حضرت، یہاں کے پانی میں یہ اثر ہے کہ برسوں کا مریض آئے اور ایک قطرہ پی لے تو بس خاصا ہٹا کٹا ہوجائے۔

حکیم : پانی کیا امرت ہے! تو سہی جو پانی میں زہر نہ ملا دیا ....!

آزاد : جناب، ہزاروں کوئیں اور پچاسوں باولیاں ہیں، کس کس میں زہر ملاتے پھرے گا؟

حکیم : خیر، بھائی سمجھا جائے گا، مگر برے پھنسے۔ اس وقت ہوش ٹھکانے نہیں ہیں، او بھٹیاری، ذری ہم کو پنساری کی دکان سے تولہ بھر شکنجبین تو لا دینا۔

بھٹیاری : اے میاں، پنساری یہاں کہاں؟ کسی فقیر کی دعا ایسی ہے کہ یہاں حکیم اور پنساری جمنے ہی نہیں پاتا۔ کئی حکیم آئے مگر قبر میں ہیں۔ کئی پنساریوں نے دکان جمائی مگر چتا میں پھونک دیے گئے۔ یہاں تو بیماری نے آنے کی قسم کھائی ہے۔

حکیم : بھئی، بڑا نکما شہر ہے۔ خدا کے لیے ہمیں ٹٹو کرایے پر کر دو، تو رفو چکر ہو جائیں۔ ایسے شہر کی ایسی تیسی۔

انھیں دھتا بتا کر آزاد سرائے کے دوسرے حصے میں جا پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک بزرگ آدمی بستر جمائے بیٹھے ہیں۔ آزاد بے تکلف تو تھے ہی، سلام علیک کہہ کر پاس جا بیٹھے۔ وہ بھی بڑے تپاک سے پیش آئے۔ ہاتھ ملایا، گلے ملے، مزاج پوچھا۔

آزاد : آپ یہاں کس غرض سے تشریف لائے ہیں؟

انھوں نے جواب دیا : جناب، میں وکیل ہوں یہاں وکالت کرنے کا ارادہ ہے، کہیے یہاں کی عدالت کا کیا حال ہے؟

آزاد : یہ نہ پوچھیے۔ یہاں کے لوگ بھیگی بلی ہیں، لڑنا بھڑنا جانتے ہی نہیں۔ سال بھر میں دو چار مقدمے شاید ہوتے ہوں۔ چوری چکاری یہاں کبھی سننے ہی میں نہیں آتی۔ زمین اراضی، لگان، پٹی داری، کے مقدمے کبھی سنے ہی نہیں۔ قرض کوئی لے نہ دے۔

وکیل صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ مگر حکیم جی کی طرح جھلے تو تھے نہیں، آہستہ سے بولے، سبحان اللہ یہاں کے لوگ بڑے بھلے آدمی ہیں۔ خدا ان کو ہمیشہ نیک راستے پر لے جائے۔ مگر دل میں افسوس ہوا کہ اس ٹیم ٹیم دھوم دھام سے آئے اور یہاں بھی وہی ڈھاک کے تین پات۔ جب مقدمے ہی نہ ہوں گے تو کھاؤں گا کیا، دشمن کا سر۔ انھیں بھی جھانسا دے کر آزاد آگے بڑھے تو دیکھا چارپائی بچھائے شہتوت کے پیڑ کے نیچے ایک صاحب بیٹھے حقہ اڑا رہے ہیں۔ آزاد نے پوچھا آپ کا نام؟

وہ بولے : گم نام ہوں۔

آزاد : وطن کہاں ہے؟

وہ : فقیر جہاں پڑ رہے وہیں اس کا گھر

آزاد : آپ کا پیشہ کیا ہے؟

وہ : خون جگر کھانا۔

آزاد : تو آپ شاعر ہیں، یہ کہیے۔

آزاد چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئے اور بے تکلف ہوکر بولے، جناب حقہ تو میرے حوالے کیجیے اور آپ اپنا کلام سنائیے۔ شاعر صاحب نے بہت کچھ چنا چنی کے بعد دوسرے کا کلام اپنا کہہ کر سنایا :

کیا حال ہوگیا ہے دل بے قرار کا
آزار ہو کسی کو الٰہی نہ پیار کا
مشہور ہے جو روز قیامت جہان میں
پہلا پہر ہے میری شب انتظار کا
امتاس دیکھنا میری وحشت کے بلبلے
آیا ہے دھوم دھام سے موسم بہار کا
راہ ان کی تکتے تکتے جو مدت گزر گئی
آنکھوں کو حوصلہ نہ رہا انتظار کا

آزاد : سبحان اللہ، آپ کا کلام بہت ہی پاکیزہ ہے۔ کچھ اور استادوں کے کلام سنائیے :

شاعر : بہت خوب سنیے :

داغ دے جاتے ہیں جب آتے ہیں
یہ شگوفہ نیا وہ لاتے ہیں

آزاد : سبحان اللہ! داغ کے لیے شگوفہ کیا خوب!

شاعر :

یار تک وار کہاں پاتے ہیں
راستہ ناپ کے رہ جاتے ہیں

آزاد : واہ کیا بول چال ہے۔

شاعر :

پھر جنوں دست نہ دکھلایئے ہمیں.
آج تلوے میرے کھجلاتے ہیں

آزاد : واہ واہ، کیا زبان ہے۔

شاعر :

پھول کا جام پلاؤ ساقی
کانٹے تالو میں پڑے جاتے ہیں

آزاد : پھول کے لیے کانٹے، کیا خوب!

شاعر :

کنگھی کے نام سے ہوتے ہیں خفا
بات سلجھی ہوئی الجھاتے ہیں

آزاد : بہت خوب!

شاعر : اچھا جناب، یہ تو فرمایئے یہاں کے رئیسوں میں کوئی شاعری کا قدردان بھی ہے؟

آزاد : قبلہ، یہ نہ پوچھیے۔ یہاں مارواڑی البتہ رہتے ہیں۔ شاعر یا منشی کی صورت سے نفرت ہے۔ یہاں کے رئیسوں سے کچھ بھی بھروسہ نہ رکھیے۔

شاعر : تب تو یہاں آنا ہی بیکار ہوا۔ آخر کیا ایک بھی رنگین مزاج رئیس نہیں ہے؟

آزاد : اب آپ تو مانتے ہی ہی نہیں یہاں قدرداں خدا کا نام ہے۔

(17)

آزاد کے دل میں ایک دن سمائی کہ آج کسی مسجد میں نماز پڑھیں، جمعہ کا دن ہے، جامع مسجد میں خوب جماؤ ہوگا۔ فوراً مسجد میں آ پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں بڑے بڑے زاہد اور مولوی، قاضی اور مفتی بڑے بڑے عمامے سر پر باندھے نماز پڑھنے چلے آرہے ہیں، ابھی نماز شروع ہونے میں دیر ہے، اس لیے ادھر ادھر کی نماز پڑھنے چلے آرہے ہیں۔ دو آدمی ایک درخت کے نیچے بیٹھے جن اور چڑیل کی باتیں کرکے وقت کاٹ رہے ہیں۔ ایک صاحب نوجوان ہیں، موٹے تازے دوسرے صاحب بڈھے ہیں، دبلے پتلے۔

بڈھے : تم تو دماغ کے کیڑے چاٹ گئے۔ بڑے بکی ہو۔ لاکھوں دفعہ سمجھایا کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے، مگر تمھیں تو کچے گھڑے کی چڑھی ہے تم کب سننے والے ہو۔

جوان : آپ بڈھے ہوگئے مگر بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ ارے صاحب بڑے بڑے عالم بڑے بڑے ماہر بھوتوں کے قائل ہیں۔ بڑھاپے میں آپ کی عقل بھی سٹھیا گئی!

بڈھے : اگر آپ بھوت پریت دکھا دیں تو ٹانگ کے راستے نکل جاؤں۔ میری اتنی عمر ہوئی کبھی کسی بھوت کی صورت نہ دیکھی۔ آپ ابھی کل کے لونڈے ہیں، آپ نے کہاں دیکھ لی؟

جوان : روز ہی دیکھتے ہیں جناب! کون سا ایسا محلہ ہے جہاں بھوت اور چڑیل نہ ہوں؟ ابھی پرسوں کی بات ہے، میرے ایک دوست نے آدھی رات کے وقت دیوار پر ایک چڑیل دیکھی۔ بال بال موتی پروے ہوئے، چوٹی کمر تک لٹکتی ہوئی، ایسی حسین کہ پریاں جھک ماریں۔ وہ سناٹا مارے پڑے رہے منکے تک نہیں۔ مگر آپ کہتے ہیں جھوٹ ہے۔

بڈھے : جی ہاں، جھوٹ ہے، سراسر جھوٹ۔ ہمارا خیال وہ بلا ہے جو صورت بنا دے، چلا پھرا دے، باتیں کرتے سنا دے۔ آپ کیا جانیں ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تو پیدائش ہے۔ اور میاں کروڑ باتوں کی ایک بات تو یہ ہے کہ میں بنا دیکھے نہ پتیاؤں گا۔ لوگ بات کا بتنگڑ اور سوئی کا بھالا بنا دیتے ہیں۔ ایک صحیح تو ننانوے جھوٹ، اور آپ ایسے ڈھلمل یقین آدمیوں کا تو ٹھکانہ ہی نہیں۔ جو سنا، فوراً مان لیا۔ رات کو درخت کی پھنگی پر بندر دیکھا اور تھرتھرانے لگے کہ پریت جھانک رہا ہے۔ بولے اور گلا دبوچا۔ ہلے اور شامت آتی۔ اندھرے گھپ میں تو یوں ہی انسان کا جی گھبراتا ہے۔ جو بھوت پریت کا خیال جم گیا تو ساری چوکڑی بھول گئے۔ ہاتھ پاؤں سب پھول گئے۔ بلی نے میاؤں کیا اور جان نکل گئی۔ چوہے کی کھڑ بڑ سنی اور بل ٹھونڈنے لگے۔ اب جو چیز سامنے آئے گی پریت بن جائے گی۔ یہاں سب پاپڑ بیل چکے ہیں۔ کئی جن ہم نے اتارے، کئی چڑیلوں سے ہم نے محلے خالی کرائے۔ جہاں دس جوتے کھوپڑی پر جمائے اور پریت نے بغچہ سنبھالا۔ یوں گپ اڑانے کو کہیے تو ہم بھی گپ بے پر کی اڑانے لگیں۔ یاد رکھو، یہ اوجھے سیانے سب رنگے سیّار ہیں۔ سب روٹی کما کھانے کے لٹکے ہیں۔ بندر نہ نچائے، مرغ نہ لڑائے، پتنگ نہ اڑائے، بھوت پریت ہی جھاڑنے لگے۔

جوان : خیر اس تو تو میں میں سے کیا واسطہ؟ چلیے ہمارے ساتھ۔ کوئی دو تین کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے، وہاں ایک صاحب رہتے ہیں۔ اگر آپ کی کھوپڑی پر ان کے عمل سے بھوت نہ چڑھ بیٹھے تو مونچھ منڈوا ڈالوں۔ کہیے گا شریف نہیں چمار ہے۔ بس اب چلیے۔ آپ نے تو جہاں ذرا سی چڑھائی اور کہنے لگے کہ پیر پیمبر، دیوی دیوتا، بھوت پریت سب ڈھکوسلا ہے۔ لیکن آج ٹھیک بنائے جایئے گا۔

یہ کہہ کر دونوں اس گاؤں کی طرف چلے۔ میاں آزاد تو دنیا بھر کے بے فکرے تھے ہی شوق چرایا کہ چلو سیر دیکھ آؤ۔ یہ بھی پرانے خیالوں کے جانی دشمن تھے۔ کہاں تو نماز پڑھنے مسجد آئے تھے کہاں چھو چھکّا دیکھنے کا شوق ہوا۔ مسجد کو دور ہی سے سلام کیا اور سیدھے سرائے چلے۔ ارے کوئی اکّا کرایے کا ہوگا؟ ارے میاں کوئی بھٹیارا اکّا بھاڑے کرے گا؟

بھٹیارا : جی ہاں، کہاں جایئے گا؟

آزاد : سک جملدی پور۔

بھٹیارا : کیا دیجیے گا؟

آزاد : پہلے گھوڑا اکّا تو دیکھیں 'گھر گھوڑا نخاس مول'

بھٹیارا : وہ کیا کمانی دار اکّا کھڑا ہے اور یہ سرنگ گھوڑی ہے ہوا سے باتیں کرتی جاتی ہے بیٹھے اور دن سے پہنچے۔

اکّا تیار ہوا، آزاد چلے تو راستے میں ایک صاحب سے پوچھا۔ کیوں صاحب اس گاؤں کو سک جملدی پور کیوں کہتے ہیں؟ کچھ عجیب بے ڈھنگ سا نام ہے۔ اس نے کہا اس کا بڑا قصہ ہے۔ ایک صاحب شیخ جمال الدین تھے۔ انھوں نے گاؤں بسایا اور اس کا نام رکھا شیخ جمال الدین پورہ۔ گنوار آدمی کیا جانیں انھوں نے شیخ کا سک، جمال کا جمل اور الدین کا دی بنا دیا۔

اکّے والے سے باتیں ہونے لگیں۔ اکّے والا بولا، حضور اب روزگار کہاں! صبح سے شام تک جو ملا کھا پی برابر۔ ایک روپیہ جانور کھا گیا، دس بارہ آنے گھر کے خرچ میں آئے، آنے دو آنے سلفے تماخو میں اڑ گئے۔ پھر موچی کے موچی۔ مہاجن کے پچیس روپے چھ مہینے سے بیباک نہ ہوئے۔ جو کہیں کچّی میں چار پانچ کوس لے گئے تو پٹیاں دھنس گئیں، پچنی ہال، دھرا سب نکل گیا۔ دو چار روپے کے متھے گئی۔ روزگار تو تمھاری سلامتی سے تب ہو جب یہ ریل اڑ

جائے۔ دیکھیے آپ ہی نے سات گنڈے سک جملدی پور کے دیے مگر تین چکر لگا کر۔

کوئی پونے دو گھنٹے میں آزاد سک جملدی پور پہنچے۔ پتہ وتہ تو ان کو معلوم تھا ہی۔ سیدھے شاہ صاحب کے مکان پر جا پہنچے۔ ٹھٹ کے ٹھٹ آدمی جمع تھے۔ عورت مرد ٹوٹے پڑتے تھے۔ ایک آدمی سے انھوں نے پوچھا، کیا آج یہاں کوئی میلہ ہے؟ اس نے کہا میلہ ویلہ نہیں، ایک منئی کے موڈ پر دیوی آئی ہیں، تون مہرارو، من سیڑو سب دیکھے آوَت ہیں۔ اسی جھنڈ میں آزاد کو وہ بوڑھے میاں بھی مل گئے، جو بھوت چڑیل کو ڈھکوسلا کہا کرتے تھے۔ اکیلے ایک طرف لے جاکر کہا جناب میں نے مسجد میں آپ کی باتیں سنی تھیں۔ قسم کھاتا ہوں، جو کبھی بھوت پریت کا قائل ہوا ہوں۔ اب ایسی کچھ تدبیر کرنی چاہیے کہ ان شاہ صاحب کی قلعی کھل جائے۔

اتنے میں شاہ صاحب نیلے رنگ کا تہمد باندے، لمبے لمبے بالوں میں حنا کا تیل ڈالے، مانگ نکالے، کھڑاؤں پہنے تشریف لائے۔ آنکھوں میں تیج بھرا ہوا تھا۔ جس کی طرف نظر بھر کر دیکھا وہی کانپ اٹھا۔ کسی نے قدم لیے کسی نے جھک کر سلام کیا۔ شاہ صاحب نے غُل مچانا شروع کیا۔ دھونی میری جلتی ہے، جلتی ہے اور بلتی ہے، دھونی میری جلتی ہے۔ کھڑی مونچھوں والا ہے، لمبے گیسووالا ہے، میرا درجہ اعلیٰ ہے۔ جھوم جھوم کر جب انھوں نے یہ آواز لگائی تو سب لوگ سناٹے میں آگئے۔ ایکا یک آپ نے اکڑ کر کہا کسی کو دعویٰ ہو تو آکر مجھ سے کشتی لڑے۔ ہاتھی کو ٹکر دوں، تو چنگھاڑ کر بھاگے، کون آتا ہے؟

اب سنیے، پہلے سے ایک آدمی کو سکھا پڑھا رکھا تھا۔ وہ تو سدھا ہوا تھا یہی جھٹ سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور بولا ہم لڑیں گے۔ بڑا اکڑیل جوان تھا، گینڈے کی سی گردن، شیر کا سا سینہ، مگر شاہ صاحب کی تو ہوا بندھی ہوئی تھی۔ لوگ اس پہلوان کی حالت پر افسوس کرتے تھے کہ بیدھا ہے، شاہ صاحب چٹکیوں میں چرمر کر ڈالیں گے۔

خیر دونوں آمنے سامنے آئے اور شاہ صاحب نے گردن پکڑتے ہی اتنی زور سے پٹکا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ آزاد نے بوڑھے میاں سے کہا جناب، یہ ملی بھگت ہے۔ اسی طرح گنوار لوگ موڑھے جاتے ہیں۔ میں ایسے مکاروں کی قبر تک سے واقف ہوں۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ شاہ صاحب نے پھر اکڑتے ہوئے آواز لگائی۔ کوئی اور زور لگائے گا؟ میاں آزاد نے آوَ دیکھا نہ تاوَ جھٹ لنگوٹ باندھ، چٹ سے کود پڑے۔ آوَ استاد، ایک پکڑ ہم سے بھی

ہوجائے۔ تب تو شاہ صاحب چکرائے کہ یہ اچھے بگڑے دل ملے۔ پوچھا آپ انگریزی پڑھے ہیں؟ آزاد نے کڑک کر کہا انگریزی نہیں انگریزی کا باپ پڑھا ہوں۔ بس اب سنبھلیے، میں آگیا۔ یہ کہہ کر گھٹنا ٹیک کلاجنگ کے پیچ پر مارا تو شاہ صاحب چاروں خانے چت زمین پر دھم سے گرے۔ ان کا گرنا تھا کہ میاں آزاد چھاتی پر چڑھ بیٹھے۔ اب بتاؤ بچہ، کاٹ لوں ناک، کتر لوں کان، باندھوں دم میں نمدا! بدمعاش کہیں کا، بوڑھے میاں نے جھپٹ کر آزاد کو گود میں اٹھا لیا۔ واہ استاد، کیوں نہ ہو، شاہ صاحب اسی دن گاؤں چھوڑ کر بھاگے۔

شاہ صاحب کو پٹکنی دے کر اور گاؤں کے ڈھل مل یقین گنواروں کو سمجھا بجھا کر آزاد بوڑھے میاں کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں انھیں شاہ صاحب کی باتیں ہونے لگیں۔

آزاد : کیوں سچ کہیے گا کیسا اڑنگا دیا؟ بہت بلبلا رہے تھے۔ یہاں استادوں کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ پور پور میں پھکیتی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایک ایک پینچ کے دو دو سو توڑ یاد ہیں۔ میں تو اسے دیکھتے ہی بھانپ گیا کہ یہ بنا ہوا ہے۔ لڑتیئے کا تو کینڈا ہی اس کا نہ تھا۔ گردن موٹی نہیں چھاتی چوڑی نہیں بدن کٹا پٹا نہیں، کان ٹوٹے نہیں، تاڑ گیا کہ گھامڑ ہے۔ گردن پکڑتے ہی دبا بیٹھا۔

بوڑھے میاں : اب اس گاؤں میں بھول کر بھی نہ آئے گا۔ ایک مرتبہ کا ذکر سنئے، ایک بنے ہوئے سدھ پالتھی مار کر بیٹھے اور لگے اکڑنے کہ کوئی چھپا کر ہاتھ میں پھول لے، ہم چٹکیوں میں بتا دیں گے۔ میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا اچھا میں نے پھول لیا، آپ بتلائیے تو سہی۔ پہلے تو آنکھیں نیلی پیلی کر کے مجھے ڈرانے لگے۔ میں نے کہا حضرت میں ان گیدڑ بھبھکیوں میں نہیں آنے کا۔ یہ پتلیوں کا تماشا کسی نادان کو دکھاؤ۔ بس بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے؟ تھوڑی دیر تک سوچ ساچ کر بولے پیلا پھول ہے۔ میں نے کہا بالکل جھوٹ، تب تو گھبرائے اور کہنے لگے مجھے دھوکہ ہوا۔ پیلا نہیں ہرا پھول ہے۔ میں نے کہا واہ بھئی لال بجھکڑ، کیوں نہ ہو۔ ہرا پھول آج تک دیکھا نہ سنا، یہ نیا گل کھلا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ ان کا گلاب سے چہرہ کمہلا گیا۔ کوئی اس وقت ان کی بے کلی دیکھتا۔ میں جامے میں پھولا نہ سماتا تھا۔ آخر اتنے شرمندہ ہوئے کہ وہاں سے پتہ توڑ بھاگے۔ ہم یہ سب کھیل کھیلے ہوئے ہیں۔

آزاد : ایسے ہی ایک شاہ صاحب کو میں نے بھی ٹھیک کیا تھا۔ ایک دوست کے گھر گیا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فقیر صاحب شان سے بیٹھے ہوئے ہیں اور اچھے اچھے پڑھے لکھے آدمی انھیں گھیرے ہوئے ہیں۔ میں نے پوچھا : آپ کی تعریف کیجیے، تو ایک صاحب نے جو اس پر ایمان لا چکے تھے، دبے دانتوں کہا شاہ صاحب غیب بندہ (تری کال درشی) ہیں۔ آپ کے کمالوں کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ دس پانچ نے تو انھیں آسمان ہی پر چڑھا دیا۔ میں نے دل میں کہا بچا تمھاری خبر نہ لی، تو کچھ نہ کیا۔ پوچھا کیوں شاہ جی یہ تو بتائیے ہمارے گھر میں لڑکا کب تک ہوگا؟ شاہ جی سمجھے یہ بھی نرے چونگا ہی ہیں۔ چلو، اناپ سناپ بتا کر الو بناؤ اور کچھ لے مرو۔ میرے باپ دادے اور ان کے باپ کے پردادے کا نام پوچھا۔ یہاں یاد کا یہ حال ہے کہ باپ کا نام تو یاد رہتا ہے، داداجان کا نام کس گدھے کو یاد ہو۔ مگر خیر، جو زبان پر آیا اول جلول بتا دیا۔ تب فرماتے کیا ہیں، بچہ دو مہینے کے اندر ہی اندر بیٹا لے۔ میں نے کہا۔ ہیں شاہ صاحب ذرا سنبھلے ہوئے۔ اب تو کہا اب نہ کہیے گا، پندرہ دن تو بندے کی شادی کو ہوئے اور آپ فرماتے ہیں کہ دو مہینے کے اندر ہی اندر لڑکا لے۔ واللہ، دوسرا کہتا تو خون پی لیتا۔ اس فقرے پر یار لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور شاہ جی کے ہواس غائب ہو گئے۔ دل میں کروڑوں ہی گالیاں دی ہوں گی۔ مگر میرے سامنے ایک نہ چلی۔ جناب اس دیار میں لوگ انھیں خدا سمجھتے تھے۔ شاہ جی کبھی روپے برساتے تھے، کبھی بے فصل کے میوے منگواتے تھے، کبھی گھڑے کو چکنا چور کر کے پھر جوڑ دیتے تھے۔ سیکڑوں ہی السیئیں یاد تھیں، میرا جواب سنا تو ہکابکا ہو گئے۔ ایسے بھاگے کہ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔ جہاں میں ہوں بھلا کسی سدھ یا شاہ جی کا رنگ جم تو جائے۔

یہی باتیں کرتے ہوئے لوگ پھر اپنے اپنے گھر سدھارے۔

(18)

میاں آزاد ایک دن چلے جاتے تھے، تو دیکھتے کیا ہیں، ایک چوراہے کے نکڑ پر بھنگ والے کی دکان ہے اور اس پر ان کے ایک لنگوٹیے یار بیٹھے ڈینگ کی لے رہے ہیں۔ ہم نے جو خرچ کر ڈالا، وہ کسی کو پیدا کرنا بھی نصیب نہ ہوا ہوگا، لاکھوں کمائے، کروڑوں لٹائے، کسی کے دینے میں نہ لینے میں۔ آزاد نے جھک کر کان میں کہا واہ بھئی استاد کیوں نہ ہوا چھی لن

ترانیاں ہیں۔ بابا تو آپ کے عمر بھر برف بیچا کیے اور دادا جوتے کی دکان رکھتے رکھتے بوڑھے ہوئے۔ آپ نے کمایا کیا، لٹایا کیا؟ یاد ہے، ایک دفعہ ساڑھے چھ روپے کی مُحرّری پائی مگر اس سے بھی نکالے گئے۔ اس نے کہا آپ بھی نرے گاودی ہیں۔ ارے میاں، اب گپ اڑانے سے بھی گئے؟ بھنگ والے کی دکان پر گپ نہ ماروں تو اور کہاں جاؤں؟ پھر اتنا تو سمجھو کہ یہاں ہم کو جانتا کون ہے۔ میاں آزاد تو ایک سیلانی آدمی تھے ہی ایک تپائی پر ٹک گئے، دیکھتے کیا ہیں ایک درخت کے تلے سرکی کا چھپّر پڑا ہے۔ ایک تخت بچھا ہے، بھنگ والا سل پر رگڑیں لگا رہا ہے۔ لگے رگڑا، مٹے جھگڑا۔ دو چار بگڑے دل بیٹھے گل مچا رہے ہیں۔ داتا تیری دکان پر ہن برسے، ایسی چکا چک پلا جس میں جوتی کھڑی ہو۔ تھوڑا سا دھتورا بھی رگڑ دو، جس میں خوب رنگ جمے۔ اتنے میں میاں آزاد کے دوست بول اٹھے، استاد آج تو دودھیا ڈلواؤ۔ پیتے ہی لے اڑیں۔ چلّو میں الو ہوجائیں۔ دکان والے نے انھیں میٹھی کیوڑے سے بسی ہوئی بھنگ پلوائی۔ آپ پی چکے تو اپنے دوست ہرنج کو بھنگ کا ایک گولا کھلایا اور پھر وہاں سے سیر کرنے چلے۔ انھیں مٹاپے کے سبب سے لوگ بھد بھد کہا کرتے تھے۔ چلتے چلتے ہرنج نے پوچھا، کیوں یار، یہ کون محلّہ ہے؟

بھد بھد : چینی بازار۔

ہرنج : واہ، کہیں ہو نہ، یہ چنیا بازار ہے۔

بھد بھد : چنیابازار کیسا، چینی بازار کیوں نہیں کہتے۔

ہرنج : ہم گلی گلی، کوچے کوچے سے واقف ہیں، آپ ہمیں راستہ بتاتے ہیں؟ چنیابازار تو دنیا کہتی ہے، آپ کہنے لگے چینی بازار۔

بھد بھد : اچھا تو خبردار، میرے سامنے اب چنیابازار نہ کہیے گا۔

ہرنج اچھا کسی تیسرے آدمی سے پوچھو۔

آزاد نے دونوں کو سمجھایا، کیوں لڑے مرتے ہو؟ مگر سنتا کون تھا۔ سامنے سے ایک آدمی چلا آتا تھا۔ آزاد نے بڑھ کر پوچھا، بھئی یہ کون محلّہ ہے؟ اس نے کہا چنیابازار۔ اب ہرنج اور بھد بھد نے اسے دق کرنا شروع کیا۔ چینی بازار ہے یا چنیابازار، یہی پوچھتے ہوئے آدھ کوس تک اس کے ساتھ گئے۔ اس بیچارے کو ان بھنگڑوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا۔ بار بار کہتا تھا کہ بھئی دونوں صحیح ہیں۔ مگر یہ ایک نہ سنتے تھے۔ جب سنتے سنتے اس کے کان

پک گئے تو وہ بیچارہ چپکے سے ایک گلی میں چلا گیا۔

تینوں آدمی پھر آگے چلے۔ مگر وہ مسئلہ حل نہ ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے تھے۔ پر دو میں سے ایک کو بھی یہ تسکین نہ ہوتی تھی کہ چنیا بازار اور چینی بازار میں کون سا بڑا فرق ہے۔

ہرنبھج : جانتے بھی ہو، اس کا نام چنیابازار کیوں پڑا؟

بھدبھد : جانتا کیوں نہیں، پہلے یہاں دساور سے چینی آکر بکا کرتی تھی۔

ہرنبھج : تمھارا سر! یہاں چین کے لوگ آکر آباد ہوگئے تھے، جبھی سے یہ نام پڑا۔

بھدبھد : گاودی ہو!

اس پر دونوں گتھ گئے۔ اس نے اس کو پٹکا، اس نے اس کو پٹکا۔ بھدبھد موٹے تھے، خوب پٹے۔

آزاد نے ان دونوں کو یہیں چھوڑا اور خود گھومتے گھامتے جوہری بازار کی طرف جا نکلے۔ دیکھا ایک لڑکا جھکا ہوا کچھ لکھ رہا ہے۔ آزاد نے لفافہ دور سے دیکھتے ہی خط کا مضمون بھانپ لیا۔ پوچھا۔ کیوں بھئی اس گاؤں کا کیا نام ہے؟

لڑکا : دن کو رتوندھی تو نہیں ہوتی؟ یہ گاؤں ہے یا شہر؟

آزاد : ہاں، ہاں وہی شہر۔ میں مسافر ہوں، سرائے کا پتہ بتا دیجیے۔

لڑکا : سرائے کس لیے جایئے گا؟ کیا کسی بھٹیاری سے رشتہ داری ہے؟

آزاد : کیوں صاحب، مسافروں سے بھی دل لگی۔ ہم ترجمہ کرتے ہیں، خط ہو عرضی ہو، درخواست ہو، اس کا وہ ترجمہ کردیں کہ پڑھنے والا دنگ رہ جائے۔

لڑکا : تب تو جناب آپ بڑے کام کے آدمی ہیں۔ لو ہماری اس عرضی کا ترجمہ کر دو۔ ایک چونی دوں گا۔

آزاد : خیر لایئے بوہنی کرلوں، عرضی پڑھیے۔

لڑکا : آپ ہی پڑھ لیجیے۔

آزاد : (عرضی پڑھ کر) سبحان اللہ، یہ عرضی ہے یا گھر کا دکھڑا۔ بھلا تمھارے کتنے لڑکے۔ لڑکیاں ہوں گی؟

لڑکا : اجی، ابھی یہاں تو شادی ہی نہیں ہوئی۔

آزاد : تو پھر یہ کیا لکھ مارا کے سارے کنبے کا بھار میرے سر ہے۔ اور نوکری بھی کیا مانگتے ہو کہ زمانے بھر کا کوڑا صاف کرنا پڑے۔ تڑکا ہوا اور بنپلس جھانکنے لگے، کبھی بھنگیوں سے تکرار ہورہی ہے کبھی بھنگنوں سے چخ چل رہی ہیں۔ ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے، پڑھو لکھو، جم کر محنت کرو، نوکری کی تمھیں کیا فکر ہے؟

لڑکا : آپ عرضی لکھتے ہیں کہ صلاح بتاتے ہیں؟ میں تو آپ سے صلاح نہیں پوچھتا۔

آزاد : میاں، پڑھنے لکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نوکری ہی کرلے۔ اور نہیں تو بنپلس کا داروغہ ہی سہی۔ خاصے جوہری بنے ہو، ایسی کون سی مصیبت آپڑی ہے کہ اس نوکری پر جان دیتے ہو؟

اتنے میں ایک لالہ صاحب قلم دان لیے عینک لگائے آکر بیٹھ گئے۔

آزاد : کہیے آپ کو بھی کچھ ترجمہ کرانا ہے؟

لالہ : جی ہاں، اس عرضی کا ترجمہ کر دیجیے۔ میرے بڑھاپے پر ترس کھائیے۔

آزاد : اچھا، اپنی عرضی پڑھیے۔

لالہ : سنیے

غریب پرور سلامت،

اپنا کیا حال کہوں، کوئی دو درجن تو بال بچے ہیں۔ آخر انھیں سیر سیر بھر آٹا چاہیے یا نہیں۔ جوڑیے کتنا ہوا۔ اور جو یہ کہیے کہ سیر بھر کوئی لڑکا نہیں کھا سکتا تو جناب میرے لڑکے بچے نہیں ہیں، کئی کئی بچوں کے باپ ہیں۔ اس حساب سے 80 روپئے کا تو آٹا ہی ہوا۔ 10 روپئے کی دال رکھیے بس ہیں اور کچھ نہیں چاہتا۔ مگر جو یہ کہیے کہ اس سے کم میں گزر کروں تو جناب یہ میرے کیے نہ ہوگا۔ روٹیوں میں خدا کا بھی ساجھا نہیں۔

'میرے لیاقت کا آدمی اس دنیا میں تو آپ کو ملے گا نہیں، ہاں شاید اس دنیا میں مل جائے۔ بچے میں کھلا سکتا ہوں، بازار سے سودے لا سکتا ہوں، بنیے کے کان کتر لوں تو سہی۔ قصے کہانیوں کا تو میں خزانہ ہوں۔ نت نئی کہانیاں کہوں۔ موقع آپڑے تو جوتے صاف کرسکتا ہوں، میم صاحب اور بابا لوگوں کو گا کر خوش کرسکتا ہوں۔ غرض ہر فن مولا ہوں۔ پڑھا لکھا بھی ہوں۔ بدنصیبی سے مڈل پاس تو نہیں ہوں لیکن اپنے دستخط کر لیتا ہوں۔ جی چاہے امتحان لے لیجیے۔

'اب رہی خاندان کی بات، تو جناب کم ترین کے بزرگ ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں پر رہے۔ میرے بڑے بھائی کی بیوی جسے پھوپھی کہتے ہیں اور جس سے مذاق کا بھی رشتہ ہے، اس کے باپ کے سسر کے چچیرے بھائی نہر کے محکمے میں 20 روپے مہینے پر داروغہ تھے۔ میرے باباجان میونسپلٹی میں صفائی کے جمع دار تھے اور 10 روپے مہینہ مشاہرہ پاتے تھے۔ چونکہ سرکار کا حکم ہے کہ اچھے خاندان کے لوگوں کی پرورش کی جائے۔ اس لیے دو ایک بزرگوں کا ذکر کر دیا۔ ورنہ یہاں تو سبھی عہدہ دار تھے۔ کہاں تک گناؤں۔'

'اب تو عرضی میں اور کچھ لکھنا نہیں باقی رہا۔ اپنی غریبی کا ذکر کر ہی دیا۔ لیاقت کی بھی کچھ تھوڑی سی چرچا کر دی اور اپنے خاندان کا بھی کچھ ذکر کر دیا۔

'اب عرض ہے کہ حضور جو ہمارے آقا ہیں میری پرورش کریں۔ اگر مجھ پر حضور کی نگاہ نہ ہوئی تو مجبور ہوکر مجھے اپنے بال بچوں کو مرچ کے ٹاپو میں بھرتی کر پڑے گا۔'

میاں آزاد نے جو یہ عرضی سنی تو لوٹنے لگے۔ اتنا ہنسے کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ جب ذرا ہنسی کم ہوئی تو پوچھا لالہ صاحب اتنا اور بتا دیجیے کہ آپ ہیں کون ٹھاکر؟

لالہ : جی، بندہ تو اگنی ہوتری ہے۔

آزاد : تو پھر آپ کے شریف خاندان ہونے میں کیا شک ہے۔ میاں آدمی بنو۔ جاکر باپ دادوں کا پیشہ کرو۔ بھاڑ جھونکنے میں جو آرام ہے وہ غلامی کرنے میں نہیں۔ مجھ سے آپ کی عرضی کا ترجمہ نہ ہوگا۔

(19)

ایک دن میاں آزاد سانڈنی پر سوار ہوکر گھومنے نکلے تو ایک تھیٹر میں جا پہنچے۔ سیلانی آدمی تو تھے ہی تھیٹر دیکھنے لگے تو وقت کا خیال ہی نہ رہا تھیٹر بند ہوا تو بارہ بج گئے تھے گھر پہنچنا مشکل تھا۔ سوچا آج رات کو سرائے ہی میں پڑے رہیں۔ سوئے تو گھوڑے بیچ کر۔ بھٹیاری نے آکر جگایا۔ اجی اٹھو آج تو جیسے گھوڑے بیچ کر سوئے ہو، اے لو وہ آٹھ کا گجر بجا، انگڑائیوں پر انگڑائیاں لے رہے ہیں مگر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔

ایک چنڈو باز بھی بیٹھے ہوئے تھے بولے۔ تو تم کو کیا پڑی ہے سونے نہیں دیتی۔ کیا جانے کس موج میں پڑے ہیں لہری آدمی تو ہئی ہیں مگر سچ کہنا کیسا دھاوت سیلانی ہے، دوسرا

اتنا گھومے تو ہلکان ہوجائے اور جو جگانا ہی منظور ہے تو لوٹے کی ٹونٹی سے ذرا سا پانی کان میں چھوڑ دو۔ دیکھو کیسے کُلل بلا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔

بھٹیاری نے چلو سے منہ پر چھینٹے دینے شروع کیے دس ہی پانچ بوندیں گری تھیں کہ آزاد ہائے ہائے کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے یہ کیا دل لگی ہے۔ کیسی میٹھی نیند سو رہا تھا لیکے جگا دیا۔

بھٹیاری : اتنی رات تک کہاں گھومتے رہے کہ ابھی نیند ہی پوری نہیں ہوئی۔

آزاد : کہیں نہیں۔ ذرا تھیٹر دیکھنے لگا تھا۔

چنڈوباز : سنا تماشا بہت اچھا ہوتا ہے آج ہمیں بھی دکھا دینا بھائی۔ تمھاری بدولت تو تھیٹر تو دیکھ لیں۔ کئے بجے شروع ہوتا ہے۔

آزاد : یہی کوئی نو بجے۔

چنڈوباز: تو پھر میں چل چکا، نو بجے شروع ہو بارہ بجے ختم ہو کہیں ایک بجے گھر پہنچیں۔ محلے بھر میں آگ ڈھونڈیں حقہ بھریں توا جمائیں، گھنٹہ بھر گڑگڑائیں۔ پلنگ پر پڑ جائیں تو نیند اچاٹ۔ کروٹوں پر کروٹیں لیں تب کہیں چار بجتے بجتے آنکھ لگے پھر بھلے مانس جو چار بجے سوئے وہ دوپہر تک اٹھنے کا نام نہ لے گا۔ لیجیے دن یوں گیا رات یوں گئی۔ اب انسان چنڈو کب پیے، داستان کب سنے، پینگ مزے کب اڑائے۔ کون جانے کیا گلابو، شتابوں کے تماشے سے اچھا ہوتا ہوگا۔ ریچھ ہی والے ہی کا تماشہ نہ دیکھیں؟ میاں اینٹھا سنگھ کے مزے نہ اڑائے۔ بکری پر تنے بیٹھے ہیں چھینک پڑی اور کھٹ سے پھندی دار ٹوپی الگ۔ بھئی کوئی بیدھا ہو جو وہاں جائے اور پھر روپے کس کے گھر سے آئے؟ جب سے افیم سو روپے سیر ہوگئی تب سے تو غریبوں کا اور بھی دیوالہ نکل گیا اور چنڈو کے ٹھیکوں نے تو ستیاناس ہی کردیا۔ سیلانی تو شہر کا چوہا چوہا ہے مگر ٹکٹ کا نام نہ ہو اور بھئی صاف تو یوں ہے کہ ہم لوگ مفت کے تماشہ دیکھنے والوں میں سے ہیں۔ میلا ٹھیلا تو کوئی چھوٹنے ہی نہیں پاتا۔ ساون بھر عیش باغ کے میلے نہ چھوڑیں کبھی املیوں میں جھول رہے ہیں کبھی بندروں کی سیر دیکھ رہے ہیں۔ بہت کیا تو ایک گنڈے کے پوڑے لیے دو پیسے بڑھائے اور ساوک کی دکان پر دم لگایا۔ چلیے پانچ چھ پیسے میں میلا ہوگیا۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ وہاں نادری حکم ہے کہ کوئی دھواں نہ اڑائے نہیں تو ہم سوچے تھے کہ چنڈو کا سامان لیتے چلیں گے

اور مزے سے کسی کونے میں لیٹے ہوئے اڑاتے جائیں گے اس میں کسی کے باپ کا کیا اجارہ۔

بھٹیارن : بھئی۔ ٹکٹ معاف ہوجائے تو میں بھی چلوں۔

آزاد : ان کو کیا پڑی ہے بھلا جو بمبئی سے انگڑ کھنگڑ لے کر اتنی دور بیگار بھگتنے آئیں۔ وہی بے ٹھکانہ بات کہتی ہو، اس کے سر نہ پیر۔

چنڈوباز : اچھا، تو تمھاری خاطر ہی سہی۔ تم بھی کیا یاد کروگی۔ ایک دن ہم بھی چونی گلائیں گے۔ تماشا ہوتا کہاں ہے؟

آزاد : یہی چھترمنزل میں، دس قدم پر۔

چنڈوباز : دس قدم کی ایک ہی کہی۔ تمھاری طرح یہاں کسی کے پاؤں میں سنیچر تو ہے نہیں۔ سات بجے سے چلنا شروع کریں، تو دس بجے پہنچیں۔ بگھی کرائے پر کریں، تو ایک روپیہ آنے کا اور ایک روپیہ جانے کا اور ٹھک جائے۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔

آزاد : اجی، میری سانڈنی پر بیٹھ لینا۔

بھٹیارن : مجھے بھی اسی پر بٹھا لینا۔ رات کا وقت ہے، کون دیکھتا ہے۔

شام ہوئی تو میاں آزاد نے سانڈنی کسی اور سرائے سے چلے۔ بھٹیارن بھی پیچھے بیٹھ گئی۔ مگر چنڈوباز نے سانڈنی کی صورت دیکھی، تو بیٹھنے کی ہمت نہیں پڑی۔ جب سانڈنی نے تیز چلنا شروع کیا، تو بھٹیارن بولی، اس موئی سواری پر خدا کی سنوار، اللہ کی قسم مارے ہچکولوں کے ناک میں دم آگیا۔ آزاد کو شرارت سوجھی، تو ایک ایڑ لگائی۔ وہ اور بھی تیز ہوگئی۔ تب تو بھٹیارن آگ بھبھوکا ہوگئی۔ یہ دل لگی رہنے دیجیے۔ مجھے بھی کوئی اور سمجھے ہو؟ میں لاکھوں سناؤں گی۔ لو بس سیدھی طرح چلنا ہو تو چلو، نہیں میں چیختی ہوں۔ پیٹ کا پانی تک ہل گیا۔ ایسی سواری کو آگ لگے۔ میاں آزاد نے ذرا لگام کو کھینچا، تو سانڈنی بلبلانے لگی۔ بی بھٹیارن تو سمجھی کی اب جان گئی۔ دیکھو، یہ چھیڑ چھاڑ اچھی نہیں۔ ہمیں اتار دو، لو اور سنو، ذرا سے ہچکولے میں منہ کے بل آرہوں، تو چکناچور ہی ہوجاؤں۔ تم مسٹنڈو کو اس کا کیا ڈر۔ روکو، روکو، ہائے میرے اللہ، میں کس بلا میں پھنس گئی۔ میاں اپنے خدا سے ڈرو، بس ہمیں اتار ہی دو۔ اتفاق سے سانڈنی ایک درخت کی پرچھائیں دیکھ کر ایسی بھڑکی کہ دس قدم پیچھے ہٹ آئی۔ اس کا بچکنا تھا کہ بی بھٹیارن دھم سے زمین پر گر پڑی۔ خدا کی مار۔ وہ تو کہو پکی سڑک نہ تھی

نہیں تو ہڈی پسلی چور چور ہوجاتی۔

چنڈوبازا : شاباش ہے تیری ماں کو، پٹکنی بھی کھائی، مگر وہی تیور۔ دوسری حیادار ہوتی تو لاکھ برس تک سوار ہونے کا نام نہ لیتی۔ سواری کیا ہے جنازہ ہے۔

بھٹیارن : چلیے، آپ کی جوتی کی نوک سے۔ ہم بے حیا ہی سہی کیا جھانسے دینے آئے ہیں۔ جس میں میں اتر پڑوں اور آپ مزے سے جم جائیں۔ منہ دھو رکھیے ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔

مگر اس جھمیلے میں اتنی دیر ہوگئی کہ جب تھیٹر پہنچے تو تماشا ختم ہوگیا تھا۔ تماشائی لوگ باہر نکل رہے تھے۔

آزاد : لیجیے، سارا مزہ کرکرا ہوگیا۔ اسی سے میں تم لوگوں کو ساتھ نہ لے آتا تھا۔

چنڈوباز : عورتوں کوتو میلے ٹھیلے میں لے ہی نہ جانا چاہیے۔ ہمیشہ السیٹ ہوتی ہے۔

بھٹیارن : جی ہاں، اور کیا میلے ٹھیلے تو آپ جیسے خراٹوں ہی کے لیے ہوتے ہیں۔

آزاد تماشائیوں کی باتیں سننے لگے۔

ایک۔ یار، ان کے پاس سامان تو خوب لیس ہے۔

دوسرا۔ واہ کیا کہنا پردے تو ایسے کہ دیکھے نہ سنے۔ بس یہی یقین ہوتا ہے کہ بارہ دری کا پھاٹک ہے یا پری خانہ۔ جنگل کا سامان دکھایا تو وہی بیل بوٹے، وہی دوب، وہی پیڑ، وہی جھاڑیاں، بس، بالکل سندربن معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا۔ اور سبز پری کی تعریف ہی نہ کروگے؟

چوتھا۔ حضرت وہ کہیں لکھنؤ میں چھ مہینے بھی تعلیم پائے تو پھر آفت ہی ڈھائے۔ لاکھوں لوٹ لے جائے لاکھوں۔

دوسری طرف گئے تو دو آدمی اور ہی طرح کی باتیں کر رہے تھے۔

ایک۔ اجی دھوکہ ہے اور کچھ نہیں۔

دوسرا۔ ہاں، ٹن ٹن کی آوز تو آتی ہے باقی خیر صلاّح۔

اب آزاد یہاں بیٹھ کر کیا کرتے۔ سوچا آؤ، سانڈنی پر بیٹھیں اور چل کر سرائے میں میٹھی نیند کے مزے لیں۔ مگر باہر آکر دیکھتے ہیں تو سانڈنی غائب۔ تھیٹر کے احاطے میں ایک درخت سے باندھ دیا تھا۔ معلوم نہیں، تڑاکر بھاگی یا کوئی چرا لے گیا۔ بہت دیر تک ادھر ادھر

ڈھونڈا کیے۔ مگر سانڈنی کا پتہ نہ لگا۔ ادھر اور سواریاں بھی تماشائیوں کو لے کر چلی گئیں۔ تب آزاد نے بھٹیارن سے کہا، اب تو پاؤں پاؤں چلنے کی ٹھہرے گی۔

بھٹیارن : نا صاحب، مجھ سے پاؤں پاؤں نہ چلا جائے گا۔

چنڈوباز : دیکھیے، کہیں کوئی سواری ملے تو لے آیئے۔ یہ بے چاری پاؤں پاؤں کہاں تک چلے گی؟

آزاد : تو تمھیں کیوں نہیں لپک جاتے؟

بھٹیارن (اللہ رکھی) اے ہاں اور کیا۔ چڑھنے کو تو سب سے پہلے تمھیں دوڑ وگے۔ تمھیں بات چیت کرنے کی بھی تمیز نہیں۔

آزاد : سواری نہ ملے گی ٹھنڈے ٹھنڈے گھر کی راہ لو، بات چیت کرتے کرتے چلے چلیں گے۔

دوسرے دن آزاد نے سانڈنی کے کھونے کی تھانے مین رپٹ کر دی۔ مگر جس آدمی کو بھیجا تھا، اس نے آ کر کہا حضور، تھانے دار نے رپٹ نہیں لکھی اور آپ کو بلایا ہے۔

آزاد : کون تھانے دار؟ ہم سے تھانے دار سے کیا واسطہ؟ ان سے کہو کہ آپ کو خود میاں آزاد نے یاد کیا ہے، ابھی حاضر ہوں۔

اللہ رکھی : لے، بس بیٹھے رہو۔ بہت اجڑپنا اچھا نہیں ہوتا۔ واہ، کہنے لگے ہم نہ جائیں گے۔ بڑے وہ بنے ہیں۔ آخر سانڈنی کی رپٹ لکھوائی ہے کہ نہیں؟ پھر اب دوڑ و دھوپوگے نہیں تو بنے گی کیوں کر؟ اور وہاں تک جاتے کیا چوڑیاں ٹوٹتی ہیں، یا پاؤں کی مہندی گر جائے گی؟

آزاد : بھئی ہم سے تھانے دار سے ایک دن چخ چل گئی تھی۔ ایسا نہ ہو وہ کوتوالی کے چبوترے پر بیٹھ کر زعم میں آجائیں تو پھر میں لے ہی پڑوں گا۔ اتنا سمجھ لینا، میں آدھی بات سننے کا روادار نہیں۔ سانڈنی ملے یا جہنم میں جائے، اس کی پروا نہیں، مگر کوئی اینڈا بینڈا فقرہ سنایا اور میں نے کرسی کے نیچے پٹکا۔ کیوں سنیں، چور نہیں کہ کوتوال سے ڈروں، جواری نہیں کہ پیادے کی صورت دیکھتے ہی جان نکلے، بدمعاش نہیں کہ منہ چھپاؤں، مریل نہیں کہ دو باتیں سہہ جاؤں۔ کوئی بولا اور میں نے تلوار نکالی۔ پھر وہ نہیں یا میں نہیں۔

اللہ رکھی : ارے، وہ بیچارہ تو ایک ہنس مکھ آدمی ہے، لڑائی کیوں ہونے لگی۔

آزاد : خیر، تمھاری خوشی ہے تو چلتا ہوں، مگر چلو تم بھی ساتھ، راستے میں دو گھڑی دل لگی ہی ہوگی۔

آخر میاں آزاد اور اللہ رکھی دونوں تھانے چلے۔ ایک کانسٹبل بھی ساتھ تھا۔ راہ میں ایک آدمی اکڑتا ہوا جارہا تھا۔ آزاد اس کا اکڑنا دیکھ کر آگ ہوگئے۔ قریب جاکر ایک دھکا جو دیا تو اس نے پچاس لڑھکنیاں کھائیں۔ تھوڑی دور اور چلے تھے کہ ایک آدمی چادر بچھائے، اس پر جڑی بوٹی پھیلائے بیٹھا گپ اڑا رہا تھا۔ اس بوٹی سے اسی برس کا بڈھا جوان ہوجائے، اس جڑی کو پانی میں گھس کر ایک تولا پیے تو شیر کا پنجہ پھیر دے۔ آزاد اس کی طرف جھک پڑے، کیوں بھئی کھلاڑی، یہ کیا سوانگ رچا ہے؟ آج کتنے عقل کے اندھے گانٹھ کے پورے جال میں پھنسے؟ یہ کہہ کر ایک ٹھوکر جو ماری تو ساری بوٹیاں، پتیاں، جڑیں ایک میں مل گئیں۔ اور آگے چلے تو غل غپاڑے کی آواز آئی۔ ایک حلوائی گراہک سے تکرار کر رہا تھا۔

حلوائی : خالی بھجیا نا ہی بکت ہے ہمری دکان پر، کس کس دیئی بھلا۔

گراہک : ابے میں کہتا ہوں، کہیں ایک گدا نہ دوں۔

آزاد : گدا تو پیچھے دیجیے گا، میں ایک گدا کہیں آپ کی گدی پر نہ جماؤں۔

گراہک : آپ کون ہیں بولنے والے؟

آزاد : اس بیچارے حلوائی کو تم کیوں للکارتے ہو؟

اللہ رکھی : اے ہے، میاں تم کوئی خدائی فوج دار ہو؟ کسی کے پھٹے میں تم کون ہو پاؤں ڈالنے والے؟

کانسٹبل : بھیّا، یو بڑے لڑاکا، بس کاو کہوں۔

یہاں سے چلے، تو تھانے آپہنچے۔

کانسٹبل : حضور، لے آیا وہ کھڑے ہیں۔

تھانے دار : اخّاہ! اللہ رکھی بھی ہیں! میں تو چال ہی سے سمجھ گیا تھا۔ کچھ بیٹھنے کو دو انھیں، کوئی ہے؟ سچ کہنا، تمھاری چال سے کیسے پہچان لیا۔

آزاد : اپنے اپنوں کو سبھی پہچان لیتے ہیں۔

تھانے دار : یہ کون بولا ؟ کون ہے بھئی؟

اللہ رکھی : اے بس چلو، دیکھ لیا، منہ دیکھے کی محبت ہے۔ گھر کی تھانے داری اور اب

تک موئی سانڈنی نہ ملی۔ تم سے تو بڑی بڑی امیدیں تھیں۔

تھانے دار (آزاد سے) کہو جی، وہ سانڈنی تمھاری ہے نہ؟

آزاد: 'تم' کا جواب یہاں نہیں دیتے، 'آپ' کہیے، میں کوئی چرکٹا ہوں۔

بھٹیارن: ہائے میرے اللہ، میں کیا کروں؟ یہ تو جہاں جاتے ہیں، دنگا مچاتے ہیں۔

تھانے دار: کیا کچھ ان سے سانٹھ گانٹھ ہے؟ سچ کہنا تمھیں قسم ہے اپنے شیخ صدو کی۔

اللہ رکھی: لو تمھیں معلوم ہی نہیں۔ اچھی تھانے داری کرتے ہو، میں تو ان کے گھر پڑ گئی ہوں نہ۔

تھانے دار: تو یہ کہیے، لاؤ بھئی، سانڈنی کانجی ہاؤس سے نکلواؤ۔

سانڈنی آ موجود ہوئی۔ میاں آزاد سوار ہوئے۔ بھٹیارن بھی پیچھے بیٹھی۔

آزاد: آج تم کئی آدمیوں کے سامنے ہمیں اپنا میاں بنا چکی ہو مکر نہ جانا۔

اللہ رکھی: ذرا چونچ سنبھالے ہوئے، کہیں سانڈنی پر سے ڈھکیل نہ دوں۔

اللہ رکھی کو یقین ہوگیا کہ آزاد مجھ پر ریچھ گئے۔ اب نکاح ہوا ہی چاہتا ہے۔ یوں ہی بہت نخرے کیا کرتی تھی، اب اور بھی نخرے بگھارنے لگی۔ نو کا عمل ہو گیا تھا۔ چارپائی پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی، مگر مکر کیے پڑی ہوئی تھی۔ اتنے میں چنڈو باز آئے۔ آتے ہی پکارے۔ میاں آزاد، میاں آزاد!

اللہ رکھی: یہ آج کیا ہے یہاں خدا ہی خیر کرے۔ دس کا عمل اور ابھی تک کھٹیا ہی پر پڑے ہیں۔ کل رات کو تماشا بھی تو نہ تھا۔ (درخت کی طرف دیکھ کر اور سانڈنی بندھی ہوئی پاکر) جبھی خوش خوش سو رہے ہیں۔ ارے میاں، کیا سانپ سونگھ گیا؟ یہ ماجرا کیا ہے؟ ہاں، اللہ کہہ کر اٹھ تو بیٹھ میرے شیخ۔

آزاد: (انگڑائی لے کر) ارے کیا صبح ہوگئی؟

چنڈو باز: صبح گئی کھیلنے، آنکھ تو کھولو، اب کوئی دم میں بارہ کی توپ دغا چاہتی ہے دن سے۔ دیکھنا، آج دن بھر ستی نہ رہے تو کہنا۔ وہ تو جہاں آدمی ذرا دیر کرکے اٹھا اور ہاتھ پاؤں ٹوٹنے لگے۔ اب ایک کام کرو، سر سے نہا ڈالو۔

آزاد: کیا بک بک لگائی ہے سونے نہیں دیتا۔

اللہ رکھی چپکے چپکے سب سن رہی ہے، مگر اٹھتی نہیں۔ چنڈو باز اس کی چارپائی کی پٹی پر

جا بیٹھے اور بولے۔ اے اٹھ اللہ کی بندی، ایسا سونا بھی کیا؟ یہ کہہ کر آپ نے اس کے بکھرے ہوئے بال، جو زمین پر لٹک رہے تھے، سمیٹ کر چارپائی پر رکھے۔ ادھر میاں آزاد کی آنکھ کھل گئی۔

چنڈوباز (گدگدا کر) اٹھو، میری جان کی قسم، وہ ہنسی آئی، وہ مسکرائی۔

آزاد: او گستاخ الگ ہٹ کر بیٹھ، ہمارے سامنے یہ بے ادبی۔

چنڈوباز: اوں ہوں، بڑے وارث علی خان بنے بیٹھے۔ بھئی آخر تم کو بھی تو جگایا تھا، اب ان کو جگانا شروع کیا، تنکتے کیوں ہو بھلا؟ میں تو سیدھا سادا بھولا بھالا آدمی ہوں۔

آزاد: جی ہاں، ہمیں تو کندھا پکڑ کر جگایا۔ یہ معلوم ہوا کہ چارپائی کو جوڑی چڑھی یا بھونچال آ گیا اور انھیں گدگدا کر جگاتے ہو، کیوں بچہ؟

اللہ رکھی جاگی تو تھی ہی، کھلکھلا کر ہنس پڑی، اے ہٹ مردوے، یہ پلنگ پر آکر بیٹھ جانا کیا مجھے کوئی وہ سمجھ رکھا ہے؟

چنڈباز نے طیش کھا کر کہا۔ واہ واہ پلنگ کی اچھی کہی، 'رہیں جھونپڑوں میں اور خواب دیکھیں محلوں کا۔' کبھی بابا جان بھی پلنگ دیکھا تھا۔

اللہ رکھی: میاں مجھ سے یہ جلی کٹی باتیں نہ کیجیے گا ذری۔ واہ ہم جھونپڑوں ہی میں رہتی ہیں سہی اب تو ایک بھلے مانس کے گھر پڑنے والے ہیں۔ کیوں میاں آزاد، ہے نہ دیکھو مکر نہ جانا۔

آزاد: واہ، مکرنے کی ایک ہی کہی، 'نیکی اور پوچھ پوچھ'؟

اللہ رکھی: تس پر بھی تمھیں شرم نہیں آتی کہ اس اچکّے نے مجھے ہاتھ لگایا اور تم مُلر مُلر دیکھا کیے۔ دوسرا ہوتا تو مہنامتھ مچا دیتا۔

چنڈوباز: کیوں لڑواتی ہو بھلا مفت میں؟ ہمیں کیا معلوم تھا کہ یہاں نکاح کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

میاں آزاد ہاتھ منہ دھونے باہر گئے تو چنڈوباز اور اللہ رکھی میں یوں باتیں ہونے لگیں۔

چنڈوباز: یار پھانسا تو بڑے ٹھ کو؟ اب جانے نہ دینا، ایسا نہ ہو نکل جائے۔ بھئی قسم خدا کی عورت کیا وِش کی گانٹھ ہے تو۔

اللہ رکھی : مگر تم بھی کتنے بے شعور ہو؟ اس کے سامنے آپ نے گدگدانا شروع کیا اب وہ کھٹکے کہ نہ کھٹکے؟ تمھاری جو بات ہے دنیا سے انوکھی، تاڑ سا قد بڑھایا مگر تمیز چھو نہیں گئی۔

چنڈو باز : اب تم سے جھگڑے کون؟ میں کسی کے دل کی بات تھوڑے ہی پڑھا ہوں، مگر بھئی پکی کر لو۔

اللہ رکھی : ہاں، پکی پوڑی ہونی چاہیے۔ کسی اچھے وکیل سے صلاح لو۔ وہ کون وکیل ہے جو کمیت گھوڑے کی جوڑی پر نکلتے ہیں، اجی وہی جو گبرو سے ہیں ابھی۔

چنڈو باز : وکیلوں کی نہ پوچھو، تیرہ سو ساٹھ ہیں۔ کسی کے پاس لے چلیں گے۔

اللہ رکھی : نہیں، واہ کسی بوڑھے وکیل کے یہاں تو میں نہ جاؤں گی۔ ایسی جگہ چلو جو جوان ہو، اچھی صلاح دے۔

چنڈو باز : اچھا، آج اتوار ہے، شام کو میاں آزاد سے کہنا کہ ہمیں اپنی بہن کے یہاں جانا ہے۔ بس ہم پھاٹک کے اس طرف دبکے کھڑے رہیں گے، تم آنا، ہم تم چل کر سب معاملہ بھگتا دیں گے۔

اللہ رکھی : اچھا اچھا تمھیں خوب سوجھی۔

اتنے میں آزاد منہ ہاتھ دھو کر آئے تو اللہ رکھی نے کہا۔ ہمیں تو آج بہن کے یہاں نیوتا ہے، کوئی پکی دو گھڑی میں آجاؤں گی۔

آزاد : ذرا سالی کی صورت ہمیں بھی تو دکھا دو۔ ایسا بھی کیا پردہ ہے، کہو تو ہم بھی ساتھ ساتھ چلے چلیں۔

اللہ رکھی : واہ میاں، تم تو انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے لگے۔ یہ کہہ کر اللہ رکھی کوٹھری میں گئی اور سولہ سنگار کر کے نکلی، تو آزاد پھڑک گئے۔ پٹیاں جمی ہوئی، گوری گوری ناک میں کالی کالی لونگ، پیارے پیارے مکھڑے پر ہلکا سا گھونگھٹ، ہاتھوں میں کڑے، پاؤں میں چھڑے، چھم چھم کرتی چلی۔

چنڈو باز : ان کے سامنے چمک چمک کے باتیں کرنا، یہ نہیں کہ جھینپنے لگو۔

اللہ رکھی : مجھے اور آپ سکھائیں۔ چمکنا بھی کچھ سکھانے سے آتا ہے۔ میری تو بوٹی بوٹی یوں ہی پھڑکا کرتی ہے۔ تم چلو تو جو میری باتوں اور آنکھوں پر لٹو نہ ہو جائیں۔ تو اللہ رکھی نہیں۔ کچھ ایسا کروں کہ وہ بھی نکاح پر رضامند ہو جائیں، تو ان سے اور آزاد سے ذرا جوتی

چلے۔

وکیل صاحب اپنے باغ میں تخت پر بیٹھے دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ خدمت گار نے آ کر کہا، حضور ایک عورت آئی ہے، کہتی ہے کچھ کہنا ہے۔

دوست : کیسی عورت ہے بھئی، جوان ہے یا کھپٹ؟

خدمت گار : حضور، یہ تو دیکھنے سے معلوم ہوگا، مُل ہے ابھی جوان۔

وکیل : کہو صبح آئے۔

دوست : واہ واہ، صبح کی ایک ہی کہی، اجی بلاؤ بھی۔ ہمارے سر کی قسم، بلاؤ، کہو ٹوپی تمھارے قدموں پر رکھ دیں۔

اللہ رکھی چھڑوں کو چھم چھم کرتی، عجب مستانی چال سے اٹھلاتی بوٹی بوٹی پھڑکاتی ہوئی آئی۔ جس نے دیکھا پھڑک گیا۔ سب رنگیلے بگڑے دل بے فکرے جمع تھے۔ ایک صاحب نواب تھے، دوسرے صاحب منشی، آپس میں مذاق ہونے لگا۔

نواب : بندگی عرض ہے۔ خدا کی قسم آپ ایک ہی نیارے ہیں۔

منشی : بھئی، صورت سے تو بھلے مانس معلوم ہوتے تھے، لیکن ایک ہی رسیا نکلے۔

وکیل : بھئی، اب ہم کچھ نہ کہیں گے، اور کہیں کیا، چھا گئی۔ بی صاحبہ آپ کس کے پاس آئی ہیں؟ کہاں سے آنا ہوا؟

اللہ رکھی : اب ایسی اجیرن ہوگئی۔

وکیل : نہیں نہیں، واہ بیٹھو، ادھر تخت پر آؤ۔

اللہ رکھی : ہاں، بنائیے، ہم تو سیدھے سادے ہیں صاحب

نواب : آپ بھولی ہیں بجا ہے۔

وکیل : عورت ہے یا پرستان کی پری۔

نواب : رتجھے رتجھے لو بی اب پو بارہ ہیں۔

اللہ رکھی : حضور، ہم یہ پو بارہ اور تین کانے تو جانتے نہیں، ہمارا مطلب نکل جائے، تو آپ سب صاحبوں کا منہ میٹھا کر دیں گے۔

دوست : آپ کی باتیں یہی کیا کم میٹھی ہیں۔

اتنے میں چنڈوباز بھی آ پہنچے۔

چنڈوباز : حضور تو انھیں جانتے نہ ہوں گے، یہ اللہ رکھی ہیں۔ ان کا نام دور دور تک روشن ہے۔

وکیل : ان کا کیا، ان کے سارے خاندان کا نام روشن ہے۔

چنڈوباز : سرائے میں ایک آزاد نامی جوان آکر ٹھہرے ہیں۔ وہ ان کے اوپر جان دیتے ہیں اور یہ ان پر مرتی ہیں۔ کئی آدمیوں کے سامنے وہ قبول چکے ہیں کہ ان کے ساتھ نکاح کریں گے۔ مگر آدمی ہیں رنگیلے، ایسا نہ ہو کہ انکار کر جائیں۔ بس، ان کی یہی عرض ہے کہ حضور کوئی ایسی تدبیر بتائیں کہ وہ نکل نہ سکیں۔

اللہ رکھی : مجھ غریبنی سے کوئی چھپن ٹکے تو آپ کو ملنے نہیں ہیں۔ رہا، اتنا ثواب کیجیے جس میں یہ شکنجے میں جکڑ جائیں۔

منشی : اگر نکاح ہی کرنے کا شوق ہے تو ہم کیا برے ہیں؟

وکیل : ایک تمھیں کیا، یہاں سب جھنڈے تلے کے شہدے چھٹے ہوئے لچے جمع ہیں۔ جس کو یہ پسند کریں اسی کے ساتھ نکاح ہوجائے۔

اللہ رکھی : حضور لوگ تو مجھ سے دل لگی کرتے ہیں۔

وکیل : اچھا، کل آؤ تو ہم تمھیں وہ ترکیب بتائیں کہ تم بھی یاد کرو۔

اللہ رکھی : مگر بندی نے کبھی سرکار دربار کی صورت دیکھی نہیں۔ آپ وکالت کیجیے گا؟

منشی : ہاں جی ہاں، اس میں منت ہی کیا ہے، مگر جانتی ہو یہ وکیل تو روپے کے آشنا ہیں۔

اللہ رکھی : واہ، روپیہ یہاں اللہ کا نام ہے، ہم ہیں چاہے بیچ لو۔

وکیل : اچھا، کل آؤ، پہلے دیکھو تو وہ کیا کہتے ہیں۔

اللہ رکھی اب یہاں سے اٹھنا چاہتی تھی مگر اٹھے کیسے۔ کنکھیوں سے چنڈوباز کی طرف دیکھا کہ اب یہاں سے چلنا چاہیے۔ وہ بھی اس کا مطلب سمجھ گئے۔ بولے اے حضور ذرا گھڑی کو تکلیف دیجیے گا دیکھیے تو کے بجے ہوں گے۔

اللہ رکھی : میں اٹکل سے کہتی ہوں، کوئی بارہ بجے ہوں گے۔

چنڈوباز : میں بھی کہوں، یہ جمائیوں پر جمائیاں کیوں آرہی ہیں۔ نشے کا وقت ٹل گیا۔ حلوائیوں کی دکانیں بھی بڑھ گئی ہوں گی۔ ملائی سے بھی گئے۔ حضور، اب تو رخصت کیجیے، اب

تو چنڈو کی لو لگی ہے، آج سویرے سویرے آزاد کی منحوس صورت دیکھی تھی، جبھی یہی حال ہوا۔

اللہ رکھی : لے خبردار، اب کی کہا تو کہا اب آزاد کا نام لیا تو مجھ سے برا کوئی نہیں، زبان کھینچ لوں گی۔ ناحق کسی پر چھدا رکھنا اچھا نہیں۔

نواب : ارے بھئی کوئی ہے، دیکھو دوکانیں بڑھ نہ گئی ہوں تو ان کو یہیں چنڈو پلوا دیں۔ ذرا دو گھڑی اور بی اللہ رکھی سے صحبت گرماویں۔

خدمت گار : جانے کو کہیے میں جاؤں، مل دکانیں کب کی بڑھ گئی ہیں۔ بازار بھر میں سناٹا پڑا ہے، چڑیاں چن گن تک سو رہی ہیں۔ اب کوئی دم میں چکیاں چلیں گی۔

اللہ رکھی : اے کیا آدھی رات ڈھل گئی؟ لے اب تو بندی رخصت ہوتی ہے۔

منشی : واہ اس اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتی کہاں جاؤ گی۔

اللہ رکھی : نہیں حضور، اب آنکھیں بند ہوئی جاتی ہیں۔ بس اب رخصت حضور بھولیے گا نہیں، اتنی دیر مزے سے باتیں کی ہیں یاد رکھیے گا لونڈی کو۔

منشی :

وہ ہنستے آئے، یہاں سے ہمیں رلا کے چلے
نہ بیٹھے آپ مگر درد دل اٹھا کے چلے

وکیل :

دکھا کے چاند سا مکھڑا چھپایا زلفوں میں
دونگی ہم کو زمانے کی وہ دکھا کے چلے

نواب :

نہ تھا جو کوچے میں اپنا قیام مدنظر
تو میرے بعد میری خاک بھی اڑا کے چلے

خدا کے لیے اتنا تو اقرار کرتی جاؤ کہ کل ضرور ملیں گے، ہاتھ پر ہاتھ مارو۔

اللہ رکھی : آپ، لوگوں نے کیا جادو کر دیا، اب رخصت کیجیے۔

وکیل :

یہ بھی کوئی ہنسی ہے کہ رخصت کا لے کے نام
سو بار بیٹھے بیٹھے ہمیں تم رلا چلے

نواب :

آنکھوں آنکھوں میں لے گئے وہ دل

کانوں کانوں ہمیں خبر نہ ہوئی۔

اللہ رکھی یہاں سے چلی تو راہ میں ڈینگ مارنے لگی۔ کیوں سب کے سب ہماری چھوی پر لوٹ گئے نہ؟ یہاں تو فقیر کی دعا ہے کہ جس محفل میں بیٹھ جاؤں وہیں کٹاؤ ہونے لگے۔

دونوں سرائے میں پہنچے تو دیکھا آزاد جاگ رہے ہیں۔

اللہ رکھی : آج کیا ہے کہ پلک تک نہ جھپکی؟ یہ کس کی یاد میں نیند اچاٹ ہے؟

آزاد : ہاں ہاں جلاؤ دو دو بجے تک ہوا کھاؤ اور ہم سے آکر باتیں بناؤ۔

اللہ رکھی : اے واہ یہ شک تب تو میزان مٹ چکی۔ اب ان کے مارے کوئی بھائی بہن چھوڑ دے۔ اب یہ بتاؤ کہ نکاح کو کون دن ٹھیک کرتے ہو؟ ہم آج سب سے کہہ آئے کہ میاں آزاد کے گھر پڑیں گے۔

آزاد : کیا سچ مچ تم سب سے کہہ آئی؟ کہیں ایسا کرنا بھی نہیں۔ میں دل لگی کرتا تھا۔ خدا کی قسم فقط دل لگی ہی تھی۔ میں پردیسی آدمی، شادی بیاہ کرتا پھروں گا اور بھٹیارن سے؟ مانا کہ تم ہو پری مگر پھر بھٹیارن ہی تو، چار دن کے لیے سرائے میں آکر ٹکے، تو یہاں سے یہ بلا لے جائیں۔

اللہ رکھی : اے چونچ سنبھال مردوئے !اور سنیے گا ہم بلا ہیں جس پر سارے شہر کی نگاہ پڑتی ہے دوسرا کہتا تو خون خرابہ کر ڈالتی۔ مگر کروں کیا، قول ہار چکی ہوں۔ برادری بھر میں کلنک کا ٹیکہ لگے گا۔ بلا کی اچھی کہی تمھارے منہ سے میری ایڑی گوری ہے، چاہے ملا لو۔

آزاد : تو بی صاحبہ سنیے کس کی شادی اور کس کا بیاہ۔

اللہ رکھی : ان باتوں سے نہ نکلنے پایئے گا۔ کل ہی تو میں نالش داغتی ہوں۔ اقرار کر کے مکر جانا کیا خالہ جی کا گھر ہے؟ میاں میں جو اپنی والی پر آئی، تو بڑا گھر ہی دکھاؤں گی۔ کسی اور بھروسے نہ بھولنا، مجھ سے برا کوئی نہیں۔

آزاد : خدا کی پناہ، میں اب تک سمجھتا تھا کہ میں ہی بڑا گھاگھ ہوں، مگر اس عورت نے میرے بھی کان کاٹے۔ بھلا دی ساری چوکڑی، خدا تڑکا جلدی سے ہو تو میں دوسری کوٹھری لوں۔

اللہ رکھی (ناک پر انگلی رکھ کر) رو دے رو دے، اس سے چھوکری ہی ہوئے ہوتے، تو کسی بھلے مانس کا گھر بستا۔ بھلا مجال پڑی ہے کہ کوئی بھٹیاری نکائے؟

آزاد: تو سارے شہر بھر میں آپ کا راج ہے کچھ؟

اللہ رکھی: ہئی ہے ہئی ہے، کیا ہنسی ٹھٹھا ہے؟ کل پرسوں تک آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوجائے گا۔

آزاد: چلیے آپ کی بلا سے۔

چنڈوباز: بلا ولا کے بھروسے نہ رہیے گا۔ دو چار دن تاتھیا مچے گی۔

آزاد: ذری آپ چپکے بیٹھے رہیے گا۔ یہ تو کامنی ہیں، لیکن تمھاری مفت میں شامت آجائے گی۔

چنڈوباز: میرے منھ نہ لگیے گا، اتنا کہے دیتا ہوں۔

آزاد نے اٹھ کر دو چار چانٹے جڑ دیے۔ اللہ رکھی نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ اللہ کرے ہاتھ ٹوٹیں، لے کے غریب کو پیٹ ڈالا۔

چنڈوباز: میری بھی تو دو ایک پڑ گئی جی۔

اللہ رکھی: اے چپ بھی رہ، بولنے کو مرتا ہے۔

اس طرح لڑ جھگڑ کر تینوں سوئے۔

(20)

دوسرے دن سویرے آزاد کی آنکھ کھلی تو دیکھا ایک شاہ جی ان کے سرہانے کھڑے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ شاہ جی کے ساتھ ایک لڑکا بھی ہے، جو اللہ رکھی کو دعائیں دے رہا ہے۔ آزاد نے سمجھا کوئی فقیر ہے، جھٹ اٹھ کر ان کو سلام کیا۔ فقیر نے مسکرا کر کہا۔ حضور میرا انعام ہوا۔ سچ کہیے گا ایسے بہروپیے کم دیکھے ہوں گے، آزاد نے دیکھا غچا کھا گئے، اب بنا انعام دیے گلا نہ چھوٹے گا۔ بس اللہ رکھی کی بھڑکیلی دلائی اٹھا کر دے دی۔ بہروپیے نے دلائی لی جھک کر سلام کیا اور لمبا ہوا۔ لونڈے نے دیکھا کہ میں ہی رہا جاتا ہوں۔ بڑھ کر آزاد کا دامن پکڑا۔ حضور ہمیں کچھ بھی نہیں؟ آزاد نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر پھینک دیا۔ تب اللہ رکھی چمک کر آگے بڑھی اور بولی ہمیں؟

آزاد : تمھارے لیے جان حاضر ہے۔

چنڈو باز : یہ سب زبانی داخل ہے۔ بی بی کو یہ خبر ہی نہیں کہ دلائی انعام میں چلی گئی۔ الٹے چلی ہیں مانگنے۔ یہ تو نہ ہوا کہ چاندی کے چھڑے بنوا دیتے، یا کسی دن ہمی کو دو چار روپے دے ڈالتے۔ جاؤ میاں بس تم کو بھی دیکھ لیا، گو کے یار ہو، 'چمڑی جائے دمڑی نہ جائے'۔

اللہ رکھی : کہیں تیرے سر گرمی تو نہیں چڑھ گئی۔ ذرا چندیا کے پٹے کتروا ڈال۔ یہ چمڑی اور دمڑی کا کون موقع تھا۔ یہ بتایئے اب نکاح کی کب تیاریاں ہیں؟

آزاد : ابھی نکاح کی امید آپ کو ہے؟ واللہ کتنی بھولی ہو۔

اللہ رکھی : تو کیا آپ نکل بھی جائیں گے؟ ایے میں تو چڑھوں گی عدالت، کہہ کر مکر جانا کیا ہنسی ٹھٹّھا ہے۔

آزاد : تو کیا نالش کیجیے گا؟

اللہ رکھی : کیوں، کیا کوئی شک بھی ہے؟ ہم کیا کسی کے دبیل ہیں؟

چنڈو باز : اور گواہ کو دیکھ رکھے۔ دلائی کیا جھپ سے اٹھا دی۔ پرائی دلائی کے آپ کون دینے والے تھے؟ اجی میں تو وہ وہ سوال جواب کروں گا کہ آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔

آزاد : اچھی بات ہے، یہ شوق سے نالش کریں اور آپ گواہی دیں۔ انھیں تو کیا کہوں پر تمھیں سمجھوں گا۔

چنڈو باز : مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجیے گا نہیں تو پھر گدا ہی دوں گا۔

اللہ رکھی : چل ہٹ، بڑا آیا وہاں سے گدا دینے والا، ابھی میں چمٹ جاؤں تو چیخنے لگے، اس پر گدا دیں گے۔

آزاد : تو پھر جایئے وکیل کے یہاں دیر ہو رہی ہے۔

اللہ رکھی : تو کیا سچ مچ تمھیں انکار ہے؟ میاں آنکھیں کھل جائیں گی۔ جب سرکار کا پیادا آئے گا تو بھاگنے کو جگہ نہ ملے گی۔

چنڈو باز : یہ ہیں شہدے، یوں نہیں ماننے کے۔ چلوں چلیں، دن چڑھتا آتا ہے۔ ابھی کنگھی چوٹی میں تمھیں گھنٹوں لگیں گے اور وہ سرکاری درباری آدمی ٹھہرے۔ موکّل صبح شام گھیرے رہتے ہیں۔ جب دیکھو، بگھیاں، ٹم ٹم، فٹن، جوڑی، گاڑی، ہاتھی، گھوڑے، پالکی، اکے،

تانگے، یابو، فنس، معانے دروازے پر موجود۔

آزاد: کیا اور کسی سواری کا نام یاد نہیں تھا؟ آج سرور خوب گٹھے ہیں۔

چنڈوباز: اجی یہاں اللہ رکھی کی بدولت روز ہی سرور گٹھے رہتے ہیں۔

اللہ رکھی نے کوٹھری میں جاکر سنگار کیا اور نکھر کر چلی تو آزاد کی نگاہ پڑ ہی گئی۔ چار آنکھیں ہوئیں تو دونوں مسکرا دیے۔ چنڈو نے یہ شعر پڑھا۔

ان کو دیکھا تو یہ ہنس دیتے ہیں
آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی

اللہ رکھی ایک ہری ہری چھتری لگائے چھم چھم کرتی چلی۔ بگڑے دل آوازیں کستے تھے، پر وہ کسی طرف آنکھ اٹھاکر نہ دیکھتی تھی۔ چنڈوباز 'ہٹو بچو' کرتے چلے جاتے تھے۔ ذری ہٹ جانا سامنے سے۔ ایں کیا چھکڑا آتا ہے، کیوں ہٹ جائیں؟ اخواہ، یہ کہیے آپ کی سواری آرہی ہے۔ لو صاحب ہٹ گئے۔ ایک رسیا نے پیچھا کیا۔ یہ لوگ آگے آگے چلے جارہے ہیں اور میاں رسیا پیچھے پیچھے غزلیں پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ چنڈوباز نے دیکھا کہ یہ اچھے بگڑے دل ملے۔ ساتھ جو ہوا تو پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ آپ ہیں کون؟ یا آگے بڑھیے یا پیچھے چلیے۔ کسی بھلے مانس کو ستاتے کیوں ہیں؟ اس پر اللہ رکھی نے چنڈوباز کے کان میں چپکے سے کہا، یہ بھی تو شکل صورت سے بھلے مانس معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے۔

چنڈوباز: آپ تو وکیل کے پاس چلتی تھیں، کہاں اس سڑی سودائی سے سانٹھ گانٹھ کرنے کی سوجھی۔ سچ ہے، حسینوں کے مزاج کا ٹھکانہ ہی کیا۔ بولے اجی صاحب ذری ادھر گلی میں آیئے گا، آپ سے کچھ کہنا ہے۔

رسیا: واہ، 'نیکی اور پوچھ پوچھ'

تینوں گلی میں گئے، تو اللہ رکھی نے کہا، کہیں تمھارے مکان بھی ہیں؟ یہاں اس گلیارے میں کیا کہوں، کوئی آوے کوئی جاوے، کھڑے کھڑے باتیں ہوا کرتی ہیں۔

چنڈوباز نے سوچا کہ دوسرا گل کھلا چاہتا ہے۔ پوچھا میاں تمھارا مکان یہاں سے کتنی دور ہے؟ جو کالے کوسوں ہو، تو میں لپک کر بگھی کرائے کرلوں۔ ان سے اتنی دور نہ چلا جائے گا۔ ان کو تو مارے نزاکت کے چھتری ہی کا سنبھالنا بھاری ہے۔

رسیا: نہیں صاحب، دور نہیں ہے، بس کوئی دس قدم آیئے۔ رسیا نے چھتری لے لی اور

خدمت گار کی طرح چھتری لگا کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ چنڈو باز نے دیکھا، اچھا گاودی ملا۔ خود بھی چھتری کے سائے میں رئیس بنے ہوئے چلنے لگے۔ تھوڑی دیر میں رسیا کے مکان پر آ پہنچے۔

رسیا:

وہ آئیں گھر میں ہمارے، خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

یہاں تو سچے عاشق ہیں۔ جس کو دل دیا اس کو دیا۔ جان جائے، مال جائے، عزت جائے، سب منظور ہے۔

چنڈو باز: اچھا اب ان کا مطلب سنیے۔ یہ بیچاری ابھی اٹھارہ انیس برس کی ہوں گی۔ ابھی کل تو پیدا ہوئی ہیں۔ اب سنیے کہ ان کے میاں ان سے لڑ جھگڑ کر حیدرآباد بھاگ گئے۔ وہاں کسی کو گھر میں ڈال لیا۔ اب یہ اکیلی ہیں، ان کا جی گھبراتا ہے اتنے میں ایک شوقین رئیس سرائے میں اترے، بڑے خوبصورت کلّے ٹھلّے کے جوان ہیں۔

اللہ رکھی: میاں آنکھیں تو ایسی رسیلی کہ دیکھی نہ سنی۔

چنڈو باز: اے تو مجھی کو اب کہنے دو۔ تم تو بات کاٹے دیتی ہو۔ ہاں تو میں کہتا تھا کہ اِن کی اُن کی آنکھیں چار ہوئیں تو اِدھر یہ اُدھر وہ، دونوں گھائل ہو گئے۔ پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوا کیں۔ پھر کھل کے صاف کہہ دیا کہ ہم تم کو بیاہیں گے۔ پھر نہ جانے کیا سمجھ کر مکر گئے۔ اب ان کا ارادہ ہے کہ ان پر نالش ٹھونک دیں۔

رسیا: اجی ان کو بھاڑ میں جھونکیں، جو بیاہ ہی کرنا ہے تو ہم سے نکاح پڑھواؤ ان کو دھتا بتاؤ۔

اللہ رکھی: سچ کہوں تم مردوں کا ہمیں اعتبار دمڑی بھر بھی نہیں رہا۔ اب جی نہیں چاہتا کہ کسی سے دل ملائیں۔

رسیا: تم نے ہمیں ابھی پہچانا ہی نہیں۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ ہم شریف زادے ہیں۔

اللہ رکھی: لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اللہ رکھی بڑی خوش نصیب ہے۔ مگر میاں میں کس سے کہوں دل کا حال کوئی کیا جانے۔

چنڈوباز : یہی دیکھیے عرضی دعویٰ ہے۔

رسیا : ارے یہ کس پاگل نے لکھا ہے جی؟ ایسا بھلا کہیں ہو سکتا ہے کہ سرکار آزاد سے تمھارا نکاح کروا ہی دے؟ ہاں اتنا ہو سکتا ہے کہ ہرجانہ دلوا دے۔ پر اس کا ثبوت بھی ذرا مشکل ہے۔

اللہ رکھی : اجی ہوگا بھی، مسودہ پھاڑ ڈالو۔ آزاد سے اب مطلب ہی کیا رہا؟

رسیا : ہم بتائیں نالش تو داغ دو ہرجانہ ملا تو ہرج ہی کیا ہے۔ باقی بیاہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ اُدھر تم نے مقدمہ جیتا اِدھر ہم بارات لے کر آئے۔

اللہ رکھی : تو چلو تم وکیل کے یہاں تک چلے چلو نہ

رسیا : ہاں، ہاں، چلو۔

تینوں آدمی وکیل کے یہاں پہنچے۔ لیکن بڑی دیر تک باہر ہی ٹاپا کیے۔ یہ رئیس آئے وہ امیر آئے۔ کبھی کوئی مہاجن آیا۔ بڑی دیر کے بعد ان کی طلبی ہوئی، مگر وکیل صاحب دیکھتے ہیں تو اللہ رکھی کا منہ اترا ہوا ہے، نہ وہ چمک دمک ہے نہ وہ مسکرانا اور لجانا، پوچھا آخر ماجرا کیا ہے؟ آج اتنی ادس کیوں ہو؟ کہاں وہ چھوی تھی، کہاں یہ اداسی چھائی ہوئی ہے؟ اللہ رکھی نے اس کا تو جواب کچھ نہ دیا، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسو کا تار بندھ گیا۔ وکیل سناٹے میں۔ آج یہ کیا ماجرا ہے، ان کی آنکھوں میں آنسو۔

چنڈوباز : حضور، یہ بڑی پاک دامن ہیں۔ جتنی ہی چنچل ہیں اتنی ہی سمجھ دار۔ میرا خدا گواہ ہے بری راہ چلتے آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی پاک دامنی کی قسم کھانی چاہیے۔ اب یہ فرمائیے مقدمہ کیسے دائر کیا جائے۔

رسیا : جی ہاں، کوئی اچھی تدبیر بتائیے زبردستی شادی تو ہو نہیں سکتی۔ اگر کچھ ہرجانہ ہی مل جائے، تو کیا برا؟ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی، کچھ تو لے ہی مریں گی۔

چنڈوباز : مریں ان کے دشمن، آپ بھی کتنے پھوہڑ ہیں واہ۔

وکیل : اچھا یہ تو بتائیے کہ وہ رئیس کہاں سے آئیں گے، جو کہیں کہ ہم سے اور ان سے بیاہ کی ٹھہری تھی؟

رسیا : اب بتا ہی دوں، بندا ہی کہے گا کہ ہم سے مہینوں سے بات چیت ہے۔ آزاد بیچ میں کود پڑے، واللہ وہ وہ جواب دوں کہ آپ بھی خوش ہو جائیں۔

وکیل : واہ تو پھر کیا پوچھنا، ہم آپ کو دو ایک چٹکلے بتا دیں گے کہ آپ فراٹے بھرنے لگیے گا۔ مگر دو ایک گواہ تو ٹھہرا لیجیے۔

چنڈوباز : ایک گواہ تو میں ہی بیٹھا ہوں فراٹے باز۔

خیر، تینوں آدمی کچہری پہنچے۔ جس پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھے وہاں میلا سا لگ گیا۔ کچہری بھر کے آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ دھکم دھکا ہو رہا ہے۔ چنڈوباز وارث علی خاں بنے بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے ہیں۔ جاؤ بھئی، اپنا کام کرو، آخر یہاں کیا میلا ہے، کیا بھیڑیا دھسان ہے۔

ایک۔ آپ لائے ہی ایسی ہیں۔

دوسرا۔ اچھا، ہم کھڑے ہیں، آپ کا کچھ اجارہ ہے؟ واہ اچھے آئے۔

تیسرا۔ بھائی ذرا ہنس بول لیں آخر مرنا تو ہے ہی

جب ایک بجا تو بی اللہ رکھی اٹھلاتی ہوئی سوال دینے چلیں۔ چنڈوباز ایک ہاتھ میں حقہ لیے ہیں دوسرے میں چھتری۔ خدمت گار بنے چلے جاتے ہیں۔ لوگ ادھر ادھر جھنڈ کے جھنڈ کھڑے ہیں۔ پر کوئی بتاتا نہیں کہ عرضی کہاں دی جاتی ہے۔ ایک کہتا ہے داہنے ہاتھ جاؤ دوسرا کہتا ہے بائیں بائیں۔ بڑی مشکل سے اجلاس تک پہنچیں۔

ادھر آزاد پڑے پڑے سوچ رہے تھے کہ اس بے فکری کا کہیں ٹھکانا ہے؟ جو کہیں نواب کے آدمی چھوٹیں، تو چور چور بنیں اور الو کے الو بنائے جائیں۔ کسی کو منہ دکھانے لائق نہ رہیں۔ آبرو پر پانی پھر گیا۔ ابھی دیکھیے کیا کیا ہوتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتے ہیں۔

اتنے میں سرائے میں لینا لینا کا غل مچا۔ یہ بھی بھڑبھڑا کر کوٹھری سے نکلے، تو دیکھتے ہیں کہ سانڈنی نے رسی توڑتاڑ کر پھینک دی ہے اور سرائے بھر میں اچکتی پھرتی ہے۔ پہلے ایک مسافر کے ٹٹو کی طرف جھکی اور اس کو مارے پُستوں کے بوکھلا دیا۔ مسافر بیچارہ ایک لگا لیے کھٹاکھٹ ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ پھر جو وہاں سے اچھلی تو دو تین بیلوں کا کچومر ہی نکال ڈالا۔ گاڑی وان ہائیں ہائیں کر رہا ہے۔ لیکن اس ہائیں ہائیں سے بھلا اونٹ سمجھا کیے ہیں۔ یہاں سے جھپٹی تو تین چار اکوں کے انجر پنجر الگ کر دیے۔ آزاد تو بڑا دکھا رہے ہیں اور آوازیں کر رہے ہیں۔ لوگ تالیاں بجا دیتے ہیں تو وہ اور بھی بوکھلا جاتی ہے۔ بارے بڑی مشکل سے نکیل ان کے ہاتھ میں آئی۔ اسے باندھ کر کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ اللہ رکھی اور چنڈو عدالت کے ایک مذکوری کے ساتھ آ پہنچے۔ آزاد نے منھ پھیر لیا اور میٹھے سروں

میں گانے لگے۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

مذکوری : حضور، سمن آیا ہے
آزاد :

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مذکوری : سمن آیا ہے، گانے کو تو دن بھر پڑا ہے لیجیے دستخط تو کر دیجیے۔
آزاد :

دھو دیا اشک ندامت کو گناہوں نے میرے
تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہوگیا

مذکوری : اجی صاحب، میری بھی سنیے گا؟
آزاد : کیا ہم سے کہتے ہو؟
مذکوری : اور نہیں تو کس سے کہتے ہیں؟
آزاد : کیسا سمن، لاؤ، ذرا پڑھیں تو، لو سچ مچ ہی نالش جڑ دی۔

مذکوری نے سمن پر دستخط کرائے اور اللہ رکھی کو گھیرا۔ آج تو ہاتھ گرماؤ، ایک چہرا شاہی لاؤ، اللہ رکھی نے کہا لے تو ابھی سوت نہ کپاس، انعام ونام کیسا؟ مقدمہ جیت جائیں تو دیتے اچھا لگے۔

مذکوری : تم جیتی داخل ہو بی بی، اچھا کل آؤں گا۔

میاں آزاد کے پیٹ میں چوہے کودنے لگے کہ یہ تو بے ڈھب ہوئی۔ میں نے ذرا دل بہلاؤ کے لیے دل لگی کیا کردی کہ یہ مصیبت گلے آپڑی۔ اب تو خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے منہ چھپاکر بھاگ کھڑے ہوں۔ بی اللہ رکھی چلا چلاکر کہنے لگیں۔ اب تو چاندی ہے، جیتے تو گھی کے چراغ جلائیں گے۔ ایک نے کہا۔ یہ نہ کہا، منہ میٹھا کریں گے، گلگلے کھلائیں گے، دوسرے نے کہا۔ نہ کھلائیں گے تو نکاح کے دن ڈھولک کون بجائے گا؟ آزاد موقع کی تاک میں تھے ہی، اللہ رکھی کی آنکھ چوکتے ہی جھٹ سے کاٹھی کسی اور بھاگے۔ ناکے

تک تو ان کو کسی نے نہ ٹوکا، مگر جب ناکے سے کوئی گولی بھر کے ٹپے پر باہر نکل گئے تو میاں چنڈو باز سے چار آنکھیں ہوئیں۔ ارے! غضب ہو گیا اب دھر لیے گئے۔

چنڈو باز : اے بڑے بھائی، کدھر کی تیاریاں ہیں؟ یہ بھاگ جانا ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے کہ کاٹھی کسی اور چل کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں خاک جھونک کر آئے ہوں گے۔ لے بس، اتر پڑو، آؤ ذرا حقہ تو پی لو۔

آزاد : اس دم میں ہم نہ آئیں گے۔ یہ فقرے کسی گنوار کو دیجیے۔ آپ اپنا حقہ رہنے دیں۔ بس اب ہم خوب پی چکے۔ ناکوں دم کر دیا بدمعاشوں نے۔ چلے تھے مقدمہ دائر کرنے۔ کس مزے سے کہتے ہیں کہ حقہ پیے جاؤ، ایسے ہی تو آپ بڑے دوست ہیں۔

چنڈو باز : نیکی کا زمانہ ہی نہیں۔ ہم نے تو کہا اتنے دن ملاقات رہی ہے، آؤ بھائی، کچھ خاطر کر دیں، اب خدا جانے کب ملنا ہو۔

آزاد : خدا نہ کرے، تم جیسے منحوسوں کی صورت خواب میں بھی نظر آئے۔

چنڈو باز نے گل مچانا شروع کیا، دوڑو، چور ہے، لینا، چور چور۔ میاں آزاد نے چنڈو باز پر سڑاک سے کوڑا پھٹکارا اور سانڈنی کو ایک ایڑ لگائی۔ وہ ہوا ہو گئی۔ شہر سے باہر ہوئے تو راہ میں دو مسافروں کو یوں باتیں کرتے سنا۔

پہلا۔ ارے میاں، آج کل لکھنؤ میں ایک نیا گل کھلا ہے۔ کسی نیاریے نے کروڑوں روپے کے جعلی اسٹامپ بنائے اور لندن تک میں جا کر کوڑے کیے۔ سنا کابل میں دو جعلیے پکڑے گئے، مشکیں کس لی گئیں اور ریل میں بند کر کے یہاں بھیج دیے گئے۔ اللہ جانتا ہے ایسا جعل کیا ہے کہ جو بھر بھی فرق معلوم ہو، تو مونچھیں منڈوا لو۔ سنا ہے کوئی ڈیڑھ سو دو سو برس سے بیچتے تھے اور کچھ چوری چھپے نہیں کھلم کھلا۔

دوسرا۔ واہ دنیا میں بھی کیسے کیسے کائیاں پڑے ہیں۔ ایسوں کے تو ہاتھ کٹوا ڈالے۔

پہلا۔ واہ واہ کیا قدر دانی کی ہے۔ انھوں نے تو وہ کام کیا کہ ہاتھ چوم لیں، جاگیریں دیں۔

آزاد کو پہلے مسافر کی گپوڑے بازی پر ہنسی آ گئی۔ کیا جھپ سے جعلیوں کو کابل تک پہنچا دیا اور ہندوستان کے اسٹامپ لندن میں بکوائے۔ پوچھا، کیوں صاحب، کتنے جعلی اسٹامپ بیچے؟

مسافروں نے سمجھا، یہ کوئی پولس افسر ہیں، ٹوہ لینے چلے ہیں، ایسا نہ ہو کہ ہم کو بھی گرفتار کرلیں۔ بغلیں جھانکنے لگے۔

آزاد : آپ ابھی کہتے نہ تھے کہ جعلیے گرفتار کیے گئے ہیں؟

مسافر : کون؟ ہم؟ نہیں تو؟

آزاد : جی، آپ باتیں نہیں کر رہے تھے کہ اسٹامپ کسی نے بنائے اور ڈیڑھ دو سو برس سے بیچتے چلے آئے؟

مسافر : حضور ہم کو تو کچھ معلوم نہیں۔

آزاد : ابھی بتاؤ سور، نہیں ہم تم کو بڑا گھر دکھائے گا اور جیڑی پہنائے گا۔

میاں آزاد تو ان کی چتونوں سے تاڑ گئے تھے کہ دونوں کے دونوں چونگا ہیں، مارے ڈر کے اسٹامپ کا لفظ زبان پر نہیں لاتے۔ جیسے ہی انھوں نے ڈانٹ بتائی ایک تو بگٹٹ پچھم کی طرف بھاگا اور دوسرا کھڑبڑ کرتا ہوا پورب کی طرف۔ میاں آزاد آگے بڑھے۔ راہ میں دیکھا، کئی مسافر ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔

ایک۔ کوئی ایسی تدبیر بتائیے کہ لو نہ لگے۔ آج کل کے دن بڑے برے ہیں۔

دوسرا۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ پیاز کی گھنٹی پاس رکھے۔ یا دو چار کچے آم توڑ لو، آموں کو پہلے بھون لو، جب پلپلے ہوں تو گودا نکال کر چھلکا پھینک دو اور ذرا سی شکر پانی میں گھول کر پی جاؤ۔

پہلا۔ کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ پانی میں تو برف ڈالنی ہی نہ چاہیے۔ پانی کا گلاس برف میں رکھ دو، جب ٹھنڈا ہو جائے تب پیو۔ برف کا پانی نقصان کرتا ہے۔

دوسرا۔ واہ لاکھوں آدمی پیتے ہیں۔

پہلا۔ اجی لاکھوں آدمی جھک مارتے ہیں۔ لاکھوں چوریاں بھی تو کرتے ہیں، پھر اس سے مطلب؟ ہم نے لاکھوں آدمیوں کو دیکھا ہے کہ گڑھوں اور تالابوں کا پانی سفر میں پیتے ہیں۔ آپ پیجیے گا؟ ہزاروں آدمی دھوپ میں چل کر کھڑے کھڑے تین چار لوٹے پانی پی جاتے ہیں۔ مگر یہ کوئی اچھی بات تھوڑی ہے۔

اور آگے بڑھے تو ایک بھڈری آنکلا۔ وہ آزاد کو پہچانتا تھا۔ دیکھتے ہی بولا تمھاری نواب صاحب کے یہاں بڑی تلاش ہے جی۔ تم غائب کہاں ہو گئے تھے اونٹ لے کر؟ اب میں

جا کر کہوں گا کہ میں نے پرشن دیکھا، تو نکلا آزاد پانچ کوس کے اندر ہی اندر ہیں۔ جب تم لپ دینی پہنچ جاؤ گے تو پھر ہماری چڑھتی کلا ہوگی۔ تم کو بھی آدھو آدھ بانٹ دیں گے۔ مگر بھنڈا نہ پھوڑنا۔ چڑھ بازی ہے۔

آزاد : واللہ کیا سوجھی ہے، منظور ہے۔

بھڈری نے پوتھی سنبھال اپنی راہ لی اور نواب کے یہاں دھر دھمکے۔

خوجی : اجی جاؤ، بھی تمھاری ایک بات بھی ٹھیک نہ نکلی۔

نواب : برسوں ہمارا نمک تم نے کھایا ہے، برسوں! ایک دو دن نہیں برسوں! اب اس وقت کچھ پرشن ورشن بھی دیکھوگے یا باتیں ہی بناؤ گے؟ ہم کو تو مسلمان بھائی تمھاری وجہ سے کافر کہنے لگے اور تم کوئی اچھا سا حکم نہیں لگاتے۔

بھڈری : وہ حکم لگاؤں گا کہ پٹ ہی نہ پڑے۔

خوجی : اجی ڈنگیے ہو خاصے۔ کہیں کسی روز میں کرولی نہ بھونک دوں۔ سوا بے پر کی اڑانے کے، بات سیکھی ہی نہیں۔ بھلے آدمی، سال بھر میں ایک دفعہ تو سچ بولا کرو۔

جھمن : واہ، سچ بولتے تو قصائی کے کتے کی طرح پھول نہ جاتے۔

نواب : یہ کیا واہیات بات۔

بھڈری : حضور، ہم سے ان سے ہنسی ہوتی ہے۔ یہ ہمیں کہتے ہیں، ہم انھیں۔ اب آپ کوئی پھول من میں لیں۔

نواب : یہ ڈھکوسلے ہم کو اچھے نہیں معلوم ہوتے۔ ہمیں صاف صاف بتا دو کہ میاں آزاد کب تک آئیں گے؟

بھڈری نے انگلیوں پر کچھ گن گنا کر کہا۔ پانی کے پاس ہیں۔

جھمن : واہ استاد! پانی کے پاس ایک ہی کہی۔ لڑکی نہ لڑکا، دونوں طرح اپنی ہی جیت۔

بھڈری : یہاں سے کوئی تین کوس کے اندر ہیں۔

دُنّی : حضور، یہ بڑا پھیلیا ہے۔ آپ پوچھتے ہیں، آزاد کب آئیں گے، یہ کہتا ہے، تین کوس کے اندر ہی اندر ہیں، سوا جھوٹ، سوا جھوٹ۔

بھڈری : اچھا، جا کر دیکھ لو، جو نامے کے پاس آزاد آتے نہ ملیں، ناک کٹا ڈالوں، پوتھی جلا دوں، کوئی دل لگی ہے؟

نواب : چابک سوار کو بلاکر حکم دو کہ ابھی سرپٹ جائے اور دیکھے، میاں آزاد آتے ہیں یا نہیں۔ آتے ہوں تو اس بھڈری کا آج گھر بھر دوں۔ بس آج سے اس کا کلمہ پڑھنے لگوں۔

چابک سوار نے بانکا مڑاسا باندھا اور سُرنگ گھوڑی پر چڑھ چلا۔ مگر پچاس ہی قدم گیا ہوگا کہ گھوڑی بھڑکی اور تیزی میں دسرے ناکے کی راہ لی۔ چابک سوار بہت اکڑے بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر روک نہ سکے، دھم سے منہ کے بل نیچے آرہے۔ خوجی نے نواب صاحب سے کہا، حضور گھوڑی نے ناظرعلی کو دے پٹکا، اور کیا جانے کس طرف نکل گئی۔

نواب : چلو خیر سمجھا جائے گا۔ تم ٹانگھن کسواؤ اور دوڑ جاؤ۔

خوجی : حضور میں تو بوڑھا ہوگیا اور رہی سہی سکت افیم نے لے لی۔ ٹانگھن ہے بلا کا شریر۔ کہیں پھینک پھانک دے، ہاتھ پاؤں ٹوٹیں تو دین دنیا دونوں سے جاؤں۔ آزاد خود بھی گئے اور ہم سب کو بھی بلا میں ڈال گئے۔

ادھر چابک سوار نے پٹکنی کھائی، ادھر لونڈوں نے تالیاں بجائیں۔ مگر شہ سوار نے گرد جھاڑی، ایک دوسرا کمیت گھوڑا کسا اور کڑکڑا دیا۔ ہوا سے باتیں کرتے جارہے ہیں۔ بغیا میں پہنچے تو دیکھا، سانڈنی کی کارچوبی جھول جھلک رہی ہے اور اونٹنی گردن جھکائے چوطرفہ مٹک رہی ہے۔ جاکر آزاد کے گلے سے لپٹ گئے۔

آزاد : کہیے، نواب کے یہاں تو خیریت ہے؟

سوار : جی ہاں، خیر صلی اللہ کے ڈھیر ہیں۔ مگر آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ او میاں، کچھ اور بھی سنا؟ اس بٹیر کی قبر بنائی گئی ہے۔ سامنے جو بیل بوٹوں سے سجا ہوا مقبرہ دکھائی دیتا ہے وہ اسی کا ہے۔

آزاد : یہ کہیے، یار لوگوں نے قبر بھی بنوا دی۔ واللہ، کیا کیا فقرے باز ہیں۔

سوار : بس، تمھاری ہی کسر تھی، کہو ہم نے سنا خوب گل چھرّے اڑائے۔ چلو۔ پر اب نواب نے یاد کیا ہے۔

آزاد : ایں، انھیں ہمارے آنے کی کہاں سے خبر ہوگئی؟

سوار : اجی، اب یہ ساری داستان راہ میں سنا دیں گے۔

آزاد : اچھا، تو پہلے آپ ہمارا خط نواب کے پاس لے جائیں۔ پھر ہم شان کے ساتھ چلیں گے۔

یہ کہہ کر آزاد نے یہ خط لکھا:

'آج قلم کی باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ کیونکہ میاں صف شکن کی سواری آتی ہے۔ حضور کے نمک کی قسم، ادھر پاتال تک اور ادھر ساتویں آسمان تک ہو آیا، تب جا کے کھوج پایا۔ شاہ جی صاحب روز ڈھاڑھیں مار مار کر روتے ہیں۔ کل میں نے بڑی خوشامد کی اور آپ کی یاد دلائی، تو ٹھنڈی آہ کھینچ کر رہ گئے۔ بڑی بڑی دلیلیں چھانٹتے تھے۔ پہلے فرمایا۔

درون بزم رہ نیست بیگانہ را

میں نے چھوٹتے ہی جواب دیا

کہ پروانگی داد پروانہ را

کھلکھلا کر ہنس پڑے، پیٹھ ٹھونکی اور فرمایا، شاباش بیٹے، نواب صاحب کی صحبت میں تم بہت برق ہو گئے۔ پورے دو ہفتے تک مجھ سے روز بحث رہی۔ آخر میں نے کہا۔ آپ چلیے نہیں میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔ مجھے سمجھایا کہ زندگی بڑی نعمت ہے۔ خیر تمھاری خاطر سے چلتا ہوں۔ لیکن ایک شرط یہ ہے کہ جب میں وہاں پہنچوں، تو نواب کے سامنے خوجی پر بیس جوتے پڑیں۔ میں نے قول دیا، تب کہیں آئے۔

سوار یہ خط لے کر ہوا کی طرح اڑتا ہوا نواب صاحب کے یہاں پہنچا۔

نواب: کہو، بیٹا کہ بیٹی؟ جلدی بولو، یہاں پیٹ میں چوہے کود رہے ہیں۔

سوار: حضور، غلام نے راہ میں دم لیا ہو تو جرمانہ دوں۔

خوجی: کتنے بے تکے ہو میاں، کہیں کھیت کی، سنیں کھلیان کی۔ بھلا اپنی کارگزاری جتانے کا یہ کون موقع ہے؟ مارے مشیخت کے دبلے ہوئے جاتے ہیں۔

سوار نے آزاد کا خط دیا۔ منشی جی پڑھنے کے لیے بلائے گئے۔ خوجی گھبرائے کہ آزاد نے یہ کب کی کسر لی۔ بولے، حضور یہ میاں آزاد کی شرارت ہے۔ شاہ صاحب نے یہ شرط کبھی نہ کی ہوگی۔ بندے سے تو کبھی گستاخی نہیں ہوئی۔

نواب: خیر، آنے تو دو۔ کیوں بھئی میر صاحب، رمال نے تو بیان کیا تھا کہ صف شکن کے دشمن جنت میں داخل ہوئے۔ یہ میاں آزاد کو کہاں سے مل گئے؟

میر صاحب: حضور، خدا کا بھید کون جان سکتا ہے؟

بھڈری: میرا پرشن کیسا ٹھیک نکلا جو ہے سو مانوں نشانے پر تیر کھٹ سے بیٹھ گیا۔

اتنے میں اندر چھوٹی بیگم کو خبر ہوئی۔ بولیں ان کا جیسا پونگا آدمی خدائی بھر میں نہ ہوگا۔ ذری سا تو بٹیر اور پاجیوں نے اس کا مقبرہ بنوا دیا۔ روز کہاں تک بکوں۔

لونڈی : بی بی، برا مانو یا بھلا تمھیں وہ راہیں ہی نہیں معلوم کہ میاں قابو میں آجائیں۔

بیگم : میری جوتی کی نوک کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان کے بیچ میں بولے۔ میں تو آپ ہی ڈرا کرتی ہوں کہ کوئی مجھی پر طوفان نہ باندھ دے۔

ادھر نواب صاحب نے حکم دیا کہ صف شکن کی سواری دھوم سے نکلے۔ اتنا اشارہ پانا تھا کہ خوجی اور میر صاحب لگے جلوس کا انتظام کرنے۔ چھوٹی بیگم کوٹھے پر کھڑی یہ تیاریاں دیکھ رہی تھیں اور دل میں ہنس رہی تھیں۔ اس وقت کوئی خوجی کو دیکھتا، دماغ نہیں ملتے تھے۔ اس کو ڈانٹ، اس کو ڈپٹ، کسی پر دھول جمائی، کسی کے چانٹا لگایا، اس کو پکڑ لاؤ، اس کو مارو۔ کبھی مسالچی کو گالیاں دیں، کبھی پنشاخے والے پر بگڑ پڑے۔ آگے آگے نشان کا ہاتھی تھا۔ ہری ہری جھول پڑی ہوئی۔ مستک پرے سندور سے گل بوٹے بنے ہوئے۔ اس کے بعد ہندستانی باجا گگز جھمیم۔ اس کے پیچھے پھولوں کے تخت، چمیلی کھلا ہی چاہتی ہے، کلیاں چٹکنے ہی کو ہیں۔ چنڈوبازوں کے تخت نے تو کمال کردیا۔ دو چار پینک میں ہیں، دس پانچ اوندھے پڑے ہوئے۔ کوئی چنڈوباز ٹھاٹ سے پونڈا چھیل رہا ہے۔ ایک گنڈیری چوس رہا ہے۔ شکار کا وہ سماں باندھا کی واہ جی واہ۔ ایک شکاری بندوق چھتیائے، گھٹنا ٹیکے آنکھ دبائے نشانہ لگا رہا ہے۔ بس دائیں کی آواز آیا ہی چاہتی ہے۔ ہرن چوکڑیاں بھرتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد انگریزی باجا۔ اس کے بعد گھوڑوں کی قطار۔ کمیت، کچھ سرنگ، نگرہ، سبزہ، عربی، ترکی، ویلر چھم چھم کرتے جارہے ہیں۔ گھوڑے دلہن بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد پھر ارگن باجا، پھر تامدان، پالکی، نالکی، سکھ پال۔ اس کے بعد پریوں کے تخت ایک سے ایک بڑھ کر۔ سب کے پیچھے روشن چوکی والے تھے۔ روشنی کا انتظام بھی چوکس تھا۔ پنشاخے اور لالٹینیں جھک جھک کر رہی تھیں۔ اس ٹھاٹ سے جلوس نکلا سارا شہر یہ بارات دیکھنے کو پھٹا پڑتا تھا۔ لوگ چکر میں تھے کہ اچھی بارات ہے دلہے کا پتا ہی نہیں برات کیا گورکھ دھندہ ہے۔

جب جلوس بغیا میں پہنچا تو آزاد ہاتھی پر سوار ہوکر صف شکن کو کابک میں بٹھائے ہوئے چلے۔

خوجی : مثل مشہور ہے، 'سو برس کے بعد گھورے کے بھی دن بہورتے ہیں۔' ہمارے

دن آج بھورے کہ آپ آئے اور شاہ جی کو لائے۔ نواب کے یہاں سناٹا پڑا ہوا تھا۔ صف شکن کے غم میں سب پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ بس لوگ یہی کہتے تھے کہ آزاد سانڈنی لے کر لمبے ہوئے۔ ایک میں ہی تمھاری حمایت کیا کرتا تھا۔

میر صاحب : جی ہاں، ہم بھی آ.پ. ہی کی طرف سے لڑتے تھے، ہم اور یہ دونوں۔

آزاد : بھئی، کچھ نہ پوچھو، خدا جانے، کن کن جنگلوں کی خاک چھانی، تب کہیں یہ ملے۔

خوجی : یہاں لوگ گپ اڑا رہے تھے۔ کسی نے کہا بھانڈوں کے یہاں نوکری کر لی۔ کوئی طوفان باندھتا تھا کہ کسی بھٹیاری کے گھر پڑ گئے۔ مگر میں یہی کہے جاتا تھا کہ وہ شریف آدمی ہیں، اتنی بے حیائی کبھی نہ کریں گے۔

خوجی اور میر صاحب، دونوں آزاد کو ملانا چاہتے تھے۔ مگر وہ ایک ہی استاد۔ سمجھ گئے کہ اب نواب کے یہاں ہماری بھی طوطی بولے گی، تبھی یہ سب ہماری خوشامد کر رہے ہیں۔ بولے اجی رات جاتی ہے یا آتی ہے؟ اب دیر کیوں کر رہے ہو؟ پنشاخے چڑھاؤ، گھوڑے چلاؤ، جب جلوس تیار ہوا، تو آزاد ایک ہاتھی پر جا ڈٹے۔ بٹیر کی کابک کو آگے رکھ لیا۔ خوجی اور میر صاحب کو پیچھے بٹھایا اور جلوس چلا۔ چوک میں تو پہلے ہی سے ہلڑ تھا کہ نواب والا بٹیر بڑی شان سے آرہا ہے۔ لاکھوں آدمی چوک میں تماشا دیکھنے کو ڈٹے ہوئے تھے، چھتیں پھٹی پڑی تھیں، باجے کی آواز جو کانوں میں پڑی، تو تماشائی لوگ اڈ پڑے۔ نشان کا ہاتھی جھنڈے کا پھریرا اڑاتا سامنے آیا۔ لیکن جیوں ہی چوک میں پہنچا ویسے ہی دیوانی کے دو مذکوریوں نے ڈانٹ کر کہا ''ہاتھی روک لو، آزاد کے نام وارنٹ آیا ہے۔

لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ فیل بان نے جو دیکھا کہ سرکاری آدمی لال لال پگیا باندھے، کالی کالی وردی ڈاٹے، خاکی پتلون پہنے، چپراس لٹکائے ہاتھی روکے کھڑے ہیں، تو سٹپٹا گیا اور ہاتھی کو جدھر انھوں نے کہا ادھر ہی پھیر دیا۔ جلوس میں ہلڑ مچ گیا۔ کوئی تخت لیے بھاگا جاتا ہے کوئی جھنڈے لیے دبکا پھرتا ہے۔ گھوڑے تھان پر پہنچے۔ تامدان اور پالکیوں کو چھوڑ کر کہار اڈے پر ہو رہے۔ باجے والے گلیوں میں گھس گئے۔

آزاد اور خوجی مذکوریوں کے ساتھ چلے، تو شہر کے باہر جا پہنچے۔ یکا یک ہاتھی جو گرجا، تو خوجی اور میر صاحب پنک سے چونک پڑے۔

خوجی : ایں، پنشاخے چڑھاؤ، پنشاخے، ابے یہ کیا اندھیر مچا رکھا ہے۔ ذرا یوں ہی آنکھ جھپک گئی تو ساری کی کرائی محنت خاک میں ملا دی۔ اب میں اتر کر کوڑے پھٹکاروں گا، تب مانو گے۔ لاتوں کے آدمی کہیں باتوں سے مانتے ہیں۔

میر صاحب : ہیں ہیں! او فیل بان! یہ ہاتھی کیا آتش بازی سے بھڑ کتا ہے؟ بڑھا لے چلو، میل میل دھت دھت! ارے بھئی خوجی یہ کس میدان میں آ نکلے؟ آخر یہ ماجرا کیا ہے بھائی؟

خوجی : پنشاخے چڑھاؤ پنشاخے، اور ان باجے والوں کو کیا سانپ سونگھ گیا ہے؟ ذرا زور زور چھیڑے جاؤ۔ اب تو بہاگ کا وقت ہے بہاگ کا۔

میر صاحب : اجی آنکھیں تو کھولیے، روشنی کا چراغ گل ہوگیا۔ مصیبت میں آ پھنسے۔ آپ وہی بے وقت کی شہنائی بجا رہے ہیں۔ اس جنگلے میں آپ کو بہاگ کی دھن سمائی ہے۔

خوجی : پنشاخے چڑھاؤ، پنشاخے۔ نہیں میں کچا پیسہ تو دوں گا نہیں۔ جھپ سے چڑھانا تو پنشاخے۔ شاباش ہے بیٹا۔

میر صاحب تو جلے بھنے بیٹھے ہی تھے۔ خوجی نے جب کئی بار پنشاخے کی رٹ لگائی تو وہ جھلا اٹھے۔ خوجی کو ہاتھی پر سے نیچے دھکیل ہی تو دیا۔ ارا رارا دھم، کون گرا؟ ذرا۔ ٹوہ تو لینا کون گرا؟

آزاد : تم گرے، تم، آپ ہی تو لڑکتے ہیں ٹوہ کیا لیں؟

خوجی : ارے میں! یہ تو کہیے، ہڈی پسلی بچ گئی؟ یارو، ذرا دیکھنا تو، ہمارا سر بچا یا نہیں؟

مذکوری : بچا ہے بچا ناہی پھوٹ پَہر لیہن ستھنا، او چلے فارسی چھانٹے ای بوجھ اٹھاؤ

خوجی : ہائیں ہائیں، کوئی مزدورا سمجھا ہے شریف اور پاجی کو نہیں پہچانتا۔ لے، اب اتارتا ہے بوجھ، یا نالے میں پھینک دوں۔ او گیدی۔ لانا تو میری کرولی۔ کیا میں گدھا ہوں؟

میر صاحب : گدھے نہیں، تو اور ہو کون؟

مذکوری : تیں کو ہس رہے؟ ارے تیں کو ہس؟ اتر ہاتھی پر سے۔ اترت ہے کہ ہم آون پھر، تیں اس ملیہے۔

میر صاحب : کہتا کس سے ہے؟ کچھ بیدھا تو نہیں ہے؟ کچھ نادر ہیں ہم لو آئے۔

مذکوری : اچھا نو یہ بوجھ اٹھا۔ تھریا لوٹیا رکھ موڑے پر اور اگوا۔ میر صاحب نے نیچے اتر

کر دیکھا تو سرکاری پیادا وردی ڈاٹے کھڑا ہے۔ لگے تھر تھر کانپنے۔ چپکے سے بوجھ اٹھایا اور مچل مچل کر چلنے لگے۔ دونوں مذکوری ہاتھی پر جا بیٹھے۔ خوجی اور میر صاحب، دونوں لدے پھندے گرتے پڑتے جانے لگے۔

خوجی : واہ ری قسمت، کیوں جی میر صاحب، ہم تو خدا کی یاد میں تھے تم کو کیا ہوا تھا؟

میر صاحب : جہاں آپ تھے وہیں میں بھی تھا۔ یہ ساری شرارت آزاد کی ہے۔

آزاد : ذری چونچ سنبھالے ہوئے، نہیں میں اترتا ہوں۔

چلتے چلتے تڑکا ہوگیا۔ خوجی بولے۔ لو بھائی، ہمارا تو بھور ہو ہی گیا۔ اب جو بوجھ اٹھا کر لے چلے اس کی ستر پشت پر لعنت۔ یہ کہہ کر بوجھ پھینک دیا۔ جب ذرا دن چڑھا تو گومتی کے کنارے پہنچے۔ ایک مذکوری نے کہا او فیل بان ہاتھی روک دے نہائے لیں۔

فیل بان : ارے تو نہا لینا کیسے گنوردل ہو؟

آزاد : کہو خوجی نہاؤ گے؟

خوجی : یوں ہی نہ گلا گھونٹ ڈالو۔

ندی کے پار پہنچے تو چنڈوباز کی صورت نظر پڑی۔

چنڈوباز : بڑے بھائی، سلام! کہو خیر صلاح؟ آنکھیں تم کو ڈھونڈتی تھیں دیکھنے کو ترس گئیں۔ اب کہو کیا ارادے ہیں؟ اللہ رکھی نے یہ خط دیا ہے، پڑھ کر چپکے سے جواب لکھ دو۔

آزاد نے خط کھولا اور پڑھا۔

'کیوں جی اسی منھ سے کہتے تھے کہ تم سے بیاہ کروں گا؟ تم تو چکمہ دے کر سدھارے اور یہاں دل کراہا کرتا ہے۔ نہا دھوکر قرآن شریف پر ہاتھ دھرو کہ بیاہ کا وعدہ نہیں کیا تھا؟ کیوں ناحق انصاف کا گلا کند چھری سے ریتتے ہو؟ اس خط کا جواب لکھنا، نہیں میں اپنی جان دے دوں گی۔'

آزاد نے جواب لکھا۔

'سنو بی بی، ہم کوئی اٹھائی گیرے نہیں ہیں۔ ہم ٹھہرے شریف، تم ہو بھٹیاری، بھلا پھر ہم سے کیوں کر بنے۔ اب اس خیال کو دل سے نکال دو۔ تمھارے کارن مذکوزیوں کی قید میں ہوں۔ تمھیں منھ نہ لگاتا تو اتنا ذلیل کیوں ہوتا؟

چنڈوباز تو خط لے کر روانہ ہوئے، ادھر کا قصہ سنیے۔ نواب جھوم جھوم کر بغیچے میں ٹہل

رہے تھے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے تھے کہ جلوس اب آیا اور اب آیا۔ یکا یک چوب دار نے آ کر کہا خداوند، لٹ گئے! لٹ گئے! وہ دیکھو صاحب تمھارے لٹ گئے۔

نواب : ارے کچھ منھ سے کہوگے بھی کیا غضب ہوگیا؟

چوب دار : خداوند برات کو اٹھائی گیروں نے لوٹ لیا۔

نواب : برات؟ برات کس کی؟ کہیں شاہ جی کی سواری سے تو مطلب نہیں ہے؟ اف ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

چوب دار : وہ دیکھو صاحب تمھارے، برات چلی آ رہی تھی۔ تماشائی اتنے جمع تھے کہ چھتیں پھٹی پڑتی تھیں۔ دیکھو صاحب تمھارے، جیسے بادشاہ کی سواری ہو۔ مدعا جیسے ہی چوک میں پہنچے تو دیکھو صاحب تمھارے، دو چپراسیوں نے ہاتھی کو پھیر دیا۔ بس صاحب تمھارے، ساری برات تتر بتر ہوگئی۔ کہاں تو باجے بج رہے تھے، کہاں صاحب تمھارے، سناٹا چھا گیا۔

نواب : بھلا شاہ جی کہاں ہیں؟

چوب دار : حضور شاہ جی کو لیے پھرتے ہیں۔ یہاں دیکھو صاحب تمھارے۔

نواب : کوئی ہے۔

ادھر آنا، اس کے کلّے پر کھڑے ہو، جتنی بار اس کے منھ سے 'وہ دیکھو صاحب تمھارے' نکلے اتنے جوتے اس پر پڑیں۔ گدھا ایک بات کہتا ہے تو تین سو ساٹھ دفعہ 'او دیکھو صاحب تمھارے'

چابک سوار : حضور اس وقت غصے کا موقع نہیں، کوئی ایسی فکر کیجیے کہ شاہ جی تو چھوٹ آئیں۔

نواب : ایں کیا وہ بھی گرفتار ہوگئے؟

سوار : جی آزاد خوجی، ہاتھی، سب کے سب پکڑ لیے گئے؟

نواب : تو یہ کہیے بیڑے کا بیڑا گیا ہے۔ ہمیں یہ کیا معلوم تھا بھلا، نہیں تو ایک گارڈ ساتھ کر دیتے۔ آخر کچھ معلوم بھی ہوا کہ یہ دھر پکڑ کیسی تھی؟ سچ تو یوں ہے کہ اس وقت میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ روپے ہم سے لو اور دوڑ دھوپ تم لوگ کرو۔

مصاحبوں کی بن آئی۔ اب کیا پوچھنا ہے۔ آپس میں ہنڈیا پکنے لگی۔ واللہ، ایسا موقع پھر تو ہاتھ آئے گا نہیں۔ جو کچھ لینا ہو لے لو، اور عمر بھر چین کرو۔ اس وقت یہ بوکھلایا ہوا

ہے۔ جو کچھ کہوگے بے دھڑک دے نکلے گا۔ لیکن ایک کام کرو۔ دس پانچ آدمی مل جل کر باتیں بناؤ۔ ایک آدمی کے کیے کچھ نہ ہوگا۔ کہیں بھڑک گیا تو غضب ہو جائے گا۔ خدا کرے روز اسی طرح وارنٹ جاری رہے۔ مگر اتنا یاد رکھیے گا کہ کہیں اندر خبر ہوئی تو بیگم صاحبہ چھچھوندر کی طرح ناچیں گی۔ پھر کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑے گا۔

مبارک قدم دروازے کے پاس کھڑی سب سن رہی تھی۔ لپک کر گئی اور چھوٹی بیگم کو بلا لائی۔ ذرا جلدی جلدی قدم اٹھائیے، یہ سب جانے کیا واہی تباہی بک رہے ہیں۔ منھ جھلس دے پکڑ کے۔ بیگم صاحبہ دبے پاؤں گئیں تو سن کر مارے غصے کے لال ہو گئیں اور نواب کو اندر بلایا۔

مبارک قدم : اے حضور کے مصاحب، اللہ جانتا ہے ایک ہی اڑی مار ہیں، جن کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ جو ہے وہ جھوٹوں کا سردار۔ مگر حضور ان کو کیا جانے کیا سمجھتے ہیں۔ پچھوا ہوا چلتی، تو ٹھنڈا پانی پیتے، اب دن بھر شورے کا جھلا پانی ملتا ہے پینے کو، اور خدا نے نعمت کھانے کو دی۔ پھر انھیں دور کی نہ سوجھے تو کسے سوجھے۔

بیگم : ایسے ہی جھوٹے خوشامدیوں نے تو لکھنؤ کا ستیاناش کر دیا۔

نواب : یہ آج کیا ہے کیا؟

بیگم : ہے کیا؟ تمھارے مصاحب منھ پر تو تمھاری جھوٹی تعریف کرتے ہیں اور پیٹھ پیچھے تمھیں گالیاں سناتے ہیں۔ ان سب کو دتکار کیوں نہیں دیتے؟

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر مذکوریوں نے آزاد کو ایک باغ میں اتارا۔

خوجی : میاں فیل بان، ذرا زینہ لگا دینا۔

فیل بان : اب آپ کے لیے زینہ بنواؤں، ایسے تو خوبصورت بھی نہیں ہیں آپ؟

میر صاحب : زینہ کیا ڈھونڈتے ہو، ہاتھی پر سے کودنا کون سی بڑی بات، ہے۔

یہ کہہ کر میر صاحب بہت ہی اکڑ کر دم کی طرف سے کودے، تو سر نیچے اور پاؤں اوپر۔ رَوک روک ہت تیرے فیل بان کی۔ سچ ہے گاڑی وان، شتربان، کوچ بان جتنے وان ہیں سب شریر ہیں۔ لاکھ بچے، مگر اوندھے ہو گئے۔ ہمارا کلا ہی جانتا ہے۔ کھٹ سے بولا۔ وہ تو کہیے میں ہی ایسا بے حیا ہوں کہ باتیں کرتا ہوں، دوسرا تو پانی نہ مانگتا۔

خوجی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اب کہیے، ہم نے جو زینہ مانگا تو ہمیں بنانے لگے۔

میر صاحب : میاں اترتے ہو کہ دوں دھکا۔

خوجی بیچارے جان پر کھیل کر جیسے ہی اترنے کو تھے کہ ہاتھی اٹھ کھڑا ہوا۔ یا علی، یا علی، بچائیے، خدا میں بڑا گنہگار ہوں۔

اتنا کہہ چکے تھے کہ اررر دھم، زمین پر آکر ڈھیر ہو گئے۔

میر صاحب نے کہا شاباش میرے پٹھے، لے چھپاکے سے اٹھ تو جا۔

خوجی : یہاں ہڈی پسلی کا پتا نہیں، آپ فرماتے ہیں اٹھ تو جا۔ کتنے بے درد ہو۔

دو آدمی وہیں بیٹھے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ خوجی اور میر صاحب تو لکڑیاں کھوجنے لگے کہ اور نہیں تو صلفا ہی اڑے اور آزاد ان دونوں اجنبیوں کی باتیں سننے لگے۔

ایک : بھئی، آخر منھ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟ کیا محرم کے دنوں میں پیدا ہوئے تھے؟

دوسرا : ہاں یار، کیوں نہ کہوگے۔ یہاں جان پر بنی ہے آپ محرم لیے پھرتے ہیں۔ ہم نے بی اللہ رکھی سے کئی روپے مہینے بھر کے وعدے پر لیے تھے۔ اس کو دو سال ہونے آئے۔ اب وہ کہتی ہے یا تو ہمارے روپے دو یا ہمارے مقدمے میں گواہ ہو جاؤ۔ نہیں تو ہم داغ دیں گے اور بڑا گھر دکھائیں گے۔ وہاں چکی پیسنی ہوگی۔ سوچتے ہیں گواہی دیں تو کس برتے پر۔ میاں آزاد کی تو صورت ہی نہیں دیکھی۔ اور نہ دیں تو وہ نالش جڑ دیتی ہیں۔ بس، یہی ٹھان لی ہے کہ آج شام کو جھپ سے چل کھڑے ہوں، ریل کو خدا سلامت رکھے کہ بھاگوں تو پتہ بھی نہ ملے۔

دوسرا : ارے میاں، وہ ترکیب بتاؤں جس میں 'سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے' تم میاں آزاد سے مل جاؤ، ادھر اللہ رکھی سے بھی ملے رہو۔ گواہی میں گول مول باتیں کہو اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے عدالت سے آؤ۔ بچہ تم ہو کس بھروسے پر۔ چار چار گنڈے میں تم کو گواہ ملتے ہیں، جو تڑ سے جھوٹا قرآن یا جھوٹی گنگا اٹھا لیں۔ ہم کو کوئی دو ہی روپے دے، قرآن اٹھوا لے۔ جو چاہے کروا لے۔ پھر واہی۔ ہو خاصے، دس ملتے ہیں دس، تمھیں جھوٹ سچ سے مطلب؟ سچ وہی ہے جس میں کچھ ہاتھ لگے، بھائی یہ تو کل جگ ہے۔ اس میں سچ بولنا حرام ہے۔ اور جو کتے نے کاٹا ہو تو سچ ہی بولیے۔

پہلا : حضرت سنیے، سچ پھر سچ ہے، اور جھوٹ پھر جھوٹ، اتنا یاد رکھیے گا۔

دوسرا : ابے جا، لایا وہاں سے جھوٹ پھر جھوٹ ہے۔ ارے نادان، اس زمانے میں

جھوٹ ہی سچ ہے۔ ایک ذرا سا جھوٹ بولنے میں دس چہرے شاہی آئے گئے ہوتے ہیں۔ ذرا زبان ہلا دی اور دس روپے ہضم۔ دس روپے کچھ تھوڑے نہیں ہوتے۔ ہمیں کسی سے تم دو گنڈے ہی دلوا دو۔ دیکھو، حلف اٹھا لیتے ہیں یا نہیں۔

آزاد : کیوں بھئی، اور جو اپنی بات سے پھر جائے تو پھر کیسی ہو؟ عورت کی بات کا اعتبار کیا؟ بہتر ہے کہ اللہ رکھی سے اسٹامپ کے کاغذ پر لکھوا لو۔

پہلا : واللہ، کیا سوجھی ہے۔

دوسرا : کیسا اسٹامپ جی! ہم کیا جانے کیا چیز ہے۔ باتیں کر رہے ہیں آپ۔ آئے وہاں سے اسٹامپ پر لکھوا لو۔ ہم کیا کوئی چور ہیں؟

دونوں مذکوریوں نے اپلے جلائے اور کھانا بنانے لگے۔ آزاد نے دیکھا بھاگنے کا اچھا موقع ہے۔ دونوں کی آنکھ بچا کر چل دیے، چٹ سے اسٹیشن پر جا کر ٹکٹ لے لیا اور ایک درجے میں جا بیٹھے۔ دو تین اسٹیشنوں کے بعد ریل ایک بڑے اسٹیشن پر ٹھہری۔ میاں آزاد نے اسباب کو بگھی پر لادا اور چل کھڑے ہوئے۔ کھٹ سے سرائے میں داخل۔ ایک کوٹھری میں جا ڈٹے اور بچھونا بچھا، خوب لہرا لہرا کر گانے لگے۔

وحشت عیاں ہے خاک سے مجھ خاکسار کی
بھڑکے ہرن بھی سونگھ کے مٹی مزار کی

یکا یک ایک شاہ صاحب فالسئی تہبند ھ باندھے، شربتی کا کیسریا کرتا پہنے، مانگ نکالے، آنکھوں میں سرمہ لگائے، ایک جوان، چنچل، حسین عورت کے ساتھ آکر آزاد کی چارپائی پر ڈٹ گئے اور بولے بابا، ہمارا نام قدمی شاہ ہے۔ حسینوں پر جان دینا ہمارا خاص کام ہے۔ اس وقت آپ نے جو یہ شعر پڑھا تو طبیعت پھڑک گئی۔ مگر بنا شراب کے گانے کا لطف کہاں؟ شوق ہو تو نکالوں پیالا اور بوتل، خوب رنگ جمے اور سرور گٹھے۔

آزاد : میں تو توبہ کر چکا ہوں۔

شاہ جی : بچہ توبہ کیسی؟ یاد رکھ، توبہ توڑنے کے لیے اور قسم کھانے کے لیے ہیں۔

یہ کہہ کر شاہ جی نے جھولی سے سونف کی ولایتی میٹھی شراب نکالی اور بولے :

سبز بوتل میں لال لال شراب
خیر ایمان کا خدا حافظ

شاہ جی میکدے میں بیٹھے ہیں
اس مسلمان کا خدا حافظ

یہ کہہ کر اس جوان عورت کی طرف دیکھ کر شراب کو پیالے میں انڈیلنے کا اشارہ کیا۔ نازنین ایک ادا سے آکر آزاد کی چارپائی پر ڈٹ گئی اور شراب کا پیالہ بھرنے لگی۔ بھٹیاری نے جو یہ حال دیکھا تو بجلی کی طرح چمکتی ہوئی آئی اور کڑک کر بولی۔ اے واہ میاں اٹھارہ اٹھارہ سنڈوں کو لے کر کھٹیا پر بیٹھتے ہو، اور جو پاٹی کھٹ سے ٹوٹ جائے تو کس کے ماتھے؟ ایسے مسافر بھی نہیں دیکھے۔ ایک تو خود ہی دبلے پتلے ہیں دوسرے دس دس کو لے کر بیٹھتے ہیں۔ لے چارپائی خالی کیجیے، ہم ایسے کرائے سے باز آئے۔ آزاد کی تو بھٹیاریوں کے نام سے روح کانپتی تھی، چپکے سے چارپائی خالی کر دی اور زمین پر دری بچھا کر آ بیٹھے۔ نازنین نے پیالہ آزاد کی طرف بڑھایا۔ پہلے تو بہت نہیں نہیں کرتے رہے لیکن جب اس نے قسمیں کھلا دیں تو مجبور ہوکر پیالہ لیا اور چڑھا گئے۔ دور چلنے لگا۔ وہ بھر بھر کے جام پلاتی جاتی تھی اور آزاد کے جسم میں نئی جان آتی جاتی تھی۔ اب تو وہ مزے میں آکر کھل کھیلے اور خوب پی۔ 'مفت کی شراب قاضی کو بھی حلال ہے' یہاں تک کہ آنکھیں جھپکنے لگیں زبان لڑکھڑانے لگی۔ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے اور آخر نشے میں چور ہوکر دھڑ سے گرے۔ شاہ جی تو اس گھات میں آئے ہی تھے جھپاک سے کپڑے باندھے، جمع جتھا لی اور چلتا دھندا کیا۔ عورت بھی ان کے ساتھ ساتھ لمبی ہوئی۔ میاں آزاد رات بھر بے ہوش پڑے رہے۔ تڑکے آنکھیں کھولی تو حال پتلا۔ نہ وہ شاہ صاحب ہیں نہ وہ عورت نہ دری۔ زمین پر پڑے لوٹ رہے ہیں۔ پیاس کے مارے گلے میں کانٹے پڑے جاتے ہیں۔ اٹھے تو لڑکھڑا کر گر پڑے، پھر اٹھے پھر منہ کے بل گرے۔ بارے بڑھی مشکل سے کھڑے ہوئے، پانی لا کر منہ ہاتھ دھوئے اور خوب پیٹ بھر کر پانی پیا، تو دل کو تسکین ہوئی، یکا یک چارپائی پر نگاہ پڑی۔ دیکھا سرہانے ایک خط رکھا ہوا ہے کھول کر پڑھا۔

'کیوں بچہ! اور پیو! اب پیو گے تو جیو گے بھی نہیں، کتنے بڑے پیکو ہو۔ بوتل کی بوتل منہ سے لگا لی۔ اب اپنی قسمت کو روؤ۔ دھت تیرے کی۔ کیا مزے سے معشوق کے پاس بیٹھے ہوئے غٹ غٹ اڑا رہے تھے۔ کھڑی گھوم گئی نا۔ بھئی ہماری خاطر سے ایک جام تو لو، کہو تو اُنی کے ہاتھ بھیجوں، لے اب ہم جتائے دیتے ہیں، خبردار مسافر کا اعتبار نہ کرنا، اور

سفر میں تو کسی پر بھروسہ رکھنا ہی نہیں۔ دیکھو آخر ہم لے دے کر چل دیے۔ عمر بھر سفر کیا مگر آدمی نہ بنے۔

یہ خط پڑھ کر میاں آزاد پر سیکڑوں گھڑے پڑ گئے۔ بہت کچھ غل غپاڑا مچایا، سرائے بھر کو سر پر اٹھایا، بھٹیارے کو دو چار چپتیں لگائیں، مگر مال نہ ملا نہ ملا۔ لوگوں نے صلاح دی کہ جاؤ تھانے پر رپٹ لکھاؤ۔ گرتے پڑتے تھانے میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں تھانے دار صاحب بیٹھے ہانک رہے ہیں۔ میں نے فلاں گاؤں میں اٹھارہ ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا اور چونتیس برس کی چوری برآمد کی۔ سپاہی ہاں میں ہاں ملاتے اور بھرّے دیتے جاتے تھے کہ آپ ایسے اور آپ ویسے، اور آپ ڈبل پیسے۔ اتنے میں آزاد پہنچے سلام بندگی ہوئی۔

تھانے دار : کہیے مزاج کیسے ہیں؟

آزاد : مزاج پھر پوچھ لینا، اب گٹھری دلواؤ استاد جی

تھانے دار : استاد جی کس بھکوے کا نام ہے اور گٹھری کیسی؟ آپ بھنگ تو نہیں پی گئے ہیں؟

آزاد : ذرا زبان سنبھال کر باتیں کیجیے گا۔ میں ٹیڑھا آدمی ہوں۔

تھانے دار : اچھے اچھوں کو تو ہم نے سیدھا بنایا، آپ ہیں کس کھیت کی مولی؟ کوئی ہے؟ وہ حلیہ تو ملاؤ ہم تو انھیں دیکھتے ہی پہچان گئے۔

گیان سنگھ نے حلیہ جو ملایا تو بال کا بھی فرق نہیں۔ پکڑ لیے گئے حوالات میں ہو گئے۔ مگر ایک ہی چھٹے ہوئے آدمی تھے۔ کانسٹبل کو وہ بھرے دیے باتوں باتوں میں دوستی پیدا کر لی کہ وہ بھی ان کا دم بھرنے لگا۔ اب اسے فکر ہوئی کہ ان کو حوالات سے ٹہلا دے۔ آخر رات کو پہرے دار کی آنکھ بچا کر حوالات کا دروازہ کھول دیا۔ آزاد چپکے سے کھسک گئے۔ دائیں بائیں دیکھتے دبے پاؤں جانے لگے۔ ذرا آہٹ ہوئی، اور ان کے کان کھڑے ہوئے۔ بارے خدا خدا کر کے راستہ کٹا۔ سرائے میں پہنچے اور بھٹیاری کو کرایہ دے کر اسٹیشن پر جا پہنچے۔

(21)

میاں آزاد ریل پر بیٹھ کر ناول پڑھ رہے تھے کہ ایک صاحب نے پوچھا۔ جناب دو ایک دم لگائیے تو پیچ وان حاضر ہے۔ واللہ وہ دھواں دھار پلاؤں کہ دل پکڑ اٹھے۔ مگر یاد رکھیے دو

دم سے زیادہ کی سند نہیں۔ ایسا نہ ہو آپ بھینسیا جونک ہو جائیں۔

آزاد نے پیچھے پھر کر دیکھا تو ایک بگڑے دل مزے سے بیٹھ کر حقہ پی رہے ہیں۔ بولے، یہ کیا اندھیر ہے بھائی، آپ ریل ہی پر گڑگڑانے لگے، اور حقہ بھی نہیں پیچوان جو کہیں آگ لگ جائے تو؟

بگڑے دل : اور جو ریل ہی ٹکرا جائے تو؟ آسمان ہی پھٹ پڑے تو؟ اس 'تو' کا تو جواب ہی نہیں ہے۔ لے پیجئے گا یا باتیں بنائیے گا؟

آزاد : جی، مجھے اس کا شوق نہیں ہے۔

یہ کہہ کر پھر ناول پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اسٹیشن پر ریل ٹھہری تو خربوزے اور آم پٹے ہوئے تھے۔ خنچیاں کی خنچیاں بھری رکھی تھیں۔ بولے کیوں بھئی اسٹیشن ہے یا آم کی دوکان؟ یا خربوزے کی کھان؟ آم پور ہے یا خربوزہ نگر؟

ایک مسافر بولا : اجی حضرت نظر نہ لگائیے اب کی فصل تو کھا لینے دیجیے۔ اسی پر تو زندگی کا دارو مدار ہے۔ کھیت میں بیل بڑھی اور یہاں کچے گھڑے کی چڑھی۔ آج بازار میں آئے اور ایں جانب بورائے۔ آم اور خربوزے پر ادھار پر بیٹھے ہیں۔ کپڑے بیچ کھائیں، برتن نخاس میں پٹیل لائیں، بدن پر لتا نہ رہے، چولہے پر توا نہ رہے، ادھار لیں، ستھنا تک گروی رکھیں، بگڑا کریں، جھگڑا کریں، مگر خربوزے پر چھری ضرور چلے۔ تڑکا ہوا، چاقو ہاتھ میں لیا اور خربوزے کی ٹوہ میں چلا۔ بازار ہے کہ مہک رہا ہے، خریدار ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ رسیلی کھٹکن جوانی کی امنگ میں اچھے اچھوں کو ڈانٹ بتاتی ہیں۔ میاں الگ رہو، خنچی پر نہ گرنے پڑو، بس دور ہی سے بھاؤ تاؤ کرو۔ لینا ایک نہ دینا دو، مفت کا جھنجھٹ۔ ایں جانب نے ایک تراشا دوسرا تراشا تیسرا تراشا خوب چکھے۔ آدمی کیا بندر ہو گئے۔ ادھر خربوزے گئے اور آم کی فصل آئی منہ مانگی مراد پائی۔ جدھر دیکھیے، ڈھیر کے ڈھیر چنے ہیں۔ یہاں سنک سوار ہو گئی۔ دیکھا اور جھپ سے اٹھایا تراشا اور کھایا۔ مال اسباب کے کوڑے کیے اور بے گنتی لیے۔ کھانے بیٹھے، تو دو داڑھی کھا گئے، چار داڑھی کھا گئے۔

آزاد : یہ داڑھی کھانے کے کیا معنی؟

مسافر : اجی حضرت، آم اتنے کھائے کی گٹھلی اور چھلکے داڑھی تک پہنچے۔

مسافر وہ ڈینگ ہانک ہی رہے تھے کہ ریل ٹھہری اور ایک چپراسی نے آکر پوچھا۔

فلاں آدمی کہاں ہے؟

آزاد : اس کمرے میں اس نام کا کوئی آدمی نہیں ہے؟

مسافر نے چپراسی کی صورت دیکھی، تو چادر سے منہ لپیٹ کر کھڑکی کی دوسری طرف جھانکنے لگے۔ چپراسی دوسرے درجے میں چلا گیا۔

آزاد : استاد، تم نے منہ جو چھپایا تو مجھے شک ہوتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، بھئی اور کسی سے نہ کہو یاروں سے تو نہ چھپاؤ۔

مسافر : منہ کیوں چھپاؤں جناب، کیا کسی کا قرض کھایا ہے یا مال مارا ہے یا کہیں خون کرکے آئے ہیں؟

آزاد : آپ بہت تیکھے ہوجائیے گا تو دھروا ہی دوں گا۔ لے بس، کچا چٹھا کہہ سناؤ ورنہ میں پکارتا ہوں پھر۔

مسافر : ارے نہیں نہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ صاف صاف بتا دیں؟ ہم نے اب کی فصل میں خربوزے اور آم خوب چھک کر چکھے، مگر ٹکا قسم کو پاس نہیں۔ پوچھو لائیں کس کے گھر سے؟ یہاں پہلے تو قرض لیا پھر ایک دوست کا مکان اپنے نام سے پٹیل ڈالا۔ اب نالش ہوئی ہے سو ہم بھاگے جاتے ہیں۔

آزاد : ایسے آم کھانے پر لعنت، کیسے نادان ہو؟

مسافر : دیکھیے نادان وادان نہ بنایئے گا، ورنہ بری ٹھہرے گی۔

آزاد : اچھا بلاؤں چپراسی کو؟

مسافر : دس گالیاں دے لیجیے مگر جان تو چھوڑ دیجیے۔

اتنے میں ایک مسافر نے کئی درجے پھاندے، یہ اچکا، یہ آیا، یہ جھپٹا اور دھم سے میاں آزاد کے پاس ہو رہا۔

مسافر : غریب پرور

آزاد : کس سے کہتے ہو؟ ہم غریب پرور نہیں امیر پرور ہیں۔ غریب پرور ہمارے دشمن ہوں۔

مسافر : اچھا صاحب آپ امیر کے باپ پرور دادا پرور سہی ہمارا آپ سے ایک سوال ہے۔

آزاد : سوال اسکول کے لڑکوں سے کیجیے، یا وکالت کے امیدواروں سے۔

مسافر : داتا، ذرا سنو تو۔

آزاد : داتا بھنڈاری کو کہتے ہیں، داتا کہیں اور رہتے ہوں گے۔

مسافر : ایک روپیہ دلواؤ تو ہزار دعائیں دوں۔

آزاد : دعا کے تو ہم قائل ہی نہیں۔

مسافر : تو پھر گالیاں سناؤں؟

آزاد : گالیاں دو، تو بتیسی پیٹ میں ہو۔

مسافر : ارے غضب، لو اسٹیشن قریب آ گیا۔ اب بے عزت ہوں گے۔

آزاد : یہ کیوں؟

مسافر : کیوں کیا ٹکٹ پاس نہیں، گھر سے دو روپے لے کر چلے تھے راستے میں لنگڑے آم دکھائی دیے۔ رال ٹپک پڑی آؤ۔ دیکھا نہ تاؤ دو روپے ٹینٹ سے نکالے اور آم پر چھری تیز کی۔ اب گرہ میں کوڑی نہیں۔ پاس نہ لتا، پان کھائیں البتہ۔

آزاد : واہ رے پیٹو! بھلا یہاں تک آئے کیوں کر؟

مسافر : اس کی نہ پوچھیے، یہاں سیکڑوں ہی السیٹے یاد ہیں۔

اتنے میں ریل اسٹیشن پر آ پہنچی۔ ٹکٹ بابو کی کالی کالی ٹوپی اور سفید چمکتی ہوئی کھوپڑی نظر آئی۔ ٹکٹ ٹکٹ ٹکٹ نکالو! میاں آزاد تو ٹکٹ دے کر لمبے ہوئے، بابو نے ان سے ٹکٹ مانگا تو لگے بغلیں جھانکنے، ویل تمھارا ٹکٹ کہاں؟

مسافر : بابو جی ہم پر تو اب کی سال ٹکس وکس نہیں بندھا۔

بابو : یوفول! تم بے ٹکٹ کے چلتا ہے الو۔

مسافر : کیا آدمی بھی الو ہوتے ہیں؟ ادھر تو دیکھنے میں نہیں آیا، شاید آپ کے بنگال میں ہوتا ہو۔

ٹکٹ بابو نے کانسٹبل کو بلا کر ان کو حوالات بھجوایا۔ آم کھانے کا مزہ ملا، مار اور گالیاں کھائیں سو گھاتے میں۔

گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہے۔ کالا متوالا بادل جھوم جھوم کر پورب کی طرف سے آیا ہے۔ وہ گھنیری گھٹا کی ہاتھ مارا نہ سوجھے۔ اندھیرے نے کچھ ایسی ہوا باندھی کہ چاند کا چراغ گل

ہوگیا۔ یہ رات ہے یا سیاہ کاریوں کا دل؟ ہر ایک آدمی جریب ٹیکتا چل رہا ہے، مگر کلیجہ دہل رہا ہے کہ کہیں ٹھوکر نہ کھائیں، کہیں منھ کے بل زمین پر نہ لڑھک جائیں۔ میاں آزاد اسٹیشن سے چلے تو سرائے کا پتہ پوچھنے لگے۔ یکایک کسی آدمی سے سر ٹکرا گیا۔ وہ بولا اندھا ہوا ہے کیا؟ راستہ بچاکے چل، پتنگ رکھے ہوئے ہیں کہیں پھٹ نہ جائیں۔

آزاد : ایں راستے میں پتنگ کیسے؟ اچھی بے پر کی اڑائی۔

پتنگ باز : بھئی واللہ، کیا کیا بگڑے دلوں سے پالا پڑ جاتا ہے۔ ہم تو نرمی سے کہتے ہیں کہ میاں ذرا دبا کر جاؤ اور آپ تیکھے ہوئے جاتے ہیں۔

آزاد : ارے نادان یہاں ہاتھ مارا سوجھتا ہی نہیں، پتنگ کس بھکوے کو سوجھیں گے۔

پتنگ باز : کیا رتوندھی آتی ہے؟

آزاد : کیا پتنگ بیچنے جا رہے ہو؟

پتنگ باز : اجی پتنگ بیچیں ہمارے دشمن، ہم خود گھر کے امیر ہیں یہاں سے چار کوس پر ایک قصبہ ہے وہاں کے رئیس ہمارے لنگوٹیے یار ہیں۔ ان سے ہم نے پتنگوں کا میدان بدا تھا۔ ہم اپنے یاروں کے ساتھ ایک بارہ دری کے کوٹھے پر تھے اور وہ اپنے دیوان خانے کی چھت پر۔ کوئی سات بجے سے ادھر بھی کنکوے چھکیے ادھر بھی بڑھے۔ خوب لمڈورے پڑے۔ پانچ روپے فی پیچ بدا تھا۔ یار ایک پتنگ خوب لڑا۔ ہمارا مانگ دار بڑھا تھا اور ادھر کا گول دوپنا ۔ دس بارہ منٹ داؤں گھات کے بعد پیچ پڑ گئے۔ پہلے تو ہمارے کلنے نتھ گئے، ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔، سمجھے اب کٹے اور کب کٹے۔ مگر واہ رے استاد ایسے کنے چھڑائے کہ واہ جی واہ! پھر پیچ لڑ گئے۔ پنسیریوں نے ڈور پلا دی، کنکوا آسمان سے جا لگا۔ جو کوئی دم اور ٹھہرتا تو وہیں جل بھن کر خاک ہو جاتا۔ اتنے میں ہم نے غوتا دے کر ایک بھبکا جو دیا تو وہ کاٹا۔ اب کوئی کہتا ہے کہ ہتھے پر سے اکھڑ گیا۔ کوئی کہتا ہے کہ ہتھّے پر سے اکھڑ گیا، ڈور الجھ گئی تھی کہ ایک کنکوے سے ہم نے کوئی نو دس کاٹے۔ مگر ان کی طرف کوئی استاد آ گیا۔ اس نے کھینچ کے وہ ہاتھ دکھائے کہ خدا کی پناہ۔ ہاتھ ہی ٹوٹیں مردود کے۔ چھکے چھڑا دیے۔ کبھی سڑسڑ کرتا ہوا نیچے سے کھینچ گیا۔ کبھی اوپر سے پتنگ پر چھاپ بیٹھا۔ آخر میں نے حساب جو لگایا تو پچاس روپے کے پیٹے میں آ گیا۔ مگر یہاں ٹکا پاس نہیں ہم نے بھی ایک مال تک لیا ہے، گھر کے سونے کے کڑے کسی کے ہاتھ پٹیلیں گے۔ کوئی دس تولے کے ہوں گے. چپکے سے

اڑا دوں گا، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی۔

آزاد : آپ کے والد کیا پیشہ کرتے ہیں؟

پتنگ باز : زمین دار ہیں۔ مگر مجھے زمین داری سے نفرت ہے۔ زمین کی صورت سے نفرت ہے، اس پیشے کے نام سے نفرت ہے۔ شریف آدمی اور لٹھ لیے ہوئے میڈھ میڈھ گھوم رہے ہیں۔ ہم سے یہ نہ ہوگا۔ ہم کوئی مزدور تو ہیں نہیں۔ یہ گنواروں ہی کو مبارک رہے۔

آزاد : حضور نے تعلیم کہاں تک پائی ہے؟ آپ تو لندن کے عجائب خانے میں رکھنے لائق ہیں۔

پتنگ باز : یہیں کے تھسیلی اسکول میں کچھ دن گھاس چھیلی ہے۔

آزاد : کیا گھسیارا بننے کا شوق چرایا تھا؟

پتنگ باز : جناب، کوئی چھ سات برس پڑھے مگر گنڈے دار پڑھائی، ایک دن حاضر تو دس دن ناغہ۔ پہلے درجے کا امتحان دیا مگر لڑھک گئے۔ ابّا جان نے کہا کہ اب ہم تمھیں نہیں پڑھائیں گے۔ خیر، اس جھنجھٹ سے چھٹی پائی، تو پیش کار صاحب کے لڑکے سے دوستی بڑھائی۔ تب تک ہم نرے جنگلی ہی تھے۔ حد یہ کہ حقہ پینا تک نہیں جانتے تھے۔ تو وجہ کیا؟ اچھی صحبت میں کبھی بیٹھے ہی نہیں تھے۔ چھوٹے مرزا بیچارے نے ہمیں حقہ پینا سکھایا۔ پھر تو ان کے ساتھ چنڈو کے چھینٹیں اڑنے لگے۔ پہلے آپ مجھے دیکھتے تو کہتے قبر میں ایک پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ بدن میں گوشت کا نام نہیں، ہڈی ہڈی گن لیجیے۔ جب سے چھوٹے مرزا کی صحبت میں تاڑی پینے لگا تب سے ذرا ہرا ہوں۔ پہلے ہم نرے گاودی ہی تھے۔ یہ پتنگ لڑانا تو اب آیا ہے۔ مگر اب کی پچاس کے پیٹے میں آگئے۔ چھوٹے مرزا سے ہم نے تدبیر پوچھی تو واللہ تڑ سے بتلایا کہ جب بہن یا بھاوج یا بی بی کی آنکھ چوکے تو کوئی سونے کی عدد صاف اڑا دو۔ بھئی ضلع اسکول میں پڑھتا تو ایسی اچھی صحبت نہ ملتی۔

آزاد : واللہ آپ تو خراد پر چڑھ گئے 'سب گن پورے' تمھیں کون کہے لنڈورے۔'

پتنگ باز : آپ یہاں کہاں ٹھہریں گے؟ چلیے اس وقت غریب خانے ہی پر کھانا کھائیے، سرائے میں تو تکلیف ہوگی۔ ہاں جو کوئی اور بات ہو تو کیا مضائقہ (مسکرا کر) سچ کہنا استاد کچھ لسر کا ہے؟

آزاد : میاں یہاں دل ہی نہیں ہے پاس۔ محبت کریں گے کیا۔ چلیے آپ ہی کے یہاں

مہمان ہوں، یہاں تو بے فکری کے ہاتھ بک گئے ہیں۔ مگر استاد اتنا یاد رہے کہ بہت تکلیف نہ کیجیے گا۔

پتنگ باز : واللہ، یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بس ایک دس سیر کا پلاؤ تو بنوایئے گا مگر تکلف نہ کیجیے گا، مانتا ہوں آپ کو۔

آزاد اور پتنگ باز اکّے پر بیٹھے ۔ اِکّا ہوا سے باتیں کرتا چلا، تو کھٹ سے مکان پر داخل۔ اندر سے باہر تک خبر ہو گئی کہ منجھلے میاں آگئے۔ میاں آزاد اور وہ دونوں اترے۔ اتنے میں ایک لونڈی اندر سے آکر بولی، چلیے بڑے صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔

پتنگ باز : اے ہے ناک میں دم کر دیا، آتے دیر نہیں ہوئی اور بلانے لگے۔ چلو آتے ہیں۔ آپ کے لیے حقہ بھر لاؤ۔ حضرت کہیے تو ذرا والد سے مل آؤں؟ گانا وانا سنیے تو بلاؤں کسی کو؟ ادھر لونڈی اندر پہنچی تو بڑے میاں سے بولی ان کے پاس تو ان کے کوئی دوست مسند تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔

میاں : ان کے دوست کی نہ کہو۔ شہر بھر کے بدمعاش، چور مکار، جھوٹوں کے سردار ان کے لنگوٹیے یار ہیں۔ بھلے مانس سے ملتے جلتے تو انھیں دیکھا ہی نہیں۔

لونڈی : نہیں میاں شکل صورت سے تو شریف بھلے مانُس معلوم ہوتے ہیں۔

خیر، رات کو آزاد اور منجھلے میاں نے میٹھی نیند کے مزے اڑائے، صبح کو ہوالی موالی جمع ہوئے۔

ایک : حضور، کل تو خوب پیچ لڑے، اور ہوا بھی اچھی تھی۔

پتنگ باز : پیچ کیا لڑے پچاس کے ماتھے گئی۔ خیر، اس کا تو یہاں غم نہیں، مگر کرکری بڑی ہوئی۔

دوسرا : واہ حضور، کرکری کی ایک ہی کہی۔ قسم خدا کی، وہ لمڈورا پیچ نکالا کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ زمانہ بھر یہی کہتا تھا کہ بھئی پیچ کیا کاٹا ، کمال کیا۔ کچھ انعام دلوایئے، خداوند! آپ کے قدموں کی قسم، آج شہر بھر میں اس پیچ کی دھوم ہے۔ چالیس پچاس روپیوں کی بھی کوئی حقیقت ہے۔

شام کے وقت آزاد اور میاں پتنگ باز بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے کہ ایک مولوی صاحب لٹپٹی دستار کھوپڑی پر جمائے، کانی آنکھ کو اس کے نیچے چھپائے، دوسری میں بریلی کا

سرمہ لگائے کمرے میں آئے۔ انھوں نے علیک سلیم کے بعد جیب سے ایک اشتہار نکال کر آزاد کے ہاتھ میں دیا۔ آزاد نے اشتہار پڑھا تو پھڑک گئے۔ ایک مشاعرہ ہونے والا تھا۔ دور دور سے شاعر بلائے گئے تھے۔ طرح کا مصرع تھا

''ہم سے اُس شوخ نے عیاری کی''

مولوی صاحب تو الٹے پاؤں لمبے ہوئے، یہاں مشاعرے کی تاریخ جو دیکھتے ہیں تو اکتیس فروری لکھی ہوئی ہے۔ حیرت ہوئی کہ فروری کا تو اٹھائیس اور کبھی انتیس ہی دن کا مہینہ ہوتا ہے۔ یہ اکتیس فروری کون سی تاریخ ہے۔ بارے معلوم ہوا کہ اسی وقت مشاعرہ تھا۔ خیر دونوں آدمی بڑے شوق سے پتا پوچھتے ہوئے گلابی بارہ دری میں داخل ہوئے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ نئی نئی وضع، نئے نئے فیشن کے لوگ جمع ہیں۔ کسی کا دماغ ہی نہیں ملتا، جسے دیکھو تاناشاہ بنا بیٹھا ہے، دنیا کی بادشاہت کو جوتی کی نوک پر مارتا ہے۔ شاعری کے شوقین امڑے چلے آتے ہیں۔ کہیں تل رکھنے کی جگہ نہیں۔ جب رات بھیگی اور چاندنی خوب نکھری تو مشاعرہ شروع ہوا۔ شاعروں نے چہکنا شروع کیا۔ مجلس کے لوگ ایک ایک شعر پر اتنا چیخے چلائے کہ ہونٹ اور گلے سوکھ کر کانٹا ہوگئے۔ اوہو ہو ہو آہا ہا ہا، واہ واہ سبحان اللہ کے دونگرے برس رہے تھے۔ شاعر نے پورا شعر پڑھا بھی نہیں کہ یار لوگ لے اڑے۔ واہ حضرت، کیوں نہ ہو! قسم خدا کی! قلم توڑ دیا! واللہ، آج اس لکھنؤ میں آپ کا کوئی ثانی نہیں! ایک شاعر نے یہ غزل پڑھی :

ہم کو دیکھا تو وہ ہنس دیتے ہیں
آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی

محفل کے لوگوں نے پورا شعر تو سنا نہیں، یاری کو گاڑی سن لیا۔ گاڑی کی، واہ واہ، کیا شعر فرمایا، گاڑی کی۔ اب جسے دیکھیے غل مچا رہا ہے۔ گاڑی کی، گاڑی کی، مگر غل غپاڑے میں سنتا کون ہے۔ شاعر بیچارہ چیختا ہے کہ حضرت گاڑی کی نہیں، یاری کی۔ پر یار لوگ اپنا ہی راگ الاپتے جاتے ہیں۔ تب تو میاں آزاد نے جھلاکر کہا، صاحبو اگاڑی نہ پچھاڑی، چوپہیا نہ پالکی گاڑی، خدا کے واسطے پہلے شعر تو سن لو، پھر تعریف کے پل باندھو۔ گاڑی کی نہیں، یاری کی۔

آنکھ چھپتی ہی نہیں یاری کی۔

دوسرے شاعر نے یہ شعر پڑھا۔

امید روز وصل تھی کس بدنصیب کو
قسمت الٹ گئی میرے روزِ سیاہ کی

حاضرین: نگاہ کی، سبحان اللہ، نگہ کی، حضرت، یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔

شاعر: نگاہ نہیں روزِ سیاہ، نگاہ سے تو یہاں کچھ معنی ہی نہ نکلیں گے۔

یہ کہہ کر انھوں نے پھر اسی شعر کو پڑھا اور سیاہ کے لفظ پر خوب زور دیا کہ کوئی صاحب پھر نگاہ نہ کہہ اٹھیں۔

آدھی رات تک ہوحق مچتا رہا۔ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ پڑوسیوں کی نیند حرام ہوگئی۔ ایک ایک شعر پڑھنے کی چار چار دفعہ فرمائش ہو رہی ہے اور بیس مرتبہ اٹھا بیٹھی، سلام پر سلام اور آداب پر آداب، اچھی قواعد ہوئی۔ لالا خوش وقت رائے اور منشی خورشید رائے تین تین سو شعروں کی غزلیں کہہ لائے تھے، جن کا ایک شعر بھی درست نہیں۔ ایک بجے سے پڑھنے بیٹھے تو تین بجا دیے۔ لوگ کانوں میں انگلیاں دے رہے ہیں، مگر وہ کسی کی نہیں سنتے۔

وہاں سے میاں آزاد اور ان کے دوست گھر آئے۔ تڑکا ہو گیا تھا۔ آزاد تو تھوڑی دیر سو کر اٹھ گئے، مگر میاں پتنگ باز نے دس بجے تک کی خبر لی۔

آزاد: آج تو آپ بڑے سویرے اٹھے۔ ابھی تو دس ہی بجے ہیں۔ بھئی بڑے سونے والے ہو۔

پتنگ باز: جناب، تڑکا تو مشاعرے میں ہی ہو گیا تھا۔ جب آدمی صبح کو سوئے گا تو دس بجے سے پہلے کیا اٹھے گا۔ اور سچ تو یوں ہے کہ ابھی اور سونے کو جی چاہتا ہے، کچھ مشاعرے کے جھگڑے کا بھی حال سنا؟ آپ تو کوئی چار بجے سو رہے تھے۔ ہم نے ساری داستان سنی۔ بڑی چخ چل گئی۔ مولوی بدر اور منشی فشار میں تو لکڑی چلتے چلتے رہ گئی۔ جو میاں رنگین نہ ہوں تو دونوں میں جوتی چل جائے۔

آزاد: یہ کیوں، کس بات پر؟

پتنگ باز: کچھ نہیں یوں ہی۔ میں تو سمجھا اب لکڑی چلی۔

آزاد: تو مشاعرہ کیا پالی تھی؟ پوچھیے شاعری کو لکڑی اور بانک سے کیا واسطہ، قلم کا زور

دکھانا چاہیے کہ ہاتھ کا۔ کسی طرح بدر اور فشار میں ملاپ کرا دیجیے۔

پتنگ باز : اے توبہ! ملاپ، ملاپ ہو چکا۔ بدر کا یہ حال ہے کہ بات کی اور غصہ آ گیا۔ اور میاں فشار ان کے بھی چچا ہیں۔ بات پیچھے کرتے ہیں، چانٹا پہلے ہی جماتے ہیں۔

آزاد : آخر بکھیڑے کا سبب کیا؟

پتنگ باز : سوا حسد کے اور کیا کہوں، ہوا یہ کہ فشار نے پہلے پڑھا۔ اس پر مولوی بدر بگڑ کھڑے ہوئے کہ ہم سے پہلے انھیں کیوں پڑھنے دیا گیا۔ ان میں کیا بات ہے۔ ہم بھی تو استاد کے لڑکے ہیں۔ اس پر فشار بولے، ابھی بچے ہو، ہجے کرنا تو جانتے نہیں، شاعری کیا جانو۔ کچھ دن استاد کی جوتیاں سیدھی کرو، تو آدمی بنو۔ بدر نے آستینیں الٹ لیں اور چڑھ دوڑے۔ فشار کے شاگردوں نے بھی ڈنڈا سیدھا کیا۔ اس پر لوگوں نے دوڑ کر بیچ بچاؤ کر دیا۔

شام کے وقت میاں آزاد نے کہا۔ بھئی، اب تو بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا ہے۔ چلیے، ذرا چار پانچ کوس سیر تو کر آئیں۔ پتنگ باز نے چار پانچ کوس کا نام سنا تو گھبرائے۔ یہ بیچارے مہین آدمی، آدھ کوس بھی چلنا کٹھن تھا، دس قدم چلے تو ہانپنے لگے۔ کہیں گئے بھی تو ٹانگھن پر۔ بھلا دس میل کون جاتا؟ بولے حضرت، میں اس سیر سے باز آیا۔ آپ کو تو ڈاک کے ہرکاروں میں نوکری کرنی چاہیے۔ مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے کہ بے سبب پنچ کوسی چکر لگاؤں اور آدمی سے اونٹ بن جاؤں، آپ جاتے ہیں تو جائیے، مگر جلد آئیے گا۔ سچ کہتے ہیں لمبا آدمی عقل کا دشمن ہوتا ہے۔ یہ گپ اڑانے کا وقت ہے یا جنگل میں گھومنے کا؟

ایک مصاحب : آپ بجا فرماتے ہیں، بھلے مانسوں کو کبھی جنگل کی دھن سمائی ہی نہیں اور حضور کے یہاں گھوڑا بگدھی سواریاں موجود ہیں۔ جوتیاں چٹخاتے ہوئے آپ کے دشمن چلیں۔

آزاد : جناب یہ نزاکت نہیں ہے اس کو تپ دق کہتے ہیں۔ آپ پانچ کوس نہ چلیے دو ہی کوس چلیے، آدھ ہی کوس چلیے۔

پتنگ باز : نہیں جناب، معاف فرمائیے۔

آزاد لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے پچھم کی طرف روانہ ہوئے۔

(22)

میاں آزاد کے پاؤں میں تو سنیچر تھا۔ دو دن کہیں ٹک جائیں تو تلوے کھجلانے لگیں۔ پتنگ باز کے یہاں چار پانچ دن جو جم گئے تو طبیعت گھبرانے لگی۔ لکھنؤ کی یاد آئی۔ سوچے اب وہاں سب معاملہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ بوریا بندھنا اٹھایا اور شکرم گاڑی کی طرف چلے۔ ریل پر بہت چڑھ چکے تھے، اب کی شکرم پر چڑھنے کا شوق ہوا۔ پوچھتے پوچھتے وہاں پہنچے۔ ڈیڑھ روپے کرایہ طے ہوا، ایک روپیہ بیعانہ دیا۔ معلوم ہوا سات بجے گاڑی چھوٹ جائے گی، آپ ساڑھے چھ بجے آ جائیے۔ آزاد نے اسباب تو وہیں رکھا، ابھی تین ہی بجے تھے، پتنگ باز کے یہاں آ کر گپ شپ کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں پونے سات بج گئے۔ شکرم کی یاد آئی بچا کھچا اسباب مزدور کے سر پر لاد کر لدے پھندے گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ راہ میں لمبے لمبے ڈگ دھرتے، مزدوروں کو للکارتے چلے آتے ہیں کہ تیز چلو، قدم جلد اٹھاؤ، جہاں سناٹا دیکھا، وہاں تھوڑی دور دوڑنے بھی لگے کہ وقت پر پہنچیں، ایسا نہ ہو کہ گاڑی چھوٹ جائے۔ وہاں ٹھیک سات بجے پہنچے تو سناٹا پڑا ہوا۔ آدمی نہ آدم زاد۔ پکارنے لگے، ارے میاں چپراسی، منشی جی، اجی منشی جی! کیا سانپ سونگھ گیا؟ بڑی دیر کے بعد ایک چپراسی نکلا، کہیے کیا ڈاک کیجیے گا؟

آزاد : اور سنیے ڈاک کیجیے گا کہ ایک ہی کہی۔ میاں بیعانہ کا روپیہ بھی دے چکے۔

چپراسی : اچھا تو اس گھاس پر بستر جمائیے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے یا ذرا بازار کی سیر کر آئیے۔

آزاد : اے سیر کیسی؟ ڈاک چھوٹے گی آخر کس وقت؟

چپراسی : کیا معلوم، دیکھیے منشی جی سے پوچھوں۔

آزاد نے منشی جی کے پاس جا کر کہا۔ ارے صاحب سات بجے بلایا تھا جس کے ساڑھے سات ہو گئے اب اور کب تک بیٹھا رہوں؟

منشی جی : جناب، آج تو آپ ہی آپ ہیں اور کوئی مسافر ہی نہیں۔ ایک آدمی کے لیے چالان تھوڑے چھوڑیں گے۔

آزاد : کہیں اس بھروسے نہ رہیے گا، بیعانہ دے چکا ہوں۔

منشی : اچھا، تو ٹھہر یے۔

آٹھ بج گئے، نو بجے گئے، دس بجے گئے، کوئی گیارہ بجے تین مسافر آئے۔ تب جا کر شکرم چلی۔ کوئی آدھ کوس تک تو دونوں گھوڑے تیزی کے ساتھ گئے، پھر سرنگ بول گیا۔ یہ گرا، وہ گرا، کوچ وان نے کوڑے پر کوڑے جمانا شروع کیا، پر گھوڑے نے بھی ٹھان لی کہ ٹلوں گا ہی نہیں۔ کوچ مین، گھسیارا، بارگیر، سب کے سب ٹھوک رہے تھے، مگر وہ کھڑا ہانپتا ہے۔ بارے بڑی مشکل سے پھونک پھونک کر قدر رکھتا ہوا دوسری چوکی تک آیا۔

دوسری چوکی میں ایک ٹٹو دبلا پتلا، دوسرا گھوڑا مرا ہوا سا تھا، ہڈیاں ہڈیاں گن لیجیے۔ یہ پہلے ہی سے رنگ لائے۔ کوچ مین نے خوب کوڑے جمائے، تب کہیں چلے۔ مگر دس قدم چلے تھے کہ پھر دم لیا۔ سائیس نے آنکھیں بند کر کے رسی پھٹکارنی شروع کی۔ پھر دس بیس قدم آہستہ آہستہ بڑھے، پھر ٹھہر گئے۔ خدا خدا کر کے تیسری چوکی آئی۔

تیسری چوکی میں ایک دبلا پتلا مشکی رنگ کا گھوڑا اور دوسرا لنگرا تھا۔ پہلے ذرا چیں چپٹ، پھر چلے۔ ایک آدھا کوس گئے تھے کہ کیچڑ ملی، پھر تو قیامت کا سامنا تھا۔ گھوڑے تھان کی طرف بھاگتے تھے، کوچ مین راس تھامے ٹک ٹک کرتا جاتا تھا، بارگیر پہیوں پر زور لگاتے تھے۔ مسافروں کو حکم ہوا کہ اتر آئیے، ذرا ہوا کھائیے۔ بیچارے اترے۔ آدھ کوس تک پیدل چلے۔ گھوڑے قدم قدم پر منھ موڑ دیتے تھے۔ وہ چل پوں مچی ہوئی تھی کہ خدا کی پناہ۔ آدھ کوس کے بعد حکم ہوا کہ اپنا اپنا بوجھ اٹھاؤ، گاڑی بھاری ہے۔ چلیے صاحب سب نے گٹھریاں سنبھالیں۔ سر پر اسباب لادے چلے آتے ہیں۔ تین گھنٹے میں کہیں چوکی طے ہوئی، مسافروں کا دم ٹوٹ گیا، کوچ مین اور سائیس کے ہاتھ کوڑے مارتے مارتے اور پہیوں پر زور لگاتے لگاتے بے دم ہو گئے۔

چوتھی چوکی کی جوڑی دیکھنے میں اچھی تھی۔ لوگوں نے سمجھا تھا، تیز جائے گی، مگر جمالی خربوزوں کی طرح دیکھنے ہی بھر کی تھی۔ کوچوان اور بارگیروں نے لاکھ لاکھ زور لگایا، مگر انھوں نے ذرا کان تک نہ ہلائے، کنوتی تک نہ بدلی۔ بت بنے کھڑے ہیں، میدان میں اڑے ہیں، کوئی تو گھاس کا مٹھا لاتا ہے، کوئی دور سے توبڑا دکھاتا ہے، کوئی پہیے پر زور لگاتا ہے، کوئی اوپر سے کوڑے جماتا ہے۔ آخر مسافروں نے بھی اتر کر زور لگایا، مگر ٹائیں ٹائیں پھس۔ آخر گھوڑوں کے عوض بیل جوتے گئے۔

پانچویں چوکی میں بابا آدم کے وقت کا ایک گھوڑا آیا۔ گھوڑا کیا خچر تھا۔ آنکھیں مانگ رہا تھا۔ مکھیاں بھِن بھِن کرتی تھیں۔ رات کو بھی مکھیوں نے اِس کا پیچھا نہ چھوڑا۔

آزاد : ارے بھئی، اب چلو نہ! آخر یہاں کیا ہورہا ہے؟ راستہ چلنے ہی سے کٹتا ہے۔

کوچ مین : اے لو صاحب، گھوڑے کا تو بندوبست کرلیں۔ ایک ہی گھوڑا تو اس چوکی پر ہے۔

آزاد : اجی دوسری طرف بھینس جوت دینا۔

ایک مسافر : یا ہم ایک سہل تدبیر بتائیں۔ مسافروں سے کہیے اتر پڑیں بوجھ اپنا اپنا سر پر لادیں اور زور لگاکر بگدھی کو ایک چوکی تک ڈھکیل لے جائیں۔

اتنے میں ایک بھٹیارا اپنے ٹٹو کو ٹک ٹک کرتا چلا آتا تھا۔ کوچوان نے پوچھا، کہو بھائی بھاڑا کرتے ہو؟ جو چاہے سو مانگو، دیں گے۔ نقد دام لو اور بگدھی پر بیٹھ جاؤ۔ ایک چوکی تک تمھارے ٹٹو کو بگدھی میں جوتیں گے۔

بھٹیارا : واہ اچھے آئے! ٹٹوا کبھی گاڑی میں جوتا بھی گیا ہے؟ مرغی کے برابر ٹٹو، اور جوتنے چلے ہیں شکرم میں۔ یوں چاہے پیٹھ پر سوار ہولو، مدا ڈاک گاڑی میں کیسے چل سکتا ہے؟

کوچ مین : ارے بھئی تم کو بھاڑے سے مطلب ہے، یا تقریر کروگے؟ ہم تو اپنی ترکیب سے جوت لیں گے۔

آزاد نے بھٹیارا سے کہا : روپیہ ٹینٹ میں رکھو اور کہو، اچھا جوتو۔ کچھ تھک تھکا کر آپ ہی ہار جائیں گے۔ روپیہ تمھارے باپ کا ہو جائے گا۔ وہ بھی راضی ہو گیا۔ اب کوچ مین نے ٹٹو کو جوتنا چاہا، مگر اس نے سیکڑوں ہی بار پشت اچھالی، دولتیاں جھاڑیں اور گاڑی کے پاس نہ پھٹکا۔ اس پر کوچوان نے ٹٹو کو ایک کوڑا مارا۔ تب تو بھٹیارا آگ ہوگیا۔ اے واہ میاں اچھے ملے ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمارا جانور بگدھی میں نہ چلے گا۔ آپ نے زبردستی کی اب گدھے کی طرح گدگد پیٹنے لگے۔

وہ تو ٹٹو کو بغل میں داب لمبا ہوا، یہاں شکرم میدان میں پڑی ہوئی ہے۔ مسافر جمائیاں لے رہے ہیں۔ سائیس چلم پر چلم اڑاتے ہیں۔ سب مسافروں نے مل کر قسم کھائی کہ اب شکرم پر نہ بیٹھیں گے۔ خدا جانے کیا گناہ کیا تھا کہ یہ مصیبت سہی۔ پیدل آنا اس سے

کہیں اچھا۔

پانچویں چوکی کے آگے پہنچے تو ایک مسافر نے جس کا نام پلٹو تھا، ٹھرّے کی بوتل نکالی اور لگا کجی پر کجی اڑانے۔ میاں آزاد کا دماغ مارے بدبو کے پریشان ہوگیا۔ مذہب سے تو انھیں کوئی واسطہ نہ تھا، کیونکہ خدا کے سوا اور کسی کو مانتے ہی نہ تھے، لیکن بدبو نے انھیں بے چین کر دیا۔ ایک دوسرے مسافر رسال دار تھے۔ ان کی جان بھی عذاب میں تھی۔ وہ شراب کے نام پر لاحول پڑھتے اور اس کی بو سے کوسوں بھاگتے تھے۔ جب بہت دق ہو گئے تو میاں آزاد سے بولے، حضرت یہ تو بے ڈھب ہوئی۔ اب تو ان سے صاف صاف کہہ دینا چاہیے کہ خدا کے واسطے اس وقت نہ پیجئے۔ تھوڑی دیر میں ہم کو اور آپ کو گالیاں نہ دینے لگیں، تو کچھ ہارتا ہوں۔ ذرا آنکھ دکھا دیجیے جس میں بہت بڑھنے نہ پائیں۔

آزاد : خدا کی قسم، دماغ پھٹا جاتا ہے۔ آپ ڈپٹ کر للکار دیجیے۔ نہ مانیں تو میں کان گرما دوں گا۔

رسال دار : کہیں ایسا غضب نہ کیجیے گا۔ پنجے جھاڑ کر لڑنے کو تیار ہو جائے گا۔ شرابی کے منہ لگنا کوئی اچھی بات تھوڑے ہے۔

دونوں میں یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ لالہ پلٹو نے ہانک لگائی۔ ہرے ہرے باغ میں گولا بولا، پگ آگے پگ پیچھے۔ یہ بے تکی کہہ کر ہاتھ جو جھٹکا تو رسال دار کی دونوں ٹانگوں پر شراب کے چھینٹے پڑ گئے۔ ہائیں ہائیں، بدمعاش الگ ہٹ، اٹھ جا یہاں سے، نہیں تو دوں گا ایک لپڑ۔

پلٹو : برسو رام جھڑاکے سے، رسال دار کی بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ ہمارا باپ گدھا تھا۔

رسال دار : چپ، کھوس دوں بانس منہ میں؟

پلٹو : اجی، تو ہنسی ہنسی میں روئے کیوں دیتے ہو؟ واہ ہم تو اپنے باپ کو برا کہتے ہیں۔

آزاد : کیا تمھارے باپ گدھے تھے؟

پلٹو : اور کون تھے؟ آپ ہی بتائیے۔ عمر بھر ڈولی اٹھائی مگر مرتے دم تک نہ اٹھانا آئی۔

رسال دار : کیا کہار تھا؟

پلٹو : اور نہیں تو کیا چمار تھا، یا بیلدار تھا؟ یا آپ کی طرح رسال دار تھا؟

آزاد : ہے نشے میں تو کیا۔ بات پکی کہتا ہے۔

پلٹو : اجی اس میں چوری کیا ہے؟ ہم کہار، ہمارا باپ کہار

آزاد : کہیے آپ کی مہری تو خیریت سے ہے۔

پلٹو : چل شکرم، چل گھوڑے، بگل بجے بھونپو بھونپو، سامنے کاٹا دکان میں آٹا، کبڑیوں کے یہاں بھاٹا، رسال دار کے لگاؤں چانٹا۔

رسال دار : ایسا نہ ہو کہ میں نشہ وشا سب ہرن کر دوں۔ زبان کو لگام دے۔

پلٹو : اچھا سائیس ہے۔

آزاد : ابے، سائیسی علم دریاؤ ہے۔

پلٹو : تو سر ناؤ ہے تو بن بلاؤ ہے۔

رسال دار : کوچ مین بگھی ٹھہراؤ!

پلٹو : کوچ مین بگدھی چلاؤ۔

میاں آزاد نے دیکھا رسال دار کا چہرہ مارے غصے کے لال ہو گیا تو انھوں نے بات ٹال دی اور پوچھا، کیوں پلٹو مہراج، سچ کہنا تم نے تو کبھی ڈولی نہیں اٹھائی؟ پلٹو بولے : نہیں کبھی نہیں۔ ہاں برتن مانجھے ہیں۔ مگر ہوش سنبھالتے ہی مدرسے میں پڑھنے لگے اور اب تار گھر میں نوکر ہیں۔ رسال دار جی لو پیتے ہو؟ رسالدار کے منھ کے پاس کُجی لے جا کر کہا، پیو پیو، اتنا کہنا تھا کہ رسال دار جل بھن کر خاک ہو گئے، تڑ سے ایک چانٹا رسید کیا، دوسرا اور دیا، پھر تین چار اور لگائے۔ پلٹو مزے سے بیٹھے چپتیں کھایا کیے۔ پھر قہقہہ لگا کر بولے، ابے جا، بڑا رسالدار بنا ہے۔ نام بڑا، درشن تھوڑے۔ ایک جوں بھی نہ مری۔ رسال داری کیا خاک کرتے ہو؟ چلو، اب تو ایک کُجی پیو دوں پھر؟

رسال دار : بھئی اس نے تو ناک میں دم کر دیا۔ پیٹتے پیٹتے ہاتھ تھک گئے۔

کوچ مین : رسال دار صاحب یہ کیا گل مچ رہا ہے؟

آزاد : بڑی بات کی تم جیتے تو بچے۔ ہم سمجھتے تھے کہ سانپ سونگھ گیا۔ یہاں مار دھار بھی ہو گئی تمھیں خبر ہی نہیں۔

کوچ مین : مار دھار! یہاں مار دھار کیسی؟

رسال دار : دیکھو، یہ سور شراب پی رہا ہے اور سب کو گالیاں دیتا ہے۔ میں نے خوب پیٹا، پھر بھی نہیں مانتا۔

پلٹو : جھوٹے ہو! کس نے پیا! کب پیا؟ یہاں تو ایک جوں بھی نہ مری۔

کوچ مین : لالہ، تھوڑی ہم کو بھی پلاؤ۔

پلٹو اور کوچ مین دونوں کوچ بکس پر جا بیٹھے اور کپیاں کا دور چلنے لگا۔ جب دونوں بدمست ہوئے تو آپس میں دھول دھپا ہونے لگا۔ اس نے اس کے لپڑ لگایا، اس نے اس کے ایک ٹیپ جڑی۔ کوچ مین نے پلٹو کو دھکیل دیا۔ پلٹو نے گرتے ہی پاؤں پکڑ کر گھسیٹا، تو کوچ مین بھی دھم سے گرے۔ دونوں چمٹ گئے۔ ایک نے کولہے پر لادا، دوسرا بغلی ڈوبا۔ مکا چلنے لگا۔ کوچ مین نے جھپٹ کے پلٹو کی منگوی لی، پلٹو نے اس کے پٹے پکڑے۔ رسال دار کو غصہ آیا تو پلٹو کے بے بھاؤ کی چپتیں لگائیں۔ ایک دو تین کرکے کوئی پچاس تک گن گئے۔ آزاد نے دیکھا کہ میں خالی ہوں۔ انھوں نے کوچ مین کو چپتیانا شروع کیا۔

آزاد : کیوں بچہ پیوگے شراب؟ سور، گاڑی چلاتا ہے کہ شراب پیتا ہے؟

رسال دار : توڑ دوں بسر، پٹک دوں بوتل سر پر۔

پلٹو : تو آپ کیا اکڑ رہے ہیں؟ آپ کی رسالداری کو تو ہم نے دیکھ لیا۔ دیکھو کوچ مین کے سر پر آدھے بال رہ گئے، یہاں بال بھی نہ بانکا ہوا۔

رسال دار : بس بھئی، اب ہم ہار گئے۔

اس جھنجھٹ میں تڑکا ہو گیا۔ مسافر رات بھر کے جگے ہوئے تھے، جھپکیاں لینے لگے۔ معلوم نہیں کتنی چوکیاں آئیں اور گئیں۔ جب لکھنؤ پہنچے تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔

(23)

میاں آزاد شکرم پر سے اترے، تو شہر کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ لکھنؤ میں گھومے تو بہت تھے پر اس حصے کی طرف آنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ سڑکیں صاف، کوڑے کرکٹ سے کام نہیں، گندگی کا نام نہیں، وہاں ایک رنگین کوٹھی نظر آئی تو آنکھوں نے وہ تراوٹ پائی کہ واہ جی واہ! اس کی بناوٹ اور سجاوٹ ایسی بھائی کی سبحان اللہ! بس دل میں کھب ہی تو گئی۔ روشیں دنیا سے نرالی، پودوں پر وہ جوبن کہ آدمی برسوں گھورا کرے۔

میاں آزاد نے ہرے بھرے درخت کے سائے میں آسن جمایا۔ ٹہنیاں ہوا کے جھونکوں سے جھومتی تھیں، میوے کے بوجھ سے زمین کو بار بار چومتی تھیں۔ آزاد ٹھنڈے ٹھنڈے ہوا

کے جھونکوں کا مزہ لے رہے تھے کہ ایک مسافر ادھر سے گزرا۔ آزاد نے پوچھا۔ کیوں صاحب اس کوٹھی میں کون رئیس رہتا ہے؟

مسافر: رئیس نہیں ایک رئیسہ رہتی ہیں۔ بڑی مالدار ہیں، رات کو روز بجرے پر دریا کی سیر کو نکلتی ہیں۔ ان کی دونوں لڑکیاں بھی ساتھ ہوتی ہیں۔

آزاد: کیوں صاحب لڑکیوں کی عمر کیا ہوگی؟

مسافر: اب عمر کا حال مجھے کیا معلوم۔ مگر سیانی ہیں، بڑی تمیزدار ہیں اور بڑھیا تو آفت کی پڑیا ہے۔

آزاد: شادی ابھی نہیں ہوئی؟

مسافر: ابھی شادی نہیں ہوئی، نہ کہیں بات چیت ہے۔ دونوں بہنوں کو پڑھنے لکھنے اور سیر کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ صفائی کا دونوں کو خیال ہے۔ خدا کرے ان کی شادی اچھے گھروں میں ہو۔

آزاد: آپ نے تو وہ خبر سنائی کہ مجھے ان لڑکیوں کو سیر کرتے ہوئے دیکھنے کا شوق ہوگیا۔

مسافر: تو پھر اسی جگہ بستر جما رکھیے۔

آزاد: آپ بھی آجائیں تو مزہ آجائے۔

مسافر: آجاؤں گا۔

آزاد: ایسا نہ ہو کہ آپ نہ آئیں اور مجھے بھیڑیا اٹھا لے جائے۔

مسافر: آپ بڑے دل لگی باز معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں اپنے وعدے کے سچے ہیں۔ بس شام ہوئی اور بندہ یہاں پہنچا۔

یہ کہہ کر وہ حضرت تو چلتے ہوئے اور آزاد درختوں سے میوے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔ پھر چڑیوں کا گانا سنا۔ پھر دریا کی لہریں دیکھیں۔ کچھ دیر تک گاتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی اور وہ مسافر نہ آیا۔ آزاد دل میں سوچنے لگے شاید حضرت جھانسا دے گیا۔ اب شام میں کیا باقی ہے۔ آنا ہوتا تو آنہ جاتے۔ شاید آج بیگم صاحبہ بجرے پر سیر بھی نہ کریں گی۔ سیر کرنے کا یہی تو وقت ہے۔ اتنے میں میاں مسافر نے آکر پکارا۔

آزاد: خیر آپ آئے تو۔ میں تو آپ کے نام کو رو چکا تھا۔

مسافر : خیر، اب ہنسیے ۔ دیکھیے وہ ہاتھی آ رہا ہے ۔ دونوں پالکیاں بھی ساتھ ہیں ۔

آزاد : کہاں کہاں؟ کدھر؟

مسافر : اینٹ کی عینک لگاؤ ۔ اتنی بڑی پالکی نہیں دیکھ سکتے ۔ ہاتھی بھی نہیں دکھائی دیتا ۔ کیا رتوندھی آتی ہے؟

آزاد : آہا ہا! وہ دیکھیے ۔ ایں وہ تو درخت کے سائے میں رک رہا ۔

مسافر : گھبرائیے نہیں، یہیں آ رہی ہے ۔ اب کوئی اور ذکر چھیڑیے، جس میں معلوم ہو کہ دو مسافر تھک کر کھڑے باتیں کر رہے ہیں ۔

آزاد : یہ آپ کو خوب سوجھی! ہاں صاحب اب کی آم کی فصل خوب ہوئی ۔ جدھر دیکھو، پٹے پڑے ہیں ۔ منڈی جائیے، کھانچیوں کی کھانچیاں ۔ تربوز کو دیکھ آئیے، کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا ۔ اور آم کے سامنے تربوز کو کون ہاتھ لگائے ۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بجرا تیار ہوا ۔ دونوں بہنیں اور بیگم صاحبہ اس میں بیٹھیں ۔ یکایک پورب کی طرف سے کالی متوالی گھٹا جھومتی ہوئی اٹھی اور بجلی نے چمکنا شروع کیا ۔ ملاح نے بجرے کو کھونٹے میں باندھ دیا ۔ دونوں لڑکیاں ہاتھی پر بیٹھیں اور گھر کی طرف چلیں ۔ آزاد نے کہا ۔ یہ برا ہوا! طوفان نے ہتھے ہی پر ٹوک دیا، نہیں تو اس وقت بجرے کی سیر دیکھ کر دل کی کلی کھل جاتی ۔ آخر دونوں آدمی گھومتے گھامتے ایک باغ میں پہنچے، تو میاں مسافر بولے ۔ حضرت اب کی آم اتنی کثرت سے پیدا ہوا کہ ٹکے سیر نہیں، ٹکے ہزار لگ گئے ۔ لیکن بغیچے والے کا یہ حال ہے کہ جہاں کسی بھلے مانس نے راہ چلتے کوئی آم اٹھا لیا اور بس چمٹ پڑا ۔ ابھی پرسوں ہی کی تو بات ہے ۔ یہاں سے کوئی چار کوس پر ایک مسافر میدان میں چلا جاتا تھا ۔ ایک کانا کھترا آم ٹپ سے زمین پر ٹپک پڑا ۔ مسافر کو کیا معلوم کہ کون ادھر ادھر تاک رہا ہے، چپکے سے آم اٹھا لیا ۔ اٹھانا تھا کہ دو گنوار دل لٹھ کندھے پر رکھے 'مار سارے کا مار سارے کا' کرتے نکل آئے ۔ مسافر نے آم جھٹ زمین پر پٹک دیا ۔ لیکن ایک گنوار نے آتے ہی گالیاں دینی شروع کیں اور دوسرے نے گھونسا تانا ۔ مسافر بھی چھتریہ آدمی تھا، آگ ہو گیا ۔ مارے غصے کے اس کا بدن تھر تھر کانپنے لگا ۔ بڑھ کے جو ایک چانٹا دیتا ہے تو ایک گنوار لڑکھڑا کے دھم سے زمین پر ۔ دوسرے نے جو یہ حال دیکھا تو لٹھ تانا ۔ راجپوت بغلی ڈوب کر جا پہنچا، ایک آنٹی جو دیتا ہے تو چاروں شانے چت ۔ ہم بھی کل ایک باغ میں پھنس گئے تھے ۔ شامت

جو آئی تو ایک درخت کے سائے میں دوپہر یا منانے بیٹھ گئے۔ بیٹھنا تھا کہ ایک نے تڑ سے گالی دی۔ اب سنیے کہ گالی تو دی ہم کو لیکن ایک پہلوان بھی قریب ہی بیٹھا تھا۔ سنتے ہی چمٹ گیا اور چمٹتے ہی کولہے پر لادا۔ گرے منہ کے بل۔ پہلوان چھاپ بیٹھا، ہفتے گانٹھ لیے، ہلسینگوا باندھ کر آسمان دکھا دیا، اور اپنے شاگردوں سے کہا، چڑھ جاؤ پیڑ پر، اور آم، پتے، بور، ٹہنی، جو پاؤ توڑ توڑ کر پھینک دو، پیڑ نوچ ڈالو، لیکن لوگوں نے سمجھایا کہ استاد جانے دو، گالی دینا تو ان کا کام ہے۔ یہ تو ان کے سامنے کوئی بات ہی نہیں، یہ اسی لائق ہیں کہ خوب دھنیں۔

آزاد : کیوں صاحب، دھنے کیوں جائیں؟ ایسا نہ کریں تو سارا باغ مسافروں ہی کے لیے ہو جائے۔ لوگ پیڑ کا پیڑ جڑ اور پھنگی تک چٹ کر جائیں۔ آپ تو سمجھے کہ یہ ایک آم کے لیے کٹ مرا، مگر اتنا نہیں سوچتے کہ ایک ہی ایک کر کے ہزار ہوتے ہیں۔ اس تاکید پر تو یہ حال ہے کہ لوگ باغ کے باغ لوٹ کھاتے ہیں اور جو کہیں اتنی تو تو میں میں نہ ہو تو نہ جانے کیا ہو جائے۔

میاں مسافر کل آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ آزاد آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی اپنے لڑکے کو گودی میں لیے تھپکی دے دے کر سلا رہا ہے۔ 'آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جا، میرے بالے کو گود سلا کیوں نہ جا'۔ آزاد ایک دل لگی باز آدمی، جا کر اس سے پوچھتے کیا ہیں۔ کس کا پلا ہے؟ وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا، بولا دور رہ کیوں پلا پڑتا ہے؟ آزاد یہ جواب سن کر خوش ہوگئے۔ بولے استاد ہم تو آج تمھارے مہمان ہوں گے۔ تمھاری حاضر جوابی سے جی خوش ہوگیا۔ اب رات ہوگئی ہے کہاں جائیں؟ اس ہنسوڑ آدمی نے ان کی بڑی خاطر کی، کھانا کھلایا اور دونوں نے دروازے پر ہی لمبی تانی۔ تڑکے میاں آزاد کی نیند کھلی۔ ہنسوڑ کو جگانے لگے۔ کیوں حضرت پڑے سویا ہی کیجیے گا یا اٹھیے گا بھی؟ واہ رے ماچا توڑ! بارے بہت ہلانے ڈلانے پر میاں ہنسوڑ اٹھے اور پھر لیٹ گئے۔ مگر پیتانے کی طرف سر کر کے۔ اتنے میں دو چار دوست اور آگئے۔ واہ بھئی واہ، ہم دو کوس سے آئے اور یہاں ابھی کھاٹ ہی نہیں چھوڑی؟ بھئی، بڑا سونے والا ہے۔ ہم نے منھ ہاتھ دھویا، حقہ پیا، بالوں میں تیل ڈالا، دو چپاتیاں کھائیں، کپڑے پہنے اور ٹہلتے ہوئے یہاں تک آئے مگر یہ ابھی تک پڑے ہی ہوئے ہیں۔ آخر ایک آدمی نے ان کے کان میں پانی ڈال دیا۔ تب تو آپ

کلبلائے۔ دیکھو دیکھو، ہیں ہیں، نہیں مانتے! واہ، اچھی دل لگی نکالی ہے۔

ایک دوست : ذرا آنکھیں تو کھولیے۔

ہنسوڑ : نہیں کھولتے آپ کا اجارہ ہے؟

دوست : دیکھیے، یہ میاں آزاد تشریف لائے ہیں، ادھر مولوی صاحب کھڑے ہیں۔ ان سے تو ملیے، سوسو کر نحوست پھیلا رکھی ہے۔

مولوی : اجی حضرت۔

ہنسوڑے : بھئی دق نہ کرو، ہمیں سونے دو۔ یہاں مارے نیند کے برا حال ہے، آپ کو دل لگی سوجھتی ہے۔

آزاد : بھائی صاحب۔

ہنسوڑ : اور سنئے۔ آپ بھی آئے وہاں سے جان کھانے۔ سویرے سویرے آپ کو بلایا کس گدھے نے تھا؟ بھلے مانس کے مکان پر جانے کا یہ وقت ہے بھلا؟ کچھ آپ کا قرض تو نہیں چاہتا؟ چلیے، بوریا بندھنا اٹھائیے۔ (آنکھیں کھول کر) اخوا آپ ہیں؟ معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کی آواز نہیں پہچانی۔

مولوی : کہیے، خاکسار کی آواز تو پہچانی؟ یا کچھ مین میخ ہے؟

ہنسوڑ : اخّا آپ ہیں! معاف کیجیے گا میں اپنے آپے میں نہ تھا۔

مولوی : حضرت، اتنا بھی نیند کے ہاتھ بک جانا بھلا کچھ بات ہے۔ آٹھ بجا چاہتے ہے اور آپ پڑے سو رہے ہیں۔ کیا کل رت جگا تھا؟ خیر، میں تو رخصت ہوتا ہوں آپ حکیم صاحب کے نام خط لکھ بھیجئے گا۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہوجائے۔ کہیں پھر نہ لڑھک رہیے گا۔ آپ کی نیند سے ہم ہارے۔

ہنسوڑ : اچھا میاں آزاد، اور باتیں تو پیچھے ہوں گی پہلے یہ بتلائیے کہ کھانا کیا کھائیے گا؟ آج ماما بیمار ہوگئی ہے اور گھر میں بھی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے روزے کی نیت کی ہے۔ آپ بھی روزہ رکھ لیں۔ فائدے کا فائدہ اور ثواب کا ثواب۔

آزاد : روزہ آپ کو مبارک ہو، اللہ میاں ہمیں یوں ہی بخش دیں گے۔ یہ دل لگی کسی اور سے کیجیے گا۔

ہنسوڑ : دل لگی کے بھروسے نہ رہیے گا۔ میں کھرا آدمی ہوں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ مولوی

صاحب خط لکھنے کو کہہ گئے ہیں۔ دو پیسے کا خون اور ہوا۔ کل بھی روزہ رکھنا پڑا۔

آزاد : دو پیسے کیوں خرچ کیجیے گا؟ اب تو ایک پیسے کے پوسٹ کارڈ چلے ہیں۔

ہنسوڑ : سچ؟ ایک ڈبل میں۔ بھئی انگریز بڑے حکمتی ہیں۔ کیوں صاحب وہ پوسٹ کارڈ کہاں بکتے ہیں؟

آزاد : اتنا بھی نہیں جانتے؟ ڈاک خانے میں آدمی بھیجئے۔

ہنسوڑ : روشن علی، ڈاک خانے سے جاکر ایک آنے کا پوسٹ کارڈ لے آؤ۔

روشن : میاں، میں دیہاتی آدمی ہوں انگریزی نہیں پڑھا۔

ہنسوڑ : ارے بھئی تم کہنا کہ وہ لفافے دیجیے جو پیسے پیسے میں بکتے ہیں۔ جا جھٹ سے کتے کی چال جانا اور بلی کی چال آنا۔

روشن : اجی مجھ سے کہیے تو میں گدھے کی چال جاؤں اور بس کھوپڑے کی چال آؤں۔ مُل ڈاک والے مجھے پاگل بنائیں گے۔ بھلا آج تک کہیں پیسے میں لفافہ بکا ہے۔

ہنسوڑ : ابے تجھے اس حجت سے کیا واسطہ؟ ڈاک خانے تک جائے گا بھی یا یہیں بیٹھے بیٹھے دلیلیں کرے گا؟

روشن ڈاک خانے گیا اور پوسٹ کارڈ لے آیا۔ میاں ہنسوڑ جھپٹ کر قلم دوات لے آئے اور خط لکھنے بیٹھے۔ مگر پرانے زمانے کے آدمی تھے۔ تعریف کے اتنے لمبے لمبے جملے لکھنے شروع کیے کہ پوسٹ کارڈ بھر گیا اور مطلب خاک نہ نکلا۔ بولے اب کہاں لکھیں؟

آزاد : دو ٹپی باتیں لکھیے۔ آپ تو لگے لیاقت بگھارنے۔ دوسرا لیجیے۔

ہنسوڑ نے دوسرا پوسٹ کارڈ لکھنا شروع کیا۔ 'جناب اب ہم تھوڑے میں بہت سا حال لکھیں گے۔ دیکھئے برا نہ مانیئے گا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ وہ بیگھے بھر کے آداب لکھے جائیں۔ وہ لمبی چوڑی دعائیں دی جائیں۔ وہ گھر کا کچا چٹھا کہہ سنانا اب رواج کے خلاف ہے۔ اب تو ہم نے قسم کھائی ہے کہ جب قلم اٹھائیں گے دس سطروں سے زیادہ نہ لکھیں گے۔ اس میں چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہوجائے۔ اب آپ بھی اس فیشن کو چھوڑ دیجیے۔' ارے یہ خط بھی گیا۔ اب تو تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں۔ لیجیے، بات کرتے کرتے دو پیسے کا خون ہوگیا۔ اس سے دو پیسے کا ٹکٹ لاتے تو کھرے کا کھرا لکھ ڈالتے۔

آزاد : میں دیکھوں تو آپ نے کیا لکھا ہے۔ واہ واہ اس پواڑے کا کچھ ٹھکانہ ہے۔

ارے صاحب مطلب سے مطلب رکھیے۔ بہت بیہودہ نہ بکیے۔ خیر اب تیسرا کارڈ لیجیے۔ مگر قلم کو روکے ہوئے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ پھر واہی تباہی لکھنے لگیں۔

ہنسوڑ : اچھا صاحب یوں ہی سہی، بس، خاص خاص باتیں ہی لکھوں گا۔

یہ کہہ کر انھوں نے یہ خط لکھا۔ جناب فضیلت مآب مولانا صاحب آپ یہ پیس لوچا لفافہ دیکھ کر گھبرائیں گے کہ یہ کیا حال ہے۔ ڈاک خانے والوں نے یہ نئی پھلجھڑی چھوڑی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں اس میں کتنی جگہ ہے۔ اگر مختصر نہ لکھوں تو کیا کروں۔ لکھنی تو بہت سی باتیں ہیں پر اس لفافے کو دیکھ کر سب آرزوئیں دل میں رہی جاتی ہیں۔ دیکھیے ابھی لکھا کچھ بھی نہیں، مگر کاغذ کو دیکھتا ہوں تو ایک طرف سب کا سب لکھ گیا۔ دوسری طرف لکھوں تو پکڑا جاؤں۔ لو صاحب یہ پوسٹ کارڈ بھی ختم ہوا۔ میاں آزاد یہ تینوں پیسے آپ کے نام لکھ گئے۔ آپ چاہے دیں ٹکا نہیں، لیکن صلاح آپ ہی نے دی تھی۔

آزاد : میں نے یہ کب کہا تھا کہ آپ خط میں اپنی زندگی کی داستان لکھ بھیجیں؟ یہ خط ہے یا رانڈ کا چرخہ؟ اتنے بڑے ہوئے ہیں، خط لکھنے کی لیاقت نہیں۔ سمجھا دیا سکھلا دیا کہ بس، مطلب سے مطلب رکھو۔ مگر تم کب ماننے لگے۔ خدا کی قسم تمھاری صورت سے نفرت ہوگئی۔ بس بے تکے پن کی حد ہوگئی۔

ہنسوڑ : واہ ری قسمت! تین پیسے گرہ سے گئے اور الو کے الو بنے۔ بھلا آپ ہی لکھیے تو جانیں۔ دیکھیں تو سہی آپ اس ذرا سے کاغذ پر کل مطلب کیوں کر لکھتے ہیں۔ اس کے لیے تو بڑا بھاری استاد چاہیے، جو پستے پر ہاتھی کی تصویر بنا دے۔

آزاد : آپ اپنا مطلب مجھ سے کہیے تو ابھی لکھ دوں۔

ہنسوڑ : اچھا سنئے مولوی ضامن علی آپ کی خدمت میں پہنچے ہوں گے ان کو وہ تیس روپے والا جگہ دلا دیجیے گا۔ آپ کا عمر بھر احسان ہوگا۔ بس اسی کو خوب بڑھا دیجیے۔

آزاد : پھر وہی جھک! بڑھا کیوں دوں؟ یہ نہ کہا کہ بس یہی میرا مطلب ہے، اس کو بڑھا دیجیے، لاؤ پوسٹ کارڈ دیکھو یوں لکھتے ہیں۔

'حضرت سلامت، مولوی ضامن علی پہنچے ہوں گے۔ وہ تیس روپے والا عہدہ ان کو دلوا دیجیے، تو احسان ہوگا۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔'

لو دیکھو اتنی سی بات کو اتنا بڑھایا کہ تین تین خط لکھے اور پھاڑے۔

ہنسوڑ : خوب، یہ تو اچھا دم کٹا خط ہے۔ اچھا اب پتا بھی لکھئے۔

آزاد نے سیدھا سادہ پتہ لکھ کر ہنسوڑ کو دکھلایا، تو آپ پوچھنے لگے۔ کیوں صاحب یہ تو شاید وہاں تک پہنچے ہی نہیں۔ کہیں اتنا ذرا سا پتہ لکھا جاتا ہے؟ اس میں میرا نام کہاں ہے؟ تاریخ کہاں ہے؟

آزاد : آپ کا نام بے وقوفوں کی فہرست میں ہے اور تاریخ ڈاک خانے میں۔

ہنسوڑ : اچھا لائیے، دو چار سطریں میں بھی بڑھا دوں۔

حضرت نے جو لکھنا شروع کیا تو پتے کی طرف بھی لکھ ڈالا۔ تھوڑے لکھنے کو بہت سمجھیے گا۔ آپ کا پرانا غلام ہوں، اب کچھ کرتے دھرتے نہیں بن پڑتی۔

آزاد : ہیں ہیں! غارت کیا نہ اس کو بھی؟

ہنسوڑ : کیوں، جگہ باقی ہے پورا پیسہ تو وصول کرنے دو۔

آزاد : جی پیسہ نہیں ایک آنہ وصول ہوگیا۔ ایک ہی طرف مطلب لکھا جاتا ہے، دوسری طرف صرف پتہ۔ آپ سے تو ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ کئی لڑکے اسکول سے نکلے۔ ان میں سے ایک بڑا شریر تھا۔ کسی پر دھپ جمائی، کسی کے چپت لگائی، کسی کے کان گرما دیے۔ اپنے سے ڈیوڑھے دونے تک کو چپتیاتا تھا۔ آزاد نے کہا۔ دیکھا یہ لونڈا کتنا بدمعاش ہے، اپنے سے دونے تک کی خبر لیتا ہے۔

ہنسوڑ : بھئی، خدا کے لیے اس کے منہ نہ لگنا۔ اس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔ یہ اسکول بھر میں مشہور ہے۔ حضرت دو دفعہ چوری کی علت میں دھرے گئے۔ ان کے مارے محلے بھر کا ناکوں دم ہے۔ ایک قصہ سنئے۔ ایک دفعہ حضرت کو شرارت کا شوق چرایا۔ پھر سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ فوراً سوجھتی ہے۔ شرارت تو اس کی خمیر میں داخل ہے۔ ایک پاؤں کا جوتا نکال کر حضرت نے ایک الماری پر رکھ دیا۔ جوتے کے نیچے ایک کتاب رکھ دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک لڑکے سے بولے، یار ذرا وہ کتاب اتارو، تو کچھ دیکھ داکھ لوں۔ نہیں تو ماسٹر صاحب بے طرح ٹھوکیں گے۔ سیدھا سادا لڑکا چپکے سے وہ کتاب اٹھانے گیا۔ جیسے کتاب اٹھائی ویسے ہی جوتی منہ پر آئی۔ سب لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ماسٹر صاحب انگریز تھے۔ بہت ہی جھلا کر پوچھا یہ کس کی جوتی کا پاؤں ہے؟ اب آپ بیٹھے چپ چاپ پڑھ رہے ہیں۔ گویا ان

سے کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ مگر ان کا تو درجہ بھر دشمن تھا۔ کسی لڑکے نے اشارے سے جڑ دی۔ ماسٹر نے آپ کو بلایا اور پوچھا ویل دوسرا پاؤں کہاں تمھارا؟ دوسرا پاؤں کدھر؟

لڑکا : پاؤں دونوں یہ ہیں۔

ماسٹر : ویل جوتی جوتی؟

لڑکا : جوتی کو کھاوے توتی۔

ماسٹر : بینچ پر کھڑا ہو۔

لڑکا : یہ سزا منظور نہیں، کوئی اور سزا دیجیے۔

ماسٹر : اچھا کل کے سبق کو سو بار لکھ لانا۔

لڑکا : واہ واہ اور سبق یاد کب کروں گا؟

ماسٹر : اچھا آٹھ آنا جرمانہ۔

دوسرے دن آپ آٹھ آنے لائے تو موٹے پیسے کھٹ کھٹ کر کے میز پر ڈال دیے۔ ماسٹر نے پوچھا اٹھنی کیوں نہیں لایا؟ بولے یہ شرط نہیں تھی۔

اسی طرح ایک بار ایک بھلے مانس کے یہاں کہہ آئے کہ تمھارے لڑکے کو اسکول میں ہیضہ ہوا ہے۔ ان کے گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ لڑکے کا باپ، چچا، بھائی، ماموں سب دوڑتے ہوئے اسکول پہنچے۔ عورتوں نے آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا۔ وہ لوگ جو اسکول گئے تو کیا دیکھتے ہیں لڑکا مزے سے گیند کھیلتا ہے۔ اجی اور کیا کہیں، اس نے اپنے باپ کو ایک بار نمک کے دھوکے میں پھٹکری کھلا دی اور اس پر طرہ یہ کہ کہا کیوں ابا جان کیسا گہرا چکما دیا۔

شام کے وقت بوڑھے میاں آزاد کے پاس آکر بولے۔ چلیے ادھر بجرا تیار ہے۔ آزاد تو ان کی تاک میں بیٹھے ہی تھے، ہنسوڑ کو لے کر ان کے ساتھ چل کھڑے ہوئے۔ ندی کے کنارے پہنچے تو دیکھا بجرے لہروں پر فراٹے سے دوڑ رہے ہیں۔ ایک درخت کے سائے میں چھپ کر یہ بہار دیکھنے لگے۔ ادھر ان دونوں حسینوں نے بجرے پر سے کنارے کی طرف دیکھا، تو آزاد نظر پڑے۔ شرم سے دونوں نے منھ پھیر لیے۔ لیکن کنکھیوں سے تاک رہی تھیں۔ یہاں تک کہ بجرا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد آزاد انھیں بوڑھے میاں کے ساتھ اس کوٹھی کی طرف چلے، جس میں دونوں لڑکیاں رہتی تھیں۔ قدم قدم پر شعر پڑھتے تھے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے تھے، اور سر

دھنتے تھے۔ حالت ایسی خراب تھی کہ قدم قدم پر ان کے گر پڑنے کا خوف تھا۔ ہنسوڑ نے جو یہ کیفیت دیکھی تو جھپٹ کر میاں آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور سمجھانے لگے۔ اس رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ آخر یہ تو سوچو کہ کہاں جا رہے ہو؟ وہاں تمھیں کوئی پہچانتا بھی ہے؟ مفت میں شرمندہ ہونے کی کیا ضرورت؟

آزاد : بھئی اب تو یہ سر ہے اور وہ در۔ بس آزاد ہے اور ان بتوں کا کوچہ۔

ہنسوڑ : یہ محض نادانی ہے۔ یہی حماقت کی نشانی ہے۔ میری بات مانو بوڑھے میاں کو پھنساؤ کچھ چٹاؤ پھر ان کی صلاح کے مطابق کام کرو، بے سمجھے بوجھے جانا اور اپنا سا منھ لے کر واپس آنا حماقت ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی کوٹھی کے قریب پہنچے۔ دیکھا بوڑھے میاں ان کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ آزاد نے کہا حضرت اب تو آپ ہی راستہ دکھائیں، تو منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ ورنہ اپنا تو حال خراب ہے۔

بوڑھے میاں : بھئی ہم تمھارے سچے مددگار اور پکے طرف دار ہیں۔ اپنی طرف سے تمھارے لیے کوئی بات اٹھا نہ رکھیں گے۔ لیکن یہاں کا بابا عالم ہی نرالا ہے۔ یہاں پرندوں کے پر جلتے ہیں۔ ہوا کا بھی گزر ہونا مشکل ہے۔ مگر دونوں میری گود کی کھلائی ہوئی ہیں، موقع پاکر آپ کا ذکر ضرور کروں گا۔ مشکل یہی ہے کہ ایک اونچے گھر سے پیغام آیا ہے ان کی ماں کو شوق چرایا ہے کہ وہیں بیاہ ہو۔

آزاد : یہ تو آپ نے بری خبر سنائی! قسم خدا کی میری جان پر بن جائے گی۔

بوڑھے میاں : صبر کیجیے، صبر! دل کو ڈھارس دیجیے۔ اب اس وقت جائیے صبح آئیے گا۔

آزاد رخصت ہونے ہی والے تھے تو کیا دیکھتے ہیں! دونوں بہنیں جھروکھوں سے جھانک رہی ہیں۔ آزاد نے یہ شعر پڑھا۔

ہم یہی پوچھتے پھرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بگڑ جاتی ہے کیا کرتے ہیں

جھروکھوں میں سے آواز آئی۔

جینا بھی آ گیا مجھے مرنا بھی آ گیا
پہچاننے لگا ہوں تمھاری نظر کو میں

اتنا سننا تھا کہ میاں آزاد کی آنکھیں مارے خوشی کے ڈبڈبا آئیں۔ جھروکھے کی طرف پھر جو تاکا تو وہاں کوئی نہ تھا۔ چکرائے کہ کس نے یہ شعر پڑھا۔ چھلاوا تھا، ٹونا تھا، جادو تھا، آخر تھا کیا؟ اتنے میں بوڑھے میاں نے اشارے سے کہا کہ بس اب جاؤ اور تڑکے آؤ۔

دونوں دوست گھر کی طرف چلے، تو میاں ہنسوڑ نے کہا: حضرت خدا کے واسطے میرے گھر پر کود پھاند نہ کیجیے گا، بہت شعر نہ پڑھیے گا، کہیں میری بیوی کو خبر ہوگئی تو جینا مشکل ہوجائے گا۔

آزاد: کیا بیوی سے آپ اتنا ڈرتے ہیں! آخر خوف کاہے کا؟

ہنسوڑ: آپ کو اس جھگڑے سے کیا مطلب؟ وہاں ذرا بھلے آدمی کی طرح بیٹھیے گا یہ نہیں کہ غل مچانے لگے۔ جو سنے گا وہ سمجھے گا کہ کہاں سے شہدے جمع ہوگئے ہیں۔

آزاد: سمجھ گیا آپ بیوی کے غلام ہیں۔ مگر ہمیں اس سے کیا واسطہ۔ آم کھانے سے مطلب کہ پیڑ گننے سے؟

دونوں آدمی گھر پہنچے تو لونڈی نے اندر سے آکر کہا۔ بیگم صاحبہ آپ کو کوئی بیس بیر پوچھ چکی ہیں۔ چلیے بلاتی ہیں۔ میاں ہنسوڑ نے ڈیوڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ ان کی بیوی نے آڑے ہاتھوں ہی لیا۔ یہ دن دن بھر آپ کہاں غائب رہنے لگے؟ اب تو آپ بڑے سیلانی ہوگئے۔ صبح کو نکلے نکلے شام کو خبر لی۔ چلو میرے سامنے سے جاؤ آج کھانا وانا خیر صلاح ہے۔ حلوائی کی دکان پر دادا جی کا فاتحہ پڑھو، تندوری روٹیاں اڑاؤ۔ یہاں کسی کو کتے نے نہیں کاٹا کہ وقت بے وقت چولہے کا منہ کالا کیا جائے۔ بھلے آدمی دو ایک گھڑی کے لیے کہیں گئے تو گئے یہ نہیں کہ دن دن بھر پتا ہی نہیں۔ اچھے ہتھکنڈے سیکھے ہیں۔

ہنسوڑے نے چپکے سے کہا: ذرا آہستہ آہستہ باتیں کرو باہر ایک بھلا مانس ٹکا ہوا ہے۔ اتنی بھی کیا بے حیائی؟

اس پر وہ چمک کر بولی۔ بس بس زبان نہ کھلواؤ بہت۔ تمھیں جو دوست ملتا ہے وہی گ... سوار، جس کے گھر نہ دوار، جانے کہاں کے الفتی ان کو مل جاتے ہیں، کبھی کسی شریف آدمی سے دوستی کرتے نہیں دیکھا۔ چلیے اب دور ہوجایئے نہیں ہم بری طرح پیش آئیں گے۔ مجھ سے برا کوئی نہیں۔

میاں ہنسوڑ بیچارے کی جان عذاب میں کہ گھر میں بیوی کوسنے سنا رہی ہے باہر میاں

آزاد آڑے ہاتھوں لیں گے کہ آپ کی بیوی نے تو خیر آپ کو جو کچھ کہا وہ کہا ہی تھا مجھے کیوں لے ڈالا؟ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟ اپنا سا منہ لے کر باہر چلے آئے اور آزاد سے کہا یار آج روزے کی نیت کرلو۔ بیوی جان فوجداری پر آمادہ ہیں۔ بات ہوئی اور تنک گئیں۔ مہینوں ہی روٹھی رہتی ہیں۔ مگر کیا کروں، امیر کی لڑکی ہے، نہیں تو میں ایک جھلا ہوں۔ مجھے یہ مزاج کہاں پسند۔ اس لیے بھئی آج فاقہ ہے۔

آزاد : فاقہ کریں آپ کے دشمن، چلیے کسی نان بائی حلوائی کی دکان پر مزے سے کھانا کھائیں۔

ہنسوڑ : ارے یار اتنے ہی ہوتے تو پھر بیوی کی کیوں سنتے، ٹکا پاس نہیں حلوائی کیا ہمارا ماموں ہے؟

آزاد : اس کی فکر نہ کیجیے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیے اور مزے سے مٹھائی چکھیے۔ وہ تدبیر سوجھی ہے کہ کبھی پٹ کی ہی نہ پڑے۔

دونوں آدمی بازار پہنچے۔ آزاد نے راستے میں ہنسوڑ کو سمجھا بجھا دیا۔ ہنسوڑ تو حلوائی کی دکان پر گئے اور آزاد ذرا پیچھے رہ گئے۔ ہنسوڑ نے جاتے ہی جاتے حلوائی سے کہا میاں آٹھ آنے کے پیسے دو اور آٹھ آنے کی پچ میل مٹھائی۔ حلوائی نے تازی تازی مٹھائی تول دی اور آٹھ آنے پیسے بھی گن دیے۔ ہنسوڑ نے پیسے تو گانٹھ میں باندھے اور مٹھائی اسی کی دکان پر چکھنے لگے۔ اتنے میں میاں آزاد بھی پہنچے اور بولے بھئی لالہ ذرا ہمیں بیسن کے لڈو تو ایک روپے کے تول دینا۔ اس نے ایک روپے کے بیسن لڈو تول کر چنگیر ان کے ہاتھ میں دی۔ اتنے میں میاں ہنسوڑ نے لکڑی اٹھائی اور اپنی راہ چلے۔ حلوائی نے للکارا میاں چلے کہاں؟ پہلے روپے تو دیتے جاؤ۔

ہنسوڑ! روپیہ اچھا مذاق ہے! ابے، کیا تو نے روپے نہیں پایا۔ یہاں پہلے روپیہ دیتے ہیں، پیچھے سودا لیتے ہیں۔ اچھے ملے! کیا دو دو دفعہ روپے لوگے؟ کہیں میں تھانے میں رپٹ نہ لکھوا دوں! مجھے بھی کوئی گنوار سمجھے ہو۔ ابھی چہرہ شاہی دے چکا ہوں۔ اب کیا کسی کا گھر لے گا؟

اب حلوائی اور ہنسوڑ میں تکرار ہونے لگی۔ بہت سے آدمی جمع ہوگئے کوئی کہتا ہے، لالہ گھاس تو نہیں کھا گئے ہو کوئی کہتا ہے میاں ایک روپے کے لیے نیت ڈانواڈول نہ کرو، ایمان

سلامت رہے گا تو بہت روپے ملیں گے۔

آزاد : لالہ، کہیں اسی طرح میرا بھی روپیہ نہ بھول جانا۔

حلوائی : کیا، آپ کا روپیہ؟ آپ نے روپے کس کو دیا؟

اب جو سنتا ہے، وہی حلوائی ہی کو الو بناتا ہے۔ لوگوں نے بہت کچھ لعنت ملامت کی کہ شریف آدمی کو بے عزت کرتے ہو۔ اتنے میں اس حلوائی کا بڈھا باپ آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ پوچھا، کیا ماجرا ہے؟ کیا دوکان لٹ گئی؟ ایک بگڑے دل نے کہا اجی، لٹ تو نہیں گئی، مگر اب تمھاری دکان کی ساکھ جاتی رہی۔ ابھی ایک بھلے مانس نے کھن سے روپے پھینکا، اب کہتا ہے کہ ہم نے روپیہ پایا ہی نہیں۔ اس کو چھوڑو تو دوسرے شریف کا دامن پکڑ لیا کہ تم نے روپے نہیں دیا۔ حالانکہ وہ بے چارے سیکڑوں قسمیں کھاتے ہیں کہ میں دے چکا ہوں۔ حلوائی بڑا تیکھا بڈھا تھا، سنتے ہی آگ ہو گیا۔ جھلا کر اپنے لڑکے کی کھوپڑی پر تان کے ایک چپت لگائی اور بولا۔ کہتا ہوں کہ بھنگ نہ کھایا کر، مانتا ہی نہیں جا کر بیٹھ دوکان پر۔

میاں آزاد اور ہنسوڑ نے مزے سے ڈیڑھ روپے کی مٹھائی باندھ لی، اور آٹھ آنے کے پیسے گھاتے میں۔ جب گھر پہنچے تو خوب مٹھائی چکھی۔ بچی بچائی اندر بھیج دی۔ ہنسوڑ نے کہا یار اسی طرح کہیں سے روپے دلواؤ تو جانیں۔ آزاد نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے؟ ابھی چلو، مگر کسی سے مانگ موںگ کر کچھ اشرفیاں باندھ لو۔ میاں ہنسوڑ نے اپنے ایک دوست سے شام کو لوٹا دینے کے وعدے پر کچھ اشرفیاں لیں۔ دونوں نے روشن علی کو ساتھ لیا اور بازار چلے۔ پہلے ایک مہاجن کو اشرفیاں دکھائیں اور پرکھوائیں۔ بیچتے ہیں، کھری کھوٹی دیکھ لیجیے۔ مہاجن نے ان کو خوب کسوٹی پر کسا اور کہا انیس کے حساب سے لیں گے۔تب ہنسوڑ دوسری دکان پر پہنچے۔ وہاں بھی اشرفیاں گنوائیں اور پرکھوائیں۔ اس کے بعد آزاد نے تو اشرفیاں لے کر گھر کی راہ لی اور میاں ہنسوڑ ایک کوٹھی میں پہنچے۔ وہاں کہا کہ ہم کو دو سو اشرفیاں خریدنی ہیں۔ مہاجن نے دیکھا آدمی شریف ہے، فوراً دو سو اشرفیاں ان کے سامنے ڈھیر کر دیں۔بیس روپے کی در بتائی۔ ہنسوڑ نے مہاجن کے منیم سے ایک پرچے پر حساب لکھوایا اور اشرفیاں باندھ کر کوٹھی کے باہر پہنچے۔ غل مچا ہائیں ہائیں لینا لینا کہاں کہاں! میاں ہنسور پینترا بدل سامنے کھڑے ہوگئے۔ بس دور سے ہی بات چیت ہو۔ سامنے آئے اور میں نے ٹلا ہاتھ دیا۔

مہاجن : اے صاحب روپے تو دیجیے؟

ہنسوڑ : کیسے روپے؟ ہم نہیں بیچتے۔

مہاجن : کیا کہا، نہیں بیچتے؟ کیا اشرفیاں آپ کی ہیں؟

ہنسوڑ : جی، اور نہیں تو کیا آپ کے باپ کی ہیں؟ ہم نہیں بیچتے، آپ کا اجارہ ہے کچھ؟ آپ ہیں کون زبردستی کرنے والے؟

اتنے میں آزاد بھی وہاں آ پہنچے۔ دیکھا تو مہاجن اور ان کے منیم جی گل مچا رہے ہیں تم اشرفیاں لائے کب تھے؟ اور ہنسوڑ کہہ رہے ہیں، ہم نہیں بیچتے۔ سیکڑوں آدمی جمع تھے۔ پولس کا ایک جمعدار بھی آ موجود ہوا۔

جمعدار : یہ کیا جھگڑا ہے لالہ چنالال؟ وہ نہیں بیچتے تو زبردستی کیوں کرتے ہو؟ اپنے مال پر سب کو اختیار ہے۔

مہاجن : اچھی پنچایت کرتے ہو جمعدار! یہاں چار ہزار روپے پر پانی پھرا جاتا ہے آپ کہتے ہیں جانے بھی دو۔ یہ اشرفیاں تو ہماری ہیں۔ یہ میاں خریدنے آئے تھے، ہم نے گن دی۔ بس باندھ بوندھ کر چل کھڑے ہوئے۔

ایک آدمی : واہ بھلا کوئی بات بھی ہے! یہ اکیلے آپ دس، جو ایسا ہوتا تو یہ کوٹھی کے باہر بھی آنے پاتے؟ آپ سب مل کر ان کا اچار نہ نکال لیتے؟ اتنے بڑے مہاجن، اور دو سو اشرفیوں کے لیے ایمان چھوڑ دیتے ہو۔

جمعدار : بری بات!

ہنسوڑ : دیکھیے آپ بازار بھر میں بھی دریافت کر لیں کہ ہم نے کتنی دوکانوں میں یہ اشرفیاں دکھلائیں اور پرکھوائیں ہیں؟ بازار بھی گواہ ہے، کچھ ایک دو آدمی وہاں تھوڑے تھے؟ اس کو بھی جانے دیجیے۔ یہ پرچہ پڑھیے۔ اگر یہ بیچتے ہوتے تو بیس کی در سے حساب لگاتے، یا ساڑھے انیس سے؟ مفت میں ایک شریف کے پیچھے پڑے ہیں، لینا ایک نہ دینا دو۔

آخر یہ طے ہوا کہ بازار میں چل کر تحقیقات کی جائے۔ میاں ہنسوڑ، ساہوکار، ان کے منیم، جمعدار اور تماشائی سب مل کر بازار چلے۔ وہاں تحقیقات کی تو دلالوں اور دکانداروں نے گواہی دی کہ بے شک ان کے پاس اشرفیاں تھیں اور انھوں نے پرکھوائیں بھی تھیں۔ ابھی ابھی یہاں سے گئے تھے۔

جمعدار : لالہ صاحب، اب خیر اسی میں ہے کہ چپکے رہیے، نہیں تو بے ڈھب ٹھہرے گی۔ آپ کی ساکھ جائے گی اور منیم کی شامت آ جائے گی۔

مہاجن : کیا اندھیر ہے! چار ہزار روپیوں پر پانی پڑ گیا، اتنے روپے کبھی عمر بھر میں نہیں جمع کیے تھے، اور جو ہے ہمیں کو الو بناتا ہے۔ خیر صاحب، لیجیے ہاتھ دھوئے۔

دونوں آدمی گھر پہنچے تو باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ جاتے ہی دو سو اشرفیاں کھن کھن کر کے ڈال دیں۔

آزاد : دیکھو یوں لاتے ہیں۔ اب یہ اشرفیاں ہماری بھابھی جان کے پاس رکھو۔

ہنسوڑ : بھئی، تم ایک ہی استاد ہو، آج سے میں تمھارا شاگرد ہو گیا۔

آزاد : لے، بھابھی سے تو خوشخبری کہہ دو۔ بہت منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔

میاں ہنسوڑ نے گھر میں جا کر کہا، کہاں ہو! کیا سو رہیں؟

بیوی : کیا کمائی کر کے لائے ہو ڈپٹ رہے ہو؟

ہنسوڑ : (اشرفیاں کھنکا کر) لو، ادھر آؤ، بہت مزاج نہ کرو۔ یہ لو دس ہزار روپے کی اشرفیاں۔

بیوی : یہ بتے کسی اور کو دیجیے گا! یہ تو وہی ہیں جو ابھی مرزا کے یہاں سے منگوائی تھیں۔

ہنسوڑ : وہ یہ ہیں، ادھر۔

بیوی : دیکھوں (کھلکھلا کر) کسی کے یہاں پھاندے تھے کیا؟ آخر لائے کس کے گھر سے؟ بس، چپکے سے ہمارے صندوقچے میں رکھ دو۔

ہنسوڑ : کیوں نہ ہو، مار کھائیں غازی میاں، مال کھائیں مجاور۔

بیوی : سچ بتاؤ، کہاں مل گئیں؟ تمھیں ہماری قسم!

ہنسوڑ : یہ انھیں کی کرامات ہیں، جنھیں تم شہدا اور لچّا بناتی تھیں۔

بیوی : میاں، ہمارا قصور معاف کرو۔ آدمی کی طبیعت ہمیشہ ایک سی تھوڑے ہی رہتی ہے۔ میں تو تمھاری لونڈی ہوں۔

آزاد : (باہر سے) ہم بھی سن رہے ہیں بھابھی صاحب! ابھی تو آپ نے ہمارے بھائی بیچارے کو ڈپٹ لیا تھا، گھر سے باہر کر دیا تھا، ہم کو جو گالیاں دیں سو گھاتے میں۔ اب

جو اشرفیاں دیکھیں تو پیاری بیوی بن گئیں۔ اب ان کے کان نہ گرمایئے گا، یہ بیچارے بے باپ کے ہیں۔

بیوی نے اندر سے کہا: آپ ہمارے مہمان ہیں۔ آپ کو کیا کہوں آپ کی ہنسی سر آنکھوں پر۔

(24)

بڑی بیگم صاحبہ پرانے زمانے کی رئیس زادی تھیں، ٹونے ٹوٹکے میں انھیں پورا وشواس تھا۔ بلی اگر گھر میں کسی دن آ جائے تو آفت ہوجائے۔ الّو بولا اور ان کی جان نکلی۔ جوتے پر جوتا دیکھا اور آگ ہوگئیں۔ کسی نے سیٹی بجائی اور انھوں نے کوسنا شروع کیا۔ کوئی پاؤں پر پاؤں رکھ کر سویا اور آپ نے للکارا۔ کتا گلی میں رویا اور ان کا دم نکل گیا۔ راستے میں کانا ملا اور انھوں نے پالکی پھیر دی۔ تیلی کی صورت دیکھی اور خون سوکھ گیا۔ کسی نے زمین پر لکیر بنائی اور اس کی شامت آئی۔ راستے میں کوئی ٹوک دے، تو اس کے سر ہو جاتی تھیں۔ ساون کے مہینے میں چارپائی بنوانے کی قسم کھائی تھی۔ جب دیکھا کہ لڑکیاں سیانی ہوگئیں تو شادی کی فکر ہوئی۔ اونچے اونچے گھروں سے پیغام آنے لگے۔ بڑی لڑکی حسن آرا کی شادی ایک رئیس کے لڑکے سے طے ہوگئی۔ حسن آرا پڑھی لکھی عورت تھی۔ اسے یہ کب منظور ہوسکتا تھا کہ بنا دیکھے بھالے شادی ہوجائے۔ جس کی صورت خواب میں بھی نہیں دیکھی، جس کی لیاقت اور عادت کی ذرا بھی خبر نہیں اس کے ساتھ ہمیشہ کے لیے باندھ دی جاؤں گی۔ سہیلیاں تو اسے مبارک باد دیتی تھیں اور اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ یا خدا کس سے اپنے دل کا درد کہوں؟ بولوں تو اڑوس پڑوس کی عورتیں طعنہ دیں کہ یہ لڑکی سوار کو کھڑے کھڑے گھوڑے پر سے اتار لے۔ دل ہی دل میں بیچاری کڑھنے لگی۔ اپنی چھوٹی بہن سپہر آرا سے اپنا دکھ کہتی تھی اور دونوں بہنیں گلے مل کر روتی تھیں۔

ایک دن دونوں بہنیں بیٹھی ہوئی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ اس میں ایک شریر لڑکے کی داستان چھپی ہوئی تھی، پڑھنے لگیں۔

'یہ حضرت دو بار قید بھی رہ چکے ہیں، اور افسوس تو یہ ہے کہ ایک رئیس کے صاحب زادے ہیں۔ پرسوں رات کو آپ نے یہ شرارت کی کہ ایک رئیس کے یہاں کودے اور کوٹھری کا تالہ

توڑ کر اندر گھسنے لگے۔ مہاجن کی لڑکی نے جو آہٹ پائی تو کلبلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ماں کو جگایا۔ ذری جا گو تو بلی نے تیل کا گھڑا گرا دیا، بل بل! اس کی ماں گڑبڑا کر جو اٹھی تو آپ کوٹھری کے باہر ایک چارپائی کے نیچے دبک رہے۔ اس نے اپنے لڑکے کو جگایا۔ وہ جوان لات ٹھوک کر چارپائی پر سے کودا، چور کا کلیجہ کتنا۔ آپ چارپائی کے نیچے سے گھبرا کر نکلے۔ مہاجن کا لڑکا بھی ان کی طرف جھپٹ پڑا اور انھیں اٹھا کر دے مارا۔ تب اس بدمعاش نے کمر سے چھری نکالی اور اس مہاجن کے پیٹ میں بھونک دی۔ آنا فانا جان نکل گئی۔ پڑوسی اور چوکیدار دوڑ پڑے اور اس شریف زادے کو گرفتار کر لیا۔ اب وہ حوالات میں ہے۔ افسوس کی بات تو یہ کہ اس کی شادی نواب فرید وجنگ کی لڑکی سے قرار پائی تھی جس کا نام حسن آرا ہے۔'

یہ لیکھ پڑھ کر حسن آرا آٹھ آٹھ آنسو رونے لگی۔ اس کی چھوٹی بہن اس کے گلے سے چمٹ گئی اور اس کو بہت کچھ سمجھا بجھا کر اپنی بوڑھی ماں کے پاس گئی۔ اخبار دکھا کر بولی، دیکھیے کیا غضب ہوگیا تھا، آپ نے بے دیکھے بھالے شادی منظور کر لی تھی۔ بوڑھی بیگم نے یہ حال سنا تو سر پیٹ کر بولی، بیٹی آج تڑکے جب میں پلنگ سے اٹھی تو پٹ سے کسی نے چھینکا اور میری بائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی۔ اسی دم پاوں تلے مٹی نکل گئی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ آج کچھ اسگن ہوگا۔ چلو اللہ نے بڑی خیر کی۔ حسن آرا کو میری طرف سے چھاتی سے لگاؤ اور کہہ دو کہ جسے تم پسند کرو اسی کے ساتھ نکاح کر دوں گی۔

سپہرآرا اپنی بہن کے پاس آئی تو باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ آتے ہی بولی، لو بہن اب تو منہ مانگی مراد پائی؟ اب اداس کیوں بیٹھی ہو؟ خدا قسم وہ خوشخبری سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔

حسن آرا: اے ہے، تو کچھ کہوگی بھی! یہاں کیا جانے اس وقت کس غم میں بیٹھے ہیں، یہ خوشی کا کون موقع ہے؟

سپہرآرا: اے واہ، ہم یوں بتا چکے۔ بنا مٹھائی لیے نہ بتاویں گے۔ اماں جان نے کہہ دیا کہ آپ جس کے ساتھ جی چاہے شادی کرلیں۔ وہ اب دخل نہ دیں گی۔ ہاں شریف زادہ اور کلے ٹھلے کا جوان ہو۔

حسن آرا: خوبصورتی عورتوں میں دیکھی جاتی ہیں، مردوں کو اس سے کیا کام؟ ہاں کالا کلوٹا نہ ہو، بس۔

سپہر آرا: یہ آپ کیا کہتی ہیں؟ 'آدمی آدمی انتر، کوئی ہیرا کوئی کنکر' کیا چاند میں گرہن لگاؤ گی؟

حسن آرا: اے تو سوت نہ کپاس، کوری سے لٹھم لٹھا۔

اتنے میں بوڑھے میاں پیر بخش نے آواز دی' بیٹی کہاں ہو، میں بھی آؤں؟

سپہر آرا: آؤ، آؤ، تمھاری ہی تو کسر تھی۔ آج سویرے سویرے کہاں تھے؟ کل تو بجرا ایسا ڈانواڈول ہوتا تھا، جیسے تنکا بہا چلا جاتا ہے۔ کلیجہ دھک دھک کرتا تھا۔

پیر بخش: تم سے کچھ کہنا ہے بیٹی! دیکھو، تم ہماری پوتیوں سے بھی چھوٹی ہو۔ تم دونوں کو میں نے گودیوں کھلایا ہے، اور تمھاری ماں ہمارے سامنے بیاہ آئی ہیں۔ تم دونوں کو میں اپنے بیٹے سے زیادہ چاہتا ہوں۔ میں جو کہوں اسے کان لگا کر سننا۔ تم اب سیانی ہوئیں، اب مجھے تمھاری شادی کی فکر ہے۔ پہلے تم سے صلاح لے لوں، تو بیگم صاحب سے عرض کروں۔ یوں تو کوئی لڑکی آج تک بن بیاہی نہیں رہی، لیکن ور انھی لڑکیوں کو اچھا ملتا ہے جو خوش نصیب ہیں۔ تمھاری ماں ہیں پرانی لکیر کی فقیر، مگر یہ میرا ذمہ کہ جسے تم پسند کرو اسے وہ بھی منظور کرلیں گی۔ آج کل یہاں ایک شریف نوجوان آکر ٹھہرے ہیں۔ صورت شاہزادوں کی سی، عادت فرشتوں کی سی، چلن بھلے مانسوں کا سا، بدن چھرہرا، داڑھی مونچھ کا نام نہیں۔ ابھی اٹھتی جوانی ہے۔ شعر کہنے میں، بول چال میں، علم و کمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ تصویر ایسی کھینچیں کہ بول اٹھے۔ بانک پٹے میں اچھے اچھے بانکوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ ان کی نس نس میں خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ اگر حسن آرا کے ساتھ ان کا نکاح ہوجائے تو خوب ہو۔ پہلے تم دیکھ لو، اگر پسند آئیں تو تمھاری ماں سے ذکر کروں۔ ہاں یہ وہی جوان ہیں جو بجرے کے ساتھ تم کو دیکھتے ہوئے باغ میں جارہے تھے۔ یاد آیا؟

حسن آرا: وہاں تو بہت سے آدمی تھے، کیا جانے کس کو کہتے ہو، بے دیکھے بھالے کوئی کیا کہے۔

سپہر آرا: مطلب یہ کہ دکھا دو۔ بھلا دیکھیں تو ہیں کیسے!

پیر بخش: ایسے جوان تو ہم نے آج تک کبھی دیکھے نہ تھے۔ وہ نور ہے کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ قسم خدا کی جو بات کرے ریجھ جائے۔

حسن آرا: ہم بتادیں جب ہم بجروں پر ہوا کھانے چلیں تو انھیں بھی وہاں لاؤ، ہم ان

کو دیکھ لیں تب تم اماں سے کہنا۔

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر میاں آزاد اپنے ہنسوڑ دوست کے ساتھ اسی کوٹھی کی طرف ٹہلتے چلے آ رہے تھے۔ راستے میں آٹھ دس گدھے ملے۔ گدھے والا ان سبوں پر کوڑے پھٹکار رہا تھا۔ آزاد نے کہا کیوں بھئی، آخر ان گدھوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے، جو پیٹتے جاتے ہو؟ کچھ خدا کا بھی خوف ہے، یا نہیں؟ گدھے والے نے اس کا تو کچھ جواب نہ دیا، گدھے ایک اور جمائی۔ تب تو میاں آزاد آگ ہو گئے۔ بڑھ کر گدھے والے کے کئی چانٹے لگائے۔ ابے آخر ان میں جان ہے یا نہیں؟ اگر نہ چلتے تو ہم کہتے خیر یوں ہی سہی خاصے جا رہے ہیں کھٹا کھٹ، اور آپ پیٹ رہے ہیں۔

ہنسوڑ: آپ کون ہوتے ہیں بولنے والے؟ اس کے گدھے ہیں، جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

آزاد: بھئی، ہم سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی بے زبان پر کوئی آدمی ظلم کرے اور ہم بیٹھے دیکھا کریں۔

کوئی دس ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ دیکھا ایک چڑی مار کنپے میں لاسا لگائے ٹڈی پر پتے جمائے چڑیوں کو پکڑتا پھرتا ہے۔ میاں آزاد آگ بھبھوکا ہو گئے۔ اتنے میں ایک طوطا جال میں آ پھنسا۔ تب تو میاں آزاد بوکھلا گئے۔ غل مچا کر کہا او چڑی مار، چھوڑ دے اس طوطے کو، ابھی ابھی چھوڑ۔ چھوڑتا ہے یا آؤں؟ چڑی مار ہکا بکا رہ گیا۔ بولا صاحب، یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔ آخر اس کو چھوڑ دیں، تو کریں پھر کیا؟ آزاد بولے بھیک مانگ، مزدوری کر، مگر یہ پیشہ چھوڑ دے۔ یہ کہہ کر آپ نے جھولا، کنپا، جال، سب چھین چھان لیا۔ جھولے کو جو کھولا تو سب جانور پھر سے اڑ گئے۔ اتنا ہی نہیں کنپے کو کاٹ کوٹ کر پھینکا، جال کو نوچ ناچ کر برابر کیا۔ تب جیب سے نکال کر دس روپے چڑی مار کو دیے اور بڑی دیر تک سمجھایا۔

ہنسوڑ: یار تم بڑے بے ڈھب آدمی ہو۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم سنک گئے ہو۔

آزاد: بھئی، تم سمجھتے ہی نہیں کہ میرا اصل مطلب کیا ہے؟

ہنسوڑ: آپ اپنا مطلب رہنے دیجیے۔ میرا آپ کا ساتھ نہ ہوگا۔ کہیں آپ کسی بگڑے دل سے بھڑ پڑے تو آپ کے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔

آزاد: اچھا غصے کو تھوک دیجیے، چلیے ہمارے ساتھ۔

ہنسوڑ: اب تو راستے میں نہ لڑ پڑیئے گا؟

آزاد : کہہ تو دیا کہ نہیں۔

دونوں آدمی آگے چلے، تو کیا دیکھتے ہیں، راہ میں ایک گاڑی بان بیل کی دم اینٹھ رہا ہے۔ آزاد نے للکارا۔ ابے او گاڑی بان، خبردار، جو آج سے بیل کی دم اینٹھی۔

ہنسوڑ : پھر وہی بات! اتنی جلدی بھول گئے؟

آزاد چپ ہوگئے۔ دونوں آدمی چپ چاپ چلنے لگے۔ تھوڑی دیر میں کوٹھی کے قریب جا پہنچے۔ یکا یک بوڑھے میاں پیر بخش آتے دکھائی دیے۔ علیک سلیک کے بعد باتیں ہونے لگیں۔

آزاد : کہیے اُدھر بھی گئے تھے؟

پیر بخش : ہاں صاحب، گیا کیوں نہ تھا۔ سویرے سویرے جا پہنچا اور آپ کی اتنی تعریف کی کہ پل باندھ دیے۔ اور پھر آپ جانیے، گو کہ بندہ عالم نہیں، فاضل نہیں، منشی نہیں، لیکن بڑے بڑے عالموں کی آنکھیں تو دیکھی ہیں، ایسے لچھے دار باتیں کیں کہ آپ کا رنگ جم گیا۔ اب آپ کو دیکھنے کو بے قرار ہیں۔ ہاں، ایک بری پخ یہ ہے کہ آپ کا امتحان لیں گی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کچھ پوچھ بیٹھیں اور آپ بغلیں جھانکنے لگیں۔

ہنسوڑ : بھئی، امتحان کا تو نام برا۔ شاید رہ گئے، تو پھر؟

آزاد : پھر آپ کا سر! رہ جانے کی ایک ہی کہی۔ امتحان کے نام سے آپ جیسے گوکھوں کی جان نکلتی ہے یا میری؟

پیر بخش : تو میں جا کر کہہ دوں کہ وہ آئے ہیں؟

یہ کہہ کر پیر بخش گھر میں گئے اور کہا وہ آئے ہیں، کہو تو بلا لاؤں؟

سپہر آرا نے کہا : اجنبی کا کھٹ سے گھر میں چلا آنا برا۔ پہلے ان سے کہیے چل کر باغ کی سیر کریں۔

پیر بخش باہر گئے اور میاں آزاد کو لے کر باغ میں ٹہلنے لگے۔ دونوں بہنیں جھروکھوں سے دیکھنے لگیں۔ سپہر آرا بولی بہن سچ مچ یہ تو تمھارے لائق ہیں۔ اللہ نے یہ جوڑی اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔

حسن آرا : اے واہ، کیسی نادان ہو! بھلا شادی بیاہ بھی یوں ہوا کرتے ہیں؟

سپہر آرا : میں ایک نہ مانوں گی۔

حسن آرا: مجھ سے کیوں جھگڑتی ہو، اماں جان سے کہو۔

سپہرآرا: اچھا تو میں اماں جان کے یہاں جاتی ہوں، مگر دیکھیے مکر نہ جائیے گا۔

یہ کہہ کر سپہرآرا بڑی بیگم کے پاس پہنچی اور آزاد کا ذکر چھیڑ کر بولے، اماں جان میں نے تو آج تک ایسا خوبصورت آدمی دیکھا ہی نہیں۔ شریف، ہنس مکھ اور پڑھے لکھے، آپ بھی ایک دفعہ دیکھ لیں۔

بڑی بیگم نے سپہرآرا کو چھاتی سے لگایا اور ہنس کر کہا تو مجھ سے اڑتی ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتی کہ سکھائی پڑھائی آئی ہوں۔

سپہرآرا: نہیں اماں جان، آپ انھیں ضرور بلائیں۔

بیگم: حسن آرا سے بھی پوچھا؟ وہ کیا کہتی ہے؟

سپہرآرا: وہ تو کہتی ہیں اماں جان جس سے چاہیں، اس سے کریں۔ مگر دل ان کا آیا ہوا ہے۔

بیگم: اچھا، بلوا لو۔

سپہرآرا وہاں سے لوٹی تو مارے خوشی کے اچھلی پڑتی تھی۔ فوراً پیر بخش کو بلا کر کہا۔ آپ میاں آزاد کو اندر لائیے۔ اماں جان انھیں دیکھنا چاہتی ہیں۔

ذرا دیر میں پیر بخش میاں آزاد کو لیے ہوئے بیگم کے پاس پہنچے۔

آزاد: آداب بجا لاتا ہوں۔

بیگم: جیتے رہو بیٹا! آؤ ادھر آ کر بیٹھو، مزاج تو اچھے ہیں؟ سپہرآرا تمھاری بڑی تعریف کرتی تھی، اور بے شک تم ہو اس لائق۔ تم کو دیکھ کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔

آزاد: آپ کی زیارت کا بہت دنوں سے شوق تھا۔ سچ ہے بڑے بوڑھوں کی کیا بات ہے۔

بیگم: کیوں بیٹا، ہاتھی کو خواب میں دیکھے تو کیسا؟

آزاد: بہت برا، مگر ہاں اگر ہاتھی کسی پر اپنی سونڈ پھیر رہا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی۔

بیگم: شاباش، تم بڑے لائق ہو۔

بیگم صاحب نے میاں آزاد کو بڑی دیر تک بٹھایا اور ساتھ ہی کھانا کھلایا۔ آزاد ہاں میں

ہاں ملاتے جاتے تھے اور دل ہی دل میں کھلکھلاتے تھے۔ جب شام ہوئی تو آزاد رخصت ہوئے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، تیز ہوا چل رہی تھی، مگر دونوں بہنوں کو بجرے پر سیر کرنے کی دھن سمائی۔ دریا کے کنارے آ پہنچیں۔ پیر بخش نے بجرا کھولا اور دونوں بہنوں کو بٹھا کر سیر کرانے لگے۔ بجرا بہاؤ پر پھراٹے سے بہا جاتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں، کالی کالی گھٹائیں، سپہر آرا کی پیاری پیاری باتیں، بوندوں کا گرنا، لہروں کا تھرکنا عجب بہار دکھاتا تھا۔ اتنے میں ہوا نے وہ زور باندھا کہ میڈھا اچھلنے لگا۔ اب بجرے کی یہ حالت ہے کہ ڈانواڈول ہورہا ہے۔ یہ ڈوبا وہ ڈوبا۔ پیر بخش تھا تو خراٹ، لیکن اس کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے، سیر دریا کی کہانیاں سب بھول گئے۔ دونوں بہنیں کانپنے لگیں۔ ایک دوسرے کو حسرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ دو کی دونوں رو رہی تھیں۔ میاں آزاد ابھی تک دریا کے کنارے ہی ٹہل رہے تھے۔ بجرے کو پانی میں چکر کھاتے دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ اتنے میں ایک دفعہ بجلی چمکی۔ سپہر آرا ڈر کر دوڑی مگر مارے گھبراہٹ کے ندی میں گر پڑی۔ ڈوبتے ہی پہلے غوطہ کھایا اور لگی ہاتھ پاؤں پھٹپھٹانے۔ ذرا دیر کے بعد پھر ابھری اور پھر غوطہ کھایا۔ آزاد نے یہ کیفیت دیکھی تو جھٹ پٹ کپڑے اتار کر دھم سے کود ہی تو پڑے۔ پہلی ڈبکی ماری تو سپہر آرا کے بال ہاتھ میں آئے۔ انھوں نے جھٹ سے زلف کو پکڑ کر کھینچا، تو وہ ابھری۔ یہ وہی سپہر آرا ہے جو کسی انجان آدمی کو دیکھ کر منہ چھپا لیتی اور پھرتی سے بھاگ جاتی تھی۔ میاں آزاد اسے ساتھ لیے ملاحی چیرتے اور کھڑی لگاتے بجرے کی طرف چلے۔ لیکن بجرا ہوا سے باتیں کرتا چلا جاتا تھا۔ پانی بلیوں اچھلتا تھا۔ آزاد نے زور سے پکارا او میاں پیر بخش، بجرا روکو، خدا کے واسطے روکو، پیر بخش کے ہوش و ہواس اڑے ہوئے تھے۔ بجرا خدا کی راہ پر جدھر چاہتا تھا جاتا تھا۔ میاں آزاد بہت اچھے تیراک تھے۔ لیکن برسوں سے عادت چھوٹی ہوئی تھی۔ دم پھول گیا۔ اتفاق سے ایک بھنور میں پڑ گئے۔ بہت زور مارا مگر ایک نہ چل سکی۔ اس پر ایک مصیبت یہ کہ سپہر آرا چھوٹ گئی۔ آزاد کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ پھر بڑی پھرتی سے جھپٹے، لاش کو ابھارا اور لاد کر لے چلے۔ مگر اب دیکھتے ہیں تو بجرے کا کہیں پتہ نہیں۔ دل میں سوچے بجرا ڈوب گیا اور حسن آرا لہروں کا لقمہ بن گئی۔ اب میں سپہر آرا کو لادے لادے کہاں تک جاؤں۔ لیکن دل میں ٹھان لی کہ چاہے بچوں چاہے ڈوبوں، سپہر آرا کو نہ چھوڑوں گا۔ پھر

چلائے۔ یارو کوئی مدد کو آؤ۔ ایک بڈھا آدمی کنارے پر کھڑا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ آزاد کو اس حالت میں دیکھ کر آواز دی۔ شاباش بیٹا، شاباش! میں ابھی آتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے کپڑے اتارے اور لنگوٹ باندھ کر دھم سے کود ہی تو پڑا۔ اس کی آواز سننا تھا کہ میاں آزاد کو ڈھارس ہوا، وہ تیزی کے ساتھ چلنے لگے۔ بڈھے آدمی نے دو ہی ہاتھ کھڑی کے لگائے تھے کہ سانس پھول گئی اور پانی نے اس زور سے تھپیڑا دیا کہ پچاس گز کے فاصلے پر ہوا۔ اب نہ آزاد کو وہ سوجھتا ہے اور نہ اس کو آزاد نظر آتے ہیں۔ ملاح نے بجرے پر سے بڈھے کو دیکھ لیا۔ سمجھا کہ میاں آزاد ہیں۔ پکارا ارے بھئی آزاد زور کرکے ادھر آؤ۔ بڈھے نے ہاتھ پیر مارے نہ جاسکا۔ تب پیر بخش نے ڈانڈ سنبھالے اور بڈھے کی طرف چلے۔ مگر افسوس دو چار ہی ہاتھ رہ گیا تھا کہ ایک مگر نے بھاڑ سا منہ کھول کر بڈھے کو نگل لیا۔ ملاح نے سر پیٹ کر رونا شروع کیا۔ ہائے آزاد، تم بھی جدا ہوئے۔ بیچاری سپہر آرا کا ساتھ دیا یہ آواز میاں آزاد کے کانوں میں بھی پڑی۔ سمجھے وہی بڈھا جو ٹیلے پر سے کودا تھا چلا رہا ہے۔ اتنے میں بجرا نظر آیا تو باغ باغ ہوگئے۔ اب یہ بالکل بے دم ہو چکے تھے۔ لیکن بجرے کو دیکھتے ہی ہمت بندھ گئی۔ زور سے کھڑی لگانی شروع کی۔ بجرے کے قریب آئے تو پیر بخش نے پہچانا۔ مارے خوشی کے تالیاں بجانے لگے۔ آزاد نے سپہر آرا کو بجرے میں لٹا دیا اور دونوں نے مل کر پیٹ سے پانی نکالا۔ پھر لٹا کر اپنے بیگ سے کوئی دوا نکالی اور اسے پلا دی۔ اب حسن آرا کی فکر ہوئی۔ وہ بیچاری بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ آزاد نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ تو ذرا ہوش آیا مگر آنکھیں بند۔ پیاری سپہر آرا کہاں ہے؟ آزاد جیتے بچے۔ پیر بخش نے پکار کر کہا آزاد تمھارے سرہانے بیٹھے ہیں اور سپہر آرا تمھارے پاس لیٹی ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ حسن آرا نے آنکھ کھولی اور آزاد کو دیکھ کر بولی آزاد میری جان اگر تم پر سے فدا ہو جائے تو اس وقت مجھے اس سے زیادہ خوشی ہو جتنا سپہر آرا کے بچ جانے سے ہوئی ہے۔ میں سچے دل سے کہتی ہوں مجھے تم سے سچی محبت ہے۔

اتنے میں دوا کا اثر جو پہنچا تو سپہر آرا بھی آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ دونوں بہنیں گلے مل کر رونے لگیں۔ حسن آرا بار بار آزاد کی بلائیں لیتی تھی۔ میں تم پر واری ہو جاؤں، تم نے آج وہ کیا جو دوسرا کبھی نہ کرتا۔ ہوا بندھ گئی تھی، بجرا آہستہ آہستہ کنارے پر آ لگا۔ آزاد نے گھاس پر لیٹ کر کہا اف مر مٹے۔

حسن آرا: بیشک سپہر آرا کی جان بچائی، میری جان بچائی، اس بیچارے بڈھے کی جان بچائی اس سے بڑھ کر اور اب کیا ہوگا۔

پیر بخش: میاں آزاد، خدا تم کو ایسا بڈھا کرے کہ تمھارے پڑپوتے مجھ سے بڑے ہوکر تمھارے سامنے کھیلیں۔ میں نے کچھ اور ہی سمجھا تھا۔ ایک آدمی تیرتا ہوا جاتا تھا میں نے سمجھا تم ہو۔

آزاد: ہاں ہاں میں تو اسے بھول ہی گیا تھا۔ پھر وہ کہاں گیا؟

پیر بخش: کیا کہوں، اس کو تو ایک مگر نگل گیا۔

آزاد: افسوس! کتنا دلیر آدمی تھا مجھے مصیبت میں دیکھ کر دھم سے کود پڑا۔

سپہر آرا: مجھ نصیبوں جلی کی وجہ سے اس بیچارے کی جان مفت میں گئی۔ میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا ہوا ہے۔ اس دریا کا ستیہ ناش ہوجائے۔ جس وقت میں اپنا گرنا اور غوطے لگانا یاد کرتی ہوں تو روئیں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ پہلے تو میں نے خوب ہاتھ پاؤں مارے مگر جب نیچے بیٹھ گئی تو منہ میں پانی جانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے منہ بند کرلیا۔ پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔

حسن آرا: بڑے گاڑھے وقت کام آئے۔

پیش بخش: اب آپ ذرا سو رہیے، تو تھکاوٹ کم ہوجائے گی۔

تینوں آدمی تھک کر چور ہوگئے تھے۔ وہیں ہری ہری گھاس پر لیٹے تو تینوں کی آنکھ لگ گئی۔ چار گھنٹے تک سوتے رہے۔ جب نیند کھلی تو گھر چلنے کی ٹھہری۔ پیر بخش نے کہا اس وقت بجرے پر سوار ہونا تو حماقت ہے۔ سڑک سڑک چلیں۔

آزاد: اجی تو کیا ہر دم طوفان آیا کرتا ہے؟

دونوں بہنوں نے کہا ہم تو اس وقت بجرے پر نہ چڑھیں گے، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہوجائے۔

آزاد نے کہا: جو اس وقت جھجک گئیں تو عمر بھر خوف لگتا رہے گا۔

حسن آرا: چلیے رہنے دیجیے، اب تو مارے تھکاوٹ کے آپ کے بدن میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی ہوگی کہ کسی کی لاش کو دو قدم بھی لے چلیے۔ نا صاحب بندی نہیں جانے کی۔ بجرے کی صورت دیکھنے سے بدن کانپتا ہے۔ ہم تمھیں بھی نہ جانے دیں گے۔

سپہرآرا: آپ بجرے پر بیٹھے اور ہم ادھر دریا میں پھاند پڑے۔

آخر یہ طے ہوا کہ پیر بخش بجرا لائیں اور تینوں آدمی اوپر اوپر گھر کی طرف چلیں۔

آزاد نے موقع پایا، تو بولے۔ اب تو ہم سے کبھی پردا نہ ہوگا؟ ہم آپ کو اپنا دل دے چکے۔ حسن آرا نے کچھ جواب نہ دیا، شرما کر سر جھکا لیا۔

رات بہت زیادہ بیت گئی تھی۔ آزاد پیر بخش کے ساتھ سوئے۔ صبح کو اٹھے تو کیا دیکھتے ہیں حسن آرا کے ساتھ ان کی دو پھوپیری بہنیں چھما چھم کرتی چلی آتی ہیں۔ ایک کا نام جہاں آرا تھا، دوسری کا گیتی آرا۔ دونوں بہنوں نے آزاد کو جھروکھے سے دیکھا۔ تب جہاں آرا حسن آرا سے بولی بہن تمھاری پسند کی میں قائل ہوگئی۔ ایسا بانکا جوان میری نظر سے نہیں گزرا۔

سپہرآرا: ہم کہتے نہ تھے کہ میاں آزاد سا طرح دار جوان کم ہوگا۔ پھر میری تو انھوں نے جان ہی بچائی ہے۔ جب تک جیوں گی تب تک ان کا دم بھروں گی۔

اتنے میں پیر بخش بھی آ پہنچے۔ جہان آرا نے ان سے کہا کیوں جی ان سن سے سفید بالوں میں خضاب کیوں نہیں لگاتے؟ اب تو کوئی دو سو سے اوپر ہوں گے۔ کیا مرنا بالکل بھول بیٹھے۔ تمھیں تو موت نے بھی سانڈ کی طرح چھوڑ دیا۔

پیر بخش: بیٹی، بہت کٹ گئی، تھوڑی باقی ہے۔ یہ بھی کٹ جائے گی۔ خضاب لگا کر رو سیاہ کون ہو۔

سپہرآرا: آزاد سے تو اب کوئی پردا ہے نہیں۔ انھیں بھی نہ بلا لیں؟

گیتی آرا: کبھی کی جان پہچان ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔

آزاد نے سامنے سے آ کر کہا۔ فقیروں سے بھی جان پہچان کی ضرورت؟ فقیروں سے کیسا پردہ؟

گیتی آرا: یہ فقیر آپ کب سے ہوئے؟

آزاد: جب سے حسینوں کی صحبت ہوئی۔

گیتی آرا: آپ شاعر بھی تو ہیں۔ اگر طبیعت حاضر ہو تو اس مصرعے پر ایک غزل کہیے۔

مرض عشق لا دوا دیکھا

آزاد : طبیعت کی تو نہ پوچھیے، ہر وقت حاضر رہتی ے۔ رہا دماغ، وہ اپنے میں نہیں۔
پھر بھی آپ کا حکم کیسے ٹالوں۔ سنئے :

شیخ، کعبے میں تونے کیا دیکھا
ہم بتوں سے ملے، خدا دیکھا
سوز نالہ نے کچھ اثر نہ کیا
ہم یہ ساز بھی بجا دیکھا
آہ نے میری کچھ نہ کام کیا
ہم نے یہ تیر بھی لگا دیکھا
ہر مرض کی دوا مقرر ہے
مرض عشق لا دوا دیکھا
شکل ناخون ہے گرچہ ابروئے یار
پر نہ اس کو گرہ کشا دیکھا
ہم نے دیکھا نہ عاشق آزاد
اور جو دیکھا تو مبتلا دیکھا

گیتی آرا : ماشاء اللہ کیسی حاضر طبیعت ہے!

آزاد : انصاف کے تو یہ معنی ہیں کہ میں نے آپ کو خوش کیا، اب آپ مجھ کو خوش کریں۔

گیتی آرا : آپ کچھ فرمائیں میں کوشش کروں گی۔

آزاد : یہ تو میری صورت سے ظاہر ہے کہ اپنا دل حسن آرا کو دے چکا ہوں۔

گیتی آرا : کیوں حسن آرا، مان کیوں نہیں جاتیں؟ یہ بیچارے تمھیں اپنا دل دے چکے۔

حسن آرا : واہ، کیا سفارش ہے! کیوں مان لیں، شادی بھی کوئی دل لگی ہے؟ میں بے سمجھے بوجھے ہاں نہ کروں گی۔ سنیے صاحب، میں آپ کی ادا، آپ کی وفا، آپ کی چال ڈھال، آپ کی لیاقت اور شرافت پر دل اور جان سے عاشق ہوں۔ مگر یہ یاد رکھیے، میں ایسا کام نہیں کرنا چاہتی جس سے پڑھی لکھی عورت بدنام ہوں۔ ہمیں ایسا چال چلن رکھنا چاہیے جو اوروں کے لیے نمونہ ہو۔ اس شہر کی سب عورتیں مجھے دیکھتی رہتی ہیں کہ یہ کس طرف کو جاتی

ہے۔ آپ کو کوئی یہاں جانتا نہیں۔ آپ پہلے یہاں شریفوں میں عزت پیدا کیجیے، آپ کے یہاں پندرھویں دن مشاعرہ ہو اور لوگ آپ کو جانیں۔ کوئی کوٹھی کرائے پر لیجیے اور اسے خوب سجائیے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ سلیقہ کا آدمی ہے اور روٹیوں کو محتاج نہیں۔ شریف زادوں کے سوا ایروں غیروں سے صحبت نہ رکھیے، اور ہر روز جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جایا کیجیے۔ لیکن دکھاوا بھی ضروری ہے۔ ایک سواری بھی رکھیے اور صبح شام ہوا کھانے جائیے، اگر ان باتوں کو آپ مانیں تو مجھے شادی کرنے میں عذر نہیں۔ یوں تو میں آپ کے احسان سے دبی ہوئی ہوں لیکن آپ سمجھ دار آدمی ہیں، اس لیے میں نے صاف صاف سمجھا دیا۔

آزاد : ایسے سمجھ دار ہونے سے باز آئے۔ ہم گنوار ہی سہی۔ آپ نے جو کچھ کہا، سب ہمیں منظور ہے، لیکن آپ بھی مجھے کبھی کبھی یہاں تک آنے کی اجازت دیجیے، اور آپ کی یہ بہنیں مجھ سے ملا کریں۔

گیتی آرا : ذری پھر تو کہیے گا! آپ کو اپنی حسن آرا سے کام ہے یا ان کی بہنوں سے؟ حسن آرا نے آپ سے جو کچھ کہا اس کو غور کیجیے۔ ابھی جلدی نہ کیجیے، آپ شراب تو نہیں پیتے؟

آزاد : شراب کی صورت اور نام سے نفرت ہے۔

حسن آرا : پھر آپ کے پاس بجرے پر کہاں سے آئی، جو آپ نے سپہر آرا کو پلائی۔

آزاد : واہ، وہ تو دوا تھی۔

جہان آرا : اے باجی، بھیا کب سے سو رہا ہے، ذرا جگا دو۔ دو گھڑی کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔

گیتی آرا : نہ، کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ بچے جب سوتے ہوں تو ان کو جگانا نہ چاہیے۔ ان کو جگانا ان کی باڑھ کو روکنا ہے۔

حسن آرا : اس وقت ہوا بڑے زور سے چل رہی ہے اور تم نے بھیا کو باریک شربتی پہنا دی ہے۔ اے دل بہار۔ فلالین کا کرتا نیچے پہنا دو۔ یہ روپیہ کون بھیا کے ہاتھ میں دے گیا؟ اور جو کھیلتے کھیلتے منہ میں لے جائے تو؟

دل بہار : اے حضور، چھین تو لوں جب وہ دے بھی۔ وہ تو رونے لگتا۔

حسن آرا : دیکھو، ہم کس ترکیب سے لے لیتے ہیں، بھلا روئے تو (چمکارکر) بھیا

(تالیاں بجا کر) بھیا لو تجھے چیز منگا دوں۔

یہ کہہ کر حسن آرا نے لڑکے کو گدگدایا۔ لڑکا ہنس پڑا اور روپیہ ہاتھ سے الگ۔

دل بہار: مُوسی کو کیسے چپ چپاتے روپیہ دے دیا اور ہم نے ہاتھ ہی لگایا تھا کہ غُل مچانے لگا۔

گیتی آرا: عمر بھر تم نے لڑکے پالے، مگر پالنا نہ آیا۔ بچوں کا پالنا کچھ ہنسی کھیل تھوڑے ہی ہے۔

دل بہار: ابھی میرا سن ہی کیا ہے کہ یہ باتیں جانوں۔

گیتی آرا: دیکھو، رات کو درخت کے تلے بچے کو نہ سلایا کرو۔ بچہ بیمار ہو جاتا ہے۔

دل بہار: ہاں، سنا ہے، لڑکے بھوت پریت کے جھپیٹ میں آ جاتے ہیں۔

حسن آرا: جھپیٹ اور بھوت پریت سب ڈھکوسلا ہے۔ رات کو درخت کے نیچے سونا اس لیے برا ہے کہ رات کو درخت سے زہریلی ہوا نکلتی ہے۔

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، عورتوں کی تعلیم کا ذکر چھڑا ہوا تھا، حسن آرا عورتوں کی تعلیم پر زور دے رہی تھی، ادھر میاں پیر بخش کو بال بنوانے کا شوق جو چرایا تو حجام کو بلوایا۔ حجام بال بناتے بناتے کہنے لگا۔ حضور ایک دن میں سرائے میں گیا تھا تو وہاں یہ بھی ٹکے ہوئے تھے یہی جو جوان سے ہیں گورے گورے، بجرے پر سیر کرنے گئے تھے یاں یاد آ گیا۔ میاں آزاد وہ بھی وہاں ملے۔ وہ صاحب تمھارے اس سرائے کی بھٹیاری سے شادی کرنے کو تھے مل پھر نکل گئے۔ اس نے ان پر نالش جڑ دی تو وہاں سے بھاگے۔ اس بھٹیاری کو اونٹ پر سوار کر کے رات کو لیے پھرتے تھے۔ پیر بخش نے قصہ سنا تو سناٹے میں آ گئے۔ بولے خبردار اور کسی سے نہ کہنا۔

(25)

میاں آزاد حسن آرا کے یہاں سے چلے، تو گھومتے گھامتے ہنسوڑ کے مکان پر پہنچے اور پکارا۔ لونڈی بولی کہ وہ تو کہیں گئے ہیں، آپ بیٹھیے۔

آزاد: بھابھی صاحبہ سے ہماری بندگی کہہ دو اور کہو، مزاج پوچھتے ہیں۔

لونڈی: بیگم صاحبہ سلام کہتی ہیں اور فرماتی ہیں کہ کہاں رہے؟

آزاد : ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔

لونڈی : وہ کہتی ہیں ہم سے نہ اڑئے۔ یہاں کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ کہیے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہے۔ یہ بجرے پر ہوا کھانا اور یہاں آکر بتے بتانا۔

آزاد : آپ سے یہ کون کچا چٹھا کہہ گیا؟

لونڈی : کہتی ہیں کہ مجھ سے بھی پردا ہے؟ اتنا تو بتادیجیے کہ برات کس دن چڑھے گی؟ ہم نے سنا ہے حسن آرا آپ پر بے طرح ریجھ گئیں۔ اور کیوں نہ ریجھیں، آپ بھی تو ماشاء اللہ گبرو جوان ہیں۔

آزاد : پھر بھائی کس کے ہیں، جیسے وہ خوبصورت، ویسے ہم۔

لونڈی : فرماتی ہیں کہ دھاندلی رہنے دیجیے۔

آزاد : بھابھی صاحب، یہ گھونگھٹ کیسا؟ ہم سے کیسا پردہ؟

اتنے میں کسی نے پیچھے سے میاں آزاد کی آنکھیں بند کر لیں۔

آزاد چلا اٹھے: بھائی صاحب

ہنسوڑ : وہاں تو آپ نے خوب رنگ جمایا۔

آزاد : اجی آپ کی دعا ہے، میں بھلا کیا رنگ جماتا۔ مگر دونوں بہنیں ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ حسن آرا کی دو بہنیں اور آئی تھیں۔ واللہ خوب مزے رہے۔

ہنسوڑ : خوش نصیب ہو بھائی، جہاں جاتے ہو وہیں پوبارہ ہوتے ہیں۔ واللہ مان گیا۔

آزاد : مگر بھائی ایک غلطی ہوگئی۔ انھوں نے کسی طرح بھانپ لیا کہ میں شراب بھی پیتا ہوں۔

ہنسوڑ : بڑے احمق ہو بھئی، کوئی ایسی حرکت کرتا ہے۔ تمھاری صورت سے نفرت ہوگئی۔

آزاد : اجی مجھے تو اپنی صورت سے آپ نفرت ہوگئی۔ مگر اب کچھ تدبیر تو بتاؤ؟

ہنسوڑ : اسی بڈھے کو سانٹو تو کام چلے۔

اس وقت دونوں آدمی کھانا کھاکر لیٹے۔ جب شام ہوئی تو دونوں حسن آرا کی طرف چلے۔ بھری برسات کے دن، کوئی گولی کے ٹپے پر گئے ہوں گے کہ پچھم کی طرف سے متوالی کالی گھٹا جھومتی ہوئی آئی اور دم کے دم چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ دوکاندار دوکانیں جھٹپٹ بند کرنے لگے۔ کھونچے والوں نے کھونچا سنبھالا، اور لمبے ہوئے۔ کوئی ٹٹو کو سونٹے پر سونٹے

لگاتا ہے کسی کا بیل دم دبائے بھاگا جاتا ہے۔ کہار پالکی اٹھائے، قدم جمائے اڑے جاتے ہیں، دہن جنگی، بائیں چرخا ہوں ہوں ہوں۔ پیدل چلنے والے تیز قدم اٹھاتے ہیں، پائچے چڑھاتے ہیں۔ کسی نے جوتیاں بغل میں دبائیں اور سرپٹ بھاگا۔ کسی نے کمر کسی اور گھوڑے کو ایڑ دی۔ اندھیرا اس غضب کا ہے کہ راہ سوجھتی ہی نہیں، ایک پر ایک بھد بھد کر کے گرتا ہے اور میاں آزاد قہقہے لگاتے ہیں۔ کیوں، حضرت پوچھنا نہ پاچھنا اور دھاک سے لڑھک جانا۔

آزاد : بس، اور تھوڑی دور رہ گیا ہے۔

ہنسوڑ : آپ کو تھوڑی دور ہوگا، یہاں تو قدم بھر چلنا مشکل ہو رہا ہے۔ ذرا دیکھ بھال کر قدم اٹھائیے گا۔ اف ہوا نے کیا زور باندھا میں تو واللہ کانپنے لگا۔ اگر صلاح ہو تو گھر پلٹ چلیں۔ وہ لیجیے، بوندیں بھی پڑنے لگیں۔ کسی بھلے مانس کے پاس جانے کا بھلا یہ کون موقع ہے۔

آزاد : اجی یہ باتیں اس سے کیجیے جو اپنے ہوش میں ہو۔ یہاں تو دیوانہ پن سوار ہے۔

اتنے میں بڑی بیگم کا محل نظر پڑا۔ آزاد نے مارے خوشی کے ٹوپی اچھال دی۔ تب تو ہنسوڑ نے بگڑ کر اسے ایک اندھے کوئیں میں پھینک دیا اور کہا بس تم میں یہی تو عیب ہے کہ اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ 'اوچھے کے گھر تیتر، باہر رکھوں کہ بھیتر'۔

آزاد :

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا لا کے دکھا دے دہن ایسا کمر ایسی

تم روکھے پھیکے آدمی، چہرے پر بھوسہ اڑ رہا ہے۔ تم یہ محبت کی باتیں کیا جانو؟

جب محل کے قریب پہنچے تو چوکیدار نے للکارا، کون؟ میاں ہنسوڑ تو جھجھکے، مگر آزاد نے بڑھ کر کہا ہم ہیں ہم۔

چوکیدار : اجی، ہم کا نام تو فرمائیے، یا ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھائیے۔

آزاد : ہم؟ ہمارا نام میاں آزاد ہے تم دل بہار کو اطلاع کردو۔

خیر، کسی طرح آزاد اندر پہنچے۔ حسن آرا اس وقت سو رہی تھیں اور سپہر آرا بیٹھی ایک

شاعر کا دیوان پڑھ رہی تھی۔ آزاد کی خبر سنتے ہی بولی۔ کہاں ہیں کہاں بلا لاؤ، میاں آزاد مکان میں داخل ہوئے۔

سپہرآرا:

وہ آئے ہیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آزاد: یہ روکھی خاطرداری کب تک ہوگی؟ ہمیں دلہا بھائی کب سے کہیے گا؟

سپہرآرا: خدا وہ دن دکھائے تو۔

آزاد: آپ کی باجی کہاں ہیں؟

سپہرآرا: آج کچھ طبیعت ناساز ہے۔ دل بہار جگا دو، کہو میاں آزاد آئے ہیں۔

حسن آرا انگڑائی لیتی، اٹھکھیلیاں کرتی چلی اور آزاد کے قریب آکر بیٹھ گئی۔

آزاد: اس وقت ہمارے دل کی کلی کھل گئی۔

سپہرآرا: کیوں نہیں پھر منھ مانگی مراد بھی تو مل گئی۔

آزاد: آخر اب ہم کب تک ترسا کریں؟ آج میں بے قبولوائے اٹھوں تو آزاد نہیں۔

حسن آرا: ہمارا تو اس وقت برا حال ہے۔ نیند اُمڈی چلی آتی ہے۔ اب ہمیں سونے جانے دیجیے۔

آزاد: (دوپٹہ پاؤں سے دبا کر) ہاں، جائیے، آرام کیجیے۔

حسن آرا: شرارت سے آپ باز نہیں آتے! دامن تو دبائے ہیں اور کہتے ہیں جائیے جائیے، کیوں کر جائیں؟

آزاد: دوپٹے کو پھینک جائیے۔

حسن آرا: بجا ہے، یہ کسی اور کو سکھائیے (بیٹھ کر) اب صاف کہہ دوں۔

آزاد: ضرور، مگر آپ کے تیور اس وقت بے ڈھب ہیں، خدا ہی خیر کرے۔ جو کچھ کہنا ہو کہہ ڈالیے۔ خدا کرے میرے مطلب کی بات منھ سے نکلے۔

حسن آرا: آپ لائق ہیں مگر ایک پردیسی آدمی، ٹھور نہ ٹھکانہ، گھر نہ بار۔ کسی سے آپ کا ذکر کروں تو کیا کہوں؟ کس کے لڑکے ہیں؟ کس کے پوتے ہیں؟ کس خاندان کے ہیں؟ شہر بھر میں یہی خبر مشہور ہوجائے گی کہ حسن آرا نے ایک پردیسی کے ساتھ شادی کرلی۔ مجھے تو

اس کی پرواہ نہیں لیکن ڈر یہ ہے کہ کہیں اس نکاح سے لوگ پڑھی لکھی عورتوں کو نیچی نظر سے نہ دیکھنے لگیں۔ بات وہ کرنی چاہیے کہ دھبہ نہ لگے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں اور اب پھر کہتی ہیں کہ شہر میں نام پیدا کیجیے، عزت کمائیے، چار بھلے آدمیوں میں آپ کی قدر ہو۔

آزاد : کہیے آگ میں پھاند پڑوں؟

حسن آرا : ماشاء اللہ، کہی بھی تو نرالی! اگر آپ آگ میں پھاند پڑے، تو لوگ آپ کو سڑی سمجھیں گے۔

سپہر آرا : کوئی کتاب لکھیے۔

حسن آرا : نہیں، کوئی بہادری کی بات ہو کہ جو سنے واہ واہ کرنے لگے۔اور پھر اچھی اچھی رئیس زادیاں چاہیں کہ ان کے ساتھ میاں آزاد کا بیاہ ہو جائے۔ اس وقت موقع بھی اچھا ہے۔ روم اور روس میں لڑائی چھڑنے والی ہے۔ روم کی مدد کرنا آپ کا فرض ہے۔ آپ روم کی طرف سے لڑئے اور جواں مردی کے جوہر دکھایئے، تمغے لٹکائے ہوئے آیئے تو پھر ہندستان بھر میں آپ ہی کی چرچا ہو۔

آزاد : منظور، دل و جان سے منظور، جاؤں اور بیچ کھیت جاؤں۔ مرے تو سیدھے جنت میں جائیں گے، بچے تو تم کو پائیں گے۔

سپہر آرا : میرے تو لڑائی کے نام سے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ (حسن آرا سے چمٹ کر) باجی، تم کیسی بے درد ہو، کہاں کالے کوسوں بھیجتی ہو۔ تمھیں خدا کی قسم اس خیال سے باز آؤ۔ آزاد جائیں گے تو پھر ان کی صورت دیکھنے کو ترس جاؤ گی۔ دن رات آنسو بہاؤ گی۔ کیوں مفت میں کسی کی جان کی دشمن ہوئی ہو؟

کنارے دریا پہنچ کے پانی
پیا نہیں ایک بوند تس پر
چڑھی ہے موجوں کی ہم سے تیوری
حباب آنکھیں بدل رہے ہیں

یہ کہتے کہتے سپہر آرا کی آنکھوں سے گول گول آنسو کی بوندیں گرنے لگیں۔

حسن آرا : ہیں ہیں، بہن، یہ مفت کا رونا دھونا اچھا سوانگ ہے، وہ مبارک دن میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے جب آزاد تمغے لٹکائے ہوئے ہمارے دروازے پر کھڑے

ہوں گے۔

میاں آزاد پر اس وقت وہ جوبن تھا کہ اوہوہو، جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ آنکھیں سرخ جیسے کبوتر کا خون، مکھڑا گورا جیسے گلاب کا پھول، کپڑے وہ بانکے پہنے تھے کہ سر سے پاؤں تک ایک ایک انگ نکھر رہا تھا۔ ٹوپی وہ بانکی کہ بانکپن بھی لوٹ جائے۔ کمر سے دوہری تلواریں لٹکی ہوئیں۔ حسن آرا کو ان کا چاند سا مکھڑا ایسا بھایا کہ جی چاہا کہ اسی وقت نکاح کرلوں۔ مگر دل پر ضبط کیا۔

آزاد : آج ہم گھر سے موت کی تلاش میں ہی نکلے تھے :

جب سے سنا کہ مرنے کا ہے نام زندگی
سر سے کفن کو باندھے قاتل کو ڈھونڈھتے ہیں

سپہرآرا : پیارے آزاد، خدا کے واسطے اس خیال سے باز آؤ۔

آزاد : یا ہاتھ توڑ جائیں گے یا کھولیں گے نقاب۔

حسن آرا سی بیوی پانا دل لگی نہیں۔ اب ہم پھر شادی کا حرف بھی زبان پر لائیں تو جواں مرد نہیں۔ اب ہماری ان کی شادی اسی روز ہوگی جب ہم میدان سے سرخ رو ہوکر لوٹیں گے۔ ہم سر کٹوائیں گے، زخم پر زخم کھائیں گے، مگر میدان سے قدم نہ ہٹائیں گے۔

سپہرآرا : جو آپ نے دالان تک بھی قدم رکھا تو ہم رو رو کر جان دے دیں گے۔

آزاد : تم گھبراؤ نہیں جیتے بچے تو پھر آئیں گے۔ ہمارے دل سے حسن آرا کی اور تمھاری محبت جاتی رہے یہ مشکل ہے۔ تم میری خاطر سے رونا دھونا چھوڑ دو۔ آخر کیا لڑائی میں سب کے سب مر ہی جاتے ہیں؟

سپہرآرا : اتنی دور جاکر ایسی ہی تقدیر ہو، تو آدمی لوٹے۔ اب میری زندگی محال ہے۔ مجھے دفنا کے جانا۔ اللہ جانے، کن کن جنگلوں میں رہوگے، کیسے کیسے پہاڑوں پر چڑھنا ہوگا، کہاں کہاں لڑنا بھڑنا ہوگا۔ ایک ذرا سی گولی تو ہاتھی کا کام تمام کر دیتی ہے، انسان کی کون کہے۔ تم وہاں گولیاں کھاؤ گے اور ہم دن رات بیٹھے بیٹھے کڑھا کریں گے۔ ایک ایک دن ایک ایک برس ہوجائے گا۔ اور پھر کیا جانے آؤ نہ آؤ۔ لڑائی چڑھائی پر جانا کچھ ہنسی تھوڑے ہی ہے۔ یہ تو تمھیں مردوں کا کام ہے۔ ہم تو یہیں سے نام سن سن کر کانپتے ہیں۔

حسن آرا : میری پیاری بہن ذرا صبر سے کام لو۔

سپہر آرا: نہ مانوں گی نہ مانوں گی۔

حسن آرا: سن تو لو۔

سپہر آرا: جی، بس، سن چکی۔ خون کیجیے، اور کہیے سن تو لو۔

حسن آرا: یہ کیا بری بری باتیں منہ سے نکالتی ہو۔ ہمیں برا معلوم ہوتا ہے۔ میں ان کو زبردستی تھوڑے ہی بھیجتی ہوں وہ تو آپ جاتے ہیں۔

سپہر آرا: سمندر سمندر جانا پڑے گا۔ کوئی طوفان آ گیا، تو جہاز ہی ڈوب جائے گا۔

آزاد: اب رات زیادہ آئی، آپ لوگ آرام کریں، ہم کل رات کو یہاں سے کوچ کریں گے۔

سپہر آرا: اس طرح جانا تھا تو ہمارے پاس دل دکھانے آئے کیوں تھے؟ (ہاتھ پکڑ کر) دیکھوں، کیوں کر جاتے ہیں۔

آزاد:
دل و جگر خون ہو چکے ہیں
ہواس تک اپنے جا چکے ہیں
وہی محبت کا حوصلہ ہے
ہزار صدمے اٹھا چکے ہیں

حسن آرا: ہائے، کس غضب میں جان پڑی۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹے جاتے ہیں، آنکھیں جل رہی ہیں۔ آزاد اگر مجھے دنیا میں کسی کی چاہ ہے تو تمھاری۔ لیکن دل سے لگی ہے کہ تم روسیوں کو نیچا دکھاؤ۔ مرنا جینا مقدر کے ہاتھ ہے۔ کون رہا ہے اور کون رہے گا۔

تاج میں جن کے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ سر تا سر
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتہ
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتہ۔
یہی دنیا کا کارخانہ ہے
یہ الٹ پھیر کا زمانہ ہے

آزاد: ہم تو جاتے ہیں تم سپہر آرا کو سمجھاتی رہنا۔ نہیں تو راہ میں میرے قدم نہ اٹھیں گے۔ کل رات کو مل کر کوچ کروں گا۔

حسن آرا : بہن ان کو جانے دو کل آئیں گے۔

سپہر آرا : جائیے، میں آپ کو روکنے والی کون؟

آزاد یہاں سے چلے کہ سامنے سے چنڈوباز آتے ہوئے مل گئے۔ گلے سے لپٹ کر بولے، واللہ آنکھیں آپ کو ڈھونڈھتی تھیں۔ صورت دیکھنے کو ترس گئے۔ وہ جو چلتے وقت آپ نے تان کر چابک جمایا تھا، اس کا نشان اب تک بنا ہے۔ بارے ملے خوب۔ بی اللہ رکھی تو مر گئی، بیچاری مرتے وقت خدا کی قسم اللہ اللہ کہا کیں اور دم توڑنے کے پہلے تین دفعہ آزاد آزاد کہہ کر چل بسیں۔

آزاد نے چنڈوباز کی صورت دیکھی، تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ روم کا جانا اور تمغے لٹکانا بھول گئے۔ سوچے اب عزت خاک میں ملی۔ لیکن جب چنڈوباز نے بیان کیا کہ اللہ رکھی چل بسیں اور مرتے وقت تک میرے ہی نام کی رٹ لگاتی رہی تو بڑا افسوس ہوا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، بولے بھئی تم نے بری خبر سنائی۔ ہائے مرتے وقت دو باتیں بھی نہ کرنے پائے۔

چنڈوباز : کیا عرض کروں، قسم خدا کی اس پیار اور اس حسرت سے تمھیں یاد کیا کہ کیا کہوں۔ میری تو روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا تو کہتیں آزاد آئے۔ آپ اپنا ایک رومال وہاں بھول آئے ہیں، اس کو ہر روز دیکھ لیا کرتی تھیں۔ مرتے وقت کہا کہ ہماری قبر پر یہ رومال رکھ دینا۔

آزاد (روکر) اف کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس غریب کو مجھ سے اتنی محبت تھی۔

چنڈوباز : ایک گلدستہ اپنے ہاتھ سے بنا کر دے گئی ہے کہ اگر میاں آزاد آجائیں تو ان کو دے دینا اور کہنا اب حشر میں آپ کی صورت دیکھیں گے۔

آزاد : بھئی، اسی وقت دو۔ خدا کے واسطے ابھی لاؤ۔ میں تو مرا بے موت، لاؤ گلدستہ ذرا چوم لوں۔ آنکھوں سے لگاؤں، گلے سے لگاؤں۔

چنڈوباز : (آنسو بہا کر) چلیے، میں سرائے میں اترا ہوا ہوں۔ گلدستہ ساتھ ہے۔ اس کو جان سے بھی زیادہ پیار کرتا ہوں۔

دونوں آدمی مل کر چلے، راہ میں اللہ رکھی کے روپ رنگ اور بھولی بھولی باتوں کا ذکر

کیا۔ چلتے چلتے دونوں سرائے میں داخل ہوئے۔ میاں آزاد جیسے ہی چنڈوباز کی کوٹھری میں گھسے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بی اللہ رکھی بگلے کے پر جیسا سفید کپڑا پہنے کھڑی ہیں۔ دیکھتے ہی میاں آزاد کا رنگ فق ہوگیا۔ چپ، اب ہلتے ہیں نہ بولتے ہیں۔

اللہ رکھی (تالیاں بجاکر) آداب عرض کرتی ہوں۔ ذرا ادھر نظر کیجیے۔ یہ کوسوں کی راہ طے کر کے ہم آپ ہی کی زیارت کے لیے آئے ہیں اور آپ کو ہم سے ایسی نفرت کہ آنکھ تک نہیں ملاتے۔ واہ ری قسمت! اب ذرا سر تو ہلائیے، گردن تو اٹھائیے، وہ چاند سا مکھڑا تو دکھائیے۔ ہائے کیا ظلم ہے، جن پر ہم جان دیتے ہیں، وہ ہماری صورت سے بیزار ہیں۔ کہیے آپ کی حسن آرا تو اچھی ہیں؟ ذرا ہم کو تو ان کا جوبن دکھاؤ۔ ہم نے سنا، کبھی کبھی بجروں پر دریا کی سیر کو جاتی ہیں، کبھی ہم جولیوں کو لے کر جشن مناتے ہیں۔ کیوں، حضرت ہم بک رہے ہیں، یا بھونک رہے ہیں؟ ہمارا ہی لہو پیے جو ادھر نہ دیکھے۔

آزاد : خدا کی قسم صرف تمھیں کو دیکھنے آیا ہوں۔

چنڈوباز : بھئی، آزاد کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی تھی۔ قسم خدا کی، میں نے جو یہ فقرہ چست کیا کہ اللہ رکھی نے مرتے وقت آزاد آزاد کہہ کے دم توڑا تو یہ بے ہوش ہوکر گر پڑے۔

اللہ رکھی : خیر، اتنی تو ڈھارس ہوئی کہ مرنے کے بعد بھی ہم کو کوئی پوچھے گا لیکن :

آئے تربت پہ بہت روئے، کیا یاد مجھے
خاک اڑانے لگے، جب کر چکے برباد مجھے

آزاد : اللہ رکھی، اب ہماری عزت تمھارے ہاتھ ہے۔ اگر تمھیں ہم سے محبت ہے، تو ہمیں دق نہ کرو۔ نہیں ہم سنکھیاں کھا کر جان دے دیں گے۔ اگر ہمیں جلانا چاہتی ہو تو ہمیں آزاد کر دو۔

اللہ رکھی : سنو آزاد، ہم بھی شریف زادی ہیں، مگر اللہ کو یہی منظور تھا کہ ہم بھٹیاری بن کر رہے ہیں۔ یاد ہے، ہمارے بوڑھے میاں نے تمھیں خط دے کر ہمارے مکان پر بھیجا تھا اور تم کئی دن تک ہمارے گھر کا چکر لگاتے رہے تھے؟ ہم دن رات کڑھا کرتے تھے۔ آخر وہ تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہی تھے، چل بسے۔ اس دن ہم نے مسجد میں گھی کے چراغ جلائے۔ مقدر کھینچ کر یہاں لایا۔ لیکن اللہ جانتا ہے، جو میری آنکھیں کسی سے لڑی ہوں۔ تم سے بیاہ کرنے کا بہت شوق تھا، لیکن تم راضی نہ ہوئے، اب ہم نے سنا ہے کہ حسن آرا کے

ساتھ تمھارا نکاح ہونے والا ہے۔ اللہ مبارک کرے۔ اب ہم نے آپ کو اجازت دے دی، خوشی سے بیاہ کیجیے، لیکن ہمیں بھول نہ جانا۔ لونڈی بن کر رہوں گی، مگر تم کو نہ چھوڑوں گی۔

آزاد : اف تم وہ ہو جس کا اس بوڑھے سے بیاہ ہوا تھا؟ یہ بھید تو اب کھلا۔ مگر ہائے افسوس تم نے یہ کیا کیا۔ تمھاری ماں نے بڑی ہی بے وقوفی کی، جو تم جیسی کامنی کا ایک بڈھے کے ساتھ بیاہ کر دیا۔

اللہ رکھی : اپنی تقدیر!

کچھ دیر تک آزاد بیٹھے اللہ رکھی کو تسلی دیتے رہے۔ پھر گلا چھڑا کر، چکما دے کر نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور آگے بڑھے تھے کہ طبلے کی تھپک کانوں میں آئی۔ گھر کا راستہ چھوڑ محفل میں جا پہنچے۔ دیکھا وہاں خوب دھما چوکڑی مچ رہی ہے۔ ایک نے غزل گائی، دوسری نے ٹھمری، تیسری نے ٹپا۔ آزاد ایک ہی رسیا وہیں جم گئے۔ اب اس سنک کو دیکھیے کہ غیر کی محفل اور آپ انتظام کرتے ہیں، کسی حقے کی چلم بھرواتے ہیں۔ کسی گڑگڑی کو تازا کرواتے ہیں۔ کبھی ٹھمری کی فرمائش کی، کبھی غزل کی۔ دس پندرہ گنواروں نے جو گانے کی آواز سنی تو دھنس پڑے۔ میاں آزاد نے انھیں دھکے دے کر باہر کیا۔ مالک مکان نے جو دیکھا کہ ایک شریف نوجوان آدمی انتظام کر رہے ہیں، تو ان کو پاس بلایا، تپاک سے بٹھایا، کھانا کھلایا۔ یہی بہار دیکھتے دیکھتے آزاد نے رات کاٹ دی۔ وہاں سے اٹھے تو تڑکا ہو گیا تھا۔

میاں آزاد کو آج ہی روم کے سفر کی تیاری کرنی تھی۔ اسی فکر میں بدحواس جا رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں ایک باغ میں جھولے پڑے ہیں، کئی لڑکیاں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے، گلے میں ہار ڈالے پینگ لگا رہی ہیں اور سب کی سب سریلی آواز سے لہرا لہرا کر یوں گا رہی ہیں :

ندیا کنارے بیلا کس نہ بویا، ندیا کنارے
بیلا بھی بویا، چمیلی بھی بوئی، بیچ
بیچ بویا رے گلاب، ندیا کنارے

آزاد کو یہ گیت ایسا بھایا کہ تھوڑی دیر ٹھہر گئے۔ پھر خود جھولے پر جا بیٹھے اور پینگ لگانے لگے۔ کبھی کبھی گانے بھی لگتے تھے اس پر لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔ یکا یک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کالا کلوٹا مریل سا آدمی کھڑا لڑکیوں کو گھور رہا ہے۔ آزاد نے کئی بار یہ

کیفیت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا، ایک چپت جما ہی تو دی۔ ٹیپ کھاتے ہی وہ جھلا اٹھا اور گالیاں دے کر کہنے لگا۔ نہ ہوئی ولایتی اس وقت پاس، نہیں تو بھٹا سا سر اڑا دیتا۔ اور جو کہیں جوان ہوتا تو کھود کر گاڑ دیتا۔ اور جو کہیں بھوکا ہوتا تو کچا ہی کھا جاتا۔ اور جو کہیں نشے کی چاٹ ہوتی تو گھول کے پی جاتا۔

آزاد پہچان گئے، یہ میاں خوجی تھے۔ کون خوجی؟ نواب کے مصاحب، کون نواب؟ وہی بٹیر باز، جن کے صف شکن کو ڈھونڈھنے آزاد نکلے تھے۔ بولے ارے بھائی خوجی ہیں؟ بہت دنوں کے بعد ملاقات ہوئی۔ مزاج تو اچھے ہیں؟

خوجی : جی ہاں، مزاج تو اچھا ہے لیکن کھوپڑی بھنا رہی ہے۔ بھلا ہم نے تمھارا کیا بگاڑا تھا۔ وہ تو کہیے میں تمھیں پہچان گیا، نہیں تو اس وقت جان سے مار ڈالتا۔

آزاد : اس میں کیا شک، آپ ہیں ہی ایسے دلیر! آپ ادھر کیسے آ نکلے؟

خوجی : آپ ہی کی تلاش میں تو آیا تھا۔

آزاد : نواب تو اچھے ہیں؟

خوجی : اجی وہ گئے چولہے میں۔ یہاں سر بھنا رہا ہے۔ لے اب چلو، تمھارے ساتھ چلیں۔ کچھ تو کھلواؤ یار۔ مارے بھوک کے بے دم ہوئے جاتے ہیں۔

آزاد : ہاں ہاں، چلیے خوب شوق سے۔

دونوں مل کر چلے تو آزاد نے خوجی کو شراب کی دکان پر لے جا کر اتنی شراب پلائی کہ وہ ٹیں ہو گئے، انھیں وہیں چھوڑ کر میاں ہنسوڑ کے گھر جا پہنچے۔

میاں ہنسوڑ بہت ناراض ہوئے کہ مجھے تو لے جا کر حسن آرا کے مکان کے سامنے کھڑا کر دیا اور آپ اندر ہو رہے۔ آدھی رات تک تمھاری راہ دیکھتا رہا۔ یہ آخر آپ رات کو تھے کہاں؟

آزاد ابھی کچھ جواب دینے والے ہی تھے کہ ایک طرف سے میاں پیر بخش کو آتے دیکھا اور دوسری طرف سے چنڈو باز کو۔ آپ دور ہی سے بولے، عجیب طرح کے آدمی ہو میاں! وہاں سے کہہ کر چلے کہ ابھی آتا ہوں، پل بھر کی بھی دیر نہ ہوگی، اور تب کے گئے گئے اب تک صورت نہیں دکھائی، اللہ رکھی بے چاری ڈھاڑیں مار مار کر رو رہی ہیں۔ چلیے ان کے آنسو تو پونچھیے۔

میاں پیر بخش نے باتیں سنیں تو ان کے کان کھڑے ہوئے۔ حجام کے منہ سے تو یہ سن ہی چکے تھے کہ میاں آزاد کسی سرائے میں ایک بھٹیاری پر لٹو ہو گئے تھے، پر اب تک حسن آرا سے انھوں نے یہ بات چھپا رکھی تھی۔ اس وقت جو پھر وہی ذکر سنا تو دل میں سوچنے لگے کہ وہاں تو لڑکیوں کو رات رات بھر نیند نہیں آتی، حسن آرا تو کسی قدر ضبط بھی کرتی ہیں مگر سپہر آرا بیچاری پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ اور یہاں یہ ہے کہ کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بولے آپ چل رہے ہیں یا یہاں بیٹھے ہوئے بی اللہ رکھی کے دکھڑے سنیے گا؟ اگر کہیں دونوں بہنیں سن لیں، تو کیسی ہو؟ بس اب بھل منسی اسی میں ہے کہ میرے ساتھ چلے چلیے، نہیں تو حسن آرا سے ہاتھ دھوئیے گا اور پھر اپنی پھوٹی قسمت کو روئیے گا۔

چنڈو باز : میاں، ہوش کی دوا کرو! بھلا مجال ہے کہ یہ اللہ رکھی کو چھوڑ کر یہاں سے جائیں۔ کیا خوب ہم تو سیکڑوں کوئیں جھانکتے آئے، آپ بیچ میں بولنے والے کون؟

آزاد : اجی انھیں بکنے بھی دو، ہم تمھارے ساتھ اللہ رکھی کے پاس چلیں گے۔ اس محبت کی پتلی کو دغا نہ دیں گے۔ تم گھبراتے کیوں ہو؟ کھانا تیار ہے، آج میٹھا پکوایا ہے، تم ذرا بازار سے لپک کر چار آنے کی بلائی لے لو۔ مزے سے کھانا کھائیں۔ کیوں استاد، ہے نہ معاملے کی بات، لانا ہاتھ۔

چنڈو باز بالائی کا نام سنتے ہی کھل اٹھے۔ جھپ سے پیسے لیے اور لڑھکتے ہوئے چلے بالائی لانے۔ میاں آزاد انھیں بتا دے کر پیر بخش سے بولے، چلیے حضرت ہم اور آپ چلیں راستے میں باتیں ہوتی جائیں گی۔

دونوں آدمی وہاں سے چلے۔ آزاد تو ڈبل چال چلنے لگے، پر میاں پیر بخش پیچھے رہ گئے۔ تب بولے، اجی ذرا قدم روکے ہوئے چلیے۔ کسی زمانے میں ہم بھی جوان تھے۔ اب یہ فرمائیے کہ یہ اللہ رکھی کون ہے؟ جو کہیں حسن آرا سن پائیں تو آپ کی صورت نہ دیکھیں، بڑی بیگم تو تم کو اپنے محل کے ایک میل ادھر ادھر بھٹکنے نہ دیں۔ آپ اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی مار رہے ہیں۔ اب شادی وادی ہونا خیر صلاح ہے۔ سوچ لیجیے کہ اگر وہاں اس کی بات چلی تو کیا جواب دیجیے گا۔

آزاد : جناب، یہاں سوچنے کا مرض نہیں۔ اس وقت جو زبان پر آئے گا کہہ جاؤں گا۔ ایسی وکالت کروں کہ آپ بھی دنگ ہو جائیں، زبان سے پھلجھڑی چھوٹنے لگے۔

اتنے میں کوٹھی سامنے نظر آئی اور ذرا دیر میں دونوں آدمی محل میں داخل ہوئے۔ سپہر آرا تو آزاد سے ملنے دوڑی، مگر حسن آرا اپنی جگہ سے نہ اٹھی۔ وہ اِس بات پر روٹھی ہوئی تھی کہ اتنا دن چڑھ آیا اور میاں آزاد نے صورت نہ دکھائی۔

حسن آرا : بہن، ان سے پوچھو کہ آپ کیا کرنے آئے ہیں؟

آزاد : آپ خود پوچھیے، کیا منہ نہیں ہے یا منہ میں زبان نہیں ہے؟

سپہر آرا : یہ اب تک آپ کہاں غائب رہے؟

حسن آرا : اجی، ہمیں ان کی کیا پرواہ، کوئی آئے یا نہ آئے، ہم کسی کے ہاتھ بکے تھوڑے ہی ہیں۔

سپہر آرا : باجی کی آنکھیں روتے روتے لال ہوگئیں۔

حسن آرا : پوچھو، آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

آزاد : پوچھے کون، آخر آپ خود کیوں نہیں پوچھتیں :

کہوں کیا میں تجھ سے کہ کیا چاہتا ہوں
جفا ہوچکی اب وفا چاہتا ہوں
بہت آشنا ہیں زمانے میں لیکن
کوئی دوست درد آشنا چاہتا ہوں

حسن آرا : ان سے کہہ دو، یہاں کسی کی واہی تباہی بکواس سننے کا شوق نہیں ہے۔ معلوم ہے آپ بڑے شاعر کی دُم ہیں۔

سپہر آرا : بہن، تم لاکھ بنو، دل کی لگی کہیں چھپانے سے چھپتی ہے۔

حسن آرا : چلو، بس چپ بھی رہو۔ بہت کلیجہ نہ پکاؤ، ہمارے دل پر جو گزر رہی ہے ہمیں جانتے ہیں۔ چلو ہم اور تم کمرہ خالی کردیں جس کا جی چاہے بیٹھے، جس کا جی چاہے جائے۔ حیادار کے لیے ایک چلو کافی ہے۔

یہ کہہ کر حسن آرا اٹھی اور سپہر آرا بھی کھڑی ہوئی۔ میاں آزاد نے سپہر آرا کا پہنچا پکڑ لیا۔ اب دل لگی دیکھیے کہ میاں آزاد تو اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اور حسن آرا اپنی طرف گھسیٹتی ہوئی کہہ رہی ہیں : ہماری بہن کا ہاتھ کوئی پکڑے تو ہاتھ ہی ٹوٹیں۔ جب ہم نے ٹکا سا جواب دے دیا تو پھر یہاں آنے والا کوئی کون! واہ ایسے حیادار بھی نہیں دیکھے!

آزاد : صاحب آپ اتنا خفا کیوں ہوئی ہیں؟ خدا کے واسطے ذرا بیٹھ جائیے۔ مانا کہ ہم خطاوار ہیں، مگر ہم سے جواب تو سنیے، خدا گواہ ہے ہم بے قصور ہیں۔

حسن آرا : بس بس، زبان نہ کھلوائیے۔ بس اب رخصت۔ آپ اب چھ مہینے کے بعد صورت دکھائیے گا، ہم بھی کلیجے پر پتھر رکھ لیں گے۔

یہ کہہ کر حسن آرا تو وہاں سے چلی گئی مگر میاں آزاد اکیلے بیٹھے بیٹھے سوچنے لگے کہ اسے کیسے مناؤں۔ آخر انھیں ایک چال سوجھی۔ ارگنی پر سے چادر اتار لی اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہے۔ چہرے بیماروں کا سا بنا لیا اور کراہنے لگے۔ اتفاق سے میاں پیر بخش اس کمرے میں آنکلے۔ آزاد کی صورت جو دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔ جاکر حسن آرا سے بولے، جلد پلنگ بچھواؤ میاں آزاد کو بخار ہو آیا ہے۔

حسن آرا : ہیں ہیں یہ کیا کہتے ہو، پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔

سپہر آرا : کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ ایسی سنائی اللہ ساتویں دشمن کو بھی نہ سنائے۔

حسن آرا : ہائے میرے اللہ، میں کیا کروں! میں نے اپنے پیروں میں آپ کلہاڑی ماری۔

ذرا دیر میں پلنگ بچھ گیا۔ حسن آرا، اس کی بہن، پیر بخش اور دل بہار چارپائی کے پاس کھڑے ہوکر آنسو بہانے لگے۔

دل بہار : میاں، کسی حکیم جی کو بلاؤ۔

سپہر آرا : چہرہ کیسا زرد ہوگیا۔

پیر بخش : میں ابھی جاکر حکیم صاحب کو لاتا ہوں۔

حسن آرا : حکیم جی کا یہاں کیا کام ہے؟ اور یوں آپ چاہیں جس کو بلائیں۔

میاں پیر بخش تو باہر گئے اور حسن آرا پلنگ پر جا بیٹھی، میاں آزاد کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ سپہ آرا پھولوں کا پنکھا جھلنے لگی۔

حسن آرا : میری زبان کٹ پڑے۔ میری ہی جلی کٹی باتوں نے یہ بخار پیدا کیا۔

یہ کہہ کر اس نے آہستہ آہستہ آزاد کی پیشانی کو سہلانا شروع کیا۔ آزاد نے آنکھیں کھول دیں اور بولے :

میرے جنازے کو ان کے کوچے میں
ناحق احباب لے کے آئے
نگاہ حسرت سے دیکھتے ہیں
وہ رخ سے پردہ ہٹا ہٹا کر
سحر ہے نزدیک شب ہے آخر
سرا سے چلتے ہیں ہم مسافر
جنھیں ہے ملنا وہ سب ہیں حاضر
جرس سے کہہ دو، کوئی صدا کر

حسن آرا : کیوں حضرت، یہ مکاری! خدا کی پناہ، میری تو بری گت ہوگئی۔

آزاد : ذرا اسی طرح ان نازک ہاتھوں سے پھر ماتھا سہلاؤ۔

حسن آرا : میرا بلا جاتی ہے، وہ وقت ہی اور تھا۔

آزاد :

میں نے جو کہا ان سے کہ شب کو یہیں رہو
آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پر

حسن آرا : آپ نے آخر یہ سوانگ کیوں رچا؟ چھپایئے نہیں صاف صاف بتایئے۔

آزاد :

اب کہتی ہو کہ تم مری محفل میں آئے کیوں
آتا تھا کون کوئی کسی کو بلائے کیوں
کہتا ہوں صاف صاف کہ مرتا ہوں آپ پر
ظاہر جو بات ہو اسے کوئی چھپائے کیوں

یہاں مارے بخار کے دم نکل رہا ہے آپ مکر سمجھتی ہیں۔

یہاں دونوں میں یہی نوک جھونک ہو رہی تھی، اتنے میں میاں خوجی پتہ پوچھتے ہوئے آپہنچے۔

خوجی : میاں ہوت ذرا آزاد کو تو بلاؤ۔

دربان : کس سے کہتے ہو؟ آئے کہاں سے؟ ہو کون؟

خوجی : ایں یہ تو کچھ تابوتی سا معلوم ہوتا ہے۔ اب التجا کر دے کہ خواجہ صاحب آئے ہیں۔

دربان : خواجہ صاحب؟ ہمیں تو جولاہے سے معلوم ہوتے ہو۔ بھلے مانسوں کی صورت ایسی ہی ہوا کرتی ہے؟

آزاد نے یہ باتیں سنیں تو باہر نکل آئے اور خوجی کو بلا لیا۔

خوجی : بھئی، ذرا آئینہ تو منگوا دینا۔

آزاد : یہ آئینہ کیا ہوگا؟ بندگی نہ سلام، بات نہ چیت، آتے ہی آتے آئینہ یاد آیا۔ بندر کے ہاتھ میں آئینہ بھلا کون دینے لگا!

خوجی : اجی منگواتے ہو یا دل لگی کرتے ہو۔ دربان سے ہم سے جھوڑ ہوگئی۔ مردود کہتا ہے تمھاری صورت بھلے مانسوں کی سی نہیں۔ اب کوئی اس سے پوچھے پھر کیا چمار کی سی ہے یا پاجی کی سی۔

آزاد : بھئی اگر سچ پوچھتے تو، تمھاری صورت سے ایک طرح کا پاجی پن برستا ہے۔ خدا چاہے پاجی بنائے، مگر پاجی کی صورت نہ بنائے۔ پر اب اس کا علاج ہی کیا؟

خوجی : واہ، اس کا کچھ علاج ہی نہیں؟ ڈاکٹروں نے مردے تک کے جلا لینے کا تو بندوبست کر لیا ہے آپ فرماتے ہیں علاج ہی نہیں۔ اب پاجی نہ بنیں گے، پاجی بن کے جئے تو کیا۔

آزاد : کل ہم روم جانے والے ہیں، چلتے ہو ساتھ؟

خوجی : نہ چلے، اس پر بھی لعنت، نہ لے چلے، تو اس پر بھی لعنت۔

آزاد : مگر وہاں چنڈو نہ ملے گا، اتنا یاد رکھیے۔

خوجی : اجی افیم ملے گی کہ وہ بھی نہ ملے گی؟ بس، تو پھر ہم اپنا چنڈو بنا لیں گے۔ ہمیں ضرور لے چلیے۔

آزاد اندر جاکر بولے : حسن آرا، اب رخصت کا وقت قریب آتا جاتا ہے، ہنسی خوشی رخصت کرو، خدا نے چاہا تو پھر ملیں گے۔

حسن آرا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ بولی، ہائے اندر والا نہیں مانتا اس کو بھی تو سمجھاتے جاؤ، یہ کس کا ہوکر رہے گا؟

آزاد : تمھاری یہ حالت دیکھ کر میرے قدم رکے جاتے ہیں۔ اب ہمیں جانے دو۔ زندگی شرط ہے، ہم پھر ملیں گے اور جشن کریں گے۔ یہ کہہ کر آزاد باہر چلے آئے اور خوجی کے ساتھ چلے۔ خوجی نے سمجھا تھا، روم کہیں لکھنؤ کے آس پاس ہوگا۔ اب جو سنا کہ سات سمندر پار جانا پڑے گا تو ہکا بکا ہوگئے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ بھئی ہم سمجھے تھے دل لگی کرتے ہو۔ یہ کیا معلوم تھا کہ سچ مچ تنگ توبڑا چڑھا کر بھاگا ہی چاہتے ہو۔ میاں تم لاکھ عالم فاضل سہی پھر بھی لڑکے ہی ہو۔ یہ خیال دل سے نکال ڈالو۔ ایک ذرا سی چنے کے برابر گولی پڑے گی، تو ٹائیں سے رہ جاؤ گے۔ آپ کو کبھی مورچے پر جانے کا شاید اتفاق نہیں ہوا۔ خدا بھلے مانس کو نہ لے جائے۔ غضب کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ گولی پڑی، یہ مر گیا۔ دائیں دائیں کی آواز سے کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ توپ کا گولا آیا اور اٹھارہ آدمیوں کو گرا دیا۔ گولا پھٹا اور بہتر ٹکڑے ہوئے، اور ایک ایک ٹکڑے نے دس دس آدمیوں کو اڑا دیا۔ جو کہیں تلوار چلنے لگی تو موت سامنے نظر آتی ہے، بے موت جان جاتی ہے۔ کھٹا کھٹ تلوار چل رہی ہے اور ہزاروں آدمی گرتے جاتے ہیں۔ سو بھئی وہاں جانا کچھ خالہ جی کا گھر تھوڑے ہی ہے۔ خدا کے لیے ادھر رخ نہ کرنا۔ اور بندہ تو اپنے حساب، جانے والے کو کچھ کہتا ہے۔ ہم ایک ترکیب بتائیں، وہ کام کیوں نہ کیجیے کہ حسن آرا آپ کو خود روکے اور لاکھوں قسمیں دیں۔ آپ اندر جا کر بیٹھیے اور ہم کو چک کے پاس بٹھائیے۔ پھر دیکھیے میں کیسی ترکیب کرتا ہوں کہ دونوں بہنیں کانپ اٹھیں۔ ان کو یقین ہو جائے کہ میاں آزاد گئے اور انٹاغفیل ہوئے۔ میں صاف صاف کہہ دوں گا کہ بھئی آزاد ذرا اپنی تصویر تو کھنچوا لو۔ آخر اب تو جاتے ہی ہو۔ واللہ جو کہیں یہ تقریر سن پائیں تو حشر تک تمھیں نہ جانے دیں اور جھپ سے شادی ہو جائے۔

آزاد : بس اب اور کچھ نہ فرمائیے۔ مرنا جینا کسی کے اختیار کی بات تو ہے نہیں۔ لاکھوں آدمی کورے آتے ہیں، اور ہزاروں راہ چلتے لوٹ جاتے ہیں۔ حسن آرا ہم سے کہے کہ ترکی جاؤ اور ہم باتیں بنائیں اس کو دھوکا دیں۔ جس سے محبت کی اس سے فریب۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوگا، چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ آپ میاں ہنسوڑ کے یہاں جائیے اور ان سے کہیے کہ ہم ابھی آتے ہیں۔ ہم پہنچے اور کھانا کھا کر لمبے ہوئے۔ خوجی تو گرتے پڑتے چلے، مگر دو قدم جا کر پھر پلٹے۔ بھئی ایک بات تو سنو۔ کیا کیا پکوا رکھوں؟ آزاد بہت ہی جھلائے۔ عجب ناسمجھ آدمی ہو! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا! ان کے یہاں جو کچھ ممکن

ہوگا تیار کریں گے۔ یہ کہہ کر آزاد تو اپنے دو چار دوستوں سے ملنے چلے، ادھر میاں خوجی ہنسوڑ کے گھر پہنچے۔ جا کر غل مچانا شروع کیا کہ جلد کھانا تیار کرو، میاں آزاد ابھی ابھی جانے والے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ پانچ سیر میٹھے ٹکڑے، سات سیر پلاؤ، دس سیر فرنی، دس ہی سیر کھیر۔ کوئی چودہ سیر زردہ۔ کوئی پانچ سیر مربہ اور میٹھے اچار کی اچاریاں جلد تیار ہوں۔ میاں ہنسوڑ کی بیوی کھانا بنانے میں برق تھیں۔ ہاتھوں ہاتھ سب سامان تیار کر دیا۔ میاں آزاد شام کو پہنچے۔

ہنسوڑ : کہیے آج تو سفر کا ارادہ ہے۔ کھانا تیار ہے، کہیے تو نکلوایا جائے۔ برف بھی منگوا رکھی ہے۔

آزاد : کھانا تو ہم اس وقت نہ کھائیں گے ذرا بھی بھوک نہیں ہے۔

ہنسوڑ : خیر آپ نہ کھائیے گا نہ سہی آپ کے اور دوست کہاں ہیں؟ ان کے ساتھ دو نوالے تم بھی کھا لینا۔

آزاد : دوست کیسے! میں نے تو کسی دوست کے لیے کھانا پکانے کو نہیں کہا تھا۔

ہنسوڑ : اور سنیے گا! کیا آپ نے اپنے ہی لیے دس سیر کھیر، اٹھارہ سیر میٹھے ٹکڑے اور خدا جانے کیا کیا الم غلم پکوایا ہے۔

آزاد : آپ سے یہ کہا کس نامعقول نے؟

ہنسوڑ : خوجی نے اور کس نے؟ بیٹھے تو ہیں پوچھیے نہ!

آزاد : خوجی تم مر بھوکے ہی رہے۔ یہ اتنی چیزیں کیا سر پر لاد کر لے جاؤ گے؟ لاحول ولاقوۃ۔

خوجی : لاحول کاہے کی؟ آپ نہ کھائیے، میں تو ڈٹ کر چکھ چکا۔ راستے کے لیے بھی باندھ رکھا ہے۔

آزاد : اچھا تو اب بوریاں بندھنا اٹھائیے، لادیے پھاندیے۔

خوجی : جناب، اس وقت تو یہ حال ہے جیسے چوہے کو کوئی پارا پلا دے۔ اب بندہ لوٹ مارے گا۔ اور یہ تو بتاؤ سواری کیا ہے؟

آزاد : اکا۔

خوجی : غضب خدا کی! تب تو میں جا چکا۔ اکے پر تو یہاں کبھی سوار ہی نہیں ہوئے۔

اور پھر کھانا کھا کر تو مر ہی جاؤں گا۔

خیر، میاں آزاد نے جھٹ پٹ کھانا کھایا اور اسباب کس کر تیار ہو گئے۔ خوجی پڑے خرّاٹے لے رہے تھے روتے گاتے اٹھے۔ باہر جا کر دیکھتے ہیں تو ایک سمند گھوڑی پوری ادھ مرا مریل ٹٹو۔ آزاد گھوڑی پر سوار ہوئے اور میاں ہنسوڑ کی بیوی سے بولے بھابھی بھول نہ جائیے گا۔ بھائی صاحب تو بھلکو آدمی ہیں، آپ یاد رکھیے گا۔ آپ کے ہاتھ کا کھانا عمر بھر نہ بھولوں گا۔ انھوں نے رخصت کرتے ہوئے کہا، جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو، خدا کرے اسی طرح منہ بھی دکھاؤ۔ امام ضامن کو سونپا۔

اب سنیے کہ میاں خوجی نے اپنے مریل ٹٹو کو جو دیکھا تو گھبرائے۔ گھوڑے پر کبھی زندگی بھر سوار نہ ہوئے تھے۔ لاکھ چاہتے ہیں کہ سوار ہو جائیں مگر ہمت نہیں پڑتی۔ یار لوگ ڈراتے ہیں۔ دیکھو دیکھو وہ پشتک اچھالی، وہ دولتی جھاڑی، وہ منہ کھول کر لپکا۔ مگر ٹٹو کھڑا ہے، کان تک نہیں ہلاتا۔ ایک دفعہ آنکھ بند کر کے حضرت نے چاہا کہ لد لیں مگر یاروں نے تالیاں جو بجائیں تو ٹٹو بھاگا اور میاں خوجی بھد سے زمین پر۔ دیکھا کہتے نہ تھے کہ ہم اس ٹٹو پر نہ سوار ہوں گے۔ مگر آزاد نے دو گھڑی دل لگی دیکھنے کے لیے ہم کو الو بنایا۔ وہ تو کہو ہڈی پسلی بچ گئی نہیں تو چرمر ہو جاتی۔ خیر دو آدمیوں نے ان کو اٹھایا اور لاد کر گھوڑی کی پیٹھ پر رکھ دیا۔ انھوں نے لگام ہاتھ میں لی ہی تھی کہ ایک بگڑے دل نے چابک جما دیا۔ ٹٹو دم دبا کر بھاگا اور میاں خوجی لڑھک گئے۔ بارے آزاد نے آ کر ان کو اٹھایا۔

خوجی : اب کیا روم تک برابر اس ٹٹو ہی پر جانا ہوگا؟

آزاد : اور نہیں کیا آپ کے واسطے اڑن کھٹولا آئے گا؟

خوجی : بھلا اس ٹٹو پر کون جائے گا؟

آزاد : ٹٹو، آپ تو اسے ٹانگھن کہتے تھے۔

خوجی : بھئی، ہمیں آزاد کر دو۔ ہم باز آئے اس سفر سے۔

آزاد : ارے بے وقوف ریل تک اسی پر چلنا ہوگا، وہاں سے بمبئی تک ریل پر جائیں گے۔

میاں آزاد اور خوجی آگے بڑھے۔ تھوڑی دیر میں خوجی کا ٹٹو بھی گرمایا اور آزاد کی گھوڑی کے پیچھے قدم بڑھا کر چلنے لگا۔ چلتے چلتے ٹٹو نے شرارت کی۔ بوٹ کے ہرے

ہرے کھیت دیکھے تو ادھر لپکا۔ کسان نے جو دیکھا تو لٹھ لے کر دوڑا اور لگا برا بھلا کہنے۔ اس کی جورو بھی چمک کر لپکی اور کوسنے لگی کہ پلپا مر جائے، کیڑے پڑیں، ابھی ابھی پیٹ پھٹے داڑھی جار کی لہاس نکلے۔ اور کسان بھی گالیاں دینے لگا۔ ارے یو ٹٹو کون سار کیر آئے۔ سر ہمرے کھیت میں پیٹھائے دِہیں۔ میاں خوجی گالیاں کھا کر بگڑ گئے۔ ان میں ایک صفت یہ تھی کہ بے سوچے سمجھے لڑ پڑتے تھے۔ چاہے اپنے سے دوگنا چوگنا ہو۔ وہ چمٹ ہی جاتے تھے۔ غصے کی یہ خاصیت ہے کہ جب آتا تھا کمزور پر۔ مگر میاں خوجی کا غصہ بھی نرالا تھا جب آتا تھا تو شہ زور پر، کسان نے ان کے ٹٹو کو کئی لٹھ جمائے تو میاں خوجی تڑ سے اتر کر کسان سے گتھ گئے۔ وہ گنوار آدمی بدن کا کرارا اور یہ دبلے پتلے آدمی، ہوا کے جھونکے میں اڑ جائیں۔ اس نے ان کی گردن دبوچی اور گد سے زمین پر پھینکا۔ پھر اٹھے تو ان کی جورو ان سے چمٹ گئی اور لگی ہاتھاپائی ہونے۔ اس نے گھونسا جمایا اور ان کے پٹے پکڑ کر پھینکا، تو چاروں شانے چت۔ دو تھپڑ بھی رسید کیے۔ ایک ادھر ایک ادھر۔ کسان کھڑا ہنس رہاہے کہ مہارارو سے جیت ناہی پاوت، یہ مسنڈن سے کا لڑیہے بھلا۔ کسان کی جورو تو ٹھونک ٹھانک کر چل دی۔ اور آپ نے پکارنا شروع کیا، قسم اباجان کی جو کہیں چھرا پاس ہوتا تو ان دونوں کی لاش اس وقت پھڑکتی ہوتی۔ وہ تو کہیے خدا کو اچھا کرنا منظور تھا کہ میرے پاس چھرا نہ تھا، نہیں تو اتنی کرولیاں بھونکتا کہ عمر بھر یاد کرتے۔ کھڑا تو رہ اوگیدی۔ اس پر گاؤں والوں نے خوب قہقہہ اڑایا۔ ایک نے پوچھا کیوں میاں صاحب چھری ہوتی تو کیا بھونک کر مر جاتے؟ اس پر میاں خوجی اور بھی آگ ہوگئے۔

میاں آزاد کوئی دو گولی کے ٹپے پر نکل گئے تھے۔ جب خوجی کو پیچھے نہ دیکھا تو چکرائے کہ ماجرا کیا ہے؟ گھوڑی پھیری اور آکر خوجی سے بولے یہاں کھیت میں کب تک پڑے رہوگے؟ اٹھو گرد جھاڑو۔

خوجی: کرولی نہ ہوئی پاس نہیں تو اس وقت دو لاشیں یہاں پھڑکتی ہوئی دیکھتے۔

آزاد: اجی وہ تو جب دیکھتے تب دیکھتے، اس وقت تو تمھاری لوتھ دیکھ رہے ہیں۔

انھوں نے پھر خوجی کو اٹھایا اور ٹٹو پر سوار کرایا۔ تھوڑی دیر میں پھر دونوں آدمیوں میں ایک کھیت کا فاصلہ ہوگیا۔ خوجی سے ایک پٹھان نے پوچھا کہ شیخ جی آپ کہاں رہتے ہیں؟ حضرت نے جھٹ سے ایک کوڑا جمایا اور کہا ابے ہم شیخ نہیں خواجہ ہیں۔ وہ آدمی غصے سے

آگ ہوگیا اور ٹانگ پکڑ کر گھسیٹا، تو خوجی کھٹ سے زمین پر۔ اب چاروں شانے چت پڑے ہیں، اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ آزاد نے جو پیچھے پھر کر دیکھا تو ٹٹو آرہا ہے مگر خوجی ندارد۔ پلٹے، دیکھیں اب کیا ہوا۔ ان کے پاس پہنچے تو دیکھا پھر اسی طرح زمین پر پڑے کرولی کی ہانک لگا رہے ہیں۔

آزاد : تمھیں شرم نہیں آتی! کمزوری مار کھانے کی نشانی۔ دم نہیں ہے تو کٹے کیوں مرتے ہو؟ مفت میں جوتیاں کھانا کون جواں مردی ہے؟

خوجی : واللہ جو کرولی کہیں پاس ہوتو چلنی ہی کر ڈالوں۔ وہ تو کہیے خیریت ہوئی کہ کرولی نہ تھی نہیں تو اس وقت قبر کھودنی پڑتی۔

آزاد : اب اٹھوگے بھی یا پرسوں تک یوں ہی پڑے رہوگے۔ تم نے تو اچھا ناک میں دم کر دیا۔

خوجی : اجی، اب نہ اٹھیں گے جب تک کرولی نہ لا دوگے بس اب بنا کرولی کے نہ بنے گی۔

آزاد : بس اب بیہودہ نہ بکو، نہیں تو میں اب کی ایک لات جماؤں گا۔

خیر، دونوں آدمی یہاں سے چلے تو خوجی بولے یہاں جوڑ جوڑ میں درد ہورہا ہے۔ اس کسان کی موسنڈھی عورت نے تو کچومر ہی نکال ڈالا۔ مگر قسم ہے خدا کی جو کہیں کرولی پاس ہوتی تو غضب ہی ہوجاتا۔ ایک کو تو جیتا چھوڑتا ہی نہیں۔

آزاد : خدا گنجے کو ننچے نہیں دیتا۔ کرولی کی آپ کو ہمیشہ تلاش رہی مگر جب آئے پٹ ہی کے آئے جوتیاں ہی کھائیں۔ خیر یہ دکھڑا کوئی کہاں تک روئے، اب یہ بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟ جی متلا رہا ہے، بند بند ٹوٹ رہا ہے، آنکھیں بھی جلتی ہیں۔

خوجی : لینڈوری آگئی۔ اب حضرت بھی آتے ہوں گے۔

آزاد : یہ لینڈوری کیسی؟ اور حضرت کون؟ میں کچھ نہیں سمجھا۔ ذرا بتاؤ تو؟

خوجی : ابھی لڑکے نہ ہو بخار کی آمد ہے۔ آنکھوں کی جلن، جی کا متلانا، بدن کا ٹوٹنا، سب اسی کی علامتیں ہیں۔ اس وقت گھوڑے پر سوار ہوکر چلنا برا ہے۔ اب آپ گھوڑے سے اتر پڑیے اور چل کر کہیں لیٹ رہیے، کہنا مانیے۔

آزاد : یہاں کوئی اپنا گھر ہے جو اتر پڑوں؟ کسی سے پوچھو تو کہ گاؤں کتنی دور ہے۔

خدا کرے پاس ہی ہو، نہیں تو میں یہاں گر پڑوں گا۔ اور قبر بھی یہیں بنے گی۔

خوجی: اجی، ذرا دل کو سنبھالو۔ کوئی اتنا گھبراتا ہے؟ قبر کیسی؟ ذرا دل کو ڈھارس دیجیے۔

آزاد: واللہ، پھونکا جاتا ہوں، بدن سے آگ نکل رہی ہے۔

خوجی: وہ گاؤں سامنے ہی ہے، ذرا گھوڑی کو تیز کردو۔

آزاد نے گھوڑی کو ذرا تیز کیا تو وہ اڑ گئی۔ خوجی نے بھی کوڑے پر کوڑا جمانا شروع کیا۔ مگر لدو ٹٹو کہاں تک جاتا؟ آخر خوجی نے جھلا کر ایک ایڑ دی تو ٹٹو اگلے پاؤں پر کھڑا ہوگیا اور میاں خوجی سنبھل نہ سکے، دھم سے زمین پر آرہے۔ اب ٹٹو پر بگڑ رہے ہیں کہ نہ ہوئی کرولی اس وقت نہیں تو اتنی بھونکتا کہ بلبلانے لگتا۔ خیر کسی طرح اٹھے، ٹٹو کو پکڑا اور لد کر چلے۔ دو چار دل لگی باز آدمیوں نے تالیاں بجائیں اور کہنا شروع کیا۔ لدا ہے لدا ہے لینا، جانے نہ پائے۔ خوجی بگڑ کھڑے ہوئے۔ ہٹو سامنے سے، نہیں تو ہنٹر جماتا ہوں۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو۔ میں سپائی آدمی ہوں۔ نوابی میں دو دو تلواریں کمر سے لگی رہتی تھیں۔ اب لاکھ کمزور ہوگیا ہوں لیکن اب بھی تم جیسے پچاس پر بھاری ہوں۔ لوگوں نے خوب ہنسی اڑائی۔ جی ہاں آپ ایسے ہی جواں مرد ہیں۔ ایسے سورما ہوتے کہاں ہیں۔

خوجی: اتروں گھوڑے سے، آؤں؟

یاروں نے کہا: نہیں صاحب، ایسا غضب بھی نہ کیجیے گا! آپ ٹھہرے پہلوان اور سپاہی آدمی، کہیں مار ڈالیے آکر تو کوئی کیا کرے گا۔

اس طرح گرتے پڑتے ایک سرائے میں پہنچے اور اندر جاکر کوٹھریاں دیکھنے لگے۔ سرائے بھر میں چکر لگائے لیکن کوئی کوٹھری پسند نہ آئی۔ بھٹیاریاں پکار رہی ہیں کہ میاں مسافر ادھر آؤ ادھر دیکھو، خاصی صاف ستھری کوٹھری ہے۔ ٹٹو باندھنے کی جگہ الگ۔ اتنا کہنا تھا کہ میاں خوجی آگ ہوگئے۔ کیا کہا، ٹٹو ہے یہ پیگو کا ٹانگھن ہے۔ ایک بھٹیاری نے چمک کر کہا ٹانگھن ہے یا گدھا؟ تب تو خوجی جھلائے اور چھری اور کرولی کی تلاش کرنے لگے۔ اس پر سرائے بھر کی بھٹیاریوں نے انھیں بنانا شروع کیا۔ آخر آپ اتنے دق ہوئے کہ سرائے کے باہر نکل آئے اور بولے۔ بھئی چلو آگے کے گاؤں میں رہیں گے۔ یہاں سب کے سب شریر ہیں۔ مگر آزاد میں اتنا دم کہاں کہ آگے جاسکیں۔ سرائے میں گئے اور ایک کوٹھری میں اتر پڑے۔ خوجی نے بھی وہیں بستر جمایا۔ سائیس تو کوئی ساتھ تھا نہیں، خوجی کو اپنے ہی ہاتھ

سے دونوں جانوروں کو کھریرا کرنا پڑا۔ بھٹیاری نے سمجھا یہ سائیس ہے۔

بھٹیاری : او سائیس بھیا، ذرا گھوڑی کو ادھر باندھو۔

خوجی : کسے کہتی ہے ری سائیس کون ہے؟

بھٹیاری : اے تو بگڑتے کیوں ہو میاں، سائیس نہیں چرکٹے سہی۔

آزاد : چپ رہو یہ ہمارے دوست ہیں۔

بھٹیاری : دوست ہیں صورت تو بھلے مانسوں کی سی نہیں ہے۔

خوجی : بھئی آزاد ذرا آئینہ تو نکال دینا۔ کئی آدمی کہہ چکے۔ آج میں اپنا چہرہ ضرور دیکھوں گا۔ آخر سبب کیا ہے کہ جسے دیکھو یہی کہتا ہے۔

آزاد : چلو واہیات نہ بکو، میرا تو برا حال ہے۔

بھٹیاری نے چارپائی بچھا دی اور آزاد لیٹے۔

خوجی نے کہا : اب طبیعت کیسی ہے؟

آزاد : بری گت ہے، جی چاہتا ہے اس وقت زہر کھا لوں۔

خوجی : ضرور، اور اس میں تھوڑی سنکھیاں بھی ملا لینا۔

آزاد : مرکمبخت، دل لگی کا یہ موقع ہے؟

خوجی : اب بوڑھا ہوا مروں کس پر، مرنے کے دن تو آ گئے۔ اب تم ذرا سونے کا خیال کرو۔ دو چار گھڑی نیند آجائے تو جی ہلکا ہوجائے۔ اتنے میں بھٹیاری نے آکر پوچھا۔ میاں کیسے ہو؟

آزاد : کیا بتاؤں مر رہا ہوں۔

بھٹیاری : کس پر؟

آزاد : تم پر۔

بھٹیاری : خدا کی سنوار

آزاد : کس پر؟

بھٹیاری نے خوجی کی طرف اشارہ کرکے کہا ان پر

خوجی : افسوس، نہ ہوئی کرولی!

آزاد : ہوتی، تو کیا کرتے؟

خوجی : پھونک لیتے اپنے پیٹ میں۔

آزاد : بھئی، اب کچھ علاج کرو، نہیں تو مفت میں دم نکل جائے گا۔

بھٹیاری : ایک حکیم یہاں رہتے ہیں میں بلائے لاتی ہوں۔

یہ کہہ کر بی بھٹیاری جا کر حکیم جی کو بلا لائی۔ میاں آزاد دیکھتے ہیں تو عجب ڈھنگ کے آدمی، دھوتی باندھے، گاڑھے کی مرزئی پہنے، چہرے سے دیہاتی پن برس رہا ہے، آدمیت چھو ہی نہیں گئی۔

آزاد : حکیم صاحب، آداب۔

حکیم : ناہیں دبواؤ ناہیں، بخار میں دابے نقصان ہوت ہے۔

آزاد : آپ کا نام؟

حکیم : ہمارا نام دانگلو

آزاد : دانگلو یا جانگلو؟

حکیم : نسخہ لکھوں؟

آزاد : جی نہیں، معاف کیجیے، بس یہاں سے تشریف لے جائیے۔

حکیم : بخار میں اک بک کرت ہیں، چاند کے پٹے کتروا ڈالو۔

خوجی : کچھ بیدھا تو نہیں ہوا! نہ ہوئی کرولی، نہیں تو توند پر رکھ دیتا۔

حکیم : بھائی، ہم سے ان کا علاج نہ ہو سکے ہے۔ اب ایک ہوئے تو علاج کریں۔ یوں پاگل کو ہے ہو؟ ہم کا الٹی کا پلوا بکت ہے سسر۔

آخر خوجی نے جھلا کر ان کو اٹھا دیا اور یہ نسخہ لکھا۔

آلو بخارا دو دانہ، تمر ہندی چھ ماشہ عرق گاؤزباں دو تولہ۔

آزاد : یہ نسخہ تو آپ کل پلائیں گے یہاں تو رات بھر میں کام ہی تمام ہو جائے گا۔

خوجی : اس وقت بندا کچھ نہیں دینے کا۔ ہاں آلو کا پانی پیجیے پانچ دانے بھگوئے دیتا ہوں۔ کھانا اس وقت کچھ نہ کھانا۔

آزاد : واہ کھانا نہ ملا تو میں آپ ہی کو چٹ کر جاؤں گا۔ اس بھروسے نہ رہیے گا۔

خوجی : واللہ، ایک دانہ بھی آپ کے پیٹ میں گیا اور آپ برس بھر تک یوں ہی پڑے رہے۔ آلو کا پانی بھی گھونٹ گھونٹ کر کے پینا۔ یہ نہیں کہ پیالہ منہ سے لگایا اور غٹ غٹ پی

گئے۔

یہ کہہ کر خوجی نے چندن گھس کر آزاد کی چھاتی پر رکھا۔ پالک کے پتے چارپائی پر بچھا دیے۔ کھیرہ کاٹ کر ماتھے پر رکھا اور ذرا سا نمک باریک پیس کر پاؤں میں ملا۔ تلوے سہلائے۔

آزاد : یہاں تو کوئی حکیم بھی نہیں۔

خوجی : اجی، ہم خود علاج کریں گے۔ حکیم نہ سہی حکیموں کی آنکھیں تو دیکھی ہیں۔

آزاد : علاج تک مضائقہ نہیں مگر مار نہ ڈالنا بھائی۔ ہاں ذرا اتنا احسان کرنا۔

آزاد کی بے چینی کچھ کم ہوئی تو آنکھ لگ گئی۔ یکایک پڑوس کی کوٹھری سے شور وگل کی آواز آئی۔ آزاد چونک پڑے اور پوچھا یہ کیسا شور ہے؟ بھٹیاری تم ذرا جاکر ان کو للکارو۔

خوجی : کہو کہ ایک شریف آدمی بخار میں پڑا ہوا ہے۔ خدا کے واسطے ذرا خاموش ہو جاؤ۔

بھٹیاری : میاں میں ٹھہری عورت ذات اور وہ مردوئے۔ اور پھر اپنے آپے میں نہیں۔ جو مجھی پر پل پڑے تو کیا کروں گی؟ ہاں بھٹیارے کو بھیجے دیتی ہوں۔

بھٹیارے نے جاکر جو ان شرابیوں کو ڈانٹا تو سب کے سب اس پر ٹوٹ پڑے اور چپتیں مار مار کر بھگا دیا۔ اس پر بھٹیاری طیش میں آکر اٹھی اور انگلیاں مٹکا کر اتنی گالیاں سنائیں کہ شرابیوں کا نشہ ہرن ہوگیا۔ وہ اتنا ڈرے کہ کوٹھری کا دروازہ بند کرلیا۔

لیکن تھوڑی دیر میں پھر شور ہوا اور آزاد کی نیند اچٹ گئی۔ خوجی کو جو شامت آئی تو شرابیوں کی کوٹھری کے دروازے کو اس زور سے دھم دھمایا کہ چول نکل گئی۔ سب شرابی جھلاکر باہر نکل آئے اور خوجی پر بے بھاؤ کی پڑنے لگی۔ انھوں نے ادھر ادھر چھری اور کرولی کی بہت کچھ تلاش کی، مگر خوب پیٹے۔ اس کے بعد وہ سب سو گئے رات بھر کوئی نہ نکلا۔ صبح کو اس کوٹھری سے رونے کی آواز آئی۔ خوجی نے جاکر دیکھا تو ایک آدمی مرا پڑا ہے اور باقی سب کھڑے رو رہے ہیں۔ پوچھا تو ایک شرابی نے کہا بھائی ہم سب روز شراب پیا کرتے ہیں۔ کل کی شراب بہت تیز تھی۔ ہم نے بہت منع کیا پر بوتل کی بوتل خالی کردی۔ رات کو ہم لوگ سوئے تو اتنا البتہ کہا کہ کلیجہ پھونکا جارہا ہے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو مرا ہوا ہے۔ آپ تو جان سے گیا اور ہم کو بھی قتل کر گیا۔

خوجی : غضب ہوگیا۔ اب تم سب دھرے جاؤ گے اور سزا پاؤ گے۔

شرابی : ہم کہیں گے سانپ نے کاٹا تھا۔

خوجی : کہیں ایسی بھول بھی نہ کرنا۔

شرابی : اچھا، بھاگ جائیں گے۔

خوجی : تب تو ضرور ہی پکڑے جاؤ گے۔ لوگ تاڑ جائیں گے کہ کچھ دال میں کالا ہے۔

شرابی : اچھا ہم کہیں گے کہ چھری مار مار کر مر گیا اور گلے میں چھری بھی بھونک دیں گے۔

خوجی : یہ حماقت ہے، میں جیسے کہوں ویسے کرو۔ تم سب کے سب روؤ اور سر پیٹو۔ ایک کہے کہ میرا سگا بھائی تھا، دوسرا کہے کہ میرا بہنوئی تھا۔ تیسرا اسے ماموں بتائے۔ جو کوئی پوچھے کہ کیا ہوا تھا، تو گردے کا درد بتاتا۔ خوب چلا چلا کر رونا۔ جو یوں آنسو نہ آویں تو مرچے لگا لو۔ آنکھوں میں ڈھول جھونک لو۔ ایسا نہ ہو کہ گڑبڑا جاؤ اور جیل خانے جاؤ۔

ادھر تو شرابیوں نے رونا پیٹنا شروع کیا، ادھر کسی نے جا کر تھانے میں جڑ دی کہ سرائے میں کئی آدمیوں نے مل کر ایک مہاجن کو مار ڈالا۔ تھانے دار اور دس چوکیدار رپ رپ کرتے آپہنچے۔ ارے او بھٹیاری بتا وہ مہاجن کہاں ٹکا ہوا تھا؟

بھٹیاری : کون مہاجن؟ کسی کا نام تو لیجیے۔

تھانیدار : تیرا باپ، اور کون!

بھٹیاری : میرا باپ؟ اس کی تلاش ہے تو قبرستان جایئے۔

تھانیدار : خون کہاں ہوا؟

بھٹیاری : خون! ارے توبہ کر بندے۔ خون ہوا ہوگا تھانے پر۔

تھانیدار : ارے اس سرائے میں کوئی مرا ہے رات کو؟

بھٹیاری : ہاں تو یوں کہیے وہ دیکھیے، بیچارے کھڑے رو رہے ہیں۔ ان کے بھائی تھے۔ کل درد ہوا۔ رات کو مر گئے۔

تھانیدار : لاش کہاں ہے؟

شرابی : حضور، یہ رکھی ہے۔ ہائے ہم تو مر مٹے۔ گھر میں جا کر کیا منہ دکھائیں گے، کس منہ سے اب گھر جائیں گے۔ کسی ڈاکٹر کو بلوایئے، ذرا نبض تو دیکھ لیں۔

تھانیدار : اجی اب نبض میں کیا رکھا ہے۔ بیچارہ بری موت مرا۔ اب اس کے دفن کفن کی فکر کرو۔

تھانیدار چلا گیا، تو میاں خوجی خوب کھلکھلا کر ہنسے کہ واللہ کیا بات بنائی ہے۔ شرابیوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی کہ واہ استاد، کیا جھانسا دیا۔ آپ کی بدولت جان بچی، نہیں تو نہ جانے کس مصیبت میں پھنس جاتے۔

تھوڑی ہی دیر بعد کسی کوٹھری سے پھر شور غُل سنائی دیا۔

آزاد : اب یہ کیسا غُل ہے بھائی؟ کیا یہ بھی کوئی شرابی ہے؟

بھٹیاری : نہیں ایک رئیس کی لڑکی ہے۔ اس پر ایک پریت آیا ہے۔ ذرا سی لڑکی لیکن اتنی دلیر ہوگئی ہے کہ کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلتی۔

آزاد : یہ سب ڈھکوسلا ہے۔

بھٹیاری : اے واہ ڈھکوسلا ہے۔ اس لڑکی کا بھائی آگرہ میں تھا اور وہاں سے پانچ سو روپے اپنے باپ کی تھیلی سے چرا لایا۔ یہاں جو آیا تو لڑکی نے کہا کہ تو چور ہے چوری کر کے آیا ہے۔

آزاد : اجی اس لڑکے نے اپنی بہن سے کہہ دیا ہوگا نہیں تو بھلا اسے کیا خبر ہوتی؟

بھٹیاری : بھلا غزلیں اسے کہاں سے یاد ہیں؟

آزاد : اس میں اچرج کی کون سی بات ہے؟ تمھیں بھی دو چار غزلیں یاد ہی ہوں گی۔

بھٹیاری : میں یہ نہ مانوں گی۔ اپنی آنکھوں دیکھ آئی ہوں۔

آزاد تو کھچڑی پکوا کر کھانے لگے اور میاں خوجی گھاس لانے چلے۔ جب گھسیاری نے بارہ آنے مانگے تو آپ نے کرولی دکھائی، اس پر گھسیاری نے گٹا ان پر پھینک دیا۔ بیچارے گٹے کے بوجھ سے زمین پر آرہے۔ نکلنا مشکل ہوگیا۔ لگے چیخنے۔ نہ ہوئی کرولی نہیں تو بتا دیتا۔ اچھے اچھے ڈاکو میرا لوہا مانتے ہیں۔ ایک نہیں پچاسوں کو میں نے چیرگٹو کیا ہے۔ یہ گھسیارن مجھ سے لڑے۔ اب اٹھاتی ہے گٹھا یا آکر کرولی بھونکوں؟

لوگوں نے گٹھا اٹھایا تو میاں خوجی باہر نکلے۔ داڑھی مونچھ پر مٹی جم گئی تھی، لت پت ہوگئے تھے۔ ادھر آزاد کھچڑی کھا کر لیٹے ہی تھے کہ قے ہوئی اور پھر بخار ہوگیا۔ تڑپنے لگے۔ تب خوجی بھی گھبرائے۔ سوچے اب بنا حکیم کے کام نہ چلے گا؟ بھٹیاری سے پوچھ کر ایک حکیم

کے یہاں پہنچے۔

حکیم صاحب پالکی پر سوار ہوکر آ پہنچے۔

خوجی : بے حد کمزوری ہے، بات کرنے کی طاقت نہیں۔

حکیم : یہ آپ کے کون ہیں؟

خوجی : جی حضور، یہ غلام کا لڑکا ہے۔

حکیم : آپ مجھے مسخرے معلوم ہوتے ہیں۔

خوجی : جی ہاں، مسخرا نہ ہوتا تو لڑکے کا باپ ہی کیوں ہوتا۔

آزاد : جناب یہ بے حیا بے شرم آدمی ہے۔ نہ اس کو جوتیاں کھانے کا ڈر، نہ چپتیائے جانے کا خوف، اس کی باتوں کا تو خیال ہی نہ کیجیے۔

خوجی : حکیم صاحب، مجھے تو کچھ دنوں سے بواسیر کی شکایت ہوگئی ہے۔

حکیم : اجی، میں خود ہی اس شکایت میں گرفتار ہوں۔ میرے پاس اس کا آزمایا ہوا نسخہ موجود ہے۔

خوجی : تو آپ نے اپنے بواسیر کا علاج کیوں نہ کیا؟

آزاد : خوجی، تمھاری شامت آئی ہے۔ آج پٹو گے۔

خیر، حکیم صاحب نے نسخہ لکھا اور رخصت ہوئے۔ اب سنیے کہ نسخے میں لکھا تھا۔ روغن گل۔ آپ نے پڑھا روغنِ گل، یعنی مٹ کا تیل۔ آپ نسخہ بندھوا کر لائے اور مٹی کے تیل میں پکا کر آزاد کو پلایا۔ تو مٹی کے تیل کی بدبو آئی۔ آزاد نے کہا یہ بدبو کیسی ہے؟ اس پر میاں خوجی نے انھیں خوب ہی للکارا۔ واہ، بڑے نازک مزاج ہیں اب کوئی عطر پلائے آپ کو، یا کیسر کا کھیت چرائے، تب آپ خوش ہوں۔ آزاد چپ ہورہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اتنے زور کا بخار چڑھا کہ خوجی دوڑے ہوئے حکیم صاحب کے پاس گئے اور بولے۔ جناب مریض بہت بے چین ہے۔ اور کیوں نہ ہو آپ نے بھی تو مٹی کا تیل نسخے میں لکھ دیا۔

حکیم : مٹی کا تیل کیسا؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔

خوجی : جی ہاں، آپ کاہے کو سمجھنے لگے۔ آپ ہی تو روغنِ گِل لکھ آئے تھے۔

حکیم : ارے بھلے آدمی، کیا غضب کیا! کیسے جانگلوؤں سے پالا پڑا ہے۔ ہم نے لکھا روغنِ گُل، اور آپ مٹی کا تیل دے آئے۔ واللہ، اس وقت اگر آپ میرے مکان پر نہ آئے

ہوتے تو کھڑے کھڑے نکلوا دیتا۔

خوجی : آپ کے ہواس تو خود ہی ٹھکانے نہیں۔ آپ کے مکان پہ نہ آیا ہوتا تو آپ نکلوا کہاں سے دیتے؟ جناب، پہلے فسد کھلوایئے۔

یہ کہہ کر میاں خوجی لوٹ آئے۔ آزاد نے کہا بھئی، حکیم کو تو دیکھ چکے، اب کوئی ڈاکٹر لاؤ۔

خوجی : ڈاکٹروں کی دوا گرم ہوتی ہے۔ بخار کا علاج ان لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔

آزاد : آپ ہیں احمق! جا کر چپکے سے کسی ڈاکٹر کو بلا لایئے۔

خوجی پتہ پوچھتے ہوئے اسپتال چلے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔

ڈاکٹر : زبان دکھاؤ، جناب!

آزاد : بہت خوب!

ڈاکٹر : آنکھیں دکھاؤ!

آزاد : آنکھیں دکھاؤں تو گھبرا کر بھاگو۔

ڈاکٹر : کیا بک بک کرتا ہے، آنکھ دکھا۔

خیر ڈاکٹر صاحب نے نسخہ لکھا اور فیس لے کر چمپت ہوئے۔ آزاد نے چار گھنٹے ان کی دوا کی، مگر پیاس اور بے چینی بڑھتی گئی۔ سیروں برف پی گئے، مگر تسکین نہ ہوئی۔ الٹے اور پیچش نے ناک میں دم کر دیا۔ صبح ہوتے ہوتے میاں خوجی ایک ویدھ راج کو بلا لائے۔ انھوں نے ایک گولی دی اور شہد کے ساتھ چٹا دی۔ تھوڑی دیر میں آزاد کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے۔ خوجی بہت گھبرائے اور دوڑے ویدھ کو بلانے۔ راہ میں ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر مل گئے۔ یہ انھیں گھیر گھار کر لائے۔ انھوں نے ایک چھوٹی سی شیشی سے دوا کی دو بوندیں پانی میں ڈال دیں۔ اس کے پیتے ہی آزاد کی طبیعت اور بھی بے چین ہوگئی۔

میاں آزاد نے دو تین دن میں اتنے حکیم، ڈاکٹر اور ویدھ بدلے کہ اپنی ہی مٹی پلید کر لی۔ اس قدر طاقت بھی نہ رہی کہ کھٹیا سے اٹھ سکیں۔ خوجی نے اب انھیں ڈانٹنا شروع کیا۔ اور سویئے اوس میں۔ ذرا سی لنگی باندھ لی اور تر بچھونے پر سو رہے۔ پھر آپ بیمار نہ ہوں تو کیا ہم ہوں۔ روز کہتا تھا کہ اوس میں سونا برا ہے مگر آپ سنتے کس کی ہیں۔ آپ اپنے کو تو جالینوس سمجھتے ہیں اور باقی سب کو گدھا۔ دنیا میں بس ایک آپ ہی تو بقراط ہیں۔

بھٹیاری : اے تم بھی عجب آدمی ہو! بھلا کوئی بیمار کو ایسے ڈانٹتا ہے؟ جب اچھے ہو جائیں تو خوب کوس لینا۔ اور جو اوس کی کہتے ہو تو میاں یہ تو عادت پر ہے۔ ہم تو دس برس سے اوس ہی میں سوتے ہیں۔ آج تک زکام بھی جو ہوا ہو تو قسم لے لو۔

آزاد : کوسنے دو۔ اب یہاں گھڑی دو گھڑی کے اور مہمان ہیں۔ اب مرے۔ نہ جانے کس بری ساعت گھر سے چلے تھے۔ حسن آرا کے پاس خط بھیج دو کہ ہم کو آکر دیکھ جائیں۔ آج اس وقت سرائے میں لیٹے ہوئے باتیں کر رہے ہیں، کل پرسوں تک قبر میں ہوں گے۔

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس
ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

خوجی : میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم کو سرسام نہ ہو جائے۔

بھٹیاری : چپ بھی رہو، آخر کچھ عقل بھی ہے؟

آزاد : میرے دن ہی برے آئے ہیں، ان کا کوئی قصور نہیں۔

بھٹیاری : آپ نے بھی تو حکیم کی دوا کی۔ حکیم لٹکائے رہتے ہیں۔

آزاد : خدا حکیموں سے بچائے۔ مونگ کی کھچڑی دے دے کر مریض کو ادھ مرا کر ڈالتے ہیں۔ اس پر پیالے بھر بھر دوا۔ اگر دو مہینے میں بھی کھٹیا چھوڑی تو سمجھیے کہ بڑا خوش نصیب تھا۔

خوجی : جی ہاں، جب ڈاکٹر نہ تھے، تب تو سب مر ہی جاتے تھے۔

آزاد : خیر، چپ رہو، سر مت کھاؤ۔ اب ہمیں سونے دو۔

میاں آزاد کی آنکھ لگ گئی۔ خوجی بھی اونگھنے لگے۔ ایک آدمی نے آکر تو ان کو جگایا اور کہاں میرے ساتھ آیئے آپ سے کچھ لینا ہے۔ خوجی نے دیکھا ان کی خاصی جوڑ تھی۔ ان سے انگل دو انگل دبتے ہی تھے۔

خوجی : تو آپ پلے کیوں پڑتے ہیں؟ دور ہی سے کہیے، جو کچھ کہنا ہو۔

مسافر : میاں آزاد کہاں ہیں؟

خوجی : آپ اپنا مطلب کہیے، یہاں تو آزاد وزاد کوئی نہیں ہے۔ آپ اپنا خاص مطلب

کہیے۔

مسافر : اجی، آزاد ہمارے بہنوئی ہیں۔ ہماری بہن نے بھیجا ہے کہ دیکھو کہاں ہیں۔

خوجی : ان کی شادی تو ہوئی نہیں بہنوئی کیوں کر بن گئے؟

مسافر : کتنے عقل کے دشمن ہ ، بھلا کوئی بے وجہ کسی کو اپنا بہنوئی بنائے گا؟

خوجی : بھلا آزاد کی بیوی کہاں ہیں؟ ہم کو تو دکھا دیجیے۔

مسافر : اجی، اس سرائے کے اس کونے میں چلو دکھا دیں۔تم سے کیا چوری ہے۔

خوجی میاں کوٹھری کے اندر آئے۔ بالوں میں تیل ڈالا سفید کپڑے پہنے۔ لال پھوند نے دار ٹوپی دی۔ میاں آزاد کا ایک خاکی کوٹ ڈاٹا اور جب خوب بن ٹھن چکے تو آئینہ لے کر صورت دیکھنے لگے۔ بس غضب ہی تو ہوگیا۔ داڑی کے بال اونچے نیچے پائے، مونچھیں گری پڑی۔ آپ نے قینچی لے کر بال برابر کرنا شروع کیا۔قینچی تیز تھی، ایک طرف کی مونچھ بالکل اڑ گئی۔ اب کیا کرتے، اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری۔ مجبور ہوکر باہر آئے، تو مسافر انھیں دیکھ کر ہنس پڑا۔ مگر آدمی تھا چالاک، ضبط کیے رہا اور خوجی کو ساتھ لے چلا۔ جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک عورت عطر میں بسی ہوئی، رنگین کپڑے پہنے چارپائی پر سو رہی ہے۔ زلفیں کالی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی، گردن کے اردگرد پڑی ہوئی ہیں۔ خوجی لگے آنکھیں سینکنے۔ اتنے میں اس عورت نے آنکھیں کھول دیں اور خوجی کو دیکھ کر للکارا۔تم کون ہو؟ یہاں کیا کام؟

خوجی : آپ کے بھائی پکڑ لائے۔

عورت : اچھا، پنکھا جھلو، مگر آنکھیں بند کر کے۔ خبردار مجھے نہ دیکھنا۔ خوجی پنکھا جھلنے لگے اور اس عورت نے جھوٹ موٹ آنکھیں بند کرلیں۔ ذرا دیر میں آنکھ کھولی تو دیکھا کہ خوجی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ اس کا آنکھیں کھولنا تھا کہ میاں خوجی نے آنکھیں خوب زور سے بند کرلیں۔

عورت : کیوں جی، گھورتے کیوں ہو! بتاؤ کیا سزا دوں؟

خوجی : اتفاق سے آنکھ کھل گئی۔

عورت : اچھا بتاؤ میاں آزاد کہاں ہیں؟

ادھر میاں آزاد کی آنکھ جو کھلی تو خوجی ندارد۔ جب گھنٹوں ہوگئے اور خوجی نہ آئے تو ان کا ماتھا ٹھنکا کہ کمزور آدمی ہیں ہی کسی سے ٹرائے ہوں گے، اس نے گردن ناپی ہوگی۔

بھٹیارے کو بھیجا جاکر ذرا دیکھو تو۔ اس نے ہنس کر کہا ذری سے تو آدمی ہیں، بھیڑیا اٹھا لے گیا ہوگا۔ دوسرا بولا، آج ہوا سناٹے کی چلتی ہے کہیں اڑ گئے ہوں گے۔ آخر بھٹیاری نے کہا کہ انھیں تو ایک آدمی بلاکر لے گیا ہے۔ خوجی خوب بن ٹھن کر گئے ہیں۔

آزاد کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے کہ خوجی کو کون پکڑ لے گیا۔ گڑگڑا کر بھٹیاری سے کہا چاہے جو ہو خوجی کو لاؤ۔ کسی سے پوچھو پاچھو۔ آخر گئے کہاں؟

ادھر میاں خوجی اس عورت کے ساتھ بیٹھ کر دسترخوان پر ہتھے لگا رہے تھے۔ کھاتے جاتے تھے اور تعریفیں کرتے جاتے تھے۔ ایک لقمہ کھایا اور کئی منٹ تک تعریف کی۔ یہ تو تعریف ہی کرتے رہے اور ادھر میاں مسافر نے دسترخوان صاف کر دیا۔ خوجی دل میں پچھتائے کہ ہم سے کیا حماقت ہوئی۔ پہلے خوب پیٹ بھر کھا لیتے، پھر چاہے دن بھر بیٹھے تعریف کرتے۔اس عورت نے پوچھا کہ کچھ اور لاؤں؟ شرمایئے گا نہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ خوجی کچھ مانگنے ہی والے تھے کہ میاں مسافر نے کہا، نہیں جی، اب کیا ہیضہ کراؤ گی؟ یہ کہہ کر اس نے دسترخوان ہٹا دیا اور خوجی منہ تاکتے رہ گئے۔ کھانا کھانے کے بعد پان کی باری آئی۔ دو ہی گلوریاں تھیں۔ مسافر نے ایک تو اس عورت کو دی اور دوسری اپنے منہ میں رکھ لی۔ خوجی پھر منہ دیکھ کر رہ گئے۔ اس کے بعد مسافر نے ان سے کہا۔ میاں ہوت، ارے بھائی تم سے کہتے ہیں۔

خوجی : کس سے کہتے ہو جی؟ کیا کہتے ہو؟

مسافر : یہی کہتے ہیں کہ ذرا پلنگ سے اتر کر بیٹھو۔ کیا مزے سے برابر جاکر ڈٹ گئے۔ اترا کہ میں پہنچوں؟ اور دیکھیے، آپ پلنگ پر چڑھ کر بیٹھے ہیں۔ اپنی حیثیت کو نہیں دیکھتا۔

خوجی : چپ گیدی، نہ ہوئی کرولی، نہیں تو بھونک دیتا۔

عورت : کرولی پیچھے ڈھونڈھیے گا، پہلے ذرا یہاں سے کھسک کر نیچے بیٹھیے۔

خوجی : بہت اچھا، اب بیٹھوں تو توپ پر اڑا دینا۔

مسافر : لے چلو، اٹھو، یہ لو جھاڑو۔ ابھی جھاڑو دے ڈالو۔

خوجی : جھاڑو تم دو۔ ہم کو کوئی بھڑبھوجا سمجھا ہے؟ ہم خاندانی آدمی ہیں۔ رئیسوں سے اس طرح باتیں کہتا ہے گیدی۔

مسافر : ہمیں تو نانبائی سا معلوم ہوتا ہے۔ چلیے، اٹھیے، جھاڑ دیجیے۔ بڑے رئیس زادے بن کر بیٹھے ہیں۔ رئیسوں کی ایسی ہی صورت ہوا کرتی ہے؟

خوجی نے دل میں سوچا کہ جس سے ملتا ہوں، وہ یہی کہتا ہے کہ بھلے مانس کی ایسی صورت نہیں ہوتی۔ اور اس وقت تو ایک طرف کی مونچھ ہی اڑ ہی گئی ہے، بھلامانس کون کہے گا۔ کچھ نہیں اب ہم پہلے منہ بنوائیں گے۔ بولے اچھا رخصت۔

مسافر : واہ کیا دل لگی ہے، بیٹھیے چلم بھر کے جایئے گا۔

میاں خوجی ایسے جھلائے کہ چمٹ ہی تو گئے۔ دونوں میں چپت بازی ہونے لگی۔ دونوں کا قد کوئی چھ چھ بالشت کا، دونوں مریل، دونوں چنڈوباز۔ یہ آہستہ سے ان کو چپت لگاتے ہیں، وہ دھیرے سے ان پر دھپ جماتے ہیں۔ انھوں نے ان کے کان پکڑے، انھوں نے ان کی ناک پکڑی۔ انھوں نے ان کو کاٹ کھایا، انھوں نے ان کو نوچ لیا۔ اور مزہ یہ کہ دونوں رو رہے ہیں۔ میاں خوجی کرولی کی دھن باندھے ہوئے ہیں۔ آخر دونوں ہانپ گئے۔ نہ یہ جیتے نہ وہ۔ خوجی لڑکھڑا کر گرے، تو چاروں شانے چت۔ اس حسینہ نے دو تین دھول اوپر سے جما دیے۔ ان کا تو یہ حال ہوا ادھر میاں مسافر نے چکر کھایا اور دھم سے زمین پر۔ آخر حسینہ نے دونوں کو اٹھایا اور کہا بس لڑائی ہوچکی۔ اب کیا کٹ ہی مروگے؟ چلو، بیٹھو۔

خوجی : نہ ہوئی کرولی، نہیں تو بھونک دیتا۔ ہت تیرے کی۔

مسافر : وہ تو ہانپ گیا، نہیں تو دکھا دیتا آپ کو مزہ۔ کچھ ایسا ویسا سمجھ لیا ہے۔ سیکڑوں پیچ یاد ہیں۔

حسینہ : خبردار جو اب کسی کی زبان کھلی۔ چلو اب چلیں میاں آزاد کے پاس۔ ان کی بھی تو خبر لیں جس کام کے لیے یہاں تک آئے ہیں۔

شام ہوگئی تھی۔ حسینہ دونوں آدمیوں کے ساتھ آزاد کی کوٹھری میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ آزاد سوئے ہیں اور بھٹیاری بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔ اس نے جٹ آزاد کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ آزاد کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ دیکھا اللہ رکھی سرہانے کھڑی ہیں اور میاں چنڈوباز سامنے کھڑے پاؤں دبا رہے ہیں۔ آزاد کی جان سی نکل گئی۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا، ہوش پیترے ہوگئے۔ یا خدا یہاں یہ کیسے پہنچی؟ کس نے پتا بتایا؟ ذرا بیماری ہلکی ہوئی تو اس بلا نے آ دبوچا۔

ایک آفت سے تو مرے مر کے ہوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی میرے اللہ نئی

خوجی: حضرت اٹھیے، دیکھیے سرہانے کون کھڑا ہے۔ واللہ پھڑک جاؤ تو سہی۔

آزاد: (اللہ رکھی سے) بیٹھیے بیٹھیے خوب ملیں۔

خوجی: اجی، ابھی ہم سے اور آپ کے سالے سے بڑی ٹھائیں ٹھائیں ہوگئی۔ وہ تو کہیے کرولی نہ تھی نہیں سالار جنگ کے پلستر بگاڑ دیے ہوتے۔

آزاد نے خوجی، چنڈوباز اور بھٹیاری کو کمرے کے باہر جانے کو کہا۔ جب دونوں اکیلے رہ گئے تو آزاد نے اللہ رکھی سے کہا۔ کہیے آپ کیسے تشریف لائی ہیں؟ ہم تو وہ آزاد ہی نہیں رہے۔ وہ دل ہی نہیں، وہ امنگ ہی نہیں اب تو روم ہی جانے کی دھن ہے۔

اللہ رکھی: پیارے آزاد، تم تو چلے روم کو۔ ہمیں کس کے سپرد کیے جاتے ہو؟ نہ ہو زمین ہی کو سونپ دو۔ اب ہم کس کے ہو کر رہیں؟

آزاد: اب ہماری عزت اور آبرو آپ ہی کے ہاتھ ہے۔ اگر روم سے جیتے واپس آئے تو تم کو نہ بھولیں گے۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی بیڑا پار کرے گا۔ میری طبیعت دو تین دن سے اچھی نہیں ہے۔ کل تو نہیں پرسوں ضرور روانہ ہوں گا۔

خوجی: (بھیتر آکر) بی اللہ رکھی ابھی پوچھ رہی تھیں کہ مجھ کو کس کے سپرد کیے جاتے ہو، آپ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ جو کوئی اور نہ ملے تو ہمیں یہ مصیبت سہیں۔ ہمارے ہی سپرد کر دیجیے۔ آپ جائیے، ہم اور وہ یہاں رہیں گے۔

آزاد: تم یہاں کیوں چلے آئے؟ نکلو یہاں سے۔

اللہ رکھی بڑی دیر تک آزاد کو سمجھاتی رہی۔ ہمارا کچھ خیال نہ کرو، ہمارا اللہ مالک ہے۔ تم حسن آرا سے قول ہارے ہو تو روم جاؤ اور ضرور جاؤ، خدا نے چاہا تو سرخ رو ہو کر آؤ گے۔ میں بھی جا کر حسن آرا ہی کے پاس رہوں گی۔ انھیں تسلی دیتی رہوں گی۔ ذرا جو کسی پر کھلنے پاوے کہ مجھ سے تم سے کیا تعلق ہے۔ اتنا خیال رہے کہ جہاں جہاں ڈاک جاتی ہو وہاں وہاں سے خط برابر بھیجتے جانا۔ ایسا نہ ہو کہ بھول جاؤ۔ نہیں تو وہ کڑھ کڑھ کر مر ہی جائے گی۔ اور میرا تو جو حال ہے اس کو خدا ہی جانتا ہے۔ اپنا دکھ کس سے کہوں؟

آزاد: اللہ رکھی، خدا کی قسم ہم تم کو اپنا اتنا سچا دوست نہیں جانتے تھے۔ تم کو میرا اتنا

خیال اور میری اتنی محبت ہے، یہ تو آج معلوم ہوا۔

اس طرح دو تین گھنٹے تک دونوں نے باتیں کیں۔ جب اللہ رکھی روانہ ہوئی تو دونوں گلے مل کر خوب روئے۔

(26)

آزاد نے سوچا کہ ریل پر چلنے سے ہندستان کی حالت دیکھنے میں نہ آئے گی۔ اس لیے وہ لکھنؤ کے اسٹیشن پر سوار نہ ہوکر گھوڑے پر چلے تھے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر جانا، جنگل اور دیہات کی سیر کرنا، نئے نئے آدمیوں سے ملنا انھیں پسند تھا۔ ریل پر یہ موقع نہیں ملتے۔ اللہ رکھی کے چلے جانے کے ایک دن بعد وہ بھی چلے۔ گھومتے گھومتے ایک قصبے میں جا پہنچے۔ بیماری سے تو اٹھے ہی تھے، تھک تھک کر ایک مکان کے سامنے بستر بچھایا اور ڈٹ گئے۔ میاں خوجی نے آگ سلگائی اور چلم بھرنے لگے۔ اتنے میں اس مکان کے اندر سے ایک بوڑھے میاں نکلے اور پوچھا آپ کہاں جارہے ہیں؟

آزاد : ارادہ تو بڑی دور کا کرکے چلا ہوں، روم کا سفر ہے دیکھوں پہنچتا ہوں یا نہیں۔

بوڑھے میاں : خدا آپ کو سرخ رو کرے۔ ہمت کرنے والے کی مدد خدا کرتا ہے۔ آیئے آرام سے گھر میں بیٹھیے۔ یہ بھی آپ ہی کا گھر ہے۔

آزاد اس مکان میں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عورت چک اٹھائے مسکرا رہی ہے۔ آزاد جیوں ہی فرش پر بیٹھے وہ حسینہ باہر نکل گئی اور بولی۔ میرے پیارے آزاد آج برسوں کے بعد تمھیں دیکھا۔ سچ کہنا کتنی جلدی پہچان گئی۔ آج منہ مانگی مراد پائی۔

میاں آزاد چکرائے کہ یہ حسینہ کون ہے جو اتنی محبت سے پیش آتی ہے۔ اب صاف صاف کیسے کہیں کہ ہم نے تمھیں نہیں پہچانا۔ اس حسینہ نے یہ بات تاڑ لی اور مسکرا کر کہا:

ہم ایسے ہوگئے اللہ اکبر اے تیری قدرت

ہمارا نام سن کر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

آپ اور ہمیں اتنی جلدی بھول جائیں۔ ہم وہ ہیں جو لڑکپن میں تمھارے ساتھ کھیلا کیے ہیں۔ تمھارا مکان ہمارے مکان کے پاس تھا۔ میں تمھارے باغ میں روز پھول چننے جایا کرتی تھی۔ اب سمجھے کہ اب بھی نہیں سمجھے؟

آزاد : آہاہا، اب سمجھا اف اوہ! برسوں بعد تمھیں دیکھا۔ میں بھی سوچتا تھا کہ یا خدا یہ کون ہے کہ ایسی بے جھجک ہو کر ملی۔ مگر پہچانتے تو کیوں کر پہچانتے؟ تب میں اور اب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ سچ کہتا ہوں زینت تم کچھ اور ہی ہو گئی ہو۔

زینت : آج کسی بھلے کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی۔ جب سے تم گئے زندگی کا مزہ جاتا رہا۔

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کٹتی
اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا

آزاد : یہاں بھی بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں، لیکن تمھیں دیکھتے ہی ساری کلفتیں دور ہو گئیں :

تب لطف زندگی ہے، جب ابر ہو چمن ہو
پیش نظر ہو ساقی پہلو میں گل بدن ہو

یہاں اختر نہیں نظر آتی۔

زینت : ہے تو، مگر اس کی شادی ہو گئی۔ تمھیں دیکھنے کے لیے بہت تڑپتی تھی۔ اس بیچاری کو چچا جان نے جان بوجھ کر کھاری کوئیں میں ڈھکیل دیا۔ ایک لچے کے پالے پڑی ہے، دن رات رویا کرتی ہے۔ ابا جان جب سے سدھارے، ان کے پالے پڑے ہیں۔ جب دیکھو، سوٹا لیے کلے پر کھڑے رہتے ہیں۔ ایسے شہدے کے ساتھ بیاہ دیا جس کا ٹھور نہ ٹھکانہ۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کوئی روپے والا یا بہادر شاہ کے خاندان کا ہوتا۔ غریب آدمی کی لڑکی کچھ غریبوں ہی کے یہاں خوش رہتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سمجھ دار ہو، چال چلن اچھا ہو، یہ نہیں کہ پڑھے نہ لکھے، نام محمد فاضل، الف کے نام ب نہیں جانتے، مگر دعویٰ یہ ہے کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔ ہمارے نزدیک جس کی عادت بری ہو اس سے بڑھ کر پاجی کوئی نہیں۔ مگر اب تو جو ہونا تھا سو ہوا، تم خوب جانتے ہو آزاد کی سالی کو اپنے بہنوئی کا کتنا پیار ہوتا ہے۔ مگر تم لو جو اس کا نام لینے کو بھی جی چاہتا ہے۔ بیوی کا زیور سب بیچ کر چٹ کر گیا، کچھ داؤں پر رکھ آیا، کچھ کے اونے پونے کیے۔ مکان دکان سب اسی جوئے کے پھیر میں گھوم گیا۔ اب ٹکے ٹکے کو محتاج ہے۔ ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کسی دن یہاں آکر کپڑے لتے نہ اٹھا لے جائے۔ چچا کو اس کا سب حال معلوم تھا مگر لڑکی کو بھاڑ میں جھونک ہی دیا۔ آتی ہوگی، دیکھنا کیسی گھل کے کانٹا ہو گئی ہے۔ ہڈی ہڈی گن لو۔ اے اختر ذرا

یہاں آؤ میاں آزاد آئے ہیں۔

ذرا دیر میں اختر آئی۔ آزاد نے اس کو اور اس نے آزاد کو دیکھا تو دونوں بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مگر ذرا ہی دیر میں اختر کی آنکھیں بھر آئیں اور گول گول آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ آزاد نے کہا بہن ہم تمھارا سب حال سن چکے، پر کیا کریں کچھ بس نہیں۔ اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی سب کا مالک ہے۔ کسی حالت میں آدمی کو گھبرانا نہ چاہیے۔ صبر کرنے والوں کا درجہ بڑا ہوتا ہے۔

اس پر اختر نے اور بھی آٹھ آٹھ آنسو رونا شروع کیا۔

زینت بولی: بہن آزاد بہت دنوں کے بعد آئے ہیں۔ یہ رونے کا موقع نہیں۔

آزاد: اختر، وہ دن یاد ہیں جب تم کو ہم چڑھایا کرتے تھے اور تم انگور کی ٹٹی میں روٹھ کر چھپ رہتی تھیں، ہم ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تمھیں منا لاتے تھے اور پھر چڑھاتے تھے؟ ہم کو جو تمھاری دونوں کی محبت ہے اس کا حال ہمارا خدا ہی جانتا ہے۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا کہ میں تم کو اس مصیبت میں دیکھتا۔ تمھاری وہ صورت ہی بدل گئی۔

اختر: بھائی اس وقت تم کو کیا دیکھا، جیسے جان میں جان آگئی۔ اب پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں سے جاؤ گے تو نہیں؟ ادھر تم گئے اور ادھر ہمارا جنازہ نکلا۔ برسوں بعد تمھیں دیکھا ہے اب نہ چھوڑوں گی۔

اسی طرح باتیں کرتے کرتے رات ہوگئی۔ آزاد نے دونوں بہنوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ تب زینت بولی۔ آج پرانی صحبتوں کی بہار آنکھوں میں پھر گئی۔ آئیے کھانا کھا کر چمن میں چلیں۔ باغ تو ویران ہے مگر چلیے ذرا دل بہلا آئیں۔ قسم لیجیے جو مہینوں چمن کا نام بھی لیتی ہوں۔

نظر آتا ہے گل آزردہ دشمن باغباں مجھ کو
بنانا تھا نہ ایسے بوستاں میں آشیاں مجھ کو

آزاد: اوہوہو، یہ پرانا درخت ہے۔ اسی کے سائے میں ہم رات رات بیٹھے رہتے تھے۔ آہاہا، یہ وہ روش ہے جس پر ہمارا پاؤں پھسلتا تھا اور ہم گرے، تو اختر خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ تمھارے یہاں ایک بوڑھی عورت تھی زینب کی ماں۔

اختر: تھیں کیوں، کیا اب نہیں ہیں؟ اے وہ ہم سے تم سے ہٹی کٹی ہے۔ کھاسی کٹھوتا

سی بنی ہوئی ہے۔

آزاد : کیا وہ بوڑھی ابھی تک زندہ ہے؟ کیا عاقبت کے بورے بٹورے گی؟ چلتے چلتے باغ میں ایک جگہ دیوار پر لکھا دیکھا کہ میاں آزاد نے آج اس باغ کی سیر کی۔

اتنے میں زینت کے بوڑھے چچا آپہنچے اور بولے، بھئی ہم نے آج جو تمھیں دیکھا تو خیال نہ آیا کہ کہاں دیکھا ہے۔ خوب آئے۔ یہ تو بتلاؤ اتنے دن رہے کہاں؟ زینت تمھیں روز یاد کرتی تھی، اٹھتے بیٹھتے تمھارا ہی نام زبان پر رہتا تھا۔ اب آپ یہیں رہیے۔ زینت کو جو تم سے محبت ہے وہ اس کا اور تمھارا دونوں کا دل جانتا ہوتا۔ میری دلی آرزو ہے کہ تم دونوں کا نکاح ہوجائے۔ اسی باغ میں رہیے اور اپنا گھر سنبھالیے۔ میں تو اب گوشے بیٹھ کر خدا کی بندگی کرنا چاہتا ہوں۔

میاں آزاد یہ باتیں سن کر پانی پانی ہوگئے۔ ہاں، کہیں تو نہیں بنتی، نہیں کہیں تو شامت آئے۔ سناٹے میں تھے کہ کہیں کیا۔ آخر بہت دیر کے بعد بولے۔ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ آپ کی مہربانی ہے۔ میں تو اپنے کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ جس کا ٹھور نہ ٹھکانہ وہ زینت کے قابل کب ہوسکتا ہے؟

میاں آزاد تو یہاں چین کر رہے تھے، ادھر میاں خوجی کا حال سنیے۔ میاں آزاد کی راہ دیکھتے دیکھتے پینک جو آگئی تو ٹٹو ایک کسان کے کھیت میں جا پہنچا۔ کسان نے للکارا۔ ارے کس کا ٹٹو ہے؟ آپ ذرا بھی نہ بولے۔ اس نے خوب گالیاں دیں۔ آپ بیٹھے سنا کیے۔ جب اس نے ٹٹو کو پکڑا اور کانجی ہاؤس لے چلا تب آپ اس سے لپٹ گئے۔ اس نے جھلاکر ایک دھکا جو دیا تو آپ نے بیس لڑھکنیاں کھائیں۔ وہ ٹٹو کو لے چلا۔ جب خوجی نے دیکھا کہ وہ ہاری جیتی ایک نہیں مانتا تو آپ دھم سے ٹٹو کے پیٹھ پر ہورہے۔ اب آگے آگے کسان پیچھے پیچھے ٹٹو اور ٹٹو کی پیٹھ پر خوجی۔ راہ چلتے لوگ دیکھتے تھے۔ خوجی بار بار کرولی کی ہانک لگاتے تھے۔ اس طرح کانجی ہاؤس پہنچے۔ اب کانجی ہاؤس کا چپراسی اور منشی بار بار کہتے ہیں کہ حضرت ٹٹو پر سے اتریے، اسے ہم بھیتر بند کریں گے۔ مگر آپ اترنے کا نام نہیں لیتے، اوپر بیٹھے بیٹھے کرولی اور طمنچے کا رونا رو رہے ہیں۔ آخر مجبور ہوکر منشی نے خوجی کو چھوڑ دیا۔ آپ ٹٹو لیے ہوئے مونچھوں پر تاؤ دیتے گھر کی طرف چلے، گویا کوئی قلعہ جیت کر آئے ہیں۔

ادھر آزاد سے اختر نے کہا، کیوں بھائی وہ پہیلیاں بھی یاد ہیں، جو تم پہلے بجھایا کرتے

تھے؟ بہت دن ہوئے، کوئی چیستاں سننے میں نہیں آئی۔

آزاد : اچھا بوجھیے۔

آں چیست دہن ہزار دارد(وہ کیا ہے جس کے سو منہ ہوتے ہیں)

در ہر دہن دو مار دارد (ہر منہ میں دو سانپ ہوتے ہیں)

شاہ است نشستہ در سر تخت (ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے)

آں را ہما در شمار دارد (اسی کو سب گنتے ہیں)

اختر : ہزار منہ، یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

زینت : گنتی کیسی؟

آزاد : کچھ نہ بتائیں گے۔ جو خدا کی بندگی کرتے ہیں وہ آپ ہی سمجھ جائیں گے۔

اختر : آہاہا، میں سمجھ گئی۔ اللہ کی قسم سمجھ گئی۔ تسبیح ہے، کیوں کیسی بوجھی؟

آزاد : ہاں! اچھا، یہ تو کوئی بوجھے :

راجا کے گھر آئی رانی

اوگھٹ گھاٹ وہ پیوے پانی

مارے لاج کے ڈوبی جائے

ناحق چوٹ پروسی کھائے

زینت : بھائی، ہماری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ بتا دو بس بوجھ چکی۔

اختر : واہ، دیکھو بوجھتے ہیں، گھڑیال ہے۔

آزاد : واللہ، خوب بوجھی، اب کی بوجھیے :

ایک نار جب سبھا میں آوے

ساری سبھا چکت رہ جاوے

چاتر چاتر بانکے یار

مورکھ دیکھیں منہ پسار

زینت : جو اس کو کوئی بوجھ دو، تو مٹھائی کھاؤں۔

آزاد : یہ اس وقت یہاں ہے۔ بس اتنا اشارا بہت ہے۔

اختر : ہم ہار گئے، آپ بتا دیں۔

آزاد : بتا ہی دوں یہ پہیلی ہے۔

زینت : ارے، کتنی موٹی بات پوچھی اور ہم نہ بتا سکے۔

اختر : اچھا، بس ایک اور کہہ دیجیے۔ لیکن اب کی کوئی کہانی کہیے۔ اچھی کہانی ہو، لڑکوں کے بہلانے کی نہ ہو۔

آزاد نے اپنی اور حسن آرا کی محبت کی داستان بیان کرنی شروع کی۔ بجرے پر سیر کرنا، سپہر آرا کا دریا میں ڈوبنا اور آزاد کا اس کو نکالنا، حسن آرا کا آزاد سے روم جانے کے لیے کہنا اور آزاد کا کمر باندھ کر تیار ہو جانا، یہ ساری باتیں بیان کیں۔

اختر : بے شک سچی محبت تھی۔

آزاد : مگر میاں عاشق وہاں سے چلے، تو راہ میں نیت ڈانواڈول ہوگئی۔ کسی اور کے ساتھ شادی کر لی۔

اختر : توبہ! توبہ! بڑا برا کیا! بس زبانی داخلہ تھا؟

زینت : سچی محبت ہوتی تو حور پر بھی آنکھ نہ اٹھاتا۔ روم جاتا اور پھر جاتا۔ مگر وہ کوئی مکار آدمی تھا۔

آزاد : وہ عاشق میں ہوں اور معشوق حسن آرا ہے۔ میں نے اپنی ہی داستان سنائی اور اپنی ہی حالت بتائی۔ اب جو حکم دو وہ منظور، جو صلاح بتاؤ وہ قبول۔ روم جانے کا وعدہ کر آیا ہوں، مگر یہاں تم کو دیکھا تو اب قدم نہیں اٹھتا۔ قسم لے لو، جو تمھاری مرضی کے خلاف کروں۔

اتنا سننا تھا کہ اختر کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور زینت کا منہ اداس ہوگیا۔ سر جھکا کر رونے لگی۔

اختر : تو پھر آئے یہاں کیا کرنے؟

زینت : تم تو ہمارے دشمن نکلے۔ ساری امنگوں پر پانی پھیر دیا۔

شکوہ نہیں ہے آپ جو اب پوچھتے نہیں
وہ شکل مٹ گئی وہ شباہت نہیں رہی

اختر : باجی، اب ان کو یہی صلاح دو کہ روم جائیں۔ مگر جب واپس آئیں تو ہم سے بھی ملیں، بھول نہ جائیں۔

اتنے میں باہر سے آواز آئی کہ نہ ہوئی کرولی ورنہ خون کی ندی بہتی ہوتی، کئی آدمیوں کا خون ہوگیا ہوتا۔ وہ تو کہیے خیر گزری۔ آزاد نے پکارا، کیوں بھائی خوجی آگئے۔

خوجی : واہ واہ واہ! کیا ساتھ دیا! ہم کو چھوڑ کر بھاگے، تو خبر بھی نہ لی۔ یہاں کسان سے ڈنڈا چل گیا، کانجی ہاؤس میں ایک چوکیدار سے لاٹھی پونگا ہوگیا مگر آپ کو کیا۔

آزاد : اجی چلو، کسی طرح آتو گئے۔

خوجی : اجی، یہی بوڑھے میاں راہ میں ملے وہ یہاں تک لے آئے۔ نہیں تو سچ مچ گھاس کھانے کی نوبت آتی۔

میاں آزاد دوسرے دن دونوں بہنوں سے رخصت ہوئے۔ روتے روتے زینت کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آزاد بھی نرم دل آدمی تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کہا میں اپنی تصویر دیے جاتا ہوں اسے اپنے پاس رکھنا۔ میں خط برابر بھیجتا رہوں گا۔ واپس آؤں گا تو پہلے تم سے ملوں گا، پھر کسی سے۔ یہ کہہ کر دونوں بہنوں کو پانچ پانچ اشرفیاں دیں۔ پھر زینت کے چچا کے پاس جاکر بولے۔ آپ بزرگ ہیں، لیکن اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ آپ نے اختر کو جیتے جی مار ڈالا۔ دین کا رکھا نہ دنیا کا۔ آدمی اپنی لڑکی کا بیاہ کرتا ہے تو دیکھ لیتا ہے کہ داماد کیسا ہے، یہ نہیں کہ شہدے اور بدمعاش کے ساتھ بیاہ کر دیا۔ اب آپ کو لازم ہے کہ اسے کسی دن بلائیے اور سمجھائیے شاید سیدھے راستے پر آجائے۔

بوڑھے میاں : کیا کہیں بھائی، ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا ہم کو اختری کا پیار نہیں ہے؟ مگر کریں کیا؟ اس بدنصیب کو سمجھائے کون؟ کسی کی سنے بھی۔

آزاد : خیر اب زینت کی شادی ذرا سمجھ بوجھ کر کیجیے گا۔ اگر زینت کسی اچھے گھر بیاہی جائے اور اسی کا شوہر چلن کا اچھا ہو تو اختر کے بھی آنسو پونچھے کہ میری بہن تو خوش ہے یہی سہی۔ چار دن جو کہیں بہن کے یہاں جاکر رہے گی تو جی خوش ہوگا۔ بڑی ڈھارس ہوگی۔ اب بندہ تو رخصت ہوتا ہے۔ مگر آپ کو اپنے ایمان اور میری جان کی قسم ہے زینت کی شادی دیکھ بھال کر کیجیے گا۔

یہ کہہ کر آزاد گھر سے باہر نکلے تو دونوں بہنوں نے چلا چلاکر رونا شروع کیا۔

آزاد : پیاری اختر اور پیاری زینت خدا گواہ ہے اس وقت اگر مجھے موت آجائے تو سمجھوں، جی اٹھا۔ مجھے خوب معلوم ہے میری جدائی تمھیں اکھرے گی لیکن کیا کروں؟ کسی

ایسی ویسی جگہ جانا ہوتا تو خیر، کوئی مضائقہ نہ تھا مگر ایک ایسی مہم پر جانا ہے جس سے انکار کرنا کسی مسلمان کو گوارا نہیں ہو سکتا۔ اب مجھے ہنسی خوشی رخصت کرو۔

زینت نے کلیجہ تھام کر کہا۔ جائیے، اس کے آگے منہ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔

اختر : جس طرح پیٹھ دکھائی اسی طرح منہ بھی دکھاؤ۔

(27)

میاں آزاد اور خوجی چلتے چلتے ایک نئے قصبے میں جا پہنچے اور اس کی سیر کرنے لگے۔ راستے میں ایک انوکھی سج دھج کے جوان دکھائی پڑے۔ سر سے پیر تک پیلے کپڑے پہنے ہوئے، ڈھیلے پائنچے کا پاجامہ، کیسریے کیچل لوٹ کا انگرکھا، کیسریا رنگی دپلی ٹوپی، کندھوں پر کیسریا رومال، جس میں لچکا ٹکا ہوا۔ سن کوئی چالیس سال کا۔

آزاد : کیوں بھئی خوجی، بھلا بھانپو تو یہ کس دیس کے ہیں؟

خوجی : شاید کابل کے ہوں۔

آزاد : کابلیوں کا یہ پہناوا کہاں ہوتا ہے؟

خوجی : واہ خوب سمجھے! کیا کابل میں گدھے نہیں ہوتے؟

آزاد : ذرا حضرت کی چال تو دیکھیے گا، کیسے کندے جھاڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کبھی ذری کے جوتے پر دھیان ہے کبھی رومال پھڑکاتے ہیں۔ کبھی انگرکھا چمکاتے ہیں۔ کبھی لچکے کی جھلک دکھاتے ہیں۔ اس داڑھی مونچھ کا بھی خیال نہیں۔ یہ داڑھی اور یہ لچکے کی گوٹ، سبحان اللہ۔

خوجی : آپ کو ذرا چھیڑیے تو، دل لگی ہی سہی۔

آزاد : جناب، آداب عرض ہے، واللہ آپ کے لباس پر تو وہ جوبن ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی، نگاہ کے پاؤں پھسلے جاتے ہیں۔

زرد پوش : (شرما کر) جی، اس کا ایک خاص سبب ہے۔

آزاد : وہ کیا؟ کیا کسی سرکار سے وردی ملی ہے؟ یا سچ کہنا استاد، کسی نائی سے تو نہیں چھین لائے؟

زرد پوش (اپنے نوکر سے) رمضانی ذرا بتا تو دینا ہمیں اپنے منہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔

رمضانی : حضور، میاں کا نکاح ہونے والا ہے، اسی پہناوے کی رسم ہے حضور!

آزاد : رسم کی ایک ہی کہی۔ یہ اچھی رسم ہے۔ داڑھی مونچھ والے آدمی اور لچکا، بنت، پٹھا لگا کر کپڑے پہنیں۔ ارے بھئی یہ کپڑے دلہن کے لیے ہیں یا آپ جیسے مچھکو پھکو بیگ کے لیے؟ خدا کے لیے ان کپڑوں کو اتارو اور مردوں کا پوشاک پہنو۔

ادھر آزاد تو یہ پھٹکار سنا کر الگ ہوئے ادھر خدمت گار نے میاں زرد پوش کو سمجھانا شروع کیا میاں سچ تو کہتے تھے۔ جس گلی کوچے میں آپ نکل جاتے ہیں لوگ تالیاں بجاتے اور ہنسی اڑاتے ہیں۔

زرد پوش : ہنسنے دو جی، ہنستے ہی گھر بستے ہیں۔

خدمت گار : میاں، میں جاہل آدمی ہوں مُل بری بات بری ہی ہے۔ ہم غریب آدمی ہیں پھر بھی ایسے کپڑے نہیں پہنتے۔

میاں آزاد ادھر آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں، ایک دکڑی سامنے سے آرہی ہے۔ اس پر تین نوجوان بڑے ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں۔ تینوں عینک باز ہیں۔ آزاد بولے، یہ نیا فیشن دیکھنے میں آیا۔ جسے دیکھو عینک باز۔ اچھی خاسی آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بننے کا شوق۔

میاں آزاد کو یہ قصبہ ایسا پسند آیا کہ انھوں نے دو چار دن یہیں رہنے کی ٹھانی۔ ایک دن گھومتے گھومتے ایک نواب کے دربار میں جا پہنچے۔ سجی سجائی کوٹھی بڑے بڑے کمرے۔ ایک کمرے میں غالیچے بچھے ہوئے، دوسرے میں چوکیاں، میز، مسہریاں قرینے سے رکھی ہوئیں۔ خوجی یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اپنے نواب کو بھول گئے۔ جاکر دونوں آدمی دربار میں بیٹھے۔ خوجی تو نوابوں کی صحبت اٹھاتے تھے، جاتے ہی جاتے کوٹھی کی اتنی تعریف کی کہ پل باندھ دیے۔ حضور خدا جانتا ہے کیا سجی سجائی کوٹھی ہے۔ قسم ہے حسین کی جو آج تک ایسی عمارت نظر سے گزری ہو۔ ہم نے تو اچھے اچھے رئیسوں کی مصاحبت کی ہے مگر کہیں یہ ٹھاٹ نہیں دیکھا۔ حضور بادشاہوں کی طرح رہتے ہیں۔ حضور کی بدولت ہزاروں غریبوں شریفوں کا بھلا ہوتا ہے۔ خدا ایسے رئیس کو سلامت رکھے۔

مصاحب : اجی ابھی آپ نے دیکھا کیا ہے؟ مصاحب لوگ تو اب آچلے ہیں۔ شام تک سب آ جائیں گے۔ ایک میلے کا میلہ روز لگتا ہے۔

نواب : کیوں صاحب، یہ فری میشن بھی جادوگر ہے شاید؟ آخر جادو نہیں تو ہے کیا؟

مصاحب : حضور بجا فرماتے ہیں۔ کچھ دن ہوئے میری ایک فری میشن سے ملاقات ہوئی۔ میں، آپ جانیے، ایک ہی کائیاں۔ ان سے خوب دوستی پیدا کی۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا، تو بولے یہ وہ مذہب ہے جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مذہب ہی نہیں۔ کیوں نہیں ہو جاتے فری میشن؟ میرے دل میں بھی آ گئی۔ ایک دن ان کے ساتھ فری میشن ہوا۔ وہاں حضور، کروڑوں لاشیں تھیں۔ سب کی سب مجھ سے گلے ملیں اور ہنسیں۔ میں بہت ہی ڈرا۔ مگر ان لوگوں نے دلاسا دیا۔ ان سے ڈرتے کیوں ہو؟ ہاں خبردار، کسی سے کہنا نہیں، نہیں تو لاشیں کچا ہی کھا جائیں گی۔ اتنے میں خداوند آگ برسنے لگی اور میں جل بھن کر خاک ہوگیا۔ اس کے بعد ایک آدمی نے کچھ پڑھ کر پھونکا تو پھر ہٹا کٹا موجود۔ حضور، سچ تو یوں ہے کہ دوسرا ہوتا تو رو دیتا، لیکن میں ذرا بھی نہ گھبرایا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک دیو جیسے آدمی نے مجھے ایک حوض میں ڈھکیل دیا۔ میں دو دن اور دو رات وہیں پڑا رہا۔ جب نکالا گیا تو پھرتیاں سا موجود۔ سب کی صلاح ہوئی کہ اس کو یہاں سے نکال دو۔ حضور خدا خدا کرکے بچے، نہیں تو جان ہی پر بن آئی تھی۔

گپی : حضور، سنا ہے، کام روپ میں عورتیں مردوں پر ماش پڑھ کر پھونکتی ہیں اور بکرا، بیل، گدھا وغیرہ بنا ڈالتی ہیں۔ دن بھر بکرے بنے میں میں کیا کیے سانی کھایا کیے رات کو پھر مرد کے مرد۔ دنیا میں ایک سے ایک انیک جادوگر پڑے ہیں۔

خوشامدی : حضور، یہ موٹھ کیا چیز ہے؟ کل رات کو حضور تو یہاں آرام فرماتے تھے، میں دو بجے کے وقت قرآن پڑھ کر ٹہلنے لگا تو حضور کے سرہانے کے اوپر روشنی سی ہوئی۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔

مصاحب : ہوش اڑنے کی بات ہی ہے۔

خوشامدی : حضور، میں رات بھر جاگتا رہا اور حضور کے پلنگ کے اردگرد پہرا دیا کیا۔

نواب : تمھیں قرآن کی قسم؟

خوشامدی : حضور کی بدولت میرے بال بچے پلتے ہیں۔ بھلا آپ سے اور جھوٹ بولوں؟ نمک کی قسم بدن کا رواں رواں کھڑا ہوگیا۔ اگر میرا باپ بھی ہوتا تو میں پہرا نہ دیتا۔ مگر حضور کا نمک جوش کرتا تھا۔

جمعدار : حضور، یہاں ایک جوڑی بکاؤ ہے۔ حضور خریدیں تو دکھاؤں۔ کیا جوڑی ہے کہ اوہوہو، ڈیڑھ ہزار سے کم میں نہ دے گا۔

مصاحب : اے تو آپ نے خرید کیوں نہ لی؟ اتنی تعریف کرتے ہو اور پھر ہاتھ سے جانے دی۔ حضور انھیں حکم ہو کہ بس خرید ہی لائیں۔ بادشاہی میں ان کے یہاں بھی کئی گھوڑے تھے، سوار بھی خوب ہوتے ہیں، اور چابک سواری میں تو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

نواب : منیم سے کہو، انھیں دو ہزار روپے دیں اور دو سائیس ان کے ساتھ جائیں۔

جمعدار منیم کے گھر پہنچے اور بولے، لال جواہر مل، سرکار نے دو ہزار روپے دلوائے ہیں جلد آیئے۔

جواہر مل : تو جلدی کاہے کی ہے؟ یہ روپے ہوں گے کیا؟

جمعدار : ایک جوڑی لی جائے گی۔ استاد دیکھو ہم کو بدنام نہ کرنا۔ چار سو کی جوڑی ہے۔ باقی رہے سولہ سو۔ اس میں سے آٹھ سو یار لوگ کھائیں گے باقی آٹھ سو میں چھ سو ہمارے، دو سو تمھارے۔ ہے پکی بات نہ؟

جواہر مل : تم لو چھ سو اور ہم لیں دو سو! میاں بھائی ہو نہ! ارے یار تین سو ہم کو دو پانچ سو تو اڑا۔ یہ معاملے کی بات ہے۔

جمعدار : اجی، میاں بھائی کی نہ کہیے، میاں بھائی تو نواب بھی ہیں، مگر اللہ میاں کی گائے، تم تو لاکھوں کھا جاؤ، مگر گاڑھے کی لنگوٹی لگائے رہو۔ کھانے کو ہم بھی کھائیں گے، مگر شربتی کے انگرکھے ڈاٹے ہوئے، نواب بنے ہوئے، قورمہ اور پلاؤ کے بغیر کھانا نہ کھائیں گے۔ تم ابالی کھچڑی ہی کھاؤ گے۔ خیر، نہیں مانتے تو جیسی تمھاری مرضی۔

میاں جمعدار جوڑی لے کر پہنچے تو دربار میں اس کی تعریفیں ہونے لگیں۔ کوئی اس کے تھوتھن کی تعریف کرتا، کوئی ماتھے کی ،کوئی چھاتی کی۔ خوشامدی بولے، واللہ کنوتیاں تو دیکھیے، پیار کر لینے کو جی چاہتا ہے۔

گپی : حضور، ایسے جانور قسمت سے ملتے ہیں۔ قسم خدا کی ایسی جوڑی سارے شہر میں نہ نکلے گی۔

مطلبی : حضور، دو دو ہزار کی ایک ایک گھوڑی ہے۔ کیا خوبصورت ہاتھ پاؤں ہیں۔ اور مزہ یہ کہ کوئی عیب نہیں۔

نواب : کل شام کو فٹن میں جوتنا، دیکھیں کیسی جاتی ہے۔

گپی : حضور، آندھی کی طرح جائے کیا دل لگی ہے کچھ۔

رات کو میاں آزاد سرائے میں پڑے رہے۔ دوسرے دن شام کو پھر نواب صاحب کے یہاں پہنچے۔ دربار جمع ہوا تھا مصاحب لوگ گپیں اڑا رہے تھے۔ اتنے میں مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ مصاحبوں نے کہا حضور روزہ کھولنے کا وقت آ گیا۔

نواب : قسم قرآن کی، ہمیں آج تک معلوم ہی نہ ہوا کہ روزہ رکھنے سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ مفت میں بھوکوں مرنا کون سا ثواب ہے؟ ہم تو حافظ کے چیلے ہیں وہ بھی روزہ نماز کچھ نہ مانتے تھے۔

آزاد : حضور نے خوب کہا :

دوش از مسجد سوئے مے خانہ آدم پیرِ ما

چیست یارانے طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما

(کل میرے پیر مسجد سے شراب خانے کی طرف آئے، دوستو بتلاؤ اب میں کیا کروں؟)

خوشامدی : واہ واہ کیا شعر ہے، سعدی کا کیا کہنا۔

گپی : سنا، گاتے بھی خوب تھے۔ بہاگ کی دھن پر سر دھنتے ہیں۔

آزاد دل میں خوب ہنسے۔ یہ مسخرے اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ سعدی کا شعر ہے یا حافظ کا۔ اور مزہ یہ کہ ان کو بہاگ بھی پسند تھا۔ کیسے کیسے گوکھے جمع ہیں۔

مصاحب : حضور، بجا فرماتے ہیں، بھوکوں مرنے سے بھلا خدا کیا خوش ہوگا؟

نواب : بھئی، یہاں تو جب سے پیدا ہوئے قسم لے لو، جو ایک دن بھی فاقہ کیا ہو۔ پھر بھوک میں نماز کی کسے سوجھتی ہے؟

خوشامدی : حضور، آپ ہی کے نمک کی قسم، دن رات کھانے کی ہی فکر رہتی ہے۔ چار بجے اور لونڈی کی جان کھانے لگے۔ لہن لا، پیاز لا، کباب پکیں تو بہ!

ہندو مصاحب : حضور، ہمارے یہاں بھی برت رکھتے ہیں لوگ، مگر ہم نے تو ہر برت کے دن گوشت چکھا۔

خوشامدی : شاباش لالہ، شاباش! واللہ تمھارا مذہب پکا ہے۔

نواب : پڑھے لکھے آدمی ہیں کچھ جاہل گنوار تھوڑے ہی ہیں۔

خوجی : واہ واہ حضور نے وہ بات پیدا کی کہ تو بہ ہی بھلی۔

خوشامدی : واہ بھئی، کیا تعریف ن ہے۔ کہنے لگے، تو بہ ہی بھلی۔ کس جنگل سے پکڑ کے آئے ہو بھئی تم نے تو وہ بات کہی کہ توبہ ہی بھلی۔ خدا کے لیے ذری سمجھ بوجھ کر بولا کرو۔

گپی : اے حضرت بولیں کیا بولنے کے دن اب گئے۔ برسات ہو چکی نہ؟

خوجی : میاں ایک ایک آؤ، یا کہو، چوکھی لڑیں۔ ہم اس سے بھی نہیں ڈرتے۔ یہاں عمر بھر نوابوں کی ہی صحبت میں رہے۔ تم لوگ ابھی کچھ دن سیکھو۔ آپ اور ہم پر منہ آئیں۔ ایک بار ہمارے نواب صاحب کے یہاں ایک حضرت آئے، بڑے بھلکڑ۔ آتے ہی مجھ پر فقرے کسنے لگے۔ بس میں نے جو آڑے ہاتھوں لیا تو جھینپ کر ایک دم بھاگے۔ میرے مقابلے میں کوئی ٹھہرے تو بھلا۔ لے بس آئیے دو دو چونچیں ہوں۔ پالی سے ناک دم نہ بھاگو تو مونچھیں منڈوا ڈالوں۔

مصاحب : آئیے پھر آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ بندے کی زبان بھی وہ ہے کہ کترنی کو مات کرے۔ زبان آگے جاتی ہے بات پیچھے رہ جاتی ہے۔

خوجی : زبان کیا چرخہ ہے رانڈ کا۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو روٹی کو حضور لوتی کہتے ہوں گے۔

مصاحب : جب خدا جھوٹ نہ بلائے تو آپ اور جھوٹ نہ بولیں۔ جب سے ہوش سنبھالا کبھی سچ بولے ہی نہیں۔ ایک دفعہ دھوکے سے سچی بات نکل آئی تھی، جس کا آج تک افسوس ہے۔

خوجی : اور وہ اس وقت جب آپ سے کسی نے آپ کے باپ کا نام پوچھا تھا اور آپ نے جلدی میں صاف صاف بتا دیا تھا۔

اس پر سب کے سب ہنس پڑے اور خوجی مونچھوں پر تاؤ دینے لگے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک ڈکری آئی اور اس پر سے ایک حسینہ اتر پڑی۔ وہ پتلی کمر کو لچکاتی ہوئی آئی۔ نواب کا مسند گھسیٹا اور بڑے ٹھاٹ سے بیٹھ گئی۔

نواب : مزاج شریف؟

آبادی : آپ کی بلا سے!

مصاحب : حضور خدا کی قسم اس وقت آپ ہی کا ذکر تھا۔
آبادی : چلو جھوٹے! علی کی سنوار تجھ پر اور نواب پر۔
مصاحب : خدا کی قسم
آبادی : اب ہم ایک چپت جمائیں گے۔ دیکھو نواب اپنے ان گرگوں کو منع کرو، میرے منہ نہ لگا کریں۔
اتنے میں ایک مہری پانچ چھ برس کے ایک لڑکے کو گود میں لائی۔
آبادی : ہماری بہن کا لڑکا ہے۔ لڑکا کیا پہاڑی مینا ہے۔ بھیا، نواب کو گالیاں تو دینا، کیوں نواب، ان کو مٹھائی دو گے نہ؟
نواب : ہاں، ابھی ابھی۔
لڑکا : پہلے مٹھائی لاؤ، پھر ہم دالی دے دیں دے۔
اب چاروں طرف سے مصاحب بلاتے ہیں، آؤ ہمارے پاس آؤ۔ لڑکے نے نواب کو اتنی گالیاں دیں کہ توبہ ہی بھلی۔ نواب صاحب خوب ہنسے اور ساری محفل لڑکے کی تعریف کرنے لگی۔ خداوند اب اس کو مٹھائی منگوا دیجیے۔
نواب : اچھا بھئی، ان کو پانچ روپے کی مٹھائی لا دو۔
آبادی : اے ہٹو بھی! آپ اپنے روپے رہنے دیں۔ کیا کوئی فقیر ہے؟
نواب : اچھا ایک اشرفی کی لادو۔
آبادی : بھیا نواب کو سلام کر لو۔
نواب : اچھا، یہ تو ہوا، اب کوئی چیز سناؤ۔ پیلو کی کوئی چیز ہو تمھیں قسم ہے۔
آبادی : اے ہٹو بھی آج روزے سے ہوں، آپ کو گانے کی سوجھتی ہے۔
فرش پر کئی نیبو پڑے ہوئے تھے۔ بی صاحبہ نے ایک نیبو داہنے ہاتھ میں لیا اور دوسرا نیبو اسی ہاتھ سے اچھالا اور روکا۔ کئی منٹ تک اسی طرح اچھالا اور روکا بھی۔ لوگ شور مچا رہے ہیں۔ کیا تلے ہوئے ہاتھ ہیں سبحان اللہ۔ وہ بولیں کہ بھلا نواب، تم تو اچھالو۔ جب جانیں کی نیبو گرنے نہ پائے۔ نواب نے ایک نیبو ہاتھ میں لیا اور دوسرا اچھالا، تو تڑ سے ناک پر گرا پھر اچھالا تو کھوپڑی پر تڑ سے۔
آبادی : بس جاؤ، بھی اتنا بھی شعور نہیں ہے۔

نواب : یہ انگلی میں کپڑا کیسا بندھا ہے؟

آبادی : بوجھو، دیکھیں کتنی عقل ہے؟

نواب : یہ کیا مشکل ہے، چھالیاں کترتی ہوں گی۔

آبادی : ہاں، وہ خون کا تار بندھا کہ توبہ۔ میں نے پانی ڈالا اور کپڑا باندھ لیا۔

مصاحب : حضور، آج اس شہر میں ان کی جوڑ نہیں ہے۔

نواب : بھلا کبھی نواب خفقان حسین کے یہاں بھی جاتی ہو؟ سچ سچ کہنا۔

آبادی : علی کی سنوار اس پر۔ حج کر آیا ہے۔ اس منحوس سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ آپ کہاں کے ایسے بڑے مولوی بن بیٹھے؟

نواب : جی بجا ہے جو آپ کو نہ بلائے وہ منحوس ہوا۔

آبادی : بلائے گا کون؟ جس کو غرض ہوگی، آپ دوڑا آوئے گا۔

آزاد اور خوجی یہاں سے چلے، تو آزاد نے کہا آپ کچھ سمجھے؟ یہ جوڑی وہی تھی، جو روشن علی خرید کر لائے تھے۔

خوجی : یہ کون بڑی بات ہے، اسی میں تو رئیسوں کا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ ان کی صحبت میں جب بیٹھیے، خوب گپ اڑائیے اور جھوٹ اس قدر بولیے کہ زمین آسمان کے قلابے ملائیے۔ رنگ جم جائے، تو دونوں ہاتھوں سے لوٹیے اور سونے کی اینٹیں بنوا کر صندوق میں رکھ چھوڑیے۔ لیکن ایسے مال کو رہتے نہ دیکھا، معلوم نہیں ہوتا کدھر آیا اور کدھر گیا۔

آزاد : یہ نواب بالکل چونگا ہے۔

خوجی : اور نہیں تو کیا، نرا چونچ۔

آزاد : خدا کرے، یہ رئیس زادے پڑھ لکھ کر بھلے آدمی ہو جائیں۔

خوجی : ارے، خدا نہ کرے بھائی، یہ جاہل ہی رہیں تو اچھا۔ جو کہیں پڑھ لکھ جائیں تو پھر اتنے بھلے مانسوں کی پرورش کون کرے؟

تیسرے دن دونوں پھر نواب کی کوٹھی پر پہنچے۔

خوجی : خدا ایسے رئیس کو سلامت رکھے۔ آج یہاں سناٹا سا نظر آتا ہے۔ کچھ چہل پہل نہیں ہے۔

مصاحب : چہل پہل کیا خاک ہو! آج مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

آزاد : ذرا خیر کرے کچھ تو فرمائیے۔

نواب : کیا عرض کروں، جب برے دن آتے ہیں تو چاروں طرف سے بری ہی بری باتیں سننے میں آتی ہیں۔ گھر میں وضع حمل ہوگیا۔

آزاد : یہ تو کچھ بری بات نہیں۔ وضع حمل کے معنی لڑکا پیدا ہونا۔ یہ تو خوشی کا موقع ہے۔

مصاحب : ہمارے حضور کا منشا اسقاط حمل (گربھ پات) سے تھا۔

خوشامدی : اجی، اسے وضع حمل بھی کہتے ہیں لغت دیکھیے۔

نواب : اجی، اتنا ہی ہوتا تو دل کو کسی طرح سمجھا لیتے ہیں۔ یہاں تو ایک اور مصیبت نے آ گھیرا۔

مصاحب : (ٹھنڈی سانس لے کر) خدا دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھائے۔

خوشامدی : حضرت، کیا عرض کروں حضور کا ایک میڑھا مر گیا، کیسا تیار تھا کہ کیا کہوں، گینڈا بنا ہوا۔

گپی : اجی، یوں نہیں کہتے کہ گینڈے کو ٹکرا دیتا تو ٹیں کر کے بھاگتا۔ ایک دفعہ میں اپنے ساتھ باغ لے گیا۔ اتفاق سے ایک راجا صاحب پاٹھے پر سوار بڑے ٹھاٹ سے آرہے تھے۔ بندہ مینڈھے کو عین سڑک پر لیے ہوئے ڈٹا کھڑا ہے۔ سپاہی نے للکارا کہ ہٹا بکری کو سڑک سے۔ اتنا کہنا تھا کہ میں آگ ہی تو ہوگیا۔ پوچھا کیا کہا بھائی؟ پھر تو کہنا۔ سپاہی آنکھیں نیلی پیلی کر کے بولا۔ ہٹا بکری کو سامنے سے، سواری آتی ہے۔ تب تو جناب میرے خون میں جوش آگیا۔ میں نے مینڈھے کو للکارا تو اس نے جھپٹ کر ہاتھی کے مستک پر ایک ٹکر لگائی۔ وہ آواز آئی جیسے کوئی درخت زمین پر آرہا ہو۔ بندر ڈال ڈال چیخنے لگے، بندریاں بچوں کو چھاتی سے لگائے دبک رہیں تو وجہ کیا، ان کو میڑھے پر بھیڑیے کا دھوکا ہوا۔

خوجی : میڈھے کو بھیڑیا سمجھی! مگر واللہ آپ کو تو بے دم کا لنگور سمجھا ہوگا۔

گپی : بس حضرت ایک ٹکر لگا کر پیچھے ہٹا اور بدن کو تول کر چھلانگ جو مارتا ہے تو ہاتھی کے مستک پر! وہاں سے پھر اچکا تو فیل بان کے ماتھے پر ایک ٹکر لگائی، مگر آہستہ سے۔ ذرا اس تمیز کو دیکھیے گا، سمجھا کہ اس میں ہاتھی کا سا زور کہاں۔ مگر راجا کا ادب کیا۔ اب میں لاکھ لاکھ زور کرتا ہوں پر وہ کسی کی سنتا ہے؟ غصہ آیا سو آیا جیسے سر پر بھوت سوار ہو گیا۔ چھڑا کر

پھر لپکا اور ایک دو تین چار، بس خدا جانے اتنی ٹکریں لگائیں کہ ہاتھی ہوا ہوگا اور چنگھاڑ کر بھاگا۔ آدمی پر آدمی گرتے ہیں آپ جانیے، پاٹھے کا بگڑنا کچھ ہنسی ٹھٹھا تو ہے نہیں۔ جناب وہی میڈھا آج چل بسا۔

آزاد : نہایت افسوس ہوا۔

خوجی : سن شریف کیا تھا؟

نواب : سن کیا تھا ابھی بچہ تھا۔

مصاحب : حضور، وہ آپ کا دشمن تھا، دوست نہ تھا۔

نواب : ارے بھئی، کس کا دوست، کیسا دشمن، اس بیچارے کا کیا قصور؟ وہ تو اچھا گیا مگر ہم سب کو جیتے جی مار ڈالا۔

آزاد : حضرت، یہ دنیا سرائے فانی ہے۔ یہاں سے جو گیا اچھا گیا۔ مگر نوجوان کے مرنے کا رنج ہوتا ہے۔

مصاحب : اور پھر جوان کیسا کہ ہونہار۔ ہاتھ مل کر رہ گئے یار، بس اور کیا کریں۔

آزاد : مرض کیا تھا؟

مصاحب : کیا مرض بتائیں، بس قسمت ہی پھوٹ گئی۔

خوشامدی : مگر کیا موت پائی ہے، رمضان کے مہینے میں، اس کی روح جنت میں ہوگی۔ طوبیٰ کے تلے جو گھاس ہے وہ چر رہا ہوگا۔

اتنے میں ایک مہری گل بدن کا لہنگا جس میں آٹھ آٹھ انگل گوٹ لگی تھی، پھڑکاتی اور گلابی دوپٹے کو چمکاتی آئی اور نواب کے کان میں جھک کر بولی۔ بیگم صاحبہ حضور کو بلاتی ہیں۔

نواب : یہ نادری حکم؟ اچھا صاحب، چلیے۔ یہاں تو بیگم اور مہری دونوں سے ڈرتے ہیں۔

نواب صاحب اندر گئے، تو بیگم نے خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا، اے میں کہتی ہوں یہ کیسا رونا دھونا ہے؟ کہاں کی ایسی مصیبت پڑ گئی کہ آنکھیں خون کی بوٹی بن گئیں؟ میڈھے نگوڑے مرا ہی کرتے ہیں۔ ایسی عقل پر پتھر پڑے کہ موئے جانور کی جان کو رو رہے ہیں۔ تمھارے عقل کو دن دن دیمک چاٹے جاتی ہے کیا؟ اور ان مفت خوروں نے تو آپ کو اور بھی چنگ پر چڑھایا ہے۔ اللہ کی قسم، اگر آپ نے رنج ونج کیا، تو ہم زمین آسمان ایک

کر دیں گے۔ آخر وہ میڈھا کوئی آپ کا بس اب کیا کہوں۔ بھیگی بلی بنے کٹر کٹر سن رہے تھے۔

نواب : تمھارے سر کی قسم، اب ہم اس کا ذکر بھی نہ کریں گے۔ مگر جب آپ کی بلی مر گئی تھی تو آپ نے کیوں دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا؟ اب ہماری دفعہ آپ غرّاتی ہیں؟

مصاحب : (پردے کے پاس سے) واہ حضور، بلی کے لیے غرّانا بھی کیا خوب، واللہ ضلع سے تو کوئی فقرہ آپ کا خالی نہیں ہوتا۔

بیگم : دیکھو، ان موئے مسنڈوں کو منع کردو کہ ڈیوڑھی پر نہ آنے پائیں۔

دربان نے جو اتنی شہہ پائی تو ایک ڈانٹ بتائی۔ بس جی سنو چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اب ڈیوڑھی پر آنے کا نام لیا تو تم جانو گے۔ بیگم صاحبہ ہم پر خفا ہوتی ہیں۔ تمھاری گرہ سے کیا جائے گا۔ ہم سپاہی آدمی ہم تو نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

مصاحب سپاہی سے تو کچھ نہ بولے، مگر بڑبڑاتے ہوئے چلے۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیوں بھئی اس وقت ناک بھوں کیوں چڑھائے ہو؟ بولے اجی کیا کہیں ہمارے نواب تو بس بچھیا کے باوا ہی رہے۔ بیوی نے ڈپٹ لیا، زن مرید ہے جی! آبرو کا بھی کچھ خیال نہیں۔ عورت ذات پھر جورو اور الٹے ڈانٹ بتائے اور داڑھی مونچھوں والے ہوکر چپ چاپ سنا کریں۔ واللہ، جو کہیں میری بیوی کہتی تو گلا ہی گھونٹ دیتا۔ یہاں ناک پر مکھی تک بیٹھنے نہیں دیتے۔

آزاد : بھئی، غصے کو تھوک دو۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ ان کی بیوی ہیں، چاہے گھڑکیاں سنیں، چاہے جھڑکیاں سہیں، آپ بیچ میں بولنے والے کون؟ اور پھر جس کا کھاتے ہو اسی کو کوستے ہو۔ اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم نمک حلال اور کٹ مرنے والے لوگ ہیں۔

اتنے میں نواب صاحب باہر نکلے۔ امیروں کے دربار میں آپ جانیے، ایک کا ایک دشمن ہوتا ہے۔ سیکڑوں چغل خور رہتے ہیں۔ ہر دم یہی فکر رہتی ہے کہ دوسرے کی چغلی کھائیں اور سب کو دربار سے نکلوا کر ہمی ہم نظر آئیں۔ دو مصاحبوں نے صلاح کی کہ آج نواب نکلیں تو اس کی چغلی کھائیں اور اس کو کھڑے کھڑے نکلوا دیں۔ نواب کو جو آتے دیکھا تو چلاکر کہنے لگے۔ سنا بھئی بس اب جو کوئی کلمہ کہا تو ہم سے نہ بنے گا۔ جس کا کھائے اسی کا گائے۔ یہ نہیں کہ جس کا کھائیں اسی کو گالیاں سنائیں۔ نواب صاحب کو چاہے آپ پیٹھ پیچھے زن مرید بنائیں، یا بھیگی بلی کہیں مگر خبردار جو آج سے بیگم صاحبہ کی شان میں کوئی گستاخی کی، خون ہی

پی لوں گا۔

نواب : (تیوریاں بدل کر) کیا؟

حافظ جی : کچھ نہیں حضور، خیریت ہے۔

نواب : نہیں کچھ تو ہے ضرور۔

روشن علی : تو چھپاتے کیوں ہو، سرکار سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے؟ حضور بات یہ ہے کہ میاں صاحب جب دیکھو تب حضور کی ہجو کیا کرتے ہیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا یہ بری بات ہے میاں کہہ کر بھائی کہہ کر، بیٹا کہہ کر، بابو کہہ کر، ہاتھ جوڑ کر، ہر طرح سمجھایا، مگر یہ تو لاتوں کے آدمی ہیں باتوں سے کب مانتے ہیں۔ ہم بھی چپکے ہو رہتے تھے کہ بھئی چغلی کون کھائے، مگر آپ زنانی ڈیوڑھی سے...... حضور، بس کیا کہوں، اب اور نہ کہلوائیے۔

نواب : ان کو ہم نے موقوف کر دیا۔

میاں مصاحب تو کھسکے۔ اتنے میں مٹرگشت آپہنچے اور نواب کو سلام کر کے بولے، خداوند، آج خوب سیر سپاٹا کیا۔ اتنا گھوما کہ ٹانگوں کے ٹٹو کی گامچیاں درد کرنے لگیں۔ کوئی علاج بتائیے۔

حافظ جی : گھاس کھائیے، یا کسی سالوتری کے پاس جائیے۔

نواب : خوب! ٹٹو کے لیے گھاس اور سالوتری کی اچھی کہی۔ اب کوئی تازہ تازہ خبر سنائیے، باسی نہ ہو گرما گرم۔

مٹرگشت : وہ خبر سناؤں کہ محفل بھر کو لوٹ پوٹ کر دوں حضور، کسی ملک سے چند پری زاد عورتیں آئی ہیں۔ تماشائیوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ سنا تھیٹر میں ناچتی ہیں اور ایک ایک قدم اور ایک ایک ٹھوکر میں عاشقوں کے دل کو پامال کرتی ہیں۔ انھیں میں سے ایک پری زاد جو دن سے نکل گئی تو بس میری جان سن سے نکل گئی۔ دریا کنارے خیمے پڑے ہیں۔ وہیں اندر کا اکھاڑا سجا ہوا ہے۔ آج شام کو نو بجے تماشہ ہوگا۔

نواب : بھئی، تم نے خوب مزے کی خبر سنائی۔ ایں جانب ضرور جائیں گے۔

اتنے میں خدایار خاں جنھیں ذرا پہلے نواب نے موقوف کر دیا تھا، آ بیٹھے اور بولے، حضور ادھر خداوند نے موقوفی کا حکم سنایا، ادھر گھر پہنچا، تو جورو نے طلاق دے دی۔ کہتی ہے 'روٹی نہ کپڑا سینت میت کا بھترا۔'

آزاد : حضور، ان غریب پر رحم کیجیے۔ نوکری کی نوکری گئی اور بیوی کی بیوی۔

نواب : حافظ جی ادھر آؤ، کچھ حال ٹھیک بتاؤ۔

حافظ : حضور، انھوں نے کہا کہ نواب تو نرے بچھیا کے تاؤ ہی ہیں زن مرید۔ اور بیگم صاحبوں کو اس نابکار نے وہ وہ باتیں کہیں کہ بس، کچھ نہ پوچھیے۔ عجب شیطان آدمی ہے۔ آپ کو یقین نہ آئے تو انھیں سے پوچھ لیجیے۔

نواب : کیوں میاں آزاد، سچ کہو تم نے کیا سنا؟

آزاد : حضور، اب جانے دیجیے قصور ہوا، میں نے سمجھا دیا ہے۔

حافظ : یہ بیچارے تو ابھی ابھی سمجھا رہے تھے کہ او گیدی تو اپنی مالک کو ایسی ایسی کھوٹی کھری کہتا ہے۔

نواب : (دربان سے) دیکھو جی حسین علی، آج سے اگر خدایار خاں کو آنے دیا تو تم جانو گے۔ کھڑے کھڑے نکال دو گے۔ اسے پھاٹک میں قدم رکھنے کا حکم نہیں۔

خدایار : حضور، غلام سے بھی تو سنیے۔ آج میاں روشن علی نے مجھے تاڑی پلا دی اور یہی منصوبہ تھا کہ یہ نشے میں چور ہو، تو اسے کسی لم میں نکلوا دیں۔ سو حضور، ان کی مراد بر آئی۔ مگر حضور، میں اس در کو چھوڑ کر اور جاؤں کہاں؟ خدا آپ کے بال بچوں کو سلامت رکھے، یہاں تو رواں رواں حضور کے لیے دعا کرتا ہے۔ حضور تو پوتڑوں کے رئیس ہیں، مگر چغل خوروں نے کان بھر دیے۔

خدا کے غضب سے ذرا دل میں کانپ
چغل خور کے منہ کو ڈستے ہیں سانپ

نواب : اچھا یہ بات ہے۔ خبردار، آج سے ایسی بے ادبی نہ کرنا۔ جاؤ، ہم نے تم کو بحال کیا۔

مصاحبوں نے غل مچایا : واہ حضور، کتنا رحم ہے! ایسے رئیس پیدا کاہے کو ہوتے ہیں۔ مگر خدایار خاں کو تو ان کی جورو نے بچا لیا۔ نہ وہ طلاق دیتی نہ یہ بحال ہوتے۔ واللہ جورو بھی قسمت سے ملتی ہے۔

(28)

دوسرے دن نو بجے رات کو نواب صاحب اور ان کے مصاحب تھیٹر دیکھنے چلے۔
نواب : بھئی، آبادی جان کو بھی ساتھ لے چلیں گے۔
مصاحب : ضرور ضرور، حضور ان کے بغیر مزہ کرکرا ہو جائے گا۔
اتنے میں فٹن آ پہنچی اور آبادی جان چھم چھم کرتی ہوئی آ کر مسند پر بیٹھ گئی۔
نواب : واللہ ابھی آپ ہی کا ذکر تھا۔
آبادی : تم سے لاکھ دفعہ کہہ دیا کہ ہم سے جھوٹ نہ بولا کرو۔ ہمیں کوئی دیہاتی سمجھا ہے۔

نواب : خدا کی قسم، چلو تم کو تماشا دکھا لائیں۔ مگر مردانے کپڑے پہن کر چلیے، ورنہ ہماری بے عزّتی ہوں۔

آبادی نے تنک کر کہا : جو ہمارے چلنے میں بے آبروئی ہے تو سلام۔
یہ کہہ کر وہ جانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔ نواب نے دوپٹہ دبا کر کہا۔ ہمارا ہی خون پیے، جو ایک قدم بھی آگے بڑھائے، ہمیں کو روئے، جو روٹھ کر جائے! حافظ جی ذرا مردانے کپڑے تو لائیے۔

غرض آبادی جان نے عمامہ سر پر باندھا، چست انگرکھا اور کسا ہوا گھٹنا، ٹاٹ بانی بوٹ، پھندنا جھلکتا ہوا، ان کے گورے بدن پر کھل اٹھا۔ نواب صاحب ان کے ساتھ فٹن پر سوار ہوئے اور مصاحبوں میں کوئی بگھی پر، کوئی ٹم ٹم پر، کوئی پالکی گاڑی پر لدے ہوئے تماشہ گھر میں داخل ہوئے۔ مگر آبادی جان جلدی میں پازیب اتارنا بھول گئی تھیں۔ وہاں پہنچ کر نواب نے اول درجے کے دو ٹکٹ لیے اور سرکس میں داخل ہوئے۔ لیکن پازیب کی چھم چھم نے وہ شور مچایا کہ سبھی تماشائیوں کی نگاہیں ان دونوں آدمیوں کی طرف اٹھ گئیں۔ جو ہے اسی طرف دیکھتا ہے، تاڑنے والے تاڑ گئے، بھانپنے والے بھانپ گئے، نواب صاحب اکڑتے ہوئے ایک کرسی پر جا ڈٹے اور آبادی جان بھی ان کی بغل میں بیٹھ گئی۔ بہت بڑا شامیانہ ٹنگا ہوا تھا۔ بجلی کی بتیوں سے چکاچوندھ کا عالم تھا۔ بیچوں بیچ ایک بڑا میدان، ارد گرد کوئی دو ہزار کرسیاں۔ خیمہ بھر جگ مگ کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں دس بارہ جوان گھوڑے کڑکڑاتے ہوئے

میدان میں آئے اور چکر کاٹنے لگے، اس کے بعد ایک جوان نازنین، آفت کی پرکالا، گھوڑے پر سوار، اس شان سے آئی کہ محفل بھر پر آفت ڈھائی۔ ساری محفل مست ہوگئی۔ وہ گھوڑے سے پھرتی کے ساتھ اچکی اور پھر پیٹھ پر آ پہنچی۔ چاروں طرف سے واہ واہ کا شور مچ گیا۔ پھر اس نے گھوڑے کو میدان میں چکر دینا شروع کیا۔ گھوڑا سرپٹ جا رہا تھا، اتنا تیز کہ نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ یکایک وہ لیڈی تڑ سے زمین پر کود پڑی۔ گھوڑا جیوں کا تیوں دوڑتا رہا۔ ایک دم میں وہ جھپٹ کر پھر پیٹھ پر سوار ہوگئی۔ اس پر اتنی تالیاں بجیں کہ خیمہ بھر گونج اٹھا۔ اس کے بعد شیروں کی لڑائی، بندروں کی دوڑ اور خدا جانے کتنے اور تماشے ہوئے۔ گیارہ بجتے بجتے تماشا ختم ہوا۔ نواب صاحب گھر پہنچے تو سانسیں بھرتے تھے اور میاں آزاد دونوں ہاتھوں سے سر دھنتے تھے۔ دونوں مس ورجینا (تماشا کرنے والی عورت) کی نگاہوں کے شکار ہوگئے۔

حافظ جی بولے: حضور، ابھی مشکل سے تیرہ چودہ برس کا سن ہوگا، اور کس پھرتی سے اچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر ہورہتی تھی کہ واہ جی واہ۔ میاں روشن علی بڑے شہ سوار بنتے تھے۔ قسم خدا کی، جوان کے باپ بھی قبر سے اٹھ آئیں تو یہ کرتب دیکھ کر ہوش اڑ جائیں۔

نواب: کیا چاند سا مکھڑا ہے۔

آبادی جان: یہ کہاں کا دکھڑا ہے؟ ہم جاتے ہیں۔

مصاحب: نہیں حضور، ایسا نہ فرمائیے، کچھ دیر تو بیٹھیے۔

لیکن آبادی جان روٹھ کر چلی ہی گئی۔ اب نواب کا یہ حال ہے کہ منہ پھلائے، غم کی صورت بنائے بیٹھے سرد آہیں کھینچ رہے ہیں۔ مصاحب سب بیٹھے سمجھا رہے ہیں، مگر آپ کو کسی طرح صبر ہی نہیں آتا۔ اب زندگی وبال ہے، جان جنجال ہے۔ یہ بھی فخر ہے کہ ہمارا دل کسی پری زاد پر آیا ہے، شہر بھر میں دھوم ہوجائے کہ نواب صاحب کو عشق چرایا ہے۔

تا کہ مشہور ہو ہزاروں میں
ہم بھی ہیں پانچویں سوار میں

مصاحبوں نے سوچا، ہمارے شہ دینے سے یہ ہاتھ سے جاتے رہیں گے، اس لیے وہ چال چلیے کہ 'سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے'۔ لگے سب اس عورت کی ہجو کرنے۔ ایک نے کہا بھائی، جادو کا کھیل تھا، دوسرے بولے، جی ہاں میں نے دن کے وقت دیکھا تھا، نہ وہ رنگ نہ وہ روغن، نہ وہ چمک دمک، نہ وہ جوبن، رات کی پری دھوکے ٹٹی ہے۔ آخر مس ورجینا

نواب کی نظروں سے گر گئی۔ بولے جانے بھی دو اس کا ذکر ہی کیا۔ تب مصاحبوں کی جان میں جان آئی۔ نواب صاحب کے یہاں سے رخصت ہوئے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

حافظ جی : ہمارے نواب بھی کتنے بھولے بھالے رئیس ہیں۔

روشن علی : اجی، نرے بچھیا کے تاؤ ہیں۔ خدایار خاں ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

خدایارخاں : اور نہیں تو کیا جھوٹ بولے تھے؟ ہمیں لگی لپٹی نہیں آتی چاہے جان جاتی رہے، مگر خوشامد نہ کریں گے۔

حافظ جی : بھئی، یہ آزاد نے بڑا اڑنگا مارا ہے۔ اس کو نہ پچھاڑا تو ہم سب نظروں سے گر جائیں گے۔

روشن علی : اجی میں ترکیب بتاؤں، جو پٹ پڑے تو نام نہ رکھوں۔ نواب ڈرپوک تو ہیں ہی، کوئی اتنا جاکر کہہ دے کہ میاں آزاد اشتہاری مجرم ہیں۔ بس پھر دیکھیے کیا تاتھیا مچتی ہے۔ آپ مارے خوف کے گھر میں گھس رہیں اور زنانے میں تو کہرام ہی مچ جائے۔ آزاد اور ان کے ساتھی اپنچی دونوں کھڑے کھڑے نکال دیے جائیں۔

خوشامدی : واہ استاد، کیا تڑ سے سوچ لیتے ہو! واللہ ایک ہی نیارے ہو۔

روشن علی : پھر ان جھانسوں کے بغیر کام بھی تو نہیں چلتا۔

حافظ جی : ہاں، خوب یاد آیا، پرسوں تیغ بہادر دکھن سے آئے ہیں۔ بیچارے بڑی تکلیف میں ہیں۔ ہمارے سچے دوستوں میں ہیں۔ ان کے لیے ایک روٹی کا سہارا ہوجائے تو اچھا۔ آپ میں سے کوئی چھیڑ دے تو ذرا بس پھر میں لے اڑوں گا۔ مگر تعریف کے پل باندھ دیجیے۔ نواب کو جھانسے میں لانا کوئی بڑی بات تو ہے نہیں۔ تھالی کے بیگن ہیں۔

حافظ جی : ایک کام کیجیے، کل جب سب جمع ہوجائیں تو ہم پہلے چھیڑیں کہ اس دربار میں ہر فن کا آدمی موجود ہے اور ریاست کہتے اسی کو ہیں کہ گنیوں کی پرورش کی جائے، شریفوں کی قدردانی حضور ہی کا حصہ ہے۔ اس پر کوئی بول اٹھے کہ اور تو سب موجود ہیں، بس یہاں ایک بن بیٹے کی کسر ہے۔ پھر کوئی کہے کہ آج کل دکھن سے ایک صاحب آئے ہیں، جو بنوٹ کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ دو چار آدمی ہاں میں ہاں ملا دیں تو انھیں وہ وہ پیچ یاد ہیں کہ تلوار چھین لیں۔ ذرا سے آدمی مگر سامنے آئے اور بجلی کی طرح تڑپ گئے۔ ہم کہیں گے واللہ آپ لوگ بھی کتنے احمق ہیں کہ ایسے آدمی کو حضور کے سامنے اب تک پیش نہیں کیا۔ اور

جو کوئی رئیس انھیں نوکر رکھ لے تو پھر کیسی ہو؟ بس دیکھ لینا، نواب خود ہی کہیں گے کہ ابھی ابھی لاؤ۔ مگر تیغ بہادر سے کہہ دینا کہ خوب بانکے بن کر آئیں مگر بات چیت نرمی سے کریں، جس میں ہم لوگ کہیں گے کہ دیکھیے خداوند، کتنی شرافت ہے۔ جن لوگوں کو کچھ آتا جاتا نہیں، وہ ہی زمین پر قدم نہیں رکھتے۔

مصاحب : مگر کیوں میاں، یہ تیغ بہادر ہندو ہیں یا مسلمان؟ تیغ بہادر تو ہندوؤں کا نام بھی ہوا کرتا ہے۔ کسی ہندو کے گھر محرم کے دنوں میں لڑکا پیدا ہوا اور امام بخش نام رکھ دیا۔ ہندو بھی کتنے بے تکے ہوتے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ پوچھیے کہ تم جو تعزیے کو سجدہ کرتے ہو، درگاہوں میں شربت پلاتے ہو، امام باڑے بنواتے ہو، تو پھر مسلمان ہی کیوں نہیں ہو جاتے۔

حافظ علی : مگر تم لوگوں میں بھی تو ایسے گوکھے ہیں جو چیچک میں مالن کو بلاتے ہیں، چوراہے پر گدھے کو چنے کھلاتے ہیں، جنم پتری بنواتے ہیں۔ کیا یہ ہندوپن نہیں ہے؟ اس کی نہ کہیے۔

ادھر میاں آزاد بھی مس ورجینا پر لٹو ہو گئے۔ رات تو کسی طرح کروٹیں بدل بدل کر کاٹیں۔ صبح ہوتے ہی مس ورجینا کے پاس جا پہنچے۔ اس نے جو میاں آزاد کی صورت سے ان کی حالت تاڑ لی تو اس طرح چمک چمک کر چلنے لگی کہ ان کی جان پر آفت ڈھائی۔ آزاد اس کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے مگر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

ورجینا : معلوم ہوتا ہے یا تو تم پاگل ہو یا ابھی پاگل خانے سے رسیاں تڑا کر آئے ہو۔

آزاد : ہاں پاگل نہ ہوتا تو تمھاری ادا کا دیوانہ کیوں ہوتا؟

ورجینا : بہتر ہے کہ ابھی سے ہوش میں آجاؤ، میرے کتنے ہی دیوانے پاگل خانے کی سیر کر رہے ہیں۔ روس کے تین جنرل مجھ پر ریجھے، یونان میں ایک رئیس لٹو ہو گئے، انگلستان کے کتنے ہی بانکے آہیں بھرتے رہے، جرمنی کے بڑے بڑے امیر سائے کی طرح میرے ساتھ گھوما کیے، روم کے کئی پاشا زہر کھانے پر تیار ہو گئے۔ مگر دنیا میں دغابازی کا بازار گرم ہے کسی سے دل نہ ملایا، کسی کو منہ نہ لگایا۔ ہمارے چاہنے والے کو لازم ہے کہ پہلے آئینے میں اپنا منہ تو دیکھے۔

آزاد : اب مجھے دیوانہ کہیے یا پاگل، میں تو مر مٹا۔

پھری چشم بت بے پیر دیکھو
ہماری گردش تقدیر دیکھو
انھیں ہے طوق منت کا گراں بار
ہمارے پاؤں کی زنجیر دیکھو

ورجینا : مجھے تمھاری جوانی پر رحم آتا ہے۔ کیوں جان دینے پر تلے ہوئے ہو۔

آزاد : جی کر ہی کیا کروں گا؟ ایسی زندگی سے تو موت ہی اچھی۔

ورجینا : آ گئے تم بھی جھانسے میں۔ ارے میاں میں عورت نہیں ہوں، جوتم سو میں۔ مگر قسم کھاؤ کہ کسی سے یہ بات نہ کہوگے۔ کئی سال سے میں نے یہی بھیس بنا رکھا ہے۔ امیروں کو لوٹنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور تدبیر نہیں۔ ایک ایک چتون کے ہزار دلوں پونڈ لاتا ہوں پھر بھی کسی کو منھ نہیں لگاتا۔ آج تمھاری بے قراری دیکھ کر تم کو صاف صاف بتا دیا۔

آزاد : اچھا مردانے کپڑے پہن کر میرے سامنے آؤ، تو مجھے یقین آئے۔

مس ورجینا ذرا دیر میں کوٹ اور پتلون پہن کر آزاد کے سامنے آئی اور بولی اب تو تمھیں یقین آیا، میرا نام ٹامس ہوڈ ہے، اگر تم کو وہ چٹھیاں دکھاؤں جو ڈھیر کی ڈھیر میرے پاس پڑی ہیں۔ تو ہنستے ہنستے تمھارے پیٹ میں بل پڑ جائے۔ دیکھیے، ایک صاحب لکھتے ہیں :

جنازہ میرا گلی میں ان کی جو پہنچے ٹھہرا کے اتنا کہنا
اٹھانے والے ہوئے ہیں ماندے سو تھک کے کاندھا بدل رہے ہیں۔

دوسرے صاحب لکھتے ہیں :

ہم بھی کشتہ تیری نیرنگی کے ہیں یاد رہے
او زمانے کی طرح رنگ بدلنے والے!

ایک بار اٹلی گیا یہاں اکثر امیروں اور رئیسوں نے میری دعوتیں کیں اور اپنی لڑکیوں سے میری ملاقات کرائی۔ میں کئی دن تک ان پریوں کے ساتھ ہوا کھاتا رہا۔ اور ایک دل لگی سنیے۔ ایک امیرزادی نے میرے ہاتھوں کو چوم کر کہا کہ ہمارے میاں تم سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سے ان کی شادی نہ ہوئی تو وہ زہر کھا لیں گے۔ یہ امیرزادی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس کا شوہر مجھے دیکھتے ہی پھول اٹھا اور ایسی ایسی باتیں کیں کہ میں مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کر سکا۔

آزاد بہت دیر تک ٹامس ہوڈ سے ان کی زندگی کے قصے سنتے رہے۔ دل میں بہت شرمندہ تھے کہ یہاں کتنے احمق بنے۔ یہ باتیں دل میں سوچتے ہوئے سرائے میں پہنچے تو پھاٹک ہی کے پاس سے آواز آئی، لانا تو میری کرولی، نہ ہوا طمنچہ نہیں تو دکھا دیتا تماشہ۔ آزاد نے للکارا کہ کیا ہے بھائی، کیا ہے ہم آ پہنچے۔ دیکھا تو خوجی ایک کتے کو دتکار رہے ہیں۔

(29)

آج تو نرالا سماں ہے۔ غریب امیر، سب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ چھوٹے. بڑے خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں۔ کہیں بلبل کے چہچہے، کہیں قمری کے قہقہے، یہ عید کی تیاریاں ہیں۔ نواب صاحب کی مسجد کا حال نہ پوچھیے۔ روزے تو آپ پہلے ہی چٹ کر گئے تھے۔ لیکن عید کے دن دھوم دھام سے مجلس سجی۔ نور کے تڑکے سے مصاحبوں نے آنا شروع کیا اور مبارک مبارک کی آواز ایسی بلند کی کہ فرشتوں نے آسمان کو تھام لیا، نہیں تو زمین اور آسمان کے قلابے مل جاتے۔

مصاحب : خدا عید مبارک کرے، میرے نواب جگ جگ جئیں۔

حافظ جی : برس دن کا ایک دن مبارک کرے۔

روشن علی : خدا حضور کی عید مبارک کرے۔

نواب : آپ کو بھی مبارک ہو۔ مگر سنا کہ آج تو عید میں فرق ہے۔ بھئی آدھا تیتر اور آدھا بٹیر نہیں اچھا۔

مصاحب : حضور، فرنگی محل کے علماء نے تو آج ہی عید کا فتویٰ لگایا ہے۔

نواب : بھلا چاند کل کسی نے دیکھا بھی؟

مصاحب : حضور، پکے پل کر چار بھشتیوں نے دیکھا، راجا کی بازار میں حافظ جی نے دیکھا اور میرے گھر میں بھی دیکھا۔

نواب : آپ کی بیگم صاحبہ کا سن کیا ہے؟ ہے کوئی چودہ پندرہ برس کی!

مصاحب نے شرما کر گردن جھکا لی۔

نواب : آپ اپنی بیگم صاحبہ کی عمر تو چھپاتے ہیں پھر ان کی شہادت ہی کیا؟ باقی رہے حافظ جی،ان کی آنکھیں پڑھتے پڑھتے جاتی رہیں۔ ان کو دن کو اونٹ تو سوجھتا ہی نہیں

بھلا سرِشام دونوں وقت ملتے ناخون کے برابر چاند کیا سوجھے گا۔
آزاد : حضرت، میں نے اور میاں خوجی نے کل شام کو اپنی آنکھوں دیکھا۔
نواب : تو تین گواہیاں معتبر ہوئیں۔ ہماری عید تو ہر طرح آج ہے۔
اتنے میں فٹن پر سے آبادی جان مسکراتی ہوئی آئی۔
نواب : آیئے آیئے آپ کی عید کس دن ہے؟
آبادی جان : کیا کوئی بھاری جوڑا بنوا رکھا ہے؟ پھٹے سے منہ شرم نہیں آتی۔
نواب :

عید قرباں ہے یہی دن تو ہے قربانی کا
آج تلوار کے مانند گلے مل قاتل

ہم کو کیا یہاں تو تیسوں روزے چٹ کیے بیٹھے ہیں۔ دووقتہ پلاؤ اڑتا تھا۔ یہ فکر تو ان کو ہوگی جو دین کا ٹوکرا سر پر لادے لادے پھرتے ہیں۔
آبادی : انھیں لچھنوں تو دوزخ میں جاؤ گے۔
نواب : خیر، ایک تسکین تو ہوئی۔ آپ سے تو وہاں ضرور گلے ملیں گے۔
مصاحب : سبحان اللہ، کیا خوب سوجھی، واللہ خوب سوجھی! کیا گرماگرم لطیفہ کہا ہے۔
اتنے میں چمپا لونڈی اندر سے گھبرائی ہوئی آئی۔ لٹ گئے، لٹ گئے! اے حضور چوری ہوگئی۔ سب موس لے گیا۔
نواب : کیا کیا، چوری ہوگئی! کب؟
چمپا : رات کو، اور کب؟ اس وقت جو بیگم صاحبہ کوٹھری میں جاتی ہیں تو روشنی دیکھتے ہی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ جاکر دیکھتی ہیں تو ایک بلو کا، کپڑے لتے سب تتر بتر پڑے ہیں۔
مصاحب : اے خداوند، کل تو ایک بجے تک یہاں دربار گرم رہا۔ معلوم ہوتا ہے کوئی پہلے ہی سے گھسا بیٹھا تھا۔
نواب : ذری ہمار تلوار تو لانا بھئی! احتیاط شرط ہے۔ شاید چھپا بیٹھا ہو۔
تلوار لے کر گھر میں گئے تو دیکھتے ہیں بیگم صاحبہ ایک نازک پلنگڑی پر سر پکڑے بیٹھی ہیں، اور لونڈیاں سمجھا رہی ہیں کہ نواب کی سلامتی رہے ایک سے ایک بڑھیا جوڑا بن جائے

گا۔ آپ گھبراتی کاہے کو ہیں؟ نواب نے جاکر کوٹھری کو دیکھا اور تلوار ہاتھ میں لیے پینترے بدلتے ہوئے گھر بھر میں معائنہ کیا پھر بیگم سے بولے، ہمارا لہو پیے جو روئے۔ آخر یہ رونا کاہے کا، مال گیا، گیا۔

لونڈی: ہاں سچ تو فرماتے ہیں۔ جان کی سلامتی رہے مال بھی کوئی چیز ہے؟

بیگم: آج عید کے دن خوشیاں مناتے، ڈومنیاں آتیں، مبارک بادیاں گاتیں، دن بھر دھما چوکڑی مچتی، رات کو رت جگا کرتے، سو آج یہ نیا گل کھلا۔ مگر گہنے کی صندوق چھوڑ گیا، اتنا احسان کیا۔ ابھی تک کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔

نواب: ہمارے سر کی قسم، لو اٹھو، منہ دھو ڈالو۔ عید مناؤ، ہمارا ہی جنازہ دیکھے جو چوری کا غم کرے۔ دو ہزار کوئی بڑی چیز ہے۔

آخر بہت کہنے سننے پر بیگم صاحبہ اٹھیں۔ لونڈی نے منہ دھلایا۔ نواب صاحب نے کہا تمھیں واللہ ہنس تو دو۔ وہ ہونٹ پر ہنسی آئی! دیکھو مسکراتی ہو۔ وہ ناک پر آئی۔

بیگم صاحبہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور گھر بھر میں قہقہے پڑنے لگے۔ یوں بیگم صاحبہ کو ہنسا کر نواب صاحب باہر نکلے، تو مصاحب، حوالی موالی خدمت گار غُل مچانے لگے، حضور کچھ تو بتائیے، یہ معاملہ کیا ہے؟ آخر کدھر سے چور آیا؟ کوئی کہتا ہے حضور بے گھر کے بھدی کے چوری نہیں ہوتی۔ ہم کو اس حبشن پر شک ہے۔ حبشن اندر سے گالیاں دے رہی ہے۔ اللہ کرے جھوٹے پر بجلی گرے، آسمان پھٹ پڑے۔ کسی نے کہا۔ خداوند چوکیدار کی شرارت ہے۔ چوکیدار ہے کہ لاکھوں قسمیں کھاتا ہے۔ گھر بھر میں ہربونگ مچا ہوا ہے۔ اتنے میں ایک مسخرے نے بڑھ کر کہا۔ حضور قسم ہے قرآن کی، ہمیں معلوم ہے۔ بھلا بے بھلا ہم پہچان گئے، ہم سے اڑ کر کوئی جائے گا کہاں؟

مصاحب: معلوم ہے تو پھر بتاتے کیوں نہیں؟

مسخرہ: اجی بتانے سے فائدہ کیا؟ مگر معلوم مجھ کو بیشک ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ غلط ہو تو ہاتھ ہاتھ بدتے ہیں۔

نواب: ارے، جس پر تجھے شک ہے اس کا نام بتا کیوں نہیں دیتا۔

مصاحب: بتاؤ، تمھیں خدا کی قسم۔ کس پر تم کو شک ہے؟ آخر کس کو تاکا ہے؟ بھئی ہم کو بچا دینا استاد۔

مسخرہ : (نواب صاحب کے کان میں) حضور یہ کسی چور کا کام ہے۔

مصاحب : کیا کہا حضور، کس کا نام لیا؟

نواب : (ہنس کر) آپ چپکے سے فرماتے ہیں یہ کسی چور کا کام ہے۔

لوگوں کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ جسے دیکھو لوٹ رہا ہے۔ اتنے میں ریل کے ایک چپراسی نے آکر تار کا لفافہ دیا۔ لفافہ دیکھتے ہی نواب صاحب کا چہرہ فق ہوگیا، ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بولے بھئی کسی انگریزی داں کو بلاؤ اور تار پڑھواؤ۔ خدا جانے کہاں سے گولا آیا ہے۔

مصاحب : کیوں میاں جوان، یہ تار بڑے صاحب کے دفتر سے آیا ہے نہ؟

چپراسی : نہیں ریل گھر سے آوا ہے۔

مصاحب : واہ رے انگریز و اللہ جانتا ہے اپنے فن کے استاد ہیں۔ اور سنیے جلدی کے لیے اب تار کی خبر بھی ریل پر آنے لگی۔ واہ رے استاد، عقل کام نہیں کرتی۔

حافظ : خدا جانے یہ تار بولتا کیوں کر ہے؟ آخر تار کے تو جان نہیں ہوتی۔

خدمت گار ایک انگریزی داں کو لے آیا۔ تار پڑھا گیا، تو معلوم ہوا کہ کسی نے مرزاپور سے پوچھا ہے کہ عید آج ہے یا کل ہوگی؟

مصاحب : یہ تو فرمائیے بھیجا کس نے؟

بابو : نثار حسین نے۔

نواب : سمجھ گیا۔ مرزاپور میں ہمارے ایک دوست ہیں نثار حسین۔ انھیں نے تار بھیجا ہوگا۔ اس کا جواب کسی سے لکھوائیے جس سے آج ہی پہنچ جائے۔ ایک روپے دو روپے جو خرچ ہو داروغہ سے دلوا دو۔ اور میاں ندرت کو تار گھر بھیجو اور کہو کہ اگر بابو کچھ مانگیں تو دے دینا۔ مگر اتنا کہہ دینا کہ خبر ضرور پہنچے۔ ایسا نہ ہو کہیں راہ میں رک رہے، تو غضب ہی ہو جائے۔

میاں ندرت لکھنؤ کے آدمی، نخاس کے باہر عمر بھر قدم ہی نہیں رکھا۔ وہ کیا جانیں کہ تار گھر کس بلا کا نام ہے۔ راہ میں ایک ایک سے پوچھتے جاتے ہیں کیوں بھئی تار گھر کہاں ہے؟ آخر کار ایک چپراسی نے کہا۔ کل کی برق کے سامنے ہے۔ میاں ندرت گھبرا رہے تھے، برے پھنسے یار، تار گھر میں نہ جانے کیا واردات ہو۔ ہم انگریزی قانون وانون نہیں جانتے۔

دیکھیں آج کیا مصیبت پڑتی ہے؟ خیر، خدا مالک ہے۔ چلتے چلتے کوئی دو گھنٹے میں عیش باغ پہنچے۔ یہاں سے پتہ پوچھتے پوچھتے چلے حسین گنج۔ وہاں ایک بابو سڑک پر کھڑے تھے۔ ان سے پوچھا کیوں بابو جی تار گھر کہاں ہے؟ انھوں نے کہا سامنے چلے جاؤ۔ پھر پلٹے بابو جی ایک روپیہ لایا ہوں اور لکھوانا یہ ہے کہ آج عید سنیوں کی ہے کل شیعوں کی ہوگی۔ بھلا وہاں بیٹھا رہوں؟ جب خبر پہنچ جائے، تب آؤں؟ بابو نے کہا ایسا کچھ ضروری نہیں، خیر تار گھر پہنچے تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے کہ دیکھیے جان کیوں کر بچتی ہے۔ تھوڑی دیر پھاٹک پر کھڑے رہے اور وہاں سے مارے ڈر کے بیرنگ واپس۔ راہ میں دونوں روپے انھوں نے بھنائے اور بیوی کے لیے پنچ میل مٹھائی چنگیل میں لے چلے۔ راستے میں یہی سوچتے رہے کہ نواب سے یوں چکمہ چلیں گے یوں جھانسا دیں گے۔ چین کرو۔ استاد اب تمھارے پوبارہ ہیں۔ حلوائی کی دوکان اور دادا جی کا فاتحہ، گھر میں خوش خوش گھسے تو بیوی دیکھتے ہی کھل گئیں۔ جھپٹ کر چنگیل ان کے ہاتھ سے چھینی۔ دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ برفی پر چاندی کا ورق لگا ہوا، امرتیاں تازہ، لڈو گرما گرم۔ پیڑے وہ جو متھرا کے پیڑوں کے دانت کھٹے کر دیں۔ دو تین لڈو اور ایک برفی تو دیکھتے ہی دیکھتے چٹ کر گئیں۔ پیڑا اٹھانے ہی کو تھیں کہ میاں ندرت جھلا کر پہنچا پکڑ لیا اور بولے، ارے بس بھی تو کروگی؟ ایک لڈو کھایا، میں کچھ نہ بولا، دوسرا نکالا میں چپ چاپ دیکھا کیا۔ تیسرے لڈو پر ہاتھ بڑھایا برفی کھائی اور اب چلیں پیڑے پر ہاتھ ڈالنے۔ اب کھانے پینے کی چیز میں ٹوکے کون، اتنی بڑی لومڑ ہوگئیں مگر بلو ہی بنی رہیں۔ مربھکوں کی طرح مٹھائی پر گر پڑنے کے کیا معنی؟ دو پیالیاں لاؤ، افیم گھولو پیو، جب خوب نشے گٹھیں تو مٹھایاں چکھو۔ خدا کی قسم، یہ افیم بھی نعمت کی ماں کا کلیجہ ہے۔

بیوی: (تنک کر) بس، نعمت کی ماں کا کلیجہ تمھیں کھاؤ۔ کھاؤ، چاہے بھاڑ میں جاؤ۔ واہ آج اتنے بڑے تیوہار کے دن مٹھائی کیا لائے کہ دماغ ہی نہیں ملتا۔ موتی کی سی آب اتار لی۔ ایک پیڑے کے خاطر پہنچا دھر کے مروڑ ڈالا۔

اتنے میں باہر سے آواز آئی، میاں ندرت ہیں؟

بیوی: سنتے ہو یا کانوں میں ٹھیٹھیاں ہیں؟ ایک آدمی گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا ہے، دروازے کو چول سے نکالے ڈالتا ہے۔ بولتے کیوں نہیں؟ کہیں چوری کر کے تو نہیں آئے ہو؟

ندرت : ذرا آہستہ آہستہ باتیں کرو۔

بیوی : اے ہے سچ کہیے گا۔ ہم تو خوب غل مچائیں گے۔ ماما، ہم پردے میں ہوئے جاتے ہیں۔ جاکر ان سے کہہ دو گھر میں گھسے بیٹھے ہیں۔

ندرت : نہیں نہیں، یہ دل لگی اچھی نہیں۔ کہہ دو نواب صاحب کے یہاں گئے ہیں۔

ماما : (باہر جاکر) میاں کیا غُل مچا رہے ہو؟ میں تو سمجھی کہیں سے دوڑ آئی ہے۔ وہ تو سویرے نواب صاحب کے یہاں گئے تھے، ابھی آئے نہیں۔ جو ملیں تو بھیج دیجیے گا۔

پکارنے والا : یہ کیسی بات؟ نواب صاحب کے یہاں سےتو ہم ابھی ابھی آرہے ہیں۔ وہاں ڈھونڈھس مچی ہوئی ہے کہ چل کہاں دیے۔ اچھا، بھابھی صاحب سے کہو آج عید کے دن دروازے پر آئے ہیں کچھ سوئیاں ویوئیاں تو کھلائیں۔ ہم تو بے تکلف آدمی ہیں۔ تقاضا کرکے دعوت لیتے ہیں۔

ماما نے اندر سے لے جاکر باہر برآمدے میں ایک موڑھا ڈال دیا۔ ادھر میاں بیوی میں تکرار ہونے لگی۔

میاں : اجی، ٹال بھی دو، ایسے ایسے مفت خورے بہت آیا کرتے ہیں۔ ماما،تم بھی پاگل ہی رہیں۔ موڑھا ڈالنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

بیوی : اے واہ! ہم تو ضرور خاطر کریں گے۔ یہ اچھا کہ نواب کے یہاں جاکر ہم کو گنوارن بنائے؟ اس میں تمھاری ناک نہ کٹے گی۔

بیوی نے ایک طشتری میں پانچ چھ ڈلیاں مٹھائی کی قرینے سے لگاکر اس پر ریشمی ہرا رومال ڈھک دیا اور ماما سے کہا جاؤ دے آؤ۔ میاں ندرت کی روح پر صدمہ ہوا کہ چار پانچ ڈلی تو بیوی باتیں کرتے کرتے چکھ گئیں۔ اور پانچ چھ اب نکل گئیں۔ غضب ہی ہوگیا۔ ماما مٹھائی لے کر چلی، تو ڈیوڑھی میں دو لڈو چپکے سے نکال کر ایک طاق میں رکھ دیے۔ اتفاق سے ایک چھوکرا دیکھ رہا تھا۔ جیسے ماما باہر گئی ویسے ہی دونوں لڈو مزے سے کھا گیا۔ چلیے چور کے گھر میں مور بیٹھا۔ مصاحب نے رومال ہٹایا، تو کہا، واہ بھابھی صاحب تو بھائی صاحب سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ یہ ہاتھی کے منہ میں زیرا۔ خیر، پانی تو لاؤ۔ حضرت نے مٹھائی کھائی اور پانی پیا، تو پان کی فرمائش کی۔ بیوی نے اپنے ہاتھ سے دو گلوریاں بنائیں۔ مصاحب نے چکھی تو حقہ مانگا۔ ندرت نے کہا۔ دیکھا نہ ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔ مٹھائی لاؤ، پان کھلاؤ، پانی

پلاؤ، حقہ بھر لاؤ، گویا بابا کے گھر میں بیٹھے ہیں۔ ان موجیوں کی تو قبر تک سے میں واقف ہوں۔ اور ایک اس پر کیا موقوف ہے۔ نواب کے یہاں جتنے ہیں سب گرگے، مفت خور، پرایا مال تاکنے والے۔ ماما جاکر کہہ دو حقہ یہاں کوئی نہیں پیتا۔ لیکن بیوی نے حقہ بھرا کر بھیج ہی دیا۔ جب پی چکے تو باہر سے آواز دی کہ ماما چارپائی یہاں موجود ہے ذری غلیچا دے جائیے گا۔ اب ٹھیک دوپہر میں کون اتنی دور جائے۔ ذرا کمر سیدھی کرلیں۔ تب تو میاں ندرت خوب ہی جھلائے۔ آخر شیطان کا منصوبہ کیا ہے؟ دیکھ رہا ہے کہ مالک گھر میں نہیں ہے۔ پھر یہ دروازے پر چارپائی پر سونا کیا معنی؟ اور مجھ سے اس سے کہاں کا ایسا یارانہ ہے کہ آتے ہی بھابھی صاحب سے فرمائشیں ہونے لگیں۔

ادھر ماما ڈیوڑھی میں گئی کہ لڈو چپکے چپکے کھائے۔ طاق میں ڈھونڈھ مارا، پر لڈوؤں کا کہیں پتہ نہیں۔ چھوکرے نے پوچھا، ماما وہاں کیا ڈھونڈھ رہی ہو؟ وہ تو چوہا کھا گیا۔ سچ کہنا کیسی ہوئی؟ چوہے نے تمھارے اچھے کان کترے؟

مصاحب : ماماجی، ذری دری دے جائیے۔

ماما : یہاں دری وری نہیں ہے۔

مصاحب : ہم جانتے ہیں بڑے بھائی کہیں اس وقت عید ملنے گئے ہیں۔ بس سمجھ جائیے۔

ندرت نے کہا : خوش ہوئیں؟ کچھ سمجھیں بھی؟ اب یہ اس فکر میں ہیں کہ تم کو ہم کو لڑوا دیں۔ اور مٹھائیاں بھیجو، گلوریاں چکھاؤ۔

جب میاں مصاحب چمپت ہوئے تو میاں ندرت بھی چنگیل کی طرف بڑھے اور افیم کی پینک میں خوب چھک کر مٹھائی چکھی۔ پھر چلے نواب کے گھر۔ قدم قدم پر فقرے سوچتے جاتے ہیں۔ بارے داخل ہوئے تو لوگوں نے آسمان سر پر اٹھایا۔

نواب : شکر ہے زندہ تو بچے! یہ آپ اب تک رہے کہاں آخر؟

مصاحب : حضور، تار گھر تو یہ سامنے ہے۔

حافظ : ہاں اور نہیں تو کیا؟ بات کرتے تو آدمی پہنچتا ہے۔

روشن علی : کون، مجھ سے کہیے تو اتنی دیر میں اٹھارہ پھیرے کروں۔

ندرت : ہاں بھائی، گھر بیٹھے جو چاہے کہہ لو، کوئی جائے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔

چلتے چلتے آندھی روگ آجاتا ہے۔ بکری مرگئی اور کھانے والے کو مزہ نہ آیا آپ لوگ تھان کے تڑے ہیں۔ کہنے لگے، دو قدم پر ہے۔ یہاں سے گئے سعادت گنج، وہاں سے دھنیا مہری کے پل، وہاں سے عیش باغ، وہاں سے گنیش گنج، وہاں سے امین آباد ہوتے ہوئے تار گھر پہنچے۔ دم ٹوٹ گیا، شل ہوگئے، مر مٹے، نہ کھانا نہ دانہ، آپ لوگ بیٹھے بیٹھے یہاں جو چاہے فرمائیں، کہنے اور کرنے میں فرق ہے۔

نواب : تو اس ٹھائیں ٹھائیں سے کیا واسطہ، یہ کہیے خبر پہنچی کہ نہیں؟

ندرت : خداوند، بھلا میں اس کا کیا جواب دوں؟ خبر دے آیا۔ بابو نے میرے سامنے کھٹ کھٹ کیا، صاحب نے روپے لیے چپراسیوں کو انعام دیا۔ چار روپے اپنے جیب سے دینے پڑے۔ وہ تو کہیے وہاں میرے ایک جان پہچان کے نکل آئے نہیں بیرنگ واپس آنا پڑتا۔

نواب : خیر، تسکین ہوئی، اب فرمائیے اتنی دیر کہاں ہوئی؟

ندرت : خداوند، جلدی کے مارے بگدھی کرائے کرکے گیا تھا، لوٹتی بار اس نے وہ پلٹا کھایا کہ میں تو سمجھا بس کچل ہی گیا۔ مگر خدا کارساز ہے گرا تو لیکن بچ گیا۔ کوئی گھنٹے تک کوچ وان یم ہی درست کیا کیا۔ اس سے دیر ہوئی حضور اب گھر جاتا ہوں۔

نواب : ارے بھئی، کھانا تو کھاتے جاؤ۔ اچھا، چار روپے وہ ہوئے اور بگدھی کے کرائے کے بھی کوئی تین روپے ہوئے ہوں گے؟ سات روپے داروغہ سے لے لو۔

ندرت : نہیں خداوند جھوٹ نہیں بولوں گا۔ چاہے فاقہ کروں مگر کہوں گا سچ ہی۔ یہی تو غلام میں جوہر ہے۔ دو روپے اور پانچ پیسے دیے۔ دیکھیے، خدا کو منہ دکھانا ہے۔

نواب : داروغہ، ان کو دس روپے دے دو۔ سچ بولنے کا کچھ انعام بھی تو دوں۔

(30)

دوسرے دن صبح کو نواب صاحب زنان خانے سے نکلے تو مصاحبوں نے جھک جھک کر سلام کیا۔ خدمت گار نے چائے کی صاف ستھری پیالیاں اور چمچے لاکر رکھے۔ نواب نے ایک ایک پیالی اپنے ہاتھ سے مصاحبوں کو دی اور سب نے گرم گرم دودھیا چائے اڑانی شروع کی۔ ایک ایک گھونٹ پیتے جاتے ہیں اور گپ بھی اڑاتے جاتے ہیں۔

مصاحب : حضور، کشمیری خوب چائے تیار کرتے ہیں۔

حافظ : ہماری سرکار میں جو چائے تیار ہوتی ہے ساری خدائی میں تو بنتی نہ ہوگی۔ ذرا رنگ تو دیکھیے۔ ہندو بھی دیکھے، تو منہ میں پانی بھر آئے۔

روشن علی : قربان جاؤں ایسی چائے تو بادشاہ کے یہاں بھی نہیں بنتی تھی۔ خدا جانے میاں رحیم کہاں سے نسخہ پا گئے۔ مگر ذرا تلخی باقی رہ جاتی ہے۔

رحیم : سبحان اللہ! آپ تو بادشاہوں کے یہاں چائے پی چکے ہیں، اور اتنا بھی نہیں جانتے کہ چائے میں تلخی نہ ہو تو وہ چائے ہی نہیں۔

خدمت گار : خداوند، شیودین حلوائی حاضر ہے۔

نواب : داروغہ جی، اس حلوائی کا حساب کردو، اور سمجھا دو کہ اگر خراب یا سڑی ہوئی باسی مٹھائی بھیجی تو اس سرکار سے نکال دیا جائے گا۔ پرسوں برفی خراب بھیجی تھی گھر میں شکایت کرتی تھیں۔

داروغہ : سنتے ہو شیودین؟ دیکھو، سرکار کیا فرماتے ہیں؟ خبردار جو سڑی گلی مٹھائی بھیجی۔ اب تم نے نمک حرامی پر کمر باندھی ہے۔ کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے۔

حلوائی : نہیں خداوند، اول مال دوں اول، چاشنی ذرا بہت آ گئی، تو دانا کم پڑا۔ کڑی ہوگئی۔ چاشنی کی گولی دیر میں دیکھی، نہیں تو اس دوکان کی برفی تو شہر بھر میں مشہور ہے۔ وہ لڑتی ہوتی ہے کہ ہونٹ بندھنے لگتے ہیں۔

داروغہ : چلو، تمھارا حساب کردیں، لے بتلاؤ، کتنے دن سے خرچ نہیں پایا اور تمھارا کیا آتا ہے؟

حلوائی : اگلے مہینے میں 25 اور کچھ آنے کی آئی تھی۔ اور اب کی 10 تاریخ انگریزی تک کوئی ستر یا اسّی کی۔

داروغہ : اجی تم تو گدے بازیاں کرتے ہو! ستر یا اسی، سو یا پانچ سو، اس مہینے میں اتنی اور اس مہینے میں اتنی۔ یہ بکھیڑا تم سے پوچھتا کون ہے؟ ہم سے تو بس گھڑی بتا دو کتنا ہوا؟

حلوائی : اچھا، حساب تو کرلوں (تھوڑی دیر کے بعد) بس، 142 روپے اور دس آنے دیجیے۔ چاہے حساب کر لیجیے، بولتا جاؤں۔

داروغہ : اجی تم کوئی نئے تو ہو نہیں۔ بتاؤ اس میں یاروں کا کتنا ہے؟ سچ بولنا لالہ (پیٹھ

ٹھونک کر) آؤ، وارے نیارے ہوں کیوں ہے نا؟

حلوائی : بس، سو ہم کو دے دو بیالیس تم لے لو۔ سیدھا سیدھا میں تو یہ جانتا ہوں۔

داروغہ : اچھا، منظور، مگر بیالیس کے باون کرو۔ ایک سو تمھارے، باون ہمارے۔ سچ کہنا دونوں مہینوں میں چالیس کی مٹھائی آئی ہوگی یا کم؟

حلوائی : اجی حضور، اب اس بھید سے آپ کو کیا واسطہ؟ آپ کو آم کھانے سے غرض ہے یا پیڑ گننے سے۔ سچ سچ یہ کہ سب ملاکر اڑتیس روپے کی آئی ہوگی۔ مل وزن میں مار دیتا ہوں۔ سیر بھر لڈو مانگ بھیجے، ہم نے پاؤ سیر کم کر دیے۔

داروغہ : اوہ اس کی نہ کہیے یہاں اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ یہ دماغ کسے کی تولنے بیٹھے۔ میاں لکھ لوٹ بیوی ان سے بڑھ کر۔ دس کے پچاس لو اور سیر کے تین پاؤ بھیجو۔ مزے ہیں۔ اچھا یہ سو روپے گن لو اور ایک سو باون کی رسید ہمیں دو۔

حلوائی : یہ مول تول ہے۔ سو اور پانچ ہم لیں اور باقی حضور کو مبارک رہیں۔

اب سنیے، میاں خوجی نے یہ ساری باتیں سن لیں۔ جب شیودین چلا گیا تو بڑھ کر بولے، اجی حضرت آداب عرض ہے۔ کہیے اس میں کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟ یا باون کے باون خود ہی ہضم کر جاؤ گے۔ اور ڈکار تک نہ لوگے؟ اب ہمارا اور آپ کا ساجھا نہ ہوگا تو بری ٹھہرے گی۔

داروغہ : کیا؟ کس سے کہتے ہیں آپ! یہ ساجھا کیسا! بھنگ تو نہیں پی گئے ہو کہیں؟ یہ کیا واہی تباہی بک رہے ہو؟ یہاں بیہودہ بکنے والوں کی زبان کھینچ لی جاتی ہے۔ تم ٹکڑ گدوں کو ان باتوں سے کیا واسطہ؟

خوجی : (کمر کس کر) او گیدی، قسم خدا کی اتنی کرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرو۔ مجھے بھی کوئی ایسا ویسا سمجھے ہو؟ میں آدمی کو دم کے دم میں سیدھا بنا دیتا ہوں۔ کسی اور بھروسے نہ بھولیے گا۔ کیا خوب، اڑتیس کے ڈیڑھ سو دلوائے، پچاس خود اڑائے اور اوپر سے غراتا ہے مردک۔ ابھی تو نواب صاحب سے سارا کچا چٹھا جڑتا ہوں۔ کھڑے کھڑے نہ نکال دیے جاؤ تو سہی۔ ہم بھی تمام عمر رئیسوں کی ہی صحبت میں رہے ہیں۔ گھاس نہیں چھیلا کیے ہیں۔ بائیں ہاتھ سے بیس روپے ادھر رکھ دیجیے۔ بس اسی میں خیر ہے، ورنہ الٹی آنتیں گلے پڑیں گی۔ اب سوچتے کیا ہو؟ ذرا چیں چپڑ کرو گے، تو قلعی کھول دوں گا۔ بولو، اب کیا رائے ہے؟ بیس روپے

سے غم کھاؤ گے یا ذلت اٹھاؤ گے؟ ابھی تو کوئی کانوں کان نہیں سنے گا، پیچھے البتہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

داروغہ : واہ ری پھوٹی قسمت! آج صبح صبح بوہنی تو اچھی ہوئی تھی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے، مگر حضرت نے اپنی منحوس صورت دکھائی۔ اب باون میں سے آپ کو بیس روپے رقم کی رقم نکال دیں تو ہمارے پاس کیا خاک رہے؟ اور ہاں خوب یاد آیا باون کس مردود کو ملے۔ سینتالیس ہی تو ہمارے ہتھے چڑھے۔ دس تم بھی لے لو (گردن میں ہاتھ ڈال کر) مان جاؤ استاد۔ ہمیں ضرورت تھی اس سے کہا، ورنہ کیا بات تھی۔ اور پھر ہم تم زندہ ہیں تو سیکڑوں لوٹیں گے میاں، یہ ہاتھ دونوں لوٹنے ہی کے لیے ہیں یا کچھ اور؟

خوجی : دس میں تو ہمارا پیٹ نہ بھرے گا۔ اچھا بھئی پندرہ دو۔

آخر داروغہ نے مجبور ہوکر پندرہ روپے میاں خوجی کو نذر کیے اور دونوں آدمی جاکر محفل میں شریک ہوئے۔ تھوڑی ہی دیر بیٹھے ہوں گے کہ چوب دار نے آکر کہا حضور، وہ بزاز آیا ہے جو ولایتی کپڑا بیچتا ہے۔ کل بھی حاضر ہوا تھا مگر اس وقت موقع نہ تھا میں نے عرض نہ کیا۔

نواب : داروغہ سے کہو مجھ سے کیا گھڑی گھڑی آکے پرچا جڑتے ہو (داروغہ سے) آؤ بھئی، اس کو بھی لگے ہاتھوں بھگتا ہی دو۔ جھنجھٹ کیوں باقی رہ جائے۔ کچھ اور کپڑا آیا ہے ولایت سے؟ آیا ہو تو دکھاؤ۔ مگر بابا مول کی سند نہیں۔

بزاز : اب کوئی دوج تک سب کپڑا آجائے گا۔ اور حضور ایسی باتیں کہتے ہیں۔ بھلا اس ڈیوڑھی پر ہم نے کبھی مول تول کی بات کی ہے آج تک؟ اور یوں تو آپ امیر ہیں، جو چاہے کہیں مالک ہیں ہمارے۔

داروغہ اور بزاز چلے۔ جب داروغہ صاحب کی کھپریل میں دونوں جاکر بیٹھے تو میاں خوجی بھی رینگتے ہوئے چلے اور دن سے موجود۔ داروغہ نے جو ان کو دیکھا تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، مردنی سی چہرے پر چھا گئی۔ چپ! ہوائیاں اڑی ہوئیں۔ سمجھے کہ یہ خوجی ایک ہی کائیاں ہے۔ اس سے خدا پناہ میں رکھے۔ صبح کو تو مردود نے ہتھے ہی پر ٹوک دیا اور پندرہ پٹیلے۔ اب جو دیکھا کہ بزاز آیا تو پھر موجود۔ آج رات کو اس کی ٹانگ نہ توڑی ہو تو سہی۔ مگر پھر سوچے کہ گڑ سے جو مرے، تو زہر کیوں دیں۔ آؤ، اس وقت چنی چنا کریں پھر سمجھا جائے

گا۔ بولے، آؤ بھائی جان، ادھر موڑھے پر بیٹھو۔ اچھی طرح بھئی؟ حقہ لاؤ، آپ کے لیے۔

بزاز صدر بازار کا رہنے والا ایک ہی استاد تھا۔ تاڑ گیا کہ اس کے بیٹھنے سے میرا اور داروغہ کا مطلب خبط ہوجائے گا۔ کسی تدبیر سے اس کو یہاں سے نکالنا چاہیے۔ پہلے تو کچھ دیر داروغہ سے اشاروں میں باتیں ہوا کیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بزاز نے کہا میاں صاحب آپ کو یہاں کچھ کام ہے؟

خوجی : تم اپنی کہو لالہ جی، ہم سے کیا واسطہ؟

بزاز : تم یہاں سے اٹھ جاؤ۔ اٹھتے ہو کہ میں دوں ایک لات اوپر سے۔

خوجی : او گیدی، زبان سنبھال، نہیں تو اتنی کرولیاں بھونکوں گا کہ خون خرابہ ہوجائے گا۔

بزاز : اٹھوں، پھر میں؟

خوجی : اٹھ کے تماشہ بھی دیکھ لے!

بزاز : بیدھا ہے کیا؟

خوجی : واللہ جو بے تے کیا تو اتنی کرولیاں۔

خوجی کچھ اور کہنے ہی کو تھا کہ بزاز نے بیٹھے بیٹھے منہ دبا دیا اور ایک چپت جمائی۔ چلیے دونوں گتھ گئے۔ اب داروغہ جی کو دیکھیے۔ بیچ بچاؤ کس مزے سے کرتے ہیں کہ خوجی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کمر دبائے ہوئے ہیں اور بزاز اوپر سے ان کو ٹھوک رہا ہے۔ داروغہ صاحب گلا پھاڑ پھاڑ کر غل مچائے جاتے ہیں کہ میاں کیوں لڑے مرتے ہو؟ بھئی دھول دھپے کی سند نہیں۔ خوجی اپنے دل میں جھلا رہے ہیں کہ اچھے میر فیصلی بنے۔ اتنے میں کسی نے نواب صاحب سے جاکر کہہ دیا کہ میاں خوجی، داروغہ اور بزاز تینوں گتھے پڑے ہیں۔ اسی وقت بزاز بھی دوڑا ہوا آیا اور فریاد کی کہ حضور ہم آپ کو یہاں تو سستا مال دیتے ہیں مگر یہ خوجی حساب کتاب کے وقت سر پر سوار ہوگئے۔ لاکھ لاکھ کہا کیے کہ بھئی ہم اپنے مال کا بھاؤ تمھارے سامنے نہ بتائیں گے مل انھوں نے ہاری مانی نہ جیتی، اور الٹے پنجے جھاڑ کے چت پٹ کی ٹھہرائی۔ کمزور مار کھانے کی نشانی۔ میں نے وہ گدا دیا کہ چھٹی کا دودھ یاد کرتے ہوں گے۔ داروغہ بھی روتے پیٹتے آئے کہ دہائی ہے چارپائی کی پٹی توڑ ڈالی، خاص دان توڑ ڈالا اور سیکڑوں کی گالیاں دیں۔

میاں خوجی ایسے دھپیائے گئے اور اتنی بے بھاؤ کی پڑی کہ بس، کچھ پوچھیے نہیں۔

نواب نے پوچھا آخر جھگڑا کیا تھا؟

داروغہ : حضور، یہ خوجی بڑے ہی تیکھے آدمی ہیں۔ بات بات پر کرولی بھونکتے ہیں اور گیدی تو تکیہ کلام ہے۔ اس وقت لالہ بلدیو سے ہی بھڑ پڑے۔ وہ تو کہیے میں نے بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ ایک آدھ کا سر ہی پھوٹ جاتا۔

بزاز : بڑے بھلے آدمی ہیں۔ داروغہ جی بیچارے نہ آجائیں تو کپڑے ویڑے پھاڑ ڈالیں۔

خوجی : تو اب روتے کاہے کو؟ اب یہ دکھڑا لے کے کیوں بیٹھے ہو!

نواب : لپا ڈگی تو نہیں ہوئی۔

خوجی : نہیں حضور، شریفوں میں کہیں ہاتھاپائی ہوتی ہے بھلا؟ ہم نے ان کو للکارا، انھوں نے ہم کو ڈانٹا، مگر کندے تول تول کر دونوں رہ گئے۔ بھلے مانس پر ہاتھ اٹھانا کوئی دل لگی ہے۔

خیر، میاں خوجی تو محفل میں جاکر بیٹھے اور ادھر لالہ بلدیو اور داروغہ صاحب حساب کرنے گئے۔

داروغہ : ہاں بھئی، بتاؤ۔

لالہ : اجی بتائیں کیا، جو چاہے دلوا دو۔

داروغہ : پہلے یہ بتاؤ، تمھارا آتا کیا ہے؟ سو، دوسو، دس، بیس، پچاس جو ہو، کہہ دو۔

لالہ : داروغہ جی، آج کل کپڑا بڑا مہنگا ہے؟

داروغہ : لالہ تم نرے گاودی ہی رہے۔ ہم کو مہنگے سستے سے کیا واسطہ؟ ہم کو تو اپنے حق سے مطلب، تم تو اس طرح کہتے ہو جیسے ہماری گرہ سے جاتا ہے۔

لالہ : پھر تو 753 نکالیے۔

داروغہ : بس، ارے میاں، اب کی اتنے دنوں میں سات ساڑھے سات سو ہی کی نوبت آئی؟

لالہ : جی ہاں، آپ سے کچھ پردہ تھوڑے ہی ہے۔ دو سو اور پچپن روپے کا کپڑا آیا ہے اندر باہر سب ملاکر۔ مگر پرسوں نواب صاحب کہنے لگے کہ اب کی تو تمھارا کوئی پانچ چھ سو کا مال آیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ ایسے موقع پر چوکنا گدھاپن ہے۔ وہ تو پانچ چھ سو بتاتے تھے،

میرے منہ سے نکل گیا حساب کیے سے معلوم ہوگا۔ مل کوئی آٹھ سات سو کا آیا ہوگا۔ تو اب 753 ہی رکھیے۔ اس میں ہمارا اور آپ کا سمجھوتہ ہو جائے گا۔

داروغہ : اجی، سمجھوتہ کیسا، ہم تم کچھ دو تو ہیں نہیں، اور ہمارے تمھارے تو باپ دادا کے وقت سے دوستانہ ہے۔ بولو کتنے پر فیصلہ ہوتا ہے۔

لالہ : بس، دو سو چھبیس تو ہم کو ایک دیجیے، اور تین سو اور دیجیے اس کے بعد بڑھے سو آپ کا۔

داروغہ : (ہنس کر) اچھا بھئی منظور، ہاتھ پر ہاتھ مارو۔ مگر 753 روپے چھ آنے کی رسید لکھو۔ جس سے معلوم ہو کہ آنے پائی سے حساب لیس ہے۔

لالہ : بڑے کائیاں ہو داروغہ جی! اجی 227 روپے چھ آنے کل آپ کا؟

خوجی : بلکہ آپ کے باپ کا۔

یہ آواز سن کر دونوں چونکے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ داروغہ کے حواس غائب۔ بزاز کے بدن میں خون کا نام نہیں۔ اتنے میں پھر آواز آئی۔ کہو کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے؟ تب دونوں کے رہے سہے ہوش اور بھی اڑ گئے۔

اب سنیے : میاں خوجی کھپریل کے پچھواڑے کے ایک موکھے کی راہ سے سب سن رہے تھے۔ جب کل کارروائی ختم ہوگئی تو آواز لگائی۔ خیر داروغہ اور لالہ بلدیو نے ان کو ڈھونڈھ نکالا اور للو پتو کرنے لگے۔

بزاز : ہمارا قصور پھر معاف کیجیے۔

داروغہ : اجی، یہ ایسے آدمی نہیں ہیں، یہ بیچارے کسی سے لڑنے بھڑنے والے نہیں۔ باقی لڑائی جھگڑا تو ہوا ہی کرتا ہے۔ دل میں کدورت آئی اور صاف ہوگئی۔

خوجی : یہ باتیں تو عمر بھر ہوا کریں گی۔ مطلب کی بات فرمایئے۔ لاؤ کچھ ادھر بھی۔

داروغہ : جو کہو۔

خوجی : سو دلوایئے پورے۔ ایک سو لیے بغیر نہ ٹلوں گا۔ آج تم دونوں نے مل کر ہماری خوب مرمت کی ہے۔

داروغہ : یہ تیس روپے تو ایک لیجیے اور یہ دس کا نوٹ۔ بس اور جو السیٹھ کیجیے تو اس سے بھی ہاتھ دھویئے۔

خوجی : خیر لائیے، چالیس ہی کیا کم ہیں۔

داروغہ : ہم سمجھتے تھے کہ بس ہمی ہم ہیں مگر آپ ہمارے بھی گرو پیدا ہوئے۔

میاں خوجی اور داروغہ صاحب ہاتھ میں ہاتھ دیے جا کر محفل میں بیٹھے، گویا دونوں میں دانت کاٹی روٹی تھی۔ مگر داروغہ کا بس چلتا تو خوجی کو کالے پانی ہی بھیج دیتے، یا زندہ چنوا دیتے۔ محفل میں لطیفے اڑ رہے تھے۔

ندرت : حضور آج ایک آدمی نے ہم سے پوچھا کہ اگر دریا میں نہائیں تو منہ کس طرف رکھیں۔ ہم نے کہا کہ بھئی اگر عقل مند ہو تو منہ اپنے کپڑوں کی طرف رکھو، ورنہ چور اٹھا لے جائے گا اور آپ غوطے ہی کھاتے رہ جائیں گے۔

حافظ : پرانا لطیفہ ہے۔

آزاد : ایک حکیم نے کہا کہ جب تک میں بن بیاہ تھا، تو بیوی والے گونگے ہو گئے تھے اور اب جو شادی کر لی تو ایک ایک منہ میں سو سو زبانیں ہیں۔

اتنے میں گندھی نے آ کر سلام کیا۔

نواب : داروغہ جی ان کو بھی بھگتا دو۔

داروغہ اور گندھی کھپریل میں پہنچے تو داروغہ نے پوچھا کتنا عطر آیا؟

گندھی : دیکھیے، آپ کے یہاں تو لکھا ہوگا۔

داروغہ : ہاں، لکھا تو ہے مگر خدا جانے وہ کاغذ کہاں پڑا ہے؟ تم اپنی یاد سے جو جی میں آئے بتا دو۔

گندھی : 35 تو کل کے ہوئے اور 80 ادھر کے۔ بیگم صاحبہ نے اب کی عطر کی بھرمار ہی کر دی۔ قرابہ کے قرابہ خالی کر دیے۔

داروغہ : اچھا بھئی، پھر اس میں کسی کے باپ کا کیا اجارہ۔ شوقین ہیں، رئیس زادی ہیں، امیر ہیں۔ عطر انھیں کے لیے ہے یا ہمارے آپ کے لیے؟ اچھا تو کل 115 ہوئے نا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے؟ لو سو یہ ہیں اور تین نوٹ پانچ پانچ کے۔

گندھی : اچھا لیجیے، یہ عطر کی شیشی آپ کے لیے لایا ہوں۔

داروغہ : کس چیز کا ہے؟

گندھی : سونگھیے تو معلوم ہو۔ خدا جانتا ہے 10 روپے تولے میں جھڑاجھڑ اڑا جا رہا ہے۔

میاں گندھی ادھر روانہ ہوئے، ادھر داروغہ جی خوش خوش چلے، تو آواز آئی کہ استاد اس شیشی میں یاروں کا بھی حصہ ہے۔ پیچھے پھر کے دیکھتے ہیں تو میاں خوجی گھومتے ہوئے چلے آتے ہیں۔

داروغہ: یار، تم نے تو بے طرح پیچھا کیا۔

خوجی: اب کی تو تم کو کچھ نہ ملا۔ مگر اس عطر میں سے آدھی شیشی لیں گے۔

داروغہ: اچھا بھئی، لے لینا۔ تم سے تو کور ہی دبی ہے۔ دونوں آدمی جا کر محفل میں پھر شریک ہو گئے۔

(31)

ایک دن پچھلے پہر سے کھٹملوں نے میاں خوجی کے ناک میں دم کر دیا۔ دن بھر کا خون جونک کی طرح پی گئے۔ حضرت بہت ہی جھلائے، چیخ اٹھے، لانا کرولی، ابھی سب کا خون چوس لوں۔ یہ ہانک جو اوروں نے سنی تو نیند حرام ہوگئی۔ چور کا شک ہوا۔ لینا لینا جانے نہ پائے۔ سرائے بھر میں ہلڑ مچ گیا۔ کوئی آنکھیں ملتا ہوا اندھیرے میں ٹٹولتا ہے، کوئی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنی گٹھری کو دیکھتا ہے، کوئی مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ میاں خوجی نے جو چور چور کی آواز سنی، تو خود بھی غل مچانا شروع کیا۔ لانا میری کرولی۔ ٹھہر! میں بھی آپہنچا۔ پینک میں سوجھ گئی کہ چور آگے بھاگا جاتا ہے، دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھاتے ہیں تو ارر دھوں۔ گرے بھی تو کہاں جہاں کمہار کے ہنڈے رکھے تھے۔ گرنا تھا کہ کئی ہنڈے چکنا چور ہوگئے۔ کمہار نے للکارا کہ چور چور۔ یہ اٹھنے ہی کو تھے کہ اس نے آ کر دبوچ لیا اور پکارنے لگا دوڑو دوڑو چور پکڑ لیا۔ مسافر اور بھٹیارے سب کے سب دوڑ پڑے۔ کوئی ڈنڈا لیے ہے کوئی لٹھ باندھے۔ کسی کو کیا معلوم کہ یہ چور ہے یا میاں خوجی۔ خوب بے بھاؤ کی پڑی۔ یار لوگوں نے تاک تاک کر زناٹے کے ہاتھ لگائے۔ خوجی کی سٹی بٹی بھول گئی، نہ کرولی یاد رہی نہ طمنچہ۔ جب خوب پٹ پٹا چکے تو ایک مسافر نے کہا بھئی یہ تو خوجی معلوم ہوتے ہیں۔ جب چراغ جلایا گیا تو آپ دبکے ہوئے نظر آئے۔ میاں آزاد سے کسی نے جا کر کہہ دیا کہ تمھارے ساتھی خوجی چوری کی علت میں پھنسے ہیں، کسی مسافر کی ٹوپی چرائی تھی۔ دوسرے نے کہا نہیں نہیں یہ نہیں ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک کمہار کی ہانڈیاں چرانے گئے تھے۔ مل جاگ ہوگئی۔

میاں آزاد کو یہ بات کچھ جچی نہیں۔ سوچے، خوجی بیچارے چوری چکاری کیا جانیں۔ پھر چوری بھی کرتے تو ہانڈیاں کی؟ دل میں ٹھان لی کہ چلیں اور خوجی کو بچا لائیں۔ چارپائی سے اترے ہی تھے تو دیکھا خوجی صاحب جھومتے چلے آتے ہیں اور بڑبڑاتے جاتے ہیں۔ ہت تیری گیدی کی، بڑا آزاد بنا ہے۔ چارپائی پر پڑا خرّ خرّ کیا کیا اور ہماری خبر ہی نہیں۔

آزاد : خیر، ہم کو تو پیچھے گالیاں دینا پہلے یہ بتاؤ کہ ہاتھ پاؤں تو نہیں ٹوٹے؟

خوجی : ہاتھ پاؤں! اجی، آپ اس وقت ہوتے تو دیکھتے کہ بندے نے کیا کیا جوہر دکھائے۔ پچاس آدمی گھیرے ہوئے تھے، پورے پچاس ایک کم نہ زیادہ اور میں پھلجھڑی بنا ہوا تھا۔ بس یہ کیفیت تھی کہ کسی کو انٹی دی دھم سے زمین پر، کسی کو کول پر لاد کر مارا۔ دو چار میرے رعب میں آکر تھرتھرا کے گر ہی تو پڑے۔ دس پانچ کی ہڈی پسلی چکنا چور کردی۔ جو سامنے آیا اسے نیچا دکھایا۔

آزاد : سچ؟

خوجی : خدائی بھر میں کوئی ایسا جیوٹ دار آدمی دکھا تو دیجیے۔

آزاد : بھئی، خدائی بھر کا حال تو خدا ہی کو خوب معلوم ہے۔ مگر اتنی گواہی تو ہم بھی دیں گے کہ آپ سا بے حیا دنیا بھر میں نہ ہوگا۔

دونوں آدمی اس وقت سو رہے، دوسرے دن سویرے نواب صاحب کے یہاں پہنچے۔

آزاد : جناب، رخصت ہونے آیا ہوں، زندگی ہے تو پھر ملوں گا۔

نواب : کیا کوچ کی تیاری کر دی؟ بھئی، واپس آنا تو ملاقات ضرور کرنا۔

آزاد اور خوجی رخصت ہوئے تو خوجی پہنچے زنانی ڈیوڑھی پر اور دربان سے بولے، یار ذرا بوا زعفران کو نہیں بلا دیتے۔ دربان نے آواز دی۔ بوا زعفران تمھارے میاں آئے ہیں۔

بوا زعفران کے میاں خوجی سے بالکل ملتے جلتے تھے، ذرا فرق نہیں۔ وہی سوا بالشت کا قد، وہی دبلے پتلے ہاتھ پاؤں۔ زعفران ان سے روز کہا کرتی تھی تم افیم کھانا چھوڑ دو۔ وہ کب چھوڑنے والے تھے بھلا۔ اسی سبب سے دونوں میں دم بھر نہیں بنتی تھی۔ زعفران نے جو باہر آکر دیکھا تو حضرت پینک لے رہے ہیں۔ جل بھن کر خاک ہی تو ہوگئی۔ جاتے ہی میاں خوجی کے پٹے پکڑ کر دو تین چار پانچ چانٹے لگا ہی تو دیے۔ خوجی کا نشہ ہرن ہوگیا۔ چونک کر بولے لانا تو کرولی، کھوپڑی پلپلی ہوگئی۔ ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہا مگر وہ دیونی نواب کا مال

کھا کھا کر ہتھنی بنی پھرتی تھی۔ ان کو چرمر کر ڈالا۔ ادھر غل غپاڑے کی آواز ہوئی، تو بیگم صاحبہ، ماما، لونڈیاں سب پردے کے پاس دوڑیں۔

بیگم : زعفران، آخر یہ ہے کیا؟ روئی کی طرح اس بے چارے کو توم کے دھر دیا۔

ماما : حضور، زعفران کا قصور نہیں، یہ اس مردوئے کا قصور ہے جو جورو کے ہاتھ بک گیا ہے۔ (خوجی کے کان پکڑ کر) جورو کے ہاتھ سے جوتیاں کھاتے ہو اور ذرا چوں نہیں کرتے؟

خوجی : ہائے افسوس، اجی یہ جورو کس مردود کی ہے۔ خدا خدا کرو۔ بھلا میں اس ہڑدنگی، کالی کلوٹی ڈائن کے ساتھ بیاہ کرتا۔ مار مار کے بھرکس نکال دیا۔

بوا زعفران نے جو یہ باتیں سنیں تو وہ آواز ہی نہیں۔ غور کر کے دیکھتے ہیں تو یہ کوئی اور ہی ہیں۔ دانتوں کے تلے انگلی دبا کر خاموش ہو رہیں۔

لونڈی : اے واہ بوا زعفران! اتنی بھی نہیں پہچانتیں۔ یہ بے چارے تو نواب صاحب کے یہاں بنے رہتے تھے۔ آخر تم کو سوجھی کیا؟

بیگم صاحب نے بھی زعفران کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اتنے میں کسی نے نواب صاحب سے سارا قصہ کہہ دیا۔ محفل بھر میں قہقہہ پڑ گیا۔

نواب : زعفران کی سزا یہی ہے کہ خوجی کو دے دی جائیں۔

خوجی : بس، غلام کے حال پر رحم کیجیے۔ غضب خدا کا۔ میاں کے دھوکے میں تو اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دیے اور جو کہیں سچ مچ میاں ہی ہوتے تو چٹنی ہی کر ڈالتی۔ کیا کہیں کچھ بس نہیں چلتا، نہیں نوابی ہوتی تو اتنی کرولیاں بھونکی ہوتیں کہ عمر بھر یاد کرتی۔ یہاں کوئی ایسے ویسے نہیں۔ گھاس نہیں کھودا کیے ہیں۔

بڑی دیر تک اندر باہر قہقہے پڑے، تب دونوں آدمی پھر سے رخصت ہو کر چلے۔ راستے میں میاں آزاد مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئے۔

خوجی : جناب آپ ہنستے کیوں ہیں؟ میں نے بھی ایسی ایسی چٹکیاں لی ہیں کہ زعفران بھی یاد ہی کرتی ہوگی۔

آزاد : میاں ڈوب مرو جا کر، ایک عورت سے ہاتھاپائی میں جیت نہ پائے۔

خوجی : جی، وہ عورت سو مرد کے برابر ہے۔ چمٹ پڑے تو آپ کے بھی حواس اڑ جائیں۔

دونوں آدمی سرائے پہنچ کر چلنے کی تیاری کرنے لگے۔ کھانا کھا کر بوریا بقچہ سنبھال اسٹیشن کو چلے۔

خوجی: حضرت، چلنے کو تو ہم چلتے ہیں مگر اتنی شرطیں آپ کو قبول کرنی ہوں گی۔

1۔ کرولی ہم کو ضرور لے دیجیے۔

2۔ برس بھر کے لیے افیم لے لیجیے۔ میں اپنے لادے لادے پھروں گا۔ ورنہ جمائیوں پر جمائیاں آئیں گی اور بے منوت مر جاؤں گا۔ آپ تو عورتوں کی طرح نشے کے عادی نہیں، مگر میں بغیر افیم پیے ایک قدم نہ چلوں گا۔ پردیس میں افیم ملے یا نہ ملے، کہاں ڈھونڈھتا پھروں گا۔

3۔ اتنا بتا دیجیے کہ وہاں بوا عفران کی سی ڈنڈ پیل دیونیاں تو نظر نہ آئیں گی؟ واللہ، کیا کس کس کے لاتے لگائی ہیں، اور کیا تان تان کے مکے بازی کی ہے کہ پلیتھن ہی نکال ڈالا۔

4۔ سرائے میں ہم سب تمام عمر نہ اتریں گے، اور جہاز پر کمہار ہوئے تو ہم ڈوب ہی مریں گے۔ ہم ٹھہرے آدمی بھاری بھرکم، کہیں پاؤں پھسل گیا اور ایک آدھ ہنڈا ٹوٹ گیا تو کمہار سے ٹھائیں ٹھائیں ہوجائے گی۔

5۔ جس رئیس کی صحبت میں بزازِ آتے ہوں گے وہاں ہم نہ جائیں گے۔

6۔ جہاں آپ چلتے ہیں وہاں کانجی ہاؤس تو نہیں ہے کہ گدھے کے دھوکے میں کوئی ہم کو کان پکڑ کے کانجی ہاؤس پہنچا دے۔

7۔ ٹٹو پر ہم سوار نہ ہوں گے چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہوجائے۔

8۔ میٹھے پلاؤ روز پکے۔

9۔ ہم کو میاں خوجی نہ کہنا۔ جناب خواجہ صاحب کہا کیجیے۔ یہ خوجی کے کیا معنی؟

10۔ مورچہ پر ہم نہ جائیں گے۔ لوٹ مار میں جو کچھ ہاتھ آئے وہ ہمارے پاس رکھا جائے۔

11۔ گولی کھانے کے تین گھنٹے پہلے اور مرنے کے دو گھڑی پہلے ہمیں بتلا دینا۔

12۔ اگر ہم مر جائیں تو پتا لگا کر ہمارے والد کے پاس ہی ہماری لاش دفن کرنا۔ اگر پتہ نہ لگے تو کسی قبرستان میں جا کر سب سے اچھی قبر کے پاس ہم کو دفن کرنا۔ اور لکھ دینا کہ یہ ان کے والد کی قبر ہے۔

13۔ پنک کے وقت ہم کو ہرگز نہ چھیڑنا۔

آزاد : تمھاری سب شرطیں منظور، اب تو چلیے گا۔

خوجی : ایک بات اور باقی رہ گئی۔

آزاد : لگے ہاتھوں وہ بھی کہہ ڈالیے۔

خوجی : میں اپنی دادی جان سے تو پوچھ لوں۔

آزاد : کیا وہ بھی زندہ ہیں؟ خدا جھوٹ نہ بلائے، تو آپ کوئی پچاس کے پیٹے میں ہوں گے۔ اور وہ اس حساب سے کم سے کم کیا ڈیڑھ سو برس کی بھی نہ ہوں گی؟

خوجی : اجی میں دل لگی کرتا تھا۔ ان کی تو ہڈیوں تک کا پتہ نہ ہوگا۔

اسٹیشن پر پہنچے غُل غپاڑا مچا ہوا تھا۔ دونوں آدمی بھیڑ کاٹ کر اندر داخل ہوئے تو دیکھا ایک آدمی گیروئے کپڑے پہنے کھڑا ہے۔ فقیروں کی سی داڑھی، بال کمر تک، مونچھیں بڑی ہوئیں، کوئی پچاس کے پیٹے میں۔ مگر چہرہ سرخ، جیسے لال انگارہ، آنکھیں آگ بھبھوکا۔

آزاد : (ایک سپاہی سے) کیوں بھئی، کیا یہ کوئی فقیر ہیں؟

سپاہی : فقیر نہیں چنڈال ہے۔ کوئی چار مہینے ہوئے یہاں آیا اور ایک آدمی کو سبز باغ دکھا کر اپنا چیلا بنایا۔ رفتہ رفتہ اور لوگ بھی شاگرد ہوئے۔ پھر تو حضرت پجنے لگے۔ اب کوئی تو کہتا ہے کہ باباجی نے دس سیر مٹھائی دریا میں ڈال دی اور دوسرے دن جاکر کہا گنگاجی ہمارا امانت ہم کو واپس کردو۔ دریا لہریں مارتا ہوا باباجی کے پاس آیا اور دس سیر گرما گرم مٹھائی کسی نے آپ ہی آپ ان کے دامن میں باندھ دی۔ کوئی قسمیں کھا کھا کر کہتا ہے کہ کئی مردے انھوں نے زندہ کر دیے۔ ایک صاحب نے یہاں تک بڑھایا کہ ایک دن موسلادھار مینہہ برس رہا تھا اور ان پر بوند نے اثر نہ کیا۔ کوئی فرشتہ ان پر چھتری لگائے رہا۔

آزاد : چکنے گھڑے بن گئے۔

سپاہی : کچھ پوچھیے نہیں۔ ان لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ قید خانے سے نکل جائیں گے۔ مگر تین دن سے حوالات میں ہیں اور اب سٹی پٹی بھولی ہوئی ہے۔ میں جو ادھر سے آؤں جاؤں تو روز دیکھوں کہ بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ مگر عورتیں زیادہ اور مرد کم۔ جو آتا ہے وہ سجدہ کرتا ہے۔ آپ کی دیکھا دیکھی میں گیا میری دیکھا دیکھی آپ گئے۔ باباجی کے یہاں روز دربار لگنے لگا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ باباجی نے اپنی کوٹھری میں ٹاٹ کے نیچے دس پانچ روپے رکھ دیے اور چپکے سے باہر نکل آئے۔ جب دربار جم گیا، تو ایک آدمی نے کہا باباجی ہم کو کچھ دکھائیے۔ بنا کچھ دیکھے ہم ایک نہ مانیں گے۔ باباجی نے آنکھیں نیلی پیلی کیں اور شیر کی طرح گرجے۔ لوگوں کے ہوش اڑ گئے، دو چار ڈرپوک آدمیوں نے تو مارے ڈر کے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک آدمی نے کہا بابا انجان ہے۔ اس پر رحم کیجیے۔ دوسرا بولا نادان ہے جانے دیجیے۔

فقیر: نہیں اس سے پوچھو کیا دیکھے گا؟

آدمی: بابا میں تو روپے کا بھوکا ہوں۔

فقیر: بچہ فقیروں کو دولت سے کیا کام؟ مگر تیری خاطر کرنا بھی ضرور ہے۔ چل چل چل۔ برسوں برسوں برسوں، کھن کھن کھن، اچھا بچہ، کٹی میں دیکھ، ٹاٹ کا کونا اٹھا۔ خدا نے تیرے لیے کچھ بھیجا ہی ہوگا۔ مگر داہنا سُر چلتا ہو، تبھی جانا نہیں تو دھوکا کھائے گا۔ وہاں کوئی ڈراونی صورت دکھائی دے تو ڈر مت جانا، نہیں تو مر جائے گا۔

باباجی نے کٹی کے ایک کونے میں پردا ڈال دیا تھا اور اس پردے میں ایک آدمی کا منہ کالا کرکے بٹھا دیا تھا۔ اب تو آدمی ڈرا کہ نہ جانے کیسے بھیانک صورت نظر آئے گی۔ کہیں ڈر نہ جاؤں، تو جان ہی جاتی رہے۔ باباجی ایک ایک سے کہتے ہیں مگر کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ تب ایک نوجوان نے اٹھ کر کہا لیجیے میں جاتا ہوں۔

فقیر: بچہ، جاتا تو ہے مگر ذرا سنبھل کر جانا۔

نوجوان بے دھڑک کوٹھری میں گھس گیا۔ ٹاٹ کے نیچے سے روپے نکال کر جیب میں رکھ لیے اور چلنے ہی کو تھا کہ پردے میں سے وہ کالا آدمی نکل پڑا اور جوان کی طرف منہ کھول کر جھپٹا۔ جوان نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لکڑی اس کی حلق میں ڈال دی اور اتنی چوٹیں لگائیں کہ بوکھلا دیا۔ جب وہ روپے لیے اکڑتا ہوا باہر نکلا، تو ہوالی موالی سب دنگ کہ یہ تو خوش خوش آتے ہیں اور ہم سمجھے تھے کہ اب ان کی لاش دیکھیں گے۔

نوجوان: (فقیر سے) کہیے حضرت، اور کوئی کرامات دکھائیے گا؟

فقیر: بچہ، تمھاری جوانی پر ہمیں ترس آگیا۔

نوجوان: پہلے جاکر اندر دیکھیے تو کہ آپ کے دیو صاحب کی کیا حالت ہے؟ ذرا مرہم

پٹی کیجیے۔

اگر وہاں سمجھ دار لوگ ہوتے تو سمجھ جاتے کہ باباجی پورے ٹھگ ہیں۔ مگر وہاں تو سبھی جاہل تھے۔ وہ سمجھے، بیشک باباجی نے نوجوان پر رحم کیا۔ خیر باباجی نے خوب ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ ایک دن کسی مہاجن کے یہاں گئے۔ وہاں محلہ بھر کے مرد اور عورتیں جمع ہوگئیں۔ رات کو جب سب لوگ چلے گئے تو انھوں نے مہاجن کے لڑکے سے کہا، ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ جو چاہے مانگ لے۔ لڑکا ان کے قدموں پر گر پڑا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک کوری ہانڈی لاؤ، چولہا گرم کرو، مگر لکڑی نہ ہو کنڈے ہوں۔ کمہار نے سب سامان چٹکیوں میں لیس کر دیا۔ تب آپ نے لوہے کا ایک پتر منگوایا۔ اسے ہانڈی میں پانی بھر کر ڈال دیا۔ پانی کو لے کر کچھ پڑھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک پڑیا دی اور کہا یہ سفید دوا اس میں ڈال دے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مہاجن کا لڑکا اندر گیا تو باباجی نے لوہے کا پتر نکال لیا۔ اور اپنے پاس سے سونے کا پتر ہانڈی میں ڈال دیا، اور چل دیے۔ مہاجن کا لڑکا باہر آیا تو باباجی کا پتہ نہیں۔ ہانڈی کو جو دیکھا تو لوہے کا پتر غائب، سونے کا تھکا موجود۔ محلے بھر میں شور مچ گیا۔ لوگ باباجی کو ڈھونڈھنے لگے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک مالدار کی بیوی نے چکمے میں آکر اپنا پانچ چھ ہزار کا زیور اتار دیا۔ باباجی زیور لے کر اڑ گئے۔ سال بھر تک کہیں پتہ نہ چلا۔ پرسوں پکڑے گئے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی آئی۔ دونوں آدمی جا بیٹھے۔

(32)

صبح کو گاڑی ایک بڑے اسٹیشن پر رکی۔ نئے مسافر آآکر بیٹھنے لگے۔ میاں خوجی اپنے کمرے کے دروازے پر پڑے گھڑکیاں جما رہے تھے۔ آگے جاؤ، یہاں جگہ نہیں ہے، کیا میرے سر پر بیٹھوگے؟ اتنے میں ایک نوجوان دلہا باراتی کپڑے پہنے آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ بارات کے اور آدمی اسباب لدوانے میں مصروف تھے۔ دلہن اور اس کی لونڈی زنانے کمرے میں بٹھائی گئی تھیں۔ گاڑی چلنے والی ہی تھی کہ ایک بدمعاش نے گاڑی میں گھس کر دلہے کی گردن پر تلوار کا ایسا ہاتھ لگایا کہ سر کٹ کر دھڑ سے الگ ہوگیا۔ اس بے گناہ کی لاش پھڑکنے لگی۔ اسٹیشن پر کہرام مچ گیا۔ سیکڑوں آدمی دوڑ پڑے اور قاتل کو گرفتار کرلیا۔ یہاں تو یہ آفت

تھی ادھر دلہن اور مہری میں اور ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

دلہن : دل بہار، دیکھو تو یہ غُل کیسا ہے؟ ذری جھانک کر دیکھنا تو۔

دل بہار : ہیں ہیں، کسی نے ایک آدمی کو مار ڈالا ہے۔ چبوترا سارا لہولہان ہے۔

دلہن : ارے غضب! کیا جانے، کون تھا بیچارا۔

دل بہار : ارے! بات کیا ہے! لاش کے سرہانے کھڑے تمھارے دیور رو رہے ہیں۔

ایک دفعہ لاش کی طرف سے آواز آئی، ہائے بھائی، تو کدھر گیا! دلہن کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ بھائی بھائی کرکے کون روتا ہے۔ ارے غضب! وہ گھبرا کر ریل سے اتری اور چھاتی پیٹتی ہوئی چلی۔ لاش کے پاس پہنچ کر بولی، ہائے لٹ گئی! ارے لوگو یہ ہوا کیا؟

دل بہار : ہیں ہیں دلہن تمھارا نصیب پھوٹ گیا۔

اتنے میں اسٹیشن کی دو چار عورتیں، تار بابو کی بیوی، گارڈ کی لڑکی، ڈرائیور کی بھتیجی وغیرہ نے آکر سمجھانا شروع کیا۔ اسٹیشن ماتم سرا بن گیا۔ لوگ لاش کے اردگرد کھڑے افسوس کر رہے تھے۔ بڑے بڑے سنگ دل آٹھ آٹھ آنسو بہا رہے تھے۔ سینہ پھٹا جاتا تھا۔ یکا یک دلہن نے ایک ٹھنڈی سانس لی زور سے ہائے کرکے چلائی اور اپنے شوہر کی لاش پر دھم سے گر پڑی۔ چند منٹ میں اس کی لاش بھی تڑپ کر سرد ہوگئی۔ لوگ دونوں لاشوں کو دیکھتے تھے اور حیرت سے دانتوں انگلی دباتے تھے۔ تقدیر کے کیا کھیل ہیں، دلہن کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی، سر سے پاؤں تک زیوروں سے لدی ہوئی، مگر دم کے دم میں کفن کی نوبت آگئی۔ ابھی اسٹیشن سے ایک پالکی پر چڑھ کر آئی تھی، اب تابوت میں جائے گی۔ ابھی کپڑوں سے عطر کی مہک آرہی تھی کہ کافور کی تدبیریں ہونے لگیں۔ صبح کو دروازے پر روشن چوکی اور شہنائی بج رہی تھی، اب ماتم کی صدا ہے۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی کہ شہر کے لوگ چھتوں اور دوکانوں سے برات دیکھ رہے تھے، اب جنازہ دیکھیں گے۔ دل بہار دونوں لاشوں کے پاس بیٹھی تھی۔ مگر آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ وہ دلہن کے ساتھ کھیلی تھی۔ دنیا اس کی نظروں میں اندھیری ہوگئی تھی۔ دلہا کے خدمت گار قاتل کو زور زور سے جوتے اور تھپڑ لگا رہے تھے اور مرنے والے کو یاد کرکے ڈھاریں مار کے روتے تھے۔ خیر اسٹیشن ماسٹر نے لاشوں کے اٹھوانے کا انتظام کیا۔ گاڑی تو چلی گئی مگر بہت سے مسافر ریل پر سے اتر آئے۔ بلا سے ٹکٹ کے دام گئے۔ اس قاتل کو دیکھ کر سب کی آنکھوں سے خون ٹپکتا تھا۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اس کو اسی دم

پیس ڈالیں۔ اتنے میں لال کرتی کا ایک گورا جو بڑی دیر سے چلاچلاکر رو رہا تھا غصے کو روک نہ سکا، جوش میں آکے جھپٹا اور قاتل کی گردن پکڑ کر اسے خوب پیٹا۔

آزاد اور میاں خوجی بھی ریل سے اتر پڑے تھے۔ دونوں لاشوں کے ساتھ ان کے گھر گئے۔ راہ میں ہزاروں آدمیوں کی بھیڑ ساتھ ہوگئی۔ جن لوگوں نے ان دونوں کی صورت خواب میں بھی نہ دیکھی تھی جانتے بھی نہ تھے کہ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں وہ بھی زار زار روتے تھے۔ عورتیں بازاروں، جھروکھوں اور چھتوں پر سے چھاتی پیٹتی تھیں کہ خدا ایسی گھڑی ساتویں دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ دوکانداروں نے جنازے کو دیکھا اور دوکان بڑھاکے ساتھ ہوئے۔ رئیس زادے سواریوں پر سے اتر اتر پڑے اور جنازے کے ساتھ چلے۔ جب دونوں لاشیں گھر پر پہنچیں تو سارا شہر اس جگہ موجود تھا۔ دلہن کا باپ ہائے ہائے کر رہا تھا اور دولہے کا باپ صبر کی سل چھاتی پر رکھے اسے سمجھاتا تھا۔ بھائی سنو ہماری اور تمھاری عمر ایک ہے، ہمارے مرنے کے دن نزدیک ہیں۔ اور دو چار برس بے حیائی سے جیے تو جیے ورنہ اب چل چلاؤ ہے۔ کسی کو ہم کیا روئیں۔ جس طرح تم آج اپنی پیاری بیٹی کو رو رہے ہو اسی طرح ہزاروں آدمیوں کو اپنی اولاد کا غم کرتے دیکھ چکے ہو۔ اس کا افسوس ہی کیا؟ وہ خدا کی امانت تھی خدا کے سپرد کردی گئی۔

ادھر قاتل پر مقدمہ پیش ہوا اور پھانسی کا حکم ہوگیا۔ صبح کے وقت قاتل کو پھانسی کے پاس لائے۔ پھانسی دیکھتے ہی بدن کے روئیں کھڑے ہوگئے۔ بڑی حسرت کے ساتھ بولا۔ سب بھائیوں کو سلام، یہ کہہ کر پھانسی کی طرف نظر کی اور یہ شعر پڑھے:

کوئی دم کیجیے کس طور سے آرام کہیں
چین دیتی ہی نہیں گردش ایام کہیں
صید لاغر ہوں میری جلد خبر لے صیاد
دم نکل جائے تڑپ کر نہ تہہ دام کہیں

خوجی: کیوں میاں، شعر اس نے تو کچھ بے تکے سے پڑھے۔ بھلا اس وقت شعر کا کیا ذکر تھا۔

آزاد: چپ بھی رہو۔ اس بے چارے کی جان پر بن آئی ہے اور تم کو مذاق سوجھتا ہے۔

انھیں کچھ رحم بھی آتا ہے یا رب وقت خوں ریزی
چھری جب حلق عاجز پر رواں جلاد کرتے ہیں

قاتل پھانسی پر چڑھا دیا گیا اور لاش پھڑکنے لگی۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی گھوڑا کڑکڑاتا سامنے سے آرہا ہے۔ وہ سیدھا جیل خانے میں داخل ہوا اور چلاکر بولا خدا کے واسطے ایک منٹ کی مہلت دو۔ مگر وہاں تو لاش پھڑک رہی تھی۔ یہ دیکھتے ہی سوار دھم سے گھوڑے سے گر پڑا اور رو کر بولا یہ تیسرا تھا۔ جیل کے داروغہ نے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے پھر آہستہ سے کہا یہ تیسرا تھا۔ اب ایک ایک آدمی اس سے پوچھتا ہے کہ میاں تم کون ہو اور روک لو روک لو کی آواز کیوں دی تھی؟ وہ سب کو یہی جواب دیتا ہے یہ تیسرا تھا۔

آزاد : آپ کی حالت پر افسوس ہوتا ہے۔

سوائی : بھئی، یہ تیسرا تھا۔

انسان کا بھی عجب حال ہے۔ ابھی دو ہی دن ہوئے کہ شہر بھر اس قاتل کے خون کا پیاسا تھا۔ سب دعا کر رہے تھے کہ اس کے بدن کو چیل کوے کھائیں۔ وہ بھی اس بوڑھے کی حالت دیکھ کر رونے لگے۔ قاتل کی بے رحمی یاد نہ رہی۔ سب لوگ اس بوڑھے سوار سے ہم دردی کرنے لگے۔ آخر جب بوڑھے کے ہوش و حواس درست ہوئے تو یوں اپنا قصہ کہنے لگا۔

میں قوم کا پٹھان ہوں۔ تین اوپر ستر برس کا سن ہوا۔ خدا نے تین بیٹے دیے۔ تینوں جوان ہوئے اور تینوں نے پھانسی پائی۔ ایک نے ایک قافلے پر چھاپا مارا۔ اس طرف لوگ بہت تھے۔ قافلہ والوں نے اسے پکڑ لیا اور اپنے آپ ایک پھانسی بناکر لٹکا دیا۔ جس وقت اس کی لاش کو پھانسی پر سے اتارا، میں بھی وہاں جا پہنچا۔ لڑکے کی لاش دیکھ کر غش کی نوبت آئی، مگر چپ۔ اگر ذرا ان لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ یہ اس کا باپ ہے تو مجھے بھی جیتا نہ چھوڑیں۔ یکا یک کسی نے ان سے کہہ دیا کہ یہ اس کا باپ ہے۔ یہ سنتے ہی دس پندرہ آدمی چمٹ گئے اور آگ جلاکر مجھ سے کہا کہ اپنے لڑکے کی لاش اس میں جلا۔ بھائی جان بڑی پیاری ہوتی ہے، انھیں ہاتھوں سے جن سے لڑکے کو پالا تھا اسے آگ میں جلا دیا۔

اب دوسرے لڑکے کا حال سنیے، وہ راولپنڈی میں راہ راہ چلا جاتا تھا کہ ایک آدمی نے جو گھوڑے پر سوار تھا اس کو چابک سے ہٹایا۔ اس نے جھلاکر تلوار میان سے کھینچی اور اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ حاکم نے پھانسی کا حکم دیا۔ اور آج کا حال تو آپ لوگوں نے خود ہی

دیکھا۔ اس لڑکی کے باپ نے قرار دیا تھا کہ میرے بیٹے کے ساتھ نکاح پڑھوائے گا۔ لڑکے نے جب دیکھا کہ یہ دوسرے کی بیوی بنی تو آپے سے باہر ہوگیا۔

میاں آزاد اور خوجی بڑی حسرت کے ساتھ وہاں سے چلے۔

خوجی : چلیے، اب کسی دوکان پر افیم خرید لیں۔

آزاد : اجی بھاڑ میں گئی آپ کی افیم، آپ کو افیم کی پڑی ہے یہاں مارے غم کے کھانا پینا بھول گئے۔

خوجی : بھئی، رنج گھڑی دو گھڑی کا ہے۔ یہ مرنا جینا تو لگا ہی رہتا ہے۔

دونوں آدمی باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک دوکان پر افیم جھڑاجھڑ بک رہی ہے۔ خوجی کی باچھیں کھل گئیں، مرادیں مل گئیں۔ جاتے ہی چونی دکان پر پھینکی، افیم لی، لیتے ہی گھولی اور گھولتے ہی غٹ غٹ پی گئے۔

خوجی : اب آنکھیں کھلیں۔

آزاد : یوں نہیں کہتے کہ اب آنکھیں بند ہوئیں۔

خوجی : کیوں استاد، جو ہم حاکم ہوجائیں تو بڑا مزہ آئے۔ میرا کوئی افیمچی بھائی کسی کو قتل بھی کر آئے تو بے داغ چھوڑ دوں۔

آزاد : تو پھر نکالے بھی جلد جایئے۔

دونوں آدمی یہی باتیں کرتے ہوئے ایک سرائے میں جا پہنچے۔ دیکھا، ایک بوڑھا ہندو زمین پر بیٹھا چلم پی رہا ہے۔

آزاد : رام رام بھائی، رام رام!

بوڑھا : سلام صاحب، سلام، ستھنا پہنے ہو اور رام رام کہتے ہو؟

آزاد : ارے بھائی رام اور خدا ایک ہی تو ہیں۔ سمجھ کا پھیر ہے۔ کہاں جاؤ گے؟

بوڑھا : گاؤں یہاں سے پانچ چوکی ہے۔ پہر رات کا گھر سے چلین، نہاوا، پوجن کین، چبینا باندھا اور ٹھنڈے ٹھنڈے چلے آئین۔ آج کچہری ماں ایک تاریخ ہتی۔ سانجھ لے پھر چلے جاب۔ زمین داری ماں اب کچہری دھاوے کے سوائے اور کا رہی گا؟

آزاد : تو زمین دار ہو؟ کتنے گاؤں ہیں تمھارے؟

بوڑھا : اے حضور، اب یو سمجھو کوئی دوئی ہزار خرچ برچ کر کے بچ رہے ہیں۔

آزاد نے دل میں سوچا کہ دو ہزار سال کی آمدنی اور بدن پر ڈھنگ کے کپڑے تک نہیں۔ گاڑھے کی مرزئی پہنے ہوئے ہے، اس کی کنجوسی کا بھی ٹھکانہ ہے؟ یہ سوچتے ہوئے دوسری طرف چلے تو دیکھا ایک قالین بڑے تکلف سے بچھا ہے اور ایک صاحب بڑے ٹھاٹ سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جام دانی کا کرتا، ادھی کا انگرکھا، تین روپے کی سفید ٹوپی، دو ڈھائی سو کی جیب گھڑی، اس کی سونے کی زنجیر گلے میں پڑی ہوئی۔ قریب ہی چار پانچ بھلے آدمی اور بیٹھے ہوئے ہیں، اور دوسرے تمباکو اڑا رہے ہیں۔ آزاد نے پوچھا تو معلوم ہوا آپ بھی ایک زمیندار ہیں۔ پانچ چھ کوس پر ایک قصبے میں مکان ہے۔ کچھ 'سیر' بھی ہوتی ہے۔ زمین داری سے سو روپے ماہوار کی بچت ہوتی ہے۔

آزاد : یہاں کس غرض سے آنا ہوا؟

رئیس : کچھ روپے قرض لینا تھا مگر مہاجن دو روپے سیکڑا سود مانگتا ہے۔

میاں آزاد نے زمین دار صاحب کے منشی کو اشارے سے بلایا الگ لے جاکر یوں باتیں کرنے لگے۔

آزاد : حضرت ہمارے ذریعہ سے روپے لیجیے۔ دس ہزار بیس ہزار جتنا کہیے، مگر جاگیر قرق کرلیں گے اور چار روپے سیکڑا سُود لیں گے۔

منشی : واہ! نیکی اور پوچھ پوچھ! اگر آپ چودہ ہزار بھی دلوا دیں تو بڑا احسان ہو۔ اور سود چاہے پانچ روپے سیکڑا لیجیے تو کوئی پروا نہیں۔ سود دینے میں تو ہم آندھی ہیں۔

آزاد : بس، مل چکا۔ یہ سود کی کیا بات چیت ہے بھلا؟ ہم کہیں سود لیا کرتے ہیں؟ منافع نہیں کہتے؟

منشی : اچھا حضور، منافع سہی۔

آزاد : اچھا یہ بتاؤ کہ جب سو روپے مہینہ بچ رہتا ہے تو پھر چودہ ہزار قرض کیوں لیتے ہیں؟

منشی : جناب آپ سے تو کوئی پردہ نہیں۔ سو پاتے ہیں اور پانچ سو اڑاتے ہیں۔ اچھا کھانا کھاتے ہیں، باریک اور قیمتی کپڑے پہنتے ہیں، یہ سب آئے کہاں سے؟ بنک سے لیا، مہاجنوں سے لیا، سب چودہ ہزار کے پیٹے میں آگئے۔ اب کوئی ٹکا نہیں دیتا۔

آزاد دل میں اس بوڑھے ٹھاکر کا ان رئیس صاحب سے مقابلہ کرنے لگے۔ وہ بھی

زمین دار یہ بھی زمین دار، ان کی آمدنی ڈیڑھ سو سے زیادہ، ان کی مشکل سے سو وہ گاڑھے کی دھوتی اور گاڑھے کی مرزئی پر خوش ہیں اور یہ شربتی اور جام دانی پھڑکاتے ہیں۔ وہ ڈھائی تلے کا چم رودھا جوتا پہنتے ہیں یہاں پانچ روپے کی سلیم شاہی جوتیاں۔ وہ پالک اور چنے کی روٹیاں کھاتے ہیں اور یہ دو وقت شیرمال اور مرغ پلاؤ پر ہاتھ لگاتے ہیں۔ وہ ٹکے گز کی چال چلتے ہیں یہاں ہوا کے گھوڑوں پر سوار۔ دونوں پر پھٹکار۔ وہ کنجوس اور یہ فضول خرچ۔ وہ روپے کو دفن کیے ہوئے، یہ روپے لٹاتے پھرتے ہیں وہ کھا نہیں سکتے تو یہ بچا نہیں سکتے۔

شام کو دونوں آدمی ریل پر سوار ہوکر پونا جا پہنچے۔

(33)

ریل سے اتر کر دونوں آدمیوں نے ایک سرائے میں ڈیرا جمایا اور شہر کی سیر کو نکلے۔ یوں تو یہاں کی سبھی چیزیں بھلی معلوم ہوتی تھیں لیکن سب سے زیادہ جو بات انھیں پسند آئی وہ یہ تھی کہ عورتیں بلا چادر اور گھونگھٹ کے سڑکوں پر چلتی پھرتی تھیں۔ شریف زادیاں بے حجاب نقاب اٹھائے مگر آنکھوں میں حیا اور شرم چھپی ہوئی۔

خوجی : کیوں میاں یہ تو کچھ عجب رسم ہے؟ یہ عورتیں منہ کھولے پھرتی ہیں۔ شرم اور حیا سب بھون کھائیں۔ واللہ کیا آزادی ہے۔

آزاد : آپ خاصے احمق ہیں۔ عرب میں، عجم میں، افغانستان میں، مصر میں، ترکستان میں، کہیں بھی پردہ ہے؟ پردا تو آنکھ کا ہوتا ہے۔ کہیں چادر حیا سکھاتی ہے؟ جہاں گھونگھٹ کاڑھا اور نظر پڑنے لگی۔

خوجی : اجی میں دنیا کی بات نہیں چلاتا۔ ہمارے یہاں تو کہاریاں اور مالنیں تک پردہ کرتی ہیں، نہ کہ شریف زادیاں ہی! ایک قدم تو بے پردے کے جاتی نہیں۔

آزاد : ارے میاں نقاب کو شرم سے کیا سروکار؟ آنکھ کی حیا سے بڑھ کر کوئی پردہ ہی نہیں۔ ہمارے ملک میں تو پردے کا نام نہیں مگر ہندستان کا تو بابا آدمی ہی نرالا ہے۔

خوجی : آپ کا ملک کون؟ ذرا آپ کے ملک کا نام تو سنوں۔

آزاد : کشمیر وہی کشمیر جسے شاعروں نے دنیا کا فردوس مانا ہے۔ وہاں ہندو مسلمان عورتیں برقعہ اوڑھ کر نکلتی ہیں، مگر یہ نہیں کہ عورتیں گھر کے باہر قدم ہی نہ رکھیں۔ یہ روگ تو

ہندستان ہی میں پھیلا ہے۔ ہم تو جب ترکی سے آئیں گے تو یہیں بستر جمائیں گے اور حسن آرا کو ساتھ لے کر آزادی کے ساتھ ہوا کھائیں گے۔

خوجی: یار بات تو اچھی ہے مگر میری بیوی تو اس لائق ہی نہیں کہ ہوا کھلانے لے جاؤں۔ کون اپنے اوپر تالیاں بجوائے؟ پھر اب تو بوڑھی ہوئی اور رنگ بھی ایسا صاف نہیں۔

آزاد: تو اس میں شرم کی کون سی بات ہے؟ آپ ان کے کالے منہ سے جھینپتے کیوں ہیں؟

خوجی: جب حبش جاؤں گا تو وہاں ہوا کھلاؤں گا۔ آپ نئی روشنی کے لوگ ہیں۔ آپ کی حسن آرا آپ سے بھی بڑھی ہوئی جو دیکھے پھڑک جائے کہ کیا چاند سورج کی جوڑی ہے۔ ایسی شکل وصورت ہو تو ہوا کھلانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اب کیا جوش دکھائیں، نہ وہ امنگ ہے نہ وہ ترنگ۔

آزاد: ہم کہتے ہیں بوا زعفران کو بیاہ لو اور ایک ٹٹو لے دو۔ بس اسی طرح وہ بھی بازاروں میں ہوا کھائیں۔

خوجی: (کان پکڑ کر) یا خدا بچائیو، پیچ پی، ہزار نیامت کھائی، مارے چپتوں کے کھوپڑی گنجی کردی تھی۔ کیا وہ بھول گیا؟

آزاد: یہاں سے بمبئی بھی تو قریب ہے۔

خوجی: ارے غضب! کیا جہاز پر بیٹھنا ہوگا؟ تو بھئی میرے لیے افیم لے دو۔

پونے سے بمبئی تک دن میں کئی گاڑیاں جاتی تھیں۔ دونوں آدمیوں نے سرائے میں پہنچ کر کھانا کھایا اور بمبئی روانہ ہوئے۔ شام ہوگئی تھی۔ ایک ہوٹل میں جاکر ٹھہرے۔ آزاد تو دن بھر کے تھکے ہوئے تھے، لیٹتے ہی خراٹے لینے لگے۔ خوجی افیمچی آدمی نیند کہاں؟ اسی فکر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ نیند کو کیوں کر بلاؤں۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لمبی تڑنگی پیچ ہتتھی عورت چمکتی دمکتی چلی آتی ہے۔ پورے سات فٹ کا قد، نہ جو بھر کم، نہ جو بھر زیادہ۔ دھانی چادر اوڑھے اٹھلا اٹھلا کر چلتی ہوئی میاں خوجی کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ خوجی نے اس کی طرف نظر ڈالی تو اس نے ایک تیکھی چتون سے ان کو دیکھا اور آگے چلی۔ آپ کو شرارت جو سوجھی تو سیٹی بجانے لگے۔ سیٹی کی آواز سنتے ہی وہ ان کی طرف جھک پڑی اور چھما چھم کرتی ہوئی کمرے میں چلی آئی۔ اب میاں خوجی کے حواس پیترے ہوئے کہ اگر آزاد کی آنکھ کھل

گئی تو لے ہی ڈالیں گے، اور جو کہیں ریجھ گئے تو ہماری خیریت نہیں۔ ہم بس نیبو اور نون چاٹ کر رہ جائیں گے۔ اشارے سے کہا۔ ذری آہستہ آہستہ بولو۔

عورت : ارے واہ میاں اچھے ملے۔

خوجی : میاں آزاد سوئے ہوئے ہیں۔

عورت : ان کا بڑا لحاظ کرتے ہو کیا باپ ہیں تمھارے؟

خوجی : خدا کے واسطے چپ بھی رہو۔

عورت : چلو ہم تم دوسری کوٹھری میں چل کر بیٹھیں۔

دونوں پاس کی ایک کوٹھری میں جا بیٹھے۔ عورت نے اپنا نام قیصر بتلایا اور بولی واللہ جانتا ہے تم پر میری جان جاتی ہے۔ خدا کی قسم کیا ہاتھ پاؤں پائے ہیں کہ جی چاہتا ہے چوم لوں۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوجی : (اکڑ کر) ابھی کیا، جوانی میں دیکھنا ہم کو۔

کیا خوب، ابھی جوانی شاید آنے والی ہے۔ کچھ اوپر پچاس کا سن ہوا، اور آپ ابھی لڑکے ہی بنے ہوئے ہیں۔ اس عورت نے آپ کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا لیکن آپ سمجھے کہ سچ مچ ریجھ ہی گئی۔ اور بھی پھلنے لگے۔

عورت : ڈیل ڈول کتنا پیارا ہے کہ جی خوش ہوگیا۔ مگر داڑھی منڈوا ڈالو۔

خوجی : اگر میں کسرت کروں تو اچھے اچھے پہلوانوں کو لڑا دوں۔

عورت : ذرا کان تو پھٹ پھٹا لو۔ شاباش

خوجی : ایک بات بتاؤں کیوں برا تو نہ مانوگی؟

عورت : برا مانوں گی تو ذرا کھوپڑی سہلا دوں گی۔

خوجی : جاں بخشی کرو تو کہوں۔

عورت : (چپت لگا کر) کیا کہتا ہے کہہ۔

خوجی : بھئی یہ دھول دھپا شریفوں میں جائز نہیں

عورت : تجھ موئے کو کون نگوڑی شریف سمجھتی ہے۔

ایک چپت اور پڑی۔ خوجی نے تیوریاں بدل کر کہا : بھئی یہ عادت مجھے پسند نہیں۔ مجھے بھی غصہ آجائے گا۔

عورت : آنکھیں کیا نیلی پیلی کرتا ہے؟ پھوڑ دوں دونوں آنکھیں۔

خوجی : اب ہمارا مطلب تو اس جھنجھٹ میں خبط ہوا جاتا ہے۔ اب تو بتاؤ کچھ مانگیں تو دوگی؟

عورت : ہاں، کیوں نہیں ایک لپڑ ادھر اور دوسرا ادھر۔ کیا مانگتے ہو؟

خوجی : کہنا یہ ہے کہ...... مگر کہتے ہوئے دل کانپتا ہے۔

عورت : اب میں تم کو ٹھیک نہ بناؤں کہیں؟

خوجی : تمھارے ساتھ بیاہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔

عورت : اے، ابھی تم بچے ہو، دودھ کے دانت تک تو ٹوٹے نہیں۔ بیاہ کیا کرے گا بھلا؟

خوجی : واہ واہ! میرے دو بچے کھیلتے ہیں، ابھی تک ان کے نزدیک لونڈے ہی ہیں ہم۔

عورت : اچھا، کچھ کمائی ومائی تو نکال اور داڑھی منڈوا۔

خوجی : (دس روپے دے کر) لو یہ حاضر ہے۔

عورت : دیکھوں! اوں ہاتھی کے منہ میں زیرا!

خوجی : لو یہ پانچ اور لو۔ اجی میں تم کو بیگم بنا کر رکھوں گا۔

عورت : اچھا ایک شرط سے شادی کروں گی۔ تڑکے اٹھتے مجھے سات بار سلام کرنا اور میں سات چپتیں لگاؤں گی۔

خوجی : اجی، بلکہ اور دس۔

عورت : اچھا، اسی بات پر کچھ اور نکالو۔

خوجی : لو یہ پانچ اور لو۔ تمھارے دم کے لیے سب کچھ حاضر ہے۔

عورت نے جھٹ سے میاں خوجی کو گود میں اٹھا لیا اور بغل میں دبا کر لے چلی، تو خوجی بہت چکرائے۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے، مگر اس نے جو دبایا تو اس طرح لے چلی جیسے کوئی چڑی مار جانوروں کو پھڑ پھڑاتے ہوئے لے چلے۔ اب سارا زمانہ دیکھ رہا ہے کہ خوجی پھڑکتے ہوئے جاتے ہیں اور وہ عورت چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے۔

خوجی : اب چھوڑتی ہے یا نہیں؟

عورت : اب عمر بھر تو چھوڑنے کا نام نہ لوں گی۔ ہم بھلے مانسوں کی بہو بیٹیاں چھوڑ دینا

کیا جانیں۔ بس ایک کے سر ہو رہیں۔ بھاگے کہاں جاتے ہو میاں؟

خوجی : میں کچھ قیدی ہوں؟

عورت : (چپت لگا کر) اور نہیں، کون ہے تو؟ اب میں کہیں جانے بھی دوں گی؟

خوجی پیچھے ہٹنے لگے، تو اس نے پٹے پکڑ کر خوب بے بھاؤ کی لگائی۔ اب یہ جھلائے اور غل مچایا کہ کوئی ہے؟ لانا کرولی، بہت سے تماشائی کھڑے ہنس رہے تھے۔

ایک : کیا ہے میاں؟ یہ دھر دھر پکڑ کیسی!

عورت : آپ کوئی قاضی ہیں؟ یہ ہمارے میاں ہیں۔ ہم چاہے چپتیائیں چاہے پیٹیں کسی کو کیا؟

دوسرا : مہرارو گردن دابے اٹھائے لیے جات ہے، وہ کرولی نکارت ہے۔

خوجی : برے پھنسے! یارو ذرا میاں آزاد کو سرائے سے بلانا۔

عورت نے پھر خوجی کو گود میں اٹھایا اور مشک کی طرح پیٹھ پر رکھ کر 'مسک دریاؤ، ٹھنڈا پانی' کہتی ہوئی لے چلی۔

ایک آدمی : کیسے مرد ہو جی! عورت سے جیت نہیں پاتے۔ بس عزت ڈوبو دی بالکل۔

خوجی : اجی، اس عورت پر شیطان کی پھٹکار۔ یہ تو مردوں کی کان کاٹتی ہے۔

اتنے میں میاں آزاد کی نیند کھلی تو خوجی غائب۔ باہر نکلے تو دیکھا خوجی کو ایک عورت دبائے کھڑی ہے۔ للکار کر کہا تو کون ہے۔ انھیں چھوڑتی کیوں نہیں؟

عورت نے خوجی کو چھوڑ دیا اور سلام کرکے بولی، حضور میرا انعام ہوا۔ میں بہروپیا ہوں۔

دوسرے دن خوجی میاں آزاد کے ساتھ شہر کی سیر کرنے چلے، تو شہر بھر کے لونڈے لہاڑیے ساتھ، پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے جاتے ہیں۔ ایک بولا کہو چڑھا بیوی نے چاند گنجی کردی نہ؟ ہت تیرے کی۔ دوسرا بولا کہو استاد، کھوپڑی کا کیا رنگ ہے؟

بے چارے خوجی کو راستہ چلنا مشکل ہوگیا۔ دو چار آدمیوں نے بہروپیے کی تعریف کی تو خوجی جل بھن کر خاک ہوگئے۔ اب کسی سے نہ بولتے ہیں نہ چالتے۔ دم دبائے، ڈگ بڑھائے، گردن جھکائے پتاتوڑ بھاگ رہے ہیں۔ بارے خدا خدا کرکے دوپہر کو پھر سرائے میں آئے۔ نیم کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں لیٹ گئے، تو ایک بھٹیاری نے مسکرا کے کہا گاج

پڑے ایسی عورت پر، جو میاں کو گود میں اٹھائے اور بازار بھر میں نچائے۔ غرض سرائے کی بھٹیاریوں نے خوجی کو ایسا انگلیوں پر نچایا کہ خدا کی پناہ! ایسے جھینپے کہ کرولی تک بھول گئے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک لمبے ڈیل ڈول کا خوبصورت جوان طمنچہ کمر میں لگائے، اودی پگڑی سر پر جمائے، بانکی ترچھی چھوی دکھاتا ہوا اکڑتا چلا آتا ہے۔ بھٹیاریاں چھپ چھپ کے جھانکنے لگیں۔ سمجھیں کہ مسافر ہے بولیں میاں ادھر آؤ یہاں بستر جماؤ۔ میاں مسافر دیکھو کیسا صاف ستھرا مکان ہے۔ بکریاں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں ہے، ذرا تو تکلیف ہوگی نہیں۔ سپاہی بولا ہمیں بازار سے کچھ سودا خریدنا ہے کوئی ہمارے ساتھ چلے تو سودا خرید کر ہم آجائیں۔ ایک بھٹیاری بولی، چلیے ہم چلتے ہیں۔ دوسری بولی لونڈی حاضر ہے۔ سپاہی نے کہا میں کسی پرائی عورت کونہیں لے جانا چاہتا۔ کوئی پڑھا لکھا مرد چلے، تو پانچ روپے دیں۔ میاں خوجی کے کان میں جو بھنک پڑی تو کلبلاکر اٹھ بیٹھے اور کہا میں چلتا ہوں مگر پانچوں نقد گنوا دیجیے۔ میں السیٹھ سے ڈرتا ہوں۔ سپاہی نے جھٹ سے پانچوں نوٹ گن دیے۔ روپے تو خوجی نے ٹینٹ میں رکھے اور سپاہی کے ساتھ چلے۔ راستے میں جو انھیں دیکھتا ہے قہقہہ لگاتا ہے بچہ کی کھوپڑی جانتی ہوگی چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ جب چاروں اُور سے بوچھاریں پڑنے لگیں تو خوجی بہت ہی جھلائے اور غل مچاکر ایک ایک کو ڈانٹنے لگے۔ چلتے چلتے ایک افیم کی دوکان پر پہنچے۔

سپاہی: کہو بھئی جوان، ہے شوق؟ پلواؤں؟

خوجی: اجی میں تو اس پر عاشق ہوں۔

سپاہی نے میاں خوجی کو خوب افیم پلائی۔ جب خوب سرور گٹھے تو سپاہی نے ان کو ساتھ لیا اور چلا۔ باتیں ہونے لگیں۔ خوجی بولے: بھئی افیم پلائی ہے تو مٹھائی بھی کھلواؤ، احسان کرے تو پورا۔

سپاہی: اجی ابھی لو، یہ چار گنڈے کی پنچ میل مٹھائی حلوائی کی دوکان سے لاؤ۔

حلوائی کی دوکان سے خوجی نے لڑلڑ کے خوب مٹھائی لی۔ اور جھومتے ہوئے چلے۔ بھوک کے مارے راستے ہی میں ڈلیاں نکال کر چکھنی شروع کردی۔ سپاہی کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا، مگر آنکھ چرا لیتا تھا۔ آخر دونوں آدمی ایک بزاز کی دوکان پر پہنچے۔ سپاہی نے خوجی کی طرف اشارہ کر کے کہا ان کے انگرکھے کے برابر جام دانی نکال دیجیے۔

بزاز : حضور، اپنے انگر کھے کے لیے لیں تو کچھ ہمیں بھی مل رہے۔ ان کا تو انگرکھا اور پاجامہ سب گز بھر میں تیار ہے۔

خوجی : نکالو، جام دانی نکالو۔ بہت باتیں نہ بناؤ۔ ابھی ایک دھکا دوں تو پچاس لڑھکنیاں کھاؤ۔

بزاز : لیجیے، کیا جام دانی ہے۔ بہت بڑھیا! مول تول دس روپے گز۔ مگر سات روپے گز سے کوڑی کم نہ ہوگی۔

سپاہی : بھئی، ہم تو پانچ روپے کے دام دیں گے۔

بزاز : اب تکرار کون کرے۔ آپ چھ کے دام دے دیں۔

سپاہی : اچھا، دو گز اتار دو۔

سپاہی نے بزاز سے سب ملاکر کوئی پچیس روپے کا کپڑا لیا اور گٹھا باندھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

بزاز : روپے؟

سپاہی : ابھی گھر سے آکر دیں گے؟ ذرا کپڑے پسند تو کرا لائیں۔ یہ ہمارا سالا بیٹھا ہے ہم ابھی آئے۔

وہ تو لے دے کر چل دیا۔ خوجی اکیلے رہ گئے۔ جب بہت دیر ہوگئی تو بزاز نے گردن ناپی، کہاں چلے آپ! کہاں چلے کہاں؟

خوجی : ہم کیا کسی کے غلام ہیں؟

بزاز : غلام نہیں تو اور ہو کون؟ تمھارے بہنوئی تم کو بٹھا کر کپڑا لے گئے ہیں۔

خوجی پینک سے چونکے تھے۔ سپاہی اور بزاز میں جب باتیں ہی رہی تھیں تب وہ پینک میں تھے۔ جھلاکر بولے، ابے کس کا بہنوئی؟ اور کون سالا؟ کچھ واہی ہوا ہے؟

اتنے میں ایک آدمی نے آخر خوجی سے کہا، تمھارے بہنوئی تمھیں یہ خط دے گئے ہیں۔ خوجی نے کھول کر پڑھا تو لکھا تھا:

ہت تیری کی، کیوں؟ کھا گیا نہ جھانسا؟ دیکھ اب کی پھر پھانسا تب کی بیوی بن کے چپتیایا، اب کی بہنوئی بن کے جھانسہ دیا۔ اور افیم کھاؤ گے؟

خوجی، ارے! کرکے رہ گئے۔ واہ رے بہروپیے اچھا گھن چکر بنایا۔ خیر اور تو جو ہوا وہ

ہوا اب یہاں سے چھٹکارا کیسے ہو۔ بزاز اس دم ٹڑوں ٹوں اور کرولی پاس نہیں۔ مگر ایک دفعہ رعب جمانے کی ٹھانی۔ دوکان کے نیچے اتر کر بولے، اس پھیر میں بھی نہ رہنا میں نے بڑے بڑوں کی گردنیں ڈھیلی کردی ہیں۔

بزاز: یہ رعب کسی اور پر جمایئے گا۔ جب تک آپ کے بہنوئی نہ آئیں گے دوکان سے ہلنے نہ دوں گا۔

بارے تھوڑے ہی دیر میں ایک آدمی نے آکر بزاز کو پچیس روپے دیے اور کہا اب ان کو چھوڑ دیجیے۔

(34)

ادھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر آزاد سے ایک آدمی نے آکر کہا جناب آج میلہ دیکھنے نہ چلیے گا؟ وہ وہ صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ دیکھتا ہی رہ جائے۔

ناز سے پائنچے اٹھائے ہوئے شرم سے جسم کو چرائے ہوئے
نشۂ بادۂ شباب سے چور، چال مستانہ حُسن پر مغرور
سیکڑوں بل کمر کو دیتی ہوئی جانِ طاؤس کبک لیتی ہوئی

چلیے اور میاں خوجی کو ساتھ لیجیے۔ آزاد رنگیلے تھے ہی، چٹ تیار ہوگئے۔ سج دھج کر اکڑتے ہوئے چلے۔ کوئی پچاس قدم چلے ہوں گے کہ ایک جھروکے سے آواز آئی۔

خدا جانے یہ آرائش کرے گی قتل کس کس کو
طلب ہوتا ہے شان آئینے کو یاد کرتے ہیں

میاں آزاد نے جو اوپر نظر کی تو جھروکھے کا دروازہ خوجی کی آنکھ کی طرح بند ہوگیا۔ آزاد حیران کہ خدا یہ ماجرا کیا ہے؟ یہ جادو تھا، چھلاوا تھا، آخر تھا کیا؟ آزاد کے ساتھی نے یہ رنگ دیکھا تو آہستہ سے کہا حضرت اس پھیر میں نہ پڑیے گا۔

اتنے میں دیکھا کہ وہ نازنین پھر نقاب اٹھائے جھروکھے پر آکھڑی ہوئی اور اپنی مہری سے بولی، فنس تیار کراؤ ہم میلے جائیں گے۔

آزاد کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اوپر سے ایک کاغذ نیچے آیا۔ آزاد نے دوڑ کر اٹھایا تو موٹے قلم سے لکھا تھا:

دل لگی کرتی ہیں پریاں میرے دیوانے سے

آزاد پڑھتے ہی اچھل پڑے۔ یہ شعر پڑھا:

ہم ایسے ہوگئے اللہ اکبر! اے تیری قدرت

ہمارے نام سے اب ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

اتنے میں ایک مہری اندر سے آئی اور مسکرا کر میاں آزاد کو اشارے سے بلایا۔ آزاد خوش خوش مہتابی پر پہنچے تو دل باغ باغ ہوگیا۔ دیکھا ایک حسینہ بڑے ٹھاٹ باٹ سے ایک کرسی پر بیٹھی ہے۔ میاں آزاد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولی معلوم ہوتا ہے آپ چوٹ کھائے ہیں کسی کے زلف میں دل پھنسا ہے۔

کھلتے ہیں کچھ اشتیاق کے طور

رخ میری طرف نظر کہیں اور

آزاد نے دیکھا تو اس نازنین کی شکل وصورت حسن آرا سے ملتی تھی۔ وہی صورت وہی گلاب سا چہرہ۔ وہی نشیلی آنکھیں بال برابر بھی فرق نہیں۔ بولے برسوں اس کوچے کی سیر کی مگر اب دل پھنسا چکے۔

حسینہ: تو بسم اللہ جائیے۔

آزاد: جیسی حضور کی مرضی۔

حسینہ: واہ ری بد دماغی، کہیے تو آپ کا کچا چٹھا کہہ چلوں؟ میاں آزاد آپ ہی کا نام ہے نہ؟ حسن آرا سے آپ ہی کی شادی ہونے والی ہے نہ؟

آزاد: یہ باتیں آپ کو کیسے معلوم ہوئیں؟

حسینہ: کیوں کیا پتے کی کہی! اب بتا ہی دوں؟ حسن آرا میری چھوٹی چچازاد بہن ہے۔ کبھی کبھی خط آجاتا ہے۔ اس نے آپ کی تصویر بھیجی ہے اور لکھا ہے کہ انھیں بمبئی میں روک لینا۔ اب آپ ہمارے یہاں ٹھہریں۔ میں آپ کو آزماتی تھی کہ دیکھوں کتنے پانی میں ہیں۔ اب مجھے یقین ہوگیا کہ حسن آرا سے آپ کو سچی محبت ہے۔

آزاد: تو پھر میں یہیں اٹھ آؤں؟

حسینہ: ضرور۔

آزاد: شاید آپ کے گھر میں کسی کو ناگوار گزرے؟

حسینہ: واہ آپ خوب جانتے ہیں کہ کوئی شریف زادی کسی اجنبی آدمی کو اس طرح بے دھڑک اپنے یہاں نہ بلائے گی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ تمھارے بھائی صاحب کسی غیر آدمی کو بیٹھے دیکھیں گے تو ان کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگے گا؟ مگر وہ تو خود اس وقت تمھاری تلاش میں نکلے ہیں۔ بہت دیر سے گئے ہیں، آتے ہی ہوں گے۔ اب آپ میرے آدمی کو بھیج دیجیے۔ آپ کا اسباب لے آئے۔

آزاد نے خوجی کے نام یہ رقعہ لکھا:

خواجہ صاحب!

اسباب لے کر اس آدمی کے ساتھ چلے آیئے۔ یہاں اتفاق سے حسن آرا کی بہن مل گئیں۔ یار ہم تم دونوں ہیں قسمت کے دھنی، یہاں افیم کی دکان بھی قریب ہے۔

تمھارا، آزاد!

(35)

خوجی نے دل میں ٹھان لی کہ اب جو آئے گا اس کو خوب غور سے دیکھوں گا۔ اب کی چکمہ چل جائے تو ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔ دو دفعہ کیا جانیں، کیا بات ہوگئی کہ وہ چکمہ دے گیا۔ یہاں اڑتی چڑیا پکڑنے والے ہیں۔ ہم بھی اگر یہاں رہتے ہوتے تو اس مردود بہروپیے کی چچا ہی بنا کر چھوڑتے۔

اتنے میں سامنے یکا یک ایک گھسیارا گھاس کا گٹھا سر پر لادے پسینے میں تر آ کھڑا ہوا اور خوجی سے بولا، حضور، گھاس تو نہیں چاہیے؟

خوجی: (خوب غور سے دیکھ کر) چل اپنا کام کر۔ ہمیں گھاس واس کچھ نہیں چاہیے۔ گھاس کوئی اور کھاتے ہوں گے۔

گھسیارا: لیے لیجیے حضور ہری ہری دوب ہے۔

خوجی: چل بے چل ہم پہچان گئے ہم سے بہت چکمے بازی نہ کرنا بچہ۔ اب کی پلیتھن ہی نکال ڈالوں گا۔ تیرے بہروپیے کی دم میں رسّا۔

اتفاق سے گھسیارا بہرا تھا۔ وہ سمجھا بلاتے ہیں۔ ان کی طرف آنے لگا۔ تب تو میاں خوجی غصہ ضبط نہ کر سکے اور چلّا اٹھے او گیدی، بس آگے نہ بڑھنا نہیں تو سر دھڑ سے جدا

ہوگا۔ یہ کہہ کر لپکے اور گٹھا پکڑ کر چاہا کہ گھسیارے کو چپت لگاویں۔ اس نے جو چھڑانے کے لیے زور کیا تو میاں خوجی منہ کے بل زمین پر آرہے اور گٹھا ان کے اوپر گر پڑا۔ تب آپ گٹھے کے نیچے سے غرانے لگے۔ ابے او گیدی، اتنی کرولیاں بھونکوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔ بدمعاش نے ناکوں دم کر دیا۔ بارے بڑی مشکل سے آپ گٹھے کے نیچے سے نکلے اور منہ پھلائے بیٹھے تھے کہ آزاد کا آدمی آکر بولا۔ چلیے آپ کو میاں آزاد نے بلایا ہے۔

خوجی : کس سے کہتا ہے؟ کمبخت اب کی سندیسیا بن کر آیا! تب کی گھسیارا بنا تھا۔ پہلے عورت کا بھیس بدلا۔ پھر سپاہی بنا چل بھاگ!

آدمی : رقعہ تو پڑھ لیجیے۔

خوجی : میں جلتی بلتی لکڑی سے داغ دوں گا سمجھے؟ مجھے کوئی لونڈا مقرر کیا ہے؟ تیرے جیسے بہروپیے یہاں جیب میں پڑے رہتے ہیں۔

آدمی نے جاکر آزاد سے سارا حال کہا۔ حضور وہ تو کچھ جھلائے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے لاکھ لاکھ کہا کیا انھوں نے ایک تو سنی نہیں۔ بس، دور ہی دور سے غراتے رہے۔

آزاد : خط کا جواب لائے؟

آدمی : غریب پرور، کہتا جاتا ہوں کہ قریب پھٹکنے تو دیا نہیں جواب کس سے لاتا؟

یہ باتیں ہو ہی رہیں تھیں کہ اس حسینہ کے شوہر آپہنچے اور کہنے لگے۔ شہر بھر گھوم آیا سیکڑوں چکر لگائے مگر میاں آزاد کا کہیں پتہ نہ چلا۔ سرائے میں گیا تو وہاں خبر ملی کہ آئے ہیں۔ ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے، ان سے پوچھا تو بڑی دل لگی ہوئی۔ جیوں ہی میں قریب گیا تو وہ کلبلا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کون؟ آپ کون؟ میں نے کہا یہاں: میاں آزاد نامی کوئی صاحب تشریف لائے ہیں؟ بولے پھر آپ سے واسطہ؟ میں نے کہا: صاحب آپ تو کاٹے کھاتے ہیں۔ تو مجھے غور سے دیکھ کر بولے : اس بہروپیے نے تو میری ناک میں دم کردیا۔ آج بھلے مانس کی صورت بنا کر آئے ہیں۔

بیگم : ذری اوپر آؤ۔ دیکھو ہم نے میاں آزاد کو گھر بیٹھے بلوا لیا۔ نہ کہوگے۔

آزاد : آداب بجا لاتا ہوں۔

مرزا : حضرت آپ کو دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستی تھیں۔

آزاد : میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔

مرزا: جناب اس کا ذکر نہ کیجیے۔ آپ سے ملنے کی مدت سے تمنا تھی۔

ادھر میاں خوجی اپنے دل میں سوچے کہ بہروپیے کو کوئی ایسا چکمہ دینا چاہیے کہ وہ بھی عمر بھر یاد کرے۔ کئی گھنٹے تک اسی فکر میں غوطے کھاتے رہے۔ اتنے میں مرزا صاحب کا آدمی پھر آیا۔ خوجی نے اس سے خط لے کر پڑھا تو لکھا تھا۔ آپ اس آدمی کے ساتھ چلے آئیے ورنہ بہروپیا آپ کو پھر دھوکا دے گا۔ بھائی کہا مانو جلدی آؤ۔ خوجی نے آزاد کی لکھاوٹ پہچانی تو اسباب وغیرہ سمیٹ کر خدمت گار کے سپرد کیا اور کہا تو جا ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔ خدمت گار تو اسباب لے کر ادھر چلا ادھر آپ بہروپیے کے مکان کا پتا پوچھتے ہوئے جا پہنچے۔ اتفاق سے بہروپیا گھر میں نہ تھا، اور اس کی بیوی اپنے میکے بھیجنے کے لیے کپڑوں کا ایک پارسل بنا رہی تھی۔ تیس روپے کی ایک گڈی بھی اس میں رکھ دی تھی۔ پارسل تیار ہو چکا تو لونڈی سے بولی۔ دیکھ کوئی پڑھا لکھا آدمی ادھر سے نکلے تو اس پارسل پر پتا لکھوا لینا۔ لونڈی راہ دیکھ رہی تھی کہ میاں خوجی جا نکلے۔

خوجی: کیوں نیک بخت ذرا پانی پلا دوگی؟

لونڈی یہ سنتے ہی پھول گئی۔ خوجی کی بڑی خاطر داری کی، پان کھلایا، حقہ پلایا اور اندر سے پارسل لا کر بولی میاں اس پر پتہ تو لکھ دو۔

خوجی: اچھا لکھ دوں گا۔ کہاں جائے گا؟ کس کے نام ہے؟ کون بھیجتا ہے؟

لونڈی: میں بیوی سے سب حال پوچھ آؤں، تو بتلاؤں۔

خوجی: اچھی بات ہے جلد آنا۔

لونڈی دوڑ کر پوچھ آئی اور پتہ ٹھکانہ بتانے لگی۔

خوجی چکمہ دینے تو گئے ہی تھے، جھٹ پارسل پر اپنا لکھنؤ کا پتہ لکھ دیا اور اپنی راہ لی۔ لونڈی نے فوراً ڈاک خانے میں پارسل دیا اور رجسٹری کرا کے چلتی ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بہروپیا جو گھر میں گھسا تو بیوی نے کہا تم بھی بڑے بھلکو ہو۔ پارسل پر پتا لکھا ہی نہ تھا۔ ہم نے لکھوا کر بھیج دیا۔

بہروپیا: دیکھوں، رسید کہاں ہے؟ (رسید پڑھ کر) اف! مار ڈالا۔ بس غضب ہی ہو گیا۔

بیوی: خیر تو ہے۔

بہروپیا: تم سے کیا بتاؤں؟ یہ وہی مرد ہے جس سے میں نے کئی روپے اینٹھے تھے، بڑا

چکمہ دیا۔

(36)

میاں آزاد مرزا صاحب کے ساتھ جہاز کی فکر میں گئے۔ ادھر خوجی نے افیم کی چسکی لگائی اور پلنگ پر دراز ہوئے۔ زہین لونڈی جو باہر آئی تو حضرت کو پینک میں دیکھ کر خوب کھلکھلائی، اور بیگم سے جا کر بولی: بیوی ذری پردے کے پاس آیئے، تو لوٹ پوٹ جایئے۔ موا خوجی افیم کھائے اوندھے منہ پڑا ہوا ہے۔ ذری آیئے تو سہی۔ بیگم نے پردے کے پاس سے جھانکا تو ان کو ایک دل لگی سوجھی۔ جھپ سے ایک بتی بنائی اور زہین سے کہا کہ لے چپکے سے اس کی ناک میں بتی کر۔ زہین ایک ہی شریر، بس کی گانٹھ۔ وہ جا کر بتی میں تیتا مرچ لگا لائی اور خوجی کی کھٹیا کے نیچے گھس کر میاں خوجی کی ناک میں آدھی بتی داخل ہی تو کردی۔ اف! اس وقت مارے ہنسی کے لکھا نہیں جاتا۔ خوجی جو کلبلا کر اٹھے تو آچھی چھی چھی او گید۔ آں چھی! او گیدی کہنے کو تھی کہ چھینک آ گئی، اور بگڑے، او نا۔ آچھ۔ او نامعقول کہنے کو تھے کہ چھینک نے زبان بند کردی۔ اتفاق سے پڑوس میں ایک پرانے فیشن کے بھلے آدمی نوکری کی تلاش میں ایک حاکم کے پاس جانے والے تھے۔ وہ جیسے ہی سامنے آئے ویسے ہی خوجی نے چھینکا۔ بے چارے اندر چلے گئے۔ پان کھایا ذرا دیر ادھر ادھر ٹہلے۔ پھر ڈیوڑھی تک پہنچے کہ چھینک پڑی۔ پھر اندر گئے۔ چکنی ڈلی کھائی۔ روانہ ہونے ہی کو تھے کہ ادھر آں چھی کی آواز آئی اور ادھر بیوی نے لونڈی نے دوڑائی کہ چلیے اندر بلاتی ہیں۔ اندر جا کے انھوں نے جوتے بدلے پانی پیا اور رخصت ہوئے۔ باہر آکر اِکّے میں بیٹھے ہی تھے کہ خوجی نے ناک کی دنالی بندوق سے ایک اور فیر داغ دی۔ تب تو وہ بہت ہی جھلائے۔ ہت تیری ناک کاٹوں اور پاؤں تو کان بھی صاف کتر لوں۔ مردک نے مرچوں کی ناس لی ہے کیا؟ ناک کیا نک چھینکنی کی جھاڑی ہے۔ منحوس نے گھر سے نکلنا مشکل کردیا۔ بیوی اندر سے بولی کہ ناک ہی کٹے موئے کی۔ ذری زہین کو بلا کر پوچھو کہ یہ کس نکٹے کو بسایا ہے؟ اللہ کرے، گدھے کی سواری نصیب ہو۔

میاں بیوی پانی پی پی کر بیچارے کو کوس رہے تھے۔ ادھر خوجی کا چھینکتے چھینکتے حلیہ بگڑ رہا تھا۔ بیگم صاحبہ گھر کے اندر سے ہنسی کے مارے لوٹی پڑتی تھیں۔ مگر واہ ری زہین! وہ دم

ساڈھے اب تک چارپائی کے نیچے دبکی پڑی تھی۔ مگر مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ جب چھینکوں کا زور ذرا کم ہوا تو انھوں نے غل مچایا، او گیدی، بھلا وے بہروپیے، نکالی نہ کسر تونے۔ اچھا بچہ، چچا ہی بنا کر چھوڑوں تو سہی۔ چارپائی سے اٹھے، منہ ہاتھ دھویا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے خوب تریڑے دیے، کھوپڑی پر خوب پانی ڈالا، تب ذرا تسکین ہوئی۔ بیٹھ کر بہروپیے کو کوسنے لگے۔ خدا کرے، سانپ کاٹے مردود کو۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا ضد پڑ گئی ہے۔ کل تیرے چھپر پر چنگاری نہ رکھ دی، تو کہنا۔

یوں کوستے ہوئے انھوں نے سب دروازے بند کر لیے کہ بہروپیا پھر نہ آجائے۔ اب تو زبین چکرائی۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا اور قریب تھا کہ چیخ کر نکل بھاگے، مگر جب میاں خوجی چارپائی پر دراز ہوگئے اور ناک پر ہاتھ رکھ لیا، تو زبین کی جان میں جان آئی۔ چپکے سے کھسکتی ہوئی نکلی اور اندر بھاگی۔

بیگم : جاؤ پھر ناک میں بتی کرو۔

زبین : نا بی بی، اب میں نہیں جانے کی، سڑی سودائی آدمی کے منہ کون لگے۔

زبین کا دیور دس برس کا چھوکرا بڑا ہی شریر تھا۔ نس نس میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ کمرے میں جا کے جھانکا تو دیکھا حضرت پینک لے رہے ہیں۔ کتا گھر میں بندھا تھا۔ جھٹ اس کو زنجیر سے کھول زنجیر میں رسی باندھی اور باہر لے جا کر چارپائی کے پائے میں کتے کو باندھ دیا۔ خوجی کی ٹانگ میں بھی وہی رسی باندھ دی اور چمپت ہوگیا۔ کتے نے جو بھونکنا شروع کیا، تو خوجی چونک کر اٹھے۔ دیکھتے ہیں تو ٹانگ میں رسی اور رسی میں کتا۔ اب ادھر خوجی چلاتے ہیں، ادھر کتا چل پوں مچاتا ہے۔ زبین دوڑی گھر میں سے آئی۔ خیر تو ہے! کیا ہوا؟ ارے، تمھاری ٹانگ میں کتا کون باندھ گیا؟

خوجی : یہ اسی بہروپیے مردک کا کام ہے، کسی اور کو کیا پڑی تھی؟

زبین : مگر، موا آیا کدھر سے؟ کواڑے تو سب بند پڑے ہوئے ہیں۔

خوجی : یہی تو مجھے بھی حیرت ہے۔ مگر اب کی میں نے بھی ناک پر اس زور سے ہاتھ رکھا کہ بہروپیا بھی میرا لوہا مان گیا ہوگا۔ مگر یہ تو سوچو کہ آیا کس طرف سے؟

زبین : میاں، کہتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اس جگہ ایک شیطان رہتا ہے۔

خوجی : شیطان! اجی نہیں یہ اس بہروپیے ہی کا کام ہے۔

زہین : اب تم یوں تھوڑے ہی مانوگے۔ ایک دن شیطان چارپائی الٹ دے گا، تو معلوم ہوگا۔

خوجی : یہ بات تھی، تو اب تک ہم سے کیوں نہ کہا بھلا، جان لوگی کسی کی؟

زہین : میں بھی کہوں کہ بند دروازے سے کتا آیا کیسے؟ میرا ماتھا ٹھنکا تھا، مدا بولی نہیں۔

خوجی : اب آزاد آئیں تو ان کو آڑے ہاتھوں لوں۔ وہ بھوت چڑیل ایک کے بھی قائل نہیں۔ سوئیں تو معلوم ہو۔

خوجی تو اسی فکر میں بیٹھے بیٹھے پنک لینے لگے۔ آزاد اور مرزا صاحب آئے تو انھیں اونگھتے دیکھ کر دونوں ہنس پڑے۔

آزاد : (خوجی کے کان میں) کیا پہنچ گئے؟

خوجی نے ہانک لگائی : 'بہروپیا، بہروپیا' اور اس زور سے آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اپنے حساب چور کو گرفتار کیا تھا۔ آنکھیں تو حضرت کی بند ہیں، مگر بہروپیا بہروپیا غل مچاتے جاتے ہیں۔ میاں آزاد نے اس زور سے جھٹک دیا کہ ہاتھ چھوٹ گیا اور خوجی پھٹ سے منہ کے بل زمین پر آرہے۔ آزاد نے غل مچایا کہ بھاگا بھاگا، وہ بہروپیا بھاگا جاتا ہے۔ خوجی بھی 'لینا لینا' کہتے ہوئے لپکے۔ دس ہی پانچ قدم چل کر آپ ہانپ گئے اور بولے 'نکل گیا، نکل گیا'۔ میں نے تو گردن ناپی تھی مگر نالی بیچ میں آگئی، اس سے بچ گیا ورنہ پکڑ ہی لیتا۔

آزاد : اجی، میں تو دیکھ ہی رہا تھا کہ آپ بہروپیے کے کلے تک پہنچ گئے تھے۔

اتنے میں ایک قاضی صاحب میاں آزاد سے ملنے آئے۔ آزاد نے نام پوچھا، تو بولے عبداللہ قدوس۔

خوجی : کیا! استو قدوس! یہ نئی گڑھت کا نام ہے۔

آزاد : نہایت گستاخ آدمی ہو تم، بس چونچ سنبھالو۔

خوجی کی آنکھیں بند تھیں۔ جب آزاد نے ڈانٹ بتائی، تو آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ قاضی صاحب پر نظر پڑی۔ دیکھتے ہی آگ ہوگئے اور بکنے لگے۔ اور دیکھیے گا ذری مردود آج مولانا بن کر آیا ہے۔ بھئی، گرگٹ کے سے رنگ بدلتا ہے اس دن گھسیارا بنا تھا آج مولوی بن بیٹھا۔

قاضی صاحب بہت جھینپے۔ مگر آزاد نے کہا کہ جناب یہ دیوانہ ہے؟ یوں ہی اول جلول بکا کرتا ہے۔

جب قاضی صاحب چلے گئے تو آزاد نے خوجی کو خوب للکارا، نامعقول، بنا دیکھے بھالے بے سمجھے بوجھے جو چاہتا ہے بک دیتا ہے۔ کچھ پڑھے لکھے ہوتے تو آدمیوں کی قدر کرتے۔ لکھے نہ پڑھے، نام محمد فاضل۔

خوجی: جی ہاں، بس اب ایک آپ ہی تو بڑے لقمان بنے ہیں۔ ہم کو یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی گدھا ہے۔ اور یہاں عربی چاٹے بیٹھے ہیں۔ افعال، فالوا ما فالت اور سنیے، غلّم غلّما غلمو۔

مرزا: یہ کون صیغہ ہے بھائی؟

خوجی: جی یہ صیغہ الم غلّم ہے۔ یہاں دیوان زبان پر ہیں۔ مگر مفت کی شیخی جتانے سے کیا فائدہ۔

مرزا صاحب کے گھر کے سامنے ایک تالاب تھا۔ خوجی ابھی اپنے کمال کی ڈینگ مار ہی رہے تھے کہ شور مچا، ایک لڑکا ڈوب گیا۔ دوڑو دوڑو پیراک اپنے کرتب دکھانے لگے۔ کوئی پل پر سے کودا دھم۔ کوئی چبوترے سے آیا تڑ۔ کوئی ملاحی چیرتا ہے کوئی کھڑی لگا رہا ہے۔ نوسیکھیے اپنے کنارے ہی پر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، اور ڈرپوک آدمی تو دور ہی سے سیر دیکھ رہے ہیں۔ بھئی، پانی اور آگ سے زور نہیں چلتا، ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔

آزاد نے شور سنا تو دوڑے ہوئے پل پر آئے اور دھم سے کود پڑے۔ غوطہ لگاتے ہی اس لڑکے کا ہاتھ مل گیا۔ نکال کر کنارے لائے تو دیکھا جان باقی ہے۔ لوگوں نے مل کر اس کو الٹا لٹکایا۔ جب پانی نکل گیا تو لڑکے کو ہوش آیا۔

اب سنیے کہ وہ لڑکا بمبئی کے ایک پارسی رئیس رستم جی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ ابھی آزاد لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر ہی کر رہے تھے کہ کسی نے جاکر رستم جی کو یہ خبر سنائی۔ بیچارے دوڑے آئے اور آزاد کو گلے سے لگا لیا۔

رستم: آپ نے اپنے لڑکے کو ڈوبنے سے بچایا۔ ہم آپ کا بہت شکرگزار ہیں۔

آزاد: اگر آپس میں اتنی ہمدردی بھی نہ ہو تو آدمی ہی کیا؟

خوجی: سچ ہے، سچ ہے۔ ہم ایسے شیروں کے تم ایسے شیر ہی ہوتے ہیں۔ میں بھی اگر

یہاں ہوتا تو ضرور کود پڑتا۔ مگر یار اب دعا مانگنی پڑی کہ یہ موٹی توند والا بھی کسی دن غوطہ کھائے تو پھر یاروں کے گہرے ہیں۔

آزاد : (پارسی سے) میں بڑے موقع سے پہنچ گیا۔

رستم : اپنے کو بڑی خوشی کا بات چیت۔

خوجی : کچھ الو کا پٹھا معلوم ہوتا ہے۔

رستم : کال آپ آوے تو ہمارا لیڈی لوگ آپ کو گانا سناوے۔

خوجی : اجی، کیا بے وقت کی شہنائی بجاتے ہو؟ اجی کچھ افیم گھولو، چسکی لگاؤ، مٹھائی منگواؤ، رئیس کی دم بنے ہیں۔

رئیس : آپ تو اپنا کا باپ ہے۔

آزاد : کل میں ضرور آؤں گا۔

خوجی : بلی دادا! خوب پہچانا، واہ پٹھے!

رستم جی آزاد سے یہ وعدہ لے کر چلے گئے، تو خوجی اورآزاد بھی گھر آئے۔ شام کو رستم جی نے پانچ ہزار روپیوں کی ایک تھیلی آزاد کے پاس بھیجی اور خط میں لکھا کہ آپ اسے ضرور قبول کریں۔ مگر آزاد نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دیا۔

(37)

ذرا خواجہ صاحب کی قطع دیکھیے، واللہ اس وقت فوٹو اتارنے کے قابل ہیں۔ نہ ہوا فوٹو، صبح کا وقت ہے۔ آپ کھاروے کی ایک لنگی باندھے پیپل کے درخت کے سائے میں کھٹیا بچھائے اونگھ رہے ہیں، مگر گڑگڑی بھی ایک ہاتھ میں تھامے ہیں۔ چاہے پیئیں نہ، مگر چلم پر کوئلے دہکتے رہیں۔ اتفاق سے ایک چیل نے درخت پر سے بیٹ کر دی۔ تب آپ چونکے اور چونکتے ہی آہی گئے۔ بہت اچھلے کودے اور اتنا غل مچایا کہ محلّہ بھر سر پر اٹھا لیا۔ ہت تیرے گیدی کی، ہمیں بھی کوئی وہ سمجھ لیا ہے۔ آج چیل بن کر آیا ہے۔ کرولی تو وہاں تک پہنچے گی نہیں، توڑے دار بندوق ہوتی تو وہ تاک کے نشانہ لگاتا کہ یاد ہی کرتا۔

آزاد : یہ کس پر گرم ہو رہے ہو خواجہ صاحب؟

خوجی : اور اوپر سے پوچھتے ہو کس پر گرم ہو رہے ہو؟ گرم کس پر ہوں گے۔ وہی

بہرور پیا ہے جو مولوی بن کر آیا تھا۔

مرزا : تو پھر اب اسے کچھ سزا دیجیے۔

خوجی :سزا کیا خاک دوں! میں زمین پر، وہ آسمان پر۔ کہتا تو ہوں کہ توڑے دار بندوق منگوا دیجیے، تو پھر دیکھیے کیسا نشانہ لگاتا ہوں۔ مگر آپ کو کیا پڑی ہے۔ جائے گا تو غریب خواجہ کے ماتھے ہی۔

مرزا : ہم بتائیں، ایک زینہ منگوادیں اور آپ پیڑ پر چڑھ جائیں، بھاگ کر جائے گا کہاں؟

خوجی : (اچھل کر) لانا ہاتھ۔

مرزا صاحب نے آدمی سے کہا کہ بڑا زینہ اندر سے لے آؤ، مگر جلد لانا، ایسا نہ ہو کہ بیٹھ رہو۔

خوجی : ہاں میاں، اسی سال آنا میرے یار دیکھو ایسا نہ ہو کہ گیدی بھاگ نکلے۔

آدمی : جب اندر سیڑھی لینے گیا تو بیگم نے پوچھا، سیڑھی کیا ہوگی؟

آدمی : حضور، وہی جو سڑی ہیں خفقان، ان پر کہیں چیل نے بیٹ کر دی، سواب سیڑھی لگا کر پیڑ پر چڑھیں گے۔

ہنسوڑ عورت، خوب ہی کھلکھلائی اور فوراً چھت پر جا پہنچی۔ آپی دوپٹہ کھسکا جاتا ہے، جوڑا کھلا پڑتا ہے اور زیبن کو للکار رہی ہیں کہ اس سے کہو جلد سیڑھی لے جائے۔ میاں خوجی نے سیڑھی دیکھی تو کمر کسی اور کانپتے ہوئے زینے پر چڑھنے لگے۔ اب آخری زینے پر پہنچ کر درخت کی ٹہنی پر بیٹھے تو چیل کی طرف منھ کر کے بولے گانس لیا گانس لیا، پھانس لیا، پھانس لیا، ہت تیرے گیدی کی، اب جاتا کہاں ہے؟ لے اب میں بھی کلے پر آپہنچا۔ بچہ آج ہی تو پھنسے ہو۔ روز جھانسے دے کر اڑنچھو ہوجایا کرتے تھے۔ اب سوچو تو جاؤ گے کدھر سے؟ لے آیئے بس، اب چوٹ کے سامنے۔ میں نے بھی کرولی تیز کر رکھی ہے۔

اتنے میں پیچھے پھر کر دیکھتے ہیں تو زینہ غائب۔ لگے سر پیٹنے۔ ادھر چیل بھی پھر سے اڑ گئی۔ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ بیگم صاحبہ نے جو یہ کیفیت دیکھی تو تالیاں بجابجا کر ہنسنے لگیں۔

خوجی : یہ مرزا صاحب کہاں گئے۔ ذری چار آنکھیں تو کیجیے ہم سے۔ آخر ہم کو آسمان

پر چڑھا کر غائب کہاں ہوگئے؟ ارے یارو، کوئی سانس ڈکار ہی نہیں لیتا۔ ارے میاں آزاد، مرزا صاحب! کوئی ہے یا سب مر گئے؟ آخر ہم کب تک یہاں ٹنگے رہیں گے۔

بیگم : اللہ کرے پینک آئے۔

خوجی : یہ کون بولا؟ (بیگم کو دیکھ کر) واہ حضور، آپ کو تو ایسی دعا نہ دینی چاہیے۔

میاں آزاد سوچے کہ خوجی افیمی آدمی ایسا نہ ہو، پاؤں ڈگمگا جائیں تو مفت کا خون ہماری گردن پر ہو۔ آدمی سے کہا۔ زینہ لگا دو، بیگم نے جو سنا تو ہزاروں قسمیں دیں، خبردار سیڑھی نہ لگانا۔ وارے سیڑھی لگا دی گئی اور خوجی نیچے اترے۔ اب سب سے ناراض ہیں۔ سب کو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے کیا مجھے مسخرہ سمجھ لیا ہے! آپ لوگوں جیسے میرے لڑکے ہوں گے۔

مرزا : بندگی۔ کہاں رہے سلارو، آج تو بہت دن کے بعد دکھائی دیے۔

سلارو : کچھ نہ پوچھیے خداوند، بڑی مصیبت میں پھنسا ہوں۔

مرزا : کیا ہے کیا ہے؟ کچھ بتاؤ تو؟

سلارو : کیا بتاوں کہتے شرم آتی ہے۔ پرسوں میرا داماد میری لڑکی کو لیے گاؤں جارہا تھا۔ جب تھانے کے قریب پہنچا تو تھانیدار صاحب گھوڑے پر سوار ہوکر کہیں جارہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی باگ روک لی اور میرے داماد سے پوچھا تم کون ہو؟ اس نے اپنا نام بتایا۔ اب تھانیدار صاحب اس فکر میں ہوئے کہ میری لڑکی کو بہلاکر رکھ لیں اور داماد کو دھتا بتا دیں۔ بولے بدمعاش، یہ تیری بیوی نہیں ہوسکتی۔ سچ بتا یہ کون ہے؟ اور تو اسے کہاں سے بھگا لایا ہے؟

داماد : یہ میری جورو ہے۔

تھانیدار : سور، ہم تیرا چالان کردیں گے۔ تیری ایسی قسمت کہاں کہ یہ حسینہ تجھ کو ملے۔ اگر تو ہماری نوکری کرلے تو اچھا، نہیں تو ہم چالان کرتے ہیں (عورت سے) تم کون ہو، بولو؟

داماد : داروغہ جی، آپ مجھ سے باتیں کیجیے، اس سے نہ بولیے۔

میری لڑکی مارے شرم کے گڑے جاتی تھی۔ گردن جھکاکر تھر تھر کانپتی تھی۔ اپنے دل میں سوچتی تھی کہ اگر زمین میں گڈھا ہوجاتا تو میں دھنس جاتی۔ سپاہی الگ للکار رہا ہے اور تھانیدار الگ کلّے پر سوار۔

داماد : میرے ساتھ کسی سپاہی کو بھیج دیجیے۔ معلوم ہوجائے کہ یہ میری بیاہتا بیوی ہے یا نہیں۔

تھانیدار : چپ، بدمعاش، میں بدمعاشوں کی آنکھ پہچان جاتا ہوں۔ تم کہاں کے ایسے خوش نصیب ہو کہ ایسی پری تمھارے ہاتھ آئی۔ یہ سب بناوٹ کی باتیں ہیں۔

سپاہی : ہاں، داروغہ جی، یہی بات ہے۔

آخر تھانیدار صاحب میری لڑکی کو ایک درخت کی آڑ میں لے گئے اور سپاہی نے میرے داماد کو دوسری طرف لے جاکے کھڑا کیا۔ تھانیدار بولا بیوی ذرا گردن تو اٹھاؤ، بھلا تم اس پر کٹنے کے قابل ہو! خدا نے چہرہ تو نور سا دیا ہے لیکن شوہر لنگور سا۔

لڑکی : مجھے وہ لنگور ہی پسند ہے۔

ادھر تو تھانیدار صاحب یہ اظہار لے رہے تھے، ادھر سپاہی میرے داماد کو اور ہی پٹی پڑھا رہا تھا۔ بھائی سنو صوبیدار صاحب کے سامنے تو میں ان کی سی کہہ رہا تھا۔ نہ کہوں تو جاؤں کہاں؟ مگر ان کی نیت بہت خراب ہے۔ چھٹا ہوا گرگا ہے۔

داماد : اور کچھ نہیں، میں سمجھ گیا کہ پھانسی ضرور پاؤں گا۔ اب تو مجھے چاہے جانے یا نہ جانے دے، میں اسے بے مارے نہ رہوں گا۔ اب بے عزتی میں باقی کیا رہ گیا۔

تھانیدار : سپاہی، سپاہی، یہ کہتی ہیں کہ یہ آدمی انھیں بھگا لایا ہے۔

لڑکی : جس نے یہ کہا ہو اس پر آسمان پھٹ پڑے۔

داماد : اب آپ کی مرضی کیا ہے؟ جو ہو صاف صاف کہیے۔

خیر، تھانیدار صاحب ایک کرسی پر ڈٹ گئے اور میری لڑکی سے کہا کہ تم اس سامنے والی کرسی پر بیٹھو، اب خیال کیجیے کہ گرہستھ عورت بنا گھونگھٹ نکالے کوئیں تک پانی بھرنے بھی نہیں جاتی، وہ اتنے آدمیوں کے سامنے کرسی پر کیسے بیٹھتی۔ سپاہی جھک جھک کر دیکھ رہے تھے اور وہ بیچاری گردن جھکائے بت کی طرح کھڑی تھی۔ تب تھانیدار نے دھمکا کر کہا تم دس برس کے لیے بھیج جاؤ گے۔ پورے دس برس کے لیے!

داماد : جب کوئی جرم ثابت ہوجائے۔

تھانیدار : ہاں، آپ قانون بھی جانتے ہیں؟ تو ہم اب ضابطے کی کارروائی کریں۔

داماد : یہ کل کارروائی ضابطے ہی کی تو ہے۔ خیر، اس وقت تو آپ کے بس میں ہوں جو

چاہے کیجیے۔ مگر میرا خدا سب دیکھ رہا ہے۔

تھانیدار: تم ہمارا کہا کیوں نہیں مان لیتے؟ ہم بس اتنا چاہتے ہیں کہ تم نوکری کرلو اور اپنی جورو کو لے کر یہیں رہا کرو۔

داماد: آپ سے میں اب بھی منت سے کہتا ہوں کہ اس بات کو دل سے نکال ڈالیے۔ نہیں تو بات بڑھ جائے گی۔

اتنے میں کسی نے پیچھے سے آکر میرے داماد کی مشکیں کس لیں اور لے چلے، اور ایک سپاہی میری لڑکی کو تھانیدار صاحب کے گھر کی طرف لے چلا۔ اب رات کا وقت ہے۔ ایک کمرے میں تھانیدار لڑکی کے پیروں پر گر پڑا۔ اس نے ایک ٹھوکر دی اور جھپٹ کر اس تیزی سے بھاگی کہ تھانیدار کے ہوش اڑ گئے۔ اب غور کیجیے کہ کم سن عورت، پردیس کا واسطہ، اندھیری رات، راستہ گم، میاں ندارد۔ سوچی یا خدا کہاں جاؤں اور کیا کروں؟ کبھی میاں کی مصیبت پر روتی، کبھی اپنی حالت پر۔ اس طرح گرتی پڑتی چلی جاتی تھی کہ ایک تلنگے سے بھینٹ ہوگئی۔ بولا کون جاتا ہے؟ کون جاتا ہے چھپا ہوا؟ لڑکی تھر تھر کانپنے لگی۔ ڈرتے ڈرتے بولی غریب عورت ہوں، راستہ بھول کر ادھر نکل آئی۔ آخر بڑی مشکل سے کانوں کا کرن پھول دے کر اپنا گلا چھڑایا۔ آگے بڑھی تو اس کا شوہر مل گیا سپاہیوں نے اسے ایک مکان میں بندکردیا تھا، مگر وہ دیوار پھاندکر نکل بھاگا آرہا تھا۔ دونوں نے خدا کا شکر کیا اور ایک سرائے میں رات کاٹی۔ صبح کو میرے داماد نے تھانیدار کو گھوڑے پر سے کھینچ کر اتنی لکڑیاں ماریں کہ بے دم ہوگیا۔ گاؤں والے تو تھانیدار کے دشمن تھے ہی، ایک نے بھی نہ بچایا بلکہ جب دیکھا کہ ادھ مرا ہوگیا تو دو چار نے لاتیں بھی جمائیں۔ اب میرا داماد میرے گھر میں چھپا بیٹھا ہے۔ بتلائیے کیا کروں؟

خوجی: مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اسی بہروپیے کی شرارت تھی۔

سلارو: کون بہروپیا؟

مرزا: تمھاری سمجھ میں نہ آئے گا۔ یہ قصہ طلب بات ہے۔

سلارو: تو پھر مجھے حکم کیا ہوتا ہے؟ ہم تو غریب ٹکے کے آدمی ہیں مگر آبرودار ہیں۔

آزاد: بس جاکر چین کرو۔ جب شورغل مچے تو آنا۔ صلاح کی جائے گی۔

سلارو نے سلام کیا اور چلا گیا۔

(38)

خوجی نے ایک دن کہا : ارے یارو، یہاں اندھیر ہے۔ تم روم چلتے چلتے بڈھے ہوجاؤ گے۔ سیپچیں سنیں، دعوتیں چکھیں، اب بقچہ سنبھالو اور چلو۔ اب چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہوجائے ہم ایک نہ مانیں گے۔ چلیے، اٹھیے، کوچ بولیے۔

آزاد : مرزا صاحب، اتنے دنوں میں خوجی نے تو ایک یہی تو بات پکی کہی۔ اب جہاز کا جلد انتظام کیجیے۔

خوجی : پہلے یہ بتائیے کتنے دنوں کا سفر ہے؟

آزاد : اسے کیا واسطہ؟ ہم کبھی جہاز پر سوار ہوئے ہوں تو بتائیں۔

خوجی : جہاز! ہائے غضب! کیا تری تری جانا ہوگا؟ میری تو روح کانپنے لگی۔ بھیا، میں نہیں جانے کا۔

آزاد : اجی چلو بھی، وہیں ترکی عورت کے ساتھ تمھارا بیاہ کردیں گے۔

خوجی : خشکی خشکی چلو تو بھائی، میں چلوں گا۔ سمندر میں جاتے پاؤں ڈگمگاتا ہے۔

مرزا : جناب، آپ کو شرم نہیں آتی؟ اتنی دور تک ساتھ آئے اب ساتھ چھوڑ دیتے ہو؟ ڈوب مرنے کی بات ہے۔

خوجی : کیا خوب! یوں بھی ڈوبوں اور ووں بھی ڈوبوں؟ خشکی ہی خشکی کیوں نہیں چلتے؟

مرزا : آپ بھی واللہ نرے چونچ ہی رہے۔ خشکی کی راہ سے کتنے دنوں میں پہنچو گے بھلا؟ خشکی کی ایک ہی کہی؟

خوجی : اب آپ سے حجت کون کرے۔ جہاز کا کون اعتبار۔ ذرا کسی سوراخ کی راہ سے پانی آیا، اور بس، پہنچے جہنم سیدھے۔

آزاد : تو نہ چلوگے؟ صاف صاف بتا دو، ابھی سویرا ہے۔

خوجی : چلیں تو بیچ کھیت، مگر پانی کا نام سنا اور کلیجہ دہل اٹھا۔ بھلا کیوں صاحب یہ تو بتائیے کہ سمندر کا پاٹ گنگا کے پاٹ سے کوئی دونا ہوگا یا کچھ کم بیش؟

مرزا : جی، بس اور کیا۔ چلیے آپ کو سمندر دکھلا دیں نہ، تھوڑے ہی فاصلے پر ہے۔

خوجی : کیوں نہیں، ہم کو لے چلیے اور چھپ چپر گٹو کر کے جہاز پر بٹھا دیجیے۔ ایک شرط

سے چلتے ہیں۔ بیگم صاحبہ ضمانت کریں۔ ہمارے سر کی قسم کھائیں کہ زبردستی نہ کریں گے۔

آزاد : اس میں کیا دقت ہے۔ چلیے، ہم بیگم صاحبہ سے کہلائے دیتے ہیں۔ آپ اور آپ کے باپ دونوں کے سر کی قسم کھالیں تو سہی۔

مرزا : ہاں ہاں، وہ ضمانت کر دیں گی۔ آیئے اٹھیے۔

میاں آزاد اور مرزا دونوں مل کر گئے اور بیگم سے کہا اس سٹری سے اتنا کہہ دینا کہ تو جہاز دیکھنے جا۔ یہ لوگ زبردستی سوار نہ کریں گے۔ بیگم صاحبہ نے جو ساری داستان سنی تو تنک کر بولیں ہم نہ کہیں گے۔ آپ لوگوں نے ذرا سی بات نہ مانی اور سٹری ہٹا لی۔ اچھا، خیر پردے کے پاس بلا لو۔

خوجی نے پردے کے پاس آکر سلام کیا، مگر جواب کون دے۔ بیگم صاحبہ تو مارے ہنسی کے لوٹی جاتی ہیں۔ میاں آزاد کے خیال سے اپنی چلبلاہٹ پر لجاتی بھی ہیں شرم اور ہنسی، دونوں نے مل کر رخساروں کو اور بھی سرخ کر دیا۔ اتنے میں خوجی نے پھر ہانک لگائی کہ حضور نے غلام کو کیوں یاد فرمایا ہے؟

مرزا : کہتی ہیں کہ ہم ضمانت کیے لیتے ہیں۔

خوجی : آپ رہنے دیجیے، انھیں کو کہنے دیجیے۔

بیگم : خواجہ صاحب بندگی، آپ کیا پوچھتے ہیں؟

خوجی : یہ لوگ مجھے جہاز دکھانے لیے جاتے ہیں۔ جاؤں یا نہ جاؤں؟ جو حکم ہو وہ کروں۔

بیگم : کبھی بھول کے نہ جانا نہیں تو پھر کے نہ آؤ گے۔

خوجی : آپ ان کی ضمانت کرتی ہیں۔

بیگم : میں کسی کی ضامن وامن نہیں ہوتی۔ 'ذرا دیکھیے ضامن نہ ہوجیے' یہ ڈوبو ہی دیں گے۔ موئی کرولی رکھی ہی رہے گی۔

خوجی : چلیے بس حد ہوگئی، اب ہم نہیں جانے کے۔

آزاد : بھئی، تم ذرا ساتھ چل کر سیر تو دیکھ آؤ۔

خوجی : واہ! اچھی سیر ہے۔ کسی کی جان جائے آپ کے نزدیک سیر ہے۔ اب جانے والے پر تین حرف۔

خیر، سمجھا بجھا کر دونوں آدمی خوجی کو لے چلے۔ جب سمندر کے کنارے پہنچے تو خوجی اسے دیکھتے ہی کئی قدم پیچھے ہٹے اور چیخ پڑے۔ پھر دس پانچ قدم پیچھے کھسکے اور رونے لگے۔ یا خدا بچائیے! لہریں دیکھتے ہی کسی نے کلیجے کو مسوس لیا۔

مرزا: کیا لطف ہے! خدا کی قسم، جی چاہتا ہے پھاند ہی پڑوں۔

خوجی: کہیں بھول سے پھاندنے وادنے کا ارادہ نہ کرنا۔ حیادار کے لیے ایک چلو کافی ہے۔

آزاد: عجب مسخرہ ہے بھائی! ایک آنکھ سے روتا ہے، ایک آنکھ سے ہنستا ہے۔

اتنے میں دو چار ملاح سامنے آئے۔ خوجی نے جو انھیں غور سے دیکھا تو مرزا صاحب سے بولے۔ یہ کون ہیں بھائی؟ ان کی تو کچھ وضع ہی نرالی ہے۔ بھلا یہ ہماری بولی سمجھ لیں گے؟

مرزا: ہاں ہاں خوب! اردو خوب سمجھتے ہیں۔

خوجی: (ایک ملاح سے) کیوں بھئی مانجھی جہاز پر کوئی جگہ ایسی بھی ہے جہاں سے سمندر نظر ہی نہ آئے اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں؟ سچ بتانا استاد! اجی ہم پانی سے بہت ڈرتے ہیں بھائی۔

مانجھی: ہم آپ کو ایسی جگہ بیٹھا دیں گے جہاں پانی کیا، آسمان تو سوجھ ہی نہ پڑے۔

خوجی: ارے تیرے قربان۔ ایک بات اور بتا دو۔ گنے ملتے جائیں گے راہ میں یا ان کا اکال ہے۔

مانجھی: گنے وہاں کہاں؟ کیا کچھ منڈی ہے؟ اپنے ساتھ چاہے جتنے لے چلیے۔

خوجی: ہائے، گنڈیریاں تازی تازی کھانے میں نہ آئیں گی۔ بھلا حلوائی کی دوکان تو ہوگی؟ آخر یہ اتنے شوقین انچی جو جاتے ہیں تو کھاتے کیا ہیں؟

مانجھی: اجی جو چاہو ساتھ رکھ لو۔

خوجی: اور جو منھ ہاتھ دھونے کو پانی کی ضرورت ہو تو کہاں سے آوے؟

آزاد: پاگل ہے پورا! اتنا نہیں سمجھتا کہ سمندر میں جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ پانی کہاں سے آئے گا۔

خوجی: تو آپ کیوں الجھ پڑے؟ آپ سے پوچھتا کون ہے؟ کیوں یار مانجھی، بھلا ہم

گنے یاں سے باندھ لے چلیں اور جہاز پر چوسیں، مگر چھلکے پھینکیں گے کہاں۔ آخر ہم دن بھر میں چار چھ پونڈے کھایا ہی چاہیں۔

آزاد : یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، گنوں کے چھلکے کھانے پڑیں گے۔

خوجی : آپ سے کون بولتا ہے؟ کیوں بھئی، جو کرولی باندھیں تو ہرج تو نہیں ہے کچھ؟

مانجھی :لیسن لے لیجیے گا، اور کیا ہرج ہے؟

خوجی : دیکھیے ایک بات معلوم ہوئی نہ! اچھا، یہ بتاؤ کہ بہروپیا تو جہاز پر نہیں چڑھنے پاتے؟

مانجھی : چاہے جو سوار ہو، دام دے سوار ہو لے۔

خوجی : یہ تو تم نے بے ڈھب سنائی۔ جہاز پر کمھار تو نہیں ہوتے؟

مانجھی آج تلک کوئی کمہار نہیں گیا۔

خوجی : اے میں تیری زبان کے قربان۔ بڑی ڈھارس ہوئی۔ خیر کمہار سے تو بچے۔ باقی رہا بہروپیا، اس گیدی کو سمجھ لوں گا۔ اتنی کرولیاں بھونکوں کہ یاد ہی کرے۔ ہاں بس ایک اور بات بھی بتا دینا۔ یہ قید تو نہیں ہے کہ آدمی صبح شام ضرور نہائے؟

مانجھی : معلوم دیتا ہے افیم بہت کھاتے ہو؟

خوجی : ہاں، خوب پہچان گئے۔ یہ کیوں کر بوجھ گئے بھائی؟ شوق ہو تو نکالوں؟

مانجھی : رام رام! ہم افیم چھوتے تک نہیں۔

خوجی : او گیدی! ٹکے کا آدمی اور جھک مارتا ہے۔ نکالوں کرولی؟

مرزا : ہاں ہاں خواجہ صاحب، دیکھیے ذرا کرولی میان ہی میں رہے۔

خوجی : خیر، آپ لوگوں کی خاطر ہے۔ ورنہ ادھیڑ کر دھر دیتا پاجی کو۔ آپ لوگ بیچ میں نہ پڑیں تو بھرکس ہی نکال دیا ہوتا۔

اتنے میں گھوڑے پر سوار ایک انگریز آکر آزاد سے بولا۔ اس درخت کا کیا نام ہے؟

آزاد : اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں۔ ہم لوگ ذرا ان باتوں کی طرف کم دھیان دیتے ہیں۔

انگریز : ہم اپنے ملک کی سب گھاس پھوس پہچانتا ہے۔

خوجی : ولایت کا ایک گھسیارا معلوم ہوتا ہے۔

انگریز: چڑیا کا علم جانتا ہے آپ؟

آزاد: جی نہیں یہ علم یہاں نہیں سکھایا جاتا۔

انگریز: چڑیا کا علم ہم خوب جانتا ہے۔

خوجی: چڑی مار ہے لندن کا۔ بس قلعی کھل گئی۔

انگریز گھوڑا بڑھا کر نکل گیا۔ ادھر آزاد اور مرزا صاحب کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ گئے۔

(39)

شام کے وقت مرزا صاحب کی بیگم پردے کے پاس آ کر کہا— آج اس وقت کچھ چھل پہل نہیں ہے، کیا خوجی اس دنیا سے سدھار گئے؟

مرزا: دیکھو خوجی، بیگم صاحبہ کیا کہہ رہی ہیں؟

خوجی: کوئی افیم تو پلوایا نہیں، چھل پہل کہاں سے؟ لطیفے سناؤں تو افیم پلوائیے گا؟

بیگم: ہاں، ہاں، کہو تو! مرو بھی، تو پوستے ہی کے کھیت میں دفنائے جاؤ۔ کافور کی جگہ افیم ہو، تو سہی۔

خوجی: ایک خوش نویس تھے۔ ان کے قلم سے ایسے حروف نکلتے تھے جیسے سانچے کے ڈھلے ہوئے۔ مگر ان حضرت میں ایک سخت عیب یہ تھا کہ غلط نہ لکھتے تھے۔

آزاد: کچھ جانگلو ہو گیا؟

خوجی: خدا ان لوگوں سے بچائے۔ بھئی میرے تو ناکوں دم ہو گیا۔ بات پوری سنی نہیں اور اعتراض کرنے کو موجود۔ بات کاٹنے پر ادھار کھائے ہوئے ہو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ غلط نہ لکھتے تھے مگر عیب یہ تھا کہ اپنی طرف سے کچھ ملا دیتے تھے۔ ایک دفعہ ایک آدمی کو قرآن لکھانے کی ضرورت ہوئی۔ سوچے کہ ان سے بڑھ کوئی خوش نویس نہیں اگر دس پانچ روپے زیادہ بھی خرچ ہوں تو بلا سے، لکھوائیں گے انھیں سے۔

بیگم: اے واہ ری عقل! کوئی آپ ہی کے سے جانگلو ہوں گے۔ گلی گلی تو چھاپے خانے ہیں۔ کوئی چھپا ہوا قرآن کیوں نہ مول لے لیا؟

خوجی: حضور، وہ سیدھے سادے مسلمان تھے۔ منطق (نیائے) نہیں پڑھے تھے۔ خیر

صاحب خوش نویس کے پاس پہنچے اور کہا حضرت جو اجرت مانگیے دوں گا مگر عرض یہ ہے کہ کہیے کہوں کہیے نہ کہوں۔ خوش نویس نے کہا— ضرور کہیے خدا کی قسم ایسا لکھوں کہ جو دیکھے پھڑک جائے— وہ بولے— حضرت یہ تو صحیح ہے لیکن اپنی طرف سے کچھ نہ بڑھا دیجیے گا۔ خوش نویس نے کہا— کیا مجال! آپ اطمینان رکھیے ایسا نہ ہونے پاوے گا۔ خیر وہ حضرت تو گھر گئے ادھر میاں خوش نویس لکھنے بیٹھے۔ جب ختم کر چکے تو کتاب لے کر چلے۔ لیجیے حضور قرآن موجود ہے۔ انھوں نے پوچھا— ایک بات صاف فرما دیجیے۔ کہیں اپنی طرف سے تو کچھ نہیں ملا دیا— خوش نویس نے کہا— جناب بدلتے یا بڑھاتے ہوئے ہاتھ کانپتے تھے۔ مگر اس میں جگہ جگہ شیطان کا نام تھا۔ میں نے سوچا خدا کے کلام میں شیطان کا کیا ذکر؟ اس لیے کہیں آپ کے باپ کا نام لکھ دیا کہیں اپنے باپ کا۔

بیگم : بس یہی لطیفہ ہے؟ یہ تو سن چکی ہوں۔

خوجی : اس دھاندلی کی سند نہیں۔ جب افیم پلانے کا وقت آیا تو دھاندلی کرنے لگیں؟

مرزا صاحب بولے : اجی یہ پلواویں یا نہ پلواویں میں پلوائے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے ایک تھالی میں تھوڑا سا کتھا گھول کر خوجی کو پلا دیا۔ خوجی کو دن کو تو اونٹ سوجھتا نہ تھا رات کو کتھے اور افیم کے رنگ میں کیا تمیز کرتے۔ پورا پیالہ چڑھا لیا اور افیم پینے کے خیال سے پینک لینے لگے۔ مگر جب رات زیادہ ہوئی تو آپ کو انگڑائیاں آنے لگیں، جمائیوں کی ڈاک بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے پانی جاری ہوگیا۔ ڈبیا جیب سے نکالی کہ شاید کچھ کھرچن ارچن پڑی پڑائی ہو، تو اس دم جی جائیں۔ مگر دیکھا تو سفاچٹ، بس سن سے جان نکل گئی۔ آدھی رات کا وقت، اب افیم آئے تو کہاں سے؟ سوچے بھئی چاہے ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے افیم کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ہی لاویں گے۔ دن سے چل ہی تو کھڑے ہوئے۔ گلی میں سپاہی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔

سپاہی : کون؟

خوجی : ہم ہیں خواجہ صاحب!

سپاہی : کس دفتر میں کام کرتے ہو؟

خوجی : پولس کے دفتر میں۔ مانک جی بھائی جی کی جگہ پر آج سے کام کرتے ہیں۔ یار اس وقت کہیں سے ذرا سی افیم لاؤ، تو بڑا احسان ہو۔ آخر استاد پالا ہمیں سے پڑے گا۔

تمھارے ہی دفتر میں ہیں۔

سپاہی : ہاں ہاں لیجیے اسی دم میں تو خود افیم کھاتا ہوں۔ افیم تو لو یہ ہے مگر اس وقت گھولیے گا کاہے میں؟

خوجی : واہ سپاہی ہو کہ باتیں؟ گھر کی حکومت ہے! سرکاری سپاہی کو سبھی مانتے ہیں۔

سپاہی : اچھا، چلو پلا دیں۔

خوجی : واہ صوبیدار صاحب! بڑے برے وقت کام آئے۔ ہم آپ جانیے اپنچی آدمی شام کو افیم کھانا بھول گئے، آدھی رات کو یاد آیا، ڈبیا کھولی تو سناٹا لے کہیں سے پانی اور پیالی دلواؤ، تو جی اٹھیں۔

خیر، سپاہی نے خوجی کو خوب افیم پلوائی۔ یہاں تک کہ گھر کو لوٹے تو راستہ بھول گئے۔ ایک بھلے مانس کے دروازے پر پہنچے تو پینک میں سوجھی کہ یہی مرزا صاحب کا مکان ہے۔ لگے زنجیر کھٹکھٹانے کھولو کھولو، بھئی اب تو کھڑا نہیں رہا جاتا۔ دروازہ کھول دینا۔

خواجہ صاحب تو باہر کھڑے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہیں اور اندر سے اس مکان میں میاں کا دم نکلا جاتا ہے۔ کوئی ایک اوپر دس برس کا سن، کھیل کود کے دن، خوجی کے بھی چچا، دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، قدم تین کم سوا دو انچ کا۔ سوا ہڈی اور چمڑے کے گوشت کا کہیں نام نہیں۔ اور ان کی بیوی خاصی دیونی، ہٹی کٹی مسنڈی، بڑے ڈیل ڈول کی عورت، اٹھتی جوانی، مگر ایک آنکھ کی کانی۔ ایک گھونسا تان کے لگاوے تو شیدی لندھور کا بھرکس نکل جائے۔ کوئی دو تین کم بیس برس کی عمر۔ دونوں میٹھی نیند میں سو رہے تھے کہ خوجی نے دھم دھمانا شروع کیا۔

میاں : یا خدا بچائیے۔ اس اندھیری رات میں کون آیا؟ مارے ڈر کے روح کانپتی ہے، مگر جو بیوی کو جگاؤں اور مردانے کپڑے پہنا کر لے جاؤں تو یہ حضرت بھی کانپنے لگے۔

خوجی : کھولو، میٹھی نیند سونے والو کھولو، یہاں جاتے دیر نہیں ہوی اور کواڑ جھپ سے بند کر لیے؟ کھٹیا ونیا سب غائب کر دی؟

میاں : بیگم، بیگم، کیا سو گئیں؟

وہاں سنتا کون ہے جوانی کی نیند ہے کہ دل لگی۔ کوئی چارپائی بھی الٹ دے تو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سر پر چکی چلے، تو بھی آنکھ نہ کھلے۔ میاں آنکھوں کو مارے ڈر کے ایک ہاتھ سے بند کیے بیوی کے سرہانے کھرے ہیں مگر تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ آخر ایک بار کچکچا کے

خوب زور سے کندھا ہلایا اور بولے، او بیگم سنتی ہو کہ نہیں؟ جگی ہیں مگر دم سادھے پڑی ہیں۔
بیگم (ہاتھ جھٹک کر) اے ہٹو لے کے کندھا اکھاڑ ڈالا۔ اللہ کرے یہ ہاتھ ٹوٹیں۔ ہماری میٹھی میٹھی نیند خراب کردی۔ خدا جانتا ہے، میں تو سمجھی ہالا ڈالا آگیا۔ خدا خدا کرکے ذرا آنکھ لگی تو یہ آفت آئی۔ اب کہ جگایا تو تم جانوگے۔ پھر اپنے داؤں کو تو بیٹھ کر روتے ہیں۔ بے حیا چل دور ہو۔

میاں: ارے، کیا پھر سو گئیں؟ جیسے نیند کے ہاتھوں بک گئی ہو۔ بیگم سنتی ہو کہ نہیں

بیگم: کیا ہے کیا؟ کچھ منھ سے بولوگے بھی؟ بیگم بیگم کی اچھی رٹ لگائی ہے۔ ڈر لگتا ہو تو منھ ڈھانک کر سو رہیں۔ ایک تو آپ نہ سوئیں دوسرے ہماری نیند بھی حرام کریں۔

خوجی: ارے بھئی کھولو، مر گیا پکارتے پکارتے۔

میاں: بیگم خدا کرے بہری ہو جائیں۔ دیکھو تو یہاں کواڑ کون توڑے ڈالتا ہے؟ بندا تو اس اندھیاری میں ہمسنے والا نہیں۔ ذری تمھیں دروازے تک جاکر دیکھ لو۔

بیگم: جی! میری بیجار اٹھتی ہے۔ تمھاری تو وہی مثل ہوئی کہ 'روٹی کھائے دس بارہ، دودھ پیے مٹکا، سارا، کام کرنے کو ننھا بیچارا'۔ پہلے تو میں عورت ذات اور جو ڈر گئی تو پھر کیسی ہو؟ چور چکار سے بیوی کو بھڑواتے ہیں۔ مرد بنے ہیں، جوروا سے کہتے ہیں کہ باہر جاکر چور سے لڑو۔

خوجی: اجی بیگم صاحب خدا کی قسم افیم لانے گیا تھا۔ ذرا دروازہ کھلوا دیجیے۔ یہ مرزا صاحب اور مولانا آزاد تو میری جان کے دشمن ہیں۔

بیگم نے جو افیم کا نام سنا تو آگ بھبھوکا ہوگئیں۔ اٹھ کر میاں کے ایک لات لگائی، اور اوپر سے کوسنے لگیں۔ اس افیم کو آگ لگے، پینے والوں کا ستیاناس ہوجائے۔ ایک تو میرے ماں باپ نے اس نکھٹو کے کھونٹے میں باندھا۔ دوسرے اس کے ماں باپ نے افیم اس کی گھٹی میں ڈال دی۔ کیوں جی تم نے تو قسم کھائی تھی کہ آج سے افیم نہ پیوں گا؟ نہ تمھاری قسم کا اعتبار نہ زبان کا۔ قسم بھی کیا مولی گاجر ہے کہ کر کر کرکے چبا گئے!

میاں: (گرد جھاڑ پونچھ کر) کیوں جی، اور جو میں بھی ایک لات کسکے جمانے کے لائق ہوتا تو پھر کیسی ٹھہرتی۔

بیوی: میں تو پہلے باتوں سے سمجھاتی ہوں اور کوئی نہ سمجھے تو پھر لاتوں سے خبر لیتی

ہوں۔ میں تو اس فکر میں ہوں کہ تم کو کھلا پلا کر ہٹا کٹا بنا دوں، پروسی طعنے تو نہ دیں۔ اور تم پیو افیم، تو جی جلے یا نہ جلے؟

میاں صاحب دل ہی دل میں اپنے ماں باپ کو گالیاں دے رہے تھے۔ یہاں دھان پان آدمی، بیوی لاکے بٹھا دی دیونی۔ وہ تو بیاہ کر کے چھٹی پا گئے لاتیں ہمیں کھانی پڑتی ہیں۔ میں تو سمجھا کہ اپنا کام ہی تمام ہوگیا۔ مگر بے حیا جیوں کا تیوں موجود۔ بولے تمھاری جان کی قسم، کون مردود چنڈو کے قریب بھی گیا ہو۔ آج یا کبھی افیم کی صورت بھی دیکھی ہو۔ اور یوں خواہ مخواہ بدگمانی کا کون سا علاج ہے؟ ذرا چل کے دیکھو تو! آخر ہے کون؟ آؤ دیکھا نہ تاؤ کس کر ایک لات جما دی بس۔ اور جو کہیں کمر ٹوٹ جاتی؟

خوجی پینک میں زنجیر پکڑے تھے۔ ادھر میاں بیوی چلے تو اس طرح کہ بیوی آگے آگے چمٹا ہاتھ میں لیے ہوئے اور میاں پیچھے پیچھے مارے ڈر کے آنکھیں بند کیے ہوے۔ دراوزہ کھلا تو خوجی دھم سے گرے سر کے بل اور میاں مارے خوف کے خوجی پر ار ار کر کے آرہے۔ بیوی نے اوپر سے دونوں کو دبوچا۔ خوجی کا نشہ ہرن ہوگیا۔ نکل کر بھاگے تو ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے مرزا صاحب کے مکان پر داخل۔ وہاں دیکھا خدمت گار پڑا خراٹے لے رہا ہے۔ چپکے سے اپنی کھٹیا پر دراز ہوئے مگر مارے ہنسی کے برا حال تھا۔ سوچے ہم تو تھے ہی یہ میاں ہمرے بھی چچا نکلے۔

(40)

صبح کا وقت تھا میاں آزاد پلنگ سے اٹھے تو دیکھا بیگم صاحبہ منھ کھولے بے تکلفی سے کھڑی ان کی اُور کنکھیوں سے تاک رہی یں۔ مرزا صاحب کو آتے دیکھا تو بدن کو چرا لیا، اور چھلانگ ماریں تو زینن کی اوٹ میں تھیں۔

مرزا: کہیے آج کیا ارادے ہیں؟

آزاد: اس وقت ہم کو کسی ایسے آدمی کے پاس لے چلیے جو ترکی کے معاملے میں خوب واقف ہو۔ ہمین وہاں کا کچھ حال معلوم ہی نہیں۔ کچھ سن تو لیں۔ وہاں کے رنگ ڈھنگ تو معلوم ہوں۔

مرزا: بہت خوب چلیے میرے ایک دوست ہیڈ ماسٹر ہیں۔ بہت ہی ذہین اور یار باش

آدمی ہیں۔

آزاد تیار ہوئے تو بیگم نے کہا: اے تو کچھ کھاتے تو جاؤ۔ ایسی ابھی کیا جلدی ہے؟

آزاد: جی نہیں دیر ہوگی۔

بیگم: اچھا چائے تو پی لیجیے۔

تھوڑی دیر میں دونوں آدمیوں نے چائے پی، پان کھائے اور چلے۔ ہیڈ ماسٹر کا مکان تھوڑی ہی دور تھا کھٹ سے داخل۔ سلام ولام کے بعد آزاد نے روم اور روس کی لڑائی کا تازہ حال پوچھا۔

ہیڈ ماسٹر: ترکی کی حالت بہت نازک ہوگئی ہے۔

خوجی: یہ بتایئے کہ وہاں توپ داغ رہی ہے ہے یا نہیں؟ دنادن کی آواز کان میں آتی ہے یا نہیں؟

ہیڈ ماسٹر: دنادن کی آواز تو یہاں تک آچکی، مگر لڑائی چھڑ گئی ہے اور خوب زوروں سے ہو رہی ہے۔

خوجی: اف میرے اللہ! یہاں تو جان ہی نکل گئی۔

آزاد: میاں ہمت نہ ہارو، خدا نے چاہا تو فتح ہے۔

خوجی: اجی، ہمت گئی بھاڑ میں یہاں تو قافیہ تنگ ہوا جاتا ہے۔

آزاد: لڑائی روس سے ہو رہی ہے یا آپس میں؟

ہیڈ ماسٹر: آپس ہی میں سمجھیے۔ اکثر صوبے بگڑ گئے اور لڑائی ہو رہی ہے۔

آزاد: یہ تو بری ہوئی۔

خوجی: بری ہوئی تو پھر جاتے کیوں ہو؟ کیا تباہی آئی ہے؟

ہیڈ ماسٹر: سربیا کی فوج سرحد کو پار کر گئی۔ ترکوں سے ایک لڑائی بھی ہوئی۔ سنا ہے کہ سربیا ہار گیا۔ مگر اس کا کہنا ہے کہ یہ سب غلط ہے۔ ہم ڈٹے ہوئے ہیں اور ترکوں کو بوسینیا کی سرحد پر زک دی۔

خوجی: اب میرے گئے بغیر بیڑا پار نہ ہوگا۔ قسم خدا کی اتنی کرولیاں بھونکی ہوں کہ پرے کے پرے صاف ہو جائیں۔ دل لگی ہے کچھ!

ہیڈ ماسٹر: دوسری خبر یہ ہے کہ سربیا اور ترکوں میں سخت لڑائی ہوئی مگر نہ کوئی ہارا نہ

جیتا۔ سربیا والے کہتے ہیں کہ ہم نے ترکوں کو بھگا دیا۔

خوجی : بھئی آزاد، سنتے ہو؟ واپس چلو؟ اجی شرط تو یہی ہے کہ نہ کہ تمغے لٹکا کر آؤ؟ آپ واپس چلیے میں ایک تمغہ بنوا دوں گا۔

کچھ دیر تک میاں آزاد اور ہیڈ ماسٹر صاحب میں یہی باتیں ہوتی رہیں۔ دس بجتے بجتے یہاں سے رخصت ہوکر گھر آئے۔ جب کھانا کھا کر بیٹھے تو بیگم صاحبہ نے آزاد سے کہا حضرت ذرا اس مصرعے پر کوئی مصرع لگائیے :

اس لیے تصویر جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

آزاد : ہاں، ہاں سنیے :

غیر دیکھے ان کی صورت اس کی تاب آئی نہیں

اس لیے تصویر جاناں.........نہیں

اس کی فرقت ذہن میں اپنے کبھی آئی نہیں

اس لیے تصویر جاناں.........نہیں

بیگم : کہیے، آپ کی خاطر سے تعریف کردیں۔ مگر مصرعے ذرا پھیکے ہیں۔

آزاد : اچھا، لے آپ ہی کوئی چٹپٹا مصرع کہیے۔

بیگم : اے ہم عورت ذات بھلا شعر و شاعری کیا جانیں۔ اور جو آپ کی یہی مرضی ہے تو لیجیے :

لوح دل ڈھونڈھا کیے پر ہاتھ ہی آئی نہیں

اس لیے.....................نہیں

خوجی : واہ بیگم صاحب! آپ نے تو سلیمان ساوجی کے بھی کان کاٹے۔ پر اب ذرا میری اپج بھی سنیے گا :

پینک افیوں سے ٹک فرصت کبھی پائی نہیں

اس لیے.....................نہیں

اس مصرعے کا سننا تھا کہ مرزا صاحب، ان کی ہنسوڑ بیوی اور میاں آزاد ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ ابھی یہی چرچا ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک آدمی نے باہر سے آواز دی۔ مرزا نے زین سے کہا کہ جاؤ دیکھو تو کون ہے؟ میاں خلیفہ ہوں تو کہنا اس وقت ہم بال نہ بنوایں گے۔

تیسرے پہر کو آجائیے۔ زیبن آٹا گوندھ رہی تھی۔ 'اچھا' کہہ کر چپ ہو رہی۔ آدمی نے پھر باہر سے آواز دی۔ تب تو زیبن کو مجبور ہو کر اٹھنا ہی پڑا۔ ناک بھوں چڑھاتی نوکر کو جلی کٹی سناتی چلی۔ جو ہے میری ہی جان کا گاہک ہے۔ جسے دیکھو میرا ہی دشمن۔ واہ ایک کام چھوڑ دوسرے پر لپکو۔ اب کی چاند ہو تو میں تنخواہ لے کے اپنے گھر بیٹھ رہوں۔ کیوں نگوڑی نوکری کا بھی کچھ اکال ہے؟ زیبن کا قاعدہ تھا کہ کام سب کرتی تھی مگر بڑبڑا کر۔ بات بات پر تنک جانا تو گویا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مگر اپنے کام میں چست تھی۔ اس لیے اس کی خاطر ہوتی تھی۔ منھ پھلا کر باہر گئی۔ پہلے تو جاتے ہی خدمت گار کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ کیا گھر بھر میں میں ہی اکیلی ہوں؟ جو پکارتا ہے مجھی کو پکارتا ہے موئے الوّ کے منھ میں نام پڑ گیا ہے۔

خدمت گار نے کہا: مجھ سے کیوں بگڑتی ہو؟ یہ میاں آئے ہیں حضور سے کر ان کا پیغام کہہ دو۔ مگر ذرا سمجھ بوجھ کر کہنا۔ سب باتیں سن لو اچھی طرح۔

زیبن: (اس آدمی سے) کون ہو جی؟ کیا کہتے ہو؟ تمھیں بھی اسی وقت آنا تھا؟

آدمی: ملاح ہوں، اور ہوں کون؟ جا کر اپنے میاں سے کہہ دو آج جہاز روانہ ہوگا۔ ابھی دس گھنٹے کی دیر ہے۔ تیار ہو جائیے۔

زیبن نے اندر جا کر یہ خبر دی۔ بیگم صاحبہ نے جہاز کا نام سنا تو دھک سے رہ گئیں۔ چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ کلیجہ دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ اگر ضبط نہ کرتیں تو آنسو جاری ہو جاتے۔

مرزا: لیجیے حضرت اب کوچ کی تیاری کیجیے۔

آزاد: تیار بیٹھا ہوں، یہاں کوئی بڑا لمبا چوڑا سامان تو کرنا نہیں۔ ایک بیگ، ایک دری، ایک لوٹا، ایک لکڑی۔ چلیے اللہ اللہ خیر صلی اللہ، وقت پر دن سے کھڑا ہوں گا۔

خوجی: یہاں بھی وہی حال ہے۔ ایک ڈبیا، اک پیالی، چنڈو پینے کی ایک نگالی، ایک کنارا، ایک دونا مٹھائی کا، ایک چاقو، ایک کرولی، بس اللہ اللہ خیر صلی اللہ، بندا بھی کیل کانٹے سے درست ہے۔

یہ سن کر میاں آزاد اور مرزا صاحب دونوں ہنس پڑے۔ مگر بیگم صاحبہ کے ہونٹوں پر ہنسی نہ آئی۔ مرزا صاحب تو اسی وقت ملاح سے باتیں کرنے کے لیے باہر چلے گئے اور میاں آزاد اور بیگم صاحبہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ کچھ دیر تک تو بیگم نے مارے رنج کے سر تک نہ اٹھایا۔ پھر بہت سنبھل کر بولیں میرا تو دل بیٹھا جاتا ہے۔

آزاد : آپ گھبرائیے نہیں، میں جلد واپس آؤں گا۔

بیگم : ہائے، اگر اتنی ہی امید ہوتی تو رونا کاہے کا تھا؟

آزاد : صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ خدا بڑا کارساز ہے۔

بیگم : آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ کیا آج ہی جاؤں گا؟ آج ہی! تمھارے جانے کے بعد میری نہ جانے کیا حالت ہوگی؟

آزاد : خدا نے چاہا تو ہنسی خوشی پھر ملیں گے۔

اتنے میں مرزا صاحب نے باہر سے آکر کہا کہ صبح کو تڑکے جہاز روانہ ہوگا۔

بیگم : یوں جانے کو سبھی جاتے ہیں لاکھوں مرد عورت ہر سال حج کر آتے ہیں، مگر لڑائی میں شریک ہونا! بس یہی خیال تو مارے ڈالتا ہے۔

آزاد : یہ لاکھوں آدمی جو لڑنے جاتے ہیں، کیا سب کے سب مر ہی جاتے ہیں؟ پھر قضا کا وقت کون ٹال سکتا ہے جیسے یہاں ویسے وہاں۔

مرزا : بھئی، میرا تو دل گواہی دیتا ہے کہ آپ سرخ رو ہوکر آئیں گے۔ اور یوں تو زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔

بیگم : یہ سب باتیں تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر سمجھاؤں کیسے؟

مرزا : جب جانتی ہو، تب رونا دھونا بیکار ہے۔ ہاتھ منھ دھو ڈالو۔ زبین پانی لاؤ۔ یہی تو تم میں عیب ہے کہ کام شام کو اور شام کا کام صبح کو کرتی ہو۔ لاؤ پانی جھٹپٹ۔

زبین : یا اللہ! اب آلو چھیلوں یا پانی لاؤں!

آخر زبین دل ہی دل میں برا بھلا کہتی پانی لائی۔ بیگم نے منھ دھویا اور بولیں۔ اب میں کوئی ایسی بات نہ کہوں گی جس سے میاں آزاد کو رنج ہو۔

خوجی : اجی میاں آزاد! چلنے کا وقت قریب آیا۔ کچھ میری بھی فکر ہے؟ وہ کرولی لیتے ہی لیتے رہ گئے؟ افیم کا کیا بندوبست کیا؟ یار کہیں ایسا نہ ہو کہ افیم راہ میں نہ ملے اور ہم جیتے جی مر مٹیں۔ ذری زبین کو بازار تک بھیج کر کوئی ساٹھ ستر قطارے تو گرم گرم منگوا دیجیے۔ نہیں تو میں جیتا نہ پھروں گا۔

زبین : ہاں، زبین ہی تو گھر بھر میں فالتو ہے۔ لپک کر بازار سے لے کیوں نہیں آتے؟ کیا چوڑیاں ٹوٹ جائیں گی؟ اور میں عورت ذات افیم لینے کہاں جاؤں گی بھلا؟

بیگم : راستے میں اس پگلے کے سبب سے خوب چہل پہل رہے گی۔
آزاد : ہاں، اسی لیے تو لیے جاتا ہوں۔ مگر دیکھیے کیا کیا بیہودگیاں کرتے ہیں؟
خوجی : اجی، آپ سے سو قدم آگے رہوں تو سہی۔
مرزا : اس میں کیا شک ہے؟ لیکن اس طرف کوئی بہروپیا ہوا تو کیسی ٹھہرے گی؟
خوجی : سچ کہتا ہوں اتنی کرولیاں بھونکوں کہ یاد کرے۔ میں دغانے والی پلٹن میں رسالدار تھا۔ اودھ میں خدا جان کتنی گڈھیاں جیت لیں۔
بیگم : اے رسالدار صاحب، آپ کی کرولی کیا ہوئی؟ مورچہ کھا گئی ہو تو صاف کر لیجیے۔ ایسا نہ ہو مورچے پر میان ہی میں ہے۔
زینن : رسالدار صاحب ہمارے لیے وہاں سے کیا لائیے گا؟
خوجی : اجی، جیتے آویں تو یہی بڑی بات ہے۔ یہاں تو بدن کانپ رہا ہے۔
انھیں باتوں میں چلنے کا وقت آ گیا۔ آزاد نے اپنا اور خوجی کا سامان باندھا۔ بگھی تیار ہوئی۔ جب میاں آزاد نے چلنے کے لیے لکڑی اٹھائی تو بیگم بیچاری بے اختیار رو دیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے امام ضامن کی اشرفی باندھی اور کہا جس طرح پیٹھ دکھاتے ہو اسی طرح منھ بھی دکھانا۔
میاں آزاد، مرزا اور خوجی جا کر بگھی میں بیٹھے۔ جب گاڑی چلی تو خوجی بولے ہم سے کوئی نہانے کو کہے گا تو ہم کرولی ہی بھونک دیں گے۔
مرزا : تو جب کوئی کہے نہ؟
خوجی : ہاں بس اتنا یاد رکھیے گا ذرا اور ہم یہ بھی جتائے دیتے ہیں کہ گنا چوس چوس کر سمندر کے باپ میں پھینکیں گے اور جو کوئی بولے گا تو دبوچ بیٹھیں گے۔ ہاں ایسے ویسے نہیں ہیں یہاں!
سامنے سمندر نظر آنے لگا۔

(41)

حسن آرا میٹھی نیند میں سو رہی تھی۔ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ ایک بوڑھے میاں سبز کپڑے پہنے اس کے قریب آ کر کھڑے ہوئے اور ایک کتاب دے کر فرمایا کہ اسے لو اور اس

میں فال دیکھو۔ حسن آرا نے کتاب لی اور فال دیکھا تو یہ شعر تھا:

ہمیں کیا خوف ہے طوفان آوے یا بلا ٹوٹے

آنکھ کھل گئی تو نہ بوڑھے میاں تھے، نہ کتاب۔ حسن آرا فال وال کی قائل نہ تھی مگر پھر بھی دل کو کچھ تسکین ہوئی۔ صبح کو وہ اپنی بہن سپہرارا سے اس خواب کا ذکر کر رہی تھی کہ لونڈی نے آزاد کا خط لاکر اسے دیا۔

حسن آرا: ہم پڑھیں گے۔

سپہرآرا: واہ، ہم پڑھیں گے۔

حسن آرا: (پیار سے جھڑک کر) بس یہی باتیں تو ہمیں بھاتیں نہیں۔

سپہرآرا: نہ بھاویں دھمکاتی کیا ہو؟

حسن آرا: میری پیاری بہن، دیکھو بڑی بہن کا اتنا کہنا مان جاؤ لاؤ خط خدا کے لیے۔

سپہرآرا: ہم تو نہ دیں گے۔

حسن آرا: تم تو خواہ مخواہ ضد کرتی ہو، بچوں کی طرح مچلی جاتی ہو۔

سپہرآرا: رہنے دیجیے، واہ واہ! ہم اپنے آزاد کا خط نہ پڑھیں؟

یہ کہہ کر سپہرآرا نے آزاد کا خط پڑھ سنایا:

اب تو جاتے ہیں ہند سے آزاد
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

آج جہاز پر سوار ہوتا ہوں۔ دو گھنٹے اور ہندستان میں ہوں۔ اس کے بعد سفر سفر، میں خوش ہوں مگر اس خیال سے جی بے چین ہے کہ تم بیقرار ہوگی۔ اگر یہ معلوم ہوجاتا کہ تم بھی خوش ہو تو جی جاتا۔ اب تو یہی دھن ہے کہ کب روم پہنچوں۔ بس رخصت

تمھارا آزاد

'ہاں پیاری سپہرآرا کو خوب سمجھانا۔ ان کا دل بہت نرم ہے۔ اس وقت خوجی پانی کی صورت دیکھ کر مچل رہے ہیں'۔

حسن آرا: یہ موا خوجی ابھی جیتا ہی ہے؟

سپہرآرا: اسے تو پانی کا نام سن کر جوڑی چڑھ آتی تھی۔

حسن آرا: آخر بیچارے جہاز پر سوار ہوگئے۔ اب دیکھیں روم سے کب خط آتا ہے؟

سپہر آرا : اب تو فال پر ایمان لائی؟ دیکھا میں کیا کہتی تھی اب مٹھائی کھلوایئے۔ ذری کوئی یہاں آنا۔ پانچ روپے کی پنچ میل مٹھائی لاؤ۔

حسن آرا : یہ کیا خبط ہے؟

سپہر آرا : آپ کی بلا سے۔ ایک ڈلی تم بھی کھا لینا۔

حسن آرا : خوب! پانچ روپے کی مٹھائی اور اس میں ہم کو ایک ڈلی ملے؟ آتے ہی آتے آدھی نہ چکھ جاؤں تو کہنا۔

سپہر آرا : واہ دے چکی میں! ایسی کچی نہیں ہوں!

حسن آرا : بھلا، کتاب سے آگے کا حال کیا معلوم ہوگا؟ مجھے بڑی ہنسی آتی ہے جب کوئی فال دیکھتا ہے۔ آنکھیں بند کیے ہوئے تھوڑی دیر بڑبڑائے اور کتاب کھولی۔ پھر اپنے اپنے طور پر مطلب نکالنے لگے۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ ہم کو بڑے استاد نے سبق پڑھایا ہے۔

تھوڑی دیر میں سپاہی نے باہر سے آواز دی کہ ماما مٹھائی لے جاؤ۔ سپہر آرا دوڑی— مجھے دینا۔ حسن آرا الگ پھرتی سے جھپٹی کہ ہمیں ہمیں۔ اب ماما بیچاری کس کو دے ایک چنگیل دو گاہک۔ اس نے حسن آرا کو چنگیل دے دی۔

حسن آرا : اب بتلایئے کھانے میں لگّا لگاؤں؟ برفی پر چاندی کے چمکتے ورق کتنی بہار دیتے ہیں!

سپہر آرا : ماما تم دیوانی ہوگئی ہو کچھ؟ روپے ہم نے دیے تھے یا انھوں نے؟ پرایا مال کیا جھپ سے اٹھا لیا۔ واہ واہ! ہاں ہاں— کہتی جاتی ہوں سنتی ہی نہیں!

ماما : وہ آپ کی بڑی..........

سپہر آرا : چلو بس رہنے بھی دو۔ اوپر سے باتیں بناتی ہو۔

سپہر آرا نے مٹھائی بانٹی تو ماما حسن آرا کی بوڑھی دادی کو بھی اس میں سے دس پانچ ڈلیاں دے آئیں۔

بوڑھی : یہ مٹھائی کیسی!

ماما : حضور، حسن آرا نے فال دیکھی تھی۔

بوڑھی : فال کیسی؟

ماما : چٹھی آئی تھی کہیں سے۔

بوڑھی : چٹھی کیسی؟

ماما : بی بی وہی جو ہیں دیکھیے کیا نام ہے ان کا جدائی۔

بوڑھی : جدائی کیسی؟ لا میری چھڑی تو دے۔

بوڑھی بیگم کمر جھکائے لٹھیا ٹیکتے ہوئے چلیں۔ آ کر دیکھا تو دونوں بہنیں مٹھائی چکھ رہی ہیں۔

بوڑھی : یہ مٹھائی کیسی آئی ہے؟

سپہرآرا : اماں جان حسن آرا نے ہم سے شرط ہاری ہیں۔ کہتی تھیں ہمارے دیوان حافظ میں چارسو صفحے ہیں، میں نے کہا نہیں چار سو چالیس ہیں۔

بوڑھی : یہ بات تھی! ماما سٹھیا گئی ہے کیا؟ جانے کیا کیا بکتی تھی۔

شام کے وقت دونوں بہنیں سہیلیوں کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیے چھت پر اٹھکھیلیاں کر رہی تھیں۔ ایک نے دوسرے کے چٹکی لی کسی نے کسی کو گدگدایا، ذرا خیال نہیں کہ تین منزلے پر کھڑی ہیں ذرا پاؤں ڈگمگایا تو غضب ہی ہوجائے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی۔ یکا یک ایک پتنگ آ کر گرا۔ سپہرآرا نے لپک کر لوٹ لیا۔ آہاہا، اس پر تو کسی نے کچھ لکھا ہے۔ ماہی جال والا پتنگ، سب کی سب دوڑ پڑیں۔ حسن آرا نے یہ شعر پڑھ کر سنائے :

بہت تیز ہے آج کل تیر مژگاں
کوئی دل نشانہ ہوا چاہتا ہے
میرے قتل کرنے کو آتا ہے قاتل
تمام آج قصہ ہوا جاتا ہے

حسن آرا کا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ تاڑ گئی کہ کوئی نئے عاشق پیدا ہوئے، مجھ پر یا سپہرآرا پر شیدا ہوئے۔ معلوم نہیں کون ہے؟ کہیں مجھے باہر دیکھ تو نہیں لیا؟ دماغ پھر گیا ہے موئے کا۔ جب سب سہیلیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں تو حسن آرا نے بہن سے کہا تم کچھ سمجھیں؟ یہ پتنگ پر کیا لکھا تھا؟ تم تو کھیل رہی تھیں۔ میں اس وقت سے اسی فکر میں ہوں کہ ماجرا کیا ہے؟

سپہرآرا: کچھ کچھ تو میں بھی سمجھتی ہوں، مگر اب کسی سے کہو سنو نہیں۔

حسن آرا : لچھن برے ہیں۔ اس پتنگ کو پھاڑ پھوڑ کر پھینک دو۔ کوئی دیکھنے نہ پائے۔

اتنے میں خدمت گار نے ماما کو آواز دی اور ماما باہر سے ایک لفافہ لے آئی۔ حسن آرا نے جو لفافہ لیا تو مارے خوشبو کے دماغ تر ہوگیا۔ پھر ماتھا ٹھنکا۔ خوشبو کیسی! ماما سے بولی کس نے دکیا ہے؟

ماما: ایک آدمی خدمت گار کو دے گیا ہے۔ نام نہیں بتایا۔ دیا اور لمبا ہوا۔

سپہر آرا: کھولو تو دیکھو ہے کیا؟

لفافہ کھولا تو ایک خط نکلا۔ لکھا تھا 'ایک غریب مسافر ہوں، کچھ دنوں کے لیے آپ کے پڑوس میں آکر ٹھہرا ہوں۔ اس لیے کوئی غیر نہ سمجھیے گا۔ سنا ہے کہ آپ دونوں بہنیں شطرنج کھیلنے میں برق ہیں۔ یہ نقشہ بھیجتا ہوں میری خاطر سے اسے حل کر دو تو بڑا احسان ہو۔ میں نے تو بہت دماغ لڑایا پر نقشہ سمجھ میں نہ آیا۔

مرزا ہمایوں فر

اس خط کے نیچے شطرنج کا ایک نقشہ دیا ہوا تھا۔

سپہر آرا: باجی، سچ کہنا یہ تو کوئی بڑے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ مگر تم ذرا غور کرو تو چٹکیوں میں حل کرلو۔ تم تو بڑے بڑے نقشے حل کر لیتی ہو۔ بھلا اس کی کیا حقیقت ہے؟

حسن آرا: بہن یہ نقشہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کو دیکھو تو اچھی طرح۔ مگر یہ تو سوچو کہ بھیجا کس نے ہے۔

سپہر آرا: ہمایوں فر تو کسی شہزادے ہی کا نام ہوگا۔ ماما کو بلاؤ اور کہو سپاہی سے پوچھے کون لایا تھا؟ کیا کہتا تھا؟ آدمی کا پتہ مل جائے تو بھیجنے والے کا پتہ ملا داخل ہے۔

ماما نے باہر جاکر اشارے سے سپاہی کو بلایا۔

سپاہی: کہو، کیا کہتی ہو؟

ماما: ذری ادھر تو آ۔

سپاہی: وہاں کونے میں کیا کروں آن کے۔ کوئی وہاں ہولے ہولے باتیں کرتے دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ یہاں سے نکلوا دوگی کیا؟

ماما: اے چل چھوکرے! کل کا لونڈا، کیسی باتیں کرتا ہے؟ چھوٹی بیگم پوچھتی ہیں کہ جو آدمی لفافہ لایا تھا وہ کدھر گیا؟ کچھ معلوم ہے؟

سپاہی: وہ تو بس لایا اور دے کے چمپت ہوا مگر مجھے معلوم ہے وہ سامنے والے باغ

میں ایک شہزادے آن کے ٹکے ہیں انھیں کا چوبدار تھا۔

حسن آرا نے یہ سنا تو بولی: شہزادے تو ہیں مگر بدتمیز۔

سپہر آرا: یہ کیوں؟

حسن آرا: اول تو کسی کنواری شریف زادی کے نام خط بھیجنا برا، دوسرے پتنگ گرایا۔ خط بھیجا وہ بھی عطر میں بسا ہوا۔

سپہر آرا: باجی یہ تو بدگمانی ہے کہ خط کو عطر میں بسایا۔ شہزادے ہیں، ہاتھ کی خوشبو خط میں بھی آ گئی۔ مگر خط ادب سے لکھا ہے۔

حسن آرا: ان کو خط بھیجنے کی جرأت کیوں کر ہوئی۔ اب خط آئے تو نہ لینا خبردار۔ وہ شہزادے ہمارا ان کا مقابلہ کیا؟ اور پھر بدنامی کا ڈر۔

سپہر آرا: اچھا نقشہ تو سوچیے، اس میں تو کوئی برائی نہیں۔

حسن آرا نے بیس منٹ تک غور کیا اور تب ہنس کر بولی لو۔ حل کر دیا۔ نہ کہوگی اللہ جانتا ہے بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ لاؤ پھر اب جواب تو لکھ بھیجیں۔ مگر ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں انگلی دیتے ہی پہنچا نہ پکڑ لیں۔ جانے بھی دو۔ مفت کی بدنامی اٹھانا بھلا کون سی دانائی ہے؟

سپہر آرا: نہیں نہیں بہن، ضرور لکھ بھیجو۔ پھر چاہے کچھ نہ لکھنا۔

حسن آرا: اچھا، لاؤ لکھیں، جو ہونا ہوگا سو ہوگا!

سپہر آرا: ہم بتائیں خط وط تو لکھو نہیں بس اس نقشے کو حل کر کے ڈاک میں بھیج دو۔

(42)

شہر سے کوئی دو کوس کے فاصلے پر ایک باغ ہے جس میں ایک عالی شان عمارت بنی ہوئی ہے۔ اسی میں شہزادہ ہمایوں فر آ کر ٹھہرے ہیں۔ ایک دن شام کے وقت شہزادہ صاحب باغ میں سیر کر رہے تھے اور دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ شام بھی ہوگئی، مگر خط کا جواب نہ آیا۔ کہیں ہمارا خط بھیجنا انھیں برا تو نہ معلوم ہوا۔ افسوس، میں نے جلدی کی۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ اپنے خط اور اس کی عبارت کو سوچنے لگے کہ کوئی بات ادب کے خلاف زبان سے نکل گئی ہو تو غضب ہی ہوجائے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی سانڈنی پر سوار دور سے چلا آرہا ہے۔ سمجھے، شاید میرے خط کا جواب لاتا ہوگا۔ خدمت گاروں سے کہا کہ دیکھو یہ

کون آدمی ہے؟ خط لایا ہے یا خالی ہاتھ آیا ہے؟ آدمی لوگ دوڑے ہی تھے کہ سانڈنی سوار ہوگیا۔

تھوڑی دیر میں ایک چپراسی نظر آیا۔ سمجھے، بس یہ قاصد ہے۔ چپراسی نے دربان کو خط دیا اور شہزادہ صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ دل نے گواہی دی کہ ساری مرادیں مل گئیں۔ خط کھولا، تو ایک لیکچر کا نوٹس تھا۔ مایوس ہوکر خط کو رکھ دیا اور سوچا کہ اب خط کا جواب آنا مشکل ہے۔ غم غلط کرنے کو ایک غزل گانے لگے۔ اتنے ہی میں ڈاک کا ہرکارا لال پکیا جمائے، دھانی دگلا پھڑکائے، لہبر طوطے کی صورت بنائے آ پہنچا اور خط دے کر روانہ ہوا۔ شہزادے خط کھولا اور عبارت پڑھی تو پھڑک گئے۔ ہائے کیا پیاری زبان ہے کیا بول چال ہے۔ زبان اور بیان میں بھی نگاہ کی طرح جادو کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ اس نازک ہاتھ کے صدقے جس نے یہ سطریں لکھی ہیں۔ لکھتے وقت کلائی لچکی جاتی ہوگی۔ ایک ایک لفظ سے شوخی ٹپکتی ہے، ایک ایک حرف سے رنگینی جھلکتی ہے۔ اور نقشہ تو ایسا حل کیا کہ قلم توڑ دیے۔ آخر میں لکھا تھا:

عشق کا حال بیسوا جانیں

ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں؟

خود ہی شعر پڑھتے تھے اور خود ہی جواب دیتے تھے۔

ایکا ایک ان کے ایک دوست آئے اور بولے کہیے کچھ جواب آیا؟ یا دھتا بتا دیا؟

شہزادہ: واہ دھتا تم جیسوں کو بتاتی ہوں گی۔ لو یہ جواب ہے۔

دوست: (لفافہ پڑھ کر) واہ، بڑے ادب سے خط لکھا ہے۔

شہزادہ: جناب، کچھ بازاری عورتیں تھوڑے ہیں۔ ایک ایک لفظ سے شرافت برستی ہے۔

دوست: پھر پوچھتے کیا ہو! گہرے ہیں ہمیں نہ بھولیے گا۔

اب شہزادے کو فکر ہوئی کہ کسی طرح ملاقات کی ٹھہرے۔ بنے یا بگڑے۔ جب آمنے سامنے بات ہو تب دل کو چین آئے۔ سوچتے سوچتے آپ کو ایک حکمت سوجھ ہی گئی۔ مونچھوں کا صفایا کردیا، نقلی بال لگا لیے، زنانے کپڑے پہنے اور پالکی پر سوار ہوکر حسن آرا کے دروازے پر جا پہنچے۔ اپنی مہری کو ساتھ لے لیا تھا۔ مہری نے پکارا، ارے کوئی ہے؟ ذرا اندر خبر کردو کہ مرزا ہمایوں فر کی بہن ملنے آئی ہیں۔

بڑی بیگم نے جو سنا تو آ کر حسن آرا کو بولیں ذرا قرینے سے بیٹھانا۔ تمیز سے باتیں کرنا۔ کوئی بھاری سا جوڑا پہن لو، سمجھیں۔

حسن آرا : اماں جان، کپڑے تو بدل لیے ہیں۔

بڑی بیگم : دیکھوں! یہ کیا سفید دوپٹہ ہے؟

حسن آرا : نہیں، اماں جان گلابی ہے۔ وہی جام دانی کا دوپٹہ جس میں کامدانی کی آڑی بیل ہے۔

بڑی بیگم : بیٹا، کوئی اور بھاری جوڑا نکالو۔

حسن آرا : ہمیں تو یہی پسند ہے۔

اتنے میں عاشق بیگم پالکی سے اتریں اور جا کر بولیں، آداب بجا لاتی ہوں۔

حسن آرا : تسلیم، آیئے۔

عاشق : آؤ، بہن گلے تو ملیں۔

دونوں بہنیں بے جھجھک عاشق بیگم سے گلے ملیں۔

سپہر آرا :

آمد ہمارے گھر میں کسی مہ لقا کی ہے
یہ شان کردگار یہ قدرت خدا کی ہے

حسن آرا :

یہ کون آیا ہے رکھ کر پھول، موئے عنبر افشاں میں
صبا اترائی پھرتی ہے جو ان روزوں گلستاں میں

عاشق :

'صفدر' زباں سے راز محبت عیاں نہ ہو
دل آشنائے درد ہو، لب پر فغاں نہ ہو

سپہر آرا : آپ نے آج غریبوں پر کرم کیا۔ ہمارے بڑے نصیب۔

عاشق : بہن، ہماری تو کئی دن سے خواہش تھی کہ آپ سے ملیں، مگر پھر ہم سوچے کہ شاید آپ کو ناگوار ہو۔ ہم تو غریب ہیں۔ امیروں سے ملتے ہوئے ذرا وہ معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا : بجا ہے، آپ تو خدا کے فضل سے شہزادی ہیں، ہم تو آپ کی رعایا ہیں۔

عاشق : آپ دونوں بہنیں ایک دن کوٹھے پر ٹہل رہی تھیں تو ہمایوں فر نے مجھے بلا کر دکھایا تھا۔

حسن آرا نے گلوری بنا کر دی اور عاشق بیگم نے انھیں کے ہاتھوں سے کھائی۔ کتھا کیوڑے میں بسا ہوا، چاندی سونے کا ورق لگا ہوا، چکنی ڈلی اور الائچی۔ غرض کہ بڑے تکلف والی گلوریاں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد طرح طرح کے کھانے دسترخوان پر چنے گئے اور تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر عاشق بیگم نے بے تکلفی سے حسن آرا کی رانوں پر سر رکھ دیا اور لیٹ رہیں۔ سپہر آرا نے اٹھ کر کشمیر کا ایک دوشالہ اوڑھا دیا اور قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

عاشق : بہن، اللہ جانتا ہے تم دونوں بہنیں چاند کو بھی شرماتی ہو۔

حسن آرا : اور آپ؟

اپنے جوبن سے نہیں یار خبردار ہنوز
ناز و انداز سے واقف نہیں زنہار ہنوز

تینوں میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ دس بجے کے قریب عاشق بیگم اٹھ بیٹھیں اور فرمایا کہ بہن اب ہم رخصت ہوں گے۔ زندگی ہے تو پھر ملیں گے۔

سپہر آرا :

بے چین کر رہا ہے کیا کیا دل و جگر کو
ہر دم کسی کا کہنا، جاتے ہیں ہم تو گھر کو

اس طرح محبت کی باتیں کر کے عاشق بیگم رخصت ہوئیں اور جاتے وقت کہہ گئیں کہ ایک دن آپ کو ہمارے یہاں آنا پڑے گا۔ پالکی پر سوار ہو کر عاشق بیگم نے ماماؤں، خدمت گاروں اور دربانوں کو دو دو اشرفیاں انعام کی دیں اور چپکے سے ماما کو ایک تصویر دے کر کہا کہ یہ دے دینا۔

کہاروں نے تو پالکی اٹھائی اور ماما نے اندر جا کر تصویر دی۔ حسن آرا نے دیکھا تو دھک سے رہ گئیں۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

'پیاری'

میں عاشق بیگم نہیں ہوں، ہمایوں فر ہوں۔ اب اگر تم سے بے وفائی کی تو زہر کھا کر جان دے دوں گا۔

حسن آرا: بہن، غضب ہوگیا!

سپہرآرا: کیا، ہوا کیا؟ بولوتو!

حسن آرا: لو، یہ تصویر دیکھو۔

سپہرآرا: (تصویر دیکھ کر) ارے، غضب ہوگیا! اس نے تو بڑا جُل دیا۔

حسن آرا: (ہیرے کی کیل ناک سے نکال کر) بہن، میں تو یہ کھا کر سو رہتی ہوں۔

سپہرآرا: (کیل چھین کر) اف ظالم نے بڑا دھوکا دیا۔

حسن آرا: ہم گلے مل چکیں۔ ظالم زانو پر سر رکھ کر سویا۔

سپہرآرا: مگر باجی، اتنا تو سوچو کہ بہن کہہ کہہ کر بات کرتے تھے۔ بہن بنا گئے ہیں۔

حسن آرا: یہ سب باتیں ہیں، کس کی بہن اور کیسا بھائی!

وہ یوں مجھے دیکھ کر گیا ہے
کھال اس کی جو کھینچیے سزا ہے

سپہرآرا: واہ! کسی کی مجال پڑی ہے جو ہم سے شرارت کرے؟

حسن آرا: خبردار، اب اس سے کچھ واسطہ نہ رکھنا۔ آدمیوں کو تاکید کر دو کہ کسی کا خط بے سمجھے بوجھے نہ لیں، ورنہ نکال دیے جائیں گے؟

سپہرآرا: ذری سوچ لو، لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے کہ ابھی تو اتنے جوش سے ملیں اور ابھی یہ نادری حکم۔

حسن آرا: ہاں، سچ تو ہے۔ ابھی تک ہمی تم جانتے ہیں۔

سپہرآرا: کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی سے ذکر کردیں۔

حسن آرا: اس سے اطمینان رکھو، وہ شہدے تو ہیں نہیں۔

سپہرآرا: واہ، شہدے نہیں، تو اور ہیں کون! شہدے کے سر پر کیا سینگ ہوتے ہیں؟

حسن آرا: اب آج سے چھت پر نہ چڑھنا۔

سپہرآرا: واہ بہن، بیچ کھیت چڑھیں۔ کسی نے دیکھ ہی لیا تو کیا! اپنا دل صاف رہنا چاہیے۔

حسن آرا: مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادے صاحب تمھاری فکر میں ہیں۔

سپہرآرا: چلیے، بس اب چھیڑخانی رہنے دیجیے۔

حسن آرا : ارے واہ! دل میں تو خوشی ہوئی ہوگی، چاہے زبان سے نہ کہو۔

سپہرآرا : آپ بھی کیا واہی تباہی بکتی ہیں؟

حسن آرا : آخر برا کیا ہے؟ شہزادے ہیں کہ نہیں۔ اور صورت تو تم دیکھ ہی چکی ہو، لو آج کے دوسرے ہی مہینے دروازے پر شہنائی بجتی ہوگی۔

سپہرآرا : ہم اٹھ کر چلے جائیں گے ہاں! یہ ہنسی ہم کو گوارا نہیں۔

حسن آرا : خدا کی قسم، میں دل لگی سے نہیں کہتی۔ آخر اس بیچارے میں کیا برائی ہے! حسین، مالدار، کمسن، شوقین، نیک بخت۔

سپہرآرا : بس، اور دس پانچ باتیں کہیے نہ۔

سپہرآرا کے دل پر ان باتوں کا بہت بڑا اثر ہوا۔ آدمی کی طبیعت بھی کیا جلد پلٹا کھاتی ہے۔ ابھی تو ہمایوں فر کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور اب دل ہی دل میں کھلی جاتی تھیں کہ ہاں ہے تو سچ۔ آخر ان میں عیب ہی کیا ہے؟

دونوں بہنوں میں تو یہ باتیں ہورہی تھیں اور وہ مہری، جو عاشق بیگم کے ساتھ آئی تھی دروازے پر چپکی کھڑی سن رہی تھی۔ جب حسن آرا چپ ہوئیں تو اس نے اندر پہنچ کر سلام کیا۔

حسن آرا : کون ہو؟

مہری : حضور، میں ہوں اچھن۔

حسن آرا : کہاں سے آئی ہو؟

مہری : آپ مجھے اتنی جلد بھول گئیں! بیگم صاحبہ نے بھیجا ہے۔

حسن آرا : بیگم صاحبہ کون؟

مہری : وہی عاشق بیگم جو آپ سے مل گئی ہیں۔

حسن آرا : کہو، کیا پیغام بھیجا ہے؟

مہری : (مسکراکر) حضور کو ذرا وہاں تک تکلیف دی ہے۔

مہری کا مسکرانا دونوں بہنوں کو بہت برا لگا۔ مگر کرتیں کیا۔ مہری انھیں چپ دیکھ کر پھر بولی، بیگم صاحبہ نے فرمایا ہے کہ اگر کچھ ہرج نہ ہو تو اس وقت ہمارے یہاں آیئے۔

سپہرآرا : کہہ دینا، ہمیں فرصت نہیں۔

مہری : انھوں نے کہا ہے کہ اگر آپ کو فرصت نہ ہو تو میں خود آ جاؤں۔

سپہر آرا : جی، کچھ ضرورت نہیں ہے۔ بس اب دور ہی سے سلام ہے۔ اور اب آج سے تم نہ آنا یہاں، سنا کہ نہیں؟

مہری : بہت اچھا، لونڈی حکم بجا لاوے گی۔ بیگم صاحبہ کی جیسی نوکر، ویسی ہی حضور کی۔

سپہر آرا : چلو بس، بہت باتیں نہ بناؤ۔ کہہ دینا خیر اسی میں ہے کہ اب کوئی خط وط نہ آئے۔ شہزادے ہیں اس سے چھوڑ دیا کوئی دوسرا ہوتا تو خون ہو جاتا۔ اتنے بڑے شہزادے اور غریب شریف زادیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ بس چلے تو وہ سزا دوں کہ عمر بھر یاد کریں۔ واہ! اچھا جال پھیلایا ہے۔

حسن آرا : بس، اب خاموش بھی رہو۔ کوئی سن لے گا۔ اب کچھ کہو نہ سنو (مہری سے) چلو، سامنے سے ہٹو۔

مہری : حضور، جان بخشی ہو تو عرض کروں؟

حسن آرا : اب تم جاؤ، ہم نے کئی دفعہ کہہ دیا۔ نہیں پچھتاؤ گی۔

مہری روانہ ہوئی۔ قسم کھائی کہ اب نہیں آنے کی۔ سپہر آرا کا چہرہ مارے غصے کے لال بھبھوکا ہو گیا۔ حسن آرا سمجھاتی تھیں کہ بہن، اب اور باتوں کا خیال کرو۔ لیکن سپہر آرا ٹھنڈی نہ ہوتی تھیں۔ بہت دیر کے بعد بولیں، بس معلوم ہوا کہ کوئی شہدا ہے اگر سچی محبت ہے تو حیا اور شرم کے ساتھ ظاہر کرنا چاہیے یا اس بے تکے پن سے؟

(43)

شہزادہ ہمایوں فر مہری کو بھیج کر ٹہلنے لگے، مگر سوچتے جاتے تھے کہ کہیں دونوں بہنیں خفا نہ ہو گئی ہوں، تو پھر بے ڈھب ٹھہرے۔ بات کی بات جائے اور شاید جان کے بھی لالے پڑ جائیں۔ دیکھیں، مہری کیا خبر لاتی ہے۔ خدا کرے دونوں مہری کو ساتھ لے کر چھت پر چلی آویں۔ اتنے میں مہری آئی اور منہ پھلا کر کھڑی ہو گئی۔

شہزادہ : کہو، صاف صاف!

مہری : حضور، کیا عرض کروں!

شہزادہ : وہ تو ہم تمھاری چال ہی سے سمجھ گئے تھے کہ بے ڈھب ہوئی۔ کہہ چلو بس۔

مہری : اب لونڈی وہاں نہیں جانے کی۔

شہزادہ : پہلے مطلب کی بات تو بتاؤ کہ ہوا کیا؟

مہری : میں نے جاکر پردے کے پاس سے سنا کہ آپ ہی کی باتیں چپکے چپکے کر رہی ہیں۔ میں جو گئی تو بڑی بہن نے رکھائی کے ساتھ باتیں کیں اور چھوٹی بہن تو بس برس ہی پڑیں۔ میں کھڑی کانپ رہی تھی کہ کِس مصیبت میں پڑی۔ بہت تیز ہوکے بولیں اب نہ آنا، نہیں تو تم جانوگی۔ اور ان سے بھی کان کھول کے کہہ دینا کہ بہت چل نہ نکلیں۔ بہت ہی بگڑیں۔ میں چور کی طرح چپکے چپکے سنتی رہی۔

ہمایوں : افسوس! تو بہت ہی بگڑیں؟

مہری : کیا کہوں حضور، اپنے آپے ہی میں نہیں تھیں۔

ہمایوں : ہم نے بڑی غلطی کی۔ پہلے تو ہمیں جانا نہ تھا اور گئے تو پہچوانا نہ تھا۔

مہری : اب جانے وانے کا ارادہ نہ کیجیے گا۔

دوسرے دن ہمایوں فر چھت پر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حسن آرا بیگم اپنے کوٹھے پر چڑھی ہیں اور منھ پر نقاب ڈالے کھڑی ہیں۔ اتنے میں سپہرآرا بھی اوپر آئیں اور شہزادے کو دیکھتے ہی اچک کر آڑ میں ہو رہیں۔ دم کے دم میں حسن آرا بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں۔ بیچارے نظر بھر دیکھنے بھی نہ پائے تھے کہ دونوں نظر سے غائب ہوگئیں۔ سوچے ایسی ہی حیا پھٹ پڑی تھی تو کوٹھے پر کیوں آئیں؟

اب ادھر کی کیفیت سنیے۔ حسن آرا کو معلوم ہی نہ تھا کہ حضرت اس وقت کوٹھے پر ٹہل رہے ہیں۔ جب سپہرآرا نے کوٹھے پر آکر شہزادے کو دیکھ لیا تو چپکے سے کہا۔ بہن یہیں بیٹھ جاؤ، وہ تاک جھانک سے باز نہ آویں گے۔ حسن آرا نے چھلانگ بھری تو کھٹ سے نیچے۔ سپہرآرا بھی اچک کر زینے پر جا پہنچیں۔

حسن آرا : پٹکی پڑے، اے واہ اچھا گھر پرکھ لیا ہے۔

سپہرآرا : میرا بس چلے تو اس کا گھر اجڑوا دوں۔

حسن آرا : یہ کیا ستم کرتی ہو؟ گھر آباد کرتے ہیں یا اجڑواتے ہیں؟

سپہرآرا : باجی، اللہ خیر کرے، یہ موا جب دیکھو کوٹھے پر کھڑا رہتا ہے۔

حسن آرا : تو تم کاہے کو اپنی زبان خراب کرتی ہو؟ آدمی ہی تو وہ بھی ہے۔

سپہر آرا: باجی، تم چاہے مانو چاہے نہ مانو، یہ موا بہروپیا ہے کوئی۔

اتنے میں ایک لونڈی نے آکر کہا لیجیے بڑی بیگم صاحبہ نے یہ مٹھائی دی ہے۔ وہ جو اس دن آئی نہیں تھیں انھوں نے مٹھائیوں کے دو خوان بھیجے ہیں۔

لونڈی کی لڑکی کا نام پیاری تھا۔ اس نے مٹھائی جو دیکھی تو توتلا کر بولی جلا سی ہمیں دیجیے۔

سپہر آرا: ارے واہ ان کو دیجیے۔ بڑی وہ بن کے آئی ہیں! اچھا اتنا بتا دے کہ کے بیاہ کرے گی؟

پیاری: پہلے مٹھائی دیجیے تو بتاؤں۔

سپہر آرا: تو مل چکی، گڑھیا میں منھ دھو آ۔

پیاری: میں ایک خصم کروں گی، اول پھل چھوڑ کے دوسلا۔ اور پھل تیسرا، پھل چوتھا، ان سب کو لاتیں مال مال کے نکال دوں گی۔ لے، اب دیجیے۔

سپہر آرا: جا اب نہ دوں گی۔

حسن آرا: دے دو، دے دو، رو رہی ہے۔

سپہر آرا: اچھا، لے مگر پانی نہ پینے دوں گی۔

پیاری: ہاں، نہ پیوں گی، لاؤ تو جلا۔

اس پر قہقہہ پڑا۔ ذرا سی لڑکی اور کیسی باتیں بناتی ہے۔ اتنے میں بڑی بیگم آکر بولیں، ارے تمھاری وہی گویاں جو اس دن آئی تھیں انھیں کے یہاں سے مٹھائی کے دو خوان آئے ہیں۔ ایک عورت ساتھ تھی۔ کہہ گئی ہے کہ دونوں بہنوں کو کل بلایا ہے۔ سو کل کسی وقت چلی جانا، گھڑی دو گھڑی دل بہلا کے چلی آنا۔ نہیں تو مفت میں شکایت ہوگی۔

حسن آرا: کل کی کل کے ہاتھ ہے اماں جان!

بیگم صاحبہ تو چلی گئیں ادھر حسن آرا کا رنگ اڑ گیا۔ بولیں بہن، یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔

سپہر آرا: ایک کام کیجیے۔ اب بے خوشامد کے کام نہ چلے گا۔ ان کے نام ایک خط لکھیے اور صاف صاف مطلب سمجھا دیجیے۔ موئے کو اچھے اچھے لٹکے یاد ہیں۔ جب ادھر دال نہ گلی تو اماں جان سے لاسا لگایا۔ اور وہ بھی کتنی بھولی ہیں۔

ایکا ایک دروازے پر ایک نیا گل کھلا۔ دس بارہ آدمیوں نے مل کر گانا شروع کیا۔

مان کریں نندلال سوں
سہاگن بچا مان کرے نندلال سوں
دودھ پوت اور انّ دھن بچھی
گود کھلائے نندلال سوں! مان

دس پانچ آدمی گاتے ہیں دو چار تال دیتے جاتے ہیں۔ دو ایک مجیرا بجاتے ہیں۔ ایک حضرت ڈھولکی تھپتھپاتے ہیں۔

گھر بھر میں کھلبلی مچ گئی کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ لڑکا کس کے ہوا ہے؟ بڑی بیگم بیوہ، دونوں بہنیں کنواری، یہ کیا اندھیر ہے بھئی!

ماما : ارے، تم کون لوگ ہو؟

کئی آدمی : اے حضور، خدا سلامت رکھے بھانڈ ہیں۔

ایک صاحب ہنہنا کر بولے میرے بچھیڑے کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ ماں کے پیٹ ہی سے ہنہناتا نکلا تھا۔

دوسرے صاحب نے اچک کر فرمایا : ہیں ہیں ہیں، دو بانگے ہیں، اور ادھر تالیاں بج رہی ہیں مان کرے نندلال..........!

بڑی بیگم : ارے لوگو یہ ہے کیا؟ یہ دن دہاڑے کیا اندھیر ہے؟ ان نگوڑے بھانڈوں سے پوچھو، آئے کس کے یہاں ہیں؟

دربان : چپ رہو جی، آخر کہاں آئے ہو؟

ایک بھانڈ : واہ شیرا، کیوں نہ ہو کیا دم ہلا کے بھونکے ہو۔

دربان : آخر تم لوگوں سے کس نے کیا کہا؟ کچھ گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟

ماما : یہ کیا غضب کرتے ہو!

بھانڈ : غضب پڑے برے کی جان پر، اور آنکھ لڑے ہم سے۔

سپاہی : میاں، قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہاں لڑکا وڑکا نہیں ہوا۔ تم مانتے ہی نہیں ہو۔

بھانڈ : واہ جناب! کیوں نہ ہو کھڑی مونچھیں اور چڑھی داڑھی۔

سپاہی : (آہستہ سے) بھلا لڑکا ہوگا کس کے؟ دو لڑکیاں، وے کنواری ہیں گی ایک بڑی بیگم وہ بوڑھی کھپٹ، اور تو کوئی عورت ہی نہیں تم یہ بک کیا رہے ہو!

بھانڈ : یہ اچھی دل لگی ہے بھئی، پھر اس مرد نے کہا ہی کیوں تھا؟
سپاہی : یہ کانٹے کس کے بوئے ہوئے ہیں۔
بھانڈ : ارے صاحب کچھ نہ پوچھیے بڑا چکمہ ہوگیا۔
دربان : لے، اب مجیرا وجیرا وجرا ہٹاؤ، نہیں تو یہاں ٹھیک کیے جاؤ گے۔
بھانڈ : واللہ ہو بڑے نمک حلال
ادھر دونوں بہنوں میں یوں باتیں ہونے لگیں۔
سپہرآرا: یہ اسی کی شرارت ہے۔
حسن آرا : کن کی؟ نہیں توبہ۔
سپہرآرا : آپ چاہے نہ مانیں ہم تو یہی کہیں گے۔
حسن آرا : بہن، وہ شہزادہ ہیں، ان سے یہ حرکت نہیں ہوسکتی۔
سپہرآرا : اچھا، پھر یہ بھانڈ کیوں آئے؟ اگر کسی نے بہکا کر بھیجا نہیں تو آئے کیسے؟
حسن آرا : ہاں کہتی تو سچ ہو، مگر اللہ جانتا ہے اس سے ایسی حرکت نہیں ہوسکتی۔
سپہرآرا : آپ میرے کہنے سے انھیں ایک خط لکھ بھیجئے کہ پھر ایسی حرکت کی تو ہم زہر ہی کھالیں گے۔

حسن آرا خط لکھنے پر راضی ہوگئیں اور یوں خط لکھا :

'حیا سے منھ نہ موڑیں گے ستائے جس کا جی چاہے
وفاداری میں ہم کو آزمائے جس کا جی چاہے
کبھی مانند گوہر آبرو 'صفدر' نہ جائے گی
بظاہر خاک میں ہم کو ملائے جس کا جی چاہے

ارے ظالم، کچھ خدا کا ڈر بھی ہے؟ کیوں جی، شریفوں کی یہ ہی حرکتیں ہوتی ہیں؟ شرم نہیں آتی! بہن بنا کر اب یہ شرارتیں کرتے ہو۔ یہ ہی مردوں کے کام ہیں!

اگر اب کی کسی کو بھیجا تو ہم ہیرے کی کنی کھالیں گے۔ خون تمھاری گردن پر ہوگا۔ آخر تم اپنے دل میں ہم کو سمجھتے کیا ہو؟ اگر بھوت سر پر سوار ہے تو کہیں اور منھ کالا کیجیے۔ ہم گھر گرست شریف زادیاں ان باتوں سے کیا واسطہ؟ دل لینا جانے نہ دل دینا۔

کانٹوں میں نہ ہو اگر الجھنا
تھوڑا لکھا بہت سمجھنا

ہمایوں فر کے پاس جب یہ خط پہنچا تو بہت شرمائے۔ سمجھ گئے کہ یہاں ہماری دال نہ گلے گی۔ دل میں ارادہ کرلیا کہ اب بھول کر بھی ایسی چالیں نہ چلیں گے۔

(44)

حسن آرا اور سپہر آرا دونوں رات کو سو رہی تھیں کہ دربان نے آواز دی۔ ماماجی دروازہ کھولو۔

ماما : دل بہار دیکھو کون پکارتا ہے؟

دل بہار : اے واہ، پھر کھول کیوں نہیں دیتیں؟

ماما : میری اٹھتی ہے جوتی، دن بھر کی تھکی ماندی ہوں۔

دل بہار : اور یہاں کون چندن چوکی پر بیٹھا ہے؟

دربان : اجی، لڑ لینا پیچھے، پہلے کواڑیں کھول جاؤ۔

ماما : اتنی رات گئے کیوں آفت مچا رکھی ہے؟

دربان : اجی کھولو تو، سواریاں آئی ہیں۔

حسن آرا : کہاں سے؟ ارے دل بہار! ماما! کیا سب کی سب مر گئیں؟ اب ہم جائیں دروازہ کھولنے؟

حسن آرا کی آواز سن کر سب کی سب ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماما نے پردا کرا کر سواریاں اتروائیں۔

سپہر آرا : اخواہ، روح افزا بہن ہیں، اور بہار بیگم آیئے بندگی۔

یہ دونوں حسن آرا کی چچیری بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی ہوچکی تھی۔ سسرال سے دونوں بہنوں سے ملاقات کرنے آئی تھیں۔ چاروں بہنیں گلے ملیں۔ خیر عافیت کے بعد حسن آرا نے کہا۔ دو برس کے بعد آپ لوگوں سے ملاقات ہوئی۔

بہار بیگم : ہاں اور کیا!

سب کی سب باتیں کرتے کرتے سو گئیں۔ صبح کو حسن آرا نے بڑی بیگم سے دونوں

بہنوں کے آنے کی خبر سنائی۔

بڑی بیگم: جبھی میری بائیں آنکھ پھڑکتی تھی۔ میں بھی کہوں کہ اللہ کیا خوشخبری سنوں گی۔ کہاں ہیں کہاں، ذرا بلاؤ تو۔

حسن آرا: ابھی سو رہی ہیں۔

بڑی بیگم: اے تو جگا دے بیٹا، اچھی تو ہیں؟

حسن آرا نے آکر دیکھا تو دونوں غافل سو رہی ہیں۔ روح افزا کی لٹیں کالی ناگن کی طرح بل کھاکر تکیے پر سے پلنگ کے نیچے لہرا رہی ہیں۔ بہار بیگم کا دوپٹہ کہیں ہیں دلائی کہیں، ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے خراٹے لے رہی ہیں۔

حسن آرا: اجی سوتی ہی رہیے گا! اماں جان بلاتی ہیں۔

روح افزا: بہن، اب تک آنکھوں میں نیند بھری ہے۔ نماز پڑھ لوں تو چلوں۔

حسن آرا: (بہار بیگم کا ہاتھ ہلاکر) اے بہن اب اٹھو۔

بہار بیگم: اللہ اتنا دن چڑھ آیا! سارے گھر مین دھوپ پھیل گئی۔

حسن آرا: اٹھیے اماجان بلا رہی ہیں۔

بہار بیگم: روح افزا کو تو جگاؤ۔

سپہرآرا: وہ کیا بیٹھی ہیں سامنے۔

دونوں نے اٹھ کر نماز پڑھی اور بڑی بیگم کے پاس چلیں۔ روح افزا جاتے ہی بڑی بیگم سے چمٹ گئیں۔ بہار بھی ان سے گلے ملیں اور ادب کے ساتھ فرش پر بیٹھیں۔

بڑی بیگم: کیوں روح افزا، اب تو اس بیماری نے پیچھا چھوڑا؟ کیا کہتے ہیں توبہ مجھے تو اس کا نام بھی نہیں آتا۔

سپہرآرا: (مسکراکر) ڈینگو بخار، آپ تو روز روز بھول جاتی ہیں۔

بڑی بیگم: ہاں، وہی ڈنکو!

سپہرآرا: ڈنکو نہیں، ڈینگو۔

روح افزا: اب ایک مہینے سے پیچھا چھوٹا ہے کہیں، میری تو جان پر بن آئی تھی۔

بڑی بیگم: چہرہ کیسا زرد پڑ گیا ہے۔

بہار بیگم: اب تو آپ انھیں اچھی دیکھتی ہیں یہ تو گھل کر کانٹا ہوگئی تھیں۔

بڑی بیگم: حکیم محمد حسین نے علاج کیا تھا نہ وہاں؟

روح افزا: جی نہیں، ایک ڈاکٹر تھا۔

بڑی بیگم: اے ہے بھولے سے علاج نہ کرنا ڈاگڈر واگڈر کا۔

روح افزا: میں تو اس کی بولی ہی نہ سمجھوں۔ کہے، زبان دکھاؤ، جب منھ دکھاویں تب تو زبان دکھاویں؟ میں نے کہا یہ تو حشر تک نہیں ہونے کا۔ پھر نبض دیکھی تو ہاتھ پردے سے نکال لیا اور کہا چوڑیاں اتار ڈالو۔ میں نے سونے کی چوڑیاں تو اتار ڈالیں مگر شیشے کی ایک چوڑی پہنے رہی۔ تب کہنے لگا ہم سے باتیں کرو۔ تب تو میں نے دولھا بھائی کو بلایا اور کہا واہ صاحب، آپ تو اچھے ڈاکٹر کو لائے! منھ کیا، ہم تو ایڑی بھی نہ دکھاویں۔ اور کہتا ہے ہم سے باتیں کرو۔ یہاں نگوڑی گٹ پٹ کسے آتی ہے! بس درگزری ایسے علاج سے۔ آپ انھیں دھتا بتائیے۔ اتنے میں اس نے گھڑی جیب سے نکالی اور کہنے لگا گنتی گنو۔ سنیے جیسے لڑکیوں کے مدرسے میں امتحان لے رہے ہوں۔ آخر میں نے ایک دو پانچ بیس گیارہ اناپ شناپ بکا۔ بڑی کڑوی دوائیاں دیں۔ بارے بچ گئی۔

بڑی بیگم: بہار، یہ تم مہینوں خط کیوں نہیں بھیجتی ہو؟

بہار بیگم: اماں جان، خطوں کا میں تو تار باندھ دوں، مگر جب کوئی لکھنے والا بھی ہو۔

روح افزا: یہ تو گرستی کے دھندے میں ایسی پڑ گئیں کہ پڑھا لکھا سب چوپٹ کر دیا۔

حسن آرا: اور دولہا بھائی نے تو خط لکھنے کی قسم کھائی ہے۔

روح افزا: دن بھر بیٹھے شعر کہا کرتے ہیں۔

بڑی بیگم: کہو، تمھاری ساس تو اچھی ہیں؟

بہار بیگم: ہاں، نہ مجھے موت آتی ہے نہ انھیں۔

حسن آرا: کل پرسوں تک دولہا بھائی یہاں آویں گے تو میں ان کو خوب جھاڑوں گی۔

بڑی بیگم: بہار، سچی بات تو یہ ہے کہ تم بھی ذرا تیز مزاج ہو۔

سپہر آرا: جو ایک گرم اور نرم ہو تو بات بنے۔ اور جو دونوں تیز ہوئے تو کیسے بنے؟

بہار بیگم: اب تم اپنی ساس سے نہ لڑنا۔ تم نرم ہی رہنا۔ میرے تو ناک میں دم آ گیا۔

بڑی بیگم: اب کی مرزا یہاں آئیں تو سمجھاؤں۔

بہار بیگم: اماں جان، مجھ سے ان سے حشر تک نہ بنے گی۔ جو کوئی لونڈی باندی بھی مجھ

سے اچھی طرح باتیں کرلے تو جل مرتی ہیں۔ اور میں جان بوجھ کر اور جلاتی ہوں۔

حسن آرا: بہن، مل جل کر رہنا چاہیے۔

بہار بیگم: جب تم سسرال جاؤ گی ایسی ہی ساس پاؤ گی اور پھر مل جل کر رہوگی تو سات بار سلام کروں گی۔

روح افزا: جھگڑا سارا یہ ہے کہ ودلہا بھائی ان کی خاطر بہت کرتے ہیں۔ بس ان کی ساس جلی مرتی ہیں کہ یہ جورو کی خاطر کیوں کرتا ہے؟

بہار بیگم: اللہ جانتا ہے ہزاروں دفعہ طرح دے جاتی ہوں۔ مگر جب نہیں رہا جاتا تو میں بھی بکنے لگتی ہوں۔ مجھے تو انھوں نے بے حیا کر دیا۔ اب وہ ایک کہتی ہیں تو میں دس سناتی ہوں۔

بڑی بیگم: (پیٹھ ٹھوک کر) شاباش!

حسن آرا: میری طرف سے بھی پیٹھ ٹھوک دیجیے گا۔

بہار بیگم: بہن، ابھی کسی سے پالا نہیں پڑا ہم کو تو ایسا دق کر رکھا ہے کہ اللہ کرے اب وہ مر جائیں یا ہم۔

چاروں بہنیں یہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں گئیں اور بناؤ سنگار کرنے لگیں۔ حسن آرا، سپہرآرا اور روح افزا تو بن ٹھن کر موجود ہوگئیں مگر بہار بیگم ابھی بال ہی سنوار رہی تھیں۔

روح افزا: انھیں جب دیکھو بال ہی سنوارا کرتی ہیں۔

بہار بیگم: تم آئے دن یہی طعنہ دیا کرتی ہو۔

روح افزا: ایسی تو صورت بھی اللہ نے نہیں بنائی ہے۔

بہار بیگم نے کوئی دو گھنٹے میں کنگھی چوٹی سے فراغت پائی۔ پھر چاروں نکل کر باتیں کرنے لگیں۔ سپہرآرا ڈلی کترتی تھیں، حسن آرا گلوریاں بناتی تھیں، روح افزا ایک تصویر کی طرف غور سے دیکھتی تھیں، مگر بہار بیگم کی نگاہ آئینے ہی پر تھی۔

سپہرآرا: ارے اب تو آئینہ دیکھ چکیں؟ یا گھنٹوں صورت ہی دیکھا کیجیے گا؟

بہار بیگم: تم کہتی جاؤ ہم جواب ہی نہ دیں گے۔

روح افزا: اللہ جانتا ہے انھیں یہ مرض ہے۔

سپہرآرا: ہاں معلوم تو ہوتا ہے۔

بہار بیگم : تم سب بہنیں ایک ہو گئیں۔ اپنی ہی زبان تھکاؤ گی۔
حسن آرا : روح افزا تم اٹھ کر آئینے پر کپڑا گرا دو۔
روح افزا : چڑ جائیں گی۔
حسن آرا : ہاں بہن، بتاؤ تو یہ بات کیا ہے؟ ساس سے بنتی کیوں نہیں تم سے؟
بہار بیگم : ایسی ساس کو تو بس چپکے سے زہر دے دے۔ کچھ کم ستر کی ہونے کو آئیں ابھی خاصی کٹھوتا سی بنی ہیں۔ میرا ہاتھ پکڑ لیں تو چھڑانا مشکل ہو جائے۔ موئی دیونی ہے۔
حسن آرا : کیا یہ بھی کوئی عیب ہے؟
بہار بیگم : ایک دن کا ذکر سنو، کسی کے یہاں سے مہری آئی۔ کچھ میوے لائی تھی۔ وہ اس وقت جھوٹ موٹ قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ مہری نے آ کے مجھ کو سلام کیا اور میوے کی طشتری سامنے رکھ دی۔ بس دن بھر منھ پھلائے رہیں۔
حسن آرا : مگر باتیں تو بڑی میٹھی میٹھی کرتی ہیں۔
بہار بیگم : ایک دن کسی نے ان کو دو چکوترے دیے۔ انھوں نے ایک چکوترا مجھ کو بھیجا اور ایک میری نند کو۔ وہ ان سے بھی بڑھ کر بس کی گانٹھ۔ جا کر ماں سے جڑ دیا کہ بھائی نے ہم کو آدھا سڑا ہوا چکوترا دیا اور بھابھی کو بڑا سا! بس اس پر صبح سے شام تک چرخا کاتتی رہیں۔
حسن آرا : میں ایک بات پوچھوں؟ سچ سچ کہنا، دولہا بھائی تو پیار کرتے ہیں؟
بہار بیگم : یہی تو خیر ہے۔
حسن آرا : دل سے؟
بہار بیگم : دل اور جان سے۔
حسن آرا : بھلا ماں سے بنتی ہے؟
بہار بیگم : وہ خود جانتے ہیں کہ بڑھیا چڑچڑی عورت ہے۔
حسن آرا : بہن، وہ تو بڑی ہیں ہی مگر تم بھی تیزی کے مارے ان کو اور جلاتی ہو، جو مل کے چلو تو وہ تمھارا پانی بھرنے لگیں۔
بہار بیگم : اچھا، تمھیں بتاؤ کیسے مل کے چلوں؟
حسن آرا : اب کی جاؤ جب تو ادب کے ساتھ جھک کر سلام کرو۔

بہار بیگم : کس کو؟

حسن آرا : اپنی ساس کو اور کس کو؟

بہار بیگم : واہ! مر جاؤں مگر سلام نہ کروں مُردار کو۔

حسن آرا : بس یہی تو بری بات ہے۔

بہار بیگم : رہنے دیجیے بس وہ تو ہم کو دیکھ کر جل مریں اور ہم ان کو جھک کر سلام کریں۔ ایک دن ماما سے بولیں کہ ہمارا پان دان اس کو کیوں دے آئیں؟ میرے منھ سے بس اتنی سی بات نکل گئی کہ میری ساس کاہے کو ہیں، یہ تو میری سوت ہیں۔ بس اس پر اتنا بگڑیں کہ توبہ ہی بھلی۔

حسن آرا : بہن، تم نے بھی تو غضب کیا۔ تمھارے نزدیک یہ اتنی سی ہی بات تھی؟ ساس کو سوت بنایا، اور اس کو اتنی سی ہی بات کہتی ہو؟ اگر تمھاری بہو آئے اور تمھیں سوت بنائے تب دیکھوں گی اچھلتی کودتی ہو کہ نہیں؟

سپہرآرا : اف! بڑی بری بات کہی۔

روح افزا : تو اب بن چکی بس۔

بہار بیگم : تم سب کو اس نے کچھ رشوت ضرور دی ہے۔ جب کہتی ہو اسی کی سی۔

سپہرآرا : ہماری بہن، اور ایسی منھ پھٹ! ساس کو سوت بنائے!

حسن آرا : اور پھر شرمائے نہ شرمانے دے۔

بہار بیگم : اچھا بتایئے تو پہلے جھک کے سلام کروں خوب زمین پر سوکر، پھر؟

حسن آرا : میرے تو بہن رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ تم سے یہ کہا کیوں کر گیا۔

بہار بیگم : بتاؤ بتاؤ ہماری قسم بتاؤ۔

حسن آرا : تم ہنسوگی اور ہمیں ہوگا رنج۔

بہار بیگم : نہیں ہنسیں گے نہیں، بولو۔

حسن آرا : جاکر سلام کرو۔

بہار بیگم : جو وہ جواب نہ دیں تو اپنا سا منھ لے کر رہ جاؤں؟

سپہرآرا : واہ! ایسا ہو نہیں سکتا۔

حسن آرا : نہ جواب دیں تو قدموں پر گر پڑو۔

بہار بیگم : میری بیچار گرتی ہے قدموں پر۔ وہ جیسا میرے ساتھ کرتی ہیں ویسا ان کی آنکھوں، گھٹنوں کے آگے آئے۔

حسن آرا : خرچ تو اجلا ہے یا تنگ ی ہے؟

بہار بیگم : تین سو وثیقے کے ہیں ڈھائی سو گاؤں سے آتے ہیں۔ نقد کوئی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ ہی زیادہ ہوگا۔ مکان، باغ، دکانیں الگ ہیں، وکالت میں کوئی چھ سات سو مہینہ ملتا ہے۔

حسن آرا : تم کو کیا دیتے ہیں؟

بہار بیگم : بڑھیا سے چرا کر میرے اوپر کے خرچ کے لیے سو روپے مقرر ہیں۔

سپہر آرا : روح افزا بہن، تمھارے میاں کیا تنخواہ پاتے ہیں؟

روح افزا : چار سو ہوئے ہیں، چار پانچ سو زمین سے مل جاتے ہیں۔

حسن آرا : تمھاری ساس تو اچھی ہیں؟

روح افزا : ہاں، بیچاری بڑی سیدھی ہیں۔ ہاں ان کی لڑکی نے البتہ میری ناک میں دم کر دیا ہے۔ جب آتی ہے روز ماں کو بھرا کرتی ہے۔

سپہر آرا : بہار بیگم جو وہاں ہوتیں تو ان سے بھی نہ بنتی۔

بہار بیگم : اچھا چپ ہی رہیے گا، نہیں تو کاٹ کھاؤں گی۔ بڑی وہ بن کے آئی ہیں۔

اتنے میں کالی کالی گھٹا چھا گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ بہار نے کہا۔ جی چاہتا ہے چھت پر سے دریا کی سیر کریں۔ سب نے کہا ہاں۔ ہاں چلیے۔ مگر حسن آرا کو یاد آ گئی کہ ہمایوں فر ضرور خبر پائیں گے اور کوٹھے پر آ کے ستائیں گے۔ لیکن مجبور تھی۔ چاروں چوکڑیاں بھرتی ہوئی چھت پر جا پہنچیں۔ ہوا اس زور سے چلتی تھی کہ دوپٹہ کھسکا جاتا تھا۔ گورا گورا بدن صاف نظر آتا تھا۔ کسی نے جا کر ہمایوں فر سے کہہ دیا کہ اس وقت تو سامنے والا کوٹھا۔ اندر کا اکھاڑا ہو رہا ہے۔ ان کو تاب کہاں؟ چٹ سے کوٹھے پر آ پہنچے۔ سپہر آرا اوپر کے کمرے میں ہو رہیں۔ روح افزا وہیں بیٹھ گئیں۔ حسن آرا نے ایک چھلانگ بھری تو راوٹی میں۔ مگر بہار بیگم نے بے ڈھب آنکھیں لڑائیں۔ ہمایوں فر نے بہت جھک کر سلام کیا۔

بہار بیگم : آنکھیں ہی پھوٹیں، جو ادھر دیکھے۔

ہمایوں : (ہاتھ کے اشارے سے) اپنا گلا آپ کاٹ ڈالوں گا۔

بہار بیگم : شوق سے۔
ننھی ننھی بوندیں پڑنے لگیں اور چاروں پریاں نیچے چل دیں۔ مرزا ہمایوں فر منھ تا کتے رہ گئے۔
حسن آرا : (بہار سے) آپ تو خوب ڈٹ کے کھڑی ہو گئیں۔
بہار بیگم : کیوں کیا کوئی گھول کر پی جائے گا؟ میں انھیں جانتی ہوں ہمایوں فر تو ہیں۔
سپہر آرا : تم کیوں کر جانتی ہو بہن!
بہار بیگم : اے واہ اور سنیے گا، لڑکپن میں ہم کھیلا کیے ہیں ان کے ساتھ۔ خوب چپتیں جمایا کیے ہیں ان کو! ان کی ماں اور دادی میں خوب جھوٹا مچھوٹا ہوا کرتا تھا۔
اتنے میں ماما نے آ کر کہا : بڑی بیگم صاحبہ نے یہ میوے بھیجے ہیں۔
سپہر آرا : دیکھوں، یہ چلغوزے لیتی جاؤ۔
پیاری : ہم کو دیجیے۔
سپہر آرا : ان کو دیجیے۔ 'پیر نہ شہید، نکٹوں کو چھاپا' سب کے بدلے ان کو دیجیے۔
حسن آرا : اچھا، پہلے سلام کرو۔
چاروں بہنوں نے مزے سے میوے چکھے۔ ایک دوسری کے ہاتھ سے چھین چھین کر کھاتی تھیں۔ جوانی کی امنگ کا کیا کہنا۔
ادھر مرزا ہمایوں فر اپنی چھت پر کھڑے یہ شعر پڑھ رہے تھے۔

نہ مڑ کر بھی بے درد قاتل نے دیکھا
تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے

جب بڑی دیر تک چھت پر کسی کو نہ دیکھا تو یہ شعر زباں پر لائے :

کل بدآموز (رقیب) نے کیا تم کو سکھایا ہے ہائے!
آج وہ آنکھ، وہ چشمک، وہ اشارہ ہی نہیں۔

(45)

ایک دن حسن آرا کو سوجھی کہ آؤ اب کی اپنی بہنوں کو جمع کر کے ایک لیکچر دوں۔ بہار بیگم بولیں، کیا؟ کیا دوگی؟

حسن آرا : لیکچر، لیکچر، لیکچر نہیں سنا کبھی؟

بہار بیگم : لیکچر کیا بلا ہے؟

حسن آرا : وہی جو دولہا بھائی جلسوں میں آئے دن پڑھا کرتے ہیں۔

بہار بیگم : تو ہم کیا تمھارے دولہا بھائی کے ساتھ ساتھ گھوما کرتے ہیں؟ جانے کہاں کہاں جاتے ہیں، کیا پڑھ پڑھ کے سناتے ہیں۔ اتنا ہم کو معلوم ہے کہ شعر بہت کہتے ہیں۔ ایک دن ہم سے کہنے لگے، چلو تم کو سیر کرا لائیں۔ فٹن پر بیٹھ لو۔ رات کا وقت ہے تم دوشالہ سے خوب منھ اور جسم چرا لینا۔ میں نے کانوں پر ہاتھ دھرے کہ نہ صاحب، بندی ایسی سیر سے درگزری۔ وہاں جانے کون کون ہو، ہم نہیں جانے کے۔

سپہر آرا : اب کی آویں تو ان کے ساتھ ہم ضرور جائیں۔

بہار بیگم : چلو، بیٹھو لڑکیاں بہنوئیوں کے ساتھ یوں نہیں جایا کرتیں۔

روح افزا : مگر سنے گا کون؟ دس پانچ لڑکیاں اور بھی تو ہوں کہ ہمی تم ٹٹروں ٹوں؟

سپہر آرا : دیکھیے، میں بلواتی ہوں، ابھی ماما کو بھیجے دیتی ہوں۔

حسن آرا : مگر نظیر کو نہ بلواؤ۔ ان کے ساتھ جانی بیگم بھی آئیں گی وہ بات بات میں شاخیں نکالتی ہیں۔ انھیں خبط ہے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی حسین ہی نہیں۔ 'شکل چڑیلوں کی، ناز پریوں کا'۔ دن رات بناؤ سنوار ہی میں لگی رہتی ہیں۔

سپہر آرا : پھر اچھا تو ہے، بہار بیگم سے بھڑا دینا۔

تھوڑی دیر میں ڈولیوں پر ڈولیاں اور بگھیوں پر بگھیاں آنے لگیں۔ دربان بار بار آواز دیتا تھا سواریاں آئی ہیں۔ لونڈیاں جا جا کر مہمانوں کو سواریوں پر سے اترواتی تھیں اور وے چمک چمک کر اندر آتی تھیں۔ آخر میں جانی بیگم اور نظیر بیگم بھی آئیں۔ جانی بیگم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی آنکھیں ناچتی رہتی تھیں۔ نظیر بیگم بھولی بھالی شرمیلی لڑکی تھی۔ شرم سے آنکھیں جھکی پڑتی تھیں۔ جب سب آ چکیں تو حسن آرا نے اپنا لیکچر سنانا شروع کیا۔

''میری پیاری بہنو، ساس بہوؤں کے جھگڑے، نند بھاوجوں کے بکھیڑے، بات بات پر تکرار، میاں بیوی کی جوتی پیزار سے خدا کی پناہ۔ ان بری باتوں سے خدا بچائے۔ بھلے مانسوں کی بہو بیٹیوں میں ایسی بات نہ آنے پائے۔ اس پھوٹ کی ہماری ہی دیس میں اتنی گرم بازاری ہے کہ ساس کی زبان پر کوسنا جاری ہے، بہو مصروف گریہ و زاری ہے اور میاں

کی عقل ماری ہے۔ نند بھاوج سے منھ پھلائے ہوئے، بھاوج نند سے تیوریاں چڑھائے ہوئے۔ بہو ہچکیاں لے لے کر روتی ہے، ساس زہر کھا کر سوتی ہے۔ اور جو ساس غصّے ور ہوئی اور بہو زبان کی تیز تو مار پیٹ کی نوبت پہنچتی ہے۔ میاں اگر بیوی کی سی کہیں تو اماں کی گھڑکیاں سہے، اماں کی سی کہے تو بیوی کی باتیں سُنے۔ ماں اُدھر بیوی ادھر کان بھرتی ہے وہ ان کے اور یہ ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتی ہیں۔

'مگر تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ساس بھلی ہو، تو بہو کو منا لے، اور بہو آدمی ہو تو ساس کو آدمی بنا لے۔ ایک شریف زادی نے اپنی ماما سے کہا کہ ہماری ساس تو ہماری سوت ہیں۔ خدا جانے ان کی زبان سے یہ بات کیسے نکلی! اس پر بھی انھیں دعویٰ ہے کہ ہم شریف زادی ہیں۔ اگر وہ ہماری رائے پر چلیں تو ان کی ساس انھیں اپنے سر پر بٹھائیں۔ وہ سیدھی جا کر ساس کے قدموں پر گر پڑیں اور آج سے ان کی کسی بات کا جواب نہ دیں۔ کیا ان کی ساس کا سر پھر گیا ہے، یا انھیں باولے کتے نے کاٹا ہے؟ بہو اگر ساس کی خدمت کرے تو دنیا بھر کی ساسوں میں کوئی ایسی نہ ملے جو چھیڑ کر بہو سے لڑے۔

'اب سوچو تو ذرا دل میں اس تکرار اور جوتی پیزار کا انجام کیا ہے؟ گھر میں پھوٹ، ایک دوسرے کی صورت سے بیزار، لونڈیوں باندیوں میں ذلیل، ساری دنیا میں بدنام، گھر تباہ۔ ایک چپ ہزار بلا کو ٹالتی ہے فساد کو جہنم میں ڈالتی ہے۔ ہاں جو یہ خیال ہو کہ ساس ایک کہیں تو دس سنائیں، وہ دو باتیں کہیں تو بیس مرتبہ ان کو الّو بنائیں، تو بس میل ہو چکا۔ ساس نہ ہوئی بھنی مونگ ہوئی۔ آخر اس کا بھی کوئی درجہ ہے یا نہیں؟ یا بس بہو سسرال میں جاتے ہی مالکن بن بیٹھے، ساس کو طاق پر رکھ دے اور میاں پر حکم چلانے لگے؟ اب میں آپ لوگوں سے اتنا چاہتی ہوں کہ سچ سچ اپنی اپنی ساسوں کا حال بیان کیجیے۔

ایک : اللہ کرے، ہماری ساس کو آج رات ہی کو ہیضہ ہو۔

دوسری : اللہ کرے، ہماری ساس کو ہیضہ ہو گیا ہو۔

تیسری : اللہ کرے ہماری ساس ایسی جگہ مرے جہاں ایک بوند پانی نہ ملے۔

بہار بیگم : یا خدا میری ساس کے پاؤں میں باؤلا کتا کاٹے اور وہ بھونک بھونک کر مرے۔

چوتھی : ہم تو اپنی ساس کو پہلے ہی چٹ کر گئے جہنم چلی گئیں۔

پانچویں: ساس تو ساس، ہماری نند نے ناک میں دم کر دیا۔
جانی بیگم: میری ساس تو میرے آگے چوں نہیں کرسکتیں۔ بولیں اور میں نے گلا گھونٹا۔
اس لیکچر کا اور کسی پر تو زیادہ نہیں مگر نظیر بیگم پر بہت اثر ہوا۔ حسن آرا سے بولیں۔ بہن ہم کل سے آیا کریں گے، ہمیں کچھ پڑھاؤ گی؟
حسن آرا: ہاں، ہاں، ضرور آؤ۔
جانی بیگم: اے واہ، یہ کیا پڑھائیں گی بھلا! ہمارے پاس آؤ، تو ہم روز پڑھا دیا کریں۔
نظیر بیگم: آپ کے تو پڑوس ہی میں رہتے ہیں ہم، مگر بہن تم تو ہڑدنگا سکھاتی ہو، دن بھر کوٹھے پر گھوڑے کی طرح دوڑا کرتی ہو کبھی نیچے کبھی اوپر۔
جانی بیگم: (نظیر بیگم کا ہاتھ پکڑ کر) مروڑ ڈالوں ہاتھ۔
نظیر: دیکھا، دیکھا، بس کبھی ہاتھ مروڑا کبھی ڈھکیل دیا۔
جانی بیگم: (نظیر کا گال کاٹ کر) اب خوش ہوئیں؟
سپہر آرا: اے واہ، لے کے گال کاٹ لیا۔
جانی بیگم: پھر عورت ہیں یا مرد ہیں کوئی؟
نظیر بیگم: اب آپ اپنی محبت رہنے دیں۔
جب سب مہمان وداع ہوئے تو چاروں بہنیں مل کر گئیں اور بڑی بیگم کے ساتھ ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا۔ کھاتے وقت یوں گفتگو ہوئی۔
بہار بیگم: حسن آرا کی شادی کہیں تجویز کی؟
بڑی بیگم: ہاں فکر میں تو ہوں۔
بہار بیگم: فکر نہیں اماں جان اب دن دن چڑھتا ہے۔
بڑی بیگم: اپنے جانے تو جلدی کر رہی ہوں۔
بہار بیگم: جلدی کیا دو چار برس میں؟
روح افزا: بہن اللہ اللہ کرو۔
بہار بیگم: بیچاری سپہر آرا بھی تاک رہی ہیں کہ ہم ان کا بھی ذکر کریں۔
سپہر آرا: دیکھیے یہ چھیڑ خانی اچھی نہیں، ہاں!

بڑی بیگم : (مسکرا کر) تم جانو یہ جانیں۔

بہار بیگم : ابھی کل شام ہی کو تو تم نے کہا تھا کہ اماں جان سے ہمارے بیاہ کی سفارش کرو۔ آج مکرتی ہو؟ بھلا کھاؤ تو قسم کہ تم نے نہیں کہا؟

سپہر آرا : واہ، ذرا ذرا سی بات پر کوئی قسم کھایا کرتا ہے!

روح افزا : پانی مرتا ہے کچھ؟

سپہر آرا : جی ہاں، آپ بھی بولیں؟

روح افزا : اچھا، قسم کھا جاؤ نا!

سپہر آرا : کاہے کو کھائیں!

بڑی بیگم : اے تو چڑتی کیوں ہو بیٹی۔

سپہر آرا : اماں جان، جھوٹ موٹ لگاتی ہیں، چڑھیں نہیں؟

روح افزا : کیا! جھوٹ موٹ؟

سپہر آرا : اور نہیں تو کیا؟

روح افزا : اچھا، ہمارے سر کی قسم کھاؤ۔

سپہر آرا : اللہ کرے، میں مر جاؤں۔

روح افزا : چلو بس رو دیں، اب کچھ نہ کہو۔

بہار بیگم : اماں جان، ایک رئیس ہیں ان کا لڑکا کوئی انیس بیس برس کا ہوگا خدا جانتا ہے بڑا حسین ہے آج کل سکندر نامہ پڑھتا ہے۔

بڑی بیگم : کھانے پینے سے خوش ہیں؟

روح افزا : خوش؟ آٹھ تو گھوڑے ہیں ان کے یہاں۔

بہار بیگم : اماں جان، وہ لڑکا حسن آرا کے ہی لائق ہے۔ دو لڑکے ہیں، دونوں لائق ہیں، ہوشیار، نیک چلن، ہمارے یاں دوسرے تیسرے آیا کرتے ہیں۔

روح افزا : ضرور منظور کیجیے۔

بڑی بیگم : اچھا، اچھا سوچ لوں۔

حسن آرا نے یہ بات چیت سنی تو ہوش اڑ گئے۔ خدا ہی خیر کرے۔ یہ دونوں بہنیں اماں جان کو پکّا کر رہی ہیں۔ کہیں منظور کرلیں تو غضب ہی ہوجائے۔ بیچارے آزاد وہاں

مصیبتیں جھیل رہے ہیں اور یہاں جشن ہو۔ اس فکر میں اس سے اچھی طرح کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ رہی اور منھ ڈھانپ کر خوب روئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تینوں بھی آئیں اور حسن آرا کو لیٹے دیکھ کر جھلائیں۔

بہار بیگم : مکر کرتی ہوں گی، سوئیں گی کیا ابھی۔

سپہر آرا : نہیں بہن، یہ تکیے پر سر رکھتے ہی سو جاتی ہیں۔

بہار بیگم : جی ہاں، سن چکی ہوں، ایک تم کو تکیے پر سر رکھتے ہی نیند آجاتی ہے، دوسرے ان کو۔

روح افزا : (گدگدا کر) اٹھو، بہن ہمارا ہی خون پیئے، جو نہ اٹھے۔ میری بہن نہ اٹھ بیٹھو شاباش!

سپہر آرا : سونے دیجیے۔ آنکھیں مارے نیند کے متوالی ہو رہی ہیں۔

بہار بیگم : رسیلی متوالیوں نے جادو ڈالا۔ ہمارے یہاں پڑوس میں روز تعلیم ہوتی ہے۔ مگر ہمارے میاں کو اس کی بڑی چڑھ ہے کہ عورتیں ناچ دیکھیں یا گانا سنیں۔ مردوں کی بھی کیا حالت ہے! گھر کے جورو سے باتیں نہ کریں باہر شیر۔ اللہ جانتا ہے ہم تو ان سب موئی بیشواؤں کو ایک پڑی پر قربان کر دیں۔ ایک نے۔ مسّی کی گھڑی جمائی تھی جیسے بطخ نے کیچڑ کھائی ہو۔

روح افزا : (حسن آرا کو چوم کر) اٹھو بہن۔

حسن آرا : (آنکھیں کھول کر) سر میں درد ہے۔

بہار بیگم :

صندلی رنگوں سے مانا دل ملا
درد سر کی کس کے ماتھے جائے گی

حسن آرا : یہاں ان جھگڑوں میں نہیں پڑتے۔

بہار بیگم : درست

روح افزا : ضرور کسی سے آنکھ لڑائی ہے، اسی سے نیند آئی ہے۔ اچھا اب سچ سچ کہہ دو کس سے دل ملا ہے؟ دل دیجیے تو یار طرح دار دیکھ کر۔

سپہر آرا : اور کیا

معشوق کیجیے تو پری زاد کیجیے

حسن آرا:

کسی سے ملنے کا اب حوصلہ نہیں ہے جاں

بہت اٹھائے مزے ان سے آشنا ہوکر

روح افزا: بس، بہت باتیں نہ بنائیے۔ ہم سب سن چکی ہیں۔ بھلا کسی پر دل نہیں آیا، تو آنکھوں سے آنسو کیوں کر نکلے؟ ذری آئینے میں صورت دیکھیے۔

سپہر آرا: اے بہن، یہ دھان پانِ آدمی، ذری سر میں درد ہوا اور لیٹ رہیں۔

بہار بیگم: لڑکی باتیں بناتی ہے۔ ہم کو چٹکیوں پر اڑاتی ہے۔

حسن آرا: اب آپ جو چاہیں کہیں، یہاں نہ کوئی عاشق ہے نہ کوئی معشوق۔

روح افزا: اڑو نہ، کہہ چلوں سب؟

حسن آرا: ہاں، ہاں کہیے، سو کام چھوڑ کے۔ آپ کو خدا کی قسم۔

روح افزا: اچھا، اس وقت دل کیوں بھر آیا؟

حسن آرا:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں؟

بہار بیگم: (تالیاں بجاکر) کھل گئی نہ بات؟

روح افزا: جادو وہ جو سر پر چڑھ کے بولے۔

حسن آرا: منھ میں زبان ہے جو چاہو بکو۔

بہار بیگم: اچھا، بڑی سچی ہو ایک تو بات کرو۔ ہم ایک ہاتھ میں کوئی چیز لیں اور دوسرا ہاتھ خالی رکھیں۔ مٹھی باندھ کے آئیں اور تم ایک ہاتھ مارو۔ جو خالی ہاتھ پر پڑے تو تم جھوٹی۔ دوسرے ہاتھ پر پڑے تو ہم جھوٹے۔

حسن آرا: اے واہ چھوکریوں کا کھیل۔

روح افزا: اخواہ اور آپ ہیں کیا؟

سپہر آرا: اچھا، آپ آیئے، مگر ہم دونوں ہاتھ دیکھ لیں گے۔

بہار بیگم: ہاں ہاں دیکھ لینا۔

بہار بیگم نے دوسرے کمرے میں جاکر ایک چھوٹی سی شیشی کی گولی داہنے ہاتھ میں رکھی اور بایاں ہاتھ خالی۔ دونوں مٹھیاں خوب زور سے بند کرلیں اور جاکر بولیں، اچھا۔ مارو ہاتھ پر ہاتھ۔

حسن آرا: یہ واہیات باتیں ہیں۔

روح افزا: تو کانپی کیوں جاتی ہو؟

سپہر آرا: باجی، بولو کس ہاتھ میں ہے؟

حسن آرا: اُدھر والے میں۔

سپہر آرا: نہیں باجی، دھوکہ کھاتی ہو۔ ہم تو بائیں ہاتھ پر مارتے ہیں۔

بہار بیگم: (بایاں ہاتھ کھول کر) سلام۔

سپہر آرا: ارے وہ ہاتھ تو دکھاؤ۔

بہار بیگم: دیکھو ہے شیشے کی گولی کہ نہیں؟

حسن آرا: دیکھا! کہا تھا کہ اس ہاتھ میں ہے۔ کہا نہ مانا۔

روح افزا: کہیے اب تو سچ ہے۔

حسن آرا: یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔

بہار بیگم: اچھا بہن اب اتنا بتا دو کہ میاں آزاد کون ہیں؟

حسن آرا: کیا جانیں، کیا واہی تباہی بکتی ہو۔

بہار بیگم: اب چھپانے سے کیا ہوتا ہے بھلا، سن تو چکے ہی ہیں ہم۔

حسن آرا: بتائیں کیا، جب کچھ بات بھی ہو؟

سپہر آرا: ان دونوں بہنوں نے خواب دیکھا تھا کل معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا: ہاں، سچ کہا، خواب دیکھا ہوگا۔

روح افزا: خواب تو نہیں دیکھا مگر سنا ہے کہ صورت شکل میں کروڑوں میں ایک ہیں۔

بہار بیگم: حسن آرا نے تو اپنا جوڑ چھانٹ لیا اب سپہر آرا کا نکاح ہمایوں فر کے ساتھ ہوجائے تو ہم سمجھیں کہ یہ بڑی خوش نصیب ہیں۔

سپہر آرا: میرے تو تلووں کو بھی نہ پہنچیں۔

حسن آرا: طوطی کا کوے سے جوڑ لگاتی ہو؟

بہار بیگم : واہ، چہرے سے نور برستا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ گھنٹوں دیکھا کریں۔ اماں سے آج ہی تو کہوں گی میں۔

حسن آرا : کہہ دیجیے گا، دھمکاتی کیا ہو؟

سپہرآرا : آپ کے کہنے سے ہوتا کیا ہے؟ یہاں کوئی پسند بھی کرے!

روح افزا : انکار کروگی تو پچھتاؤ گی۔

(46)

سویرے حسن آرا تو کچھ پڑھنے لگیں اور بہار بیگم نے سنگار دان منگا کر نکھرنا شروع کیا۔

حسن آرا : بس صبح تو سنگار، شام تو سنگار، کنگھی چوٹی، تیل پھلیل اس کے سوا تمھیں اور کسی چیز سے واسطہ نہیں۔ روح افزا سچ کہتی ہیں کہ تھیں اس کا روگ ہے۔

بہار بیگم : چلو، پھر تمھیں کیا؟ تمھاری باتوں میں خیال بٹ گیا، مانگ ٹیڑھی ہوگئی۔

حسن آرا : ہے ہے،غضب ہوگیا۔ یہاں تو دولہا بھائی بھی نہیں ہیں؟ آخر یہ نکھار دکھاؤ گی کسے؟

بہار بیگم : ہم اٹھ کر چلے جائیں گے،تم چھیڑتی جاتی ہو اور موا چھپکا سیدھا نہیں رہتا۔

حسن آرا : اب تک مانگ کا خیال تھا اب چھپکے کا خیال ہے۔

بہار بیگم : اچھا، ایک دن ہم تمھارا سنگار کردیں، خدا کی قسم وہ جوبن آجائے کہ جس کا حق ہے۔

حسن آرا : پر اب صاف صاف کہلاتی ہو،تم لاکھ بنو ٹھنو ہمارا جوبن خداداد ہوتا ہے، ہمیں بناؤ چنار کی کیا ضرورت بھلا!

بہار بیگم : اپنے منھ میاں مٹھو بن لو۔

حسن آرا : اچھا،سپہرآرا سے پوچھو، جو یہ کہیں وہ ٹھیک۔

سپہرآرا : جس طرح بہار بہن نکھرتی ہیں اس طرح اگر تم بھی نکھرو تو چاند کا ٹکڑا بن جاؤ۔ تمھارے چہرے پر سرخی اور سفیدی کے سوا نمک بھی بہت ہے۔ مگر وہ گوری چٹی ہیں بس نمک نہیں۔

روح افزا : سچی بات تو یہ ہے کہ حسن آرا ہم سب میں بڑھ چڑھ کر ہیں۔

اتنے میں ایک فٹن کھڑکھڑاتی ہوئی آئی، مشقی جوڑی جُتی ہوئی۔ نواب خُرشید علی اتر کر بڑی بیگم کے پاس پہنچے اور سلام کیا۔

بڑی بیگم : آؤ بیٹا، بائیں آنکھ جب پھڑکتی ہے تب کوئی نہ کوئی آتا ضرور ہے۔ اس دن آنکھ پھڑکی تو لڑکیاں آئیں یہ روح افزا کی کیا حالت ہوگئی ہے؟

نواب صاحب : اب تو بہت اچھی ہیں۔ مگر پرہیز نہیں کرتیں۔ تیتا مرچ نہ ہو تو کھانا نہ کھائیں، پھر بھلا اچھی کیوں کر ہوں؟

یہاں سے باتیں کرکے نواب صاحب اس کمرے میں پہنچے جس میں چاروں بہنیں بیٹھی تھیں۔ نواب صاحب کا لباس دیکھیے، جراب خاکی رنگ کا، گھٹنا چست، کرتا سفید فلالین کا۔ اس پر سیاہ بنات کا دگلا اور ہری گرنٹ کی گوٹ۔ بانکی نکّے دار ٹوپی۔ پاؤں میں سیاہ وارنش کا بوٹ، ایک سفید دلائی اوڑھے ہوئے۔ حسن آرا اور سپہرآرا نے نیچی گردن کرکے بندگی کی۔ روح افزا نے کہا آپ بے اطلاع کیے ہمارے کمرے میں کیوں چلے آئے صاحب؟

نواب صاحب : حکم ہو تو لوٹ جاؤں۔

بہار بیگم : شوق سے۔ بن بلائے کوئی نہیں آتا، لو سپہرآرا اب ان کے ساتھ بگّھی پر ہوا کھانے جاؤ۔

سپہرآرا : واہ کیا جھوٹ موٹ لگاتی ہو۔ بھلا میں نے کب کہا تھا؟

روح افزا : ہم گواہ ہیں۔

نواب صاحب : اچھا، پھر اس میں عیب ہی کیا ہے؟

اتنے میں روح افزا ایک شیشے کی طشتری میں چکنی ڈلیاں رکھ کر لائیں۔ نواب صاحب نے دو اٹھا کر کھا لیں اور 'آ کھ تھو، آ کھ تھو' کرتے کرتے بولے پانی منگاؤ خدا کے واسطے۔

وہ چکنی ڈلی اصل میں مٹی کی تھی۔ چاروں بہنوں نے قہقہہ لگایا اور وہ حضرت بہت جھینپے۔ جب منھ دھو چکے تو سپہرآرا نے ایک گلوری دی۔

نواب صاحب : (گلوری کھول کر) اب بے دیکھے بھالے کھانے والے کی ایسی تیسی۔ کہیں اس میں مرچیں نہ جھونک دی ہوں۔ اس وقت تو بھوک لگی ہوئی ہے۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

حسن آرا : باسی کھیر کھائیے تو لاؤں؟

نواب صاحب : نیکی اور پوچھ پوچھ؟

حسن آرا جا کر ایک قلفی اٹھا لائی۔ نواب صاحب نے بڑی خوشی سے لی، مگر کھولتے ہیں تو مینڈھکی اچک کر نکل پڑی۔

نواب صاحب : خوب! یہ روح افزا سے بھی بڑھ کر نکلیں۔ 'بڑی بی تو بڑی بی، چھوٹی بی سبحان اللہ'۔

رات کو نواب صاحب آرام کرنے گئے تو بہار بیگم نے پوچھا، کہو تمھاری اماں جان تو جیتی ہیں، یا ڈھلک گئیں؟

نواب صاحب : کیا بے تکی اڑاتی ہو، خواہ مخواہ دل دکھاتی ہو، ایسی باتیں کرتی ہو کہ سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

بہار بیگم : ہاں ان کی تو محبت پھٹ پڑی ہے تم کو، بتیس دھار کا دودھ پلایا ہے کہ نہیں!

نواب صاحب : اسی سے آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

بہار بیگم : تو کیوں آئے؟ کیا چکلا نگوڑا اجڑ گیا ہے؟ یا بازار میں کسی نے آگ لگا دی؟

نواب صاحب : اچھا، اس وقت تو خدا کے لیے یہ باتیں نہ کرو۔ کوئی چھ دن کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔

بہار بیگم : کیا کہیں آج اور ٹھکانہ نہ لگا؟

نواب : تم تو جیسے لڑنے پر تیار ہو کر آئی ہو۔

بہار بیگم : کیوں؟ آج پراٹن صاحب نہ بنوگے؟ کوٹ پتلون پہن کے نہ جاؤ گے؟ مجھ سے اڑتے ہو!

نواب صاحب رنگین مزاج آدمی تھے۔ بہار بیگم کو ان کے سیر سپاٹے بُرے معلوم ہوتے تھے۔ اسی سبب سے کبھی کبھی میاں بیوی میں چخ چل جاتی تھی۔ مگر اب کی مرتبہ بہار بیگم نے ایک ایسی بات سنی تھی کہ آنکھوں سے خون برسنے لگا تھا۔ ایک دن نواب صاحب کوٹ پتلون ڈاٹ کر ایک بنگلے پر جا پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے آدمی نے آکر پوچھا— آپ کہاں سے آتے ہیں؟ آپ نے کہا— ہمار نام پراٹن صاحب ہے۔ میم صاحب کو بلاؤ۔ اب سنیے، ایک کنجڑن جو پڑوس میں رہتی تھی، وہاں ترکاری بیچنے گئی ہوئی تھی۔ وہ ان حضرت کو پہچان گئی اور گھر میں آکر بہار بیگم سے کچا چٹھا کہہ سنایا۔ بیگم سنتے ہی آگ بھبھوکا ہوگئیں اور سوچی کہ

آج تو آنے دو، کیسا آڑے ہاتھوں لیتی ہوں کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے۔ مگر اسی دن یہاں چلی آئیں اور بات جیوں کی تیوں رہ گئی۔ بھری تو بیٹھی ہی تھیں، اس وقت موقع ملا، تو اُبل پڑیں۔ نواب نے جو پتے پتے کی سنی، تو سناٹے میں آ گئے۔

بہار بیگم : کہیے پراٹن صاحب، مزاج تو اچھے ہیں؟

نواب صاحب : تم کیا کہتی ہو؟ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا کچھ۔

بہار بیگم : ہاں، ہاں، آپ کیا سمجھیں گے۔ ہم ہندوستانی اور آپ خاص ولایت کے پراٹن صاحب! ہماری بولی آپ کیا سمجھیں گے؟

نواب صاحب : کہیں بھنگ تو نہیں پی گئی ہو؟

بہار بیگم : اب بھی نہیں شرماتے؟

نواب صاحب : خدا گواہ ہے، جو کچھ سمجھ میں بھی آیا ہے۔

بہار بیگم : جلائے جاؤ اور پھر کہو کہ دھواں نہ نکلے۔ میں کیا جانتی تھی کہ تم پراٹن صاحب بن جاؤ گے!

ادھر تو میاں بیوی میں نوک جھونک ہو رہی تھی، ادھر ان کی سالیاں دروازے کے پاس کھڑی چپکے چپکے جھانکتیں اور ساری داستان سن رہی تھیں۔ مارے ہنسی کے رہا نہ جاتا تھا۔ آخر جب ایک مرتبہ بہار نے زور سے نواب کا ہاتھ جھٹک کر کہا— آپ تو پراٹن صاحب ہیں، میں آپ کو اپنے گھر میں نہ گھسنے دوں گی— تو سپہر آرا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بہار نے ہنسی کی آواز سنی تو دھک سے رہ گئی۔ نواب بھی ہکا بکا ہو گئے۔

نواب صاحب : تمھاری بہنیں بڑی شوخ ہیں۔

روح افزا : بہن، سلام!

سپہر آرا : دلہا بھائی، بندگی عرض۔

حسن آرا : میں بھی پراٹن صاحب کو آداب عرض کرتی ہوں۔

نواب صاحب : سمجھا دو، یہ بری بات ہے۔

سپہر آرا : بگڑتے کیوں ہو پراٹن صاحب!

بہار بیگم : (کمرے سے نکل کر) اے، تو اب بھاگی کہاں جاتی ہو؟

روح افزا : بہن، اب جائیے۔ پراٹن صاحب سے باتیں کریے۔

بہار بیگم : آؤ آؤ تمھیں خدا کی قسم۔

سپہر آرا : کوئی اپنا بھائی بند ہو، تو آئیں۔ بھلا پراٹن صاحب کو کیا منھ دکھائیں؟

نواب صاحب : اس پراٹن کے نام نے تو ہمیں خوب جھنڈے پر چڑھایا۔ کیسے رسوا ہوئے!

بہار بیگم : اپنی کرتوتوں سے۔

سپہر آرا : اب تو قلعئی کھل گئی۔

تینوں بہنوں نے نواب صاحب کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ بے چارے بہت جھینپے۔ جب وِے چلی گئیں، تو بہار بیگم نے بھی پراٹن صاحب کا قصور معاف کر دیا۔

دلوں میں کہنے سننے سے عداوت آ ہی جاتی ہے
جب آنکھیں چار ہوتی ہیں، محبت آ ہی جاتی ہے

(47)

آج ہم ان نواب صاحب کے دربار کی طرف چلتے ہیں، جہاں خوجی اور آزاد نے مہینوں مصاحبت کی تھی اور آزاد بٹیر کی تلاش میں مہینوں سیر سپاٹے کرتے رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ نواب صاحب ایک مَسند پر شان سے بیٹھے ہوئے تھے۔ اردگرد مصاحب لوگ بیٹھے ھُقّے گڑگڑاتے تھے۔ بی اللہ رکھی بھی جا کر مَسند کا کونا دبا کر بیٹھیں۔

نواب صاحب : یوں آیئے، بی صاحب!

اللہ رکھی : (کھسک کر) بہت خوب!

مصاحب : (دوسرے مصاحب کے کان میں) کیا زمانہ ہے، واہ! ہم شریف اور شریف کے لڑکے اور یہ عزّت کی جوتیوں پر بیٹھے ہیں۔ کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔

ندرت : یار، کیا کہیں، ابّا جان چھکلے دار تھے، جس کا چاہا، بھُقّا سا سر اڑا دیا۔ ڈنکا سامنے بجتا تھا۔ انھیں آنکھوں کے سامنے دونوں طرف آدمی جھک جھک کر سلام کرتے تھے، اور انھیں آنکھوں یہ بھی دیکھ رہیں کہ بیسوا آ کر مسند پر بیٹھ گئی اور ہم نیچے بیٹھے ہیں۔ واہ ری قسمت! پھوٹ گئی۔

نواب صاحب : آپ کا نام کیا ہے بی صاحب؟

اللہ رکھی : حضور، مجھے اللہ رکھی کہتے ہیں۔

نواب صاحب : کیا پیارا نام ہے!

نُدرت : حضور، چاہے آپ برا مانیں یا بھلا، ہم تو بیچ کھیت کہیں گے کہ آپ کے یہاں شریفوں کی قدر نہیں۔ غضب خدا کا، یہ ٹکے کی بازاری عورت مسند پر آکے بیٹھ جائے اور ہم شریف لوگ ٹھوکریں کھائیں! آسمان نہیں پھٹ پڑتا! کیسے کیسے گوکھے رئیس جمع ہیں دنیا میں۔

اتنا کہنا تھا کہ حافظ جی بگڑ کھڑے ہوئے اور لپک کے ندرت کے منھ پر ایک لپڑ جمایا۔ وہ آدمی تھے کرارے، لپڑ کھاتے ہی آگ ہو گئے۔ جھپٹ کے حافظ جی کو دے پٹکا۔ اس پر کل مصاحب اور ہوالی موالی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ایک : چھوڑ دے بے!

دوسرا : اتنی لاتیں لگا گا کہ بھُرکس نکل جائے گا۔

تیسرا : مردک، جس کا نمک کھاتا ہے، اسی کو گالیاں سناتا ہے؟

نواب صاحب : نکال دو اسے باہر۔

حافظ : دیکھیے تو نمک حرام کی باتیں!

نواب : آج سے دربار میں نہ آنے پائے۔

تین چار آدمیوں نے مل کر حافظ جی کو چھڑایا۔ دربار میں ہلّڑ مچا ہوا تھا۔ اللہ رکھی کھڑے کھڑے تھرتھراتی تھی اور نواب صاحب ان کو دلاسہ دیتے جاتے تھے۔

ایک : مصاحب : (اللہ رکھّی سے) اے حضور، آپ نہ گھبرائیں۔

دوسرا : مصاحب : واللہ بی صاحبہ، جو آپ پر ذرا بھی آنچ آنے پائے۔

نواب : تم تو میری پناہ میں ہو جی!

اللہ رکھی : جی ہاں، مگر خوف معلوم ہوتا ہے۔

نواب : ابھی اس موذی کو یہاں سے نکلوائے دیتا ہوں۔

حافظ : حضور، وہ باہر کھڑے سب کو گالیاں دے رہے ہیں۔

سب نے مل کر میاں ندرت کو باہر تو نکال دیا، پر وہ ٹرّا آدمی تھا، باہر جا کر اینڑی بینڑی سنانے لگا— ایسے رئیس پر آسمان پھٹ پڑے، جو ان ٹکے ٹکے کی عورتوں کے شریفوں سے اچھا سمجھے۔ کسی زمانے میں ہم بھی ہاتھی نشین تھے۔ چودہ چودہ ہاتھی ہمارے دروازے پر

جھومتے تھے۔ آج اس نوبڑھ رئیس نے ہم کو فرش پر بیٹھایا اور مال زادی کو مسند پر جگہ دی۔ خدا اس مردک سے سمجھے!

نواب صاحب : یہ کون غل مچا رہا ہے؟

ایک : مصاحب : وہی ہے حضور۔

دوسرا : مصاحب : نہیں حضور، وہ کہاں! وہ بھاگا پتّا توڑ۔ یہ کوئی فقیر ہے۔ بھوکوں مرتا ہے۔

نواب : کچھ دلوا دو بھائی!

ایک مصاحب نے داروغہ جی کو بلایا اور ان سے دس روپے لے کر باہر چلا۔ جب اس کے لوٹ آنے پر بھی باہر کا شور نہ بند ہوا، تو نواب نے خدمت گار کو بھیجا کہ دیکھ، اب کون چلّا رہا ہے؟ خدمت گار نے باہر جا کر جو دیکھا، تو میاں ندرت کھڑے گالیاں سنا رہے ہیں۔ جب وہ نواب صاحب کے پاس جانے لگا، تو داروغہ جی نے اسے روک کر سمجھایا— اگر تم نے ٹھیک ٹھیک بتلا دیا، تو ہم تم کو مار ہی ڈالیں گے۔ خبردار، یہ نہ کہنا کہ میاں ندرت گالیاں دے رہے ہیں۔ بلکہ یوں بیان کرنا کہ وہ فقیر تو دس روپے لے کر چل دیا، مگر اور کئی فقیر، جو اس وقت وہاں موجود تھے، آپ کو دعائیں دے رہے ہیں۔ ان کا سوال ہے کہ حضور کے دربار سے کچھ انھیں بھی ملے۔

نواب صاحب نے یہ سنا، تو انھیں یقین آ گیا۔ بے چارے بھولے بھالے آدمی تھے، حکم دیا کہ اسی وقت سب فقیروں کو انعام ملے، کوئی دربار سے نامراد نہ لوٹے، ورنہ میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔

حافظ : داروغہ جی، ان فقیروں کو چالیس روپے دے دیجیے۔

نواب : کیا، چالیس! بھلا سو روپے تو تقسیم کرو!

مصاحب : اے، خدا سلامت رکھے۔

حافظ : واہ واہ، کیوں نہ ہو میرے نواب!

داروغہ نے سو روپے لیے اور باہر نکلے۔ کئی مصاحب بھی ان کے ساتھ ساتھ باہر آ پہنچے۔

ایک : ایسے غوثِ رئیس کہاں ملیں گے؟

دوسرا : کیا پاگل ہے، واللہ۔

داروغہ : کہہ دیں کہ دے آئے۔

حافظ : بے وقوف، کاٹھ کا الو۔

داروغہ : کہہ دیں گے کہ دے آئے۔

حافظ : لیکن جو پھر غل مچائے؟

داروغہ : اجی، اس کو نکال باہر کر دو۔ دو دھکّے۔

سب نے میاں ندرت کو گھیر لیا اور کوسوں تک رگیدتے ہوئے لے گئے۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے چلے۔ اللہ رکھی کو بھی خوب کوسا۔

نواب نے لاکھوں قسمیں دیں کہ اللہ رکھی کھانا کھائیں اور کچھ دن اسی باغیچے میں آرام سے رہیں، مگر اللہ رکھی نے ایک نہ مانی۔ میاں ندرت کا اسے بار بار طعنے دینا، اسے ٹکے کی عورت اور بیسوا کہنا اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

نواب : سچ کہیے بی صاحبہ، آخر آپ کیوں اس قدر رنجیدہ ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی خطا ہوئی ہو، تو معاف کرو۔

اللہ رکھی : جانے ہمیں اس وقت کیا یاد آیا۔ آپ سے کیا بتائیں دل ہی تو ہے۔

نواب : مجھ سے تو کوئی قصور نہیں ہوا۔

اللہ رکھی : حضور، یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ ہماری سی بے حیا زندگی کسی کی نہ ہو۔ ماں باپ نے اندھے کنوئیں میں ڈھکیل دیا، آپ چین سے اڑایا کیے، ہمیں بھاڑ میں جھونک گئے۔ ہمارے بوڑھے میاں شادی کرتے ہی دوسرے شہر میں جا بسے۔ ہم ان کے نام کو رو بیٹھے۔ جب وہ انٹاغفیل ہو گئے، تو ہماری ماں نے بڑا جشن کیا اور ایک دوسرے لڑکے سے شادی ٹھہرائی۔ مگر اماں سے کسی نے کہہ دیا— خبردار، لڑکی کو اب نہ بیاہنا، بھلے مانسوں میں بیوہ کا نکاح نہیں ہوتا۔ بس، اماں چٹ سے بدل گئیں۔ آخر میں ایک رات کو گھر سے نکل بھاگی۔ لیکن اس دن سے آج تک جیسی پاک پیدا ہوئی تھی، ویسی ہی ہوں۔ آج اس آدمی نے جو مجھے ٹکے کی عورت اور بیسوا بنایا، تو میرا دل بھر آیا۔ قسم لے لیجیے، جو میاں آزاد کے سوا کسی سے کبھی آنکھیں لڑی ہوں۔

نواب : کون، کون؟ کس کا نام تم نے لیا؟
حافظ : اچھا پتہ لگا۔ وہ تو نواب صاحب کے دوست ہیں۔
نواب : ہم کو ان کی خبر ملے، تو فوراً بلوا لیں۔
اللہ رکھی : وہ تو کہیں باہر گئے ہیں۔ کچھ دنوں ہماری سرائے میں ٹھہرے تھے۔ اچھے خوبصورت جوان ہیں۔ ان کو ایک بھولے بھالے نواب مل گئے تھے۔ نواب نے ایک بٹیر پالا تھا۔ میاں آزاد نے اسے کابک سے نکال کر چھپا لیا۔ نواب کے مصاحبوں نے بٹیر کی خوب تعریفیں کیں۔ کسی نے کہا، قرآن پڑھتا تھا، کسی نے کہا، روزے رکھتا تھا۔ سب نے مل کر نواب کو الّو بنا لیا۔ میاں آزاد کو اونٹنی دی گئی کہ جا کر بٹیرے ڈھونڈ لاؤ۔ آزاد اونٹنی لے کر ہمارے یہاں بہت دن تک رہے۔

نواب صاحب مارے شرم کے گڑھے جاتے تھے۔ عمر بھر میں آج ہی تو انھیں خیال آیا کہ ایسے مصاحبوں سے نفرت کرنا لازم ہے۔ مصاحبوں نے لاکھ لاکھ چاہا کہ رنگ جمائیں مگر نواب اور بھی بددماغ ہو گئے۔

نواب : وہ بھولا بھالا نواب میں ہی ہوں۔ آپ نے اس وقت میری آنکھیں کھول دیں۔

مصاحب : غریب پرور، خدا جانتا ہے، ہم لوگ کٹ مرنے والے ہیں۔
نواب : بس، ہم سمجھ گئے۔
حافظ : حضور، توپ دم کر دیجیے، جو ذرا خطا ہو۔ ہم لوگ جان دینے والے آدمی ہیں۔
نواب : بس، چڑھاؤ نہیں۔ اب قلعی کھل گئی۔
مصاحب : خدا جانتا ہے۔
نواب : اب قسمیں کھانے کی کچھ ضرورت نہیں۔ جو ہوا سو ہوا، آگے سمجھا جائے گا۔
اللہ رکھی : جو مجھ کو معلوم ہوتا، تو یہ ذکر ہی کبھی نہ کرتی۔
نواب : خدا کی قسم، تم نے مجھ پر اور میرے باپ پر، دونوں پر اس وقت احسان کیا۔ تم ذکر نہ کرتیں، تو میں ہمیشہ اندھا بنا رہتا، تم نے تو اس وقت مجھے جلا لیا۔
مصاحب : جس نے جو کہہ دیا، وہی حضور نے مان لیا۔ بس، یہی تو خرابی ہے۔ ذرا ہماری خدمتوں کو دیکھیں، تو ہم کو موتیوں میں تولیں— قسم خدا کی— موتیوں میں تولیں۔

نواب : میرا بس چلے، تو تم سب کو کالے پانی بھیج دوں۔ اور اوپر سے باتیں بناتے ہو؟ بٹیر بھی روزہ رکھتے ہیں؟

حافظ : خداوند، خدا کی خدائی میں کیا کچھ بعید ہے۔

نواب : چلو بس، خدائی میں دخل نہ دو۔ معلوم ہوا، بڑے دیندار ہو۔ میرا بس چلے، تو تم کو ایسی جگہ قتل کروں، جہاں پانی تک نہ ملے۔

حافظ : اگر کوئی قصور ثابت ہو، تو قتل کر ڈالیے۔

مصاحب : خداوند، وہ آزاد ایک ہی گرگا ہے، بڑا دغاباز۔

اللہ رکھی : بس، بس، ان کو نہ کچھ کہیے۔ ان کا سا آدمی کوئی ہو تو لے!

نواب : کیا شک ہے۔ خیر، اب بھی سویرا ہے، سستے چھوٹے۔

اللہ رکھی : چھٹے تو سستے۔ اے ہاں، یہ کہاں کی نمک حلالی ہے کہ بٹیر کو روزہ دار اور نمازی بنا دیا؟ جو سنے گا، کیا کہے گا؟

نواب : نمک حلال کے بچے بنے ہوئے ہیں!

مصاحب : خداوند! جو چاہے، کہہ لیجیے، ہم لوگ حجت اور تکرار تھوڑے ہی کر سکتے ہیں۔

نواب : اجی، تم تو زہر دے دو، سنکھیاں کھلا دو۔ خوب دیکھ چکا۔

اللہ رکھی : ایسے بے ایمانوں سے خدا بچائے۔

مصاحب : ہاں، مسند پر بیٹھ کر جو چاہے کہہ لو۔ بازار میں جھوٹم جھوٹ کرتی پھرتی ہو، اور یہاں آکے باتیں بناتی ہو۔

نواب : بس، زبان بند کرو۔ میرا دل کھٹا ہو گیا۔

مصاحب : جو ہم خطاوار ہوں تو ہمارا خوا ہم سے سمجھیں۔ ذرا بھی کسی بات میں نمک حرامی کی ہو، تو ہم پر آسمان پھٹ پڑے۔ حضور چاہے نہ مانیں، مگر دنیا کہتی ہے کہ جیسے مصاحب حضور کو ملے ہیں، ویسے بڑے خوش قسمتوں کو ملتے ہیں۔

نواب : یوں کہو ں کہ جس کی قسمت پھوٹ جاتی ہے، اس کو تم جیسے گرگے ملتے ہیں۔ بس، آپ لوگ بوریا بدھنا اٹھائیے اور چلتے پھرتے نظر آیئے۔

مصاحب : حضور، مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑیں گے، نہ چھوڑیں گے۔

حافظ : یہ دامن چھوڑ کر کہاں جائیں؟

مرزا : کہیں ٹھکانہ بھی ہے؟

حافظ : ٹھکانہ تو سب کچھ ہو جائے، مگر چھوڑ کر جانے کو بھی جب جی چاہے۔ جس کا اتنے دن تک نمک کھایا، اس سے بھلا الگ ہونا کیسے گوارہ ہو؟ مار ڈالیے، مگر ہم تو اس ڈیوڑھی سے نہیں جانے کے۔ یہ در اور یہ سر۔ مریں بھی، تو حضور ہی کی چوکھٹ پر، اور جنازہ بھی نکلے، تو اسی دروازے سے!

نواب : باتیں نہ بناؤ۔ جہاں سینگ سمائے، چلے جاؤ۔

حافظ : حضور کو خدا سلامت رکھے۔ جہاں حضور کا پسینہ گرے، وہاں ہمارا خون ضرور گرے گا۔

مگر نواب صاحب ان چکموں میں نہ آئے۔ خدمت گاروں کو حکم دیا کہ ان سبھوں کو پکڑ کر باہر نکال دو۔ اگر نہ جائیں، تو ٹھوکر مار کر نکال دو۔

اب بی اللہ رکھی کا بھی حال سنیے۔ ان کو میاں ندرت کی باتوں کا ایسا قلق ہوا، دل پر ایسی چوٹ لگی کہ اپنے کل زیور اور اسباب بیچ کر بستی کے باہر ایک ٹیلے پر فقیروں کی طرح رہنے لگیں۔ قسم کھا لی کہ جب تک آزاد روس سے نہ لوٹیں گے، اسی طرح رہوں گی۔

(48)

جس جہاز پر میاں آزاد اور خوجی سوار تھے، اسی پر ایک نوجوان انگریز افسر اور اس کی میم بھی تھی۔ انگریز کا نام چارلس ہیلٹن تھا اور میم کا وینیشیا۔ آزاد کو اداس دیکھ کر وینیشیا نے اپنے شوہر سے پوچھا— اس جنٹل مین سے کیونکر پوچھیں کہ یہ بار بار لمبی سانسیں کیوں لے رہا ہے؟

صاحب : تم ایسے ویسے آدمیوں کو جنٹل مین کیوں کہتی ہو؟ یہ تو نگر (کالا آدمی) ہے۔

میم : نگر تو ہم حبشی کو کہتے ہیں۔ یہ تو گورا چٹا، خوبصورت آدمی ہے۔

صاحب : تو کیا خوبصورت ہونے سے ہی کوئی جنٹل مین ہو جاتا ہے؟ انگلینڈ کے سب سپاہی گورے ہوتے ہیں، تو کیا اس سے وہ سب کے سب جنٹل مین ہو گئے؟

میم : تم تو اپنی دلیل سے آپ قائل ہو گئے۔ جب گورے چمڑے سے کوئی جنٹل مین نہیں ہوتا، تو پھر تم سب کیوں جنٹل مین کہلاؤ؟ اور ان لوگوں کو نگر کیوں کہو؟ واہ، اچھا انصاف

ہے!

اتنے میں جہاز کے ایک کونے سے آواز آئی کہ او گیدی، نہ ہوئی کرولی، نہیں تو لاش پھڑکتی ہوتی۔

میاں آزاد ڈرے کہ ایسا نہ ہو، میاں خوجی کسی انگریز سے لڑ پڑیں، افیم کی لہر میں کسی سے بے وجہ جھگڑ پڑیں۔ قریب جاکر پوچھا— یہ کیوں بگڑے جی، کس پر غل مچایا؟

خوجی : اجی، جاؤ بھی، یہاں شکار ہاتھ سے جاتا رہا۔ واللہ، گرفتار ہی کر لیا تھا۔ گیدی کو پاتا، تو اتنی کرولیاں لگتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ مگر میرا پاؤں پھسل گیا اور وہ نکل گیا۔

آزاد : تمھیں ایک آنچ کی ہمیشہ کسر رہ جاتی ہے۔ یہ تھا کون؟

خوجی : تھا کون، وہی بہروپیا! اور کس کو پڑی تھی بھلا!

آزاد : بہروپیا

خوجی : جی ہاں بہروپیا۔ بڑا تعجب ہوا آپ کو؟

آزاد : بھئی ہاں، تعجب کہیں لینے جانا ہے۔ کیا بہروپیا بھی جہاز پر سوار ہو لیا ہے؟ بڑا لاگو ہے بھئی؟

خوجی : سوار نہیں ہوا، تو آیا کہاں سے؟

آزاد : کیا سوتے ہو خوجی، یا پینک میں ہو؟

خوجی : خوجی کی ایسی کی تیسی۔ پھر تم نے خوجی کہا ہم کو!

آزاد : معاف کرنا بھئی، قصور ہوا۔

خوجی : واہ، اچھا قصور ہوا! کسی کے جوتے لگائیے اور کہیے، قصور ہوا۔ جب دیکھو، خوجی خوجی۔

آزاد : اچھا جناب خواجہ صاحب، اب تو راضی ہوئے! یہ بہروپیا کہاں سے آگیا؟

خوجی : ارے صاحب، اب تو خواب میں بھی آنے لگے۔ ابھی میں سوتا تھا، آپ آ پہنچے۔ میرے ہاتھ میں اس وقت افیم کی ڈبیا تھی۔ پھینک کے ڈبیا اور لے کے کٹارہ جو پیچھے جھپٹا، تو دو کوس نکل گیا۔ مگر شامت یہ آئی کہ ایک جگہ ذرا سا پانی پڑا تھا۔ میری تو جان ہی نکل گئی۔ پھسلا، تو آرا۔ را۔ را۔ دھوں!

آزاد : کیا گر پڑے؟ جاؤ بھی!

خوجی : بس، کچھ نہ پوچھیے۔ میرا گرنا ایسا معلوم ہوا، جیسے ہاتھی پہاڑ سے گرا۔ دھڑام دھڑام!

آزاد : اس میں کیا شک! آپ کے ہاتھ پاؤں ہی ایسے ہیں۔ وہ تو کہیے، بڑی خیریت گزری۔

خوجی : اور کیا، مگر جاتا کہاں ہے گیدی۔ رگید کے ماروں یہاں، پلٹن میں صوبے داری کر چکے ہیں۔

میم اور صاحب، دونوں میاں آزاد اور خوجی کی باتیں سن رہے تھے۔ صاحب تو اردو خوب سمجھتے تھے، مگر میم صاحب کوری تھیں۔ صاحب نے ترجمہ کر کے بتایا، تو وینشیا بھی مارے ہنسی کے لوٹ گئی۔ یہ اِنچ بھر کا آدمی، ایک ایک ماشے کے ہاتھ پاؤں، اور آپ کے گرنے سے اتنی بڑی آواز ہوئی کہ جیسے ہاتھی گرے!

صاحب : سڑی ہے کوئی۔ جانے کیا واہی تباہی بکتا ہے۔

میم : تم چپ رہو۔ ہم اس جنٹل مین سے پوچھتے ہیں، یہ کون پاگل ہے۔

صاحب : اچھا، مگر ہندوستانی بدتمیز ہوتے ہیں۔ تم اس سے باتیں نہ کرو۔

میم : اچھا، تمھیں پوچھو۔

اس پر صاحب نے انگلی کے اشارے سے آزاد کو بلایا۔ آزاد بھلا کب سننے والے تھے۔ بولے ہی نہیں۔ صاحب پلٹنی آدمی، چہرہ مارے غصے کے لال ہو گیا۔ خیال ہوا کہ وینشیا تالیاں بجائے گی کہ ایک نگر تک مخاطب نہ ہوا، بات کا جواب تک نہ دیا۔ وینشیا نے جب یہ حالت دیکھی تو اٹھلاتی اور مسکراتی ہوئی میاں آزاد کی طرف گئی۔ آزاد لیڈیوں سے بولنے چالنے کے عادی تو تھے ہی، ایک خوبصورت لیڈی کو آتے دیکھا، تو ٹوپی اتار کر سلام کیا اور پوچھا— آپ کہاں تشریف لے جائیں گی؟

میم : گھر جا رہی ہوں۔ یہ ٹھگنا آدمی کون ہے؟ خوب باتیں کرتا ہے۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

آزاد : جی ہاں، بڑا مسخرہ ہے۔

میم : چارلی، یہ تو کہتے ہیں وہ بونا مسخرہ ہے۔

صاحب : اس کی باتیں بڑے مزے کی ہوتی ہیں۔

صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آزاد کی ڈیل ڈول دیکھ کر ڈر گئے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اتنے میں جہاز پر ایک دل لگی باز کو سوجھی کہ آؤ، خوجی کو بنائیں۔ دو چار اور شہدے اس سے مل گئے۔ جب دیکھا کہ میاں خوجی پینک میں سو گئے، تو ایک آدمی نے دو لا لال مرچیں ان کی ناک میں ڈال دیں۔ خوجی نے جو آنکھ کھولی، تو مارے چھینکوں کے بوکھلا گئے۔ باولے کتے کی طرح ادھر اُدھر دوڑنے لگے۔ میم اور صاحب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔

آزاد : جناب خواجہ صاحب!

خوجی : بس، الگ رہیے گا، آک چھیں!

آزاد : آخر یہ ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ تو!

خوجی : چلیے، آپ کو کیا، چاہے جو کچھ ہوا! آ ......چھیں!

آزاد : یار یہ اسی بہروپیا کی شرارت ہے۔

خوجی : دیکھیے تو، کتنی کرولیاں بھونکی ہوں کہ آ ......چھی۔ یاد ہی تو کرے— چھیں۔

آزاد : مگر تم تو گر گر پڑتے ہو میاں! ایک دفعہ جی کڑا کر کے پکڑ کیوں نہیں لیتے؟

خوجی : ناک میں مرچیں ڈال دیں گیدی نے۔

آزاد : اب کی آپ ناک میں بیٹھے رہیے، بس، آتے ہی پکڑ لیجیے۔ مگر ہے بڑا شریر، سچ مچ ناک میں دم کر دیا۔

خوجی : کچھ ٹھکانہ ہے! ناک میں مرچیں جھونکنے کی کون سی دل لگی ہے؟

آزاد : اور کیا صاحب، یہ بیجا بات ہے۔

خوجی : بیجا و بیجا کے بھروسے نہ رہیے گا، میں کسی دن ہاتھ پاؤں ڈھیلے کر دوں گا۔ کہاں کے بڑے کڑے خاں ہیں آپ! میں نے صوبے داری کی ہے۔

آزاد : تو آپ میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے کرتے ہیں؟ میں نے تو آپ کا کچھ بگاڑا نہیں۔

خوجی : (آنکھیں کھول کر) ارے! یہ آپ تھے! بھئی، معاف کرنا۔ بس، دیکھتے جاؤ، اب گرفتار ہی کیا چاہتا ہوں گیدی کو۔

آزاد : لیکن، ذرا ہوشیار رہیے گا۔ بہروپیا گیا جہنم میں، ایسا نہ ہو، کوئی حضرت روپے

پیسے غائب کر دیں، بے وقوف کہیں کا! ابے گدھے، یہاں بہروپیا کہاں؟

خوجی : بس، چونچ سنبھالیے، بندہ چلتا ہے۔ دوستی ہو چکی۔ کچھ آپ کے غلام نہیں ہیں۔ اور سنیے، ہم گدھے ہیں۔ کیا جانے کتنے گدھے ہم نے بنا ڈالے۔

آزاد : خیر، یہی سنیے۔ لیکن جائے گا کہاں؟ یہاں بھی کچھ خشکی ہے؟

خوجی : ارے او جہاز کے کپتان! جہاز روک لے— ابھی روک لے۔

صاحب : وہ یوں نہ سنے گا۔ دو چار ہاتھ کرولی کے لگایئے، تو پھر سنے۔

اتنے میں حاضری کھانے کا وقت آیا۔ آزاد نے بے تکلفی کے ساتھ ان دونوں کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر تینوں ٹہلنے لگے۔ آزاد کو وینیشیا کی ایک ایک چھوی بھاتی تھی اور وہ حسینہ کبھی شوخی سے اٹھلاتی تھی، کبھی ناز کے ساتھ مسکراتی تھی۔ اتنے میں خوجی نے یہ شعر پڑا۔

گر تم نہیں تو اور بت مہ جبیں سہی

ہم کو دل لگی سے غرض ہے، کہیں سہی

آزاد نے جو یہ شعر سنا، تو خوجی کے پاس آکر بولے— یہ کیا غضب کرتے ہو جی؟ اس کا شوہر شعر خوب سمجھ لیتا ہے۔

خوجی : وہ گیدی ان اشاروں کو کیا جانے۔

آزاد : تم بڑے شریر ہو۔

خوجی : کیوں استاد، ہمیں سے یہ اڑن گھائیاں بتاتے ہو، کیوں؟ سچ کہنا، حسن آرا کے لگ بھگ ہے کہ نہیں۔ بمبئ والی بیگم بھی ایسی ہی شوخ تھی۔

وینیشیا نے خوجی کو مسکراتے دیکھا، تو انگلی کے اشارے سے بلایا۔ خوجی تو ریشا ختمی ہو گئے۔ بہت اینٹھتے اور اکڑتے ہوئے چلے۔ گویا لندھور پہلوان کے بھی چچا ہیں۔ واہ، کیوں نہ ہو۔ اس وقت ذرا پاؤں پھسلے، تو دل دگی ہو۔ میم صاحب کے پاس پہنچے۔

آزاد : ٹوپی اتار کر سلام کرو خوجی۔

خوجی کا لفظ سننا تھا کہ خواجہ صاحب کا غصہ ایک سو بیس درجہ پر جا پہنچا۔ بس، پلٹ پڑے اور پلٹتے ہی الٹے پاؤں بھاگنے لگے۔

آزاد : او گیدی جو پلٹ گیا تو اتنی کرولیا بھونکی ہوں گی کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔

میم : کیوں خوجی، کیا مجھ سے خفا ہو گئے؟

آزاد : کیوں بھائی، کیا شیطان نے پھر انگلی کر دی؟ میاں خوجی؟

خوجی : خوجی پر خدا کی مار! خوجی پر شیطان کی پھٹکار! ایک دفعہ خوجی کہا، میں خون پی کر رہ گیا، اب پھر دہرایا۔ خدا جانے، کب کا دیا اس گاڑھے وقت کام آیا۔ نہیں تو مارے کرولیوں کے بھٹا سا سر اڑا دیتا۔ لاکھ گیا گزرا ہوں، تو کیا ہوا، عمر بھر رسالد داری کی ہے، گھاس نہیں کھودی۔

میم : اچھا، یہ خوجی کے نام پر بگڑے! ہم سمجھے، ہم سے روٹھ گئے۔

خوجی : نہیں، میم صاحب! ایسی بات آپ فرماتیں ہیں۔

آزاد : ذرا ان سے ان کی بیوی جان کا حال پوچھیے۔ اس کا نام بوا زعفران ہے۔ دیونی ہے دیونی۔

خوجی نے بوا زعفران کا نام سنا، تو رنگ فق ہو گیا اور سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ آزاد نے جب وینیشیا سے سارا قصہ کہا، تو مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئی۔

(49)

ایک عالی شان محل کی چھت پر حسن آرا اور ان کی تینوں بہنیں میٹھی نیند سو رہی ہیں۔ بہار بیگم کی زلفِ عنبر کی لپٹیں آتی تھیں، روح افزا کے گھونگھر والے بال نوجوانوں کے مزاج کی طرح بل کھاتے تھے، سپہر آراہ کی مہندی عجب لطف دکھاتی تھیں اور حسن آرا بیگم کے گورے گورے مکھڑے کے گرد کالی کالی زلفوں کو دیکھ کر دھوکا ہوتا تھا کہ چاند گرہن سے نکلا ہے۔

ادھر تو یہ چاروں پریاں بے خبر آرام میں ہیں، ادھر شہزادہ ہمایوں فر اپنے دوست میر صاحب سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے ہیں۔

میر کچھ اڑوسی پڑوسی کا تو حال کہیے۔ دونوں حسینیں نظر آتی ہیں-یا نہیں؟

شہزادہ : ارے میاں، اب تو چوکڑی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ سب مست ہیں۔ مگر بلا کی حیا دار۔

میر : یہ کہیے، گہرے ہیں استاد!

شہزادہ : اجی، ابھی خواب دیکھ رہا تھا کہ ایک مہری حسن آرا کا خط لائی ہے۔ خط پڑھ

ہی رہا تھا کہ آپ بلا کی طرح آپہنچے۔ جی چاہتا ہے، گولی مار دوں۔

میر: کیوں صاحب، آپ نے تو کان پکڑے تھے۔

شہزادہ: دل پر قابو بھی تو ہو؟

میر: کلنک کا ٹیکا لگاؤ گے؟ خدا کے لیے پھر توبہ کرو۔ آخر چاروں چھوکڑیوں میں سے آپ ریجھے کس پر! یا چاروں پر دل آیا ہے؟

شہزادہ: چار نکاح تو جائز ہیں۔

میر: تو یہ کہیے، چاروں پر دانت ہے۔

شہزادہ: نہیں میاں، ہنستا ہوں۔ دو ہی تو کنواری ہیں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ یکا یک محلّے میں چور چور کا غل مچا۔ کوئی چراغ جلاتا ہے، کوئی بیوی کے زیور ٹٹولتا ہے۔ چاروں طرف کھلبلی مچ گئی۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ بڑی بیگم صاحبہ کے گھر چور گھسا تھا۔ شہزادے نے جو یہ بات سنی تو میر صاحب سے بولے — بھئی، موقع تو اچھا ہے۔ چلو، اس وقت ذرا ہو آئیں۔ اسی بہانے احسان جتائیں۔

میر: سوچ لو، ایسا نہ ہو، پیچھے میرے ماتھے جائے۔ تم تو شہزادے بن کر چھوٹ جاؤ گے، الّو میں بنوں گا۔ آخر وہاں چل کر کیا کہو گے؟

شہزادہ: اجی، کہیں گے کیا! بس، افسوس کریں گے۔ شاید اسی پھیر میں ایک جھلک مل جائے۔ اور نہیں، تو آواز ہی سن لیں گے۔

دونوں آدمی بیگم صاحبہ کے مکان پر پہنچے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ چالیس پچاس آدمی ایک چور کو گھیرے کھڑے ہیں اور چاروں طرف سے اس پر بے بھاؤ کی پڑ رہی ہیں۔ ایک نے تڑ سے چپت جمائی، دوسرے نے کھوپڑی پر دھول لگائی۔ چور پر اتنی پڑی کہ بلبلا گیا۔ جھلا جھلا کر رہ جاتا تھا۔ دو تین بھلے آدمی لوگوں کو سمجھا رہے تھے، بس کرو، اب تو کھوپڑی پلپلی کر دی۔ کیا جماتے ہی جاؤ گے؟

1۔ بھئی، خوب ہاتھ گرمائے۔

2۔ ہم تو پولے ہاتھ سے لگاتے تھے۔ جس میں چوٹ کم آئے، مگر آواز خوب ہو۔

چور: چھوٹوں گا تو ایک ایک سے سمجھوں گا۔ کیا کروں، بے بس ہوں، ورنہ سب کو پیس کر دھر بتیا۔

بہار بیگم کے میاں بھی کھڑے تھے۔ بولے— ایک ہی شیطان ہے۔

شہزادہ : آخر، یہ آیا کدھر سے؟

نواب صاحب : میں گھوم کر کوئی دس بجے کے لگ بھگ۔ کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ نیند آ گئی۔ یہ غل مچا، تو تلوار لے کر دوڑ پڑا۔ اب سنیے، میں تو اوپر سے آر رہا ہوں، اور چور نیچے سے اوپر جاتا ہے۔ راستے میں مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے چھری نکالی، مگر میں نے بھی تلوار کا وہ ہاتھ چلایا کہ ذرا ہاتھ اوچھا نہ پڑے، تو بھنڈارا کھلا جائے۔ پھر تو ایسا سہا کہ ہوش اڑ گئے۔ بھاگتے راہ نہ ملی۔ اب چھت پر پہنچا اور چاہتا تھا کہ جھپٹ کر نیچے کود پڑے، مگر میری چھوٹی سالی نے اس پھرتی سے رسی کا پھندا بنا کر پھینکا کہ الجھ کر گرا۔ اٹھ کر بھاگنے کو ہی تھا کہ میں گلے پر پہنچ گیا اور جاتے ہی چھاپ بیٹھا۔ عورتوں نے دہائی دینا شروع کی، لیکن میں نے نہ چھوڑا۔ آپ نے اس وقت کہاں تکلیف فرمائی؟

شہزادہ : میں نے کہا، چل کر دیکھوں، کیا بات ہوئی۔ بارے شکر ہے کہ خیریت ہوئی۔ مگر آپ کی سالی بڑی دلیر ہیں۔ دوسری عورت ہو، تو ڈر جائے۔

یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر اندر چاروں بہنوں میں بھی یہی ذکر تھا۔ چاروں ہنس ہنس کر یوں باتیں کر رہی تھیں۔

سپہر آرا : ہے ہے باجی، میں نے جب اس کالے کالے سنڈے کو دیکھا، تو سن سے جان نکل گئی۔

روح افزا : مواں تمباکو کا پنڈا۔

حسن آرا : وہ تو خیر گزری کہ صندوق ہاتھ سے گر پڑا، نہیں تو سب موس لے جاتا۔

سپہر آرا : بہار بیگم کی چڑ چڑی سال لاکھوں ہی سناتی کہ میری بہو کے گہنے سب بیچ کھائے۔

بہار بیگم : چور چور کی بھنک کان میں پڑی، تو میں کلبلا کر چونک پڑی۔ بھاگی، تو جوڑا بھی کھل گیا۔ اللہ جانتا ہے، بڑی محنت سے باندھا تھا۔ چلو خیر!

روح افزا : بس، ہماری باجی کو چوٹی کنگھی کی فکر رہتی ہے۔

حسن آر : جتنا ان کو اس بات کا خیال ہے، اتنا ہمارے خاندان بھر میں کسی کو نہیں ہے۔ جبھی تو دلہا بھائی اتنے دیوانے رہتے ہیں۔

بہار بیگم : چلو، بیٹھی رہو، چھوٹے منہ کی بڑی بات!

حسن آرا : دلہا بھائی کو ان کے ساتھ عشق ہے۔

بہار بیگم : کا ٹر ٹر لگائی ہے ناحق!

اب دل لگی سنیے کہ مرزا ہمایوں فر باہر بیٹھے چپکے چپکے ساری باتیں سن رہے تھے۔ نواب بے چارے کٹ کٹ گئے، مگر چپ۔ اندر جاکر سمجھائیں، تو ادب کے خلاف، چپکے بیٹھے رہے، تو بھی رہا نہیں جاتا۔ جان عذاب میں تھی۔ خیر حقہ پی کر شہزادہ رخصت ہوئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد نواب صاحب اندر آئے اور بولے — تم لوگوں کی بھی عجیب عادت ہے۔ جب دیکھوگی کہ کوئی غیر آدمی آکے بیٹھا ہے، بس، تبھی غل مچاؤ گی۔ اس وقت ایک بھلے مانس بیٹھے تھے اور یہاں چہل ہو رہی تھی۔

بہار بیگم : وہ بھلا مانس نگوڑا کون تھا، جو اتنے وقت پنچایت کرنے آبیٹھا؟

روح افزا : تو اب کوئی ان کے مارے اپنے گھر میں بات نہ کرے؟ گھوٹ کر مار نہ ڈالیے۔

حسن آرا : ہم بھی تو سنیں، وہ بھلے مانس کون تھے؟

نواب : اجی، یہی، جو سامنے رہتے ہیں، شہزادے؟

حسن آرا : تو آپ نے آکر ہم سے کہہ کیوں نہ دیا؟ پھر ہم کاہے کو بولتے؟

بہار بیگم : اپنی خطا نہ کہیں گے، دوسروں کو للکاریں گے۔

نواب : اس وقت وہاں سے آنے کا موقع نہ تھا۔ مجھ سے پوچھا کہ چور کو کس نے پکڑا۔ میں نے کہا، میری چھوٹی سالی نے۔ تو بہت ہی ہنسے۔

نواب صاحب باہر چلے گئے، تو پھر باتیں ہونے لگیں۔

سپہر آرا : ذرا ان کی ڈھٹائی تو دیکھو کہ چور کا نام سنتے ہی آڈٹا۔ بھلا کیا وجہ تھی اس کی؟ ایسا کہاں کا بڑا رستم تھا؟

حسن آرا : تین بجے کے وقت آپ جو آئے، تو کیوں آئے!

روح افزا : میں بتاؤں، اس کو یہ خبر نہ ہوگی کہ دولہا بھائی گھر پر ہیں۔ یہ نہ ہوتے تو گھر میں گھس پڑتا۔

بہار بیگم : نہیں، واہ، شہزادہ ہے، کوئی ایسا ویسا ہے!

سپہرآرا: کام تو شہدے کے جیسے ہیں۔

اب ایک اور دل لگی سنیے۔ چور آیا، غل گپاڑا ہوا، پکڑا گیا، زمانے بھر میں ہلّو مچا، محلّہ بھر جاگ اٹھا، چور تھانے پر پہنچا، مگر بڑی بیگم صاحبہ ابھی تک خراٹے ہی لے رہی ہیں۔ جب جاگیں، تو ماما سے بولیں — کچھ غل سا مچا تھا ابھی؟

ماما: ہاں، کچھ آواز تو آئی تھی۔

بیگم: ذری، کسی سے پوچھو تو۔

ماما: اے بی بی، پوچھنا اس میں کیا ہے؟ بھیڑیا ویڑیا آیا ہوگا۔

بیگم: میں نے آج ہاتھی کو خواب میں دیکھا ہے، اللہ بچائے۔

اتنے میں چور کے آنے کی خبر ملی۔ تب تو بیگم صاحبہ کے ہوش اڑ گئے۔ ماما کو بھیجا کہ جا پوچھ، کچھ لے تو نہیں گیا۔

حسن آرا: اماں جان بہت جلد جاگیں! کیا تو بھی گھوڑے بیچ کر سوئی تھی؟ اللہ ری نیند!

ماما: ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ مگر کچھ غل کی آواز ضرور آئی تھی۔

حسن آرا: بھر جاگ اٹھا، تمھارے نزدیک کچھ ہی کچھ غل تھا۔ ٹھیک! جاکے امّاں سے کہہ دے کہ چور آیا تھا، مگر جاگ ہوگئی۔

سپہرآرا: اے، کاہے کے واسطے بہکتی ہو۔ ماما، تو جاکے سو رہے، شور غل کہیں کچھ نہ تھا، کوئی سوتے میں بڑّا اٹھا ہوگا۔

حسن آرا: نہیں ماما، یہ دل لگی کرتی ہیں۔ چور آیا تھا۔

ماما: اے، گیا چولھے میں نگوڑا چور! ادھر آنے کا رخ کرے، تو آنکھیں ہی پھوٹ جائیں۔ کیا ہنسی ٹھٹھا ہے۔

سپہرآرا: دیکھو تو سہی بھلا!

ماما: ابھی بیگم صاحبہ سن لیں، تو دنیا سر پر اٹھا لیں۔

ماما نے جا کر بیگم سے کہا — اے حضور، کچھ ہے نہ وے، بے کار کو جگایا۔ نہ بھیڑیا، نہ چور، کوئی سوتے سوتے بڑّا اٹھا تھا۔

بیگم: ذرا باہر جا کر تو پوچھ یہ غل کیسا تھا؟

مہری: بی بی، میں ابھی باہر سے آئی ہوں، کوٹھے پر کل مونہا آیا تھا۔ کوٹھری کا قفل توڑ

کر جب صندوق اٹھایا تو، جاگ ہو گئی۔ اتنے میں نواب صاحب کوٹھے پر سے ننگی تلوار لیے دوڑے آئے۔

بیگم : نواب صاحب کے دشمنوں کو تو کہیں چوٹ اُوٹ نہیں آئی؟

مہری : نہ بی بی ایک پھانس تک تو چبھی نہیں۔

بیگم : چور کچھ لے تو نہیں گیا؟

مہری : ایک جھنجھی تک نہیں۔

بیگم : چور اب کہاں ہے؟

مہری : خادم حسین تھانے پر لے گیا۔

ماما : اب چکی پیسنی پڑے گی۔

بیگم : تو تو کہتی تھی کہ کوئی سوتے سوتے بڑا اٹھا تھا۔ جھوٹی زمانے بھر کی! چل، جا، ہٹ!

اب تھانے کا حال سنیے۔ تھانے دار ندارد، جمعدار شراپ پیے مست، کانسٹبل اپنی اپنی ڈیوٹی پر۔ ایک کانسٹبل پہرے پر کھڑا سو رہا تھا۔ خادم حسین نے بہت غل مچایا، تب جا کے حضرت کی نیند کھلی۔ بگڑے کہ مجھے جگایا کیوں؟ چور کو چھوڑ دو۔

خادم حسین : واہ چھوڑ دینے کی ایک ہی کہی۔ میں بھی تھانے میں محرر رہ چکا ہوں۔

کانسٹبل : نہ چھوڑ گے تم؟

خادم حسین : ہوش کی دوا کرو میاں! اس کے ساتھ تم کو بھی پھنساؤں گا تو سہی۔

کانسٹبل : (چور سے) تجھے انھوں نے اپنے یہاں کے گھنٹے رکھا تھا؟

چور : پکڑ کر بس یہاں لے آئے؟

کانسٹبل : دت گوکھے! ابے، تو کہنا کہ میں راہ راہ چلا جاتا تھا، ان سے مجھ سے لاگ ڈاٹ تھی۔ انھوں نے گھات پا کر مجھے پکڑ لیا، خوب پیٹا اور چار گھنٹے تک اصطبل کی کوٹھری میں بند رکھا۔

چور : لاگ ڈاٹ کیا بتاؤں؟

کانسٹبل : کہہ دینا کہ میری جورو پر یہ بری نگاہ ڈالتے تھے۔ بس، لاگ ڈاٹ ہو گئی۔

چور : مگر میری جورو تو چار برس ہوئے ایک کے ساتھ نکل گئی۔

کانسٹبل : بس، تو بات بن گئی! کہہ دینا، انھیں کی سازش سے نکلی تھی۔ تو ان پر دو جرم

قائم ہوں گے۔ ایک یہ کہ تم کو جھوٹ موٹ پھانس لیا، دوسرے زبردستی قید رکھا۔

خادم حسین : تمھاری باتوں پر کچھ ہنسی آتی ہے، کچھ غصہ

کانسٹبل : جب بڑا گھر دیکھوگے، تب ہنسی کا حال کھل جائے گا۔

خادم حسین : ہمارے گھر میں چوری ہو اور ہمیں پھنسیں؟

خیر، کانسٹبل صاحب روزنامچہ لکھنے بیٹھے۔ خادم حسین نے ساری داستان بیان کی۔ جب اس نے یہ کہا کہ نواب صاحب تلوار لے کر دوڑے، تو کانسٹبل نے قلم روک دیا اور کہا— ذرا ٹھرو، تلوار کا لائسنس ان کے پاس ہے؟

خادم حسین : ان کے ساتھ تو بیس سپاہی تلوار باندھے نکلتے ہیں۔ تم ایک لائسنس لیے پھرتے ہو!

آخر رپورٹ ختم ہوئی اور خادم اپنے گھر آیا۔

(50)

ایک دن میاں آزاد مسٹر اور مسز اپیلٹن کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ ایک ہنسوڑ آبیٹھے اور لطیفے کہنے لگے۔ بولے— اجی، ایک دن بڑی دل لگی ہوئی۔ ہم ایک دوست کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات کو اس کے خدمت گار کی بیوی دس انڈے چٹ کر گئی۔ جب دوست نے پوچھا، تو خدمت گار نے بگڑی بات بنا کر کہا کہ بلّی کھا گئی۔ مگر میں نے دیکھ لیا تھا، جب بلّی آئی تو وہ عورت اسے مارنے دوڑی۔ میں نے کہا— بلّی کو مار نہ ڈالنا نہیں تو پھر انڈے ہضم نہ ہوں گے۔

آزاد : بات تو یہی ہے۔ کھائے کوئی، بلّی کا نام بد۔

اپیلٹن : آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟

ہنسوڑ : شادی کرنا تو آسان ہے، مگر بیوی کا سنبھالنا مشکل۔ ہاں، ایک شرط پر ہم شادی کریں گے۔ بیوی دس بچوں کی ماں ہو۔

میم : بچوں کی قید کیوں کی؟

ہنسوڑ : آپ نہیں سمجھی۔ اگر جوان آئی، تو اس کے نخرے اٹھاتے اٹھاتے ناک میں دم آجائے گا ادھیڑ بیوی ہوئی تو نخرے نہ کرے گی اور بچّے بڑے کام آئیں گے۔

آزاد : وہ کیا؟

ہنسوڑ : قحط کے دنوں میں بیچ لیں گے۔

اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ میاں خوجی لڑھکتے ہوئے چلے آتے ہیں۔ ایک سوکھا کٹار ہاتھ میں ہے۔

آزاد : آیئے۔ بس، آپ ہی کی کسر تھی۔

خوجی : مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کسی سے پوچھوں تو کہ یہ سمندر ہے کیا چیز اور کس کی دعا سے بنا ہے؟

ہنسوڑ : میں بتاؤں! اگلے زمانے میں ایک ملک تھا گھامڑ نگر۔

خوجی : ذری ٹھہر جایئے گا۔ وہاں افیم بھی بکتی تھی؟

ہنسوڑ : اس ملک کے باشندے بڑے دلیر ہوتے تھے، مگر قد کے چھوٹے۔ بالکل ٹینی مرغے کے برابر۔

خوجی : (مونچھوں پر تاؤ دے کر) ہاں ہاں، چھوٹے قد کے آدمی تو دلیر ہوتے ہی ہیں۔

ہنسوڑ : اور کوئی بغیر کرولی باندھے گھر سے نہ نکلتا تھا۔

خوجی : (اکڑ کر) کیوں میاں آزاد، اب نہ کہو گے؟

ہنسوڑ : مگر ان لوگوں میں ایک عیب تھا، سب کے سب افیم پیتے تھے۔

خوجی : (تیوریاں چڑھا کر) او گیدی!

آزاد : ہیں ہیں! شریف آدمیوں سے یہ بدزبانی!

خوجی : ہم تو سر سے پاؤں تک پھک گئے، آپ شریف لیے پھرتے ہیں۔

ہنسوڑ : وہاں کی عورتیں بڑی گرانڈیل ہوتی تھیں۔ جہاں میاں ذرا بگڑے، اور بیوی نے بغل میں دبا کر بازار میں گھسیٹا۔

خوجی : اہا ہا، سنتے ہو یارا وہ بہروپیا وہیں کا تھا۔ اب تو اس گیدی کا مکان بھی مل گیا۔ چچا بنا کر چھوڑوں، تو سہی۔

ہنسوڑ : وہ سب رسالداری کرتے تھے۔

خوجی : اور وہاں کیا کیا ہوتا تھا؟ اس ملک کے آدمیوں کی تصویریں بھی آپ کے پاس

ہیں؟

ہنسوڑ : تھیں تو، مگر اب نہیں رہیں۔ بس، بالکل تمھارے ہی سے ہاتھ پاؤں تھے۔ کرارے جوان۔ پونڈے بہت کھاتے تھے۔

خوجی : او ہو! وے سب ہما، ے ہی باپ دادا تھے۔ دیکھو بھائی آزاد، اب یہ بات اچھی نہیں۔ وہاں سے تو لمبے چوڑے وعدے کر کے لائے تھے کہ کرولی ضرور لے دیں گے، اور یہاں صاف مکر گئے۔ اب ہمیں کرولی منگا دو، تو خیریت ہے، نہیں تو ہم بگڑ جائیں گے۔ واللہ، کون گیدی دم بھر ٹھہرے یہاں۔

آزاد : اور یہاں سے آپ جائیں گے کہاں؟ جہنم میں؟

وینیشیا : کچھ روپے بھی ہیں؟ جہاز کا کرایہ کہاں سے دوگے؟

آزاد : میں ان کا خزانچی ہوں۔ یہ گھر جائیں، کرایہ میں دے دوں گا۔

ہنسوڑ : اس خزانچی کے لفظ پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا۔ شادی کے پہلے نوجوان لیڈیاں اپنے عاشق کو اپنا خزانہ کہتی ہیں۔ شادی ہونے کے بعد اسے خزانچی کہنے لگتی ہیں۔ خزانچی کے خزانچی اور میاں کے میاں۔

وینیشیا : اچھا ہوا، تمھاری بیوی چل بسیں، نہیں تو تمھاری کفایت ان کی جان ہی لے لیتی۔

ہنسوڑ : عجیب عورت تھی، شادی کے بعد ایسی رونی صورت بنائے رہتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا، آج باپ کے مرنے کی خبر آئی ہے۔ دو برس کے بعد ہم سے چھ مہینے کے لیے جدا ہوئی۔ اب جو دیکھتا ہوں، تو اور ہی بات ہے۔ بات بات پر مسکرانہ اور ہنسنا۔ بات ہوئی اور کھل گئی۔ میں نے پوچھا کیا تم وہی ہو، جو ناک بھوں چڑھائے رہتی تھیں؟ مسکرا کر کہا — ہاں، ہوں تو وہی۔ میں نے کہا— خیر، کایا پلٹ تو ہوئی۔ ہنس کے بولی— واہ اس میں تعجب کاہے کا۔ ایک دن مجھے خیال آ گیا، بس، تب سے اب ہر وقت ہنستی ہوں۔ تب تو میں نے اپنا منھ پیٹ لیا۔ رونی صورت بنا کر بولا— ہم تو خوش ہوئے تھے کہ اب ہم سے تم سے خوب بنے گی، مگر معلوم ہو گیا کہ تمھاری ہنسی اور رونے دنوں کا اعتبار نہیں۔ اگر تمھیں اسی طرح بیٹھے بیٹھے کسی دن خیال آ گیا کہ رونا اچھا، تو پھر رونا ہی شروع کر دوگی۔

آزاد : مجھے بھی ایک بات یاد آ گئی۔ ہمارے محلّے میں ایک خواجہ صاحب رہتے تھے۔

ان کے ایک لڑکی تھی، اتنی حسین کہ چاند بھی شرما جائے۔ بات کرتے وقت بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اس کی شادی ایک گنوار جاہل سے ہوئی، جو اتنا بدصورت تھا کہ اس سے بات کرنے کا بھی جی نہ چاہتا تھا۔ آخر لڑکی اسی غم میں کڑھ کڑھ کر مر گئی۔

(51)

کئی دن تک تو جہاز خیریت سے چلا گیا، لیکن پیریم کے قریب پہنچ کر جہاز کے کپتان نے سب کو اطلاع دی کہ ایک گھنٹے میں بڑی سخت آندھی آنے والی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی سب کے ہوش حواس غائب ہو گئے۔ عقل نے ہوا بتلائی، آنکھوں میں اندھیری چھائی، موت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ ترّا یہ کہ آسمان فقیروں کے دل کی طرح صاف تھا، چاندنی خوب نکھری ہوئی، کسی کو سان گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ طوفان آئے گا، مگر بیرومیٹر سے طوفان کی آمد صاف ظاہر تھی۔ لوگوں کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، جان کے لالے پڑ گئے، یا خدا، جائیں تو کہاں جائیں، اور اس طوفان سے نجات کیوں کر پائیں؟ کپتان کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس کے نائب بھی سٹی پٹی بھول گئے۔ سیڑھیوں سے تختے پر آتے تھے اور گھبرا کر پھر اوپر چڑھ جاتے تھے۔ کپتان لاکھ لاکھ سمجھاتا تھا، مگر کسی کو اس کی بات کا یقین نہ آتا تھا۔

کسی طرح سے سمجھتا نہیں دلِ ناشاد،

وہی ہے رونا، وہی چیخنا، وہی فریاد۔

اتنے میں ہوا نے وہ زور باندھا کہ لوگ تراہی تراہی کرنے لگے۔ کپتان نے ایک پال تو رہنے دیا، اور جہاز کو خدا کی راہ پر چھوڑ دیا۔ لہروں کی یہ کیفیت کہ آسمان سے باتیں کرتی تھیں۔ جہاز جھونکے کھا کر گیند کی طرح ادھر سے ادھر اچھلتا تھا۔ سب کے سب زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے، اپنی جانوں کو رو بیٹھے۔ بچے سہم کر اپنی ماؤں سے چپٹے جاتے تھے۔ کوئی عورت منھ ڈھنک کر روتی تھی کہ عمر بھی کی کمائی اسی سمندر میں گنوائی۔ کوئی اپنے پیارے بچے کو چھاتی سے لگا کر کہتی— بیٹا، اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ پر وہ نادان مسکراتا تھا اور اس بھولے پن سے ماں کے دل پر بجلیاں گراتا تھا۔ کسی کو مارے خوف کے چپ لگ گئی تھی، کسی کے ہاتھ پاؤں میں کپکپی تھی۔ کوئی سمندر میں کود پڑنے کا ارادہ کر کے رہ جاتا تھا، کوئی بیٹھا

دیوتوں کو مناتا تھا۔ کیا بوڑھے، کیا جوان، سب کی عقل گم تھی۔ وینیشیا کے چہرے کا رنگ کافور ہو گیا۔ ہنسوڑ کے دل سے ہنسی کا خیال کوسوں دور ہو گیا۔ میاں آزاد کا چہرہ زرد، اپیلٹن کے ہاتھ پاؤں سرد۔ میاں آزاد سوچنے لگے، یا خدا، یہ کس مصیبت سے دوچار کیا، معشوق کے عوض موت کو گلے کا ہار کیا! جی لگانے کی خوب سزا پائی، عشق کی دھن میں جان بھی گنوائی۔ ہماری ہڈیاں تک گل جائیں گی، پر حسن آرا ہماری خبر بھی نہ پائیں گی۔ سپہر آرا بار بار فال دیکھیں گی کہ آزاد کب میدان سے سرخرو ہو کر آئیں گے اور ہم کب مسجد میں گھی کے چراغ جلائیں گے، مگر آزاد کی کشتی غوطے کھاتی ہے اور ذرا دیر میں تہہ کی خبر لاتی ہے۔

جہاز میں تو یہ کہرام مچا تھا، مگر خوجی لمبی تانے سو ہی رہے تھے۔ اس نیند پر خدا کی مار، اس پینک پر شیطان کی پھٹکار! آزاد نے جگایا کہ خواجہ صاحب، اٹھیے، طوفان آیا ہے۔ حضرت نے لیٹے ہی لیٹے بھنبھنا کر فرمایا کہ چپ گیدی، ہم نے خواب میں بہروپیا پکڑ پایا ہے۔ تب تو آزاد کلاّئے اور کس کر ایک لات لگائی۔ خوجی کلبلا کر اٹھ بیٹھے اور سمندر کی بھیانک صورت دیکھی، تو کانپ اٹھے۔

کپتان خوب سمجھتا تھا کہ حالت ہر گھڑی نازک ہوتی جاتی ہے، لیکن پرانا آدمی تھا، کلیجہ مضبوط کیے ہوئے تھا۔ اس سے لوگوں کو تسلی ہوتی تھی کہ شاید جان بچ نکلے۔ سامنے پیرم کا جزیرہ نظر آتا تھا، مگر وہاں تک پہنچنا محال تھا۔ سب کے سب دعا کر رہے تھے کہ جہاز کسی طرح اس ٹاپو تک پہنچ جائے۔ مرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں آزاد نے کیا دیکھا کہ اپیلٹن وینیشیا کا ہاتھ پکڑ کر تختہ پر کھڑے ہو رہے ہیں۔ آزاد کو دیکھتے ہی وینیشیا نے کہا— مسٹر آزاد رخصت! ہمیشہ کے لیے رخصت!

آزاد : رخصت!

ہنسوڑ : ہے ہے! لو، اب بھنور میں جہاز آ گیا۔

یہ سن کر عورتوں نے وہ فریاد مچائی کہ لوگوں کے کلیجے دہل گئے۔

اپیلٹن : بس، اتنی ہی دنیا تھی!

آزاد : ہاں، اتنی ہی دنیا تھی!

خوجی : بھئی آزاد، خدا گواہ ہے، میں اس وقت افیم کے نشے میں نہیں۔ افسوس، تمھاری جان جاتی ہے، حسن آرا سمجھیں گی کہ آزاد نے دھوکہ دیا۔ ہائے آزاد، تیری جوانی مفت گئی۔

ایکاایک جہاز تین بار گھوما اور ہوا کے جھونکے سے کئی گز کے فاصلے پر جا پہنچا۔ اب لائف بوٹ کے سوا اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ جہاز ڈوبنے ہی کو تھا، دس فیٹ سے زیادہ پانی اس میں سما گیا تھا۔ لائف بوٹ سمندر میں اتارے گئے اور آزاد لڑکوں اور عورتوں کو اٹھا اٹھا کر لائف بوٹ میں بیٹھانے لگے۔ ان کی اپنی جان خطرے میں تھی، مگر ان کی انھیں پرواہ نہ تھی۔ جب وہ وینیشیا کے پاس پہنچے، تو اس نے ان سے ہاتھ ملایا اور ہیپلٹن اور وہ، دونوں لائف بوٹ میں کود پڑے۔ آزاد کی دلیری پر لوگ حیرت سے دانتوں تلے انگلی دباتے تھے۔ لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ کوئی فرشتہ ہے، جو بے گناہوں کی جان بچانے کے لیے آیا ہے۔

ٹاپو کے باشندے کنارے پر کھڑے روشنی کر رہے تھے کہ شعلے اٹھیں اور جہاز کے لوگ سمجھ جائیں کہ زمین قریب ہے۔ سینکڑوں آدمی غل مچاتے تھے، تالیاں بجاتے تھے۔ کچھ لوگ رو رہے تھے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے، جو دل میں کھلے جاتے تھے کہ اب پَو بارہ ہیں۔

ایک : بس، اب جہاز ڈوبا۔ تڑکے ہی سے لیس ہو کر آ ڈٹوں گا۔

دوسرا : ہمیں ایک بار جواہرات کا ایک صندوق مل گیا تھا۔

تیسرا : اجی، ہم نے اسی طرح بہت کچھ پیدا کیا۔

چوتھا : اجی، کیا بکتے ہو؟ کچھ تو خدا سے ڈرو۔ وے سب تو مصیبت میں ہیں، اور تم لوگوں کو لوٹ کی دھن سوار ہے۔ شرم ہو، تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرو۔

میاں خوجی بار بار ہمّت باندھ کر لائف بوٹ کی طرف جاتے اور ڈر کر لوٹ آتے تھے۔ آخر آزاد نے انھیں بھی گھسیٹ کر لائف بوٹ میں پہنچایا۔ وہاں جاتے ہی انھوں نے غل مچایا کہ افیم کی ڈبیا تو وہیں رہ گئی! میاں! ذری لپک کے کوئی ہماری ڈبیا لے آئے۔ آزاد نے کہا— میاں، تم بھی کتنے پاگل ہو؟ یہاں جانوں کے لالے پڑے ہیں، تمھیں اپنی ڈبیا ہی کی فکر ہے۔

لائف بوٹ کُل تین تھے۔ ان میں مشکل سے پچاس ساٹھ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن ہر شخص چاہتا تھا کہ میں بھی لائف بوٹ میں پہنچ جاؤں۔ کپتان نے یہ حالت دیکھی، تو زنجیر کھول دیں۔ کشتیاں بہہ نکلیں۔ اب باقی آدمیوں کی جو حالت ہوئی، وہ بیان میں نہیں آسکتی۔ اگر کوئی فوٹوگرافر ان بدنصیبوں کی تصویر اتارتا، تو بڑے سے بڑے سنگ دل بھی اسے دیکھ کر سر دھنتے۔ موت چمٹی جاتی ہے، اور موت کے پنجوں میں پھنسی ہوئی جان پھڑ پھڑا رہی ہے۔ مگر

جان بڑی پیاری چیز ہے۔ لوگ خوب جانتے تھے کہ جہاز کے ڈوبنے میں دیر نہیں، لائف بوٹ بھی دور نکل گئے، مگر پھر بھی یہ امید ہے، شاید کسی طرح بچ جائیں۔ دو بدنصیب بہنیں یوں باتیں کر رہی تھیں۔

بڑی بہن : کود پڑو پانی میں۔ شاید بچ جائیں۔

چھوٹی بہن : لہریں کہیں نہ کہیں پہنچا ہی دیں گی۔

بڑی : اماں سنیں گی تو کیا کریں گی؟

چھوٹی : میں تو کودتی ہوں۔

بڑی : کیوں جان دیتی ہے؟

ایک عورت نے اپنے پیارے بچّے کو سمندر میں پھینک دیا اور کہا— یہ لڑکا تیرے سپرد کرتی ہوں۔

یہ کہہ کر خود بھی گر پڑی۔

اب سنیے، جس لائف بوٹ پر وینیشیا اور اپیلٹن تھے، وہ ہوا کے جھونکے سے پیرم سے دور ہٹ گیا۔ وینیشیا نے کہا— اب کوئی امید نہیں!

اپیلٹن : خدا پر بھروسہ رکھو۔

وینیشیا : یا خدا، ہمیں بچا لے۔ ہم بے گناہ ہیں۔

اپیلٹن : صبر، صبر!

وینیشیا : لو، آزاد کی کشتی بھی ادھر ہی آنے لگی۔ اب کوئی نہ بچے گا۔

دونوں کشتیاں تھوڑے ہی فاصلے پر جا رہی تھیں، اتنے میں ایک لہر نے اپیلٹن کی کشتی کو ایسا جھونکا دیا کہ وہ نیچے اوپر ہونے لگی اور تین آدمی سمندر میں گر پڑے۔ اپیلٹن بھی ان میں سے ایک تھے۔ ان کے گرتے ہی وینیشیا نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئی۔ آزاد نے یہ حال دیکھا، تو فوراً بوٹ پر سے کود پڑے اور جان ہتھیلی پر لیے ہوئے، لہروں کو چیرتے، اپیلٹن کی مدد کو چلے۔ ادھر اپیلٹن کا کتا بھی پانی میں کودا اور ان کے سر کے بال دانتوں سے پکڑ کے اوپر لایا۔ میاں آزاد بھی تیرتے ہوئے جا پہنچے اور اپیلٹن کو پکڑ لیا۔ اسی وقت کشتی بھی آ پہنچی اور لوگوں نے مدد دے کر اپیلٹن کو کھینچ لیا۔ مگر کشتی اتنی تیزی سے نکل گئی کہ آزاد اس پر نہ آ سکے۔ اب ان کے لیے موت کا سامنا تھا۔ مگر وہ کلیجہ مضبوط کیے ٹاپو کی طرف تیرتے

چلے جاتے تھے۔ ٹاپو والوں نے انھیں آتے دیکھا تو اور بھی حوصلہ بڑھایا، اور ہمّت دلائی۔ سب کے سب دعا کر رہے تھے کہ یا خدا، اس جوان کو بچا۔ جیوں ہی آزاد ٹاپو کے قریب پہنچے، رسّیاں پھینکی گئیں اور آزاد اوپر آئے۔ سب نے ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ وینیشیا نے میاں آزاد سے کہا— تم نہ ہوتے، تو میں کہیں کی نہ رہتی۔ تمھارا احسان کبھی نہ بھولوں گی۔

اپیلٹن : بھائی، دیکھنا، بھول نہ جانا۔ ترکی سے خط لکھتے رہنا۔

آزاد : ضرور، ضرور!

وینیشیا : آزاد، جیسے بہن کو اپنے بھائی کی محبت ہوتی ہے، ویسی ہی مجھ کو تمھاری محبت ہے۔

آزاد : میں جہاں رہوں گا، آپ لوگوں سے ضرور ملوں گا۔

خوجی : یار، ہماری افیم کی ڈبیا جہاز ہی میں رہ گئی۔ دیکھیں، کس خوش نصیب کے ہاتھ لگتی ہے۔

سب لوگ یہ جملہ سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

(52)

مالٹا میں آرمینیاں، عرب یونان، اسپین، فرانس سبھی دیشوں کے لوگ ہیں۔ مگر دو دن سے اس جزیرے میں ایک بڑے گرانڈیل جوان کا گزر ہوا ہے۔ قد کوئی آدھ گز کا، ہاتھ پاؤں دو دو ماشے کے، ہوا ذرا تیز چلے، تو اڑ جائیں۔ مگر بات بات پر تیکھے ہوئے جاتے ہیں۔ کسی نے ذرا ترچھی نظر سے دیکھا، اور آپ نے کرولیاں سیدھی کی۔ نہ دین کی فکر تھی، نہ دنیا کی، بس، افیم ہو، اور چاہے کچھ ہو یا نہ ہو۔

آزاد نے کہا— بھئی، تمھارا یہ فقرہ عمر بھر نہ بھولے گا کہ دیکھیں ہماری افیم کی ڈبیا کس خوش نصیب کے ہاتھ لگتی ہے۔

خوجی : پھر، اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟ ہماری تو جان پر بن آئی، اور آپ کو دل لگی سوجھتی ہے۔ جہاز کے ڈوبنے کا کس مردک کو رنج ہو۔ مگر افیم کے ڈوبنے کا البتہ رنج ہے۔ دو دن سے جمہائیوں پر جمہائیاں آتی ہیں۔ پیسے لاؤ، تو دیکھوں، شاید کہیں مل جائے۔

میاں آزاد نے دو پیسے دیے اور آپ ایک دکان پر پہنچ کر بولے— افیم لانا جی؟

دکاندار نے ایک ہاتھ سے کہا کہ ہم نے سمجھا نہیں۔

خوجی : عجب جانگلو ہے! ابے، ہم افیم مانگتے ہیں۔

دکان دار ہنسنے لگا۔

خوجی : کیا پھٹی جوتی کی طرح دانت نکالتا ہے! لاتا ہے افیم کہ نکالوں کرولی!

اتنے میں میاں آزاد پہنچے اور پوچھا— یہاں کیا خریداری ہوتی ہے؟

خوجی : اجی، یہاں تو سبھی جانگلو ہی جانگلو رہتے ہیں۔ گھنٹے بھر سے افیم مانگ رہا ہوں، سنتا ہی نہیں۔

آزاد : پھر کہنے سے تو آپ برا مانتے ہیں بھلا یہ بارود بیچتا ہے یا افیم؟ بالکل گوکھے ہی رہے۔

خوجی : اگر افیم کا یہی حال رہا، تو ترکی تک پہنچنا محال ہے۔

آزاد : بھئی، ہمارا کہا مانو۔ ہمیں ترکی جانے دو اور تم گھر جاؤ۔

خوجی : واہ وا، اب میں ساتھ چھوڑنے والا نہیں۔ اور میں چلا جاؤں گا، تو تم لڑوگے کس کے برتے پر؟

آزاد : بے شک، آپ ہی کے برتے پر تو میں لڑنے جاتا ہوں نا؟

خوجی : کون؟ قسم کھا کے کہتا ہوں، جب سنیے گا، یہی سنیے گا کہ خواجہ صاحب نے توپ میں کیل لگا دی۔

آزاد : جی، اس میں کیا شک ہے۔

خوجی : شک وک کے بھروسے نہ رہیے گا! اکیلی لکڑی چولھے میں بھی نہیں جلتی۔ جس وقت خواجہ صاحب عربی گھوڑے پر سوار ہوں گے اور اکڑ کر بیٹھیں گے، اس وقت اچھے اچھے جنڈیل کنڈیل جھک جھک کر سلام کریں گے۔

اتنے میں ایک حبشی سامنے سے آنکلا۔ کرارا جوان، مچھلیاں بھری ہوئیں، سینہ چوڑا۔ خوجی نے جو دیکھا کہ آدمی اکڑتا ہوا سامنے سے آ رہا ہے، تو آپ بھی اینٹھنے لگے۔ حبشی نے قریب آکر کندھے سے ذرا دھکّا دیا، تو میاں خوجی نے بیس لڑھکنیاں کھائیں۔ مگر بے حیا تو تھے ہی، جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے، اور حبشی کو للکار کہا— ابے او گیدی، نہ ہوئی کرولی اس وقت۔ ذرا میرا پیر پھسل گیا، نہیں تو وہ پٹکنی دیتا کہ انجر پنجر ڈھیلے ہو جاتے!

آزاد : تم کیا، تمھارا گاؤں بھر تو اس کا مقابلہ کر لے!

خوجی : اچھا، لڑا کر دیکھ لو نا! چھاتی پر نہ چڑھ بیٹھوں، تو خواجہ نام نہیں۔ کہو، تو للکاروں جا کر۔

آزاد : بس، جانے دیجیے۔ کیوں ہاتھ پیر کے دشمن ہوئے ہو!

دوسرے دن جہاز وہاں سے روانہ ہوا۔ آزاد کو بار بار حسن آرا کی یاد آتی تھی۔ سوچتے تھے، کہیں لڑائی میں مارا گیا، تو اس سے ملاقات بھی نہ ہوگی۔ خوجی سے بولے۔ کیوں جی، ہم اگر مر گئے، تو تم حسن آرا کو ہمارے مرنے کی خبر دوگے، یا نہیں؟

خوجی : مرنا کیا ہنسی ٹھٹا ہے؟ مرتے ہیں ہم جیسے دبلے پتلے بوڑھے اپنچی کہ تم ایسے ہٹے کٹے جوان؟

آزاد : شاید ہمیں تم سے پہلے مر جائیں؟

خوجی : ہم تم کو اپنے پہلے مرنے ہی نہ دیں گے۔ ادھر تم بیمار ہوئے، اور ہم نے ادھر زہر کھایا۔

آزاد : اچھا، جو ہم ڈوب گئے؟

خوجی : سنو میاں، ڈوبنے والے دوسرے ہی ہوتے ہیں۔ وہ سمندر میں ڈوبنے نہیں آیا کرتے، ان کے لیے ایک چلّو کافی ہوتا ہے۔

آزاد : ذرا دیر کے لیے مان لو کہ ہم مر گئے، تو اطلاع دوگے نہ؟

خوجی : پہلے تو ہم تم سے پہلے ہی ڈوب جائیں گے،اور اگر بدنصیبی سے بچ گئے، تو جا کر کہیں گے— آزاد نے شادی کر لی، اور گلچھرّے اڑا رہے ہیں۔

آزاد : تب تو آپ دوستی کا حق خوب ادا کریں گے!

خوجی : اس میں حکمت ہے۔

آزاد : کیا ہے، ہم بھی سنیں؟

خوجی : اتنا بھی نہیں سمجھتے! ارے میاں، تمھارے مرنے کی خبر پا کر حسن آرا کی جان پر بن آئے گی، وہ سر پٹک پٹک کر دم توڑ دے گی، اور جو یہ سنے گی کہ آزاد نے دوسری شادی کر لی، تو اسے تمھارے نام سے نفرت ہو جائے گی، اور رنج تو پاس پھٹکنے بھی نہ پائے گا۔ کیوں، ہے نہ اچھی ترکیب؟

آزاد : ہاں، ہے تو اچھی!

خوجی : دیکھا، بوڑھے آدمی ڈبیا میں بند کر رکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ تم لاکھ پڑھ جاؤ، پھر لونڈے ہی ہو ہمارے سامنے۔ مگر تمھاری آج کل یہ کیا حالت ہے؟ کوئی کتاب پڑھ کر دل کیوں نہیں بہلاتے؟

آزاد : جی اچاٹ ہو رہا ہے۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔

خوجی : تو خوب سیر کرو۔ ارے یار، پہلے تو ہمیں امید ہی نہیں کہ ہندستان پہنچے، لیکن زندہ بچے، اور ہندستان کی صورت دیکھی، تو زمین پر قدم نہ رکھیں گے، لوگوں سے کہیں گے، تم لوگ کیا جانو، مالٹا کہاں ہے؟ خوب گپے اڑائیں گے۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آدمی ایک کوٹھے میں گئے۔ وہاں قہوے کی دکان تھی۔ آزاد نے ایک آدمی کے ہاتھ افیم منگائی۔ خوجی نے افیم دیکھی تو کھل گئے۔ وہیں گھولی اور چسکی لگائی۔ واہ آزاد، کیوں نہ ہو، یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اس وقت ہم بھی اپنے وقت کے بادشاہ ہیں۔

فکر دنیا کی نہیں رہتی ہے مے خواروں میں،

غم غلط ہو گیا جب بیٹھ گئے یاروں میں۔

اس دکان میں بہت سے اخبار میز پر پڑے تھے۔ آزاد ایک کتاب دیکھنے لگے۔ مالک دکان نے دیکھا، تو پوچھا— کہاں کا سفر ہے؟

آزاد : ترکی جانے کا ارادہ ہے۔

مالک : وہاں ہماری بھی ایک کوٹھی ہے۔ آپ وہاں ٹھہریئے گا۔

آزاد : آپ ایک خط لکھ دیں، تو اچھا ہو۔

مالک : خوشی سے۔ مگر آج کل تو وہاں جنگ چھڑی ہے!

آزاد : اچھا، چھڑ گئی؟

مالک : ہاں، چھڑ گئی۔ لڑائی سخت ہوگی۔ لوہے سے لوہا لڑے گا۔

جب آزاد یہاں سے چلنے لگے، تو مالک نے اپنے لڑکے نام خط لکھ کر آزاد کو دیا۔ دونوں آدمی وہاں سے آ کر جہاز پر بیٹھے۔

(53)

رات کے گیارہ بجے تھے، چاروں بہنیں چاندنی کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ ایکاایک ماما نے کہا— اے حضور، ذری چپ تو رہیے۔ یہ غل کیسا ہو رہا ہے؟ آگ لگی ہے کہیں۔

حسن آرا: ارے، وہ شعلے نکل رہے ہیں۔ یہ تو بالکل قریب ہے۔

نواب صاحب: کہاں ہو سب کی سب! ضروری سامان باندھ کر الگ کرو۔ پڑوس میں شہزادے کے یہاں آگ لگ گئی۔ زیور اور جواہرات الگ کر لو۔ اسباب اور کپڑے کو جہنم میں ڈالو۔

بہار بیگم: ہائے، اب کیا ہوگا!

حسن آر: ہائے ہائے، شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔

نیچے اتر کر سبھوں نے بڑی پھرتی سے سب چیزیں باہر نکالیں اور پھر کوٹھے پر گئیں، تو کیا دیکھتی ہیں کہ ہمایوں فر کی کوٹھی میں آگ لگی ہے اور ہر طرف سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ یہ سب اتنی دور پر کھڑی تھی، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاروں طرف بھٹی ہی بھٹی ہے۔ دھنیاں جو چٹکیں، تو بس، یہی معلوم ہوا کہ بادل گرج رہا ہے۔

بہار بیگم: ہائے، لاکھوں پر پانی پڑ گیا۔

سپہر آرا: بہن، ادھر تو آؤ۔ دیکھو، ہزاروں آدمی جمع ہیں۔ ذرا دیکھو، وہ کون ہے؟ ہے ہے! وہ کون ہے؟

بہار بیگم: کہاں کون ہے؟

سپہر آرا: وہ مہتابی پر کون ہے؟

حسن آرا: ارے، یہ تو ہمایوں فر ہیں۔ غضب ہو گیا۔ اب یہ کیونکر بچیں گے؟

سپہر آرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر بولی— باجی، اب ہوگا کیا؟ چاروں طرف آگ ہے۔ بچے گا کیونکر بے چارہ!

بہار بیگم: اس کی جوانی پر ترس آتا ہے۔

حسن آرا منھ ڈھانپ کر خوب روئی۔ سپہر آرا کا یہ حال تھا کہ آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ ہمایوں فر مہتابی پر اس تاک میں سوئے تھے کہ شاید ان حسینوں میں سے کسی کا جلوہ نظر آئے۔

لیکن ٹھنڈی ہوا چلی، تو آنکھ لگ گئی۔ جب آگ لگی اور چاروں طرف غل مچا، تو جاگے، لیکن کب؟ جب مہتابی کے نیچے کے حصے میں چاروں طرف آگ لگ چکی تھی۔ خدمت گاروں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہی سوچتے تھے، کسی طرح سے اس بے چارے کی جان بچائیں۔ اسباب بٹورنے کی فکر کسے! کوئی شہزادے کی جوانی کو یاد کر کے روتا تھا، کوئی سر دھن کر کہتا تھا— غریب بوڑھی ماں کے دل پر کیا گزرے گی؟ شہر کے غول کے غول آدمی آکر جمع ہو گئے۔ سپاہی اور چوکیدار، شہر کے رئیس اور افسر امڑے چلے آتے تھے۔ دریا سے ہزاروں گھڑے پانی لایا جاتا تھا۔ بہشتی اور مزدور آگ بجھانے میں مصروف تھے۔ مگر ہوا اس تیزی پر تھی کہ پانی تیل کا کام دیتا تھا شہزادے اس ناامیدی کی حالت میں سوچ رہے تھے کہ جن لوگوں کے دیدار کے لیے میں نے اپنی جان گنوائی، انھیں معلوم ہو جائے، تو میں سمجھوں کہ جی اٹھا۔ اتنے میں ادھر نظر پڑی، تو دیکھا کہ سب کی سب عورتیں کوٹھے پر کھڑی ہائے ہائے کر رہی ہیں۔ سوچے، خیر شکر ہے! جس کے لیے جان دی، اس کو اپنا ماتم کرتے تو دیکھ لیا۔ ایکاایک انھیں اپنا چھوٹا بھائی یاد آیا۔ اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا— بھئی، گھر بار تمھارے سپرد ہے۔ ماں کو تسلی دینا کہ ہمایوں فر نہ رہا، تو میں تو ہوں۔ یہ فقرہ سن کر سب لوگ رونے لگے۔ اتنے میں آگ کے شعلے اور قریب آئے اور ہوا نے اور زور باندھا، تو شہزادہ نے سپہرآرا کی طرف نظر کر کے تین بار سلام کیا۔ چاروں بہنیں دیواروں سے سر ٹکرانے لگیں کہ ہائے، یہ کیا ستم ہوا! شہزادے نے یہ کیفیت دیکھی، تو اشارے سے منع کیا۔ لیکن دونوں بہنوں کی آنکھوں میں اتنے آنسو بھرے ہوئے تھے کہ انھیں کچھ دکھائی نہ دیا۔

سپہرآرا کھڑکی کے پاس جا کر پھر سر پیٹنے لگی۔ ہمایوں فر اسے دیکھ کر اپنا صدمہ بھول گئے اور ہاتھ باندھ کر دور ہی سے کہا— اگر یہ کروگی، تو ہم اپنی جان دے دیں گے! گویا جان بچنے کی امید ہی تو تھی! چاروں طرف آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے، دھواں بادل کی طرف چھایا ہوا تھا۔ بھاگنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ ہوا کہتی ہے کہ میں آج ہی تیزی دکھلاؤں گی، اور آپ کہتے ہیں کہ میں اپنی جان دے دوں گا۔

اتنے میں جب آگ بہت ہی قریب آگئی، تو ہمایوں فر کی ہمّت چھوٹ گئی۔ بے چینی کی حالت میں ساری چھت پر گھومنے لگے۔ آخر یہاں تک نوبت آئی کہ جو لوگ قریب کھڑے تھے، وہ لپٹوں کے مارے اور دور بھاگنے لگے۔ آگ ہمایوں فر سے صرف ایک گز

کے فاصلے پر تھی۔ آنچ سے پھونکے جاتے تھے۔ جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی، تو آخری بار سپہرآرا کی طرف ٹوپی اتار کر سلام کیا اور بدن کو تول کر دھم سے کود پڑے۔

اُدھر سپہرآرا نے بھی ایک چیخ ماری اور کھڑکی سے نیچے کودی۔

شہزادہ صاحب نیچے گھاس پر گرے۔ یہاں زمین بالکل نرم اور گیلی تھی۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور ہاتھوں ہاتھ زمین سے اٹھا لیا۔ لطف کی بات یہ کہ سپہرآرا کو بھی ذرا چوٹ نہیں لگی تھی۔ اس نے اٹھتے ہی کہا کہ لوگو، ہمایوں شہزادہ بچا ہو، تو ہمیں دکھا دو۔ نہیں تو اسی کی قبر میں ہم کو بھی زندہ دفن کر دینا۔

اتنے میں نواب صاحب نے سپہرآرا کو الگ لے جا کر کہا— تم گھبراؤ نہیں۔ شہزادہ صاحب خیریت سے ہیں۔

سپہرآرا: ہائے! دولہا بھائی، میں کیونکر مانوں۔

نواب صاحب: نہیں بہن، آؤ، ہم انھیں ابھی دکھائے دیتے ہیں۔

سپہرآرا: پھر دکھاؤ میرے دولہا بھائی!

نواب صاحب: ذرا بھیڑ چھنٹ جائے، تو دکھاؤں۔ تب تک گھر چلی چلو۔

سپہرآرا: پھر دکھاؤ گے؟ ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر کہو۔

نواب صاحب: اس سر کی قسم، ضرور دکھائیں گے۔

سپہرآرا کو اندر پہنچا کر نواب صاحب ہمایوں فر کے یہاں پہنچے، تو دیکھا کہ ٹانگ میں کچھ چوٹ آئی ہے۔ ڈاکٹر پٹی باندھ رہا ہے اور بہت سے آدمی انھیں گھیرے کھڑے ہیں۔ لوگ اس بات پر بحث کر رہے ہیں کہ آگ لگی کیونکر؟ رات بھر شہزادے کی حالت بہت خراب رہی۔ درد کے مارے تڑپ تڑپ اٹھتے۔ صبح کو چارپائی سے اٹھ کر بیٹھے ہی تھے کہ چٹھی رساں نے آ کر ایک خط دیا۔ شہزادے صاحب نے اس خط کو نواب صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے یہ مضمون پڑھ سنایا۔

اجی حضرت، تسلیم،

سچ کہنا، کیسا بدلہ لیا! لاکھ لاکھ سمجھایا، مگر تم نے نہ مانا۔ آخر، تم خود ہی مصیبت میں پڑے۔ تم نے ہمارا دل جلایا ہے، تو ہم تمھارا گھر بھی نہ جلائیں؟ جس وقت یہ خط تمھارے پاس پہنچے گا، مکان جل بھُن کے خاک ہو گیا ہوگا۔

شہزادے صاحب نے یہ مضمون سُنا، تو تیوریوں پر بل پڑ گئے اور چہرہ مارے غصّے کے سرخ پڑ گیا۔

(54)

رات کا وقت تھا، ایک سوار ہتھیار سجاتے، راتوں رات گھوڑے کو کڑکڑاتا ہوا، بگٹٹ بھاگا جاتا تھا۔ دل میں چور تھا کہ کہیں پکڑ نہ جاؤں! جیل خانہ جھیلوں۔ سوچ رہا تھا، شہزادے کے گھر میں آگ لگائی ہے، خیرت نہیں۔ پولس کی دوڑ آتی ہی ہوگی۔ رات بھر بھاگتا ہی گیا۔ آخر صبح کو ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ بدن تھک کر چور ہو گیا تھا۔ ابھی گھوڑے سے اترا ہی تھا کہ بستی کی طرف سے غل کی آواز آئی۔ وہاں پہنچا، تو کیا دیکھتا ہے کہ گاؤں بھر کے باشندے جمع ہیں، اور دو گنوار آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ابھی یہ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک نے دوسرے کے سر پر ایسا لٹھ مارا کہ وہ زمین پر آ رہا۔ لوگوں نے لٹھ مارنے والے کو گرفتار کر لیا اور تھانے پر لائے۔ شہسوار نے دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ دونوں کی ایک جوگن سے آشنائی تھی۔

سوار : یہ جوگن کون ہے بھئی؟

ایک گنوار : اتنی عمر آئی، اُس جوگن کتھوں نہ دِیکھ۔

اتنے میں تھانے دار آ گئے۔ زخمی کو چارپائی پر ڈال کر اسپتال بھجوایا اور خونی کو گواہوں کے ساتھ تھانے لے گئے۔ میاں سوار بھی ان کے ساتھ ہو لیے، تھانے میں تحقیقات ہونے لگی۔

تھانے دار : یہ کس بات پر جھگڑا ہوا جی؟

چوکیدار : حضور، وہ سائیں جون جوگن بنی ہے۔

تھانے دار : ہم تم سے اتنا پوچھتا ہے کس بات پر لڑائی ہوا؟

چوکیدار : جیسے اِہو وہاں جات رہے اور وَہو وہاں جات رہے۔ تَون آپس میں لگا ڈانٹ ہو گئی۔ اے بس، ایک دن مار دھار ہو گئی۔ بس، لاٹھی چلے لاگ۔ مور سے رکت بہت بہا۔

مولوی : صوبے دار صاحب، آج دونوں نے خوب کجیاں چڑھائی تھیں۔

تھانے دار : آپ کون ہیں؟

مولوی : حضور، گاؤں کا قاضی ہوں۔

تھانے دار : یہیں مکان ہے آپ کا؟

مولوی : جی ہاں، پرانہ رئیس ہوں۔

شہسوار : بے شک!

تھانے دار : دیہات والے بھی عجیب جانگلو ہوتے ہیں۔ ایک بار ایک دیہاتی مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بڑے بڑے گنوار کے لٹھ جمع تھے۔ ایک صاحب نے شعر پڑھا، تو آخر میں فرماتے ہیں— بیمار ہَوں۔ لوگ حیرت میں تھے کہ اس ہَوں کے کیا معنی۔ پھر حضرت نے فرمایا— سرشار ہَوں۔ مارے ہنسی کے لوٹ گیا، ہاں، مولوی صاحب، پھر کیا ہوا؟

مولوی : بس، جناب، پھر دونوں میں کشتی ہوئی۔ کبھی یہ اوپر، وہ نیچے، کبھی وہ نیچے، یہ اوپر۔ تب تو میں بھاگا کہ چوکیدار سے کہوں۔ دھوڑتا گیا۔

تھانے دار : جناب، اس مہاورے کو یاد رکھیے گا۔

مولوی : بس، میں دھوڑ کے پورن چوکیدار کے مکان پر گیا۔ اس کی جوڑو بولی۔

سوار : کون بولی؟

تھانے دار : (ہنس کر) سنا نہیں آپ نے؟ جوڑو!

مولوی : حضور، حکّام ہیں، آپ کو ہنسنا نہ چاہیے۔

تھانے دار : جی ہاں، میں حکّام ہوں، مگر آپ بھی تو امراء ہیں! ہاں، فرماؤ جی!

مولوی : دیکھیے، فرماتا ہوں۔

سوار : اب ہنسی ضبط نہیں ہوسکتی۔

مولوی : بس جناب وہاں سے میں اس چوکیدار کو لایا۔ وہاں آکر دیکھا، تو خون کے دریا بہہ رہے تھے۔

اتنے میں خبر آئی کہ زخمی دنیا سے روانہ ہو گیا۔ تھانے دار صاحب مارے خوشی کے پھول گئے۔ معمولی مار پیٹ 'خون' ہو گئی۔ خونی کا چالان کیا اور جج نے اسے پھانسی کی سزا دے دی۔

جس وقت خونی کو پھانسی ہو رہی تھی، میاں سوار بھی تماشہ دیکھنے آپہنچے۔ مگر اس وقت کی حالت دیکھ کر ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ آنکھیں کھل گئیں۔ سوچنے لگے— دنیا سے ناطہ توڑ لیں۔ کسی سے حسد اور کینہ نہ رکھیں۔ اگر کہیں پکڑ گیا ہوتا، تو مجھے بھی یوں ہی پھانسی ملتی۔ خدا نے بہت بچایا۔ مگر ذرا اس جوگن کو دیکھنا چاہیے۔ یہ دل میں ٹھان کر جوگن کے مکان کی طرف چلے۔

جب لوگوں سے پوچھتے ہوئے اس کے مکان پر پہنچے، تو دیکھا کہ ایک خوبصورت باغ ہے اور ایک چھوٹا سا خوشنما بنگلہ، بہت صاف ستھرا۔ مکان کیا، پری خانہ تھا۔ جوگن کے قریب جا کر اس کو سلام کیا۔ جوگن کے پور پور پر جوبن تھا۔ جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ سر سے پیر تک سندلی کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ شہسوار ہزار جان سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ جوگن ان کے چتونوں سے تاڑ گئی کہ حضرت کا دل آیا ہے۔

سوار : بڑی دور سے آپ کا نام سن کر آیا ہوں۔

جوگن : اکثر لوگ آیا کرتے ہیں۔ کوئی آئے، تو خوشی نہیں، نہ آئے، تو رنج نہیں۔

سوار : میں چاہتا ہوں کہ عمر بھر آپ کے قدموں کے تلے پڑا رہوں۔

جوگن : آپ کا مکان کہاں ہے؟

سوار:

گھر بار سے کیا فقیر کو کام؟
کیا لیجیے چھوڑے گاؤں کا نام

جوگن : یہاں کیسے آئے؟

سوار : رمتے جوگی تو ہیں ہی، ادھر بھی آنکلے۔

جوگن : آخر اتنا تو بتلاؤ کہ ہو کون؟

سوار : ایک بدنصیب آدمی۔

جوگن : کیوں؟

سوار : اپنے کاموں کا پھل۔

جوگن : سچ ہے۔

سوار : مجھے عشق ہی نے تو غارد کر دیا۔ ایک بیگم کی دو لڑکیاں ہیں۔ ان سے آنکھیں لڑ

گئیں۔ جیتے جی مر مٹا۔

جوگن : شادی نہیں ہوئی۔

سوار : ایک دشمن پیدا ہو گیا۔ آزاد نام تھا۔ بہت ہی خوبصورت سجیلا جوان۔

میاں آزاد کا نام سنتے ہی جوگن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ شہسوار دنگ تھے کہ بیٹھے بٹھائے اسے کیا ہو گیا۔

سوار : ذرا دل کو ڈھارس دو، آخر تمھیں کس بات کا رنج ہے؟

جوگن :

خوف سے لیتے نہیں نام کہ سن لے نہ کوئی،

دل ہی دل میں تمھیں ہم یاد کیا کرتے ہیں۔

ہماری داستان غم سے بھری ہوئی ہے۔ سن کر کیا کروگے۔ ہاں، تمھیں ایک صلاح دیتی ہوں۔ اگر چاہتے ہو کہ دل کی مراد پوری ہو، تو دل صاف رکھو۔

سوار : تمھارے سوا اگر کسی اور پر نظر پڑے، تو آنکھیں پھوٹ جائیں۔

جوگن : یہی دل کی صفائی ہے؟

سوار : شیشی سے گلاب نکال لو۔ مگر گلاب کی بو باقی رہے گی۔ دنیا کو چھوڑ تو بیٹھیں، پر عشق دل سے نہ جائے گا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ تمھارے ہی ساتھ زندگی بسر کریں۔ آزاد اس کے ساتھ رہیں، ہم تمھارے ساتھ۔

جوگن : بھلا تم آزاد کو پاؤ، تو کیا کرو؟

سوار : کچا ہی چبا جاؤں؟

جوگن : تو پھر ہم سے نہ بنے گی؟ اگر تمھارا دل صاف نہیں، تو اپنی راہ لو۔

سوار : اچھا، اب آج سے آزاد کا نام ہی نہ لیں گے۔

(55)

آزاد کا جہاز جب اسکندریہ پہنچا، تو وہ خوجی کے ساتھ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ جب کھانا کھانے کا وقت آیا، تو خوجی بولے۔ لاحول، یہاں کھانے والے کی ایسی تیسی! چاہے اِدھر کی دنیا ادھر ہو جائے، مگر ہم ذرا سی تکلیفوں کے لیے اپنا مذہب نہ چھوڑیں گے۔ آپ

شوق سے جائیں اور مزے سے کھائیں، ہمیں معاف ہی رکھیے۔

آزاد : اور افیم کھانا مذہب کے خلاف نہیں ہے؟

خوجی : کبھی نہیں! اور، اگر ہو بھی ، تو کیا یہ ضروری ہے کہ ایک کام مذہب کے خلاف کیا، تو اور بھی سب کام مذہب کے خلاف ہی کریں؟

آزاد : اجی، تو کس گدھے نے تم سے کہا کہ یہاں کھانا مذہب کے خلاف ہے؟ میز کرسی دیکھی اور چیخ اٹھے کہ مذہب کے خلاف ہے؟ اس خبط کی بھی کوئی دوا ہے!

خوجی : اجی، وہ خبط ہی سہی۔ آپ رہنے دیجیے۔

آزاد : کھاؤ، یا جہنم میں جاؤ۔

خوجی : جہنم میں وے جائیں گے، جو یہاں کھائیں گے۔ یہاں تو سیدھے جنّت میں پہنچے گے۔

آزاد : وہاں افیم کہاں سے آئے گی؟

اتنے میں دو ترکی آئے اور اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مزے سے کھانے لگے۔ آزاد کی چڑھ بنی، پوچھا، خواجہ صاحب، بول گیدی، اب شرمایا یا نہیں؟ خوجی نے پہلے تو کہا، یہ مسلمان نہیں ہیں۔ پھر کہا، شاید ہوں ایسے ویسے! مگر جب معلوم ہوا کہ دونوں خاص ترکی کے رہنے والے ہیں، تو بولے— آپ لوگ یہاں ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں؟ کیا یہ مذہب کے خلاف نہیں؟

ترکی : مذہب کے خلاف کیوں ہونے لگا؟

آخر خوجی جھینپے؟ پھر ہوٹل میں کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر کے بعد آزاد تو ایک صاحب سے ملنے چلے اور خوجی نے پینک لینا شروع کیا۔ جب نیند کھلی، تو سوچے کہ ہم بیٹھے بیٹھے کب تک یہیں مکھیاں ماریں گے۔ آؤ دیکھیں، اگر کوئی ہندستانی بھائی مل جائے، تو گپیں اڑائیں۔ ادھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ آخر کار ایک ہندستانی سے ملاقات ہوئی۔ سلام بندگی کے بعد باتیں ہونے لگیں۔ خواجہ صاحب نے پوچھا— کیوں صاحب، یہاں کوئی افیم کی دکان ہے؟ اس آدمی نے اس کا کچھ جواب ہی نہ دیا۔ خوجی تیکھے آدمی— ان کا بھلا یہ تاب کہاں کہ کسی سے سوال کریں اور وہ جواب نہ دے؟ بگڑ کھڑے ہوئے— نہ ہوئی کرولی، خدا کی قسم! ورنہ تماشہ دکھا دیتا۔

ہندستانی نے سمجھا، یہ پاگل ہے۔ اگر بولوں گا، تو خدا جانے، کاٹ کھائے، یا چوٹ

کرے۔ اس سے یہی اچھا کہ چپ ہو رہو۔ میاں خوجی سمجھے کہ دب گیا اور بھی اکڑ گئے۔ اس نے سمجھا، اب چوٹ کیا ہی چاہتا ہے۔ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا پیچھے ہٹنا تھا کہ میاں خوجی اور بھی شیر ہوئے۔ مگر گندے تول تول کر رہ جاتے تھے۔ پھر رعب سے پوچھا— کیوں بے، یہاں ٹھنڈا پانی مل سکتا ہے؟ وہ غریب جھٹ پٹ ٹھنڈا پانی لایا۔ خوجی نے دو چار گھونٹ پانی پیا اور اکڑ کر بولے— مانگ، کیا مانگتا ہے؟ اس آدمی نے سمجھا، یہ ضرور دیوانہ ہے! آپ کی حالت تو اتنی خراب ہے، پلّے ٹکا تو ہے نہیں اور کہتے ہیں— مانگ، کیا مانگتا ہے؟ خوجی نے پھر تن کر کہا— مانگ کچھ۔ اس آدمی نے ڈرتے ڈرتے کہا— یہ جو ہاتھ میں ہے، دے دیجیے۔

خوجی کا رنگ اڑ گیا۔ جان تک مانگتا، تو دینے میں دریغ نہ کرتے، مگر چیپیا بیگم تو نہیں دی جاتی۔ اس سے پوچھا— تم یہاں کب سے ہو، کیا نام ہے؟ اس نے جواب دیا— مجھے طہوَر خان کہتے ہیں۔

خوجی : بھلا، اس ہوٹل میں مسلمان لوگ کھاتے ہیں؟

طہوَر خان : برابر! کیوں نہ کھائیں؟

ہوٹل والوں نے مِسکوٹ کی کہ خوجی کو چھیڑنا چاہیے۔ اس ہوٹل میں قاہرہ کا رہنے والا بونا تھا۔ لوگ سوچے، بس بونے اور خوجی سے پکڑ ہو، تو اچھا۔ بونا بڑا شریر تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا— چلو، تمھاری کشتی بَدی گئی ہے۔ وہ دیکھو، ایک آدمی ہندستان سے آیا ہے۔ کتنا اچھا جوڑ ہے۔ یہ سن کر بونا میاں خوجی کے قریب گیا اور جھک کر سلام کیا۔ خوجی نے جو دیکھا کہ ایک آدمی ہم سے بھی اونچا ملا، تو اکڑ کر آنکھوں سے سلام کا جواب دیا۔ بونے نے اِدھر اُدھر دیکھ کر ایک دفعہ موقع جو پایا، تو میاں خوجی کی ٹوپی اتار کر پڑاک سے ایک دھول جمائی اور ٹوپی پھینک کر بھاگا۔ مگر ذرا ذرا سے پاؤں ، بھاگ کر جاتا کہاں؟ خوجی بھی جھپٹے۔ آگے آگے بونا اور پیچھے پیچھے میاں خوجی۔ کہتے جاتے تھے— او گیدی، نہ ہوئی کرولی، نہیں تو اسی دم بھونک دیتا۔ آخر بونا ہانپ کر کھڑا ہو گیا۔ تب تو خوجی نے لپک کر ہاتھ پکڑا اور پوچھا— کیوں بے! اس پر بونے نے منھ چڑھایا۔ خوجی غصّے میں بھرے تو تھے ہی، آپ نے بھی ایک دھپ جڑی۔

خوجی : اور لے گا؟

بونا : (اپنی زبان میں) چھوڑ، نہیں مار ہی ڈالوں گا۔
خوجی : دے ماروں اٹھا کر؟
بونا : رات آنے دو۔
خوجی نے جھلّا کر بونے کو اٹھا کر دے مارا، چاروں شانے چت، اور اکڑ کر بولے— وہ مارا! اور لے گا! خوجی سے یہ باتیں؟
اتنے میں آزاد آ گئے۔ خوجی تنے بیٹھے تھے، عمر بھر میں انھوں نے آج پہلی ہی مرتبہ ایک آدمی کو نیچا دکھایا تھا۔ آزاد کو دیکھتے ہی بولے— اس وقت ایک کُشتی اور نکلی!
آزاد : کُشتی کیسی؟
خوجی : کیسی ہوتی ہے کُشتی ؟ کُشتی اور کیا؟
آزاد : معلوم ہوتا ہے، پٹے ہو۔
خوجی : پٹنے والے کی ایسی تیسی! اور کہنے والے کو کیا کہوں؟
آزاد : کُشتی نکالی!
طہور خان : ہاں حضور، یہ سچ کہتے ہیں۔
خوجی : لیجیے، اب تو آیا یقین۔
آزاد : کیا ہوا، کیا؟
طہوَر خان : جی، یہاں ایک بونا ہے۔ اس نے ان کے دھول لگائی۔
آزاد : دیکھا نا! میں تو سمجھا ہی تھا کہ پٹے ہوگے۔
خوجی : پوری بات تو سن لو۔
طہوَر خان : بس، دھول کھا کر لپکے، اس کے کئی چپتے لگائیں، اور اٹھا کر دے پٹکا۔
خوجی : وہ پٹخنی بتائی کہ یاد ہی تو کرتا ہوگا۔ دو مہینے تک کھٹیا سے نہ اٹھ سکے گا۔
طہوَر خان : وہ دیکھیے، سامنے کھڑا کون اکڑ رہا ہے؟ تم تو کہتے تھے کہ دو مہینے تک اٹھ ہی نہ سکے گا۔
رات کو کوئی نو بجے آزاد نے پانی مانگا۔ ابھی پانی پی ہی رہے تھے کہ کمرے کا لیمپ غل ہوگیا اور کمرے میں چٹاخ چٹاخ کی آوازیں گونجنے لگی۔
خوجی : ارے، یہ تو وہی بونا معلوم ہوتا ہے۔ پانی اسی نے پلایا تھا اور چپت بھی اسی

نے جڑی۔ دل میں کہا— کیا تڑکا نہ ہوگا؟ زندہ کھود کر گاڑ دوں، تو سہی۔

خوجی پانی پی کر لیٹے کہ دست کی حاجت ہوئی۔ بونے نے پانی میں جمال گوٹا ملا دیا تھا۔ تل تل پر دست آنے لگے۔ مشہور ہو گیا کہ خوجی کو ہیضہ ہوا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ اس نے دوا دی اور خوجی دستوں کے مارے نڈھال ہو کر چارپائی پر گر پڑے۔ آزاد ایک رئیس سے ملنے گئے تھے۔ ہوٹل کے ایک آدمی نے ان کو جا کر اطلاع دی۔ گھبرائے ہوئے آئے۔ خوجی نے آزاد کو دیکھ کر سلام کیا، اور آہستہ سے بولے— رخصت! خدا کرے، تم جلد یہاں سے لوٹو۔ یہ کہہ کر تین بار کلمہ پڑھا۔

آزاد : کیسی طبیعت ہے؟

خوجی : مر رہا ہوں، ایک حافظ بلواؤ اور اس سے کہو، قرآن شریف پڑھے۔

آزاد : اجی، تم دو دن میں اچھے ہو جاؤ گے۔

خوجی : زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ مگر بھئی، خدا کے واسطے ذرا اپنی جان کا خیال رکھنا۔ ہم تو اب چلتے ہیں۔ اب تک ہنسی خوشی تمھارا ساتھ دیا، مگر اب مجبوری ہے۔ آب و دانے کی بات ہے، ہم کو یہاں کی مٹی گھسیٹ لائی۔

آزاد : اجی نہیں، آج کے چوتھے روز دندناؤ گے۔ دیکھ لینا ڈنڈ پیلتے ہو گے۔

خوجی : خدا کے ہاتھ ہے۔

آزاد : دیکھیے، کب ملاقات ہوتی ہے۔

خوجی : اس بوڑھے کو کبھی کبھی یاد کرتے رہنا۔ ایک بات یاد رکھنا، پردیس کا واسطہ ہے، سب سے مِل جُل کر رہنا۔ جوتی پیزار، لڑائی جھگڑا کسی سے نہ کرنا۔ سمجھدار ہو تو کیا، آخر بچے ہی ہو۔ یار، جدائی ایسی اکھر رہی ہے کہ بس، کیا بیان کروں۔

آزاد : اچھے ہو جاؤ، تو ہندستان چلے جانا۔

خوجی : ارے میاں، یہاں دم بھر کا بھروسہ نہیں ہے۔

دوسرے دن آزاد خوجی سے رخصت ہو کر جہاز پر سوار ہوئے۔ اتنے دنوں کے بعد خوجی کی جدائی سے انھیں بہت رنج ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نیند آ گئی، تو خواب دیکھا کہ وہ حسن آرا بیگم کے دروازے پر پہنچے ہیں اور وہ انھیں پھولوں کا ایک گلدستہ دے رہی ہیں۔ ایکا ایک توپ دغی اور آزاد کی آنکھ کھل گئی۔ جہاز قسطنطنیہ پہنچ گیا تھا۔

(56)

آزاد تو اُدھر قاہرے کی ہوا کھا رہے تھے، ادھر حسن آرا بیمار پڑیں۔ کچھ دن تک تو حکیموں اور ڈاکٹروں کی دوا ہوئی، پھر گنڈے تعویذ کی باری آئی۔ آخر آب و ہوا تبدیل کرنے کی ٹھہری۔ بہار بیگم کے پاس گومتی کے کنارے ایک بہت اچھی کوٹھی تھی۔ چاروں بہنیں، بڑی بہن اور گھر کے نوکر چاکر سب اس نئی کوٹھی میں آپہنچے۔

بیگم : مکان تو بڑا کشادہ ہے! دیکھوں چندر بیدھی ہے یا سُوریہ بیدھی۔

حسن آرا : ہاں امّاں جان، یہ ضرور دیکھنا چاہیے۔

روح افزا : اے لو، ضرور۔ ہزار کام چھوڑ کر۔

دونوں بہنیں ہنستی بولتی مکان کے دالان اور کمرے دیکھنے لگیں۔ چھت پر ایک کمرے کے دروازے جو کھولے، تو دیکھا، دریا لہریں مار رہا ہے۔ حسن آرا نے کہا— باجی، اس وقت جی خوش ہو گیا۔ ہماری پلنگڑی یہیں بچھے۔ برسوں کا بیمار یہاں رہے، تو دو دن میں اچھا بھلا چنگا ہو جائے۔

سپہر آرا : بہار بہن، بھلا کبھی اندھیرے اجالے دولہا بھائی نہانے دیتے ہیں دریا میں؟

بہار بیگم : اے ہے، اس کا نام بھی نہ لینا۔ ان کو بہت چڑھ ہے اس بات کی۔

صبح کا وقت تھا، چاروں بہنیں اونچی چھت پر ہوا کھانے لگیں کہ اتنے میں ایک طرف سے دھواں اٹھا۔ حسن آرا نے پوچھا— یہ دھواں کیسا ہے؟

روح افزا : اس گھاٹ پر مُردے جلائے جاتے ہیں۔

حسن آرا : مردے یہیں جَلتے ہیں؟

بہار بیگم : ہاں، مگر یہاں سے دور ہے۔

سپہر آرا : ہائے، کیا جانے کون بے چارہ جل رہا ہوگا؟

روح افزا : زندگی کا بھروسہ نہیں۔

بڑی بیگم نے سنا کہ یہاں مُردے جلائے جاتے ہیں، تو ہوش اڑ گئے۔ بولیں— اے بَہار، تم یہاں کیسے رہتی ہو؟ خورشید دولہا آئیں تو ان سے کہوں۔

حسن آرا : فائدہ؟ برسوں سے تو وہ یہاں رہتے ہیں، بھلا تمھارے کہنے سے مکان چھوڑ

دیں گے!

سپہرآرا : یہ ہمیشہ یہاں رہتے ہیں، کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہم جو دو دن رہیں گے، تو مردے آکر چمٹ جائیں گے بھلا؟

بڑی بیگم کا بس چلتا، تو کھڑے کھڑے چلی جاتیں، مگر اب مجبور تھیں۔ یہاں سے چاروں بہنیں دوسری چھت پر گئیں، تو بہار بیگم نے کہا— یہ جو اس طرف دور تک اونچے اونچے ٹیلے نظر آتے ہیں، یہاں آبادی تھی۔ جہاں تم بیٹھی ہو، یہاں وزیر کا مکان تھا۔ مجال کیا تھا کہ کوئی اس طرف آ جاتا! مگر اب وہاں خاک اڑتی ہے، کتے لوٹ رہے ہیں۔

اتنے میں ایک کشتی اسی گھاٹ پر آکر رکی۔ اس پر سے دو آدمی اترے، ایک بوڑھے تھے دوسرا نوجوان۔ دونوں ایک قالین پر بیٹھے اور باتیں کرنے لگے۔ بوڑھے میاں نے کہا— میاں آزاد سا دلیر جوان بھی کم دیکھنے میں آئے گا۔ یہ انھیں کا شعر ہے۔

سینے کا چمن بنائیں گے ہم،
گل کھائیں گے گل کھلائیں گے ہم۔

جوان (گل باز) : میاں آزاد کون تھے جناب؟

اس پر بوڑھے میاں نے آزاد کی ساری داستان بیان کر دی۔ دونوں بہنیں کان لگا کر دونوں آدمیوں کی باتیں سنتی تھیں اور روتی تھیں۔ حیرت ہو رہی تھی کہ یہ دونوں کون ہیں اور آزاد کو کیسے جانتے ہیں؟ مہری سے کہا— جاکے پتہ لگا کہ وہ دونوں آدمی، جو درخت کے سائے میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں، کون ہیں؟ مہری نے ایک بہشتی کے لڑکے کو اس کام پر تعینات کیا۔ لڑکے نے ذرا دیر میں آکر کہا— دونوں آدمی سرائے میں ٹھہریں گے اور دو دن یہاں رہیں گے۔ مگر ہیں کون، یہ پتہ نہ چلا۔ مہری نے جا کر یہی بات حسن آرا سے کہہ دی۔ حسن آرا نے کہا— اس لڑکے کو یہ چونّی دو اور کہو، جہاں یہ نکلیں، ان کے ساتھ جائے اور دیکھ آئے۔ مہری نے زور سے پکارا— ابے او شُبراتی! سن، ان دونوں آدمیوں کے ساتھ جا۔ دیکھ، کہاں نکلتے ہیں۔

شُبراتی : اجی، ابھی پہنچا۔

شُبراتی چلے۔ راستے میں آپ کو شوق چرایا کہ چھلاّ میری کھیلیں۔ ایک گھنٹے میں شُبراتی نے کوئی ڈھیڑ پیسے کی کوڑیاں جیتیں۔ مگر لالچ کا برا ہو، جھے، تو دم کے دم میں ڈیڑھ

پیسہ وہ ہارے، اور بارہ کوڑیاں گرہ سے گئیں، وہاں سے اداس ہو کر چلے۔ راہ میں بندر کا تماشہ ہو رہا تھا۔ اب میاں شُبراتی جا چکے۔ کبھی بندریا کو چھیڑا، کبھی بکرے پر ڈھیلا پھینکا۔ مداری نے دیکھا کہ لونڈا تیز ہے، تو بولا— ادھر آؤ جوان، آدمی ہو کہ جانور؟

شُبراتی : آدمی۔

مدراری : سور کہ شیر؟

شُبراتی : ہم شیر، تم سور۔

مداری : گدھا کہ گدھی؟

شُبراتی : گدھا۔

مداری : الّو کہ بیل؟

شُبراتی : تم الّو، تمھارے باپ بیل، اور تمھارے دادا بچھیا کے تاؤ۔

تھوڑی دیر کے بعد میاں شُبراتی یہاں سے روانہ ہوئے، تو ایک رئیس کے یہاں ایک سپیرا سانپ کا تماشہ دکھا رہا تھا۔ میاں شُبراتی بھی ڈٹ گئے۔ سپیرا تونبی میں بھیروی کا رنگ دکھاتا تھا۔

رئیس نے کہا : تب جانیں، جب کسی کے سر سے سانپ نکالو۔

سپیرے نے کہا : حضور، منتر میں سب قدرت ہے۔ مُل کوئی آدھ سیر آٹا تو پیٹ بھر کھانے کو دو۔ جس کے بدن سے کہیے، سانپ نکالوں۔

لونڈے یہ سن کر ہرّ ہو گئے کہ دھرے نہ جائیں۔ میاں شُبراتی ڈٹے رہے۔

سپیرا : واہ جوان، تمھیں ایک بہادر ہو۔

شبراتی : اور ہمارے باپ ہم سے بڑھ کر۔

سپیرا : یہاں بیٹھ تو جاؤ۔

میاں شُبراتی بے دھڑک جا بیٹھے، سپیرے نے جھوٹ موٹ کوئی منتر پڑھا اور زور سے میاں شبراتی کی کھونپڑی پر دھپ جما کر کہا یہ لیجیے سانپ۔ واہ واہ کا دونگڑا بج گیا۔ رئیس نے سپیرے کو پانچ روپے انعام دیے اور کہا— اس لونڈے کو چار آنے پیسے دے دو۔ میاں شبراتی نے چونّی پائی، تو پھولے نہ سمائے۔ جاتے ہی گول گپّے والے سے پیسے کے کچالو، دھیلے کے دہی بڑے، دھیلے کی سونٹھ کی ٹکیا لی اور چکھتے ہوئے چلے۔ پھر تکیے پر جا کر کوڑیاں کھیلنے لگے۔

دو پیسے کی کوڑیاں ہارے۔ وہاں سے اٹھے، تو حلوائی کی دکان پر ایک آنے کی پوریاں کھائیں اور کنوئیں پر پانی پیا۔ وہاں سے آکر مہری کو پکارا۔

مہری : کہو، وہ ہیں؟

شُبراتی : وہ تو چلے گئے۔

مہری : کچھ معلوم ہے، کہاں گئے؟

شُبراتی : ریل پر سوار ہو کر کہیں چل دیے؟

مہری نے جا کر حسن آرا کو یہ خبر کہی، تو انھوں نے کہا— لونڈے سے پوچھو، شہر ہی میں ہیں یا باہر چلے گئے؟ مہری نے جا کر پھر شبراتی سے پوچھا— شہر میں ہیں یا باہر چلے گئے؟ شبراتی کو اس کی یاد نہ رہی کہ میں نے پہلے کیا کہا تھا، بولا— کسی اور سرائے میں اٹھ گئے۔

مہری : کیوں رے جھوٹے، تو تو کہتا تھا، ریل پر چلے گئے؟

شُبراتی : میں نے؟

مہری : چل جھوٹے، تو گیا کہ نہیں؟

شُبراتی : ابّا کی قسم، گیا تھا۔

مہری : چل دور ہو، موا جھوٹا۔

اتنے میں بڑی بیگم کا پرانا نوکر حسین بخش آگیا۔ حسن آرا نے اسے بلا کر کہا— بڑے میاں، ایک صاحب آزاد کے جاننے والوں میں یہاں آئے ہیں اور کسی سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ تم ذرا اس لونڈے شبراتی کے ساتھ اس سرائے تک جاؤ اور پتہ لگاؤ کہ وہ کون صاحب ہیں۔ اب میاں شُبراتی چکرائے کہ خدا ہی خیر کرے۔ دل میں چور تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ابھی سرائے میں ٹکے ہی ہوں، تو مجھ پر بے بھاؤ کی پڑنے لگے۔ دبے دانتوں کہا، چلیے؟ آگے آگے حسین بخش اور پیچھے پیچھے میاں شُبراتی چلے۔ راہ میں شبراتی نے ایک لونڈے کی کھوپڑی پر دھپ جمائی، اور آگے بڑھے، تو ایک دیوانے پر کئی ڈھیلے پھینکے۔ اور دو قدم گئے، تو ایک بوڑھی ماما سے کہا— نانی، سلام۔ وہ گالیاں دینے لگی، مگر آپ بہت کھلکھلائے۔ اور آگے چلے، تو ایک اندھا ملا۔ آپ نے اس سے کہا— آگے گڈھا ہے، اور اس کی لاٹھی چھین لی۔ حسین بخش کبھی مسکراتے تھے، کبھی سمجھاتے۔ چلتے چلتے ایک تیلی ملا، میاں شبراتی نے پوچھا— کیوں بھئی تیلی، مرنا، تو اپنی کھوپڑی مجھے دے دینا۔ منتر جگاؤں گا۔ تیلی نے کہا—

چپ! لونڈا بڑا شریر ہے۔ اور آگے بڑھے، تو ایک رنگریز سے پوچھا— کیوں بڑے بھائی، اپنی داڑھی نہیں رنگتے؟ اس نے کہا— کہو، تمھارے باپ کی داڑھی رنگ دیں نیل سے۔ اب سنیے، دو ہندو بوریا بکچا سنبھالے کہیں باہر جانے کے لیے گھر سے نکلے۔ میاں شُبراتی ایک آنکھ دبا کر سامنے جا کھڑے ہوئے۔ وہ سمجھے، سچ مچ کانا ہے۔ ایک نے کہا— ابے، ہٹ سامنے سے او بے کانے؟ آپ نے وہ آنکھ کھول دی۔ دوسری دبا لی۔ دونوں آدمی اسے آشگُن سمجھ کر اندر چلے گئے۔ اتنے میں ایک کانی عورت سامنے سے آئی۔ میاں شبراتی نے دیکھتے ہی ہانک لگائی— 'ایک لکڑیاں بانسے کی، کانی آنکھ تماشے کی۔'

جیوں ہی دونوں سرائے میں پہنچے، حسین بخش نے بڑھ کر بوڑھے میاں کو سلام کیا۔ بڑے میاں بولے— جناب، میاں آزاد سے میری پرانی ملاقات ہے۔ میری لڑکیوں کے ساتھ وہ مدت تک کھیلا کیے ہیں۔ میری چھوٹی لڑکی سے ان کے نکاح کی بھی تجویز ہوئی تھی، مگر اب تو وہ ایک بیگم سے قول ہار چکے ہیں۔ اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں۔ شام کو حسین بخش رخصت ہوئے اور گھر آکر حسن آرا سے کہا— وہ تو آزاد کے پرانے ملاقاتی ہیں۔ شاید آزاد نے ان کی ایک لڑکی سے نکاح کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے، یہ سنتے ہی حسن آرا کا رنگ فق ہو گیا۔ رات کو حسن آرا نے سپہرآرا سے کہا— کچھ سنا؟ اس بڈھے کی ایک لڑکی کے ساتھ آزاد کا نکاح ہونے والا ہے۔

سپہرآرا : غلط بات ہے۔

حسن آرا : کیوں؟

سپہرآرا : کیوں کیا، آزاد ایسے آدمی ہی نہیں۔

حسن آرا : دل لگی ہو، جو کہیں آزاد اس سے بھی اقرار کر گئے ہوں۔ چلو خیر، چار نکاح تو جائز بھی ہیں۔ لیکن اللہ جانتا ہے، یقین نہیں آتا۔ آزاد اگر ایسے ہرجائی ہوتے، تو جان ہتھیلی پر لے کر روم نہ جاتے۔

حسن آرا نے زبان سے تو یہ اطمینان ظاہر کیا، پر دل سے یہ خیال دور نہ کر سکیں کہ ممکن ہے، آزاد نے وہاں بھی قول ہارا ہو۔ ایک تو ان کی طبیعت پہلے ہی سے خراب تھی، اس پر یہ نئی فکر پیدا ہوئی، تو پھر بخار آنے لگا۔ دل کو لاکھ لاکھ سمجھاتیں کہ آزاد بات کے دھنی ہیں، لیکن یہ خیال دور نہ ہوتا۔ ادھر ایک نئی مصیبت یہ آئی کہ ان کے ایک عاشق اور پیدا ہو گئے۔ یہ

حضرت بہار بیگم کے رشتے میں بھائی ہوتے تھے۔ نام تھا مرزا عسکری۔ عسکری نے حسن آرا کو لڑکپن میں دیکھا تھا۔ ایک دن بہار بیگم سے ملنے آئے، اور سنا کہ حسن آرا بیگم آج کل یہیں ہیں، تو ان پر ڈورے ڈالنے لگے۔ بہار بیگم سے بولے— اب تو حسن آرا سیانی ہوئی ہوں گی؟

بہار بیگم: ہاں، خدا کے فضل سے اب سیانی ہیں۔

عسکری: دونوں بہنوں میں حسن آرا گوری ہیں نا؟

بہار بیگم: اے، دونوں خاصی گوری چٹی ہیں، مگر حسن آرا جیسی حسین ہم نے تو نہیں دیکھی۔ گلاب کے پھول جیسا مکھڑا ہے۔

عسکری: تم ہماری بہن کیسی ہو؟

بہار بیگم: اس کے کیا معنی؟

عسکری: اب صاف صاف کیا کہوں، سمجھ جاؤ۔ بہن ہو، بڑی ہو، اتنے ہی کام آؤ۔ پھر اور نہیں تو کیا، عاقبت میں بخشاؤ گی؟

بہار بیگم: عسکری، خدا جانتا ہے، ہمیں دل سے تمھاری محبت ہے۔

عسکری: برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔

بہار بیگم: ارے، یوں کیوں نہیں کہتے کہ میں گودیوں میں کھلایا ہے۔

عسکری: یہ ہم نہ مانیں گے۔ ایسی آپ کتنی بڑی ہیں مجھ سے۔ برس نہیں، حد دو برس۔

بہار بیگم: اے لو، اس جھوٹ کو دیکھو، چھتیں پرانی ہیں۔

عسکری: اچھا، پھر کوئی پندرہ بیس برس کی چھوٹائی بڑائی ہے؟

بہار بیگم: ہئی ہے؟

عسکری: اچھا، اب پھر کس دن کام آؤ گی؟

بہار بیگم: بھئی، اگر حسن آرا منظور کر لیں، تو ہے۔ میں آج اماں جان سے ذکر کروں گی۔

اتنے میں حسن آرا بیگم نے اوپر سے آواز دی۔ اے باجی ذری ہم کو ہرے ہرے ملائم سنگھاڑے نہیں منگا دیتیں؟ محمد عسکری نے رسوخیت جتانے کے لیے ماما سے کہا— میرے آدمی سے جا کر کہو کہ چار سیر تازے سنگھاڑے تڑوا کر لے آئے۔ حسن آرا نے جوان کی آواز سنی،

تو سپہر آرا سے پوچھا— یہ کون آیا ہے؟ سپہر آرا نے کہا— اے، وہی تو ہیں عسکری! تھوڑی دیر میں مرزا عسکری تو چلے گئے اور چلتے وقت بہار بیگم سے کہہ گئے کہ ہم نے جو کہا ہے، اس کا خیال رہے۔ بہار بیگم نے کہا— دیکھو، اللہ چاہے، تو آج کے دوسرے ہی مہینے حسن آرا بیگم کے ساتھ منگنی ہو۔ حسن آرا اسی وقت نیچے آ رہی تھیں۔ یہ بات ان کے کان میں پڑ گئی۔ پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ الٹے پاؤں لوٹ گئیں اور سپہر آرا سے یہ قصہ کہا۔ اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔ کچھ دیر تک دونوں بہنیں سناٹے میں پڑی رہیں۔ پھر سپہر آرا نے دیوانِ حافظ اٹھا لیا اور فال دیکھی، تو سرے پر ہی شعر نکلا۔

بے رو ایں دام بر مرغِ دیگر نے،

کہ عنقا را بلند است آشیانہ۔

(یہ جال دوسری چڑیا پر ڈال۔ عنقا کا گھونسلا بہت اونچا ہے۔)

سپہر آرا یہ شعر پڑھتے ہی اچھل پڑی۔ بولی— لو، فتح ہے۔ بیڑا پار ہو گیا۔

اتنے میں بہار بیگم آ پہنچیں اور حسن آرا سے بولیں— تم لوگوں نے مرزا عسکری کو تو دیکھا ہوگا؟ کتنا خوبصورت جوان ہے۔

سپہر آرا: دیکھا کیوں نہیں، وہی شوکین سے آدمی ہیں نا؟

بہار بیگم: اب کی آئے گا تو اوٹ میں سے دکھا دوں گی۔ بڑا ہنس مکھ، ملنسار آدمی ہے۔ جس وقت آتا ہے، مکان بھر مہکنے لگتا ہے۔ میری بیماری میں بے چارہ دن بھر میں تین تین پھیرے کرتا تھا۔

حسن آرا یہ باتیں سن کر دل ہی دل میں سوچنے لگیں کہ یہ کہہ کیا رہی ہیں۔ کیسے عسکری؟ یہاں تو آزاد کو دل دے چکے۔ وہ ٹرکی سدھارے، ہم قول ہارے۔ ان کو عسکری کی پڑی ہے۔ بہار بیگم نے بڑی دیر تک عسکری کی تعریف کی، مگر حسن آرا کب پسیجنے والی تھیں۔ آخر، بہار بیگم خفا ہو کر چلی گئیں۔

دوسرے دن جب عسکری پھر آئے، تو بہار بیگم نے ان سے کہا— میں نے حسن آرا سے تمھارا ذکر تو کیا، مگر وہ بولیں تک نہیں۔ اس موئے آزاد پر لٹو ہو رہی ہیں۔

عسکری: میں ایک ترکیب بتاؤں، ایک کام کرو۔ جب حسن آرا بیگم اور تم پاس بیٹھی ہو، تو آزاد کا ذکر ضرور چھیڑو۔ کہنا، عسکری ابھی ابھی اخبار پڑھتا تھا، اس کا ایک دوست ہے

آزاد، وہ نان بائی کا لڑکا ہے۔ اس کی بڑی تعریف چھپی ہے۔ کہتا تھا، اس نان بائی کے لونڈے کی خوش قسمتی کو تو دیکھو، کہاں جا کر شپّا لڑایا۔ جب وہ کہیں کہ آزاد شریف آدمی ہیں، تو کہنا، عسکری کے پاس آزاد کے نہ جانے کتنے خط پڑے ہیں۔ وہ قسم کھاتا ہے کہ آزاد نان بائی کا لڑکا ہے، بہت دنوں تک میرے یہاں ٹکّے بھرتا رہا۔

یہ کہہ کر مرزا عسکری تو بِدا ہوئے، اور بہار بیگم حسن آرا کے پاس پہنچیں۔

حسن آرا: کہاں تھیں بہن؟ آؤ، دریا کی سیر کریں۔

بہار بیگم: ذرا عسکری سے باتیں کرنے لگی تھی۔ کسی اخبار میں ان کے ایک دوست کی بڑی تعریف چھپی ہے۔ کیا جانے، کیا نام بتایا تھا؟ بھلا ہی سا نام ہے۔ ہاں، خوب یاد آیا، آزاد۔ مگر کہتا تھا کہ نانبائی کا لڑکا ہے۔

حسن آرا: کس کا؟

بہار بیگم: نانبائی کا لڑکا بتاتا تھا۔ تمھارے عاشق صاحب کا بھی تو یہی نام ہے۔ کہیں وہی عسکری کے دوست نہ ہوں۔

سپہر آرا: واہ، اچھے آپ کے عسکری ہیں جو نانبائی کے چھوکروں سے دوستی کرتے پھرتے ہیں۔

بہار تو یہ آگ لگا کر چلتی ہوئی، ادھر حسن آرا کے دل میں کھلبلی مچی۔ سوچیں، آزاد کے حال سے کسی کو اطلاع تو ہے نہیں، شاید نانبائی ہی ہوں۔ مگر یہ شکل وصورت، یہ علم اور کمال، یہ لیاقت اور ہمّت نانبائی میں کیونکر آ سکتی ہے؟ نانبائی پھر نانبائی ہے۔ آزاد تو شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔ سپہر آرا نے کہا— باجی، بہار بہن ادھار کھائے بیٹھی ہیں کہ عسکری کے ساتھ تمھارا نکاح ہو۔ ساری کارستانی اسی کی ہے۔ عسکری کے ہتھ کنڈوں سے اب بچے رہنا۔ وہ بڑا نٹ کھٹ معلوم ہوتا ہے۔

شام کو ماما نے ایک خط لا کر حسن آرا کو دیا۔ انھوں نے پوچھا— کس کا خط ہے؟

ماما: پڑھ لیجیے۔

سپہر آرا: کیا ڈاک پر آیا ہے؟

ماما: جی نہیں، کوئی باہر سے دے گیا ہے۔

حسن آرا نے خط کھول کر پڑھا۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

قدم رکھ دیکھ کر الفت کے دریا میں ذرا اے دل،
خطر ہے ڈوب جانے کا بھی دریا کے نہانے میں۔

حسن آرا بیگم کی خدمت میں آداب۔ میں جتائے دیتا ہوں کہ آزاد کے پھیر میں نہ پڑیے۔ وہ پیچ قوم آپ کے قابل نہیں۔ نانبائی کا لڑکا، تندور جلانے میں تاک، آٹا گوندھنے میں مشاق۔ وہ اور آپ کے لائق ہو! اوّل تو پاجی، دوسرے دل کا ہرجائی، اور پھر طرّہ یہ کہ انپڑھ! بہار بہن مجھے خوب جانتی ہیں۔ میں اچھا ہوں یا برا، اس کا فیصلہ وہی کر سکتی ہیں۔ آزاد میرے دشمن نہیں، میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ اسی سبب سے آپ کو صلاح دیتا ہوں کہ آپ اس کا خیال دل سے دور کر دیں۔ خدا وہ دن نہ دکھائے کہ آزاد سے تمھارا نکاح ہو۔

تمھارا عسکری

حسن آرا نے اس خط کے جواب میں یہ شعر لکھا۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری، راہ لگ اپنی،
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں، ہم بے زار بیٹھے ہیں۔

سپہر آرا نے کہا۔ کیوں باجی، ہم کیا کہتے تھے؟ دیکھا، وہی بات ہوئی نا؟ اور جھوٹا تو اسی سے ثابت ہے کہ میاں آزاد کو انپڑھ بتاتے ہیں۔ خدا کی شان، یہ اور آزاد کو انپڑھ کہیں! ہم تو کہتے ہی تھے کہ یہ بڑا نکھٹو معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا نے یہ پرزہ ماما کو دیا کہ جا، باہر دے آ۔ عسکری نے یہ خط پایا، تو جل اٹھے۔ دل میں کہا — اگر آزاد کو نیچا نہ دکھایا، تو کچھ نہ کیا۔ جا کر بڑی بیگم سے ملے اور ان سے خوب نمک مرچ ملا ملا کر باتیں کیں۔ بہار بیگم نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور عسکری کی خوب تعریفیں کیں۔ آزاد کو جہاں تک بدنام کرتے بنا، کیا۔ یہاں تک کہ آخر بڑی بیگم بھی عسکری پر لٹو ہو گئیں۔ مگر حسن آرا اور سپہر آرا عسکری کا نام سنتے ہی جل اٹھتیں تھیں۔ دونوں آزاد کو یاد کر کر کے رویا کرتیں، اور بہار بیگم بار بار عسکری کا ذکر کر کے انھیں دق کیا کرتیں۔ یہاں تک کہ ایک دن بڑی بیگم کے سامنے سپہر آرا اور بہار بیگم میں ایک جھوڑ ہو گئی۔ بہار کہتی تھیں کہ حسن آرا کی شادی مرزا عسکری سے ہوگی، اور ضرور ہوگی۔ سپہر آرا کہتی تھی۔ یہ ممکن نہیں۔

ایک دن بڑی بیگم نے حسن آرا کو بلا بھیجا، لیکن جب حسن آرا گئیں، تو منھ پھیر لیا۔ بہار بیگم بھی وہیں بیٹھی تھیں۔ بولیں — اماں جان تم سے بہت ناراض ہیں حسن آرا!

بیگم: میرا نام نہ لو۔

بہار بیگم: جی نہیں، آپ خفا نہ ہوں۔ مجال ہے، آپ کا حکم نہ مانیں۔

بیگم: سنا ہوا ہے سب۔

بہار بیگم: حسن آرا، امّاں جان کے پاس آؤ۔

حسن آرا پریشان کہ اب کیا کروں۔ ڈرتے ڈرتے بڑی بیگم کے پاس جا بیٹھیں۔ بڑی بیگم نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔

بہار بیگم: امّاں جان، یہ آپ کے پاس آئی ہوئی ہیں، ان کا قصور معاف کیجیے۔

بیگم: جب یہ میرے کہنے میں نہیں ہیں، تو مجھ سے کیا واسطہ؟ عسکری سا لڑکا کوئی مشعل لے کر بھی ڈھونڈھے، تو نہ پائے۔ مگر انھیں اپنی ہی ضد ہے۔

بہار بیگم: حسن آرا، خوب سوچ کر اس کا جواب دو۔

بیگم: میں جواب سَواب کچھ نہیں مانگتی۔

بہار بیگم: آپ دیکھ لیجیے گا، حسن آرا آپ کا کہنا مان لیں گی۔

بیگم: بس، دیکھ لیا!

بہار بیگم: امّاں جان، ایسی باتیں نہ کہیے۔

بیگم: دل جلتا ہے بہار، دل جلتا ہے! اپنے دل میں کیا کیا سوچتے تھے، مگر اب اٹھ ہی جائیں یہاں سے تو اچھا

یہ کہہ کر بڑی بیگم اٹھ کر چلی گئیں۔ حسن آرا بھی اوپر چلی گئیں اور لیٹ کر رونے لگیں۔ تھوڑی دیر میں بہار نے آکر کہا— حسن آرا، ذری پردے ہی میں رہنا، عسکری آتے ہیں۔ حسن آرا نے عسکری کا نام سنا، تو کانپ اٹھی۔ اتنے میں عسکری آکر، برآمدے میں کھڑے ہو گئے۔

بہار بیگم: بیٹھو عسکری!

عسکری: جی ہاں، بیٹھا ہوں۔ خوب ہوا دار مکان ہے۔ اس کمرے میں تم رہتی ہو نا؟

بہار بیگم: نہیں، اس میں ہماری بہنیں رہتی ہیں۔

عسکری: اب حسن آرا کی طبیعت کیسی ہے؟

بہار بیگم: پوچھ لو، بیٹھی تو ہیں۔

عسکری : نہیں بتاؤ تو آخر؟

بہار بیگم : تم بھی تو حکیم ہو؟ بھلا پردے کے پاس سے نبض تو دیکھو۔

حسن آرا مسکرائیں۔ سپہر آرا نے کہا— اے، ہٹو بھی! بڑے آئے وہاں سے حکیم!

بہار بیگم : تم تو ہوا سے لڑتی ہو۔

سپہر آرا : لڑتی ہی ہے۔

عسکری : اس وقت کھانا کھا چکی ہوں گی۔ شام کو نبض دیکھ لوں گا۔

بہار بیگم : اے، ابھی کھانا کہاں کھایا؟

سپہر آرا : ہاں، ہاں، کھا چکی ہیں۔

مرزا عسکری تو رخصت ہوئے، مگر بہار بیگم کو صبر کہاں؟ پوچھا— حسن آرا، اب بولو، کیا کہتی ہو؟ سپہر آرا تنک کر بولی— اب کوئی اور بات بھی ہے، یا رات دن یہی ذکر ہے؟ کہہ دیا ایک دفعہ کہ جس بات سے یہ چڑھتی ہیں، وہ کیوں کرو۔

بہار بیگم : ہونا وہی ہے، جو ہم چاہتی ہیں۔

حسن آرا : خیر، بہن، جو ہونا ہے، ہو رہے گا۔ اس کا ذکر ہی کیا؟

سپہر آرا : بہار بہن، ناحق بیٹھے بیٹھائے رنج بڑھاتی ہو۔

بہار بیگم : یاد رکھنا، امّاں جان ابھی ابھی قسم کھا چکیں ہیں کہ وہ تم دونوں کی صورت نہ دیکھیں گی۔ بس، تمھیں اب اختیار ہے، چاہے مانو، چاہے نہ مانو۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ حسن آرا جب بڑی بیگم کے سامنے جاتیں، تو وہ منھ پھیر لیتیں۔ دونوں بہنیں رات دن رویا کرتیں۔ سوچیں کہ یہ تو سب کے سب ہمارے خلاف ہیں، آؤ، روح افزا کو بلائیں، شاید وہ ہمارا ساتھ دیں۔ ماما نے کہا— میں ابھی ابھی جاتی ہوں۔ جہاں تک بن پڑے گا، بہت کہوں گی۔ اور، کہنا کیا ہے، لے ہی آؤں گی۔

اتنے میں بہار بیگم نے آکر کہا— اے حسن آرا، ذری پردہ کر کے عسکری کو نبض دکھا دو۔ زینے پر کھڑے ہیں۔ حسن آرا مجبور ہوگئی۔ سپہر آرا کو اشارے سے بلایا اور کہا— بہار بہن تو باہر ہی بیٹھیں گی۔ میرے بدلے تم نبض دکھا دو۔ سپہر آرا نے مسکرا کر کہا— اچھا، اور پردے کے پاس بیٹھ کر نبض دکھائی۔

عسکری : دوسرا ہاتھ لائیے۔

بہار بیگم : بخار تو نہیں ہے؟

عسکری : تھوڑا سا بخار تو ضرور ہے۔ کمزوری بہت ہے۔

جب عسکری چلے گئے، تو حسن آرا نے بہار بیگم سے کہا— آپ کے عسکری تو بڑے ہوشیار ہیں!

بہار بیگم : کیا شک بھی ہے؟

حسن آرا : اف، مارے ہنسی کے برا حال ہے۔ واہ رے حکیم!

سپہر آرا : 'نیم حکیم، خطرے جان۔'

بہار بیگم : یہ کاہے سے؟

حسن آرا : نبض کس کی دیکھی تھی؟

بہار بیگم : تمھاری۔

حسن آرا : ارے واہ، کہیں دیکھی ہو نا؟ بس، دیکھ لی حکمت۔

بہار بیگم : پھر کس کی نبض دیکھی؟ کیا سپہر آرا بیٹھ گئی تھیں؟

سپہر آرا : اور نہیں تو کیا؟ کمزوری بتاتے تھے۔ کمزوری ہمارے دشمنوں کو ہو۔

بہار بیگم : بھلا علاج میں کیا ہنسی کرنی تھی؟

باہر جا کر بہار نے عسکری کو خوب آڑے ہاتھوں لیا— اے، بس، جاؤ بھی، مفت میں ہم کو بد بنایا! حسن آرا نے ہنسی ہنسی میں سپہر آرا کو اپنی جگہ بیٹھا دیا، اور تم ذرا نہ پہچان سکے۔ خدا جانتا ہے، مجھے بہت شرم آئی۔

شام کو روح افزا بیگم آ پہنچیں اور بڑی بیگم کے پاس جا کر سلام کیا۔

بڑی بیگم : تم کب آئیں؟

روح افزا : ابھی ابھی چلی آتی ہوں۔ حسن آرا کہاں ہیں؟

بہار بیگم : ہمیں ان کا حال معلوم نہیں۔ کوٹھے پر ہیں۔

روح افزا : ذری، بلوایئے!

بہار بیگم : دونوں بہنیں، ہم سے خفا ہیں۔

روح افزا کوٹھے پر گئیں، تو دونوں بہنیں ان سے گلے مل کر خوب روئیں۔

روح افزا : یہ تم کو کیا ہو گیا حسن آرا؟ وہ صورت ہی نہیں۔ ماجرا کیا ہے؟

سپہر آرا : اب تو آپ آئی ہیں، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ سارا گھر ہم سے فرنٹ ہو رہا ہے۔ ہمیں تو کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب حرام ہے۔

بہار بیگم کو یہ صبر کیسے ہوتا کہ روح افزا آئیں اور دونوں بہنیں ان سے اپنا دکھڑا روئیں۔ آ کر دھیرے سے بیٹھ گئیں۔

روح افزا : بہن، یہ کیا بات ہے؟ آخر کس بات پر یہ رنجا رنجی ہو رہی ہے؟

بہار بیگم : میں تم سے پوچھتی ہوں، عسکری میں کیا برائی ہے، شریف نہیں ہے وہ، یا پڑھا لکھا نہیں ہے، یا اچھے خاندان کا نہیں ہے؟ آخر ان کے انکار کا سبب کیا ہے؟

سپہر آرا : ہم نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ ہم عسکری کا نام نہیں سننا چاہتے۔

روح افزا : تو یہ کہو، بات بہت بڑھ گئی ہے۔ مجھے ذرا بھی کچھ حال معلوم ہوتا، تو فوراً ہی آ جاتی۔

بہار بیگم : اب آئی ہو، تو کیا بنا لوگی؟ یہ ایک نہ مانیں گی۔

روح افزا : وہ تو شاید مان بھی جائیں، مگر آپ کا مان جانا البتہ مشکل ہے۔

بہار بیگم : یہ کہیے، آپ ان کی طرف سے لڑنے آئی ہیں؟

روح افزا : ہاں، ہم سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا کہ خواہ مخواہ جھگڑا ہو۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بڑی بیگم صاحبہ لٹھیا ٹیکتی ہوئی آئیں۔

روح افزا : آیئے امّاں جان، بیٹھیے۔

بیگم : میں بیٹھنے نہیں آئی، یہ کہنے آئی ہوں کہ عسکری کے ساتھ حسن آرا کا نکاح ضرور ہوگا۔ اس میں ساری دنیا ایک طرف ہو، میں کسی کی نہ سنوں گی۔ میں جان دے دوں گی۔ یہ نہ مانیں گی تو، زہر کھا لوں گی، مگر کروں گی یہی، جو کہہ رہی ہوں۔

بڑی بیگم یہ کہہ کر چلی گئیں۔ حسن آرا اتنا روئیں کہ آنکھیں لال ہوگئیں۔ روح افزا نے سمجھایا، تو بولیں— بہن، امّاں جان مانیں گی نہیں، اور ہم سوا آزاد کے اور کسی کے ساتھ شادی نہ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہونا ہے کہ ہمی نہ ہوں گے۔

(57)

حسن آرا بیگم کی جان عذاب میں تھی۔ بڑی بیگم سے بول چال بند، بہار بیگم سے ملنا

جلنا ترک۔ عسکری روز ایک نیا گُل کھلاتا۔ وہ ایک ہی کائیاں تھا، روح افزا کو بھی باتوں میں لگا کر اپنا طرف دار بنا لیا۔ ماما کو پانچ روپے دیے۔ وہ اس کا دم بھرنے لگی۔ مہری کو جوڑا بنوا دیا، وہ بھی اس کا کلمہ پڑھنے لگی۔ نواب صاحب اس کے دوست تھے ہی۔ حسین بخش کو بھی گانٹھ لیا۔ بس، اب سپہرآرا کے سوا حسن آرا کا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ ایک دن روح افزا چپکے چپکے ادھر آئی، تو دیکھا، کمرے کے سب دروازے بند ہیں۔ شیشے سے جھانک کر دیکھا، حسن آرا رو رہی ہیں اور سپہرآرا اداس بیٹھی ہیں۔ روح افزا کا دل بھر آیا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور دونوں بہنوں کو گلے لگا کر کہا— آؤ، ہوا میں بیٹھیں۔ ذری، منھ دھو ڈالو۔ یہ کیا بات ہے! جب دیکھو، دونوں بہنیں روتی رہتی ہو؟

سپہرآرا : بہن، جان بوجھ کر کیوں انجان بنتی ہو؟ بھلا آپ سے بھی کوئی بات چھپی ہے؟ مگر آپ بھی ہمارے خلاف ہو گئیں! خیر، اللہ مالک ہے۔

روح افزا : تمھاری تو نئی باتیں ہیں؟ جہاں تمھارا پسینہ گرے، وہاں ہم لہو گرائیں، اور تم سمجھتی ہو کہ ہم تمھیں جلاتے ہیں۔ ہم تو محبت سے پوچھتے ہیں، اور تم ہمیں پر بگڑتی ہو۔

حسن آرا : سنو باجی، تم کون سی باتیں نہیں جانتی ہو، جو پوچھتی ہو۔ ہم صاف صاف کہہ چکے کہ یا تو عمر بھر کنواری ہی رہیں گے یا آزاد کے ساتھ نکاح ہوگا۔

سپہرآرا : ایسے ایسے 360 عسکری ہوں، تو کیا؟ حلوہ کھانے کو منھ چاہیے۔

روح افزا : اب اس وقت بات بڑھ جائے گی۔ اور کوئی بات کرو۔

حسن آرا : ہم اتنا چاہتے ہیں کہ آپ ذرا انصاف کریں۔

روح افزا : مگر یہ گتھی کیونکر سلجھے گی؟

اتنے میں ماما نے ایک اخبار لا کر رکھ دیا! حسن آرا نے پڑھنا شروع کیا۔ ایکا ایک مضمون دیکھ کر چونک اٹھی۔ مضمون یہ تھا کہ میاں آزاد نے ترکی میں ایک سائس کی بیوی سے شادی کر لی۔ سائس کو زہر دلوا دیا اور اب سائسن کے ساتھ گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ حسن آرا نے اخبار پھینک دیا اور اٹھا کر کمرے میں چلی گئیں۔ سپہرآرا نے بھانپ لیا کہ ضرور آزاد کی کچھ خبر ہے۔ اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی، تو یہ مضمون نظر پڑا۔ سناٹے میں آ گئی۔ جس آزاد کے لیے یہاں ساری دنیا سے لڑائی ہو رہی تھی۔ جس کا دونوں آسرا لگائے بیٹھی تھیں، اس کا یہ حال! حسن آرا کو جا کر تسکین دینے لگی— باجی، یہ سب غلط ہے۔

حسن آرا : قسمت کی خوبی ہے۔
سپہر آرا : ہم تو فال دیکھیں گے۔
حسن آرا : ہمارا تو دل ٹوٹ گیا۔ ہائے، ہم کیا جانتے تھے کہ محبت یہ برا دن دکھائے گی۔

حالِ اوّل سے یہ نہ تھا ظاہر،
کہ اسی غم میں ہوں گے ہم آخر۔

اپنا کیا اپنے آگے آیا۔ میاں آزاد کے ہتھکنڈے کیا معلوم تھے۔ ان کو ہمارا ذرا خیال نہ آیا۔ ایک نیچ قوم کی عورت کو بیاہا۔ حسن آرا کو بھول گئے۔ یہاں مہینوں اسی رنج میں گزر گئے کہ ترکی کیوں بھیجا۔ بیٹھے بیٹھائے ان کی جان کے در پہ کیوں ہوئی۔ رات دن دعا مانگی کہ وہ خیریت سے گھر آئیں۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ ایکا ایک یہ غم کی بجلی گر پڑے گی۔ قسمت پھوٹ گئی۔ اب تو یہی آرزو ہے کہ ایک دفعہ چار آنکھیں ہوں، پھر جھک کر سلام کروں۔

سپہر آرا : اگر یہی کرنا تھا تو اتنی دور گئے کیا کرنے تھے؟

روح افزا کمرے میں آئی، تو دیکھا، حسن آرا دلائی اوڑھے پڑی ہیں۔ بند پر ہاتھ رکھا، تو تیز بخار۔ حسن آرا انھیں دیکھ کر رونے لگیں۔ روح افزا بولیں — بہن، طبیعت کو قابو میں رکھو۔ ایسی بھی نوج میں کوئی بیماری میں گھبرائے۔ بہار بیگم نے سنا، تو وہ بھی گھبرائی ہوئی آئیں۔ بدن پر ہاتھ رکھا، تو معلوم ہوا، جیسے کسی نے جھلسا دیا۔ حسن آرا نے روک کر کہا — باجی، ہر طرح کی بیماری میں نے اٹھائی ہے، مگر دل کبھی اتنا کمزور نہ ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جان نکل رہی ہے۔ بہار بیگم نے بڑی بیگم کو بلوایا۔ وہ بھی بدحواس آئی اور حسن آرا کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں — اللہ، یہ ہوا کیا!

بہار بیگم : بخار سا بخار ہے!

نواب صاحب دوڑے ہوئے آئے۔ دیکھا، تو کہرام مچا ہوا ہے۔ اتنے میں عسکری آئے۔ بہار بیگم نے کہا — بھیا، ذری نبض تو دیکھو۔ یہ دم کے دم میں کیا ہو گیا؟

عسکری : (نبض دیکھ کر) بہن، کیا بتاؤں نبض ہی نہیں ملتی!

اس فقرے پر بہار بیگم سر پیٹنے لگیں۔ نواب صاحب نے سمجھایا، کہ یہ وقت دوا اور علاج کا ہے، رونا تو عمر بھر ہے۔ عسکری فوراً بڑے حکیم صاحب کو بلانے گئے۔ شہزادہ ہمایوں فر بھی

آئے تھے۔ بولے— میں جا کر سِول سرجن کو ساتھ لاتا ہوں۔ سرجن صاحب آئے اور نبض دیکھ کر کہا— دل پر کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو، یا ایسی ہی کوئی اور بات ہو۔ نسخہ لکھا اور فیس لے کر چل دیے۔ اتنے میں بڑے حکیم صاحب آئے اور نبض دیکھ کر عسکری کے کان میں کہا— کام تمام ہو گیا۔ نسخہ لکھ کر آپ بھی باہر گئے۔ بہار بیگم سب سے زیادہ بے قرار تھیں۔

شام کا وقت تھا، بڑی بیگم نماز پڑھ رہی تھیں، بہار بیگم اداس بیٹھی ہوئی تھیں، نواب صاحب ہمایوں فر کے ساتھ اسی بیماری کا ذکر کر رہے تھے کہ ایکاایک اندر سے رونے کی آواز آئی۔

نواب صاحب : کیا ہوا، کیا! ہوا کیا!!

بہار بیگم : جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو گیا۔

نواب صاحب نے جا کر دیکھا، تو حسن آرا کی آنکھیں پھر گئیں تھیں اور بدن ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ نواب صاحب کو دیکھتے ہی بڑی بیگم نے ایک اینٹ اٹھائی اور سر پر پٹک لی۔ سپہر آرا نے تین بار دیوار سے سر ٹکرایا۔ نواب صاحب ڈاکٹر کو بلانے دوڑے۔

(58)

روم پہنچ کر آزاد ایک پارسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ اسی ہوٹل میں جارجیہ کی ایک لڑکی بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کا نام تھا مِیڈا۔ آزاد کھانا کھا کر اخبار پڑھ رہے تھے مِیڈا کو باغ میں ٹہلتے دیکھا ہے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ آزاد کے کلیجے میں تیر سا لگا۔ مِیڈا بھی کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی کہ یہ کون آدمی ہے۔ آدمی تو نہایت حسین ہے، مگر ترکی نہیں معلوم ہوتا ہے۔

آزاد کو بھی باغ کی سیر کرنے کی دھن سوار ہوئی، تو ایک پھول توڑ کر مِیڈا کے سامنے پیش کیا، مِیڈا نے پھول تو لے لیا، مگر بنا کچھ کہے سنے گھوڑے پر سوار ہو کر چلی گئی۔ آزاد سوچ رہے تھے کہ یہاں کسی سے جان نہ پہچان، اب اس حسینہ کو کیونکر دیکھیں گے؟ اسی فکر میں بیٹھے تھے کہ ہوٹل کا مالک آ پہنچا۔ آزاد نے اس سے باتوں باتوں میں پتہ لگا لیا کہ یہ ایک کنواری لیڈی ہے۔ اس کی خوبصورتی کی دور دور چرچا ہے۔ جسے دیکھیے، اس کا عاشق

ہے۔ پیانو بجانے کا دلی شوق ہے۔ گھوڑے پر ایسا سوار ہوتی ہے کہ اچھے اچھے شہسوار دنگ رہ جاتے ہیں۔

شام کے وقت آزاد ایک کتاب دیکھ رہے تھے کہ ایک عورت نے آکر کہا— ایک صاحب باہر آپ کی تلاش میں کھڑے ہیں۔ آزاد کو حیرت ہوئی کہ یہ کون ہے؟ باہر آئے، تو دیکھا، ایک عورت منھ پر نقاب ڈالے کھڑی ہے۔ انھیں دیکھتے ہی اس نے نقاب الٹ دی۔ یہ مِیڈا تھی۔

مِیڈا : میں وہی ہوں، جسے آپ نے پھول دیا تھا۔

آزاد : اور میں نے آپ کی صورت کو اپنے دل پر کھینچ لیا تھا۔

مِیڈا : یہاں کب تک ٹھہریے گا؟

آزاد : لڑائی میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔

مِیڈا : اس لڑائی کا برا ہو، جس نے ہزاروں گھروں کو برباد کر دیا! بھلا، اگر آپ نہ جائیں، تو کوئی حرج ہے؟

آزاد : مجبوری ہے!

مِیڈا نے آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور باغ میں ٹہلتے ٹہلتے بولی— جب تک آپ یہاں رہیں گے، میں روز آؤں گی۔

آزاد : میرے لیے یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے۔ میں اچھی ساعت دیکھ کر گھر سے چلا تھا۔

مِیڈا : آپ نے وزیرِ جنگ سے اپنے لیے کیا طے کیا؟

آزاد : ابھی تو ان سے ملنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

مِیڈا : مجھے امید ہے کہ میں آپ کو کوئی اچھا عہدہ دلا سکوں گی۔

آزاد : آپ کا وطن کہاں ہے؟

مِیڈا : جارجیا۔

آزاد : تو یہ کہیے، آپ کوہ قاف کی پری ہیں۔

اس طرح کی باتیں کر کے مِیڈا چلی گئی۔ آزاد کچھ دیر تک سناٹے میں کھڑے رہے۔ اتنے میں ایک فرانسیسی افسر آکر بولا— تم ابھی کس سے باتیں کر رہے تھے؟

آزاد: مِس مِیڈا سے۔

افسر: تمھیں معلوم ہے، اس سے میری شادی ہونے والی ہے۔

آزاد: بالکل نہیں۔

یہ سنتے ہی اس افسر نے جس کا نام جداب تھا، تلوار کھینچ کر آزاد پر حملہ کیا۔ آزاد نے خالی دی۔ یکایک کسی نے پیچھے سے آزاد پر تلوار چلائی۔ تلوار پھسلتی ہوئی بائیں کندھے پر لگی۔ پلٹ کر آزاد نے جوایک تلا ہوا ہاتھ لگایا، تو وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ آزاد سنبھلنے ہی کو تھے کہ جداب پھر ان پر جھپٹا۔ آزاد نے پھر خالی دی اور کہا۔ میں چاہوں تو تمھیں مار سکتا ہوں۔ مگر مجھے تمھاری جوانی پر رحم آتا ہے۔ یہ کہہ کر آزاد نے پینترا بدلا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اتنے میں ہوٹل کے کئی آدمی نکل آئے۔ اور آزاد کی تعریف کرنے لگے۔ جداب نے شرمندہ ہو کر کہا مجھے اس کا افسوس ہے کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے بغیر پوچھے آپ پر پیچھے سے حملہ کیا۔ اس کے لیے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ دونوں آدمی گلے تو ملے، مگر فرانسیسی کے دل سے کدورت نہ گئی۔

دوسرے دن میاں آزاد حمید پاشا کے پاس گئے، جو جنگ کے وزیر تھے۔ حمید نے آزاد کا ڈیل ڈول دیکھ کر ان کی بات چیت سنی، تو فوجی عہدہ دینے کا وعدہ کر لیا۔ آزاد خوش خوش لوٹے آتے تھے کہ مِیڈا گھوڑے پر سوار آ پہنچی۔

مِیڈا: آپ کہاں گئے تھے؟

آزاد: وزیرِ جنگ کے پاس۔ کل تو آپ کی بدولت میری جان ہی گئی تھی۔

مِیڈا: سن چکی ہوں۔

آزاد: اب آپ سے بولتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

مِیڈا: جیت تو تمھاری ہی ہوئی۔ تم مجھے دل میں برا سمجھ رہے ہوگے، مگر میرا دل قابو سے باہر ہے۔ میرا دل تم پر آیا ہے۔ میں چاہتی ہوں، میری تمھارے ساتھ شادی ہو۔

آزاد: مجھے افسوس ہے کہ میری شادی طے ہو چکی ہے۔ خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں، آپ کی ایک ایک ادا میرے دل میں چبھ گئی ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔

مِیڈا نے اداس ہو کر کہا— پچھتاؤ گے، اور گھوڑا بڑھا دیا۔ اسی رات کو مِیڈا نے حمید پاشا سے جا کر کہا کہ آزاد نام کا جو ہندستانی آج آپ کے پاس آیا تھا، وہ روس کا مخبر ہے۔

اس سے ہوشیار رہیے گا۔

حمید : تمھیں اس کا پورا یقین ہے؟

مِیڈا : مجھے آزاد کے ایک دوست ہی سے یہ بات معلوم ہوئی۔

حمید : تمھارا ذمّہ۔

مِیڈا : بے شک۔

یہ آگ لگا کر مِیڈا گھر آئی، مگر بار بار یہ سوچتی تھی کہ میں نے بہت برا کیا۔ ایک بے گناہ کو مفت میں پھنسایا۔ خیال آیا کہ جا کر وزیرِ جنگ سے کہہ دے کہ آزاد بے گناہ ہے، مگر بدنامی کے خوف سے جانے کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ میاں آزاد ہوٹل میں بیٹھے حقّہ پی رہے تھے کہ ایک ترکی افسر نے آکر کہا— آپ کو ترکی کی سرکار نے قید کر لیا۔

آزاد : مجھ کو؟

افسر : جی ہاں۔

آزاد : آپ غلطی کر رہے ہیں۔

افسر : نہیں، مجھے آپ ہی کا پتہ دیا گیا ہے۔

آزاد : آخر میرا قصور؟

افسر : مجھے بتانے کا حکم نہیں۔

تین دن تک آزاد قید خانے میں رہے، چوتھے دن حمید پاشا کے سامنے لائے گئے۔

حمید : مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم روسی جاسوس ہو۔

آزاد : بالکل غلط۔ میں کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ آپ بتلا سکتے ہیں کہ کس نے مجھ پر الزام لگایا؟

حمید : ایک شریف لیڈی نے، جس کا نام مِیڈا ہے۔

آزاد مِیڈا کا نام سنتے ہی سناٹے میں آگئے۔ دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ منھ سے ایک بات بھی نہ نکلی۔ اب آزاد پھر قید خانے میں آئے، تو منھ سے بے اختیار نکل گیا— مِیڈا! مِیڈا!!! تو نے مجھ پر بڑا ظلم کیا!

آزاد کو اس کا اتنا رنج ہوا کہ اسی دن سے بخار آنے لگا۔ دو تین دن میں ان کی حالت اتنی خراب ہوگئی کہ جیل کے داروغہ نے صبح شام سیر کرنے کا حکم دے دیا۔ ایک دن وہ شام کو

باہر سیر کر رہے تھے کہ ایک خوبصورت نوجوان گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

جوان : معاف کیجیے گا، آپ کی صورت میرے ایک دوست سے بہت ملتی ہے۔ میں نے سمجھا شاید وہی ہوں۔ آپ کچھ بیمار معلوم پڑتے ہیں۔

آزاد : جی ہاں کچھ بیمار ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ میں نے کہیں آپ کو دیکھا ہے۔

جوان : شاید دیکھا ہو۔

یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ آزاد نے فوراً پہچان لیا۔ یہ مسکراہٹ مِیڈا کی تھی۔ آزاد نے کہا— مِیڈا، تم نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔

مِیڈا : میں اپنے کیے پر خود شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کرو۔

(59)

میاں خوجی پندرہ روز میں خاصے ٹانٹھے ہو گئے، تو کانسل سے جا کر کہا— مجھے آزاد کے پاس بھیج دیا جائے۔ کانسل نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ دوسرے دن خوجی صاحب جہاز پر بیٹھ کر قسطنطنیہ چلے۔ اُدھر میاں آزاد ابھی تک قید خانے میں ہی تھے۔ حمید پاشا نے ان کے بارے میں خوب تحقیقات کی تھی، اور گو انھیں اطمینان ہو گیا تھا کہ آزاد روسی جاسوس نہیں ہیں، پھر بھی ابھی تک آزاد رہا نہ ہوئے تھے۔

ایک دن میاں آزاد قید خانے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک فرانسیسی قیدی آیا۔ اس پر بھی جاسوسی کا الزام تھا۔ آزاد نے پوچھا— آپ نے اپنی صفائی نہیں پیش کی؟

فرانسیسی : اندھیر ہے، اندھیر! میں تو ان ترکوں کا جانی دشمن ہوں۔

آزاد : مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔ میں تو ترکوں کا عاشق ہوں۔ ایسی دلیر قوم دنیا میں نہیں ہے۔

فرانسیسی : ابھی ان لوگوں کو اچھی طرح نہیں جانتے۔ آپ ہی کو بے وجہ قید کر لیا۔

آزاد : لڑائی کے دنوں سے ابھی جگہ ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔

فرانسیسی : آپ روسی زبان نہیں جانتے؟

آزاد : بالکل نہیں۔

فرانسیسی : روس کی سرکار نے بہت مجبور ہو کر لڑائی کی ہے۔

آزاد : میں تو سمجھتا ہوں، روس والوں کی زیادتی ہے، سارا یورپ ترکی کا دشمن ہے۔

اس طرح کی باتیں کر کے فرانسیسی چلا گیا اور دوسرے ہی دن میاں آزاد آزاد کر دیے گئے۔ یہ قیدی فرانسیسی نہ تھا، حمید پاشا نے ایک ترکی افسر کو آزاد کے دل کا بھید لینے کے لیے بھیجا تھا۔

شام کا وقت تھا، آزاد بیٹھے ہوئے مِیڈا سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے آکر کہا— حضور، ایک ناٹا سا آدمی باہر کھڑا ہے، اور کہتا ہے کہ ہمیں کوٹھی کے اندر جانے دو۔ آزاد نے کہا— آنے دو۔ ایک منٹ میں میاں خوجی آکر کھڑے ہوگئے۔ آزاد نے دوڑ کر انھیں گلے لگا لیا اور خیر عافیت پوچھنے کے بعد اپنی رام کہانی سنائی۔ میاں خوجی نے جب آزاد کے قید ہونے کا حال سنا، تو بگڑ کر بولے— خدا نے چاہا، تو ہم تمھارا بدلہ لیں گے۔ کھڑے کھڑے بدلہ نہ لے لیں تو نام نہیں!

آزاد : خیر، اب اس کا افسوس نہ کیجیے۔ مِس مِیڈا ابھی آتی ہوں گی، ذرا ان کے سامنے بے ہودگی نہ کیجیے گا۔

خوجی : بھئی، ابھی انھیں مت آنے دو۔ ذرا ہم بن ٹھن لیں۔ افسوس یہی ہے کہ ہمارے پاس کرولی نہیں۔ بے کرولی کے ہم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔

آزاد : کیا ان سے لڑیے گا؟

خوجی : نہیں صاحب، لڑنا کیسا! بے کرولی کے جوبن نہیں آتا۔ آپ یہ باتیں کیا جانیں۔

اتنے میں مِس مِیڈا دوسرے کمرے سے نکل آئیں۔ خوجی نے اپنا ٹھاٹ بنانے کے لیے میز پر کا کپڑا اوڑھ لیا، تولیا سر میں باندھا اور ایک چھری ہاتھ میں لے کر مِیڈا کی طرف گھورنے لگے۔ مِیڈا نے جو ان کی صورت دیکھی، تو مسکرا دی۔ خوجی کھل گئے۔ آزاد سے بولے— کیوں آزاد، سچ کہنا، مجھے دیکھتے ہی کیسا کِھل گئیں! مِیڈا نے آزاد سے پوچھا— یہ کون آدمی ہے؟

آزاد : ایک پاگل ہے۔ اس کو یہ خبط ہے کہ جو عورت اسے دیکھتی ہے، ریجھ جاتی ہے۔ تم ذرا اس کو بناؤ۔

مِیڈا نے خوجی کو اشارے سے قریب بلایا۔ آپ جا کر ایک کرسی پر ڈٹ گئے۔

مِئیڈا : (ہاتھ میں ہاتھ دے کر) آپ کا نام کیا ہے؟

خوجی : (آزاد سے) مجھے سمجھاتے جاؤ جی!

آزاد نے دُوبھاشیے کا کام کرنا شروع کیا۔ مِئیڈا جو کہتی تھی، ان کو سمجھاتے تھے، اور وہ جو کچھ کہتے تھے، اسے سمجھاتے تھے۔

مِئیڈا : کل آپ کی دعوت ہے، آپ شراب پیتے ہیں؟

خوجی : ہاں— نہیں۔ مگر اچھا، نہیں نہیں۔ کہہ دو افیم پیتا ہوں۔

مِئیڈا : یہ آپ کا گلاب سا چہرہ کمہلا جائے گا!

خوجی نے اکڑ کر آزاد کی طرف دیکھا۔

مِئیڈا : آپ کچھ گانا بھی جانتے ہیں۔

خوجی : ہاں، اور ناچنا بھی جانتا ہوں۔

مِئیڈا : او ہو، تو پھر ناچو۔

خوجی نے ناچنا شروع کیا۔ اب مِئیڈا ہنسنے لگی، تو آپ اور بھی پھول گئے۔ تھوڑی دیر میں مئیڈا ہوٹل سے چلی گئی۔ تب آزاد نے کہا— بھئی، خوجی، یہ بات اچھی نہیں۔ میں تم کو ایسا نہیں جانتا تھا۔

خوجی : تو میں کیا کروں؟ جب وہ خود ہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے، تو رکھائی کرنا بھی تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

تھوڑی دیر میں مِئیڈا کا خط آیا۔ آزاد نے کہا— جناب خواجہ صاحب، ہم کو تو ذرا خط دکھانا۔

خوجی : بس، بس، چلیے، الگ ہٹیے۔

آزاد : لاؤ ہم پڑھ دیں۔ تم سے بھلا کیا پڑھا جائے گا۔

خوجی : عجب آدمی ہیں آپ! آپ کہاں کے ایسے بڑے عالم ہیں!

خوجی نے خط کو تین بار چوما اور آزاد کو الگ بلا کر پڑھنے کو دیا۔ لکھا تھا—

'میرے پیارے جوان، تمھاری ایک ایک ادا نے میرے دل میں جگہ کر لی ہے۔ تمھاری سارس کی سی گردن اور بندر کی سی حرکتیں جب یاد آتی ہیں، تو میں اچھل اچھل پڑتی ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ آج کس وقت آؤ گے؟ یہ خط اپنے دوست آزاد کو نہ دکھانا اور وعدے پر ضرور

آنا۔

خوجی : یار، تمھیں تو سب حال معلوم ہو گیا، مگر اس سے کہہ نہ دینا۔

آزاد : میں تو جا کر شکایت کروں گا کہ ہم سے چھپایا کیوں؟ ابھی ابھی خط بھیجتا ہوں۔

خوجی : خیر، جائیے، کہہ دیجیے۔ وہ ہم پر عاشق ہیں۔ تم ایسے ہزار لگی چپٹی باتیں کریں، ہوتا کیا ہے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے!

آزاد : یار، اب تمھارے ساتھ نہ رہیں گے۔

خوجی : آخر، سبب بتائیے۔

آزاد : غضب خدا کا! میڈا سی ماہ رو اور ہمارے سامنے تمھیں یہ خط لکھے۔

خوجی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ بولے— یہ بات ہے؟ ہم جوان ہی ایسے ہیں، اس کو کوئی کیا کرے۔ لیکن اگر تم خلاف ہو گئے، تو واللہ، میں مِیڈا سے بات تک نہ کروں گا۔ تم مجھے جان سے بھی زیادہ پیارے ہو۔ قسم خدا کی، اب دنیا میں تمھارے سوا میرا کوئی نہیں۔ بس، فقط تم! اور ہم تو بوڑھے ہوئے۔ یہ بھی مِس مِیڈا کی مہربانی ہے۔ اجی، مصر میں تو تم نہ تھے۔ وہاں پر بھی ایک عورت مجھ پر عاشق ہو گئی تھی! مگر خرابی یہ تھی کہ نہ ہم اس کی بات سمجھیں، نہ وہ ہماری! ہاں، اشاروں میں خوب باتیں ہوئیں۔ اچھا، پھر ایک حجّام تو بلواؤ۔ آج جانا ہے نا!

آزاد نے ایک حجّام بلوایا۔ حجامت بننے لگی۔

خوجی : گھوٹو، گھوٹو۔ گھوٹے جا۔ ابھی کھُونٹی باقی ہے۔ خوب گھوٹو۔

حجّام نے پھر چھُرا پھیرا۔ خوجی نے پھر ٹٹول کر کہا۔ ابھی کھُونٹی باقی ہے گھوٹو۔

حجّام : تو حضور، کب تک گھوٹا کروں!

خوجی : دونے پیسے دیں گے ہم۔

حجّام : مانا، مگر کوئی حد بھی ہے؟

خوجی : تم کو اس سے کیا مطلب!

حجّام : خون نکلنے لگے گا۔

آزاد : اور اچھا ہے، لوگ کہیں گے، نوشا کے چہرے سے خون برستا ہے۔

خوجی : ہاں، خوب سوچی۔

حجام : (رکسبت سنبھال کر) اب کسی اور نائی سے گھٹوائیے۔

آزاد : اچھا، پٹے تو کترتے جاؤ۔

حجام نے جھلا کر آدھے بال کتر ڈالے۔ ایک طرف کی آدھی مونچھ اڑا دی۔ خوجی ایک تو یوں ہی بڑے حسین تھے، اب حجام نے بال کتر کر اور بھی ٹھیک بنا دیا خوجی نے جو آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو مونچھیں ندارد جھلا کر کہا او گیدی، یہ کیا کیا؟ حجام ڈرا کہ کہیں یہ صاحب مار نہ بیٹھیں۔

آزاد : کیوں، کیوں خفا ہو گئے بھئی!

خوجی : اس نے پٹے اُول جلول کترے، اور آپ بولے تک نہیں؟

آزاد : میں سچ کہتا ہوں آپ اتنے حسین کبھی نہ تھے۔

خوجی : اور چہرے کی تو فکر کرو!

آزاد : ہاں، ہاں، گھبراتے کیوں ہو؟

خوجی : ہم کو یاد آتا ہے کہ نوشا کے سامنے چھوٹے چھوٹے لڑکے غزلیں پڑھتے ہیں۔ دو ایک لونڈے بلوا لیجیے، تو ان کو غزلیں رٹا دیں۔

آزاد نے دو لڑکے بلوائے، اور میاں خوجی ان کو غزلیں یاد کرانے لگے۔ ایک غزل میاں آزاد نے یہ بتلائی۔

بھلا یہ تو بتاؤ کہ یہ کون بشر ہے،
سب صورتِ لنگور فقط دم کی کسر ہے۔

خوجی : چلیے بس، اب دل لگی رہنے دیجیے۔ واہ، اچھے ملے!

آزاد : اچھا، اور غزل لکھوائے دیتا ہوں۔

فُغاں ہے، آہ ہے، نالہ ہے، بے قراری ہے،
فِراقِ یار میں حالت عجب ہماری ہے۔

خوجی : واہ، شادی کو اس شعر سے کیا واسطہ!

آزاد : اچھا صاحب، یہ غزل یاد کروا دیجیے۔

کہا تھا بلبل سے حال میں نے
تیرے ستم کا بہت چھپا کر،
یہ کس نے ان کو خبر سنائی

کہ ہنس پڑے پھول کھلکھلا کر

میرے جنازے کو ان کے کوچے میں

ناحق احباب لے کے آئے،

نگاہِ حسرت سے دیکھتے ہیں

وہ رخ سے پردہ اٹھا اٹھا کر۔

خوجی : واہ، جنازے کو شادی سے کیا مطلب ہے بھلا!

آزاد : اوپر والا شعر پسند ہے؟

خوجی : ہاں، ہنسنا اور کھلکھلانا، ایسے لفظ ہوں، تو کیا پوچھنا!

آزاد : اچھا، اور سنیے۔

خوجی : نہیں اتنا ہی کافی ہے۔ ذرا باجے والوں کی تو فکر کیجیے۔ ہاتھی، گھوڑے، پالکی، سبھی چاہیے۔ مگر ہمارے لیے جو گھوڑا منگوایئے گا، وہ ذرا سیدھا ہو۔

آزاد : بھلا، گھوڑا نہ ملے، تو خچّر ہو تو کیسا؟

خوجی : واہ، آپ نے مجھے کوئی گدھا سمجھا ہے؟

اتنے میں ہوٹل کا مینیجر آ گیا اور یہ تیاریاں دیکھ کر ہنسنے لگا۔

خوجی : کیوں صاحب، یہ آپ ہنسے کیوں؟

مینیجر : جناب، یہاں شریف لوگ شادیوں میں باجے گاجے نہیں لے جاتے، اور پیدل ہی جاتے ہیں۔ ہاں، ایک بات ہوسکتی ہے، دس پانچ آدمیوں کو تھالیاں دے دیجیے، بانس کی کھپاچوں سے انھیں بجاتے جائیں۔ آواز کی آواز اور باجے کا باجا۔

خوجی : بھئی آزاد، سوچ لو۔

آزاد : وہ جب یہاں دستور ہی نہیں، تو پھر کیا کیا جائے گا؟ ہاں، نوشے کا پیدل جانا ذرا بدنامی کی بات ہے۔

مینیجر : تو پیدل نہ جایئے۔ جس طرح یہاں رئیس لوگ جاتے ہیں، اس طرح جایئے— آدمی کی گود میں۔

خوجی : منظور۔ مگر ہم کو اٹھا سکے گا کوئی؟

مینیجر : ہم اس کا بندوبست کر دیں گے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔

دو گھڑی دن رہے خوجی کی برات چلی۔ تین مزدور آگے آگے تھالیاں بجاتے جاتے ہیں، دو لونڈے آگے پیچھے ساتھ۔ خوجی ایک مزدور کی گود میں، گیروئے کپڑے پہنے، اکڑے بیٹھے ہیں۔ ایکاایک آپ بولے— ارے رے رے! روک لو برات۔ روک لو۔ پنج شاخہ والے کہاں ہے؟ کوئی بولتا ہی نہیں۔ پردیس میں بھی انسان پر کیا مصیبت پڑتی ہے؟ اب میں دولہا بن کر رہوں، یا انتظام کروں! یہ دونوں گیدی تو نرے جانگلو ہی نکلے۔ پھر یاد آیا کہ نشان کا ہاتھی تو ہے ہی نہیں۔ ارے! کرولی بھی نہیں۔ حکم دیا کہ لوٹا دو برات۔ چلو ہوٹل میں۔

آزاد : یہ کیا بھئی؟ کیا بات ہے؟ لوٹے کیوں جاتے ہو؟

خوجی : نشان کا ہاتھی تو ہے ہی نہیں۔

آزاد : عجب آدمی ہو بھئی، آپ لڑنے جاتے ہیں، یا شادی کرنے؟ اور پھر یہاں ہاتھی کہاں؟ کہیے تو خچر پر ایک جھنڈی رکھوا دیں۔

اتنے میں مِس مِیڈا آتی ہوئی دیکھائی دیں۔ خوجی انھیں دیکھتے ہی اور بھی اکڑ گئے۔ کیا کہوں، میرے ساتھ کے آدمی سب گولی مار دینے لائق ہیں۔ کوئی انتظام ہی نہ کیا۔

مِیڈا : خیر، کل آ جائیے گا۔ مگر آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ یہاں ایک روسی بہت دنوں سے میرا عاشق ہے۔ پہلے اس سے لڑو، پھر ہمارے ساتھ شادی ہو۔

خوجی : مجال ہے اس کی کہ میرے سامنے کھڑا ہو جائے؟ ہم پچاس آدمیوں سے اکیلے لڑ سکتے ہیں۔ جب برات ہوٹل پہنچی، تو مِیڈا نے کہا— تو ان سے کب لڑیے گا؟

خوجی : جب کہیے۔ خون پی جاؤں گا۔

مِیڈا : اچھا، کل تیار رہیے گا۔

دوسرے دِن میڈا نے ایک ترکی پہلوان کو لاکر ہوٹل میں بیٹھا دیا اور خوجی سے بولی— لیجیے، آپ کا دشمن آ گیا۔ خوجی نے جب اسے دیکھا، تو ہوش اڑ گئے۔ دنیا بھر کے آدمیوں سے دو مٹھی اونچا۔ دل میں سوچنے لگے، یہ تو کچّا ہی کھا جائے گا۔ ایک چپت دے، تو ہم زمین میں دھنس جائیں۔ اس سے لڑے گا کون بھلا! مارے ڈر کے ذرا پیچھے ہٹ گئے۔ مِیڈا نے کہا— آپ تو ابھی سے ڈرنے لگے۔ خوجی ایکاایک دھڑام سے گر پڑے اور چلّانے لگے— اس طرح کا درد ہو رہا ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ افسوس، دل کی دل ہی میں رہ گئی! واللہ، وہ پٹکنی دیتا کہ کمر ٹوٹ جاتی۔ مگر خدا کو منظور نہ تھا۔ ترکی پہلوان نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکا دیا،

تو دس قدم پر جا گرے۔ بولے— او گیدی، ذرا بیمار ہو گیا ہوں، نہیں تو کچا ہی کھا جاتا، نمک بھی نہ مانگتا۔

آخر اس بات پر فیصلا ہوا کہ جب خوجی اچھے ہو جائیں، تو پھر کسی دن کشتی ہو۔

(60)

میاں شہسوار کا دل دنیا سے تو گر گیا تھا، مگر جوگن کی اٹھتی جوانی دیکھ کر دُھن سمائی کہ اس کو نکاح میں لاویں۔ ادھر جوگن نے ٹھان لی تھی کہ عمر بھر شادی نہ کروں گی۔ جس کے لیے جوگن ہوئی، اسی کی محبت کا دم بھروں گی۔ ایک دن شہسوار نے جو سنا کہ سپہرآرا کوٹھے پر سے کود پڑی، تو دل بے اختیار ہو گیا۔ چل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں، ماجرا کیا ہے؟ راستے میں ایک منشی سے ملاقات ہو گئی۔ دونوں آدمی ساتھ ساتھ بیٹھے، اور ساتھی ہی ساتھ اترے۔ اتفاق سے ریل سے اترتے ہی منشی جی کو ہیضہ ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے چل بسے۔ شہسوار نے جو دیکھا کہ منشی کے پاس دولت کافی ہے، تو فوراً ان کے بیٹے بن گئے اور سارا مال اسباب لے کر چمپت ہو گئے۔ سات ہزار کی اشرفیاں، دس ہزار کے نوٹ اور کئی سو روپے ہاتھ آئے۔ رئیس بن بیٹھے۔ فوراً جوگن کے پاس لوٹ گئے۔

جوگن : کیا گئے نہیں؟

شہسوار : آدھی ہی راہ سے لوٹ آئے۔ مگر ہم امیر ہو کر آئے ہیں۔

جوگن : امیر کیسے! بولو؟ ہم کو بناتے ہو؟

شہسوار : قسم خدا کی، ہزاروں لے کر آیا ہوں۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔

دنیا کے بھی عجب کارخانے ہیں۔ شہسوار کو بائیس ہزار تو نقد ملے اور جب کپڑوں کی گٹھری کھولی، تو ایک ٹوپی نکل آئی، جس میں ہیرے اور موتی ٹکے ہوئے تھے۔ جوگن کے عاشقوں میں ایک جوہری بھی تھا۔ اس نے یہ ٹوپی بیس ہزار میں خرید لی۔ جب جوہری چلا گیا، تو شہسوار نے جوگن سے کہا— لو، اب تو اللہ میاں نے تو چھپّر پھاڑ کے دولت دی۔ کہو، اب نکاح کی ٹھہرتی ہے؟ کیوں مفت میں جوانی کھوتی ہو؟

جوگن : اب رنگ لائی گلہری۔ اوچھے کے گھر تیتر، باہر رکھوں کہ بھیتر۔ روپے کیا مل گیا، اپنے آپ کو بھول گئے۔

شہسوار سچ مچ اوچھا تھا۔ اب تک تو آپ جوگن کی خوشامد کرتے تھے، ڈئی دیے بیٹھے تھے کہ کبھی نہ کبھی تو دل پسیجے گا، مگر اب زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتے۔ بات بات پر تنکتے ہیں۔ جوگن، تو دنیا سے منہ موڑے بیٹھی تھی، ان کے چونچلے کیوں برداشت کرتی؟ شہسوار سے نفرت کرنے لگی۔

ایک دن شہسوار ہوا کے گھوڑے پر سوار ڈینگ مارنے لگے— اس وقت ہم بھی لاکھ کے پیٹ میں ہیں۔ اور لاکھ روپے جس کے پاس ہوتے ہیں، اس کو لوگ تین چار لاکھ کا آدمی آنکتے ہیں۔ اب دو گھوڑے اور لیں گے۔ مگر ہم یہ مہاجنی کارخانہ نہ رکھیں کہ چار جامہ اور زین پوش۔ بس، انگریزی کاٹھی۔ اور ایک جوڑی فٹن کے لیے۔ جو دیکھے، کہے، رئیس جاتا ہے۔ اور رئیس کے کیا دو سینگ ہوتے ہیں سر پر؟ ایک کوٹھی بھی بنوا دیں گے۔ کوئی تعلقے دار اپنا علاقہ بیچے، تو کھڑے کھڑے خرید لیں۔

جوگن : اچھا، کھانا تو کھا لو۔

شہسوار : آج کھانا کیا پکا ہے؟

جوگن : بیسن کی روٹی۔

شہسوار : یہ تو رئیسوں کا کھانا نہیں۔

جوگن : رئیس کون ہیں؟

شہسوار : ہم تم، دونوں۔ کیا اب بھی رئیس ہونے میں شک ہے؟ ہاں، خوب یاد آیا، ایک ہاتھی بھی خریدیں گے۔

جوگن : ہاں، بس اسی کی کسر تھی۔ دو تین گدھے بھی خریدنا۔

شہسوار : گدھے تو رئیسوں کے یہاں نہیں دیکھے۔

جوگن : نئی بات سہی۔

شہسوار : ہاں، خوب سوجھی۔

جوگن : پھر، یہ سب کب خریدو گے؟

شہسوار : جب چاہیں۔ روپے کا تو سارا کھیل ہے۔ تیس چالیس ہزار روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ انسان گنے، تو برسوں میں گنتی ختم ہو۔

جوگن : اجی، دو تین آدمی تو اتنے عرصے میں مر جائیں، دس پانچ کی آنکھیں پھوٹ

جائیں۔

اس دن سے شہسوار کی حالت ہی کچھ اور ہوگئی۔ کبھی روتے، کبھی بہکی بہکی باتیں کرتے۔ آخر جوگن نے وہاں سے کہیں بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ پڑوس میں ایک آدمی رہتا تھا جو موم کے کھلونے خوب بناتا تھا۔موم کے آدمی اپنے بناتا کہ اصل کا دھوکہ ہوتا تھا اسے بلا کر جوگن نے اس کے کان میں کچھ کہا اور کاریگر دس دن کی مہلت لے کر رخصت ہوا۔

نو دن تک تو جوگن نے کسی طرح کاٹے، دسویں دن ایکاایک شہسوار نے اسے دیکھا، تو چپ چاپ پڑی ہے۔ بلایا، جواب ندارت۔قریب جا کر دیکھا، تو پچھاڑ کھا کر گر پڑے۔ لگے دیوار سے سر ٹکرانے۔ جی میں آیا کہ زہر کھا لیں اور اسی کے ساتھ چلے چلیں۔کیا لُطف سے دن کٹتے تھے، اب یہ روپے کس کام آویں گے۔ جان جانے کا رنج نہیں، مگر یہ روپیہ کہاں جائے گا؟ آخر وصیت لکھی کہ میرے بعد میری ساری جائداد سپہرآرا کو دی جائے۔ یہ وصیت لکھ کر شہسوار نے لکھ کر سر پیٹنا شروع کیا۔ کھلونہ بنانے والا کاریگر اسے سمجھانے لگا— صبر کیجیے۔ ہائے، کیا مزاج تھا! یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی کو بلالایا۔ دونوں نے لاش کو خوب لپیٹ کر کندھے پر اٹھایا۔ میاں شہسوار پیچھے پیچھے چلے۔

کاریگر : تم کیوں آتے ہو؟ قبرستان بہت دور ہے۔

شہسوار : قبر تک تو چلنے دو۔

کاریگر : کیا غضب کرتے ہو۔ تھانے والوں کو خبر ہوگئی تو مفت میں دھرے جاؤگے۔

شہسوار : مٹی تو دے دوں۔

کاریگر : بس، اب ساتھ نہ آیئے۔

(61)

قید خانے سے چھوٹنے کے بعد میاں آزاد کو رِسالے میں ایک عہدہ مل گیا۔ مگر اب مشکل یہ پڑی کہ آزاد کے پاس روپے نہ تھے۔ دس ہزار روپے کے بغیر تیاری مشکل۔ اجنبی آدمی، پرایا ملک، اتنے روپے کا انتظام کرنا آسان نہ تھا۔ اس فکر میں میاں آزاد کئی دن تک غوطے کھاتے رہے۔ آخر یہی سوچا کہ یہاں کوئی نوکری کر لیں اور روپے جمع ہو جانے کے بعد فوج میں جائیں۔ من مارے بیٹھے ہوئے تھے، کہ مِیڈا آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس تپاک

کے ساتھ آزاد روز پیش آیا کرتے تھے۔ اس کا آج پتہ نہ تھا! چکرا کر بولی— اداس کیوں ہو! میں تو تمھیں مبارکباد دینے آئی تھی۔ یہ الٹی بات کیسی؟

آزاد : کچھ نہیں۔ اداس تو نہیں ہوں۔

مِٹیڈا : ذرا آئینے میں صورت تو دیکھیے۔

آزاد : ہاں، مِٹیڈا، شاید کچھ اداس ہوں۔ میں نے تم سے اپنے دل کی کوئی بات کبھی نہیں چھپائی۔ مجھے عہدہ تو مل گیا، مگر یہاں ٹکا پاس نہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟

مِٹیڈا : بس، اس لیے آپ اتنے اداس ہیں! یہ تو کوئی بڑی بات نہیں۔ تم اس کی کوئی فکر نہ کرو۔

یہ کہہ کر مِٹیڈا چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کے آدمی نے آکر ایک لفافہ آزاد کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ آزاد نے لفافہ کھولا، تو اچھل پڑے۔ استنبول بینک کے نام بیس ہزار کا چیک تھا۔ آزاد روپے پا کر خوش تو ہوئے، مگر یہ افسوس ضرور ہوا کہ مِٹیڈا نے اپنے دل میں نہ جانے کیا سمجھا ہوگا۔ اسی وقت بینک گئے، روپے لیے اور سب سامان ٹھیک کرکے دوسرے دن فوج میں داخل ہو گئے۔

دوپہر کے وقت گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی۔ خوجی نے سنا، تو بولے— یہ آواز کیسی ہے بھئی؟ ہم سمجھ گئے۔ بھونچال آنے والا ہے۔ اتنے میں کسی نے کہا— فوج جا رہی ہے۔ خوجی کوٹھے پر چڑھ گئے۔ دیکھا، فوج سامنے آ رہی ہے۔ یہ گھڑگھڑاہٹ توپ خانے کی تھی۔ ذرا دیر میں آزاد پر نظر پڑی۔ گھوڑے کی باگ اٹھائے، ران جمائے چلے جاتے تھے۔ خوجی نے پکارا— میاں، آزاد! ارے میاں، ادھر، ادھر! واہ، سنتے ہی نہیں۔ فوج میں کیا ہو گئے، مزاج ہی نہیں ملتے۔ ہم بھی پلٹن میں رہ چکے ہیں، رسال دار تھے، پر یہ نہ تھا کہ کسی کی بات نہ سنیں۔

سارے شہر میں ایک میلہ سا لگا ہوا تھا، کوٹھے پھٹے پڑتے تھے۔ عورتیں اپنے شوہروں کو لڑائی پر جاتے دیکھتی تھیں اور ان پر پھولوں کی بوچھار کرتی تھیں۔ مائیں اپنے بیٹوں کے لیے خدا سے دعا کر رہی تھیں۔

فوج تو میدان کو گئی اور میاں خوجی مس مِٹیڈا سے ملنے چلے۔ مِٹیڈا کی ایک سہیلی کا نام تھا مِس روز۔ مِٹیڈا خوجی کو دیکھتے ہی بولی— لیجیے، میں نے آپ کی شادی مِس روز سے

ٹھیک کر دی۔ اب کل برات لے کر آیئے۔

خوجی : خدا آپ کو اس نیکی کا بدلہ دے۔ میں تو وزیرِ جنگ کو بھی نوید دوں گا۔

مِنڈا : اجی، سلطان کو بھی بلوایئے۔

خوجی : تو پھر بندوبست کیجیے۔ شادی کے لیے ناچ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اگر طبلے پر تھاپ نہ پڑی، محفل نہ جمی، تو شادی ہی کیا؟

مِنڈا : مگر یہاں تو آدمی کا ناچ منع ہے۔ کہیں کوئی عورت ناچے، تو غضب ہی ہو جائے۔

خوجی : اچھا، پھر کسی سبیل سے ناچ کا نام تو ہو جائے۔

مِنڈا : اس کی تدبیر یوں کیجیے کہ کسی بندر نچانے والے کو بلا لیجیے۔ خرچ بھی کم اور لطف بھی زیادہ۔ تین بندر والے کافی ہوں گے۔

خوجی : تین تو منحوس ہیں۔ پانچ ہو جائیں، تو اچھا!

خیر، دوسرے دن خوجی برات سجا کر مِنڈا کے مکان کی اُور چلے۔ آگے نشان کا خچّر تھا، پیچھے ریچھ اور بندر۔ دس پانچ لڑکے مشعلیں لیے خوجی کے چاروں چلے جاتے تھے، اور خوجی ٹٹّو پر سوار، گیروئے رنگ کی پوشاک پہنے، سیاہ پگڑی باندھے، اکڑے بیٹھے تھے۔ ٹٹّو اتنا مریل تھا کہ خوجی بار بار اچھلتے تھے، ایڑ پر ایڑ لگاتے تھے، مگر وہ دو قدم آگے جاتا تھا تو چار قدم پیچھے۔ ایکاایک ٹٹّو بیٹھ گیا۔ اس پر لڑکوں نے اسے ڈنڈے مارنا شروع کیا۔ خوجی بگڑ کر بولے — او مسخرو، تم سب ہنستے کیا ہو! جلد کوئی تدبیر بتاؤ، ورنہ مارے کرولیوں کے بولا دوں گا۔

سائیس : حضور، میں اس گھوڑے کی عادت خوب جانتا ہوں۔ یہ بغیر چابک کھائے اٹھنے والا نہیں۔

خوجی : تو مصلحت کرتا ہے کہ کسی تدبیر سے ٹٹّو کو مناتا ہے؟

سائیس : آپ اتر پڑیے۔

خوجی اتر پڑے اور سائیس نے ٹٹو کو مار مار کر اٹھایا۔ خوجی پھر سوار ہونے چلے۔ ایک پیر رکاب پر رکھ کر دوسرا اٹھایا ہی تھا کہ ٹٹو چلنے لگا۔ خوجی ارا را،را کر کے دھم سے زمین پر آ رہے۔ پگڑی یہ گری، کرولی وہ گری۔ ڈبیا ایک طرف، ٹٹو ایک طرف۔ سائیس نے کہا — اٹھیے،

اٹھیے۔ گھوڑے سے گرنا شہسواروں ہی کا کام ہے۔ جسے گھوڑا نصیب نہیں، وہ کیا گرے گا؟

خوجی : خیرت یہ ہوئی کہ میں گھوڑے پر نہ گرا، ورنہ میرے بوجھ سے اس کا کام ہی تمام ہو جاتا۔

خوجی نے پھر سر پر پگڑی رکھی، کرولی کمر سے لگائی اور ایک لڑکے سے پوچھا— یہاں آئینہ تو کہیں نہیں ملے گا؟ پھر سے پوشاک بجی ہے، ذرا منھ تو دیکھ لیتے۔

لڑکا : آئینہ تو نہیں ہے، کہیے، پانی لے جاؤں۔ اسی میں منھ دیکھ لیجیے۔

یہ کہہ کر وہ ایک ہانڈی میں پانی لایا— خوجی پینک میں تو تھے ہی، ہانڈی جو اٹھائی، تو سارا پانی اوپر آ رہا۔ بگڑ کر ہانڈی پٹک دی۔ پھر آگے بڑھے۔ مگر دو چار قدم چل کر یاد آیا کہ مس روز کا مکان تو معلوم ہی نہیں، برات جائے گی کہاں؟ بولے— یارو، غضب ہو گیا! جلوس روک لو۔ کوئی مکان جانتا ہے؟

سائیس : کون مکان؟

خوجی : وہی جی، جہاں چلنا ہے۔

سائیس : مجھے کیا معلوم؟ جدھر کہیے، چلوں۔

خوجی : تم لوگ عجیب گھامڑ ہو۔ برات چلی اور دلہن کے گھر کا پتہ تک نہ پوچھا۔

سائیس : نام تو بتائیے؟ کسی سے پوچھ لیا جائے۔

خوجی : ارے بھائی، مجھے ان کا نام نہ لینا چاہیے۔ اٹکل سے چلو اسی طرف۔

سائیس : ارے، کچھ نام تو بتائیے!

خوجی : کوہ قاف کی پری کہہ دو۔ پوری نام ہم نہ لیں گے۔

ایک طرف کئی آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ سائیس نے پوچھا— یہاں کوئی پری رہتی ہے؟

ایک آدمی نے کہا— مجھے اور تو نہیں معلوم، مگر شہر باہر پورب کی طرف جو ایک تالاب ہے، وہاں پار سال جو ایک فقیر ٹکے تھے، ان کے پاس ایک پری تھی۔

خوجی : لو، چل نہ گیا پتہ! اسی تالاب کی طرف چلے چلو۔

اب سنیے۔ اس تالاب پر ایک رئیس کی کوٹھی تھی۔ اس کی بیوی مر گئی تھی۔ گھر میں ماتم ہو رہا تھا۔ دروازے پر جو یہ شور غل مچا، تو اس نے اپنے نوکروں سے پوچھا— یہ کیسا غل ہے؟ باہر نکل کر خوب پیٹو بدمعاشوں کو! دو تین آدمی ڈنڈے لے لے کر پھاٹک سے نکلے۔

خوجی : واہ رے آپ کے یہاں کا انتظام! کب سے برات کھڑی، اور دروازے پر روشنی تک ندارد!

ایک آدمی : تو کون ہے بے؟ کیا رات کو بندر نچانے آیا ہے؟

خوجی : زبان سنبھال۔ جا کر اپنے مالک سے کہہ، برات آئی ہے۔

آدمیوں نے برات کو پیٹنا شروع کیا۔ خوجی پر ایک چپت پڑی، تو پگڑی گر پڑی۔ تو دوسرے نے ٹٹو پر ڈنڈے جمائے۔

خوجی : بھئی، ایسی دل لگی نہ کرو۔ کچھ کمبختی تو نہیں آئی تم سب کی؟

بندر والوں پر جب مار پڑی، تو وے سب بھاگے۔ لڑکے بھی چراغ پھینک پھانک کر بھاگے۔ ٹٹو نے بھی ایک طرف کی راہ لی۔ بے چارے خوجی اکیلے پٹ پٹا کر ہوٹل کی طرف چلے۔

(62)

جوگن شہسوار سے جان بچا کر بھاگی، تو راستے میں ایک وکیل صاحب ملے۔ اسے اکیلے دیکھا، تو چھیڑنے کی سوجھی۔ بولے— حضور کو آداب۔ آپ اس اندھری رات میں اکیلے کہاں جاتی ہیں؟

جوگن : ہمیں نہ چھیڑیے۔

وکیل : شہزادی ہو؟ نواب زادی ہو؟ آخر ہو کون؟

جوگن : غریب زادی ہوں۔

وکیل : لیکن آوارہ۔

جوگن : جیسا آپ سمجھیے۔

وکیل : مجھے ڈر لگتا ہے کہ تمھیں اکیلا پا کر کوئی دِق نہ کرے۔ میرا مکان قریب ہے، وہیں چل کر آرام سے رہو۔

جوگن : مجھے آپ کے ساتھ جانے میں کوئی عذر نہیں، مگر شرط یہی ہے کہ میری عزّت کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

وکیل : یہ آپ کیا فرماتیں ہیں؟ میں شریف آدمی ہوں۔

وکیل صاحب دیکھنے میں تو شریف معلوم ہوتے تھے، مگر دل کے بڑے کھوٹے تھے۔ جوگن نے سمجھا کہ اس وقت اور کہیں جانا تو مناسب نہیں۔ رات کو یہیں رہ جاؤں، تو کیا حرج؟ وکیل صاحب کے گھر گئی، تو دیکھا، ایک کمرے میں ٹاٹ پر دری بچھی ہے، اور ایک ٹوٹی میز پر قلم داوات رکھی ہے۔ سمجھ گئی، یہ کوئی ٹٹ پنجیے وکیل ہیں۔

رات زیادہ آ گئی تھی۔ جب جوگن سوئی، تو وکیل صاحب نے اپنے نوکر سالار بخش کو یوں پٹی پڑھائی— تم صبح ان سے کہنا کہ وکیل صاحب بہت بڑے رئیس ہیں۔ ان کے باپ چکلے دار تھے۔ ان کے یہاں دو بگھیاں ہیں اور آدمیوں کی تنخواہ مہینے میں تین سو روپے دیتے ہیں۔

سَلار بخش: بھلا وہ یہ نہ کہیں گی کہ رئیس ہیں، تو پھٹے حالوں کیوں رہتے ہیں؟ ایک تو کھٹیا آپ کے پاس، اور اس پر یہ باتیں کہ ہم ایسے اور ہم ویسے۔ ہاں، میں اتنا کہہ دوں گا کہ ہمارے حضور دل کے بڑے وہ ہیں۔

وکیل: وہ کے کیا معنی؟

سَلار بخش: اجی، چالاک ہیں۔

وکیل: آج کھانا دل لگا کر پکانا۔

سَلار بخش: تو کسی باورچی کو بلا لیجیے نہ! دو روپے خرچیے، تو اچھے سے اچھے کھانے پکوا دوں۔ اور ان کے لیے کوئی ماما رکھیے بے اس کے بات نہ بنے گی۔ ہاں، چاہے مار ڈالیے ہمیں، ہم جھوٹ نہ بولیں گے کبھی۔

وکیل: دیکھو، سب فکر ہو جائے گی۔

سَلار بخش: فکر کیا خاک ہوگی؟ مقدمے والے تو آتے ہی نہیں۔

وکیل: اجی، ایک مقدمے میں عمر بھی کی کسر نکل جائے گی۔

سَلار بخش: تو کیا ملے گا ایک مقدمے میں؟

وکیل: اجی، ملنے کی نہ کہو! ملیں، تو دو لاکھ مل جائیں۔

سَلار بخش: ایں، اتنا جھوٹ! میاں، میں نوکری نہیں کرنے کا۔ دیکھیے، چھت نہ گر پڑے کہیں! لوگ کہتے ہیں، کال پڑتا ہے، ہیضہ آتا ہے، مینھ نہیں برستا۔ برسے کیا خاک، اس جھوٹ کو تو دیکھیے، کچھ ٹھکانہ ہے، دو لاکھ ایک مقدمے میں آپ پائیں گے! کبھی بابا راج نے

بھی دو لاکھ کی صورت دیکھی تھی؟ ہم نے تو آپ کے بابا کو بھی جوتیاں چٹھکاتے دیکھا۔ وہ تو کہیے، فیقر کی دعا سے روٹیاں چلی جاتی ہیں۔ یہی غنیمت سمجھو؟

وکیل : تم بڑے گستاخ ہو۔

سَلار بخش : میں تو کھری کھری کہتا ہوں۔

وکیل : خیر، کل ایک کام تو کرنا! ذرا دو ایک آدمیوں لگا لانا۔

سَلار بخش : کیا کرنا؟

وکیل : دو آدمیوں کو موکّل بنا کر لے آنا، جس میں یہ سمجھیں کہ ان کے پاس مقدمے بہت آتے ہیں۔ ہم تو رنگ جماتے ہیں نہ اپنا۔ یہ بات! سمجھے!

سَلار بخش : اگر دو ایک کو پھانس پھونس کر لائے بھی، تو فائدہ کیا؟ ٹکا تو وصول نہ ہوگا۔

وکیل : وہ سمجھیں گی کہ یہ بہت بڑے وکیل ہیں۔

سَلار بخش : اچھا، اس وقت تو سوئیے۔ صبح دیکھی جائے گی۔

دونوں آدمی سوئے۔ سب سے پہلے جوگن کی آنکھ کھلی۔ سَلار بخش سے بولی— کیوں جی، ان کا نام کیا ہے؟

سَلار بخش : ان کا نام ہے ہیگن؟

جوگن : کیا؟ ہیگن! تب تو شریف ضرور ہوں گے اور ان کے باپ کا نام کیا ہے؟ بیگن؟

سَلار بخش : باپ کا نام مداری۔

جوگن : واہ، بس، معلوم ہوگیا۔ اور پیشہ کیا ہے؟

سَلار بخش : دلالی کرتے ہیں۔

جوگن : ایں، یہ دلال ہیں؟

سَلار بخش : جی، اور کیا! باپ دادے کے وقت سے دلالی ہوتی آتی ہے۔

وکیل صاحب لیٹے لیٹے سن رہے تھے اور دل ہی دل میں سَلار بخش کو گالیاں دے رہے تھے کہ پاجی نے جمع جمایا رنگ پھینکا کر دیا۔ اتنے میں بارہ کی توپ دغی اور وکیل صاحب اٹھ بیٹھے۔

وکیل پانی لاؤ۔ آج وہ دوسرا خدمت گار کہاں ہے؟

سَلار بخش : حضور، چھٹی لے گیا ہے۔

وکیل : اور ماما نہیں آئی؟

سلار بخش : رات اس کے لڑکا ہوا ہے۔

وکیل : اور کالے خاں کہاں مر گیا آج!

سلار بخش : لال خاں کے پاس گیا ہے حضور!

وکیل : اور ہمار محرّر؟

سلار بخش : انھیں نواب صاحب نے بلوا بھیجا ہے۔

وکیل : سب موکّل کہاں ہیں؟

سلار بخش : حضور، سب واپس چلے گئے۔

وکیل : کچھ پرواہ نہیں، ہم کو مقدموں کی کیا پرواہ!

سلار بخش : حضور کے گھر کی ریاست کیا کم ہے!

وکیل : (جوگن سے) آج تو آپ خوب سوئیں۔

جوگن : مارے سردی کے رات بھر کانپتی رہی۔ قسم لے لو، جو آنکھ بھی جھپکی ہو۔ یہ تو بتایئے۔ آپ کا نام کیا ہے؟

وکیل : ہمار نام مولوی مرزا محمد صادق علی بیگ، وکیل عدالت۔

جوگن : 'گھر کی پٹکی باسی ساگ۔'

وکیل : ایں، اور سنیے۔

جوگن : تمھارا نام ہینگ ہے؟ اور بیگن کے لڑے ہو، دلالی کرتے ہو؟

وکیل : ہینگ کس پاجی کا نام ہے؟

سلار بخش : ان سے کسی نے ہینگ کہہ دیا ہوگا۔

وکیل : تیرے سوا اور کون کہنے بیٹھا ہوگا؟

سلار بخش : تو کیا میں ہی اکیلا آپ کا نوکر ہوں کچھ؟ پندر بیس آدمی ہیں۔ کسی نے کہہ دیا ہوگا۔ اس کو ہم کیا کریں لے بھلا؟

وکیل : اوپر سے اور ہنستا بے غیرت! (جوگن سے) ہم سے ایک فقیر نے کہا ہے کہ تم جلد بادشاہ ہونے والے ہو۔

جوگن : ہاں، پھر الّو تمھارے سر پر بیٹھا ہی چاہتا ہے۔ دو ہی طرح سے غریب آدمی

بادشاہ ہو سکتا ہے— یا تو ٹانگ ٹوٹ جائے، یا الّو سر پر بیٹھے۔ اچھا، آپ کی آمدنی کیا ہوگی؟

وکیل : یہ نہ پوچھو۔ کچھ روپیہ گاؤں سے آتا ہے، کچھ وثیقہ ہے، کچھ وکالت سے پیدا کرتے ہیں۔

جوگن : اور سواری کیا ہے آپ کے پاس؟

وکیل : آج کل تو بس، ایک پالکی ہے اور دو گھوڑے۔

جوگن : بندھتے کہاں ہے؟

سَلار بخش : ادھر ایک اصطبل ہے، اور اس کے پاس ہی فیل خانہ۔

جوگن : ایں، کیا آپ کے پاس ہاتھی بھی ہے؟

وکیل : نہیں جی، کہنے دو اسے۔ یہ یوں ہی کہا کرتا ہے۔

جوگن : اچھا وکالت میں کیا ملتا ہوگا؟

وکیل : اب تو آج کل مقدمے ہی کم ہیں۔

جوگن : تو بھی بھلا؟

سَلار بخش : اس کی نہ پوچھیے، کسی مہینے میں دو چار ہاتھی آگئے، کسی مہنے میں دس پانچ اونٹ مل گئے۔

وکیل : تو اٹھ جا یہاں سے۔ ہزار بار کہہ دیا کہ مسخرے پن سے ہم کو نفرت ہے، مگر مانتا ہی نہیں شیطان! تجھ سے کچھ کہا تھا ہم نے!

سَلار بخش : ہاں، ہاں، یاد آگیا۔ لیجیے ابھی جاتا ہوں۔

وکیل صاحب سَلار بخش کے ساتھ برآمدے میں آئے کہ کچھ اور سمجھا دیں، تو سَلار بخش نے کہا— ابھی سبھوں کو پھانسے لاتا ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے۔ مگر یہ بھی بیٹھی رہیں، جس میں لوگ سمجھیں کہ وکیل کی بڑی آمدنی ہے۔ میں کہہ دوں گا کہ گانا سننے کے لیے نوکر رکھا ہے۔ سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔

وکیل : سو نہیں، دو سو کہنا!

سَلار بخش : وہی بات کہیے گا، جو بے تکی ہو۔ بھلا کسی کو بھی دنیا میں یقین آوے گا کہ یہ وکیل دو سو روپے خرچ کر سکتا ہے؟

وکیل : کیوں، کیوں؟

سَلار بخش : اب آپ تو ہنڈی کی چنڈی نکالتے ہیں۔ ڈھیلے ڈھیلے پر تو آپ مقدمے لیتے ہیں، دو سو کی رقم بھلا آپ کیا خرچ کریں گے؟

وکیل : اچھا، بک نہ بہت۔ جا، پھانس لا دو چار کو۔

سَلار بخش باہر جا کر دو چار اڑوسیوں پڑوسیوں کو سکھا پڑھا کر مونچھو پر تاؤ دیتے ہوئے آیا، اور حقّہ بھر کر جوگن کے سامنے پیش کیا۔

جوگن : کیا لکّو والے کی دکان سے لائے ہو؟ ہٹا لے جاؤ اسے! تمھیں مدریا بھی نہیں جُرتا؟

وکیل : ارے، تو یہ حقّہ کہاں اٹھا لایا؟ وہ حقّہ کہاں ہے، جو نصیرالدین حیدر کے پینے کا تھا؟ وہ گنگا جمنی گُڑگُڑی کہاں ہے، جو ہمارے سالے نے بھیجی تھی۔

سَلار بخش : وہ حضور کے بہنوئی لے گئے۔

وکیل : تو آخر، پیچوان اور چاندی کا حقّہ کیوں نہیں نکالتے؟ یہ بھدّے سَل حقّہ اٹھا لائے وہاں سے۔

سَلار بخش : خداوند، وہ سب تو بند ہیں۔

جوگن : آخر یہ سب سامان بند کہاں ہے؟ ذرا سا تو مکان آپ کا، مرغی کے ٹاپے کے برابر۔ وہ کن کوٹھوں میں بند ہے سب کا سب؟

اتنے میں ایک مقدِمے والا آیا۔ ایک ہاتھ میں جھاڑو، دوسرے میں پنجہ۔ آتے ہی جھاڑوں کونے میں کھڑی کر دی اور پنجہ ٹیک کر بیٹھ گیا۔ وکیل صاحب سر سے پیر تک پھونک گئے۔ پوچھا— تم کون ہو؟ اس نے کہا— ہم بھنگی ہیں صاحب! جوگن مسکرائی۔ وکیل صاحب نے سَلار بخش کی طرف دیکھا۔ سَلار بخش سر کھجلانے لگے۔

وکیل : کیا چاہتا ہے؟

بھنگی : حضور، میری مٹّی کا ایک بانس کوئی نکال لے گیا۔ حضور کو وکیل کرنے آیا ہوں۔ غلام ہوں خداوند۔

وکیل : کوئی ہے نکال دو اس پاجی کو۔

سَلار بخش : خداوند، امیروں کا مقدمہ تو آپ لیں، اور غریبوں کا کون لے؟ وکیل تو درجی کی سوئی ہے، کبھی ریشم میں، کبھی لٹھے میں!

وکیل : غریبوں کا مقدمہ غریب وکیل لے۔

سالار بخش : اب تو حضور اس کی فریاد سن ہی لیں۔ اچھا مہتر، بتاؤ کیا دوگے؟

مہتر : ہمارے پاس تو دو مٹو سا ہی ہیں۔

وکیل : (جھلاّ کر) نکالو، نکالو اس کمبخت کو!

وکیل صاحب نے غصّے میں مہتر کی جھاڑو اٹھا لی اور اس پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ وہ جھاڑو پنجہ چھوڑ کر بھاگا۔

جوگن : اچھا، آپ اب الگ ہی رہیے گا۔ جا کر غسل کیجیے۔

وکیل : آج تو بڑی سردی ہے۔

جوگن : اللہ جانتا ہے، غسل کرو، نہیں تو چھوئیں گے نہیں۔

سَلار بخش : ہاں، سچ تو کہتی ہیں۔

وکیل : تو چپ رہ۔

جوگن نے سَلار بخش کو حکم دیا کہ تم پانی بھرو۔ سَلار بخش پانی بھر لائے۔ وکیل صاحب نے روتے روتے کپڑے اتارے، لنگی باندھی اور بیٹھے۔ جیسے بدن پر پانی پڑا، آپ غل مچا کر بھاگے۔ سَلار بخش چمڑے کا ڈول لیے ہوئے پیچھے دوڑا۔ پھر پانی پڑا، پھر روئے۔ جوگن مارے ہنسی کے لوٹ لوٹ گئی۔ بارے کسی طرح آپ کا غسل پورا ہوا۔ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ منھ سے بات نہ نکلتی تھی اس پر سَلار بخش نے پنکھا جھلنا شروع کیا، تب تو اور بھی جھلاّئے اور کس کر اسے دو تین لاتیں لگائیں۔ سلارو بھاگ کھڑے ہوئے۔

جوگن : اب یہ دری تو اٹھاؤ۔

وکیل : کیوں، دری نے کیا قصور کیا؟

سَلار بخش : حضور، بھنگی تو اسی پر بیٹھا تھا؟

وکیل : ارے، تو پھر بولا! قسم خدا کی، مارتے مارتے اُدھیڑ کر رکھ دوں گا۔

جوگن : سَلار بخش ، یہ چاندنی اٹھا لے جاؤ۔

دری اٹھی، تو قلعی کھل گئی۔ نیچے ایک پھٹا پرانہ ٹاٹ پڑا تھا، بابا آدم کے وقت کا۔ وکیل کٹ گئے۔ جوگن نے کہا— لے، اب اس پر کوئی فرش بچھواؤ۔

وکیل : وہ بڑی دری لاؤ، جو چھکڑے پر لد کر آئی تھی۔

سَلار بخش : وہ! اس کو تو ایک لونڈا چرا لے گیا۔

جوگن : خدا کی پناہ، چھکڑے پر تو لد کر موئی دری آئی، اور ذرا سا لونڈا چرا لے گیا!

وکیل : اچھا، وہ نہ سہی، جاؤ اور جو کچھ ملے اٹھا لاؤ۔

یہ کہہ کر وکیل صاحب تو برآمدے میں چلے گئے اور سَلار بخش جا کر اپنا کمبل اور ایک دسترخوان اٹھا لایا۔ وکیل کمرے میں آئے، تو دیکھا کہ دسترخوان بچھا ہوا ہے اور جوگن کھلکھلا کر ہنس رہی ہے۔ سَلار بخش ایک کوٹھری میں چھپ رہا تھا۔ وکیل نے جھلاّ کر ڈنڈا نکالا اور کوٹھری میں گھس کر اسے دو تین ڈنڈے لگائے۔ پھر ڈانٹ کر کہا— آخر جو تو میرا نمک کھاتا ہے، تو میرا رنگ کیوں پھیکا کرتا ہے؟ میں ایک کہوں، تو دو کیا کر۔ خیرخواہی کے معنی یہ ہیں۔ سکھلا دیا، سمجھا دیا، مگر تو ہندی کی چندی نکالتا ہے۔

سَلارو بخش : اچھا، حضور جیسا کہتے ہیں، وہی کروں گا۔ اور بھی جو کچھ سمجھانا ہو، سمجھا دیجیے۔ پھر میں نہیں جانتا۔

وکیل : اچھا، ہم جاتے ہیں، تو آکر کہنا کہ قصور معاف کیجیے۔ اور رونا خوب۔

وکیل صاحب ہدایت کر کے چلے گئے اور جوگن سے باتیں کرنے لگے۔ اتنے میں سالار بخش روتا ہوا آیا۔ جوگن دھک سے رہ گئی۔ سلارو تھوڑی دیر تک خوب روئے، پھر وکیل کے قدموں پر گر کر کہا— حضور، میرا قصور معاف کریں۔

وکیل : ابے، تو کوئی اس طرح روتا ہے۔

جوگن : میں تو سمجھی کہ آپ کے عزیزوں میں سے کوئی چل بسا۔

اتنے میں وکیل صاحب کے نام ایک خط آیا۔ جوگن نے پوچھا— کس کا خط ہے؟

وکیل : صاحب کے پاس سے آیا ہے۔

جوگن : کون صاحب؟ کوئی انگریز ہیں؟

وکیل : ہاں، ضلع کے حاکم ہیں۔ ہم سے یارانہ ہے۔

سَلار بخش : آپ سے نا! اور ان سے بھی تو یارانہ ہے، جنھوں نے جرمانہ ٹھونک دیا تھا؟

وکیل : صاحب نے ہمیں بلایا ہے۔

جوگن : تو شاید آج تمھاری دعوت وہیں دیں؟ تبھی آج کھانا دانہ نہیں پک رہا ہے۔ دوپہر ہونے کو آئی، اور ابھی تک چولہا نہیں جلا۔

وکیل : ارے سلارو، کھانا کیوں نہیں پکاتا؟

سَلار بخش : بازار بند ہے۔

جوگن : آگ لگے تیرے مسخرے پن کو! یہاں آنتیں کوں کاں کر رہی ہیں، اور تجھے دل لگی سوجھتی ہے!

وکیل صاحب نے باہر جا کر سلارو سے کہا— بنیے سے آٹا کیوں نہیں لاتا؟

سَلار بخش : حضور، کوئی دے بھی! کوئی دس برس سے تو حساب نہیں ہوا۔ بازار میں نکلتا ہوں، تو چاروں طرف سے تقاضے ہونے لگتے ہیں۔

وکیل : ابے، اس وقت تو کسی بہانے سے مانگ لا۔ آخر کبھی نہ کبھی مقدمے آویں گے ہی۔ ہمیشہ یوں ہی سناٹا تھوڑے ہی رہے گا؟

خیر، سَلار بخش نے کھانا پکایا، اور کوئی چار بجے آٹھ موٹی موٹی روٹیاں، ایک پیالی میں ماش کی دال اور دوسری میں آدھ پاؤ گوشت رکھ کر لایا!

وکیل : ابے، آج پلاؤ نہیں پکا؟

سَلار بخش : حضور، بلی کھا گئی۔

وکیل : اور گوشت بھی ایک ہی طرح کا پکایا؟

سَلار بخش : حضور، میں پانی بھرنے چلا گیا، تو کتا چکھ گیا۔

جوگن : یہاں کی بلّی اور کتّے بڑے لاگو ہیں!

سَلار بخش : کچھ نہ پوچھیے۔

اتنے میں کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔

سَلار بخش : کون صاحب ہیں؟

وکیل : دیکھو، ماموں صاحب نہ ہوں۔ کہہ دینا، گھر میں نہیں ہیں۔

سَلار بخش : حضور، وہ ہے ممّن تیلی۔

وکیل : کہہ دو ہم تیل ویل نہ لیں گے۔ رات کو ہمارے یہاں موم بتیاں جلتی ہیں، اور کھانے میں تیل آتا نہیں۔ پھر تیلی کا یہاں کیا کام؟

سَلار بخش : مقدمہ لایا ہے حضور!

تیلی میلے کُچیلے کپڑے پہنے، ہاتھ میں ایک کپّی لیے آ کر بیٹھ گیا۔

وکیل : کیا مانگتا ہے؟

تیلی : ایک آدمی نے ہم پر نالش کر دی ہے حضور! اب آپ ہی بچاویں تو بچ سکتا ہوں۔

وکیل : محنتانہ کیا دوگے؟

سَلار بخش : ہائے ہائے، پہلے اس کی فریاد تو سنو کہ وہ کہتا کیا ہے! بس، مردہ دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں، آپ کو اپنے حلوے مانڈے سے کام۔ بتاؤ بھئی، کیا دو گے؟

تیلی : ایک پلی تیل۔

وکیل : نکال دو اسے، نکال دو!

تیلی : اچھا صاحب، تین پلی لے لو۔

سَلار بخش : اچھا، آدھی کپی تیل دے دو۔ بس، اتنا کہنا مانو۔

وکیل : ہیں ہیں، کیوں شرح بگاڑتے ہو؟ تم جاؤ جی!

سَلار بخش : پہلے دیکھیے تو! راضی بھی ہوتا ہے؟

تیلی آدھی کپّی دینے پر راضی نہ ہوا اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سَلار بخش دبی زبان سے کہا— حضور، شام کو کیا پکے گا؟

وکیل : ابے، شام تو ہوگئی اب کیا پکے گا؟

سَلار بخش : خداوند، اس طرح تو میں ٹیں ہو جاؤں گا۔ آپ نہ کھائیں، ہمارے واسطے تو بتلا دیجیے۔

وکیل : اپنے واسطے چھیچھڑے لے آ جا کر۔

سَلار بخش : (آہستہ سے) وے بھی بچنے پاوئے جو آپ سے۔

جوگن کو ہنسی آ گئی۔ وکیل نے کہا— میری بات پر ہنستی ہوگی؟ میں ایسی ہی کہتا ہوں۔ اس پر جوگن کو اور بھی ہنسی آئی۔

وکیل : اللہ ری شوخی—

خوب رُو جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی،
ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی۔

رات کو جوگن نے اپنے پاس سے پیسے دے کر بازار سے کھانا منگوایا، اور کھا کر سوئی۔

صبح کو وکیل صاحب کی نیند کھلی، تو دیکھا، جوگن کا کہیں پتہ نہیں۔ گھر بھر میں چھان مارا۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ بولے — سلارو، غضب ہو گیا! ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

سلار بخش : پھوٹ گئی خداوند، آپ کی قسمت پھوٹ گئی۔

وکیل : پھر اب؟

سلار بخش : کیا عرض کروں حضور!

وکیل : گھر بھر میں تو دیکھ چکے نہ تم؟

سلار بخش : ہاں، اور تو سب دیکھ چکا، اب ایک پرنالہ باقی ہے، وہاں آپ جھانک لیں۔

(63)

زمانہ بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ وہی اللہ رکھی جو ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتی پھرتی تھی، جو جوگن بنی ہوئی ایک گاؤں میں پڑی تھی، آج ثریا بیگم بنی ہوئی سرکس کے تماشے میں بڑے ٹھاٹ سے بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ سب روپے کا کھیل ہے۔

ثریا بیگم : کیوں مہری، روشنی کاہے کی ہے؟ نہ لیمپ، نہ جھاڑ، نہ کنول اور سارا خیمہ جگمگا رہا ہے۔

مہری : حضور، عقل کام نہیں کرتی، جادو کا کھیل ہے۔ بس، دو انگارے جلا دیے اور دنیا بھر جگمگانے لگی۔

ثریا بیگم : داروغہ کہاں ہیں؟ کسی سے پوچھیں تو کہ روشنی کاہے کی ہے؟

مہری : حضور، وہ تو چلے گئے۔

ثریا بیگم : کیا باجا ہے واہ، واہ!

مہری : حضور، گورے بجا رہے ہیں۔

ثریا بیگم : ذرا گھوڑوں کو تو دیکھو، ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔ گھوڑے کیا، دیو ہیں۔ کتنا چوڑا ماتھا ہے اور ذرا سی تھتھنی! کتنی تھوڑی سی زمین میں چکّر دیتے ہیں! واللہ، عقل دنگ ہے!

مہری : بیگم صاحب، کمال ہے۔

ثریا بیگم: ان میموں کا جگر تو دیکھو، اچھے اچھے شہسواروں کو مات کرتی ہیں۔

مہری: سچ ہے حضور، یہ سب جادو کے کھیل ہیں۔

ثریا بیگم: مگر جادوگر بھی پکّے ہیں۔

مہری: ایسے جادوگروں سے خدا سمجھے۔

اس پر ایک عورت جو تماشہ دیکھنے آئی تھی، چِڑھ کر بولی— اے واہ، یہ بے چارے تو ہم سب کا دل خوش کریں، اور آپ کوسیں! آخر ان کا قصور کیا ہے، یہی نہ کہ تماشہ دکھاتے ہیں؟

مہری: یہ تماشے والے تمھارے کون ہیں؟

عورت: تمھارے کوئی ہوں گے۔

مہری: پھر تم چٹکیں تو کیوں چٹکیں؟

عورت: بہن، کسی کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہنا چاہیے۔

مہری: اے، تو تم بیچ میں بولنے والی کون ہو؟

عورت: تم سب تو جیسے لڑنے آئی ہو۔ بات کی، اور منھ نوچ لیا۔

ثریا بیگم کے ساتھ مہری کے سوا اور بھی کئی لونڈیاں تھیں، ان میں ایک کا نام عبّاسی تھا۔ وہ نہایت حسین اور بلا کی شوخ تھی۔ ان سبھوں نے مل کر اس عورت کو بنانا شروع کیا—

مہری: گاؤں کی معلوم ہوتی ہے!

عبّاسی: گنوارن تو ہے ہی، یہ بھی کہیں چھپا رہتا ہے؟

ثریا بیگم: اچھا، اب بس، اپنی زبان بند کرو۔ اتنی میمیں بیٹھیں ہیں، کسی کی زبان تک نہ ہلی۔ اور ہم آپس میں کٹی مرتی ہیں۔

اتنے سامنے ایک زیبرا لایا گیا۔ ثریا بیگم نے کہا— یہ کون جانور ہے؟ کسی ملک کا گدھا تو نہیں ہے؟ چوں تک نہیں کرتا۔ کان دبائے دوڑا جاتا ہے۔

عبّاسی: حضور، بالکل بس میں کر لیا۔

مہری: ان فرنگیوں کی جو بات ہے، انوکھی۔ ذرا اس میم کو تو دیکھیے، اچھے اچھے شہسواروں کے کان کاٹے۔

سوار لیڈی نے گھوڑے پر ایسے ایسے کرتب دیکھائے کہ چاروں طرف تالیاں پڑنے

لگیں۔ ثریا بیگم نے خوب تالیاں بجائیں۔ زنانے درجے کے پاس ہی دوسرے درجے میں کچھ اور لوگ بیٹھے تھے۔ بیگم صاحب کو تالیاں بجاتے سنا تو ایک رنگیلے شیخ جی بولے—

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

مرزا صاحب: رگوں میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

پنڈت جی: شوقین معلوم ہوتی ہیں۔

شیخ جی: واللہ، اب تماشہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

مرزا صاحب: ایک صورت نظر آئی۔

پنڈت جی: تم بڑے خوش نصیب ہو۔

یہ لوگ تو یوں چہک رہے تھے۔ ادھر سرکس میں ایک بڑا کٹ گھرا لایا گیا، جس میں تین شیر بند تھے۔ شیروں کے آتے ہی چاروں طرف سنّاٹا چھا گیا۔ عبّاسی بولی— دیکھیے حضور، وہ شیر جو بیچ والے کٹ گھرے میں بند ہے، وہی سب سے بڑا ہے۔

مہری: اور غصے ور بھی سب سے زیادہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کا سر نگل جائے گا۔

ثریا بیگم: کہیں کٹ گھرا توڑ کر نکل بھاگے تو سب کو کھا جائے۔

مہری: نہیں حضور، سدھے ہوئے ہیں۔ دیکھیے، وہ آدمی ایک شیر کا کان پکڑ کر کس طور پر اُسے اٹھاتا بیٹھاتا ہے۔ دیکھیے دیکھیے حضور، اس آدمی نے ایک شیر کو لٹا دیا اور کس طرح پاؤں سے اسے روند رہا ہے۔

عبّاسی: شیر کیا ہے، بالکل بلّی ہے۔ دیکھیے، اب شیر سے اس آدمی کی کُشتی ہو رہی ہے۔ کبھی شیر آدمی کو پچھاڑتا ہے، کبھی آدمی شیر کے سینے پر سوار ہوتا ہے۔

یہ تماشہ کوئی آدھ گھنٹہ تک ہوتا رہا۔ اس کے بعد بیچ میں ایک بڑی میز بچھائی گئی اور اس پر بڑے بڑے گوشت کے ٹکڑے رکھے گئے۔ ایک آدمی نے سیخ کو ایک ٹکڑے میں چھید دیا اور گوشت کو کٹ گھرے میں ڈالا۔ گوشت کا پہنچنا تھا کہ شیر اس کے اوپر ایسا لپکا جیسے کسی زندہ جانور پر شکار کرنے کے لیے لپکتا ہے۔ گوشت کو منھ میں دبا کر بار بار ڈکارتا تھا اور زمین پر پٹک دیتا تھا۔ جب ڈکارتا، مکان گونج جاتا اور سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ بیگم نے گھبرا کر کہا— معلوم ہوتا ہے، شیر کٹ گھرے سے نکل بھاگا ہے۔ کہاں ہیں داروغہ جی ذرا ان کو بلانا تو!

بیگم صاحب تو یہاں ڈر کے مارے چیخ رہی تھیں اور ان سے تھوڑی ہی دور پر وکیل صاحب اور میاں سَلار بخش میں تکرار ہو رہی تھی۔

وکیل : رک کیوں گیا بے؟ باہر کیوں نہیں چلتا؟

سَلار بخش : تو آپ ہی آگے بڑھ جائیے نا!

وکیل : تو اکیلے ہم کیسے جا سکتے ہیں؟

سَلار بخش : یہ کیوں؟ کیا بھیڑیا کھا جائے گا؟ یا پیٹھ پر لاد کر اٹھا لے جائے گا، ایسے دبلے پتلے بھی تو آپ نہیں ہیں۔ بیٹھیے تو کانکھ دے۔

وکیل : بغیر نوکر کے جانا ہماری شان کے خلاف ہے۔

سَلار بخش : تو آپ کا نوکر کون ہے؟ ہم تو اس وقت مالِک معلوم ہوتے ہیں۔

وکیل : اچھا، باہر نکل کر اس کا جواب دوں گا، دیکھ تو سہی!

سَلار بخش : اجی، جاؤ بھی، جب یہاں ہی جواب نہیں دیا باہر کیا بناؤ گے؟ اب چپکے ہو رہیے۔ ناحق بن ناحق کو بات بڑھے گی۔

وکیل : بس، ہم انھیں باتوں سے تو خوش ہوتے ہیں۔

سَلار بخش : خدا سلامت رکھے حضور کو۔ آپ کی بدولت ہم بھی دو گال ہنس بول لیتے ہیں۔

وکیل : یار، کسی طرح اس ثریّا بیگم کا پتہ تو لگاؤ کہ یہ کون ہیں۔ شبّو جان تو چکما دے کر چلی گئیں، شاید یہی نکاح پر راضی ہو جائیں۔

سَلار بخش : ضرور! اور خوبصورت بھی آپ ایسے ہی ہیں۔

ثریّا بیگم چپکے چپکے یہ باتیں سنتی اور دل ہی دل میں ہنستی جاتی تھی۔ اتنے میں ایک خوبصورت جوان نظر پڑا۔ ہاتھ پاؤں سانچے کے ڈھلے ہوئے، مسیں بھیگتی ہوئیں، میاں آزاد سے صورت بالکل ملتی تھی۔ ثریّا بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ عبّاسی سے کہا— ذری، داروغہ صاحب بلواؤ۔ عبّاسی نے باہر آکر دیکھا تو داروغہ صاحب حقّہ پی رہے ہیں۔ کہا— چلیے، نا دری حکم ہے کہ ابھی ابھی بلا لاؤ۔

داروغہ : اچھا اچھا۔ چلتے ہیں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے! ذرا حقّہ تو پی لینے دو۔

عبّاسی : اچھا، نہ چلیے، پھر ہم کو اُلاہنا نہ دیجیے گا! ہم جتائے جاتے ہیں۔

داروغہ : (حقہ پٹک کر) چلو صاحب، چلو۔ اچھی نوکری ہے، دن رات غلامی کرو تب بھی چین نہیں۔ یہ مہینہ ختم ہو لے تو ہم اپنے گھر کی راہ لیں۔

داروغہ صاحب جب ثریا بیگم کے پاس پہنچے تو انھوں نے آہستہ سے کہا— وہ جو کرسی پر ایک جوان کالے کپڑے پہن کر بیٹھا ہوا ہے، اس کا نام جا کر دریافت کرو۔ مگر آدمیت سے پوچھنا۔

داروغہ : یا خدا! حضور بڑی کڑی نوکری بولیں غلام کو یہ سب باتیں یاد کیونکر رہیں گی جیسا حکم ہو۔

عباسی : اے، تو باتیں کون ایسی لمبی چوڑی ہیں جو یاد نہ رہیں گی؟

داروغہ : ارے بھائی، ہم میں تم میں فرق بھی تو ہے! تم ابھی سترہ اٹھارہ برس کی ہو اور یہاں بالکل سفید ہو گئے ہیں۔ خیر، حضور، جاتا ہوں۔

داروغہ صاحب نے جوان کے پاس جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان کا نام میاں آزاد ہے۔ بیگم صاحب نے آزاد کا نام سنا تو مارے خوشی کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے داروغہ کو حکم دیا جاکر پوچھ آؤ اللہ رکھی کو بھی آپ جانتے ہیں آج نمک کا حق ادا کرو۔ کسی ترکیب سے ان کو مکان تک لاؤ۔

داروغہ صاحب سمجھ گئے کہ اس جوان پر بی بی کا دل آ گیا۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ اگر اللہ رکھی کا ذکر چھیڑا اور یہ بگڑ گئے تو بڑی کرکری ہوگی۔ اور اگر نہ جاؤں تو یہ نکال باہر کریں گی۔ چلے، پر ہر قدم پر سوچتے جاتے تھے کہ نہ جانے کیا آفت آئے۔ جا کر جوان کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے— ایک عرض ہے حضور، مگر شرط یہ ہے کہ آپ خفا نہ ہوں۔ سوال کے جواب میں صرف 'ہاں' یا 'نہیں' کہہ دیں۔

جوان : بہت خوب! 'ہاں' کہوں گا یا 'نہیں'۔

داروغہ : حضور کا غلام ہوں۔

جوان : اجی، آپ اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں، آپ کو جو کچھ کہنا ہو، کہیے۔ میں برا نہ مانوں گا۔

داروغہ : ایک بیگم صاحب پوچھتی ہیں کہ حضور اللہ رکھی کے نام سے واقف ہیں؟

جوان : بس، اتنی ہی بات! اللہ رکھی کو میں خوب جانتا ہوں۔ مگر یہ کس نے پوچھا ہے؟

داروغہ : کل صبح کو آپ جہاں کہیں، وہاں آ جاؤں۔ سب باتیں طے ہو جائیں گی۔

جوان : حضرت، کل تک کی خبر نہ لیجیے، ورنہ آج رات کو مجھے نیند نہ آئے گی۔

داروغہ نے جاکر بیگم صاحب سے کہا— حضور، وہ تو اسی وقت آنے کہتے ہیں۔ کیا کہہ دوں؟ بیگم بولیں— کہہ دو، ضرور ساتھ چلیں۔

اسی جگہ ایک نواب صاحب اپنے مصاحبوں کے ساتھ بیٹھے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ نواب نے فرمایا— کیوں میاں نتھو، یہ کیا بات نکالی ہے کہ جس جانور کو دیکھو، بس میں آگیا۔ عقل کام نہیں کرتی۔

نتھو : خداوند، بس بات ساری یہ ہے کہ یہ لوگ عقل کے پتلے ہیں۔ دنیا کے پردے پر کوئی ایسی چیز نہیں جس کا علم ان کے یہاں نہ ہو۔ چڑیا کا علم ان کے یہاں، ہل چلانے کا علم ان کے یہاں، گانے بجانے کا علم ان کے یہاں۔ کل جو بارہ دری کی طرف سے ہوکر گزرا تو دیکھا، بہت سے آدمی جمع ہیں۔ اتنے میں انگریزی باجا بجنے لگا تو حضور، جو گورے باجا بجاتے تھے، ان کے سامنے ایک ایک کتاب کھلی ہوئی تھی۔ مگر بس، دھونتو، دھونتو! اس کے سوا کوئی بول ہی سننے میں نہیں آیا۔

مرزا : حضور کے سوال کا جواب تو دو! حضور پوچھتے ہیں کہ جانوروں کو بس میں کیونکر لائے؟

نتھو : کہا نہ کہ ان کے یہاں ہر بات کا علم ہے۔ علم کے زور سے دیکھا ہوگا کہ کون جانور کس پر عاشق ہے۔ بس، وہی چیز مہیا کر لی۔

نواب : تسلی نہیں ہوئی۔ کوئی خاص وجہ ضرور ہے۔

نتھو : حضور، ہندستان کا نٹ بھی وہ کام کرتا ہے جو کسی اور سے نہ ہو سکے۔ بانس گاڑ دیا، اوپر چڑھ گیا اور انگوٹھے کے زور سے کھڑا ہوگیا۔

مرزا : حضور، غلام نے پتہ لگا لیا۔ جو کبھی جھوٹ نکلے تو ناک کٹوا ڈالوں! بس، ہم سمجھ گئے۔ حضور آج تک کوئی بڑے سے بڑا پہلوان بھی شیر سے نہیں لڑ سکا۔ مگر اس جوان کی ہمّت کو دیکھیے کہ اکیلا تین تین شیروں سے لڑتا رہا۔ یہ آدمی کا کام نہیں ہے، اور اگر ہے تو کوئی آدمی کر دکھائے! حضور کے سر کی قسم، یہ جادو کا کھیل ہے۔ واللہ، جو اس میں فرق ہو تو ناک کٹوا ڈالوں۔

نواب : سبحان اللہ، بس یہی بات ہے۔

نتھو : ہاں، یہ مانا۔ یہاں پر ہم بھی قائل ہو گئے۔ انصاف شرط ہے۔

نواب : اور نہیں تو کیا، ذرا سا آدمی، اور آدھے درجن شیروں سے کشتی لڑے! ایسا ہو سکتا ہے بھلا! شیر لاکھ کمزور ہو جائے، پھر شیر ہے۔ یہ سب جادو کے زور سے شیر، ریچھ اور سب جانور دکھا دیتے ہیں۔ اصل میں شیر ویر کچھ بھی نہیں ہیں۔ سب جادو ہی جادو ہے۔

نتھو : حضور، ہر طرح سے روپیہ کھینچتے ہیں۔ حضور کے سر کی قسم۔ ہندوستانی اس سے اچھے شیر بنا کر دکھا دیں۔ کیا یہاں جادوگری ہے ہی نہیں؟ مگر قدر تو کوئی کرتا نہیں۔ حضور ذرا غور کرتے تو معلوم ہو جاتا کہ شیر لڑتے تو تھے، مگر پتلیاں نہیں پھرتی تھیں۔ بس، یہی معلوم ہو گیا کہ جادو کا کھیل ہے۔

زبر خاں : واللہ، میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ میاں نتھو میرے منھ سے بات چھین لے گئے۔

نتھو : بھلا شیروں کو دیکھ کر کسی کو بھی ڈر لگتا تھا؟ ایمان سے کہیے گا۔

زبر خاں : مگر جب جادو کا کھیل ہے تو شیر سے لڑنے کا کمال ہی کیا ہے؟

نواب : اور سنیے، ان کے نزدیک کچھ کمال ہی نہیں! آپ تو ویسے شیر بنا دیجیے! کیا دل لگی بازی ہے؟ کہنے لگے، اس میں کمال ہی کیا ہے۔

مرزا : حضور، یہ ایسے ہی بے پر کی اڑایا کرتے ہیں۔

نتھو : جادو کے شیروں سے نہ لڑیں تو کیا سچ مچ کے شیروں سے لڑیں؟ واہ ری آپ کی عقل!

نواب : کہیے تو اس سے، جو سمجھدار ہو۔ بے سمجھ سے کہنا فضول ہے۔

نتھو : حضور، کمال یہ ہے کہ ہزاروں آدمی یہاں بیٹھے ہیں، مگر ایک کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے۔

نواب : سمجھے تو ہمی سمجھے!

مرزا : حضور کی کیا بات ہے۔ واللہ، خوب سمجھے!

اتنے میں ایک کھلاڑی نے ایک ریچھ کو اپنے اوپر لادا اور دوسرے کی پیٹھ پر ایک پاؤں سے سوار ہو کر اسے دوڑانے لگا۔ لوگ دنگ ہو گئے۔ ثریا بیگم نے اس آدمی کو پچاس روپے

انعام دیے۔

وکیل صاحب نے یہ کیفیت دیکھی تو ثریّا بیگم کا پتہ لگانے کے لیے بے قرار ہو گئے۔ سَلار بخش سے کہا— بھیا سلارو، اس بیگم کا پتہ لگاؤ۔ کوئی بڑی امیر کبیر معلوم ہوتی ہیں۔

سَلار بخش: ہمیں تو یہ افسوس ہے کہ تم بھالو کیوں نہ ہوئے۔ بس، تم اسی لائق ہو کہ رسوں سے جکڑ کر دوڑائے۔

وکیل: اچھا بچہ، کیا گھر نہ چلوگے؟

سَلار بخش: چلیں گے کیوں نہیں، کیا تمھارا کچھ ڈر پڑا ہے؟

وکیل: مالک سے ایسی باتیں کرتا ہے؟ مگر یار، ثریّا بیگم کا پتہ لگاؤ۔

میاں آزاد نواب اور وکیل دونوں کی باتیں سن سن کر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔ اتنے میں نواب صاحب نے آزاد سے پوچھا— کیوں جناب، یہ سب نظر بندی ہے یا کچھ اور؟

آزاد: حضرت، یہ سب طِلسمات کا کھیل ہے۔ عقل کام نہیں کرتی۔

نواب: سنا ہے، پچاس کوس کے ادھر کا آدمی اگر آئے تو اس پر جادو کا خاک اثر نہ ہو۔

آزاد: مگر ان کا جادو بڑا کڑا جادو ہے۔ دس منزل کا آدمی بھی آئے تو چکمہ کھا جائے۔

نواب: آپ کے نزدیک وہ کون انگریز بیٹھا تھا؟

آزاد: جناب، انگریز اور ہندوستانی کہیں نہیں ہیں۔ سب جادو کا کھیل ہے۔

نواب: ان سے جادو سیکھنا چاہیے۔

آزاد: ضرور سیکھیے۔ ہزار کام چھوڑ کر۔

جب تماشہ ختم ہو گیا تو ثریّا بیگم نے آزاد کو بہت تلاش کرایا، مگر کہیں ان کا پتہ نہ چلا۔ وہ پہلے ہی ایک انگریز کے ساتھ چل دیے تھے۔ بیگم نے داروغہ جی کو خوب ڈانٹا اور کہا— اگر تم کل انھیں نہ لاؤ گے تو تمھاری کھال کھنچوا کر اس میں بُھس بھروں گی!

(64)

ثریّا بیگم میاں آزاد کی جدائی میں بہت دیر تک رویا کیں، کبھی داروغہ پر جھلّائیں، کبھی عبّاسی پر بگڑیں، پھر سوچتیں کہ اللہ رکھّی کے نام سے ناحق بلوایا، بڑی بھول ہو گئی، کبھی خیال

کرتیں کہ وعدے کے سچّے ہیں، کل شام کو ضرور آئیں گے، ہزار کام چھوڑ کے آئیں گے۔ رات بھیگ گئی تھی، مہریاں سو رہی تھیں، محل دار اونگھتا تھا، شہر بھر میں سناٹا تھا، مگر ثریا بیگم کی نیند میاں آزاد نے حرام کر دی تھی۔

بھرے آتے ہیں آنسو آنکھ میں اے یار کیا باعث
نکلتے ہیں صدف سے گوہرِ شہوار کیا باعث

ساری رات پریشانی میں گزری، دل بے قرار تھا، کسی پہلو چین نہیں آتا تھا، سوچتیں کہ اگر میاں آزاد وعدے پر نہ آئے تو کہاں ڈھونڈھوں گی، بوڑھے داروغہ پر دل ہی دل میں جھلاتی تھیں کہ پتہ تک نہ پوچھا۔ مگر آزاد تو پکّا وعدہ کر گئے تھے، لوٹ کر ضرور ملیں گے، پھر ایسے بے درد کیسے ہو گئے کہ ہمارا نام بھی سنا اور پرواہ نہ کی۔ یہ سوچتے سوچتے انھوں نے یہ غزل گانی شروع کی—

نہ دل کو چین مر کر بھی ہوائے یار میں آئے،
تڑپ کر خلد سے پھر کوچۂ دلدار میں آئے۔
عجب راحت ملی، کچھ دین دنیا کی نہیں پرواہ،
جنوں کے سایہ میں پہنچے بڑی سرکار میں آئے۔
عوض جب ایک دل کے لاکھ دل ہوں میرے پہلو میں،
تڑپنے کا مزہ تب فرقتِ دلدار میں آئے۔
نہیں پرواہ، ہمارا سر جو کٹ جائے تو کٹ جائے،
تھکے بازو نہ قاتل کا نہ بل تلوار میں آئے۔
دمِ آخر وہ پونچھیں اشک 'صفدرؔ' اپنے دامن سے،
الٰہی رحم اتنا تو مزاجِ یار میں آئے۔

ثریا بیگم کو ساری رات جاگتے گزری۔ سویرے داروغہ نے آکر سلام کیا۔

بیگم: آج کا اقرار ہے نہ؟

داروغہ: ہاں حضور، خدا مجھے سرخرو کرے۔ اللہ رکھّی کا نام سن کر تو وہ بے خود ہو گئے۔ کیا عرض کروں حضور!

بیگم: ابھی جایئے اور چاروں طرف تلاش کیجیے۔

داروغہ : حضور، ذرا سویرا تو ہو لے، دو چار آدمیوں سے ملوں، پوچھوں، دوچھوں، تب تو مطلب نکلے۔ یوں اٹکر لیس کس محلّے میں جاؤں اور کس سے پوچھوں؟

عبّاسی : حضور، مجھے حکم ہو تو میں بھی تلاش کروں۔ مگر بھاری سا جوڑا لوں گی!

بیگم : جوڑا؟ اللہ جانتا ہے، سر سے پاں تک زیور سے لدی ہوگی۔

بی عبّاسی بن ٹھن کر چلیں اور ادھر داروغہ جی میانے پر لد کر روانہ ہوئے۔ عبّاسی تو خوش خوش جاتی تھی اور یہ منہ بنائے سوچ رہے تھے کہ جاؤں تو کہاں جاؤں؟ عبّاسی لہنگا پھڑکاتی ہوئے چلی جاتی تھی کہ راہ میں ایک نواب صاحب کی ایک مہری ملی۔ دونوں میں گھل گھل کر باتیں ہونے لگیں۔

عبّاسی : کہو بہن، خوش تو ہو؟

بنّو : ہاں، بہن،، اللہ کا فضل ہے۔ کہاں چلیں؟

عبّاسی : کچھ نہ پوچھو بہن، ایک صاحب کا پتہ پوچھتی پھرتی ہوں۔

بنو : کون ہیں، میں بھی سنوں۔

عبّاسی : یہ تو نہیں جانتی، پر نام ہے میاں آزاد۔ خاصے گھبرو جوان ہیں۔

بنّو : ارے، انھیں میں خوب جانتی ہوں۔ اسی شہر کے رہنے والے ہیں۔ مگر ہیں بڑے نٹ کھٹ، سامنے ہی تو رہتے ہیں۔ کہیں ریجھی تو نہیں ہو؟ ہے تو جوان ایسا ہے۔

عبّاسی : اے، ہٹو بھی! یہ دل لگی ہمیں نہیں بھاتی۔

بنّو : لو، یہ مکان آ گیا۔ بس، اسی میں رہتے ہیں! 'جوڑو نہ جاتا، اللہ میاں سے ناطہ'

بنّو نے تو اپنی راہ گئی، عبّاسی ایک گلی میں ہو کر ایک بڑھیا کے مکان پر پہنچی۔ بڑھیا نے پوچھا— اب کس سرکار میں ہو جی؟

عبّاسی : ثریّا بیگم کے یہاں۔

بڑھیا : اور ان کے میاں کا کیا نام ہے؟

عبّاسی : جو تجویز کرو۔

بڑھیا : تو کنواری یا بیوہ! کوئی جان پہچان ملاقاتی ہے یا کوئی نہیں ہے؟

عبّاسی : ایک بوڑھی سی عورت کبھی کبھی آیا کرتی ہیں۔ اور تو ہم نے کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا۔

بڑھیا : کوئی دیوزاد بھی آتا جاتا ہے؟

عباسی : کیا مجال! چڑیا تک تو پر نہیں مار سکتی؟ اتنے دنوں میں صرف کل تماشہ دیکھنے گئی تھیں۔

بڑھیا : اے لو، اور سنو! تماشہ دیکھنے جاتی ہیں تو پھر کہتی ہو کہ ایسی ویسی نہیں ہیں؟ اچھا، ہم ٹوہ لگا لیں گی۔

عباسی : انھوں نے قسم کھائی ہے کہ شادی ہی نہ کروں گی، اور اگر کروں گی بھی تو ایک خوبصورت جوان کے ساتھ جو آپ کا پڑوسی ہے۔ میاں آزاد نام ہے۔

بڑھیا : ارے، یہ کتنی بڑی بات ہے! گو میں وہاں بہت کم آتی جاتی ہوں، پر وہ مجھے خوب جانتے ہیں۔ بالکل گھر کا سا واسطہ ہے۔ تم بیٹھو، میں ابھی آدمی بھیجتی ہوں۔

یہ کہہ کر بڑھیا نے ایک عورت کو بلا کر کہا— چھوٹے مرزا کے پاس جاؤ اور کہو کہ آپ کو بلاتیں ہیں۔ یا تو ہم کو بلایئے یا خود آیئے۔

اس عورت کا نام مبارک قدم تھا۔ اس نے جا کر مرزا آزاد کو بڑھیا کا پیغام سنایا— حضور، وہ خبر سناؤں کہ آپ بھی پھڑک جائیں۔ مگر انعام دینے کا وعدہ کیجیے۔

آزاد : آزاد نہیں، اگر مالامال نہ کر دیں۔

مبارک : اچھل پڑیے گا۔

آزاد : کیا کوئی رقم ملنے والی ہے؟

مبارک : اجی، وہ رقم ملے کہ نواب ہو جاؤ۔ ایک بیگم صاحبہ نے پیغام بھیجا ہے۔ بس، آپ میری بڑھیا کے مکان تک چلے چلیے۔

آزاد : ان کو یہیں نہ بلا لاؤ۔

مبارک : میں بیٹھی ہوں، آپ بلوا لیجیے۔

تھوڑی دیر میں بڑھیا ایک ڈولی پر سوار آ پہنچی اور بولی— کیا ارادے ہیں؟ کب چلیے گا؟

آزاد : پہلے کچھ باتیں تو بتاؤ۔ حسین ہے نا؟

بڑھیا : اجی، حسن تو وہ ہے کہ چاند بھی مات ہو جائے، اور دولت کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں، تو کب چلنے کا ارادہ ہے؟

آزاد : پہلے خوب پکّا پوڑھا کر لو، تو مجھے لے چلو۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں چل کر جھینپنا پڑے۔

(65)

ہمارے میاں آزاد اور اس مرزا آزاد میں نام کے سوا اور کوئی بات نہیں ملتی تھی۔ وہ جتنے ہی دلیر، ایماندار، سچے آدمی تھے، اتنے ہی یہ فریبی، جالیے اور بدنیت تھے۔ بہت مالدار تو تھے نہیں، مگر سوا سو روپے وثیقہ کے ملتے تھے۔ اکیلا دم، نہ کوئی عزیز، نہ رشتہ دار، پلّے برے کے بدمعاش، چوروں کے پیر، اٹھائی گیری کے لنگوٹیے یار، ڈاکوؤں کے دوست، گرہ کٹوں کے ساتھی۔ کسی کی جان لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ جس سے دوستی کی، اسی کی گردن کاٹی۔ امیر سے مل جل کر رہنا اور اس کی گھڑکی جھڑکی سہنا، ان کا خاص پیشہ تھا۔ لیکن جس کے یہاں دخل پایا اس کو یا تو لنگوٹی بندھوا دی یا کچھ لے دے کے الگ ہوئے۔ شہر کے مہاجن اور ساہوکار ان سے تھر تھر کانپتے رہتے۔ جس مہاجن سے جو مانگا، اس نے حاضر کیا اور جو انکار کیا تو دوسرے روز چوری ہو گئی۔ ان کے مزاج کی عجب کیفیت تھی۔ بچّوں میں بچّے، بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان۔ کوئی بات ایسی نہیں جس کا انھیں تجربہ نہ ہو۔ ایک سال تک فوج میں بھی نوکری کی تھی۔ وہاں آپ نے ایک دن یہ دل لگی کی کہ رِسالے کے بیس گھوڑوں کی اگاڑی پچھاڑی کھول ڈالی۔ گھوڑے ہنہنا کر لڑنے لگے۔ سب لوگ پڑے سو رہے تھے۔ گھوڑے جو کھلے، تو سب کے سب چونک پڑے۔ ایک بولا— لینا لینا! چور چور! پکڑ لینا، جانے نہ پائے۔ بڑی مشکل سے چند گھوڑے پکڑے گئے۔ کچھ زخمی ہوئے، کچھ بھاگ گئے۔ اب تحقیقات شروع ہوئی۔ مرزا آزاد بھی سب کے ساتھ ہمدردی کرتے تھے اور اس بدمعاش پر بگڑ رہے تھے جس نے گھوڑے چھوڑے تھے۔ افسر سے بولے— یہ شیطان کا کام ہے، خدا کی قسم۔

افسر : اس کی گوشمالی کی جائے گی۔

آزاد : وہ اسی لائق ہے۔ مل جائے تو چچا ہی بنا کر چھوڑوں۔

خیر، ایک بار ایک دفتر میں آپ کلرک ہو گئے۔ ایک دن آپ کو دل لگی سوجھی، سب عملوں کے جوتے اٹھا کر دریا میں پھینک دیے۔ سَرِشتے دار اٹھے، اِدھر اُدھر جوتا ڈھونڈتے

ہیں، کہیں پتہ ہی نہیں۔ ناظر اٹھے، جوتا ندارد۔ پیش کار کو صاحب نے بلایا، دیکھتے ہیں تو جوتا غائب۔

پیش کار : ارے بھائی، کوئی صاحب جوتا ہی اڑا لے گئے۔

چپراسی : حضور میرا جوتا پہن لیں۔

پیش کار : واہ، اچھا لالہ وشنو دیال، ذرا اپنا بوٹ تو اتار دو۔

لال وشنودیال پٹواری تھے۔ ان کا لکڑ توڑ جوتا پہن کر پیش کار صاحب بڑے صاحب کے اجلاس پر گئے۔

صاحب : ویل ویل پیش کار، آج بڑا امیر ہوگیا۔ بہت بڑا قیمتی بوٹ پہنا ہے۔

پیش کار : حضور، کوئی صاحب جوتا اڑا لے گئے۔ دفتر میں کسی کا جوتا نہیں بچا۔

بڑے صاحب تو مسکرا کر چپ ہوگئے، مگر چھوٹے صاحب بڑے دل لگی باز آدمی تھے۔ اجلاس سے اٹھ کر دفتر میں گئے تو دیکھتے ہیں کہ قہقہے پر قہقہ پڑ رہا ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے جوتے تلاش رہے ہیں۔ چھوٹے صاحب نے کہا— ہم اس آدمی کو انعام دینا چاہتے ہیں جس نے یہ کام کیا۔ جس دن ہمارا جوتا غائب کر دے، ہم اس کو انعام دیں۔

آزاد : اور اگر ہمارا جوتا غائب کر دے تو ہم پورے مہینے کی تنخواہ دے دیں۔

ایک بار مرزا آزاد ایک ہندو کے یہاں گئے۔ وہ اس وقت روٹی پکا رہے تھے۔ آپ نے چپکے سے جوتا اتارا اور رسوئی میں جا بیٹھے، ٹھاکر نے ڈانٹ کر کہا— ایں، یہ کیا شرارت!

آزاد : کچھ نہیں، ہم نے کہا، دیکھیں، کس تدبیر سے روٹی پکاتے ہو؟

ٹھاکر : رسوئی جوٹھی کر دی!

آزاد : بھئی، بڑا افسوس ہوا۔ ہم یہ کیا جانتے تھے۔ اب یہ کھانا بے کار جائے گا؟

ٹھاکر : نہیں جی، کوئی مسلمان کھا لے گا۔

آزاد : تو ہم سے بڑھ کر اور کون ہے؟

آزاد بسم اللہ کہہ کر تھالی میں ہاتھ ڈالنے کو تھے کہ ٹھاکر نے للکارا— ہے ہے، رسوئی تو جوٹھی کر چکے، اب کیا برتنوں پر بھی دانت ہے؟

خیر، آزاد نے پتوں میں کھانا کھایا اور دعا دی کہ خدا کرے، ایسا ایک الو روز پھنس جائے۔

ڈوم دھاری، طبلیے، گویے، کلاوت، کتھک، کوئی ایسا نہ تھا جس سے مرزا آزاد سے ملاقات نہ ہو۔ ایک بار ایک بینکار کو دو سو روپے انعام دیے۔ تب سے اس گروہ میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ ایک بار آپ پولس کے انسپکٹر کے ساتھ جاتے تھے۔ دونوں گھوڑوں پر سوار تھے۔ آزاد کا گھوڑا اڑّا تھا اور ان سے بنا مذاق کے رہا نہ جایا چاہے۔ چپکے سے اتر پڑے۔ گھوڑا ہنہناتا ہوا انسپکٹر صاحب کے گھوڑے کی طرف چلا۔ انھوں نے لاکھ سنبھالا، لیکن گر ہی پڑے۔ پیٹھ میں بڑی چوٹ آئی۔

اب سنیے، بڑھیا اور عبّاسی جب بیگم صاحب کے یہاں پہنچی تو بیگم کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ فوراً کمرے کے اندر چلی گئیں۔ بڑھیا نے آکر پوچھا— حضور، کہاں تشریف رکھتی ہیں؟

بیگم : عبّاسی، کہو کیا خبریں ہیں؟

عبّاسی : حضور کے اقبال سے سب معاملہ چوکس ہے۔

بیگم : آتے ہیں یا نہیں؟ بس، اتنا بتا دو۔

عبّاسی : حضور، آج تو ان کے یہاں ایک مہمان آ گئے۔ مگر کل ضرور آئیں گے۔

اتنے میں ایک مہری نے آکر کہا— داروغہ صاحب آئے ہیں۔

بیگم : آ گئے! جیتے آئے، بڑی بات!

داروغہ : ہاں حضور، آپ کی دعا سے جیتا آیا۔ نہیں تو بچنے کی تو کوئی صورت ہی نہ تھی۔

بیگم : خیر، یہ بتلاؤ، کہیں پتہ لگا؟

داروغہ : حضور کے نمک کی قسم کہ شہر کا کوئی مقام نہ چھوڑا۔

بیگم : اور کہیں پتہ نہ چلا؟ ہے نہ!

داروغہ : کوئی کوچہ، کوئی گلی ایسی نہیں جہاں تلاش نہ کی ہو۔

بیگم : اچھا، نتیجہ کیا ہوا؟ ملے یا نہ ملے؟

داروغہ : حضور، سنا کہ ریل پر سوار ہو کر کہیں باہر جاتے ہیں۔ فوراً گاڑی کرائے کی اور اسٹیشن پر جا پہنچا، میاں آزاد سے چار آنکھیں ہوئیں کہ اتنے میں سیٹی کو کی اور ریل کھڑکھڑاتی ہو چلی۔ میں لپکا کہ دو دو باتیں کر لوں، مگر ایک انگریز نے ہاتھ پکڑ لیا۔

بیگم : یہ سب سچ کہتے ہو نہ؟

داروغہ : جھوٹ کوئی اور بولا کرتے ہوں گے۔

بیگم : صبح سے کچھ کھایا تو نہ ہوگا؟

داروغہ : اگر ایک گھونٹ پانی کے سوا کچھ اور کھایا ہو تو قسم لے لیجیے۔

عبّاسی : حضور، ہم ایک بات بتائیں تو ان کی شیخی ابھی ابھی نکل جائے۔ کہاروں کو یہیں بلاکر پوچھنا شروع کیجیے!

بیگم صاحب کو یہ صلاح پسند آئی۔ ایک کہار کو بلا کر تحقیقات کرنے لگیں۔

عبّاسی : بچہ، جھوٹ بولے تو نکال دیے جاؤ گے۔

کہار : حضور، ہمیں جو سکھایا ہے، وہ کہہ دیتے ہیں۔

عبّاسی : کیا کچھ سکھایا بھی ہے؟

کہار : صبح سے اب تک سکھایا ہی کیے یا کچھ اور کیا؟ یہاں سے اپنی سسرال گئے۔ وہاں کسی نے کھانے کو بھی نہ پوچھا تو وہاں سے ایک مجلس میں گئے۔ حقّے لیے اور چکھ کر بولے— کہیں ایسی جگہ چلو جہاں کسی کی نگاہ نہ پڑے۔ ہم لوگوں نے ناکے کے باہر ایک تکیے میں میانہ اتارا۔ داروغہ جی نے وہاں نان بائی کی دکان سے سالن اور روٹی منگا کر کھائی۔ ہم لوگوں کو چبینے کے لیے پیسے دیے۔ دن بھر سویا کیے۔ شام کو حکم دیا، چلو۔

عبّاسی : داروغہ صاحب، سلام! اجی، ادھر دیکھیے داروغہ صاحب۔

بیگم : کیوں صاحب، یہ جھوٹ! ریل پر گئے تھے آپ؟ بولیے!

داروغہ : حضور، یہ نمک حرام ہے، کیا عرض کروں!

داروغہ کا بس چلتا تو کہار کو جیتا چنوا دیتے، مگر بے بس تھے۔ بیگم نے کہا— بس، جاؤ۔ تم کسی مصرف کے نہیں ہو۔

رات کو عبّاسی بیگم صاحب سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ گانے کی آواز آئی۔ بیگم نے پوچھا— کون گاتا ہے؟

عبّاسی : حضور، مجھے معلوم ہے۔ یہ ایک وکیل صاحب ہیں۔ سامنے مکان ہے۔ وکیل کو تو نہیں جانتی، مگر ان کے یہاں ایک آدمی نوکر ہے، اس کو خوب جانتی ہوں۔ سَلار بخش نام ہے۔ ایک دن وکیل صاحب ادھر سے جاتے تھے۔ میں دروازے پر کھڑی تھی۔ کہنے لگے— مہری صاحب، سلام! کہو، تمھاری بیگم صاحب کا نام کیا ہے؟ میں نے کہا، آپ اپنا مطلب کہیے، تو کہنے لگے— کچھ نہیں، یوں ہی پوچھتا تھا۔

بیگم : ایسے آدمیوں کو منھ نہ لگایا کرو۔

عبّاسی : مختار ہے حضور، مہتابی سے مکان دکھائی دیتا ہے۔

بیگم : چلو دیکھیں تو، مگر وہ تو نہ دیکھ لیں گے! جانے بھی دو۔

عبّاسی : نہیں حضور، ان کو کیا معلوم ہوگا۔ چپکے سے چل کر دیکھ لیجیے۔

بیگم صاحب مہتابی پر گئیں تو دیکھا کہ وکیل صاحب پلنگ پر پھیلے ہوئے ہیں اور سلارو حقّہ بھر رہا ہے۔ نیچے آئی تو عبّاسی بولی— حضور، وہ سلار بخش کہتا تھا کہ کسی پر مرتے ہیں۔

بیگم : وہ کون تھی؟ ذرا نام تو پوچھنا۔

عبّاسی : نام تو بتایا تھا، مگر مجھے یاد نہیں ہے۔ دیکھیے، شاید ذہن میں آ جائے۔ آپ دس پانچ نام تو لیں۔

بیگم: نذیر بیگم، زعفری بیگم، حسینی خانم، شبّو خانم!

عبّاسی : (اچھل کر) جی ہاں، یہی، مگر شبّو خانم نہیں، شبّو جان بتایا تھا۔

ثریّا بیگم نے سوچا، اس بنگلے کا پڑوس اچھا نہیں، جُل دے کے چلی آئی ہوں، ایسا نہ ہو، تاک جھانک کرے۔ دروازے تک آ ہی چکا، عبّاسی اور سلارو میں بات چیت بھی ہوئی، اب فقط اتنا معلوم ہونا باقی ہے کہ یہی شبّو جان ہیں۔ کہیں ہمارے آدمیوں پر یہ بھید کھل جائے تو غضب ہی ہو جائے۔ کسی طرح مکان بدل دینا چاہیے۔ رات کو تو اسی خیال میں سو رہیں۔ صبح کو پھر وہی دھن سمائی کہ آزاد آئیں اور اپنی پیاری پیاری صورت دیکھائیں۔ وہ اپنا حال کہیں، ہم اپنی بیتی سنائیں۔ مگر آزاد اب کی میرا یہ ٹھاٹ دیکھیں گے تو کیا خیال کریں گے۔ کہیں یہ نہ سمجھیں کہ دولت پا کر مجھے بھول گئی۔ عبّاسی کو بلا کر پوچھا— تو آج کب جاؤ گی؟

عبّاسی : حضور، بس کوئی دو گھڑی دن رہے جاؤں گی اور بات کی بات میں ساتھ لے کر آ جاؤں گی۔

اُدھر مرزا آزاد بن ٹھن کر جانے ہی کو تھے کہ ایک شاہ صاحب کھٹ پٹ کرتے ہوئے آ پہنچے۔ آزاد نے جھک کر سلام کیا اور بولے— آپ خوب آئے۔ بتلایئے، ہم جس کام کو جانا چاہتے ہیں وہ پورا ہوگا یا نہیں؟

شاہ : لگن چاہیے۔ دُھن ہو تو ایسا کوئی کام نہیں جو پورا نہ ہو۔

آزاد : گستاخی معاف کیجیے تو ایک بات پوچھوں، مگر برا نہ مانیے گا!

شاہ گستاخی کیسی، جو کچھ کہنا ہو، شوق سے کہو۔

آزاد : اس پگلی عورت سے آپ کو کیوں محبت ہے؟

شاہ : اسے پگلی نہ کہو، میں اس کی صورت پر نہیں، اس کی سیرت پر مرتا ہوں۔ میں نے بہت سے اولیا دیکھے، پر ایسی عورت میری نظر سے آج تک نہیں گزری۔ اللہ رکھی سچ مچ جنت کی پری ہے۔ اس کی یاد کبھی نہ بھولے گی۔ اس کا ایک عاشق آپ ہی کے نام کا تھا۔

انھیں باتوں میں شام ہو گئی، آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور زور سے مینہ برسنے لگا۔ آزاد نے جانا ملتوی کر دیا۔ صبح کو آپ ایک دوست کی ملاقات کو گئے۔ وہاں دیکھا کہ کئی آدمی مل کر ایک آدمی کو بنا رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں۔ وہ دبلا پتلا، مرا پٹا آدمی تھا۔ ان کو قرینے سے معلوم ہو گیا کہ یہ چنڈوباز ہے۔ بولے— کیوں بھئی چنڈوباز، کبھی نوکری بھی کی ہے؟

چنڈوباز : اجی حضرت، عمر بھر ڈنڈ پیلے اور جوڑیاں ہلائیں۔ شاہی میں ابا جان کی بدولت ہاتھی نشین تھے۔ ابھی پار سال تک ہم بھی گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تھے۔ مگر جوئے کی لت تھی، ٹکے ٹکے کو محتاج ہو گئے۔ آخر، سرائے میں ایک بھٹیاری اللہ رکھّی کے یہاں نوکری کر لی۔

آزاد : کس کے یہاں؟

چنڈوباز : اللہ رکھّی نام تھا۔ ایسی خوبصورت کہ میں کیا عرض کروں۔

آزاد : ہاں، رات کو بھی ایک آدمی نے تعریف کی تھی۔

چنڈوباز : تعریف کیسی! تصویر ہی نہ دکھا دوں؟

یہ کہہ کر چنڈوباز نے اللہ رکھّی کی تصویر نکالی۔

آزاد : او ہو ہو!

عجب ہے کھینچی مصور نے کس طرح تصویر،\
کہ شوخیوں سے وہ ایک رنگ پر رہے کیونکر!

چنڈوباز : کیوں، ہے پری یا نہیں؟

آزاد : پری، پری اصل پری!

آزاد : اسی سرائے میں میاں آزاد نام کے ایک شریف ٹِکے تھے۔ ان پر عاشق ہو

گئیں۔ بس، کچھ آپ ہی کی صورت تھی۔

آزاد : اب یہ بتاؤ کہ وہ آج کل کہاں ہے؟

چنڈوباز : یہ تو نہیں جانتے، مگر یہیں کہیں ہے۔ سرائے سے تو بھاگ گئی تھیں۔

آزاد نے تاڑ لیا کہ اللہ رکھّی اور ثریا بیگم میں کچھ نہ کچھ بھید ضرور ہے۔ چنڈوباز کو اپنے گھر لائے اور خوب چنڈو پلایا۔ جب دو تین چھینٹے پی چکے تو آزاد نے کہا— اب اللہ رکھّی کا مفصل حال بتاؤ۔

چنڈو باز : اللہ رکھّی کی صورت تو آپ دیکھ ہی چکے، اب ان کی سیرت کا حال سنیے۔ شوخ، چلبلی، چنچل، آگ بھبھوکا، تیکھی چتون، مگر ہنس مکھ۔ میاں آزاد پر ریجھ گئیں۔ اب آزاد نے وعدہ کیا کہ نکاح پڑھوائیں گے، مگر قول ہار کر نکل گئے۔ انھوں نے نالش کر دی، پکڑ آئے، مگر پھر بھاگ گئے۔ اس کے بعد ایک بیگم حسن آرا تھیں، اس پر ریجھے۔ انھوں نے کہا— روم کی لڑائی میں نام پیدا کر کے آؤ تو ہم نکاح پر راضی ہوں۔ بس، روم کی راہ لی۔ چلتے وقت ان کی اللہ رکھّی سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہا— حسن آرا تمھیں مبارک ہو، مگر ہم کو نہ بھول جانا۔ آزاد نے کہا، ہرگز نہیں۔

آزاد : حسن آرا کہاں رہتی ہیں؟

چنڈوباز : یہ ہمیں نہیں معلوم۔

آزاد : اللہ رکھّی کو دیکھو تو پہچان لو یا نہ پہچانو؟

چنڈوباز : فوراً پہچان لیں۔، نہ پہچاننا کیسا!

میاں چنڈو باز تو پینک لینے لگے۔ ادھر عبّاسی آزاد مرزا کے پاس آئی اور کہا— اگر چلنا ہے تو چلے چلیے، ورنہ پھر آنے جانے کا ذکر نہ کیجیے گا۔ آپ کے ٹال مٹول سے وہ بہت چڑھ گئی ہیں۔ کہتی ہیں، آنا ہو تو آئیں اور نہ آنا ہو تو نہ آئیں۔ یہ ٹال مٹول کیوں کرتے ہیں؟

آزاد نے کہا— میں تیار بیٹھا ہوں۔ چلیے۔

یہ کہہ کر آزاد نے گاڑی منگوائی اور عبّاسی کے ساتھ اندر بیٹھے۔ چنڈوباز کوچ بکس پر بیٹھے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ ثریا بیگم کے محل پر گاڑی پہنچی تو عبّاسی نے اندر جا کر کہا— مبارک، حضور آ گئے۔

بیگم : شکر ہے!

عبّاسی : اب حضور چک کی آڑ بیٹھ جائیں۔

بیگم : اچھا، بلاؤ۔

آزاد برآمدے میں چک کے پاس بیٹھے۔ عبّاسی نے کمرے کے باہر آ کر کہا— بیگم صاحب فرماتی ہیں کہ ہمارے سر میں درد ہے، اب آپ تشریف لے جائیے۔

آزاد : بیگم صاحب سے کہہ دیجیے کہ میرے پاس سر کے درد کا ایک نایاب نسخہ ہے۔

عبّاسی : وہ فرماتی ہیں کہ ایسے یسے مداری ہم نے بہت چنگے کیے ہیں۔

آزاد : اور اپنے سر کے درد کا علاج نہیں ہو سکتا؟

بیگم : آپ کی باتوں سے سر کا درد اور بڑھتا ہے۔ خدا کے لیے آپ مجھے اس وقت آرام کرنے دیجیے۔

آزاد—

ہم ایسے ہو گئے اللہ۔ اکبر اے تیری قدرت

ہمارا نام سن کر ہاتھ وہ کانوں پہ دھرتے ہیں

یا تو وہ مزے مزے کی باتیں تھیں، اور اب یہ بے وفائی!

بیگم : تو یہ کہیے کہ آپ ہمارے پرانے جاننے والوں میں ہیں۔ کہیے، مزاج تو اچھے ہیں؟

آزاد : دور سے مزاج پرسی بھلی معلوم نہیں ہوتی۔

بیگم : آپ تو پہیلیاں بجھواتے ہیں۔ اے عبّاسی، یہ کس اجنبی کو سامنے لا کر بیٹھا دیا؟ واہ واہ!

عبّاسی : (مسکرا کر) حضور، زبردستی ڈھنس پڑے۔

بیگم : محلّے والوں کو اطلاع دو۔

آزاد : تھانے پر رپٹ لکھوا دو اور مشکیں بندھوا دو۔

یہ کہہ کر آزاد نے اللہ رکھّی کی تصویر عبّاسی کو دی اور کہا اسے ہماری طرف سے پیش کر دو۔ عبّاسی نے جا کر بیگم صاحب کو یہ تصویر دی۔ بیگم صاحب تصویر دیکھتے ہی دنگ ہو گئیں۔ ایں، انھیں یہ تصویر کہاں ملی؟ شاید یہ تصویر چھپا کر لے گئے تھے۔ پوچھا— اس تصویر کی کیا قیمت ہے؟

آزاد : یہ بکاؤ نہیں ہے۔

بیگم : تو پھر دکھائی کیوں؟

آزاد: اس کی قیمت دینے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

بیگم : کچھ کہیے تو، کس دام کی تصویر ہے۔

آزاد : حضور ملا لیں۔ ایک شہزادے اس تصویر کے دو لاکھ روپے دیتے تھے۔

بیگم : یہ تصویر آپ کو ملی کہاں؟

آزاد : جس کی یہ تصویر ہے اس سے دل مل گیا ہے۔

بیگم : ذری منہ دھو آیئے۔

اس فقرے پر عبّاسی کچھ چونکی، بیگم صاحب سے کہا— ذری حضور مجھے تو دیں۔ مگر بیگم نے صندوقچہ کھول کر تصویر رکھ دی۔

آزاد : اس شہر کی اچھی رسم ہے۔ دیکھنے کو چیز لی اور ہضم! بی عبّاسی، ہماری تصویر لا دو۔

بیگم : لاکھوں کدورتیں ہیں، ہزاروں شکایتیں۔

آزاد : کس سے؟

کدورت ان کو ہے مجھ سے نہیں ہے سامنا جب تک،
اِدھر آنکھیں ملیں ان سے اُدھر دل مل گیا دل سے۔

بیگم : اجی، ہوش کی دوا کرو۔

آزاد : ہم تو اس ضبط کے قائل ہیں۔

بیگم : (ہنس کر) بجا۔

آزاد : اب تو کھلکھلا کر ہنس دیں۔ خدا کے لیے، اب اس چک کے باہر آؤ یا مجھی کو اندر بلاؤ۔ نقاب اور گھونگھٹ کا طِلسم توڑو۔ دل بے قابو ہے۔

بیگم : عبّاسی، ان سے کہو کہ اب ہمیں سونے دیں۔ کل کسی کی راہ دیکھتے دیکھتے رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

آزاد : دن کو موقع نہ تھا، رات کو مینہ برسنے لگا۔

بیگم : بس، بیٹھے رہو۔

یہ عبث کہتے ہو، موقع نہ تھا اور گھات نہ تھی،

مہندی پاؤں میں نہ تھی آپ کے، برسات نہ تھی۔
کج ادائی کے سوا اور کوئی بات نہ تھی،
دن کو آ سکتے نہ تھے آپ تو کیا رات نہ تھی؟
بس، یہی کہیے کہ منظور ملاقات نہ تھی۔

آزاد—

معشوق پن نہیں اگر اتنی کجی نہ ہو!

عبّاسی دنگ تھی کہ یا خدا، یہ کیا ماجرا ہے۔ بیگم صاحب تو جامے سے باہر ہی ہوئی جاتی ہیں۔ مہریاں دانتوں انگلیاں دبا رہی تھیں۔ ان کو ہوا کیا ہے۔ داروغہ صاحب کٹے جاتے تھے، مگر چپ۔

بیگم: کوئی بھی دنیا میں کسی کا ہوا ہے؟ سب کو دیکھ لیا۔ تڑپا تڑپا کر مار ڈالا۔ خیر، ہمارا بھی خدا ہے۔

آزاد: پچھلی باتوں کو اب بھول جایئے۔

بیگم: بے مروّتوں کو کسی کے درد کا حال کیا معلوم؟ نہیں تو کیا وعدہ کرکے مکر جاتے!

آزاد: نالش بھی تو داغ دی آپ نے!

بیگم: انتظار کرتے کرتے ناک میں دم آگیا۔

راہ ان کی تکتے تکتے یہ مدت گزر گئی،
آنکھوں کو حوصلہ نہ رہا انتظار کا۔

آزاد، بس دل ہی جانتا ہے۔ ٹھان لی تھی کہ جس طرح مجھے جلایا ہے، اسی طرح ترساؤں گی۔ اس وقت کلیجہ بانسوں اچھل رہا ہے۔ مگر بے چینی اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اب اُدھر کا حال تو کہو، گئے تھے!

آزاد: وہاں کا حال نہ پوچھو۔ دل پاش پاش ہوا جاتا ہے۔

ثریا بیگم نے سمجھا کہ اب پالا ہمارے ہاتھ رہا۔ کہا— آخر، کچھ تو کرو۔ ماجرا کیا ہے؟

آزاد: اجی، عورت کی بات کا اعتبار کیا؟

بیگم: واہ، سب کو شامل نہ کرو۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اب وہ بتلایئے کہ ہم سے جو وعدے کیے تھے، وہ یاد ہیں یا بھول گئے؟

اقرار جو کیے تھے کبھی ہم سے آپ نے،
کہیے، وہ یاد ہیں کہ فراموش ہو گئے؟

آزاد : یاد ہیں۔ نہ یاد ہونا کیا معنی؟

بیگم : آپ کے واسطے حقّہ بھر لاؤ۔

آزاد : حکم ہو تو اپنے خدمت گار سے حقّہ منگوا لوں۔ عبّاسی، ذرا ان سے کہو، حقّہ بھر لائیں۔

عبّاسی نے جا کر چنڈوباز سے حقّہ بھرنے کو کہا۔ چنڈوباز حقّہ لے کر اوپر گئے تو اللہ رکھی کو دیکھتے ہی بولے— کہیے اللہ رکھی صاحب، مزاج تو اچھے ہیں؟

ثریا بیگم دھک سے رہ گئی۔ وہ تو کہیے، خیر گزری کہ عبّاسی وہاں پر نہ تھی۔ ورنہ بڑی کرکری ہوتی۔ چپکے سے چنڈوباز کو بلا کر کہا— یہاں ہمارا نام ثریا بیگم ہے۔ خدا کے واسطے ہمیں اللہ رکھی نہ کہنا۔ یہ تو بتاؤ، تم ان کے ساتھ کیسے ہو لیے۔ تم سے ان سے تو دشمنی تھی؟ چلتے وقت کوڑا مارا تھا۔

چنڈوباز : اس کے بارے میں پھر عرض کروں گا۔

آزاد : کیا خدا کی شان ہے کہ خدمت گار کو اندر بلایا جائے اور مالک ترسے!

بیگم : کیوں گھبراتے ہو؟ ذرا باتیں تو کر لینے دو؟ اس موئے مسخرے کو کہاں چھوڑا؟

آزاد : وہ لڑائی پر مارا گیا۔

بیگم : اے ہے، مار ڈالا گیا! بڑا ہنسوڑ تھا بے چارہ!

ثریا بیگم نے اپنے ہاتھوں سے گلوریاں بنائیں اور اپنے ہی ہاتھ سے مرزا آزاد کو کھلائی۔ آزاد دل میں سوچ رہے تھے کہ یا خدا، ہم نے کون سا ایسا ثواب کا کام کیا، جس کے بدلے میں تو ہم پر اتنا مہربان ہو گیا ہے! حالانکہ نہ کبھی کی جان، نہ پہچان۔ یقین ہو گیا کہ ضرور ہم نے کوئی نیک کام کیا ہوگا۔ چنڈوباز کو بھی حیرت ہو رہی تھی کہ اللہ رکھی نے اتنی دولت کہاں پائی۔ اِدھر اُدھر بھوچکّے ہو ہو کر دیکھتے تھے، مگر سب کے سامنے کچھ پوچھنا ادب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اتنے میں آزاد بولے— زمانہ بھی کتنے رنگ بدلتا ہے۔

ثریا بیگم : ہاں، یہ تو پرانہ دستور ہے۔ لوگ اقرار کچھ کرتے ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔

آزاد : یوں نہیں کہتیں کہ لوگ چاہتے کچھ ہیں اور ہوتا کچھ اور ہے۔

ثریا بیگم : دو چار دن اور صبر کرو۔ جہاں اتنے دنوں خاموش رہے، اب چند روز تک اور چپکے رہو۔

چنڈو باز : خداوند، یہ باتیں تو ہوا ہی کریں گی، اب چلیے، کل پھر آیئے گا۔ مگر پہلے بی اعلیٰ......۔

ثریا بیگم : ذرا سمجھ بوجھ کر!

چنڈوباز : قصور ہوا۔

آزاد : ہم سمجھے ہی نہیں، کیوں قصور ہوا؟

ثریا بیگم : ایک بات ہے۔ یہ خوب جانتے ہیں۔

آزاد : پھر اب چلوں! مگر ایسا نہ ہو کہ یہ سارا جوش دو چار دن میں ٹھنڈا پڑ جائے۔ اگر ایسا ہوا تو میں جان دے دوں گا۔

ثریا بیگم : میں تو یہ خود ہی کہنے کو تھی۔ تم میری زبان سے بات چھین لے گئے۔

آزاد : ہماری محبت کا حال خدا ہی جانتا ہے۔

ثریا بیگم : خدا تو سب جانتا ہے، مگر آپ کی محبت کا حال ہم سے زیادہ اور کوئی نہیں جانتا۔ یا (چنڈوباز کی طرف اشارہ کرکے) یہ جانتے ہیں۔ یاد ہے نا؟ اگر اب کی بھی ویسا ہی اقرار ہے تو خدا ہی مالک ہے۔

آزاد : اب ان باتوں کا ذکر ہی نہ کرو۔

ثریا بیگم : ہمیں اس حالت میں دیکھ کر تمھیں تعجب تو ضرور ہوا ہوگا کہ اس درجے پر یہ کیسے پہنچ گئی۔ وہ بوڑھا یاد ہے جس کی طرف سے آپ نے خط لکھا تھا؟

آزاد مرزا کچھ جانتے ہوتے تو سمجھتے، ہاں ہاں کہتے جاتے تھے۔

آخر اتنا کہا— تم بھی تو وکیل کے پاس گئی تھیں؟ اور ہم کو پکڑوا بلایا تھا! مگر سچ کہنا، ہم بھی کس چالاکی سے نکل بھاگے تھے؟

ثریا بیگم : اور اس کا آپ کو فخر ہے۔ شرماؤ نہ شرمانے دو۔

آزاد : اجی، وہ موقع ہی اور تھا۔

ثریا بیگم نے اپنا سارا حال کہہ سنایا۔ اپنا جوگن بنا، شہسوار کا آنا، تھانے دار کے گھر سے بھاگنا، پھر وکیل صاحب کے یہاں پھنسنا، غرض ساری باتیں کہہ سنائیں۔

آزاد : افوہ، بہت مصیبتیں اٹھائیں!

ثریا بیگم : اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ شبھ گھڑی نکاح ہو تو سارا غم بھول جائے۔

چنڈوباز : ہم بیگم صاحب کی طرف ہوں گے۔ آپ ہی نے تو کوڑا جمایا تھا؟

آزاد : کوڑا ابھی تک نہ بھولے! ہم تو بہت سی باتیں بھول گئے۔

ثریہ بیگم : اب تو رات بہت زیادہ گئی، کیوں نہ نیچے جا کر داروغہ صاحب کے کمرے میں سو رہو۔

آزاد اٹھنے ہی کو تھے کہ آذان کی آواز کان میں آئی۔ باتوں میں تڑکا ہو گیا۔ آزاد یہاں سے چلے تو راستے میں ثریا بیگم کا حال پوچھنے لگے— کیوں جی، بیگم صاحب ہم کو وہی آزاد سمجھتی ہیں؟ کیا ہماری ان کی صورت بالکل ملتی ہے؟

چنڈوباز : جناب، آپ ان سے بیس ہیں، انیس نہیں۔

آزاد : تم نے کہیں کہہ تو نہیں دیا کہ اور آدمی ہے؟

چنڈوباز : واہ، واہ، میں کہہ دیتا تو آپ وہاں دھسنے بھی پاتے؟ اب کہیے تو جا کر جڑ دوں۔ بس، ایسی ہی باتوں سے تو آگ لگ جاتی ہے؟

یہ باتیں کرتے ہوئے آزاد گھر پہنچے اور گاڑی سے اترنے ہی کو تھے کہ کئی کانسٹبلوں نے ان کو گھیر لیا، آزاد نے پینترا بدل کر کہا— ایں، تم لوگ کون ہو؟

جمعدار نے آگے بڑھ کر وارنٹ دیکھایا اور کہا— آپ میرے حراست میں ہیں۔ چنڈوباز دبکے گاڑی میں بیٹھے تھے۔ ایک سپاہی نے ان کو بھی نکالا۔ آزاد نے غصّے میں آکر دو کانسٹبلوں کو تھپڑ مارے، تو ان سبھوں نے مل کر اِن کی مُشکیں کس لیں اور تھانے کی طرف لے چلے۔ تھانے دار نے آزاد کو دیکھا تو بولے— آیئے مرزا صاحب، بہت دنوں کے بعد آپ نظر آئے۔ آج آپ کہاں بھُول پڑے؟

آزاد : کیا مرے ہوئے سے دل لگی کرتے ہو! حوالات سے باہر نکال دو تو مزا دیکھاؤں، اس وقت جو چاہو، کہہ لو، مگر اجلاس پر ساری قلعی کھول دوں گا۔ جس جس آدمی سے تم نے رشوت لی ہے، ان کو پیش کروں گا، بھاگ کر جاؤ گے کہاں؟

تھانے دار : رسّی جل گئی، مگر رسّی کا بل نہ گیا۔

آزاد تو ڈینگیں مار رہے تھے اور چنڈوباز کو چنڈو کی دھن سوار تھی۔ بولے— ارے

یارو، ذری چنڈو پلوا دو بھئی! آخر اتنے آدمیوں میں کوئی چنڈوباز بھی ہے، یا سب کے سب روکھے ہی ہیں؟

تھانے دار : اگر آج چنڈو نہ ملے تو کیا ہو؟

چنڈوباز : مر جائیں اور کیا ہو؟

تھانے دار : اچھا دیکھیں، کیسے مرتے ہو؟ کوئی شرط بدتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اگر اس کو چنڈو نہ ملے تو یہ مر جائے۔

انسپکٹر : اور ہم کہتے ہیں کہ یہ کبھی نہ مرے گا۔

چنڈوباز : واہ ری تقدیر، سمجھے تھے، اللہ رکھی کے یہاں اب چین کریں گے، چین تو رہا دور، قسمت یہاں لے آئی۔

تھانے دار : اللہ رکھی کون؟ یہ بتا دو، تو چنڈو منگا دوں۔

چنڈوباز : صاحب، ایک عورت ہے جو سرائے میں رہتی تھی۔

اب سنیے، شام کے وقت ثریا بیگم بن ٹھن کر بیٹھی آزاد کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر آزاد تو حوالات میں تھے۔ یہاں آتا کون؟ عباسی کو آزاد کے گرفتار ہونے کی خبر تو مل گئی، مگر اس نے ثریا بیگم سے کہا نہیں۔

(66)

شہزادہ ہمایوں فر کئی مہینے تک نیپال کی ترائی میں شکار کھیل کر لوٹے، تو حسن آرا کی مہری عباسی کو بلوا بھیجا۔ عباسی نے شہزادہ کے آنے کی خبر سنی تو چمکتی ہوئی آئی۔ شہزادے نے دیکھا تو پھڑک گئے۔ بولے — آیئے، بی۔ مہری صاحب، حسن آرا بیگم کا مزاج تو اچھا ہے؟

عباسی : ہاں، حضور!

شہزادہ : اور دوسری بہن؟ ان کا نام تو ہم بھول گئے۔

عباسی : بے شک، ان کا نام تو آپ ضرور ہی بھول گئے ہوں گے۔ کوٹھے پر سے دھوپ میں آئینہ دکھائے، گھورا گھوری کیے اور لوگوں سے پوچھے — بڑی بہن زیادہ حسین ہیں یا چھوٹی؟ ہے تعجب کی بات کہ نہیں؟

شہزادہ : ہمیں تو تم حسین معلوم ہوتی ہو۔

عبّاسی : اے حضور، ہم غریب آدمی، بھلا ہمیں کون پوچھتا ہے؟

شہزادہ : ہمارے گھر پڑ جاؤ۔

عبّاسی : حضور تو مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ اللہ جانتا ہے، کیا مزاج پایا ہے! یہی ہنسنا بولنا رہ جاتا ہے حضور!

شہزادہ : اب کسی ترکیب سے لے چلو۔

عبّاسی : حضور، بھلا میں کیسے لے چلوں! رئیسوں کا گھر، شریفوں کی بہو بیٹیوں میں پرائے مرد کا کیا کام۔

شہزادہ : کوئی ترکیب سوچو، آخر کس دن کام آؤ گی؟

عبّاسی : آج تو کسی طرح ممکن نہیں۔ آج ایک مِس آنے والی ہیں۔

شہزادہ : پھر کسی ترکیب سے مجھے وہاں پہنچا دو۔ آج تو آنکھیں سینکنے کا خوب موقع ہے۔

عبّاسی : اچھا، ایک تدبیر ہے۔ آج باغ ہی میں بیٹھک ہوگی۔ آپ چل کر کسی درخت پر بیٹھے رہیں۔

شہزادہ : نہیں بھائی، یہ ہمیں پسند نہیں۔ کوئی دیکھ لے تو ناحق الّو بنوں۔ بس، تم باغبان کو گانٹھ لو۔ یہی ایک تدبیر ہے۔

عبّاسی نے جا کر مالی کو لالچ دیا۔ کہا۔ اگر شہزادہ کو اندر پہنچا دو تو دو اشرفیاں انعام دلواؤں۔ مالی راضی ہو گیا۔ تب عبّاسی نے آکر شہزادے سے کہا۔۔ لیجیے حضرت، فتح ہے اگر دیکھیے، دھوتی اور مرزائی پہننی پڑے گی اور موٹے کپڑے کی بھدّی سی ٹوپی دیجیے، تب وہاں پہنچ پایئے گا۔

شام کو ہمایوں فر نے مالی کا بھیس بنایا اور مالی کے ساتھ باغ میں پہنچے تو دیکھا کہ باغ کے بیچوں بیچ ایک پکا اور اونچا چبوترہ ہے اور چاروں بہنیں کرسیوں پر بیٹھی مس فیرنگٹن سے باتیں کر رہی ہیں۔ مالی نے پھولوں کا ایک گلدستہ بنا کر دیا اور کہا۔۔ جا کر میز پر رکھ دو۔ ہمایوں فر نے مس صاحب کو جھک کر سلام کیا اور ایک کونے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔

سپہر آرا : ہیرا ہیرا، یہ کون ہے؟

ہیرا : حضور، غلام ہے آپ کا۔ میرا بھانجہ ہے۔

سپہر آرا : کیا نام ہے؟
ہیرا : لوگ ہمایوں کہتے ہیں حضور!
سپہر آرا : آدمی تو سلیقے دار معلوم ہوتا ہے۔ ارے ہمایوں، تھوڑے پھول توڑ لے اور مہری کو دے دے کہ میرے سرہانے رکھ دے۔
شہزادہ نے پھول توڑ کر مہری کو دیے اور پھولوں کے ساتھ رومال میں ایک رقعہ باندھ دیا۔ خط کا مضمون یہ تھا—
'میری جان،
اب صبر کی طاقت نہیں۔ اگر جلانا ہو تو جلا لو، ورنہ کوئی حکمت کام نہ آئے گی!
ہمایوں فر'
جب شہزادہ ہمایوں فر چلے گئے تو سپہر آرا نے مالی سے کہا— اپنے بھانجے کو نوکر رکھ لو۔
مالی : حضور، سرکار ہی کا نمک تو کھاتا ہے! یوں بھی نوکر ہے، وہ بھی نوکر ہے۔
سپہر آرا : مگر ہمایوں تو مسلمانوں کا نام ہوتا ہے۔
مالی : ہاں حضور، وہ مسلمان ہو گیا ہے۔
دوسرے دن شام کو سپہر آرا اور حسن آرا باغ میں آئیں تو دیکھا، چبوترے پر شطرنج کے دو نقشے کھینچے ہوئے ہیں۔
سپہر آرا : کل تک تو یہ نقشے نہیں تھے، آہاہا، ہم سمجھ گئے۔ ہمایوں مالی نے بنائے ہوں گے۔
مالی : ہاں حضور، اسی نے بنایا ہے۔
سپہر آرا : بہن، جب جانیں کہ نقشہ حل کر دو۔
حسن آرا : بہت ٹیڑھا نقشہ ہے۔ اس کا حل کرنا مشکل ہے (مالی سے) کیوں جی، تمھارے بھانجے کو شطرنج کھیلنا کس نے سکھایا؟
مالی : حضور، اس کو شوق ہے، لڑکپن سے کھیلتا ہے۔
حسن آرا : اس سے پوچھو، اس نقشے کو حل کر دے گا؟
مالی : کل بلوا دوں گا حضور!
سپہر آرا : اس کا بھانجہ بڑا منچلا معلوم ہوتا ہے۔

حسن آرا : ہاں، ہوگا۔ اس ذکر کو جانے دو۔

سپہرآرا : کیوں کیوں، باجی جان! تمھارے چہرے کا رنگ کیوں بدل گیا؟

حسن آرا : کل اس کا جواب دوں گی۔

سپہرآرا : نہیں، آخر بتاؤ تو؟ تم اس وقت خفا کیوں ہو؟

حسن آرا : یہ مرزا ہمایوں فر کی شرارت ہے۔

سپہرآرا : افوہ! یہ ہتھکنڈے!

حسن آرا : (مالی سے) سچ سچ بتا، یہ ہمایوں کون ہے؟ خبردار جو جھوٹ بولا!

سپہرآرا : بھانجہ ہے تیرا؟

مالی : حضور، حضور!

حسن آرا : حضور حضور لگائی ہے، بتاتا نہیں۔ تیرا بھانجہ اور یہ نقشے بنائے؟

مالی : حضور، میں مالی نہیں ہوں، ذاتی کا کائتھ ہوں، مگر گھر بار چھوڑ کر باغ وانی کرنے لگا۔ ہمارا بھانجہ پڑھا لکھا ہو تو کون تعجب کی کون بات ہے!

حسن آرا : چل جھوٹے، سچ سچ بتا۔ نہیں اللہ جانتا ہے، کھڑے کھڑے نکلوا دوں گی۔

سپہرآرا اپنے دل میں سوچنے لگی کہ ہمایوں فر نے بطور پیچھا کیا۔ اور پھر اب تو ان کو خبر پہنچی ہی گئی ہے تو پھر مالی بننے کی کیا ضروت ہے!

حسن آرا : خدا گواہ ہے۔ سزا دینے کے قابل آدمی ہے۔ بھل منسی کے یہ مانی نہیں ہے کہ کسی کے گھر میں مالی یا چمار بن کر گھسے۔ یہ ہیرا نکال دینے لائق ہے۔ اس کو کچھ چٹایا ہوگا، جبھی پھسل پڑا۔

مالی کے ہوش اڑ گئے بولا— حضور مالک ہیں۔ بیس برس سے اس سرکار کا نمک کھاتا ہوں مگر کوئی قصور غلام سے نہیں ہوا۔ اب بڑھاپے میں حضور یہ داغ کھائیں۔

حسن آرا : کل اپنے بھانجے کو ضرور لانا۔

سپہرآرا : اگر قصور ہوا ہے تو سچ سچ کہہ دے۔

مالی : حضور، جھوٹ بولنے کی تو میری عادت نہیں۔

دوسرے دن شہزادہ نے مالی کو پھر بلوایا اور کہا— آج ایک بار اور دکھا دو۔

مالی : حضور، لے چلنے میں تو غلام کو عذر نہیں، مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں بڑھاپے میں داغ نہ

لگ جائے۔

شہزادہ : اجی وہ موقوف کر دیں گی تو ہم نوکر رکھ لیں گے۔

مالی : سرکار، میں نوکری کو نہیں، عزت کو ڈرتا ہوں۔

شہزادہ : کیا مہینہ پاتے ہو؟

مالی : 6 روپے ملتے ہیں حضور!

شہزادہ : آج سے 6 روپے یہاں سے تمھاری زندگی بھر ملا کریں گے۔ کیوں، ہمارے آنے کے بعد عورتیں کچھ کہتی نہیں تھیں؟

مالی : آپس میں کچھ باتیں کرتی تھیں، مگر میں سن نہیں سکا۔ تو میں شام کو آؤں گا؟

شہزادہ : تم ڈرو نہیں، تمھارا نقصان نہیں ہونے پائے گا۔

مالی تو سلام کرکے روانہ ہوا اور ہمایوں فر دعا مانگنے لگے کہ کسی طرح شام ہو۔ بار بار کمرے کے باہر جاتے، بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے۔ سوچے، آؤ ذرا سو رہیں۔ سونے میں وقت بھی کٹ جائے گا اور بے قراری بھی کم ہو جائے گی۔ لیٹے، مگر بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ کھانا کھانے کے بعد لیٹے تو ایسی نیند آئی کہ شام ہو گئی۔ اُدھر سپہرآرا نے ہیرا مالی کو اکیلے میں بلا کر ڈانٹنا شروع کیا۔ ہیرا نے رو کر کہا— ناحق اپنے بھانجے کو لایا۔ نہیں تو یہ لتھاڑ کیوں سننی پڑتی۔

سپہرآرا : کچھ دیوانہ ہوا ہے بڈھا! تیرا بھانجہ اور اتنا سلیقہ دار؟ اتنا حسین؟

ہیرا : حضور، اگر میرا بھانجہ نہ ہو تو ناک کٹوا ڈالوں۔

سپہرآرا : (مہری سے) ذرا تو اسے سمجھا دے کہ اگر سچ سچ بتلا دے تو کچھ انعام دوں۔

مہری نے مالی کو الگ لے جا کر سمجھانا شروع کیا— ارے بھلے آدمی، بتا دے۔ جو تیرا رتی بھر نقصان ہو تو میرا ذمّہ۔

ہیرا : اس بڑھوتی میں کلنک کا ٹیکا لگوانا چاہتی ہو؟

مہری : اب مجھ سے تو بہت اڑو نہیں، شہزادہ ہمایوں فر کے سوا اور کسی کی اتنی ہمّت نہیں ہو سکتی۔ بتا، تھے وہی کہ نہیں؟

ہیرا : ہاں، آئے تو وہیں تھے۔

مہری : (سپہرآرا سے) لیجیے حضور، اب اسے انعام دیجیے۔

سپہر آرا : اچھا ہیرا، آج جب وہ آئیں تو یہ کاغذ دے دینا۔

اتفاق سے حسن آرا بیگم بھی ٹہلتی ہوئی آ گئیں۔ وہ بھی دفتی پر ایک شعر لکھ لائی تھیں۔ سپہر آرا کو دیکھ کر بولیں— ہیرہ سے کہہ دو، جس وقت ہمایوں فر آئیں، یہ دفتی دکھا دے۔

سپہر آرا : اے تو باجی جب ہمایوں فر ہوں بھی؟

حسن آرا : کتنی سادی ہو؟ جب ہوں بھی؟

سپہر آرا : اچھا، ہمایوں فر ہی سہی! یہ شعر تو سناؤ۔

حسن آرا : ہم نے یہ لکھا ہے—

اسیرِ حرص و شہوت ہر کہ شُد ناکام می باشد

دریں آتش کسے گر پختہ باشد خام می باشد

(جو آدمی حرص اور شہوت میں قید ہو گیا، وہ ناکام رہتا ہے۔ اس آگ میں اگر کوئی پکا بھی ہو تو کچا رہتا ہے۔)

ہیرا نے جھک کر سلام کیا اور شام کو ہمایوں فر کے مکان پہنچا۔

ہمایوں : آ گئے؟ اچھا، ٹھہرو۔ آج بہت سوئے۔

ہیرا : خداوند، بہت خفا ہوئیں اور کہا کہ ہم تم کو موقوف کر دیں گے۔

ہمایوں : تم اس کی فکر نہ کرو۔

ہیرا : حضور، مجھے آدھ سیر آٹے سے مطلب ہے۔

جھٹ پٹے وقت ہمایوں ہیرا کے ساتھ باغ میں پہنچے۔ یہاں ہیرہ نے دونوں بہنوں کے لکھے ہوئے شعر ہمایوں فر کو دیکھائے۔ ابھی وہ پڑھ ہی رہے تھے کہ حسن آرا باغ میں آ گئی اور ہیرہ کو بلا کر کہا— تمھارا بھانجہ آیا؟

ہیرا : حاضر ہے حضور!

حسن آرا : بلاؤ۔

ہمایوں نے آ کر سلام کیا اور گردن جھکا لی۔

حسن آرا : تمھارا کیا نام ہے جی؟

ہمایوں : ہمایوں۔

حسن آرا : کیوں صاحب، مکان کہاں ہے؟

ہمایوں—

گھر بار سے کیا فقیر کو کام،
کیا لیجیے چھوڑے گاؤں کا نام۔

حسن آرا: اخواہ، آپ شاعر بھی ہیں؟

ہمایوں: حضور، کچھ بک لیتا ہوں۔

حسن آرا: کچھ سناؤ۔

ہمایوں: حکم ہو تو زمین پر بیٹھ جاؤں۔

سپہر آرا: بڑے گستاخ ہو تم۔ کہیں نوکر ہو؟

ہمایوں: جی ہاں حضور، آج کل شہزادہ ہمایوں فر کی بہن کے یہاں نوکر ہوں۔ اتنے میں بڑی بیگم آ گئیں۔ ہمایوں فر مارے خوف کے بھاگ گئے۔

(67)

ثریا بیگم نے آزاد مرزا کے قید ہونے کی خبر سنی تو دل پر بجلی سی گر پڑی۔ پہلے تو یقین نہ رہا، مگر جب خبر سچی نکلی تو ہائے ہائے کرنے لگی۔

عبّاسی: حضور، کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر ان کے ایک عزیز ہیں۔ وہ پیروی کرنے والے ہیں۔ روپے بھی خرچ کریں گے۔

ثریا بیگم: روپیہ نگوڑا کیا چیز ہے۔ تم جا کر کہو کہ جتنے روپیوں کی ضرورت ہو، ہم سے لیں۔

عبّاسی آزاد مرزا کے چچا کے پاس جا کر بولی— بیگم صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے اور کہا ہے کہ روپے کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہے۔ جتنے روپے کہیے، بھیج دیں۔

یہ بڑے مرزا آزاد سے بھی بڑھ کر بگڑے باز تھے۔ ثریا بیگم کے پاس آ کر بولے— کیا کہوں بیگم صاحب، میری تو عزت خاک میں مل گئی۔

ثریا بیگم: یا میرے اللہ، یہ کیا غضب ہو گیا؟

بڑے مرزا: کیا کروں، سارا زمانہ تو ان کا دشمن ہے۔ پولس سے عداوت، عملوں سے تکرار۔ میرے پاس اتنے روپے کہاں کہ پیروی کروں۔ وکیل بغیر لیے دیے مانتے نہیں۔

جان عذاب میں ہے۔

ثریا بیگم : اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ سب بندوبست ہو جائے گا۔ سو دو سو، جو کہیے، حاضر ہے۔

بڑے مرزا : فوجداری کے مقدمے میں اونچے وکیل ذرا لیتے بہت ہیں۔ میں کل ایک بارسٹر کے پاس گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایک پیشی کے دو سو لوں گا۔ اگر آپ چار سو روپے دے دیں تو امید ہے کہ شام تک آزاد تمھارے پاس آ جائیں۔

بیگم صاحب نے چار سو روپے دلوا دیے۔ بڑے مرزا روپے لے کر باہر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد آ کر ایک چارپائی پر دھم سے گر پڑے اور بولے— آج تو عزّت ہی گئی تھی، مگر خدا نے بچا لیا— میں جو یہاں سے گیا تو ایک صاحب نے آ کر کہا— آزاد مرزا کو تھانے دار ہتھکڑی پہنا کر چوک سے لے جائے گا، بس، میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اتفاق سے ایک رسال دار مل گئے۔ انھوں نے میری یہ حالت دیکھی تو کہا— دو سو روپے دو تو پولس والوں کو گانٹھ لوں۔ میں نے فوراً دو سور روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھے۔ اب دو سو اور دلوائے تو وکیلوں کے پاس جاؤں۔ بیگم نے دو سو روپے اور دلوا دیے۔ بڑے مرزا دل میں خوش ہوئے، اچھا شکار پھنسا۔ روپے لے کر چلتے ہوئے۔

اِدھر ثریا بیگم رو رو کر آنکھیں پھوڑے ڈالتی تھی، مہریاں سمجھاتیں، دن رات رونے سے کیا فائدہ، اللہ پر بھروسہ رکھیے، اس کی مرضی ہوئی تو آزاد مرزا دو چار دن میں گھر آئیں گے۔ مگر یہ نصیحتیں بیگم صاحب پر کچھ اثر نہ کرتی تھیں۔ ایک دن ایک مہری نے آ کر کہا— حضور، ایک عورت ڈیوڑھی پر کھڑی ہے۔ کہیے تو بلاؤں! بیگم نے کہا— بلا لو۔ وہ عورت پردہ اٹھا کر آنگن میں داخل ہوئی اور جھک کر بیگم کو سلام کیا۔ اس کی سج دھج ساری دنیا کی عورتوں سے نرالی تھی۔ گلؔ بدن کا چست پاجامہ، بانکا عمامہ، مخمل کا دگلا، اس پر ہلکا کار چوبی کا کام، ہاتھ میں آبنوس کا پنجرا، اس میں ایک چڑیا بیٹھی ہوئی۔ سارا گھر اسی کی اُور دیکھنے لگا۔ سب کی سب دنگ تھیں کہ یا خدا، یہ اٹھتی جوانی، گلاب سا رنگ، اور یوں گلی کوچوں کی سیر کرتی پھرے! عبّاسی بولی— کیوں بی بی، تمھارا مکان کہاں ہے؟ اور یہ پہناوا کس ملک کا ہے؟ تمھارا نام کیا ہے بی بی؟

عورت : ہمارا گھر من چلے جوانوں کا دل ہے اور نام معشوق ہے۔

یہ کہہ کر اس نے پنجڑا سامنے رکھ دیا اور یوں چہکنے لگی— حضور، آپ کو یقین نہ آئے گا۔ کل میں پرستان میں بیٹھی ہوا کی سیر دیکھ رہی تھی کہ پہاڑ پر بڑے زوروں کی آندھی آئی اور اتنی گرد اڑی کہ آسمان کے نیچے ایک اور آسمان نظر آنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی گھڑگھڑاہٹ کی آواز آئی اور ایک اڑن کھٹولہ آسمان سے اتر پڑا۔

عباسی : ارے، اڑن کھٹولہ! اس کا ذکر تو کہانیوں میں سنا کرتے تھے۔

عورت : بس حضور، اس اڑن کھٹولے میں سے ایک سچ مچ کی پری اتری اور دم میں کھٹولہ غائب ہو گیا۔ وہ پری، اصل میں پری نہ تھی، وہ ایک انسان تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ہزار جان سے عاشق ہو گئی۔ اب سنا ہے کہ وہ بے چارہ کہیں قید ہو گیا ہے۔

ثریا بیگم : کیا، قید ہے! بھلا، اس جوان کا نام بھی تمھیں معلوم ہے؟

عورت : جی ہاں حضور، میں نے پوچھ لیا ہے۔ اسے آزاد کہتے ہیں۔

ثریا بیگم : ارے! یہ تو کچھ اور ہی غل کھلا۔ کسی نے تمھیں بہکا تو نہیں دیا؟

عورت : حضور، وہ آپ کے یہاں بھی آئے تھے۔ آپ بھی ان پر ریجھی ہوئی ہیں۔

ثریا بیگم : مجھے تو تمھاری سب باتیں دیوانوں کی بک جھک معلوم ہوتی ہیں۔ کہاں پری، کہاں آزاد، کہاں اڑن کھٹولہ! سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔

عورت : ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ذرا عقل چاہیے۔

یہ کہہ کر اس نے پنجڑا اٹھایا اور چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں داروغہ صاحب نے اندر آکر کہا— دروازے پر تھانے دار اور سپاہی کھڑے ہیں۔ مرزا آزاد جیل سے بھاگ نکلے ہیں۔ اور وہی آج عورت کے بھیس میں آئے تھے۔ بیگم صاحب کے ہوش حواس غائب ہو گئے! ارے، یہ آزاد تھے!

(68)

آزاد اپنی فوج کے ساتھ ایک میدان میں پڑے ہوئے تھے کہ ایک سوار نے فوج میں آکر کہا— ابھی بگل دو۔ دشمن سر پر آ پہنچا۔ بگل کی آواز سنتے ہی افسر، پیادے، سوار سب چوک پڑے۔ سوار اینٹھتے ہوئے چلے، پیادے اکڑتے ہوئے بڑھے۔ ایک بولا— مار لیا ہے۔ دوسرے نے کہا— بھگا دیا ہے۔ مگر ابھی تک کسی کو معلوم نہیں کہ دشمن کہاں ہے۔ مخبر دوڑائے

گئے تو پتہ چلا کہ روس کی فوج دریا کے اس پار پیر جمائے کھڑی ہے۔ دریا پر پل بنایا جا رہا ہے اور انوکھی بات یہ تھی کہ روسی فوج کے ساتھ ایک لیڈی، شہسواروں کی طرح ران پٹری جمائے، کمر سے تلوار لٹکائے، چہرے کو نقاب سے چھپائے، عجب شوخی اور بانکپن کے ساتھ لڑائی میں شریک ہونے کے لیے آئی ہے۔ اس کے ساتھ دس جوان عورتیں گھوڑیوں پر سوار چلی آ رہی ہیں۔ مخبر نے ان عورتوں کی کچھ ایسی تعریف کی کہ لوگ سن کر دنگ رہ گئے۔ بولا— اس رئیس زادی نے قسم کھائی ہے کہ عمر بھر کنواری رہوں گی۔ اس کا باپ ایک مشہور جنرل تھا، اس نے اپنی پیاری بیٹی کو شہسواری کا فن سکھایا تھا۔ روس میں بس یہی ایک عورت ہے جو ترکوں سے مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئی ہے۔ اس نے قسم کھائی ہے کہ آزاد کا سر لے کر زار کے قدموں پر رکھ دوں گی۔

آزاد : بھلا، یہ تو بتلاؤ کہ اگر وہ رئیس کی لڑکی ہے تو اسے میدان سے کیا سروکار؟ پھر میرا نام اس کو کیونکر معلوم ہوا؟

مخبر : اب یہ تو حضور، وہی جانے، ان کا نام مس کلاریسا ہے۔ وہ آپ سے تلوار کا مقابلہ کرنا چاہتی ہیں۔ میدان میں اکیلے آپ سے لڑیں گی، جس طرح پرانے زمانے میں پہلوانوں میں لڑائی کا رواج تھا۔

آزاد پاشا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ افسروں نے ان کو بنانا شروع کیا۔ آزاد نے سوچا، اگر قبول کیے لیتا ہوں تو نتیجہ کیا! جیتا، تو کوئی بڑی بات نہیں۔ لوگ کہیں گے، لڑنا بھڑنا عورتوں کا کام نہیں۔ اگر چوٹ کھائی تو جگ ہنسائی ہوگی۔ مس میڈا طعنے دیں گی۔ اللہ رکھی آڑے ہاتھوں لیں گی کہ ایک چھوکری سے چرکا کھا گئے۔ ساری ڈینگ خاک میں مل گئی۔ اور اگر انکار کرتے ہیں تو بھی تالیاں بجیں گی کہ ایک نازک بدن عورت کے مقابلے سے بھاگے۔ جب خود کچھ فیصلہ نہ کر سکے تو پوچھا— دل لگی تو ہو چکی، اب بتلایئے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

جنرل : صلاح یہی ہے کہ اگر آپ کو بہادری کا دعوی ہے تو قبول کر لیجیے، ورنہ چپکے ہو رہیے۔

آزاد : جناب، خدا نے چاہا، تو ایک چوٹ نہ کھاؤں اور بے داغ لوٹ آؤں۔ عورت لاکھ دلیر ہو، پھر بھی عورت ہے!

جنرل : یہاں مونچھوں پر تاؤ دے لیجیے، مگر وہاں قلعی کھل جائے گی۔

انور پاشا: جس وقت وہ حسینہ تلوار سج کر سامنے آئے گی، ہوش اڑ جائیں گے۔ غش پر غش آئیں گے۔ ایسی حسین عورت سے لڑنا کیا کچھ ہنسی ہے؟ ہاتھ نہ اٹھے گا۔ منھ کی کھاؤ گے۔ اس کی ایک نگاہ تمھارا کام تمام کر دے گی۔

آزاد: اس کی کچھ پرواہ نہیں۔ یہاں تو دلی آرزو ہے کہ کسی نازنین کی نگاہوں کے شکار ہوں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک آدمی نے آکر کہا— کوئی صاحب حضرت آزاد کو ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں۔ اگر حکم ہو، تو بلا لاؤں۔ بڑے تیکھے آدمی ہیں۔ مجھ سے لڑ پڑے تھے۔ آزاد نے کہا اسے اندر آنے دو۔ سپاہی کے جاتے ہی میاں خوجی اکڑتے ہوئے آ پہنچے۔

آزاد: مدت کے بعد ملاقات ہوئی، کوئی تازہ خبر کہیے۔

خوجی: کمر تو کھولنے دو، افیم گھولوں، چسکی لگاؤں تو ہوش آئے۔ اس وقت تھکا ماندا، مرا مِٹا آ رہا ہوں۔ سانس تک نہیں سماتی ہے۔

آزاد: مس میڈا کا حال تو کہو!

خوجی: روز کمیّت گھوڑے پر سوار دریا کے کنارے جاتی ہیں۔ روز اخبار پڑھتی ہے۔ جہاں تمھارا نام آیا، بس رونے لگیں۔

آزاد: ارے، یہ انگلی میں کیا ہوا ہے جی! جل گئی تھی کیا؟

خوجی: جل نہیں گئی تھی جی، یہ اپنی صورت گلے کا ہار ہوئی۔

آزاد: اے، یا ماجرا کیا ہے؟ ایک کان کون کتر لے گیا ہے؟

خوجی: نہ ہم اتنے حسین ہوتے، نہ پریاں جان دیتیں!

آزاد: ناک بھی کچھ چپٹی معلوم ہوتی ہے۔

خوجی: صورت، صورت! یہی صورت بلائے جان ہو گئی۔ اسی کے ہاتھوں یہ دن دیکھنا پڑا۔

آزاد: صورت، مورت نہیں، آپ کہیں سے پٹ کر آئیں ہیں۔ کمزور، مار کھانے کی نشانی، کسی سے بھڑ پڑے ہوں گے۔ اس نے ٹھونک ڈالا ہوگا! یہی بات ہوئی ہے نا؟

خوجی: اجی، ایک پری نے پھولوں کی چھڑیوں سے سزا دی تھی۔

آزاد: اچھا، کوئی خط وت بھی لائے ہو؟ یا چلے آئے یوں ہی ہاتھ جھلاتے؟

خوجی : دو دو خط ہیں۔ ایک مس میڈا کاڈ، دوسرا ہرمج جی کا۔

آزاد اور خوجی نہر کے کنارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اب جو آتا ہے، خوجی کو دیکھ کر ہنستا ہے۔ آخر خوجی بگڑ کر بولے — کیا بھیڑ لگائی ہے؟ چلو، اپنا کام کرو۔

آزاد : تم کو کسی سے کیا واسطہ، کھڑے رہنے دو۔

خوجی : اجی نہیں، آپ سمجھتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ نظر لگا دیں گے۔

آزاد : ہاں، آپ کا کلاّ ٹھلاّ دیکھ کر نظر لگ جائے تو تعجب بھی نہیں۔

خوجی : اجی، وہ ایک صورت ہی کیا کم ہے! اور قسم لے لو کہ کسی مردک کو اب تک معلوم ہوا ہو کہ ہم اتنے حسین ہیں! اور ہمیں اس کا کچھ غرور بھی نہیں —

مطلق نہیں غرور جمال و کمال پر۔

آزاد : جی ہاں، باکمال لوگ کبھی غرور نہیں کرتے، سیدھے سادے ہوتے ہی ہیں۔ اچھا، آپ افیم گھولیے، ساتھ ہے یا نہیں؟

خوجی : جی نہیں، اور کیا! آپ کے بھروسے آتے ہیں؟ اچھا، لاؤ، نکلواؤ۔ مگر ذرا عمدہ ہو۔ کمسریٹ کے ساتھ تو ہوتی ہوگی؟

آزاد : اب تم مرے۔ بھلا یہاں افیم کہاں؟ اور کمسریٹ میں؟ کیا خوب!

خوجی : تب تو بے موت مرے۔ بھئی کسی سے مانگ لو۔

آزاد : یہاں افیم کا کسی کو شوق ہی نہیں۔

خوجی : اتنے شریف زادے ہیں اور افیمچی ایک بھی نہیں؟ واہ!

آزاد : جی ہاں، سب گنوار ہیں۔ مگر آج دل لگی ہوگی، جب افیم نہ ملے گی اور تم تڑپو گے، بلبلاؤ گے۔

خوجی : یہ تو ابھی سے جمہائیاں آنے لگیں۔ کچھ تو فکر کرو یار!

آزاد : اب یہاں افیم نہ ملے گی۔ ہاں، کرولیاں جتنی چاہو، منگا دوں۔

خوجی : (افیم کی ڈبیا دکھا کر) یہ بھری ہے افیم! کیا الّو سمجھے تھے! آنے کے پہلے ہی میں نے ہرمُج جی سے کہا کہ حضور، افیم منگوا دیں۔ اچھا، یہ لیجیے، ہرمُج جی کا خط۔

آزاد نے خط کھولا تو یہ لکھا تھا —

'مائی ڈیئر آزاد،

ذڑا خوجی سے خیر و عافیت تو پوچھیے، اتنا پٹے کہ دو دانت ٹوٹ گئے، کان کٹ گئے اور گھونسے اور مکّے کھائے۔ آپ ان سے اتنا پوچھیے کہ لالہ رخ کون ہیں؟

تمھارا ہرمُج'۔

آزاد : کیوں صاحب، یہ لالہ رخ کون ہیں؟

خوجی : افوہ، ہم پر چکمہ چل گیا۔ واہ رے ہرمُج جی، واللہ! اگر نمک نہ کھائے ہوتا تو جا کر ابھی کرولی بھونک دیتا۔

آزاد : نہیں، تمھیں واللہ، بتاؤ تو، یہ لالے رخ کون ہیں؟

خوجی : اچھا ہرمُج جی، سمجھیں گے!

سودا کریں گے دل کا کسی دل رخا کے ساتھ،

اس باوفا کو بیچیں گے ایک بے وفا کے ہاتھ۔

ہائے لالہ رخ جان جاتی ہے، مگر موت بھی نہیں آتی۔

آزاد : پٹے ہوئے ہو، کچھ حال تو بتلاؤ۔ حسین ہے؟

خوجی : (جھلاّ کر) جی نہیں، حسین نہیں ہے۔ کالی کلوٹی ہے۔ آپ بھی واللہ، نرے چونج ہی رہے! بھلا، کسی ایسی ویسی کی جرأت کیسے ہوتی کہ ہمارے ساتھ بات کرتی! یاد رکھو، حسین پر جب نظر پڑے گی، حسین ہی کی پڑے گی۔ دوسرے کی مجال نہیں۔

'غالب'

ان سیمی تنوں کے واسطے،

چاہنے والا بھی اچھا چاہیے۔

آزاد : اچھا، اب لالے رخ کا تو حال بتاؤ۔

خوجی : اجی، اپنا کام کرو،اس وقت دل قابو میں نہیں ہے۔ وہ حسن ہے کہ آپ کے باباجان نے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ مگر ہاتھوں میں چُل ہے۔ گھنٹے بھر میں پانچ سات بار ضرور چیتیاتی تھیں۔ کھونپڑی پلپلی کر دی۔ بس، ہم کو اسی بات سے نفرت تھی۔ ورنہ، نک سک سے درست! اور چہرہ چمکتا ہوا، جیسے آبنوس! ایک دن دل لگی دل لگی میں اٹھ کر ایک پچاس جوتے لگا دیے، تڑ تڑ تڑ! ہیں، ہیں، یہ کیا حماقت ہے، ہمیں یہ دل لگی پسند نہیں، مگر وہ سنتی کس کی ہیں! اب فرمائیے، جس پر پچاس جوتے پڑے، اس کی کیا گت ہوگی۔ ایک روز ہنسی ہنسی میں

کان کاٹ لیا۔ ایک دن دکان پر کھڑا ہوا سودا خرید رہا تھا۔ پیچھے سے آکر دس جوتے لگا دیے۔ ایک مرتبہ ایک حوض میں ہم کو ڈھکیل دیا۔ ناک ٹوٹ گئی، مگر ہے لاکھوں میں لاجواب ا

طرزِ نگاہ نے چھین لیے زاہدوں کے دل،
آنکھیں جو ان کی اٹھ گئیں دستِ دعا کے ساتھ۔

آزاد : تو یہ کہیے، ہنسی ہنسی میں خوب جوتیاں کھائیں آپ نے!

خوجی : پھر یہ تو ہے ہی، اور عشق کہتے کسے ہیں؟ ایک دفعہ میں سو رہا تھا، آنے کے ساتھ ہی اس زور سے چابک جمائی کہ میں تڑپ کر چیخ اٹھا۔ بس، آگ ہوگئی کہ ہم پیٹیں، تو تم روؤ کیوں؟ جاؤ، بس، اب ہم نہ بولیں گی۔ لاکھ منایا مگر بات تک نہ کی۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ سرے بازار وہ ہمیں چپتیائیں اور ہم سر جھکائے کھڑے رہیں۔

لب نے جو جلایا تو تیری آنکھ نے مارا،
قاتل بھی رہا ساتھ مسیحا کے ہمیشہ
پردہ نہ اٹھایا کبھی چہرہ نہ دکھایا
مشتاق رہے ہم رخِ زیبا کے ہمیشہ۔

آزاد : کسی دن ہنسی ہنسی میں آپ کو زہر نہ کھلا دے؟

خوجی : کیوں صاحب، کھلا دیں کیوں نہیں کہتے؟ کوئی کنڈے والی مقرر کی ہے۔ وہ بھی رئیس زادی ہیں! آپ کی مس میڈا پر گر پڑے تو یہ کچل جائیں۔ اچھا ہماری داستان تو سن چکے، اپنی بیتی کہو۔

آزاد : ایک نازنین ہم سے تلوار لڑنا چاہتی ہے۔ کیا رائے ہے؟ پیغام بھیجا ہے کہ کسی دن آزاد پاشا سے اور ہم سے اکیلے تلوار چلے۔

خوجی : مگر تم نے پوچھا تو ہوتا کہ سن کیا ہے؟ شکل وصورت کیسی ہے؟

آزاد : سب پوچھ چکے ہیں۔ روس میں اس کا ثانی نہیں ہے۔ مس میڈا یہاں ہوتیں تو خوب دل لگی رہتی۔ ہاں، تم نے تو ان کا خط دیا ہی نہیں۔ تمھاری باتوں میں ایسا الجھا کہ اس کی یاد ہی نہ رہی۔

خوجی نے میڈا کا خط نکال کر دیا۔ یہ مضمون تھا—

'پیارے آزاد،

آج کل اخباروں ہی میں میری جان بستی ہے۔ مگر کبھی کبھی تو خط بھی بھیجا کرو۔ یہاں جان پر بن آئی ہے، اور تم نے وہ چپّی سادھی ہے کہ خدا کی پناہ۔ تم سے اس بے وفائی کی امید نہ تھی۔

یوں تو منہ دیکھے کی ہوتی ہے محبت سب کو،
جب میں جانوں کہ میرے بعد میرا دھیان رہے۔

تمھاری، میڈا۔؟

(69)

دوسرے دن آزاد کا اس روسی نازنین سے مقابل تھا۔ آزاد کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ سویرے اٹھ کر باہر آئے تو دیکھا کہ دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہیں اور دونوں طرف سے توپیں چل رہی ہیں۔

خوجی دور سے ایک اونچے درخت کی شاخ بیٹھے لڑائی کا رنگ دیکھ رہے تھے اور چلاّ رہے تھے، ہوشیار، ہوشیار! یارو، کچھ خبر بھی ہے؟ ہائے! اس وقت اگر توڑے دار بندوق ہوتی تو پرے کے پرے صاف کر دیتا۔ اتنے میں آزاد پاشا نے دیکھا کہ روسی فوج کے سامنے ایک حسینہ کمر میں تلوار لٹکائے، ہاتھ میں نیزہ لیے، گھوڑے پر شان سے بیٹھی سپاہیوں کو آگے بڑھنے کے لیے للکار رہی ہے۔ آزاد کی اس پر نگاہ پڑی تو دل میں سوچے، خدا اسے بری نظر سے بچائے۔ یہ تو اس قابل ہے کہ اس کی پوجا کرے۔ یہ، اور میدان جنگ! ہائے ہائے، ایسا نہ ہو کہ اس پر کسی کا ہاتھ پڑ جائے۔ غضب کی چیز ہے یہ حسن، انساں لاکھ چاہتا ہے، مگر دل کھنچ ہی جاتا ہے، طبیعت آ ہی جاتی ہے۔ اس حسینہ نے جو آزاد کو دیکھا تو یہ شعر پڑھا—

سنبھل کے رکھیو قدم راہِ عشق میں مجنوں،
کہ اس دیار میں سودا برہنہ پائی ہے۔

یہ کہہ کر گھوڑا بڑھایا۔ آزاد کے گھوڑے کے طرف جھکی اور جھکتے ہی ان پر تلوار کا وار کیا۔ آزاد نے وار خالی دیا اور تلوار کو چوم لیا۔ ترکوں نے اس زور سے نعرہ مارا کہ کوسوں تک میدان گونجنے لگا۔ مس کلاریسا نے جھلاّ کر گھوڑے کو پھیرا اور چاہا کہ آزاد کو دو ٹکڑے کر دے، مگر جیسے ہی ہاتھ اٹھایا، آزاد نے اپنے گھوڑے کو آگے بڑھایا اور تلوار کو اپنی تلوار سے روک کر

ہاتھ سے اس پری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ترکوں نے پھر نعرہ مارا اور روسی جھینپ گئے۔ مس کلاریسا بھی لجائیں اور مارے غصے کے جھلاّ کر وار کرنے لگیں۔ بار بار چوٹ آتی تھی، مگر آزاد کی یہ کیفیت تھی کہ کچھ چوٹیں تلوار پر روکیں اور کچھ خالی دیں۔ آزاد اس سے لڑ تو رہے تھے، مگر وار کرتے دل کانپتا تھا۔ ایک دفعہ اس شیر دل عورت نے ایسا ہاتھ جمایا کہ کوئی دوسرا ہوتا، تو اس کی لاش زمین پر پھڑکتی نظر آتی، مگر آزاد نے اس طرح بچایا کہ ہاتھ بالکل خالی گیا جب اس خاتون نے دیکھا کہ آزاد نے ایک چوٹ بھی نہیں کھائی تو پھر جھنجھلا کر اتنے وار کیے کہ دم لینا بھی مشکل ہو گیا۔ مگر آزاد نے ہنس ہنس کر چوٹیں بچائیں۔ آخر اس نے ایسا تلا ہوا ہاتھ گھوڑے کی گرد پر جمایا کہ گردن کٹ کر دور جا گری۔ آزاد فوراً کود پڑے اور چاہتے تھے کہ اچھل کر مس کلاریسا کے ہاتھ سے تلوار چھین لیں کہ اس نے گھوڑے کو چابک جمائی اور اپنی فوج کی طرف چلی۔ آزاد سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ گھوڑا ہوا ہوگیا۔ آزاد گھوڑے پر لٹکے رہ گئے۔

جب گھوڑا روس کی فوج میں داخل ہوا تو روسیوں نے تین بار خوشی سے آوازیں لگائیں اور کوئی چالیس پچاس آدمیوں نے آزاد کو گھیر لیا۔ دس آدمیوں نے ایک ہاتھ پکڑا، پانچ نے دوسرا ہاتھ۔ دو چار نے ٹانگ لی۔ آزاد بولے — بھئی، اگر میرا ایسا ہی خوف ہے تو میرے ہتھیار کھول لو اور قید کر دو۔ دس آدمیوں کا پہرہ رہے۔ ہم بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ اگر تمھارے یہی ہتھکنڈے ہے تو دس پانچ دن میں ترک جوان آپ ہی آپ بندھے چلے جائیں گے۔ مس کلاریسا کی طرح پندرہ بیس پریاں مورچے پر جائیں تو شاید ترکی کی طرف گولندازی بھی بند ہو جائے!

ایک سپاہی : ٹھگے ہوئے چلے آئے، ساری دلیری دھری رہی گئی!

دوسرا سپاہی : واہ ری کلاریسا؟ کیا پھرتی ہے!

آزاد : اس میں تو شک نہیں کہ اس وقت ہم شکار ہو گئے۔ مس کلاریسا کی ادا نے مار ڈالا۔

ایک افسر : آج ہم تمھاری گرفتاری کا جشن منائیں گے۔

آزاد : ہم بھی شریک ہوں گے۔ بھلا، کلاریسا بھی ناچیں گی؟

افسر : اجی، وہ آپ کو انگلیوں پر نچائیں گی۔ آپ ہیں کس بھروسے؟

آزاد : اب تو خدا ہی بچائے تو بچیں۔ برے پھنسے۔

تیری گلی میں ہم اس طرح سے ہیں آئے ہوئے

شکار ہو کوئی جس طرح چوٹ کھائے ہوئے

افسر : آج تو ہم پھولے نہیں سماتے۔ بڑے مُوڑھ کو پھانسا۔

آزاد : ابھی خوش ہو لو، مگر ہم بھاگ جائیں گے۔ مس کلاریسا کو دیکھ کر طبیعت لہرائی، ساتھ چلے آئے۔

افسر : واہ، اچھے جواں مرد ہو! آئے لڑنے اور عورت کو دیکھ کر پھسل پڑے۔ سورما کہیں عورت پر پھسلا کرتے ہیں؟

آزاد : بوڑھے ہو گئے ہو نہ! ایسا تو کہا ہی چاہو۔

افسر : ہم تو آپ کی شہسواری کی بڑی دھوم سنتے تھے! مگر بات کچھ اور ہی نکلی۔ اگر آپ میرے مہمان نہ ہوتے تو ہم آپ کے منھ پر کہہ دیتے کہ آپ شہدے ہیں۔ بھلے آدمی، کچھ تو غیرت چاہیے۔

اتنے میں ایک روسی سپاہی نے آکر افسر کے ہاتھ میں ایک خط رکھ دیا۔ اس نے پڑھا تو یہ مضمون تھا۔

(1) حکم دیا جاتا ہے کہ میاں آزاد کو سائبیریا کے ان میدانوں میں بھیجا جائے، جو سب سے زیادہ سرد ہے۔

(2) جب تک یہ آدمی زندہ رہے، کسی سے بولنے نہ پائے۔ اگر کسی سے بات کرے تو دونوں پر سوسو بینت پڑے۔

(3) کھانا صرف ایک وقت دیا جائے۔ ایک دن آدھ سیر ابالا ہوا ساگ اور دوسرے دن گڑ اور روٹی۔ پانی کے تین کٹورے رکھ دیے جائیں، چاہے ایک ہی بار پی جائے چاہے دس بار پیے۔

(4) دس سیر آٹا روز پیسے اور دو گھنٹے روز ڈیل بولی جائے۔ چکّی کا پاٹ سر پر رکھ کر چکر لگائے۔ ذرا دم نہ لینے پائے۔

(5) ہفتے میں ایک بار برف میں کھڑا کر دیا جائے اور باریک کپڑا پہننے کو دیا جائے۔

آزاد : بات تو اچھی ہے، گرمی نکل جائے گی۔

افسر: اس بھروسے بھی نہ رہنا۔ آدھی رات کو سر پر پانی کا تڑیڑا روز دیا جائے گا۔

آزاد منھ سے تو ہنس رہے تھے، مگر دل کانپ رہا تھا کہ خدا ہی خیر کرے۔ اوپر سے حکم آ گیا تو فریاد کس سے کریں اور فریاد کریں بھی تو سنتا کون ہے؟ بولے، ختم ہو گیا یا اور کچھ ہے۔

افسر: تمھارے ساتھ اتنی رعایت کی گئی ہے کہ اگر مس کلاریسا رحم کریں تو کوئی ہلکی سزا دی جائے۔

آزاد: تب تو وہ ضرور ہی معاف کر دیں گی۔

یہ کہہ کر آزاد نے یہ شعر پڑھا—

کھول دی ہے زلف کس نے پھول سے رخسار پر
چھا گئی کالی گھٹا ہے آن کر گلزار پر

افسر: اب تمھارے دیوانہ پن میں ہمیں کوئی شک نہ رہا۔

آزاد: دیوانہ کہو، چاہے پاگل بناؤ۔ ہم تو مر مٹے۔

سختیاں ایسی اٹھائیں ان بتوں کے ہجر میں
رنج سہتے سہتے پتھر کا کلیجہ ہو گیا۔

(70)

شام کے وقت ہلکی پھلکی اور صاف ستھری چھول داری میں مس کلاریسا بناؤ چناؤ کر کے ایک نازک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ چاندنی نکھری ہوئی تھی، پیڑ اور پتے دودھ میں نہائے ہوئے اور ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اُدھر میاں آزاد قید میں پڑے ہوئے حسن آرا کو یاد کر کے سر دھنتے تھے کہ ایک آدمی نے آ کر کہا— چلیے، آپ کو مس صاحب بلاتی ہیں۔ آزاد چھول داری کے قریب پہنچے تو سوچنے لگے، دیکھیں، یہ کس طرح پیش آتی ہے۔ اگر کہیں سائبیریا بھیج دیا تو بے موت ہی مر جائیں گے۔ اندر جا کر سلام کیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کلاریسا نے تیکھی چتون کر کہا— کہیے، مزاج ٹھنڈا ہوا یا نہیں؟

آزاد: اس وقت تو حضور کے پنجے میں ہوں، چاہے قتل کیجیے، چاہے سولی دیجیے۔

کلاریسا: جی تو نہیں چاہتا کہ تمھیں سائبیریا بھیجوں، مگر وزیر کے حکم سے مجبور ہوں ا

وزیر نے مجھے اختیار تو دے دیا ہے کہ چاہوں تو تمھیں چھوڑ دوں، لیکن بدنامی سے ڈرتی ہوں۔ جاؤ، رخصت!

فوج کے افسر نے حکم دیا کہ سو سوار آزاد کو لے کر سرحد پر پہنچا آئیں ان کے ساتھ کچھ دور چلنے کے بعد آزاد نے پوچھا— کیوں یارو، اب جان بچنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

ایک سپاہی : بس، ایک صورت ہے کہ جو سوار تمھارے ساتھ جائیں وہ تمھیں چھوڑ دیں۔

آزاد : بھلا، وِے لوگ کیوں چھوڑنے لگے؟

سپاہی : تمھاری جوانی پر ترس آتا ہے۔ اگر ہم ساتھ چلے تو ضرور چھوڑ دیں گے۔

تیسرے دن آزاد پاشا سائبیریا جانے کو تیار ہوئے۔ سو سپاہی پرے جمائے ہوئے، ہتھیاروں سے لیس، ان کے ساتھ چلنے کو تیار تھے۔ جب آزاد گھوڑے پر سوار ہوئے تو ہزارہا آدمی ان کی حالت پر افسوس کر رہے تھے۔ کتنی ہی عورتیں رومال سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ایک عورت اتنی بے قرار ہوئی کہ جا کر افسر سے بولی— حضور، یہ آپ بڑا غضب کرتے ہیں۔ ایسے بہادر آدمی کو آپ سائبیریا بھیج رہے ہیں۔

افسر : میں مجبور ہوں۔ سرکاری حکم کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے۔

دوسری اِستری : اس بے چارے کی جان کا خدا حافظ ہے۔ بےقصور جان جاتی ہے۔

تیسری اِستری : آؤ۔ سب کو سب مل کر چلیں اور مس صاحب سے سفارش کریں۔ شاید دل پسیج جائے۔

یہ باتیں کر کے وہ کئی عورتوں کے ساتھ مس کلاریسا کے پاس جا کر بولی— حضور، یہ کیا غضب کرتی ہیں! اگر آزاد مر گئے تو آپ کی کتنی بڑی بدنامی ہوگی؟

کلاریسا : ان کو چھوڑنا میرے امکان سے باہر ہے۔

وہ اِستری : کتنی ظالم! کتنی بے رحم ہو! ذرا آزاد کی صورت تو چل کر دیکھ لو۔

کلاریسا : کچھ نہیں جانتے!

اب تک تو آزاد کو امید تھی کہ شاید مس کلاریسا مجھ پر رحم کریں، لیکن جب ادھر سے کوئی امید نہ رہی اور معلوم ہو گیا کہ بنا سائبیریا گئے جان نہ بچے گی تو رونے لگے۔ اتنے زور سے

چیخے کہ مس کلاریسا کے بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے اور تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ گھوڑے سے گر پڑے۔

ایک سپاہی : ارے یارو، اب یہ مر جائے گا۔

دوسرا سپاہی : مرے یا جیے، سائبیریا تک پہنچنا ضروری ہے۔

تیسرا سپاہی : بھئی، چھوڑ دو۔ کہہ دینا، راستے میں مر گیا۔

چوتھا سپاہی : ہماری فوج میں ایسا خوبصورت اور کڑیل جوان دوسرا نہیں ہے۔ ہماری سرکار کو ایسے بہادر افسر کی قدر کرنی چاہیے تھی۔

پانچواں سپاہی : اگر آپ سب لوگ ایک رائے ہوں تو ہم اس کی جان بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالیں۔ مگر تم لوگ ساتھ نہ دو گے۔

چھٹا سپاہی : پہلے اسے ہوش میں لانے کی فکر تو کرو۔

جب پانی کے خوب چھینٹے دیے گئے تو آزاد نے کروٹ بدلی۔ سواروں کی جان میں جان آئی۔ سب ان کو لے کر آگے بڑھے۔

(71)

آزاد تو سائبیریا کی طرف روانہ ہوئے، ادھر خوجی نے درخت پر بیٹھے بیٹھے افیم کی ڈبیا نکالی۔ وہاں پانی کہاں؟ ایک آدمی درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ آپ نے اس سے کہا— بھائی جان، ذرا پانی پلا دو۔ اس نے اوپر دیکھا، تو ایک بونا بیٹھا ہوا ہے۔ بولا— تم کون ہو؟ دل لگی یہ ہوئی کہ وہ فرانسیسی تھا۔ خوجی اردو میں بات کرتے تھے، وہ فرانسیسی میں جواب دیتا تھا۔

خوجی : افیم گھولیں گے میاں! ذرا سا پانی دے ڈالو بھائی!

فرانسیسی : واہ، کیا صورت ہے! پہاڑ پر نہ جا کر بیٹھو؟

خوجی : بھئی واہ رے ہندستان! واللہ، اس فصل میں سبیلوں پر پانی ملتا ہے، کیوڑے کا بسا ہوا۔ ہندو پوسرے بیٹھاتے ہیں اور تم ذرا پانی بھی نہیں دیتے۔

فرانسیسی : کہیں اوپر سے گر نہ پڑنا۔

خوجی : (اشارے سے) ارے میاں پانی پانی!

فرانسیسی : ہم تمھاری بات نہیں سمجھتے۔

خوجی : اتر نا پڑا ہمیں! ابے، او گیدی، ذرا سا پانی کیوں نہیں دے جاتا؟ کیا پاؤں کی مہندی گر جائے گی؟

فرانسیسی نے جب اب بھی پانی نہ دیا تو خوجی اوپر سے پتے توڑ توڑ پھینکنے لگے۔ فرانسیسی جھلاّ کر بولا— بچہ، کیوں شامتیں آئی ہیں۔ اوپر آکر اتنے میں گھونسے لگاؤں گا کہ ساری شرارت نکل جائے گی۔ خوجی نے اوپر سے ایک شاخ توڑ کر پھینکی۔ فرانسیسی نے اتنے ڈھیلے مارے کہ خوجی کی کھوپڑی جانتی ہوگی۔ اتنے میں ایک ترک آ نکلا۔ اس نے سمجھا بجھا کر خوجی کو نیچے اتارا۔ خوجی نے افیم گھولی، چسکی لگائی اور پھر درخت پر جا کر ایک موٹی شاخ سے ٹک کر پینک لینے لگے۔ اب سنیے کہ ترکوں اور روسیوں میں اس وقت خوب گولے چل رہے تھے۔ ترکوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا، مگر فرانسیسی توپ خانے نے ان کے چھکّے چھڑا دیے اور ان کا سردار آصف پاشا گولی کھا کر گر پڑا۔ ترک تو ہار کر بھاگ نکلے۔ روسیوں کی ایک پلٹن نے اس میدان میں پڑاؤ ڈالا۔ خوجی پینک سے چونک کر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے کہ ایک روسی جوان کی نظر ان پر پڑی۔ بولا— کون؟ تم کون ہو؟ ابھی اتر جاؤ۔

خوجی نے سوچا، ایسا نہ ہو کہ پھر ڈھیلے پکڑنے لگیں۔ نیچے اتر آئے۔ ابھی زمین پر پاؤں بھی نہ رکھا تھا کہ روسی نے ان کو گود میں اٹھا کر پھینکا تو دھم سے زمین پر گر گئے۔

خوجی : او گیدی، خدا تم سے اور تمھارے باپ سے سمجھے!

ایک روسی : بھئی، یہ پاگل ہے کوئی۔

دوسرا : اس کو فوج کے ساتھ رکھو۔ خوب دل لگی رہے گی۔

روسیوں نے کئی ترک سپاہیوں کو قید کر لیا تھا۔ خوجی بھی انھی کے ساتھ رکھ دیے گئے۔ ترکوں کو دیکھ کر انھیں ذرا تسکین ہوئی۔ ایک ترک بولا— تم تو آزاد کے ساتھ آئے تھے نا؟ تم ان کے کون ہو؟

خوجی : میرا لڑکا ہے جی، تم نوکر بتاتے ہو۔

ترک : ایں، آپ آزاد پاشا کے باپ ہیں!

خوجی : ہاں، ہاں، تو اس میں تعجب کی کون بات ہے۔ میں نے ہی تو آزاد کو مار مار کر لڑنا سکھایا۔

ترکوں نے خوجی کو آزاد کا باپ سمجھ کر فوجی قاعدے سے سلام کیا۔ تب خوجی رونے

لگے— ارے یارو، کہیں سے تو ہمیں لڑکے کی صورت دیکھا دو۔ کیا تم کو اسی دن کے لیے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا؟ اب تمھاری ماں کو کیا صورت دکھاؤں گا؟

ترک : آپ زیادہ بے چین نہ ہوں۔ آزاد ضرور چھوٹیں گے۔

خوجی : بھئی، مجھے تو بڑھاپے میں داغ دے گئے۔

ترک : حضور، اب دل کو سنبھالیں۔

خوجی : بھئی، میری اتنی عزت نہ کرو نہیں تو روسیوں کو شک ہو جائے گا کہ یہ آزاد پاشا کے باپ ہیں۔ تب بہت تنگ کریں گے۔

ترک : خدا نے چاہا تو افسر لوگ آپ کو ضرور چھوڑ دیں گے۔

خوجی : جیسی مولا کی مرضی!

(72)

بڑی بیگم کا باغ پری خانہ بنا ہوا ہے۔ چاروں بہنیں روِشوں میں اٹھکھیلیاں کرتی ہیں۔ نازوں ادا سے تول تول کر قدم دھرتی ہیں۔ عبّاسی پھول توڑ توڑ کر جھولیاں بھر رہی ہیں۔ اتنے میں سپہر آرا نے شوخی کے ساتھ گلاب کا پھول توڑ کر گیتی آرہ کی طرف پھینکا۔ گیتی آرہ نے اچھالا تو سپہر آرا کی زلف کو چھوتا ہوا نیچے گرا۔ حسن آرا نے کئی پھول توڑے اور جہان آرہ بیگم سے گیند کھیلنے لگیں۔ جس وقت گیند پھینکنے کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھیں، ستم ڈھاتی تھیں۔ وہ کمر کا لچکنا اور گیسو کا بکھرنا، پیارے پیارے ہاتھوں کی لوچ اور مسکرا مسکرا کر نشانے بازی کرنا عجب لطف دکھاتا تھا۔

عبّاسی : ماشا اللہ، حضور کس صفائی کے ساتھ پھینکتی ہیں!

سپہر آرا : بس عبّاسی، اب بہت خوشامد کی نہ لو۔ کیا جہاں آرہ بہن صفائی سے نہیں پھینکتی؟ باجی ذرا جھپٹتی زیادہ ہیں۔ مگر ہم سے نہ جیت پائیں گی۔ دیکھ لینا۔

عبّاسی : جس صفائی سے حسن آرا بیگم گیند کھیلتی ہیں، اس صفائی سے جہان آرہ بیگم کا ہاتھ نہیں جاتا۔

سپہر آرا : میرے ہاتھ سے بھلا پھول گر سکتا ہے! کیا مجال!

اتنے میں جہاں آرہ بیگم نے پھول کو نوچ ڈالا اور اف کہہ کر بولیں— اللہ جانتا ہے،

ہم تو تھک گئے۔

سپہر آرا: اے واہ، بس اتنے میں ہی تھک گئیں؟ ہم سے کہیے، شام تک کھیلا کریں۔

اب سنیے کہ ایک دوست نے مرزا ہمایوں فر کو جا کر اطلاع دی کہ اس وقت باغ میں پریاں اِدھر اُدھر دوڑ رہی ہیں۔ اس وقت کی کیفیت دیکھنے قابل ہے۔ شہزادے نے یہ خبر سنی تو بولے— بھئی، خوش خبری تو سنائی، مگر کوئی تدبیر تو بتاؤ۔ ذرا آنکھیں ہی سینک لیں۔ ہاں، ہیرا مالی کو بلواؤ۔ ذرا دیکھیں۔

ہیرا نے آ کر سلام کیا۔

شہزادہ: بھئی، اس وقت کسی حکمت سے اپنے باغ کی سیر کراؤ۔

ہیرا: خداوند، اس وقت تو معاف کریں، سب وہیں ہیں۔

شہزادہ: الّو ہی رہے، ارے میاں، وہاں سنّاٹا ہوتا تو جا کر کیا کرتے! سنا ہے، چاروں پریاں وہیں ہیں۔ باغ پرستان ہو گیا ہوگا! ہیرا، لے چل، تجھے اپنے ناراین کی قسم! جو مانگ، فوراً دوں۔

ہیرا: حضور ہی کا نمک کھاتا ہوں یا کسی اور کا؟ مگر اس وقت موقع نہیں ہے۔

شہزادہ: اچھا، ایک شعر لکھ دوں، وہاں پہنچا دو۔

یہ کہہ کر شہزادہ نے یہ شعر لکھا—

چھکایا تو نے ایک عالم کو ساقی جامِ گلگو سے
ہمیں بھی کوئی ساغر، ہم بھی ہیں امید واروں میں

ہیرا یہ رقعہ لے کر چلا۔ شہزادے نے سمجھا دیا کہ سپہر آرا کو چپکے سے دے دینا۔ ہیرا گیا تو دیکھا کہ عبّاسی اور بوڑھی مہری میں تکرار ہو رہی ہے۔ صبح کے وقت عبّاسی حسن آرا کے لیے کمہارن کے یہاں سے دو جھنجھریاں لائی تھی۔ دام ایک آنا بتایا۔ بڑی بیگم نے جو یہ جھنجھریاں دیکھیں تو مہری کو حکم دیا کہ ہمارے واسطے بھی لاؤ۔ مہری ویسی ہی جھنجھریاں دو آنے کی لائی۔ اس وقت عبّاسی ڈینگ مارنے لگی کہ میں جتنی سستی لاتی ہوں، کوئی دوسرا بھلا لا تو دے۔ مہری اور عبّاسی میں پرانی چشمک تھی۔ بولی— ہاں بھئی، تم کیوں نہ سستی چیز لاؤ۔ ابھی کم سن ہو نہ؟

عبّاسی: تم بھی تو کسی زمانے میں جوان تھیں۔ بازار بھر کو لوٹ لائی ہوگی۔ میرے منھ

نہ لگنا۔

مہری : ہوش کی دوا کر چھوکری! بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ بنا موئی! زمانے بھر کی آوارہ! اور سنو!

عبّاسی : دیکھیے حضور، یہ لام قاف زبان سے نکالتی ہیں۔ اور میں حضور کا لحاظ کرتی ہوں۔ جب دیکھو، طعنے کے سوا بات ہی نہیں کرتیں۔

مہری : منھ پکڑ کر جھلس دیتی مراد کا!

عبّاسی : منھ جھلس اپنے ہوتوں سوتوں کا۔

مہری : حضور، اب ہم نوکری چھوڑ دیں گے۔ ہم سے یہ باتیں نہ سنی جائیں گی۔

عبّاسی : ایں، تم تو بے چاری ننھی ہو۔ ہمی گردن مارنے کے قابل ہیں! سچ ہے، اور کیا!

سپہر آرا : سارا قصور مہری کا ہے۔ یہی روز لڑا کرتی ہے عبّاسی سے۔

مہری : اے حضور، پیچ پی ہزار نعمت پائی! جو میں ہی جھگڑالو ہوں تو بسم اللہ، حضور لونڈی کو آزاد کر دیں۔ کوئی بات نہ چیت، آپ ہی گالی گفتے پر آمادہ ہو گئی۔

جہاں آرا : 'لڑیں گے جوگی جوگی اور جائے گی کھپڑوں کے ماتھے۔' اماں جان سن لیں گی تو ہم سب کی خبر لیں گی۔

عبّاسی : حضور ہی انصاف سے کہیں۔ پہل کس کی طرف سے ہوئی؟

جہاں آرا : پہل تو مہری نے کی۔ اس کے کیا معنی کہ تم جوان ہو، اس سے سستی چیز مل جاتی ہے؟ جس کو گالی دوگی، وہ برا مانے گی ہی۔

حسن آرا : مہری، تمھیں یہ سوجھی کیا؟ جوانی کا کیا ذکر تھا بھلا!

عبّاسی : حضور، میرا قصور ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

مہری : میرے اللہ، عورت کیا، بش کی گانٹھ ہے۔

عبّاسی : جو چاہو سو کہہ لو، میں ایک بات کا بھی جواب نہ دوں گی۔

مہری : اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر لگایا کرتی ہے۔ میں تو اس کی نس نس سے واقف ہوں۔

عبّاسی : اور میں تو تیری قبر تک سے واقف ہوں!

مہری : ایک کو چھوڑا، دوسرے کے گھر بیٹھی، اس کو کھایا، اب کسی اور کو چٹ کرے گی۔

اور باتیں کرتی ہے!

ستر...... کے بعد کچھ کہنے ہی کو تھی کہ عبّاسی نے سینکڑوں گالیاں سنائی اور ایسی جامے سے باہر ہوئی کہ دوپٹہ ایک طرف اور خود دوسری طرف۔ ہیرا مالی نے بڑھ کر دوپٹہ دیا تو کہا— چل ہٹ، اور سنو! اس موئے بوڑھے کی باتیں! اس پر قہقہہ پڑا۔ شور سنتے ہی بڑی بیگم صاحب، لاٹھی ٹیکتی ہوئی آ پہنچی، مگر یہ سب چہل میں مست تھیں۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

بڑی بیگم : یہ کیا شہدہ پن مچا تھا؟ بڑے شرم کی بات ہے۔ آخر کچھ کہو تو؟ یہ کیا دھا چوکڑی مچی تھی؟ کیوں مہری، یہ کیا شور مچا تھا؟

مہری : اے حضور، بات منھ سے نکلی اور عبّاسی نے ٹینٹوا لیا۔ اور کیا بتاؤں۔

بڑی بیگم : کیوں عبّاسی، سچ سچ بتاؤ! خبر دار!

عبّاسی : (رو کر) حضور!

بڑی بیگم : اب ٹیسوئے پیچھے بنانا پہلے ہماری بات کا جواب دو۔

عبّاسی: حضور، جہاں آرا بیگم سے پوچھ لیں، ہمیں آوارہ کہا، بیسوا کہا، کوسا، گالیاں دیں، جو زبان پر آیا، کہہ ڈالا۔ اور حضور، ان آنکھوں کی ہی قسم کھاتی ہوں، جو میں نے ایک بات کا بھی جواب دیا ہو۔ چپ سنا کی۔

بڑی بیگم : جہاں آرا کیا بات ہوئی تھی؟ بتاؤ صاف صاف۔

جہاں آرا : اماں جان، عبّاسی نے کہا ہم دو جھنجھریاں ایک آنے کو لائے اور مہری نے دو آنے دیے، اسی بات پر تکرار ہو گئی۔

بڑی بیگم : کیوں مہری، اس کے کیا معنی؟ کیا جوانوں کو بازار والے مفت اٹھا دیتے ہیں؟ بال سفید ہو گئے، مگر ابھی تک آوارہ پن کی بو نہیں گئی۔ ہم نے تم کو موقوف کیا مہری! آج ہی نکل جاؤ۔

اتنے میں موقع پا کر ہیرا نے سپہر آرا کو شہزادے کا خط دیا۔ سپہر آرا نے پڑھ کر یہ جواب لکھا— بھئی، تم تو غضب کے جلد باز ہو۔ شادی بیاہ بھی نگوڑا منھ کا نوالہ ہے! تمھاری طرف سے تو پیغام آتا ہی نہیں۔

ہیرا خط لے کر چل دیا۔

کوٹھے پر چوکا بچھا ہے اور ایک نازک پلنگ پر ثریّا بیگم سادی اور ہلکی پوشاک پہنے آرام سے لیٹی ہیں۔ ابھی حمام سے آئی ہیں۔ کپڑے عطر میں بسے ہوئے ہیں۔ اِدھر اُدھر پھولوں کے ہار اور گجرے رکھے ہیں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ مگر تب بھی مہری پنکھا لیے کھڑی ہے۔ اتنے میں ایک مہری نے آکر کہا— داروغہ جی حضور سے کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ بیگم صاحب نے کہا— اب اس وقت کون اٹھے۔ کہو، صبح کو آئیں۔ مہری بولی— حضور، کہتے ہیں، بڑا ضروری کام ہے۔ حکم ہوا کہ دو عورتیں چادر تانے رہیں اور داروغہ صاحب چادر کے اس پار بیٹھیں۔ داروغہ صاحب نے آکر کہا— حضور، اللہ نے بڑی خیر کی، خدا کو کچھ اچھا ہی کرنا منظور تھا۔ ایسے برے پھنسے تھے کہ کیا کہیں!

بیگم : ایں، تو کچھ کہوگے بھی؟

داروغہ : حضور، بدن کے روئیں کھڑے ہوتے ہیں۔

اس پر عبّاسی نے کہا— داروغہ جی، گھاس تو نہیں کھا گئے ہو! دوسری مہری بولی— حضور، سٹھیا گئے ہیں۔ تیسری نے کہا— بوکھلائے ہوئے آئے ہیں۔ داروغہ صاحب بہت جھلّائے۔ بولے— کیا قدر ہوتی ہے، واہ! ہماری سرکار تو کچھ بولتیں ہی نہیں اور مہریاں سر چڑھی جاتی ہیں۔ حضور اتنا بھی نہیں کہتین کہ بوڑھا آدمی ہے۔ اس سے نہ بولو۔

بیگم : تم تو سچ مچ دیوانے ہو گئے ہو۔ جو کہنا ہے، وہ کہتے کیوں نہیں؟

داروغہ : حضور، دیوانہ سمجھیں یا گدھا بنائیں، غلام آج کانپ رہا ہے۔ وہ جو آزاد ہیں، جو یہاں کئی بار آئے بھی تھے، وہ بڑے مکّار، شاہی چور، نامی ڈکیت، پرلے سرے کے بگڑے باز، کالے جواری، دھاوت شرابی، زمانے بھر کے بدمعاش، چھٹے ہوئے گرگے، ایک ہی شریر اور بد ذات آدمی ہیں۔ طوطی کا پنجڑا لے کر وہی عورت کے بھیش میں آیا تھا۔ آج سنا، کسی نواب کے یہاں بھی گئے تھے۔ وہ آزاد، جن کے دھوکے میں آپ ہیں، وہ تو روم گئے ہیں۔ ان کا اُن کا مقابلہ کیا! وہ عالم، فاضل، یہ بے ایمان بدمعاش۔ یہ بھی اس نے غلط کہا کہ حسن آرا بیگم کا بیاہ ہو گیا۔

بیگم : داروغہ، بات تو تم پتے کی کہتے ہو، مگر یہ باتیں تم سے بتائی کس نے؟

داروغہ : حضور، وہ چنڈو باز جو آزاد مرزا کے ساتھ آیا تھا۔ اسی نے مجھ سے بیان کیا۔

بیگم : اے ہے، اللہ نے بہت بچایا۔

مہری : اور باتیں کیسی چکنی چپڑی کرتا تھا؟

داروغہ صاحب چلے گئے تو بیگم نے چنڈو باز کو بلایا۔ مہریوں نے پردہ کرنا چاہا تو بیگم نے کہا— جانے بھی دو۔ بوڑھے کھوسٹ سے پردہ کیا؟

چنڈو باز : حضور، کچھ اوپر سو برس کا سن ہے۔

بیگم : ہاں، آزاد مرزا کا تو حال کہو۔

چنڈو باز : اس کے کاٹے کا منتر ہی نہیں۔

بیگم : تم سے کہاں ملاقات ہوئی؟

چنڈو باز : ایک دن راستے میں مل گئے۔

بیگم : وہ تو قید نہ تھے! بھاگے کیوں کر؟

چنڈو باز : حضور، یہ نہ پوچھیے، تین تین پہرے تھے۔ مگر خدا جانے، کس جادو منتر سے تینوں کو ڈھیر کر دیا اور بھاگ نکلا۔

بیگم : اللہ بچائے ایسے موذی سے۔

چنڈو باز : حضور، مجھے بھی خوب سبز باغ دیکھایا۔

مہری : اللہ جانتا ہے، میں اس کی آنکھوں سے تاڑ گئی تھی کہ بڑا نٹ کھٹ ہے۔

چنڈو باز : حصور، یہ کہنا تو بھول ہی گیا تھا کہ قید سے بھاگ کر تھانے دار کے مکان پر گیا اور اسے بھی قتل کر دیا۔

بیگم : سب آدمیوں میں سے نکل بھاگا؟

مہری : آدمی ہے کہ جنّات؟

عبّاسی : حضور، ہمیں آج ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو، ہمارے یہاں بھی چوری کرے۔

چنڈو باز رخصت ہو کر گئے تو ثریا بیگم سو گئیں۔ مہریاں بھی لیٹیں، مگر عبّاسی کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ مارے خوف کے اتنی ہمت بھی نہ باقی رہی کہ اٹھ کر پانی تو پیتی۔ پیاس سے تالو میں کانٹے پڑے تھے۔ مگر دبکی پڑی تھی۔ اسی وقت ہوا کے جھونکوں سے ایک کاغذ اڑ کر

اس کی چارپائی کے قریب کھڑکھڑایا تو دم نکل گیا۔

سپاہی نے آواز دی— 'سونے والے جاگتے رہو' اور یہ کانپ اٹھی۔ ڈر تھا، کوئی چمٹ نہ جائے۔ لاشیں آنکھوں تلے پھرتی تھیں۔ اتنے میں بارہ کا گجر ٹھناٹھن بجا۔ تب عبّاسی نے اپنے دل میں کہا، ارے، ابھی بارہ ہی بجے۔ ہم سمجھے تھے کہ سویرا ہو گیا۔ ایکایک کوئی وہاگ کی دھن میں گانے لگا—

سپہیا جاگت رہیو،

اس نگری کے دس دروازے نکل گیا کوئی اور۔

سپہیا جاگت رہیو۔

عبّاسی سنتے سنتے سوگئی، مگر تھوڑی ہی دیر میں ٹھناکے کی آواز آئی تو جاگ اٹھی۔ آدمی کی آہٹ معلوم ہوئی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اتنے میں بیگم صاحب نے پکارا— عبّاسی، پانی پلا۔ عبّاسی نے پانی پلایا اور بولی— حضور، اب کبھی لاشوں واشوں کا ذکر نہ کیجیے گا۔ میرا تو عجب حال تھا۔ ساری رات آنکھوں میں ہی کٹ گئی۔

بیگم : ایسا بھی ڈر کس کام کا، دن کو شیر، رات کو بھیڑ۔

بیگم صاحب سونے کو ہی تھیں کہ ایک آدمی نے پھر گانا شروع کیا۔

بیگم : اچھی آواز ہے۔

عبّاسی : پہلے بھی گا رہا تھا۔

مہری : ایں، یہ وکیل ہیں!

کچھ دیر تک تینوں باتیں کرتے کرتے سوگئیں۔ سویرے منھ اندھیرے مہری اٹھی تو دیکھا کہ بڑے کمرے کا تالا ٹوٹا پڑا ہے۔ دو صندوق ٹوٹے پھوٹے ایک طرف رکھے ہوئے ہیں اور اسباب سب تتر بتر۔ غل مچا کر کہا— ارے! لٹ گئی، ہائے لوگوں، لٹ گئی! گھر میں کہرام مچ گیا۔ داروغہ صاحب دوڑ پڑے۔ ارے، یہ کیا غضب ہوگیا۔ بیگم کی بھی نیند کھلی۔ یہ حالت دیکھی تو ہاتھ مل کر کہا— لٹ گئی! یہ شور غل سن کر پڑوسنیں غل مچاتی ہوئی کوٹھے پر آئیں اور بولیں— بہن، یہ بم چیخ کیسی ہے! یہ کیا ہوا؟ خیریت تو ہے!

بیگم : بہن، میں تو مر مٹی۔

پڑوسن : کیا چوری ہو گئی؟ دو بجے تک تو میں آپ لوگوں کی باتیں سنتی رہی۔ یہ چوری

کس وقت ہوئی؟

عبّاسی : بہن، کیا کہوں، ہائے!

پڑوسن : دیکھیے تو اچھی طرح۔ کیا کیا لے گیا، کیا کیا چھوڑ گیا؟

بیگم : بہن، کس کے ہوش ٹھکانے ہیں۔

عبّاسی : مجھ جلم جلی کو پہلے ہی کھٹکا ہوا تھا۔ کان کھڑے ہو گئے، مگر پھر کچھ سنائی نہ دیا۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا۔

داروغہ : حضور، یہ کسی شیطان کا کام ہے۔ پاؤں تو کھا ہی ڈالوں۔

مہری : جس ہاتھ سے صندوق توڑے، وہ کٹ کر گر پڑیں۔ جس پاؤں سے آیا اس میں کیڑے پڑیں۔ مرے گا بلک بلک کر۔

عبّاسی : اللہ کرے، اٹھوارے ہی میں کھٹیا مچپاتی نکلے۔

مہری : مگر عبّاسی، تم بھی ایک ہی کل جبھی ہو۔ وہی ہوا۔

ثریّا بیگم نے اسباب کی جانچ کی تو آدھے سے زیادہ غائب پایا۔ رو کر بولیں— لوگوں، میں کہیں کی نہ رہی۔ ہائے میرے ابا، دوڑو۔ تمھاری لاڈلی بیٹی آج لٹ گئی۔ ہائے میری اماں جان! ثریّا بیگم اب فقیرن ہو گئی۔

پڑوسن : بہن، ذرا دل کو ڈھارس دو۔ رونے سے اور ہلکان ہوگی۔

بیگم : قسمت ہی پلٹ گئی۔ ہائے!

پڑوسن : اے! کوئی ہاتھ پکڑ لو۔ سر پھوڑے ڈالتی ہیں۔ بہن، بہن! خدا کے واسطے سنو تو! دیکھو، سب مال مِلا جاتا ہے۔ گھبراؤ نہیں۔

اتنے میں ایک مہری نے غل مچا کر کہا— حضور، یہ جوڑی کڑے کی پڑی ہیں۔

عبّاسی : بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی۔

لوگوں نے صلاح دی کہ تھانے دار کو بلایا جائے، مگر ثریّا بیگم تو تھانے دار سے ڈری ہوئی تھیں، نام سنتے ہی کانپ اٹھیں اور بولیں— بہن، مال چاہے یہ بھی جاتا رہے، مگر تھانے والوں کو میں اپنی ڈیوڑھی نہ نا گھسنے دوں گی۔ داروغہ جی نے آنکھ اوپر اٹھائی تو دیکھا، چھت کٹی ہوئی ہے۔ سمجھ گئے کہ چور چھت کاٹ کر آیا تھا۔ ایکا ایک کئی کانسٹبل باہر آپہنچے۔ کب واردات ہوئی؟ نو دفعے تو ہم پکار گئے۔ بھیتر باہر سے تو برابر آواز آئی۔ پھر یہ چوری کب ہوئی؟

داروغہ جی نے کہا— ہم کو اس ٹائیں ٹائیں سے کچھ واسطہ نہیں ہے جی! آئے وہاں سے رعب جمانے! ٹکے کا آدمی اور ہم سے زبان ملاتا ہے۔ پڑے، پڑے سوتے رہے اور اس وقت تحقیقات کرنے چلے ہیں؟ ساٹھ ہزار کا مال گیا ہے۔ کچھ خبر بھی ہے!

کانسٹبل نے جب سنا کہ ساٹھ ہزار کی چوری ہوئی تو ہوش اڑ گئے۔ آپس میں یوں باتیں کرنے لگے—

1۔ ساٹھ ہزار! پچاس اور دوئی ساٹھ؟ کا ہے؟

2۔ پچاس دوئی ساٹھ نہیں، پچاس اور دس ساٹھ!

3۔ اجی خدا خدا کرو۔ ساٹھ ہزار۔ کیا نرے، جواہرات ہی تھے؟ ایسے کہاں کے سیٹھ ہیں!

داروغہ: سمجھا جائے گا، دیکھو تو سہی! تم سب کی سازش ہے۔

1۔ داروغہ، ترکیب تو اچھی کی۔ شاباش!

2۔ بیگم صاحب کے یہاں چوری ہوئی تو بلا سے۔ تمھاری تو ہانڈیاں چڑھ گئیں۔ کچھ ہمارا بھی حصہ ہے؟

اتنے میں تھانے دار صاحب آ پہنچے اور کہا، ہم موقع دیکھیں گے۔ پردہ کرایا گیا۔ تھانے دار صاحب اندر گئے تو بولے— اخواہ، اتنا بڑا مکان ہے! تو کیوں نہ چوری ہو؟

داروغہ: کیا؟ مکان اتنا بڑا دیکھا اور آدمی رہتے ہیں سو نہیں دیکھتے؟

تھانے دار: رات کو یہاں کون کون سویا تھا؟

داروغہ: عبّاسی، سب کے نام لکھوا دو۔

تھانے دار: بولو عبّاسی مہری، رات کو کس وقت سوئی تھیں تم؟

عبّاسی: حضور، کوئی گیارہ بجے آنکھیں لگیں۔

تھانے دار: ایک ایک بوٹی پھڑکتی ہے۔ صاحب کے سامنے نہ اتنا چمکنا۔

عبّاسی: یہ باتیں میں نہیں سمجھتی۔ چمکنا مٹکنا بازاری عورتیں جانیں۔ ہم ہمیشہ بیگموں میں رہا کیے ہیں۔ یہ اشارے کسی اور سے کیجیے۔ بہت تھانے داری کے بل پر نہ رہیے گا۔ دیکھا کہ گھر میں عورتیں ہی عورتیں تو پیٹ سے پاؤں نکالے۔

تھانے دار: تم تو جامے سے باہر ہوئی جاتی ہو۔

بیگم صاحب کمرے میں کھڑی کانپ رہی تھیں۔ ایسا نہ ہو، کہیں مجھے دیکھ لے۔ تھانے دار نے عبّاسی سے پھر کہا— اپنا بیان لکھواؤ۔

عبّاسی: ہم چارپائی پر سو رہے تھے کہ ایک بار آنکھ کھلی۔ ہم نے صراحی سے پانی انڈیلا اور بیگم صاحب کو پلایا۔

تھانے دار: جو چاہو، لکھوا دو۔ تم پر دروغ حلفی کا جرم نہیں لگ سکتا۔

عبّاسی: کیا ایمان چھوڑنا ہے؟ جو ٹھیک ٹھیک ہے وہ کیوں چھپائیں؟

عبّاسی نے انگلیاں مٹکا مٹکا کر تھانے دار کو اتنی کھری کھوٹی سنائیں کہ تھانے دار صاحب کی شیخی کرکری ہو گئی۔ داروغہ صاحب سے بولے— آپ کو کسی پر شک ہو تو بیان کیجیے۔ بے بھیدیے کے چوری نہیں ہو سکتی۔ داروغہ نے کہا— ہمیں کسی پر شک نہیں۔ تھانے دار نے دیکھا کہ یہاں رنگ نہ جمے گا تو چپکے سے رخصت ہوئے۔

(74)

خوجی آزاد کے باپ بن گئے تو ان کی عزّت ہونے لگی۔ ترکی قیدی ہر دم ان کی عزّت کرنے کو مستعد رہتے تھے۔ ایک دن ایک روسی فوجی افسر نے ان کی انوکھی صورت اور ماشے ماشے بھر کے ہاتھ دیکھے تو جی چاہا کہ ان سے باتیں کریں۔ ایک فارسی داں ترک کو مترجم بنا کر خواجہ صاحب سے باتیں کرنے لگا۔

افسر: آپ آزاد پاشا کے باپ ہیں؟

خوجی: باپ تو کیا ہوں، مگر خیر، باپ ہی سمجھیے۔ اب تو تمھارے پنجے میں پڑ کر چھکے چھوٹ گئے۔

افسر: آپ بھی کسی لڑائی میں شریک ہوئے تھے؟

خوجی: واہ، اور زندگی بھر کرتا کیا رہا؟ تم جیسا گوکھا افسر آج ہی دیکھا۔ ہمارا کینڈا ہی گواہی دیتا ہے کہ ہم فوج کے جوان ہیں۔ کینڈے سے نہیں پہچانتے؟ اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ دگلے والی پلٹن کے رسال دار تھے۔ آپ ہم سے پوچھتے ہیں، کوئی لڑائی دیکھی ہے؟ جناب، یہاں وہ وہ لڑائیاں دیکھیں ہیں کہ آدمی کی بھوک پیاس بند ہو جائے۔

افسر: آپ گولی چلا سکتے ہیں۔

خوجی : اجی حضرت، اب فصد کھلوایئے۔ پوچھتے ہیں، گولی چلائی ہے! ذرا سامنے آ جایئے تو بتاؤں۔ ایک بار ایک کتے سے اور ہم سے لاگ ڈاٹ ہوگئی۔ خدا کی قسم، ہم سے کتا گیارہ بارہ قدم پر پڑا تھا۔ دھر کے داغتا ہوں تو پوں پوں کرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا۔

افسر : او ہو! آپ خوب گولی چلاتا ہے۔

خوجی : اجی، تم ہم کو جوانی میں دیکھتے!

افسر نے ان کی بے تکی باتیں سن کر حکم دیا کہ دو نالی بندوق لاؤ۔ تب تو میاں خوجی چکرائے۔ سوچے کہ ہماری سات پیڑھیوں تک تو کسی نے بندوق چلائی نہیں اور نہ ہم کو یاد آتا ہے کہ بندوق کبھی عمر بھر چھوئی بھی ہو، مگر اس وقت تو آبرو رکھنی چاہیے۔ بولے— اس بندوق میں گز تو نہیں ہوتا؟

افسر : اڑتی چڑیا پر نشانہ لگا سکتے ہو؟

خوجی : اڑتی چڑیا کیسی! آسمان تک کے جانوروں کو بھون ڈالوں۔

افسر : اچھا تو بندوق لو۔

خوجی : تاک کر نشانہ لگاؤں تو درخت کی پتیاں گرا دوں۔

یہ کہہ کر آپ ٹہلنے لگے۔

افسر : آپ نشانہ کیوں نہیں لگاتا؟ اٹھایئے بندوق۔

خوجی نے زمین میں خوب زور سے ٹھوکر ماری اور ایک غزل گانے لگے۔ افسر دل میں خوب سمجھ رہا تھا کہ یہ آدمی محض ڈینگیں مارنا جانتا ہے۔ بولا— اب بندوق لیتے ہو یا اسی بندوق سے تم کو نشانہ بناؤں؟

خیر، بڑی دیر تک دل لگی رہی۔ افسر خوجی سے اتنا خوش ہوا کہ پہرے والوں کو حکم دے دیا کہ ان پر بہت سختی نہ رکھنا۔ رات کو خوجی نے سوچا کہ اب بھاگنے کی تدبیر سوچنی چاہیے ورنہ لڑائی ختم ہو جائے گی اور ہم نہ اِدھر کے رہیں گے اور نہ اُدھر کے۔ آدھی رات کو اٹھے اور خدا سے دعا مانگنے لگے کہ اے خدا! آج رات کو تو مجھے اس قید سے نجات دے دے۔ ترکوں کا لشکر نظر آئے اور میں غل مچا کر کہوں کہ ہم آپہنچے آپہنچے۔ آزاد سے بھی ملاقات ہو اور خوش خوش وطن چلیں۔

یہ دعا مانگ کر خوجی رونے لگے۔ ہائے، اب وہ دن کہاں نصیب ہوں گے کہ نوابوں

کے دربار میں گپ اڑا رہیں ہوں۔ وہ دل لگی، وہ چہل اب نصیب ہو چکی۔ کس مزے سے کٹی جاتی تھی اور کسی لطف سے گنڈیریاں چوستے تھے! کوئی کھٹیاں خریدتا ہے، کوئی قطارے چکاتا ہے۔ شورغل کی یہ کیفیت ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، مکھیوں کی بھن بھن ایک طرف، چھلکوں کا ڈھیر دوسری طرف، کوئی عورت چنڈوخانے میں آ گئی تو اور بھی چہل ہونے لگی۔

دو بجے خوجی باہر نکلے تو ان کی نظر چھوٹے سے ٹٹو پر پڑی۔ پہرے والے سو رہے تھے۔ خوجی ٹٹو کے پاس گئے اور اس کی گردن پر ہاتھ پھیر کر کہا— بیٹا، کہیں دغا نہ دینا۔ مانا کہ تم چھوٹے موٹے ٹٹو ہو اور خواجہ صاحب کا بوجھ تم سے نہ اٹھ سکے گا، مگر کچھ پرواہ نہیں، ہمتِ مَرداں مددے خدا۔ ٹٹو کو کھولا اور اس پر سوار ہو کر آہستہ آہستہ کیمپ سے باہر کی طرف چلے۔ بدن کانپ رہا تھا، مگر جب کوئی سو قدم کے فاصلے پر نکل گئے تو ایک سوار نے پکارا— کون جاتا ہے؟ کھڑا رہ!

ہم ہیں جی گراس کٹ، سرکاری گھوڑوں کی گھاس چھیلتے ہیں۔

سوار: اچھا تو چلا جا۔

خوجی جب ذرا دور نکل آئے تو دو چار بار خوب غل مچایا— مار لیا، مار لیا! خواجہ صاحب دو کروڑ روسیوں میں سے بے داغ نکل آتے ہیں۔ لو بھئی ترکوں، خواجہ صاحب آ پہنچے۔

اپنی فتح کا ڈنکا بجا کر خوجی گھوڑ سے اترے اور چادر بچھا کر سوئے تو ایسی میٹھی نیند آئی کہ عمر بھر نہ آئی تھی۔ گھڑی بھر رات باقی تھی کہ ان کی نیند کھلی۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوئے اور آگے چلے۔ دن نکلتے نکلتے انھیں ایک پہاڑ کے نزدیک ایک فوج ملی۔ آپ نے سمجھا، ترکوں کی فوج ہے۔ چلّا کر بولے— آ پہنچے، آ پہنچے! ارے یارو، دوڑو۔ خواجہ صاحب کے قدم دھو دھو کر پیو، آج خواجہ صاحب نے وہ کام کیا کہ رستم کے دادا سے بھی نہ ہو سکتا۔ دو کروڑ روسی پہرہ دے رہے تھے اور میں پینترے بدلتا ہوا دَن سے غائب، لکڑی ٹیکی اور اڑا۔ دو کروڑ روسی دوڑے، مگر مجھے پکڑ پانا دل لگی نہیں۔ کہہ دیا، لو ہم لمبے ہوتے ہیں، چوری سے انہیں چلے، ڈنکے کی چوٹ کہہ کر چلے۔

ابھی وہ یہ ہانک ہی لگا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور گھوڑے سے اتار لیا۔

خوجی : ایں، کون ہے بھئی؟ میں سمجھ گیا میاں آزاد ہیں۔

مگر آزاد وہاں کہاں، یہ روسیوں کی فوج تھی۔ اسے دیکھتے ہی خوجی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ روسیوں نے انھیں دیکھ کر خوب تالیاں بجائیں۔ خوجی دل ہی دل میں کٹے جاتے تھے، مگر بچنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ سپاہیوں نے خوجی کو چپتے جمانی شروع کیں۔ اُدھر دیکھا، اِدھر پڑی۔ خوجی بگڑ کر بولے — اچھا گیدی، اس وقت تو بے بس ہوں، اب کی پھنساؤ تو کہوں۔ قسم ہے اپنے قدموں کی، آج تک کبھی کسی کو نہیں ستایا۔ اور سب کچھ کیا، پتنگ اڑائے، بٹیر لڑائے، چنڈو پیا، افیم کھائی، چرس کے دم لگائے، مدک کے چھینٹے اڑائے مگر کس مردود نے کسی غریب کو ستایا ہو۔

یہ سوچ کر خوجی کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

ایک سپاہی نے کہا — بس، اب اس کو دق نہ کرو۔ پہلے پوچھ لو کہ یہ ہے کون آدمی۔ ایک بولا — یہ ترکی ہے، کپڑے کچھ بدل ڈالے ہیں۔ دوسرے نے کہا — یہ گوئندہ ہے، ہماری ٹوہ میں آیا ہے۔

اوروں کو بھی یہی شبہ ہوا۔ کئی آدمیوں نے خوجی کی تلاشی لی۔ اب خوجی اور سب اسباب تو دکھاتے ہیں مگر افیم کی ڈبیا نہیں کھولتے۔

ایک روسی : اس میں کون چیز ہے؟ کیوں تم اس کو کھولنے نہیں دیتے؟ ہم ضرور دیکھیں گے۔

خوجی : او گیدی، ماروں گا بندوق، دھواں اس پار ہو جائے گا۔ خبردار جو ڈبیا ہاتھ سے چھوئی! اگر تمھارا دشمن ہوں تو میں ہوں۔ مجھے چاہے مارو، چاہے قید کرو، پر میری ڈبیا میں ہاتھ نہ لگانا۔

روسیوں کو یقین ہو گیا کہ ڈبیا میں ضرور کوئی قیمتی چیز ہے۔ خوجی سے ڈبیا چھین لی۔ مگر اب ان میں آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ ایک کہتا تھا، ڈبیا ہماری ہے، دوسرا کہتا تھا، ہماری ہے۔ آخر یہ صلاح ہوئی کہ ڈبیا میں جو کچھ نکلے وہ سب آدمیوں میں برابر بانٹ دی جائے۔ غرض ڈبیا کھولی گئی تو افیم نکلی۔ سب کے سب شرمندہ ہوئے۔ ایک سپاہی نے کہا — اس ڈبیا کو دریا میں پھینک دو۔ اسی کے لیے ہم سے تلوار چلتے چلتے بچی۔

دوسرا بولا — اسے آگ میں جلا دو۔

خوجی : ہم کہہ دیتے ہیں ڈبیا ہمیں واپس کر دو، نہیں ہم بگڑ جائیں تو قیامت آ جائے گی۔ ابھی تم ہمیں نہیں جانتے!

سپاہیوں نے سمجھ لیا کہ یہ کوئی دیوانہ ہے، پاگل خانے سے بھاگ آیا ہے۔ انھوں نے خوجی کو ایک بڑے پنجڑے میں بند کر دیا۔ اب میاں خوجی کی سٹی پٹی بھول گئی۔ چلّا کر بولے— ہائے آزاد! اب تمھاری صورت نہ دیکھیں گے! خیر، خوجی نے نمک کا حق ادا کر دیا۔ اب وہ بھی قید کی مصیبتیں جھیل رہا ہے اور صرف تمھارے لیے۔ ایک بار ظالموں کے پنجے سے کسی طرح مار کوٹ کر نکل بھاگے تھے، مگر تقدیر نے پھر اسی قید میں لا پھنسایا۔ جواں مردوں پر ہمیشہ مصیبت آتی ہے، اس کا تو غم نہیں، غم تو اسی کا ہے کہ شاید اب تم سے ملاقات نہ ہوگی۔ خدا تمھیں خوش رکھے، میری یاد کرتے رہنا—

شاید وہ آئیں میرے جنازے پے دوستوں
آنکھیں کھلی رہیں میری دیدار کے لیے

(75)

میاں آزاد قازقوں کے ساتھ سائبیریا چلے جا رہے تھے۔ کئی دن کے بعد وہ ڈینیوب ندی کے کنارے جا پہنچے۔ وہاں ان کی طبیعت اتنی خوش ہوئی کہ ہری ہری دوب پر لیٹ گئے اور بڑی حسرت سے یہ غزل پڑھنے لگے—

رکھ دیا سر کو تیغِ قاتل پر
ہم گرے بھی تو جاکے منزل پر
آنکھ جب بسملوں میں اونچی ہو
سر گرے کٹ کے پائے قاتل پر
ایک دم بھی تڑپ سے چین نہیں
دیکھ لو ہاتھ رکھ کے تم دل پر

یہ غزل پڑھتے پڑھتے انھیں حسن آرہ کی یاد آ گئی اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ کاسک لوگوں نے سمجھایا کہ بھئی، اب وے باتیں بھول جاؤ، اب یہ سمجھو کہ تم وہ آزاد ہی نہیں ہو۔ آزاد کھل کھلا کر ہنسے اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ آپے میں نہیں ہو۔ قازقوں نے گھبرا کر انھیں

سنبھالا اور سمجھانے لگے کہ یہ وقت صبر سے کام لینے کا ہے۔ اگر ہوش و حواس ٹھیک رہے تو شاید کسی تدبیر سے واپس جا سکے ورنہ خدا ہی حافظ ہے۔ سائبیریا سے کتنے ہی قیدی بھاگ آتے ہیں، مگر تم تو ابھی سے ہمت ہارے دیتے ہو۔

اتنے میں وہ جہاز جس پر سوار ہو کر آزاد کو ڈینیوب کے پار جانا تھا، تیار ہو گیا۔ تب تو آزاد کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایسا تار بندھا کہ قازقوں کے بھی رومال تر ہو گئے۔ جس وقت جہاز پر سوار ہوئے دل قابو میں نہ رہا۔ رو رو کر کہنے لگے— حسن آرا، اب آزاد کا پتہ نہ ملے گا۔ آزاد اب دوسری دنیا میں ہیں، اب خواب میں بھی اس آزاد کی صورت نہ دیکھو گی جسے تم نے روم بھیجا۔

یہ کہتے کہتے آزاد بے ہوش ہو گئے۔ قازقوں نے ان کو عطر سونگھایا اور خوب پانی کے چھینٹے دیے تب جا کر کہیں ان کی آنکھیں کھلیں۔ اتنے میں جہاز اس پار پہنچ گیا تو آزاد نے روم کی طرف منھ کر کے کہا— آج سب جھگڑا ختم ہو گیا۔ اب آزاد کی قبر سائبیریا میں بنے گی اور کوئی اس پر رونے والا نہ ہوگا۔

قازقوں نے شام کو ایک باغ میں پڑاؤ ڈالا اور رات بھر وہیں آرام کیا۔ لیکن جب صبح کو کوچ کی تیاریاں ہونے لگی تو آزاد کا پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف ہلّڑ مچ گیا، اِدھر اُدھر سوار چھوٹے، پر آزاد کا پتہ نہ پایا۔ وہ بے چارے ایک نئی مصیبت میں پھنس گئے تھے۔

سویرے میاں آزاد کی آنکھ جو کھلی تو اپنے کو عجب حالت میں پایا۔ زور کی پیاس لگی ہوئی تھی، تالو سوکھا جاتا تھا، آنکھیں بھاری، طبیعت ست، جس چیز پر نظر ڈالتے تھے، دھندلی دیکھائی دیتی تھی۔ ہاں، اتنا البتہ معلوم ہو رہا تھا کہ ان کا سر کسی کے زانو پر ہے۔ مارے پیاس کے ہونٹ سوکھ گئے تھے، گو آنکھیں کھولتے تھے، مگر بات کرنے کی طاقت نہ تھی۔ اشارے سے پانی مانگا اور جب پیٹ بھر پانی پی چکے تو ہوش آیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک حسین عورت سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ عورت کیا حور تھی۔ آزاد نے کہا، خدا کے واسطے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ ہمیں کیسے یہاں پھانس لائی، میری تو کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا، قازق کہاں ہیں؟ ڈینیوب کہاں ہے؟ میں یہاں کیوں چھوڑ دیا گیا؟ کیا سائبیریا اسی مقام کا نام ہے؟ حسینہ نے آنکھوں کے اشارے سے کہا— صبر کرو، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ آپ ترکی ہیں یا فرانسیسی؟

آزاد: میں ہندی ہوں۔ کیا یہ آپ ہی کا مکان ہے؟

حسینہ: نہیں، میرا مکان پولینڈ میں ہے، مگر مجھے یہ جگہ پسند ہے۔ آیئے آپ کو مکان کی سیر کراؤں۔

آزاد نے دیکھا کہ پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی پر قیمتی پتھروں کی ایک کوٹھی بنی ہے۔ پہاڑ ڈھالو تھا اور اس پر ہری ہری گھاس لہرا رہی تھی۔ ایک میل کے فاصلے پر ایک پرانا گرجا کا سنہلا مینار چمک رہا تھا۔ اتر کی طرف ڈینیوب ندی عجب شان سے لہریں مارتی تھی۔ کشتیاں دریا میں آتی ہیں۔ روس کی فوجیں دریا کے پار جاتی ہیں۔ میڈھا ہوا سے الل رہا ہے۔ کوٹھی کے اندر گئے تو دیکھا کہ پہاڑ کو کاٹ کر دیواریں بنی ہیں۔ اس کی سجاوٹ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ چھت پر گئے تو ایسا معلوم ہوا کہ آسمان پر جا پہنچے۔ چاروں طرف پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں ہری ہری دوب سے لہرا رہی تھیں۔ قدرت کا یہ تماشہ دیکھ کر آزاد مست ہو گئے اور یہ شعر ان کی زبان سے نکلا—

لگی ہے مینہ کی جھڑی باغ میں چلو جھولیں
کہ جھولنے کا مزہ بھی اسی بہار میں ہے
یہ کون پھوٹ کے رویا کہ درد کی آواز
رچی ہوئی جو پہاڑوں کے آبشار میں ہے

حسینہ: مجھے یہ جگہ بہت پسند ہے۔ میں نے زندگی بھر یہیں رہنے کا ارادہ کیا ہے، اگر آپ بھی یہیں رہتے تو بڑے مزے سے زندگی کٹتی۔

آزاد: یہ آپ کی مہربانی ہے! میں تو لڑائی ختم ہو جانے کے بعد اگر چھوٹ سکا تو وطن چلا جاؤں گا۔

حسینہ: اس خیال میں نہ رہیے گا، اب اسی کو اپنا وطن سمجھیے۔

آزاد: میرا یہاں رہنا کئی جانوں کا گاہک ہو جائے گا۔ جس خاتون نے مجھے لڑائی میں شریک ہونے کے لیے یہاں بھیجا ہے، وہ میرے انتظار میں رو رو کر جان دے دے گی۔

حسینہ: آپ کی رہائی اب کسی طرح ممکن نہیں۔ اگر آپ کو اپنی جان کی محبت ہے تو وطن کا خیال چھوڑ دیجیے، ورنہ ساری زندگی سائبیریا میں کاٹنی پڑے گی۔

آزاد: اس کا کوئی غم نہیں، مگر قول جان کے ساتھ ہے۔

حسینہ: میں پھر سمجھائے دیتی ہوں۔ آپ پچھتائیں گے۔

آزاد: آپ کو اختیار ہے۔

یہ سنتے ہی اس عورت نے آزاد کو پھر قید خانے میں بھجوا دیا۔

اب میاں خوجی کا حال سنیے۔ روسیوں نے انھیں دیوانہ سمجھ کر جب چھوڑ دیا تو آپ ترکوں کی فوج میں پہنچ کر دون کی لینے لگے۔ ہم نے یوں روسیوں سے مقابلہ کیا اور یوں نیچا دیکھایا۔ ایک روسی پہلوان سے میری کشتی بھی ہو گئی، بہت بپھر رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ لنگوٹ کسا اور خدا کا نام لے کر تال ٹھونک کے اکھاڑے میں اتر پڑا، وہ بھی داؤں پیچ میں برق تھا اور ہاتھ پاؤں ایسے کہ کیا کہوں۔ میرے ہاتھ پاؤں سے بھی بڑے۔

ایک سپاہی: ایں، اجی ہم نہ مانیں گے۔ آپ کے ہاتھ پاؤں سے ہی ہاتھ پاؤں تو دیو کے بھی نہ ہوں گے!

خوجی: بس، جیوں ہی اس نے ہاتھ بڑھایا، میں نے ہاتھ باندھ لیا۔ پھر جو زور کرتا ہوں تو ہاتھ کھٹ سے الگ!

سپاہی: ارے، ہاتھ ہی توڑ ڈالے! بے چارے کو کہیں کا نہ رکھا!

خوجی: بس، پھر دوسرا آیا، میں نے گردن پکڑی اور انٹی دی، دھم سے گرا۔ تیسرا آیا، چپت جمائی اور دھر دبایا۔ چوتھا آیا، اڑنگا مارا اور دھم سے گرا دیا۔ پانچواں آیا اور میں نے مارے کرولیوں کے کچومر نکال لیا۔

سپاہی: آپ نے برا کیا۔ طاقتور لوگ کمزوروں پر رحم کیا کرتے ہیں۔

خوجی: تب کئی سوار توپیں لیے ہوئے آئے، مگر میں نے سب کو پٹکا۔ آخر کوئی ستر آدمی مل کر مجھ پر ٹوٹ پڑے تب جا کے کہیں میں گرفتار ہوا۔

سپاہی: بس، ستر ہی! ستر آدمیوں کو تو آپ پیس کر دھر دیتے۔ کم سے کم کوئی دو سو تو ضرور ہوں گے!

خوجی: جھوٹ نہ بولوں گا، مجھے سبھوں نے رکھا بڑی عزّت کے ساتھ، رات بھر تو میں وہیں رہا، سویرا ہوتے ہی کرولی لے کر للکارا کہ آ جاؤ جس کو آنا ہو، بندہ چلتا ہے۔ بس کوئی دو کروڑ روسی نکل پڑے— لینا لینا! ارے میں نے کہا کہ کس کا لینا اور کس کا دینا، آ جا جسے آنا ہو۔ خدا کی قسم جو کسی نے چوں بھی کی ہو۔ سب کے سب ڈر گئے۔

لوگ سمجھ گئے کہ نرا جانگلو ہے۔ خوجی نے یہی سمجھا کہ میں نے ان سبھوں کو الّو بنایا۔

دن بھر تو پینک لیتے رہے، شام کے وقت ہوا کھانے نکلے۔ اتفاق سے راہ میں ایک گدھا مل گیا۔ آپ فوراً گدھے پر سوار ہوئے اور ٹک ٹک کرتے چلے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک آدمی نے للکارا— روک لے گدھا، کہاں لیے جاتا ہے؟

خوجی : ہٹ جا سامنے سے۔

جوان : اتر گدھے سے۔ اترتا ہے یا میں دوں کھانے بھر کو؟

خوجی : تو نہیں چھوڑے گا، نکالوں کرولی پھر؟

آخر، اس جوان نے خوجی کو گدھے سے ڈھکیل دیا، تب آپ چور چور کا غل مچانے لگے۔ یہ غل سن کر دو چار آدمی آ گئے اور خوجی کو چپتے جمانے لگے۔

خوجی : تم لوگوں کی قضا آئی ہے، میں دُھن کے رکھ دوں گا۔

جوان : چپکے سے گھر کی راہ لو، ایسا نہ ہو، مجھے تمھاری کھوپڑی سہلانی پڑے۔

اتفاق سے ایک ترکی سوار کا اس طرف سے گزر ہوا۔ خوجی نے چلا کر کہا— دوہائی ہے سرکار کی! یہ ڈاکو مارے ڈالتے ہیں۔

سوار نے خوجی کو دیکھ کر پوچھا — تم یہاں کہاں؟

خوجی : یہ لوگ مجھے ترکوں کا دوست سمجھ کر مارے ڈالتے ہیں۔

سوار نے ان آدمیوں کو ڈانٹا اور اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ خوجی شیر ہو گئے۔ ایک کے کان پکڑے اور کہا، آگے چل، دوسرے پر چپت جمائی اور کہا، پیچھے چل۔

اس طرح خوجی نے ان بے چاروں کو بری گتی بنائی، مگر پڑاؤ پر پہنچ کر انھیں چھوڑ دیا۔

جب سب لوگ کھا کر لیٹے تو خوجی نے پھر ڈینگ مارنی شروع کی۔ ایک بار میں دریا نہانے گیا تو بیچو بیچ میں جا کر ایسا غوطہ لگایا کہ تین دن پانی سے باہر نہ ہوا۔

ایک سپاہی : تب تو آپ یوں کہیے کہ آپ غوطہ خوروں کے استاد ہیں! کل ذرا ہمیں بھی غوطہ لے کر دیکھایئے۔

خوجی : ہاں ہاں، جب کہو۔

سپاہی : اچھا تو کل کی رہی۔

خوجی نے سمجھا، یہ سب رعب میں آ جائیں گے۔ مگر دِے ایک چھٹے گُرگے۔ دوسرے

دن ان سبھوں نے خوجی کو ساتھ لیا اور دریا نہانے کو چلے۔ پڑاؤ سے دریا صاف نظر آتا تھا۔ خوجی کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھاگنے ہی کو تھے کہ ایک آدمی نے روک لیا اور دو ترکوں نے ان کے کپڑے اتار لیے۔ خوجی کی یہ کیفیت تھی کہ کلیجہ تھر تھر کانپ رہا تھا، مگر زبان سے نہ بات نکلتی تھی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اب گلا نہ چھوٹے گا تو منتیں کرنے لگے— بھائیوں، میری جان کے کیوں دشمن ہوئے ہو؟ ارے یارو، میں تمھارا دوست ہوں، تمھارے سبب سے اتنی زحمت اٹھائی، قید ہوا اور اب تم لوگ ہنسی ہنسی میں مجھے ڈبا دینا چاہتے ہو۔ غرض خوجی بہت گڑگڑائے مگر ترکوں نے ایک نہ مانی۔ خوجی منتیں کرتے کرتے تھک گئے تو کوسنے لگے— خدا تجھ سے سمجھے! یہاں کوئی افسر بھی نہیں۔ نہ ہوئی کرولی، نہیں اس وقت جیتا چنوا دیتا۔ خدا کرے، تمھارے اوپر بجلی گرے۔ سب کے سب کپڑے اتار لیے، گویا ان کے باپ کا مال تھا۔ اچھا گیدی، اگر جیتا بچا تو سمجھ لوں گا۔ مگر دل لگی بازوں نے اتنے غوطے دیے کہ بے دم ہو گئے اور ایک غوطہ کھا کر ڈوب گئے۔

(76)

آزاد کو سائبیریا بھیج کر مس کلاریسا اپنے وطن کو روانہ ہوئی اور راستے میں ایک ندی کے کنارے پڑاؤ کیا۔ وہاں کی آب و ہوا اس کو ایسی پسند آئی کہ کئی دن تک اسی پڑاؤ پر شکار کھیلتی رہی۔ ایک دن مس کلاریسا نے صبح کو دیکھا کہ اس کے خیمے کے سامنے ایک دوسرا بہت بڑا خیمہ لگا ہوا ہے۔ حیرت ہوئی کہ یا خدا، یہ کس کا سامان ہے۔ آدھی رات کا سناٹا تھا، ایکا ایک خیمے کہاں سے آ گئے، ایک عورت کو بھیجا کہ جا کر پتہ لگائے کہ یہ لوگ کون ہیں۔ وہ عورت جو اس کھیمے میں گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ ایک جواہر نگار تخت پر ایک حوروں کو شرمانے والی شہزادی بیٹھی ہوئی ہے۔ دیکھتے ہی دنگ ہو گئی۔ جا کر مس کلاریسا سے بولی— حضور، کچھ نہ پوچھیے، جو کچھ دیکھا، اگر خواب نہیں تو جادو ضرور ہے۔ ایسی عورت دیکھی کہ پری بھی اس کی بلائیں لیں۔

کلاریسا: تم نے کچھ پوچھا بھی کہ ہیں کون؟

لونڈی: حضور، مجھ پر تو ایسا رعب چھایا کہ منہ سے بات ہی نہ نکلی۔ ہاں، اتنا معلوم ہوا کہ ایک رئیس زادی ہیں اور سیر کرنے کیے لیے آئی ہیں۔

اتنے میں وہ عورت خیمے سے باہر نکل آئی۔ کلاریسا نے جھک کر اس کو سلام کیا اور چاہا کہ بڑھ کر ہاتھ ملائے۔ مگر اس نے کلاریسا کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھ کر منھ پھیر لیا۔ یہ کوہ قاف کی پری مئیڈا تھی۔ جب سے اسے معلوم ہوتا تھا کہ کلاریسا نے آزاد کو سائبیریا بھجوا دیا ہے، وہ اس کے خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ اس وقت کلاریسا کو دیکھ کر اس کے دل نے کہا کہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا، مگر پھر سوچی کہ پہلے نرمی سے پیش آؤں۔ باتوں باتوں میں سارا ماجرا کہہ سناؤں، شاید کچھ پسیجے۔

کلاریسا: تم یہاں کیا کرنے آئی ہو؟

مئیڈا: مصیبت کھینچ لائی ہے، اور کیا کہوں۔ لیکن آپ یہاں کیسے آئی؟

کلاریسا: میرا بھی وہی حال ہے۔ وہ دیکھیے، سامنے جو قبر ہے اسی میں وہ دفن ہے جس کی موت نے میری زندگی کو موت سے بدتر بنا دیا ہے۔ ہائے! اس کی پیاری صورت میری نگاہ کے سامنے ہے، مگر میرے سوا کسی کو نظر نہیں آتی۔

مئیڈا: میں بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ جس جوان کو دل دیا، جان دی، ایمان دیا، وہ اب نظر نہیں آتا، اس کو ایک ظالم باغبان نے باغ سے جدا کر دیا، خدا جانے، وہ غریب کن جنگلوں میں ٹھوکریں کھاتا ہوگا۔

کلاریسا: مگر تمھیں یہ تسکین تو ہے کہ تمھارا یار زندہ ہے اور کبھی نہ کبھی اس سے ملاقات ہوگی۔ میں تو اس کے نام کو رو چکی۔ میرے اور اس کے ماں باپ شادی کرنے پر راضی تھے، ہم خوش تھے کہ دل کی مرادیں پوری ہوں گی، مگر شادی کے ایک ہی دن پہلے آسمان ٹوٹ پڑا، میرے پیارے کو فوج میں شریک ہونے کا حکم ملا۔ میں نے سنا تو جان سی نکل گئی۔ لاکھ سمجھایا، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ جس روز یہاں سے روانہ ہوا، میں نے خوب ماتم کیا اور رخصوت ہوئی۔ یہاں رات دن اس کی جدائی میں تڑپا کرتی تھی، مگر اخباروں میں لڑائی کے حال پڑھ کر دل کو تسلی دیتی تھی۔ ایکاایک اخبار میں پڑھا کہ اس کی ایک ترکی پاشا سے تلوار چلی، دونوں زخمی ہوئے، پاشا تو بچ گیا، مگر وہ بے چارہ جان سے مارا گیا۔ اس پاشا کا نام آزاد ہے۔ یہ خبر سنتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا، دل میں ٹھان لیا کہ اپنے پیارے کے خون کا بدلہ آزاد سے لوں گی۔ یہ طے کر کے یہاں سے چلی اور جب آزاد میرے ہاتھوں سے بچ گیا تو میں نے اسے سائبیریا بھیجوا دیا۔

میڈا یہ سن کر بے ہوش ہو گئی۔

(77)

جس وقت خوجی نے پہلا غوطہ کھایا تو ایسے الجھے کہ ابھرنا مشکل ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر میں ترکوں نے غوطے لگا کر انھیں ڈھونڈ نکالا۔ آپ کسی قدر پانی پی گئے تھے۔ بہت دیر تک تو ہوش ہی ٹھکانے نہ تھے۔ جب ذرا ہوش آگیا تو سب کو ایک سرے سے گالیاں دینا شروع کیں۔ سوچے کہ دو ایک روز میں ذرا ٹانٹھا ہو لوں تو ان سے خوب سمجھوں۔ ڈیرے پر آکر آزاد کے نام خط لکھنے لگے۔ ان سے ایک آدمی نے کہہ دیا تھا کہ اگر کسی آدمی کے نام خط بھیجنا ہو اور پتہ نہ ملتا ہو تو خط کو پتوں میں لپیٹ دریا کے کنارے کھڑا ہو اور تین بار 'بھیجو، بھیجو' کہہ کر خط کو دریا میں ڈال دے، خط آپ ہی آپ پہنچ جائے گا۔ خوجی کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی۔ آزاد کے نام ایک خط لکھ کر دریا میں ڈال آئے۔ اس خط میں آپ نے اپنی بہادری کے کاموں کی خوب ڈینگیں ماری تھیں۔

رات کا وقت تھا، ایسے اندھریا چھایا ہوا تھا، گویا تاریکی کا دل سویا ہو۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اتنے زور سے چلتے تھے کہ روح تک کانپ جاتی تھی۔ ایکاایک روس کی فوج کے نقارے کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ دونوں طرف کے لوگ لڑنے کو تیار ہیں۔ خوجی گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور سوچنے لگے کہ یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں؟ اتنے میں ترکی فوج بھی تیار ہو گئی اور دونوں فوجیں دریا کے کنارے جمع ہو گئیں۔ خوجی نے دریا کی صورت دیکھی تو کانپ اٹھے۔ کہا۔ اگر خشکی کی لڑائی ہوتی تو ہم بھی آج جوہر دکھاتے۔ یوں تو سب افسر اور سپاہی للکار رہے تھے، مگر خوجی کی امنگیں سب سے بڑھی ہوئی تھیں۔ چلّا چلّا کر دریا سے کہہ رہے تھے کہ اگر تو خشک ہو جائے تو میں پھر مزہ دکھلاؤں۔ ایک ہاتھ میں پرے کے پرے کاٹ کر رکھ دوں۔

گولہ چلنے لگا۔ ترکوں کی طرف سے ایک انجنیر نے کہا کہ یہاں سے آدھ میل کے فاصلے پر کشتیوں کا پل باندھنا چاہیے۔ کئی آدمی دوڑائے گئے کہ جا کر دیکھیں، روسیوں کی فوجیں کس کس مقام پر ہیں۔ انھوں نے آکر بیان کیا کہ ایک کوس تک روسیوں کا نام و نشان نہیں ہے۔ فوراً پل بنانے کا انتظام ہونے لگا۔ یہاں سے ڈیڑھ کوس پر پینتیس کشتیاں موجود

تھیں۔ افسر نے حکم دیا کہ ان کشتیوں کو یہاں لایا جائے۔ اسی دم دو سوار گھوڑے کڑکڑاتے ہوئے آئے۔ ان میں سے ایک خوجی تھے۔

خوجی : پینتیس کشتیاں یہاں سے آدھے کوس مستعد ہیں۔ میں نے سوچا، جب تک سوار تمھارے پاس پہنچیں گے اور تم حکم دو گے کہ کشتیاں آئیں تو تب تک یہاں خدا جانے کیا ہو جائے، اس لیے ایک سوار کو لے کر فوراً کشتیوں کو ادھر لے آیا۔

فوج کے افسر نے یہ سنا تو خوجی کی پیٹھ ٹھونک دی اور کہا— شاباش اس وقت تو تم نے ہماری جان بچا دی۔

خوجی اکڑ گئے۔ بولے— جناب، ہم کچھ ایسے ویسے نہیں! آج ہم دکھا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔ ایک ایک کو چن چن کر ماروں!

اتنے میں انجینیروں نے پھرتی کے ساتھ کشتی کا پل باندھنے کا انتظام کیا۔ جب پل تیار ہو گیا تو افسر نے کچھ سواروں کو اس پار بھیجا۔ خوجی بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔ جب پل کے بیچ میں پہنچے تو ایک دفع غل مچایا— اور گیدی، ہم آ پہنچے۔

ترکوں نے ان کا منھ دبایا اور کہا— چپ!

اتنے میں ترکوں کا دستہ اس پار پہنچ گیا۔ روسیوں کو کیا خبر تھی کہ ترک لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ اِدھر خوجی جوش میں آ کر تین چار ترکوں کو ساتھ لے دریا کے کنارے کنارے گھٹنوں کے بل چلے۔ جب ان کو معلوم ہو گیا کہ روسی فوج تھک گئی تو ترکوں نے ایک دم سے دھاوا بول دیا۔ روسی گھبرا اٹھے۔ آپس میں صلاح کی کہ اب بھاگ چلیں۔ خوجی بھی گھوڑے پر سوار تھے، روسیوں کو بھاگتے دیکھا تو گھوڑے کو ایک ایڑ دی اور بھاگتے سپاہیوں میں سے سات آدمیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ ترکی فوج میں واہ واہ کا شور مچ گیا۔ خواجہ صاحب اپنی تعریف سن کر ایسے خوش ہوئے کہ پرے میں گھس گئے اور گھوڑے بڑھا بڑھا کر تلوار پھینکنے لگے۔ دم کے دم میں روسی سواروں سے میدان خالی کر دیا۔ ترکی فوج میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ خواجہ صاحب کے نام فتح لکھی گئی۔ اس وقت ان کے دماغ ساتویں آسمان پر تھے۔ اکڑے کھڑے تھے۔ بات بات پر بگڑتے تھے۔ حکم دیا— فوج کے جنرل سے کہو، آج ہم ان کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ کھانا کھانے بیٹھے تو منھ بنایا، واہ! اتنے بڑے افسر اور یہ کھانا! نہ میٹھے چاول، نہ فرنی، نہ پلاؤ۔ کھانا کھاتے وقت اپنی بہادری کی کتھا کہنے لگے— واللہ، سبھوں

کے حوصلے پست کر دیے۔ خواجہ صاحب ہیں کہ باتیں! میرا نام سنتے ہی دشمنوں کے کلیجے کانپ گئے۔ ہمارا وار کوئی روک لے تو جانیں۔ برسوں مصیبتیں جھیلیں ہیں تب جاکے اس قابل ہوئے کہ روسیوں کے لشکر میں اکیلے گھس پڑے! اور ہمیں ڈر کس کا ہے؟ بہشت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

افسر: ہم نے وزیرِ جنگ سے درخواست کی ہے کہ تم کو اس بہادری کا انعام ملے۔

خوجی: اتنا ضرور لکھنا کہ یہ آدمی دگلے والی پلٹن کا رسال دار تھا۔

افسر: دگلے والی پلٹن کیسی؟ میں نہیں سمجھا۔

خوجی: تمھارے مارے ناک میں دم ہے اور تم ہندی کی چندی نکالتے ہو۔ اودھ کا حال معلوم ہے یا نہیں؟ اودھ سے بڑھ کر دنیا میں اور کون بادشاہت ہوگی؟

افسر: ہم نے اودھ کا نام نہیں سنا۔ آپ کو کوئی خطاب ملے تو آپ پسند کریں گے؟

خوجی: واہ، نیکی اور پوچھ پوچھ!

اس دن سے ساری فوج میں خوجی کی دھوم مچ گئی۔ ایک دن روسیوں نے ایک پہاڑی پر سے ترکوں پر گولے اتارنے شروع کیے۔ ترک لوگ آرام سے لیٹے ہوئے تھے۔ ایکاایک توپ کی آواز سنی تو گھبرا گئے۔ جب تک مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں تب تک ان کے کئی آدمی کام آئے۔ اس وقت خوجی نے اپنے سپاہیوں کو للکارا، تلوار کھینچ کر پہاڑی پر چڑھ گئے اور کئی آدمیوں کو زخمی کیا، اس سے ان کی اور بھی دھاک بیٹھ گئی۔ جسے دیکھو، انھیں کی تعریف کر رہا تھا۔

ایک سپاہی: آپ نے آج وہ کام کیا ہے کہ رستم سے بھی نہ ہوتا۔ اب آپ کے واسطے کوئی خطاب تجویز آجائے گا۔

خوجی: میرا آزاد آجائے تو میری محنت ٹھکانے لگے، ورنہ سب ہیچ ہے۔

افسر: جس وقت تم گھوڑے سے گرے، میرے ہوش اڑ گئے۔

خوجی: گرتے ہی سنبھل بھی گئے تھے۔

افسر: چت گرے تھے؟

خوجی: جی نہیں۔ پہلوان جب گرے گا، پٹ گرے گا۔

افسر: ذرا سا تو آپ کا قد ہے اور اتنی ہمّت!

خوجی : کیا کہا، ذرا سا قد، کسی پہلوان سے پوچھیے۔ کتنی ہی کشتیاں جیت چکا ہوں۔
افسر : ہم سے لڑیے گا؟
خوجی : آپ ایسے دس ہوں تو کیا پروا؟
فوج کے افسر نے اسی دن وزیر جنگ کے پاس خوجی کی سفارش لکھ بھیجی۔

(78)

خوجی تھے تو مسخرے، مگر وفادار تھے۔ انھیں ہمیشہ آزاد کی دھن سوار رہتی تھی۔ بار بار یاد کیا کرتے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ آزاد کو پولینڈ کی شہزادی نے قید کر دیا ہے تو وہ آزاد کو کھوجنے نکلے۔ پوچھتے پوچھتے کسی طرح آزاد کے قید خانے تک پہنچ ہی تو گئے۔ آزاد نے انھیں دیکھتے ہی گود میں اٹھا لیا۔

خوجی : آزاد، آزاد، ارے میاں، تم کون ہو؟

آزاد : او ہو ہو!

خوجی : بھائی جان، تم بھوت ہو یا پریت، ہمیں چھوڑ دو۔ میں اپنے آزاد کو ڈھونڈنے جاتا ہوں۔

آزاد : پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کیسے پہنچے؟

خوجی : سب بتلائیں گے، مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ تمھاری یہ گتی کیسی ہو گئی۔

آزاد نے ساری باتیں خوجی کو سمجھائیں، تو آپ نے کہا— واللہ، نرے گاؤدی ہو۔ ارے بھائی جان، تمھاری جان کے لالے پڑنے ہیں، تم کو چاہیے کہ جس طرح ممکن ہو، شہزادی کو خوش کرو، تم کو تو یہ دکھانا چاہیے کہ شہزادی کو چھوڑ کر کہیں جاؤ گے ہی نہیں۔ خوب عشق جتاؤ، تب کہیں تمھارا اعتبار ہوگا۔

آزاد : ہو سڑی تو کیا ہوا، مگر بات ٹھکانے کی کرتے ہو، مگر یہ تقریر کون کرے؟

خوجی : اور ہم آئے کیا کرنے ہیں؟

یہ کہہ کر آپ شہزادی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے ان کی صورت دیکھی تو ہنس پڑی۔ میاں خوجی سمجھے کہ ہم پر ریجھ گئی۔ بولے— کیا لڑواؤ گی کیا؟ آزاد سنے گا تو بگڑ اٹھے گا۔ مگر واہ رے میں! جس نے دیکھا، وہی ریجھا اور یہاں یہ حال ہے کہ کسی سے بولتے

تک نہیں۔ ایک ہو تو بولوں، چار نکاح تک تو جائز ہے، مگر جب اِندر کا اکھاڑا پیچھے پڑ جائے تو کیا کروں؟

شہزادی : ذرا بیٹھ تو جایئے۔ یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں بیٹھی رہوں اور آپ کھڑے رہیں۔

خوجی : پہلے یہ بتاؤ کہ جہیز کیا دوگی؟

عربن : اور اکڑتے کس برتے پر ہو۔ سوکھی ہڈیوں پر یہ غرور؟

خوجی : تم پہلوانوں کی باتیں کیا جانو۔ یہ چور بدن کہلاتا ہے، ابھی اکھاڑے میں اتر پڑوں تو پھر کیفیت دیکھو۔

عربن : ٹینی مرغ کے برابر تو آپ کا قد ہے اور دعویٰ اتنا لمبا چوڑا!

خوجی : تم گنوارن ہو، یہ باتیں کیا جانو۔ تم قد کو دیکھا چاہو اور یہاں لمبے آدمی کو لوگ بیوقوف کہتے ہیں۔ شیر کو دیکھو، اور اونٹ کو دیکھو۔ مصر میں ایک بڑے گرانڈیل جوان کو پٹکنی بتائی۔ مارا چاروں شانے چت۔ اٹھ کر پانی بھی نہ مانگا۔

خیر، بہت کہنے سننے سے آپ کرسی پر بیٹھے تو دونوں ٹانگیں کرسی پر رکھ لی اور بولے— اب جہیز کا حال بتاؤ۔ لیکن میں ایک شرط سے شادی کروں گا، ان سب لونڈیوں کو محل بنواؤں گا اور ان کے اچھے اچھے نام رکھوں گا۔ طاؤس محل، گلاب محل......۔

شہزادی : تو آپ اپنی شادی کے پھیر میں ہیں، یہ کہیے۔

خوجی : ہنستی آپ کیا ہیں۔ اگر ہمارا کرتب دیکھنا ہو تو کسی پہلوان کو بلاؤ۔ اگر ہم کشتی نکالیں تو شادی منظور؟

شہزادی نے ایک موٹی تازی حبشن کو بلایا۔ خوجی نے آنکھ اوپر اٹھائی تو دیکھتے ہیں کہ ایک کالی کلوٹی دیونی ہاتھ میں ایک موٹا سوٹا لیے چلی آتی ہے۔ دیکھتے ہی ان کے ہوش اڑ گئے۔ حبشن نے آتے ہی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ان کی جان نکل گئی۔ بولے— ہاتھ ہٹاؤ۔

حبشن : دم ہو تو ہاتھ ہٹا دو۔

خوجی : میرے منہ نہ لگنا، خبردار!

حبشن نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور مروڑنے لگی۔ خوجی جھلا جھلا کر کہتے تھے، ہاتھ چھوڑ

دے۔ ہاتھ ٹوٹا تو بری طرح پیش آؤں گا، مجھ سے برا کوئی نہیں۔

حبشن نے ہاتھ چھوڑ کر ان کے دونوں کان پکڑے اور اٹھایا تو زمین سے چھ انگل اونچے؟

حبشن : کہو، شادی پر راضی ہو یا نہیں؟

خوجی : عورت سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اس کے منھ کون لگے!

اس پر حبشن نے خواجہ صاحب کو گود میں اٹھایا اور لے چلی۔ انھوں نے سینکڑوں گالیاں دیں — خدا تیرا گھر خراب کرے، تم پر آسمان ٹوٹ پڑے، دیکھو، میں کہے دیتا ہوں کہ پیس ڈالوں گا۔ میں صرف اس سبب سے نہیں بولتا کہ مرد ہو کر عورت ذات سے کیا بولوں۔ کوئی پہلوان ہوتا تو میں ابھی سمجھ لیتا، اور سمجھاتا کیا؟ مارتا چاروں شانے چت۔

عربن : خیر، دل لگی تو ہو چکی، اب یہ بتاؤ کہ آزاد سے تم نے کیا کہا؟ وہ تو آپ کے دوست ہیں۔

خوجی : اوں ہوں، تم کو کسی نے بہکا دیا، وہ دوست نہیں، لڑکے ہیں۔ میں نے اس کے نام ایک خط لکھا ہے، لے جاؤ اور اس کا جواب لاؤ۔

عربن آپ کا خط لے کر آزاد کے پاس پہنچی اور بولی — حضور، آپ کے والد نے اس خط کا جواب مانگا ہے۔

آزاد : کس نے مانگا ہے؟ تم نے یہ کون لفظ کہا؟

عربن : حضور کے والد نے...... وہ جو ٹھیگنے سے آدمی ہیں۔

آزاد : وہ سور، میرے گھر کا غلام ہے۔ وہ مسخرہ ہے۔ ہم اس کے خط کا جواب نہیں دیتے۔

عربن نے آکر خوجی سے کہا — آپ کا خط پڑھ کر آپ کے لڑکے بہت ہی خفا ہوئے۔

خوجی : نالائق ہے کپوت، جی چاہتا ہے، اپنا سر پیٹ لوں۔

شہزادی نے کہا — جا کر آزاد پاشا کو بلا لاؤ۔ اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔

ذرا دیر میں آزاد آ پہنچے۔ خوجی انھیں دیکھ کر سٹپٹا گئے۔

ادھر تو شہزادی خوجی کے ساتھ یوں مذاق کر رہی تھی۔ اُدھر ایک لونڈی نے آکر کہا —

حضور، دو سوار آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہزادی کو بلاؤ۔ ہم نے بہت کہا کہ شہزادی صاحب کو آج فرصت نہیں ہے، مگر وہ نہیں سنتے۔

شہزادی نے خوجی سے کہا کہ باہر جا کر ان سواروں سے پوچھو کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ خوجی نے جا کر ان دونوں کو خوب غور سے دیکھا اور بولے— حضور، مجھے تو رئیس زادے معلوم ہوتے ہیں۔ شہزادی نے جا کر شہزادوں کو دیکھا تو آزاد بھول گئے۔ انھیں ایک دوسرے محل میں ٹھہرایا اور نوکروں کو تاکید کر دی کہ ان مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ آزاد تو اس خیال میں بیٹھے کہ شہزادی آتی ہوگی اور شہزادی نئے مہمانوں کی خاطر داری کا انتظام کر رہی تھی۔ لونڈیاں بھی چل دیں، خوجی اور آزاد اکیلے رہ گئے۔

آزاد: معلوم ہوتا ہے، ان دونوں لونڈوں کو دیکھ کر لٹو ہو گئی۔

خوجی: تم سے تو پہلے ہی کہتے تھے، مگر تم نے نہ مانا۔ اگر شادی ہو گئی ہوتی تو مذاق تھی کہ غیروں کو اپنے گھر میں ٹھہراتی۔

آزاد: جی چاہتا ہے، اسی وقت چل کر دونوں کے سر اڑا دوں۔

خوجی: یہی تو تم میں بری عادت ہے۔ ذرا صبر سے کام لو، دیکھو کیا ہوتا ہے۔

(79)

ان دونوں شہزادوں میں ایک نام مسٹر کلارک تھا اور دسرے کا ہنری۔ دونوں کی اٹھتی جوانی تھی۔ نہایت خوبصورت۔ شہزادی دن کے دن انھیں کے پاس بیٹھی رہتی، ان کی باتیں سننے سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ میاں آزاد تو مارے جلن کے اپنے محل سے نکلتے ہی نہ تھے۔ مگر خوجی ٹوہ لینے کے لیے دن میں کئی بار یہاں آ بیٹھتے تھے۔ ان دونوں کو بھی خوجی کی باتوں میں بڑا مزہ آتا۔

ایک دن خوجی دونوں شہزادوں کے پاس گئے، تو اتفاق سے شہزادی وہاں نہ تھی۔ دونوں شہزادوں نے خوجی کی بڑی خاطر کی۔ ہنری نے کہا— خواجہ صاحب، ہم کو پہچانا؟

یہ کہہ کر اس نے ٹوپ اتار دیا۔ خوجی چونک پڑے۔ یہ میڈا تھیں۔ بولے— مس میڈا، خوب ملیں۔

میڈا: چپ چپ! شہزادی نہ جان نے پائے۔ ہم دونوں اسی لیے آئے ہیں کہ آزاد کو

یہاں سے چھڑا لے جائیں۔

خوجی : اچھا، کیا یہ بھی عورت ہے؟

مئیڈا : یہ وہی عورت ہیں جو آزاد کو پکڑ لے گئی تھیں۔

خوجی : اخواہ، مس کلاریسا! آپ تو اس قابل ہیں کہ آپ کا بایاں قدم لے۔

مئیڈا : اب یہ بتاؤ کہ یہاں سے چھٹکارا پانے کی بھی کوئی تدبیر ہے؟

خوجی : ہاں، وہ تدبیر بتاؤں کہ کبھی پٹ ہی نہ پڑے۔ یہ شہزادی بڑی پینے والی ہے، اسے خوب پلاؤ اور جب بے ہوش ہو جائے تو لے اڑو۔

خوجی نے جا کر آزاد سے یہ قصہ کہا۔ آزاد بہت خوش ہوئے۔ بولے— میں تو دونوں کی صورت دیکھتے ہی تاڑ گیا تھا۔

خوجی : مس کلاریسا کہیں تمھیں دغا نہ دے۔

آزاد : اجی نہیں، یہ محبت کی گھاتیں ہیں۔

خوجی : ابھی ذرا دیر میں محفل جمے گی۔ نہ کہوگے، کیسی تدبیر بتائی!

خوجی نے ٹھیک کہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں شہزادی نے ان دونوں آدمیوں کو بلا بھیجا۔ یہ لوگ وہاں پہنچے تو شراب کے دور چل رہے تھے۔

شہزادی : آج ہم شرط لگا کر پییں گے۔

ہنری : منظور۔ جب تک ہمارے ہاتھ سے جام نہ چھوٹے تک تم بھی نہ چھوڑو۔ جو پہلے چھوڑ دے وہ ہارا۔

کلارک : (آزاد سے) تم کون ہو میاں، صاف بولو!

آزاد : میں آدمی نہیں ہوں، دیوزاد ہوں۔ پریاں مجھے خوب جانتی ہیں۔

کلاریسا —

اڑتا ہے مجھ سے او ستم ایجاد کس لیے
بنتا ہے آدمی سے پری زاد کس لیے

کلاریسا نے شہزادی کو اتنی شراب پلائی کہ وہ مست ہو کر جھومنے لگی۔ تب آزاد نے کہا— خواجہ صاحب، آپ سچ کہنا، ہمارا عشق سچا ہے یا نہیں۔ مئیڈا، خدا جانتا ہے، آج کا دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے۔ کسے امید تھی کہ اس قید میں تمھارا دیدار ہوگا؟

خوجی: بہت بہکو نہ بھائی، کہیں شہزادی سن رہی ہو تو آفت آ جائے۔

آزاد: وہ اس وقت دوسری دنیا میں۔

خوجی: شہزادی صاحب، یہ سب بھاگے جا رہے ہیں، ذرا ہوش میں تو آیئے۔

آزاد: ابے چپ رہ نالائق۔ میڈا بتاؤ، کس تدبیر سے بھاگو گی؟ مگر تم نے تو وہ روپ بدلا کہ خدا کی پناہ! میں یہی دل میں سوچتا تھا کہ ایسے حسین شہزادے یہاں کیسے آ گئے، جنھوں نے ہمارا رنگ پھینکا کر دیا۔ واللہ، جو ذرا بھی پہچانا ہو۔ مس کلاریسا، تم نے تو غضب ہی کر دیا۔ کون جانتا تھا کہ سائبیر یا بھیج کر تم مجھے چھڑانے آؤ گی!

میڈا: اب تو موقع اچھا ہے، رات زیادہ آ گئی ہے۔ پہرے والے بھی سوتے ہوں گے، دیر کیوں کریں۔

آزاد اصطبل میں گئے اور چار تیز گھوڑے چھانٹ کر باہر لائے۔ دونوں عورتیں تو گھوڑے پر سوار ہو گئیں، مگر خوجی کی ہمّت چھوٹ گئی، ڈرے کہ کہیں گر پڑیں تو ہڈی پسلی چور ہو جائے۔ بولے— بھائی، تم لوگ جاؤ مجھے یہیں رہنے دو۔ شہزادی کو تسلی دینے والا بھی تو کوئی چاہیے۔ میں اسے باتوں میں لگائے رکھوں گا۔ جس میں اسے کوئی شک نہ ہو۔ خدا نے چاہا تو ایک ہفتے کے اندر قسطنطنیہ میں تم سے ملیں گے۔

یہ کہہ کر خوجی تو ادھر چلے اور وہ تینوں آدمی آگے بڑھے۔ قدم قدم پر پیچھے پھر پھر کر دیکھتے تھے کہ کوئی پکڑنے آ نہ رہا ہو۔ صبح ہوتے ہوتے یہ لوگ ڈینیوب کے کنارے آ پہنچے اور گھوڑوں سے اتر کر ہری ہری گھاس پر ٹہلنے لگے۔ ایکاایک پیچھے سے کئی سوار گھوڑے دوڑاتے آتے دیکھائی پڑے۔ ان لوگوں نے اپنے گھوڑے چرنے کو چھوڑ دیے تھے۔ اب بھاگیں کیسے؟ دم کے دم میں سب کے سب سوار سر پر آ پہنچے اور ان تینوں آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ اکیلے آزاد بھلا تیں آدمیوں کا کیا مقابلہ کرتے!

دوپہر ہوتے ہوتے یہ لوگ شہزادی کے یہاں جا پہنچے۔ شہزادی تو غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ اندر ہی سے کہلا بھیجا کہ آزاد کو قید کر دو۔ یہ حکم دے کر شہزادوں کو دیکھنے کے لیے باہر نکلی تو شہزادوں کی جگہ دو شہزادیاں کھڑی نظر آئیں۔ دھک سے رہ گئی۔ یا خدا، یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں!

کلاریسا: بہن، مرد کے بھیس میں تو تمھیں پیار کر چکے۔ اب آؤ، بہنیں بہنیں مل کر پیار

کریں۔ ہم وہی ہیں جن کے ساتھ تم شادی کرنے والی ہو۔

شہزادی : ارے کلاریسا، تم یہاں کہاں؟

کلاریسا : آؤ گلے ملیں۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تمھارے اوپر کوئی آفت نہ آ جائے۔ ایسے نامی سرکاری قیدی کو اڑا لانا تمھیں مناسب نہ تھا۔ وزیر جنگ کو یہ خبر مل گئی ہے۔ اب تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ اس ترکی جوان کو ہمارے حوالے کر دو۔

شہزادی سمجھ گئی کہ اب آزاد کو رخصت کرنا پڑے گا۔ آزاد سے جا کر بولی— پیارے آزاد، میں نے تمھارے ساتھ جو برائیاں کی ہیں، انھیں معاف کرنا۔ میں نے جو کچھ کیا، دل کی جلن سے مجبور ہو کر کیا۔ تمھاری جدائی مجھ سے برداشت نہ ہوگی۔ جاؤ، رخصت۔

یہ کہہ کر اس نے کلاریسا سے کہا— شہزادی، خدا کے لیے انھیں سائبیریا نہ بھیجنا۔ وزیر جنگ سے تمھاری جان پہچان ہے! وہ تمھاری بات مانتے ہیں، اگر تم معاف کر دوگی، تو وہ ضرور معاف کر دیں گے۔

(80)

اُدھر جب آزاد فوج سے غائب ہوئے تو چاروں طرف ان کی تلاش ہونے لگی۔ دو سپاہی گھومتے گھومتے شہزادی کے محل کی طرف آ نکلے۔ اتفاق سے خوجی بھی افیم کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ ان دونوں سپاہیوں نے خوجی کو آزاد کے ساتھ پہلے دیکھا تھا۔ خوجی کو دیکھتے ہی پکڑ لیا اور آزاد کا پتہ پوچھنے لگے۔

خوجی : میں کیا جانوں کہ آزاد پاشا کون ہے۔ ہاں، نام البتہ سنا ہے۔

ایک سپاہی : تم آزاد کے ساتھ ہندستان سے آئے ہو اور تم کو خوب معلوم ہے کہ آزاد پاشا کہاں ہیں۔

خوجی : کون آزاد کے ساتھ آیا ہے؟ میں پٹھان ہوں، پیشاور سے آیا ہوں، مجھ سے آزاد سے واسطہ؟

مگر وہ دونوں سپاہی بھی چھٹے ہوئے تھے، خوجی کے جھانسے میں نہ آئے۔ خوجی نے جب دیکھا کہ ان ظالموں سے بچنا مشکل ہے تو سوچے کہ سڑی بن جاؤ۔ اور کچھ کا کچھ جواب دو۔ مرنا ہے تو دوسرے کو لے کر مرو۔ مرنا نہ ہوتا تو اپنا وطن چھوڑ کر اتنی دور آتے ہی کیوں۔

خاصے مزے میں نواب کے یہاں دندناتے تھے۔ الو بنا بنا کر مزے اڑاتے تھے۔ چینی کے پیالیوں میں مالوے کی افیم گھلتی تھی، چنڈو کے چھینٹے اڑتے تھے، چرس کے دم لگتے تھے۔ وہ سب مزے چھوڑ چھاڑ کر الو بنے، مگر پھنسے سو پھنسے!

سپاہی: تمھارا نام کیا ہے؟ سچ سچ بتا دو۔

خوجی: کل تک دریا چڑھا تھا، آج چڑیا دانہ چگے گی۔

سپاہی: تمھارے باپ کا کیا نام تھا؟

خوجی: ہم کو اپنا نام تو یاد ہی نہیں۔ باپ کے نام کو کون کہے؟

سپاہی: تم یہاں کس کے ساتھ آئے؟

خوجی: شیطان کے ساتھ۔

سپاہیوں نے جب دیکھا کہ یہ اول جلول بک رہا ہے تو ایک موٹے سے درخت میں باندھا اور بولے— ٹھیک ٹھیک بتلاتے ہو تو بتلا دو ورنہ ہم تمھیں پھانسی دے دیں گے۔

خوجی کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ خدا سے دعا مانگنے لگے کہ اے خدا، میں تو اب دنیا سے جا رہا ہوں، مگر مرتے وقت دعا مانگتا ہوں کہ آزاد کا بال بھی بانکا نہ ہو۔

آخر، سپاہیوں کو خوجی کے سڑی ہونے کا یقین آ ہی گیا۔ چھوڑ دیا۔ خوجی کے سر سے یہ بلا ٹلی تو چہکنے لگے— تم لوگ زندگی کے مزے کیا جانو، ہم نے وہ وہ مزے لوٹے ہیں کہ سنو تو پھڑک جاؤ۔ نواب صاحب کی بدولت بادشاہ بنے پھرتے تھے، صبح سے دس بجے تک چنڈو کے چھینٹے اڑے، پھر کھانا کھایا، سوئے تو چار بجے کی خبر لائے، چار بجے سے افیم گھلنے لگی، پونڈے چھیلے اور گڑیریاں چوسیں، اتنے میں نواب صاحب نکل آئے۔ ویسے رئیس یہاں کہاں؟ وہاں کے ایک ادنیٰ کہار نے بیس لاکھ کی شراب اپنی برادری والوں کو ایک رات میں پلا دی۔ ایک کہار نے سونے چاندی کی کجیوں میں شراب پلائی۔ اس پر ایک بوڑھے خرانٹ نے کہا— نہ بھائی پنچو، اپنا مرجاد نہ چھوڑب۔ ہمرے باپ یہی کجی ماں پیہن۔ ہمارے دادا پیہن، اب ہم کہاں کہ بڑے رئیس ہوئی گین! مہرا نے سونے چاندی کی پیالیاں منگوائی اور فقیروں کو بانٹ دیں۔ دس ہزار پیالیاں چاندی کی تھیں اور دس ہزار سونے کی۔ جب بادشاہ کو یہ خبر ملی تو حکم دیا کہ جتنے کہار آئے ہوں، سب کو ایک ایک لہنگا دلوا دیا جائے۔ اب اس گئی گزری حالت پر بھی جو بات وہاں ہے وہ کہیں نہیں ہے۔

سپاہی : آپ کے ملک میں سپاہی تو اچھے اچھے ہوں گے؟

خوجی : ہمارے ملک میں ایک سے ایک سپاہی موجود ہیں۔ جو ہے اپنے وقت کا رستم۔

سپاہی : آپ بھی تو وہاں کے پہلوان ہی معلوم ہوتے ہیں۔

خوجی : اس وقت تو سردی نے مار ڈالا ہے، اب بڑھاپا آیا، جوانی میں البتہ میں بھی ہاتھی کا دُم پکڑ لیتا تھا تو ہُمس نہیں سکتا تھا۔ اب نہ وہ شوق، نہ وہ دل، اب تو فقیری اختیار کی۔

سپاہی : آپ کی شادی بھی ہوئی ہے؟

خوجی : آپ نے بھی وہی بات پوچھی! فقیر آدمی، شادی ہوئی نہ ہوئی، برابر کے لڑکے ہیں۔

سپاہی : آپ کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں؟

خوجی : اوہ، پوچھتے ہیں، پڑھے لکھے ہیں۔ یہاں بلا پڑھے لکھے ہی عالم فاضل ہیں، پڑھنے کا مرض نہیں پالتے، یہ عارضہ تو نہیں دیکھا، اپنے یہاں تو چنڈو، چرس، مدک کے چرچے رہتے ہیں۔ ہاں، اگلے زمانے میں پڑھنے لکھنے کا بھی رِواج تھا۔

سپاہی : تو آپ کا ملک جاہلوں ہی سے بھرا ہوا ہے؟

خوجی : تم خود گنوار ہو۔ ہمارے یہاں ایک ایک پہلوان ایسے پڑے ہیں جو تین تین ہزار ہاتھ جوڑی کے ہلاتے ہیں۔ ڈنڈوں پر جھک گئے تو چار پانچ ہزار ڈنڈ پیل ڈالے۔ گلچلے ایسے کہ اندھیری رات میں صرف آواز پر تیر لگایا اور نشانہ خالی نہ گیا۔

یہ باتیں کر کے، خوجی نے اَفیم گھولی اور روسیوں سے پینے کے لیے کہا۔ اور سبھوں نے انکار کیا، مگر ایک مسافر کی شامت جو آئی تو اس نے ایک چسکی لگائی ذرا دیر میں نشے نے رنگ جمایا تو جھومنے لگا۔ ساتھیوں نے قہقہہ لگایا۔

خوجی : ایک دن کا ذکر ہے کہ نواب صاحب کے یہاں ہم بیٹھے گپّے اڑا رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب آئے۔ یہاں اس وقت سرور ڈٹا ہوا تھا، ہم نے عرض کی، مولوی صاحب، اگر حکم ہو تو ایک پیالی حاضر کروں۔ مولوی نے آنکھیں نیلی پیلی کیں اور کہا— کوئی مسخرہ ہے بے تو! میں نے کہا— یار، ایمان سے کہہ دو کہ تم نے کبھی افیم پی ہے یا نہیں؟ مولوی صاحب اتنے جامے سے باہر ہوئے کہ مجھے ہزاروں گالیاں سنائیں۔ آج بڑی سردی ہے، ہم ٹھٹھرے

جاتے ہیں۔

سپاہی : یہ وقت ہوا کھانے کا ہے۔

خوجی : خدا کی مار اس عقل پر۔ یہ وقت ہوا کھانے کا ہے؟ یہ وقت آگ تاپنے کا ہے۔ہمارے ملک کے رئیس اس وقت کھڑکیاں بند کر کے بیٹھے ہوں گے۔ ہوا کھانے کی اچھی کہی، یہاں تو روح کانپ رہی ہے اور آپ کو ہوا کھانے کی سوجھتی ہے۔

سپاہی : ایک مسافر نے ہم سے کہا تھا کہ ہندستان میں لوگ پرانی رسموں کے بہت پابند ہیں۔ اب تک پرانی لکیریں پیٹتے جاتے ہیں۔

خوجی : تو کیا ہمارے باپ دادا بیوقوف تھے؟ ان کی رسموں کو جو نہ مانے وہ کپوت، جو رسم جس طرح چلی آتی ہے اسی طرح رہے گی۔

سپاہی : اگر کوئی رسم خراب ہو تو کیا اس میں ترمیم کی ضرورت نہیں؟

خوجی : لاکھ ضرورت ہو تو کیا، پرانی رسموں کو کبھی ترمیم نہ کرنی چاہیے۔ کیا وہ لوگ احمق تھے؟ ایک آپ ہی بڑے عقلمند پیدا ہوئے!

روسیوں کو خوجی کی باتوں میں بڑا مزہ آیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ کوئی دوسرا آدمی ہے۔ آزاد کا دوست نہیں۔ خوجی کو چھوڑ دیا اور کئی دن کے بعد یہ قسطنطنیہ پہنچ گئے۔

(81)

ایک دن دو گھڑی دن رہے چاروں پریاں بناؤ چناؤ کر کے ہنس کھیل رہی تھیں۔ سپہر آرا کا دوپٹہ ہوا کے جھونکوں سے اڑا جاتا تھا۔ جہاں آرا موتیے کے عطر میں بسی تھی۔ گیتی آرا کا سیاہ ریشمی دوپٹہ خوب کھل رہا تھا۔

حسن آرا : بہن، یہ گرمی کے دن اور کالا ریشمی دوپٹہ! اب کہنے سے تو برا مانیے گا، جہاں آرا بہن نکھریں تو آج دولہا بھائی آنے والے ہیں، یہ آپ نے ریشمی دوپٹہ کیا سمجھ کے پھڑکایا!

عباسی : آج چبوترے پر اچھی طرح چھڑکاؤ نہیں ہوا۔

ہیرا : ذرا بیٹھ کر دیکھیے تو، کوئی دس مشکیں تو چبوترے ہی پر ڈالی ہوں گی۔

ایکا ایک مہری کی چھوکری پیاری دوڑتی ہوئی آئی اور بولی— حضور، ہم نے یہ آج

بگلی پالی ہے۔ بڑی سرکار نے خرید دی اور دو آنے مہینہ باندھ دیا۔ صبح کو ہم حلوا کھلائیں گے۔ شام کو پیڑا۔ اُدھر سپہرآرا اور گیتی آرہ گیند کھیلنے لگیں تو حسن آرا نے کہا، اب روز گیند ہی کھیلا کروگی؟ ایسا نہ ہو، آج بھی امّاں جان آ جائیں۔

عبّاسی : حضور، گیند کھیلنے میں کون سا عیب ہے؟ دو گھڑی دل بہلتا ہے۔ بڑی سرکار کی نہ کہیے، وہ بوڑھی ہوئیں، بگڑی ہی چاہیں۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ شہزادہ ہمایوں فر ہاتھی پر سوار باغیچے کی دیوار سے جھانکتے ہوئے نکلے۔ سپہرآرا بیگم کو گیند کھیلتے دیکھا تو مسکرا دیے۔ ہاتھی تو آگے بڑھ گیا مگر حسن آرا کو شہزادے کا یوں جھانکنا برا لگا۔ داروغہ کو بلا کر کہا، کل اس دیوار پر دو ردّے اور چڑھا دو، کوئی ہاتھی پر ادھر سے نکل جاتا ہے تو بے پردگی ہوتی ہے۔ سو کام چھوڑ کر یہ کام کرو۔

جب داروغہ چلے گئے تو جہاں آرا نے کہا— سپہرآرا بہن نے ان کو اتنا ڈھیٹ کر دیا، نہیں شہزادے ہوں یا خود بادشاہ ہوں، ایسی اندھیر نگری نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے، چلا آئے۔

پھر وہی چہل پہل ہونے لگی۔ سپہرآرا اور عبّاسی پچیسی کھیلنے لگیں۔

عبّاسی : حضور، اب کی ہاتھ میں یہ گوٹ نہ پیٹوں تو عبّاسی نام نہ رکھوں۔

سپہرآرا : واہ! کہیں پٹی نہ ہو۔

عبّاسی : یا اللہ، پچیس پڑیں۔ ارے، دیے بھی تو تین کانے؟ بازی خاک میں مل گئی۔

حسن آرا : لے کے ہروا نہ دی ہماری بازی! بس اب دور ہو۔

عبّاسی : اے بی بی، میں کیا کروں لے بھلا۔ پانسا وہی ہے لیکن وقت ہی تو ہے۔

حسن آرا : اچھا بازی ہو لے، تو ہم پھر آئیں۔

سپہرآرا : اب میں داوں بولتی ہوں۔

حسن آرا : ہم سے کیا مطلب، وہ جانے، تم جانو۔ بولو عبّاسی۔

عبّاسی : حضور، جب بازی ستیاناس ہو گئی تب تو ہم کو ملی اور اب حضور نکلی جاتی ہیں۔

حسن آرا : ہم نہیں جانتے۔ پھر کھیلنے کیوں بیٹھی تھیں؟

عبّاسی : اچھا منظور ہے، پھینکیے پانسا۔

سپہرآرا : دو مہینے کی تنخواہ ہے اتنا سوچ لو۔

عبّاسی : اے حضور، آپ کی جوتیوں کا صدقہ، کون بڑی بات ہے۔ پھینکیے تین کانے۔
سپہرآرا نے جو پانسا پھینکا تو پچیس! دوسرا پچیس، تیس، پھر پچیس، غرض سات پنچیں ہوئیں۔ بولی— لے اب روپے بائیں ہاتھ سے ڈھیلے کیجیے۔ مہری، باجی کی صندوقچی تو لے آؤ، الماری کے پاس رکھی ہے۔
حسن آرا نے مہری کو آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ مہری کمرے سے باہر آکر بولی— اے حضور، کہاں ہے؟ وہاں تو نہیں ملتی۔
سپہرآرا : بس جاؤ بھی، ہاتھ جھلاتی آئیں، چلو ہم بتاویں کہاں ہے۔
مہری : جو حضور بتا دیں تو اور تو لونڈی کی حیثیت نہیں ہے، مگر سیر بھر مٹھائی حضور کی نظر کروں۔
سپہرآرا مہری کو ساتھ لے کر کمرے کی طرف چلیں۔ دیکھا تو صندوقچی ندارد! ہیں، یہ صندوقچی کون لے گیا؟ مہری نے لاکھ ہنسی ضبط کی مگر ضبط نہ ہو سکی۔ تب تو سپہرآرا جھلائی، یہ بات ہے! میں بھی کہوں، صندوقچی کہاں غائب ہو گئی۔ تمھیں قسم ہے، دے دو۔
سپہرآرا پھر ناک سکوڑتی ہوئی باہر آئی تو سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔ ایک نے پوچھا— کیوں، صندوقچی ملی؟ دوسری بولی— ہمارا حصہ نہ بھول جانا۔ حسن آرا نے کہا— بہن، دس ہی روپیہ نکالنا۔ عبّاسی نے کہا— حضور، دیکھیے، ہمی نے جتواد دیا، اب کچھ رشوت دیجیے۔
مہری : اور بی بی، میں بھلا کاہے کو چھپا دیتی، کچھ میری گرہ سے جاتا تھا۔
سپہرآرا : بس بس بیٹھو، چلیں وہاں سے بڑی وہ بن کے۔
مہری : اپنی ہنسی کو کیا کروں، مجھی پر دھوکہ ہوتا ہے۔
اتنے میں دربان نے آواز دی، سواریاں آئی ہیں، اور ذرا دیر میں دو عورتیں ڈولیوں سے اتر کر اندر آئیں۔ ایک کا نام نظیر بیگم، دوسری کا جانی بیگم۔
حسن آرا : بہت دن بعد دیکھا۔ مزاج اچھا رہا بہن؟ دبلی کیوں ہو اتنی؟
نظیر : ماندی تھی، بارے خدا خدا کرکے، اب سنبھلی ہوں۔
حسن آرا : ہم نے تو سنا بھی نہیں۔ جانی بیگم ہم سے کچھ خفا سی معلوم ہوتی ہیں، خدا خیر کرے!
جانی : بس، بس ذری میری زبان نہ کھلوانا، الٹے چور کوتوال کو ڈانٹے۔ یہاں تک آتے

مہندی گھس جاتی۔

جانی بیگم کی بوٹی بوٹی پھڑکتی تھی۔ نظیر بیگم بھولی بھالی تھیں۔ جانی بیگم نے آتے ہی آتے کہا، حسن آرا آؤ، آنکھ مونڈی دھپ کھیلیں۔

جہاں آرا : کیا یہ کوئی کھیل ہے؟

جانی : اے ہے، کیا ننھّی بنی جاتی ہیں!

نظیر : بس ہم تمھاری انھیں باتوں سے گھبراتے ہیں۔ اچھی باتیں نہ کروگی۔

جانی : اے، وہ نگوڑی اچھی باتیں کون سی ہوتی ہیں، سنے تو سہی۔

نظیر : اب تمھیں کون سمجھائے۔

جانی بیگم سپہر آرا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر باغیچے کی طرف لے گئیں تو حسن آرا نے کہا— ان کے تو مزاج ہی نہیں ملتے۔

بڑی بیگم : بڑی کلاّ دراز چھوکری ہے۔ اس کے میاں کی جان عذاب میں ہے، ہم تو ایسے کو اپنے پاس بھی نہ آنے دیں۔

حسن آرا : نہیں امّاں جان، یہ نہ فرمایئے، ایسی نہیں ہے، مگر ہاں، زبان نہیں رکتی۔

ایکا ایک جانی بیگم نے آکر کہا— اچھا بہن، اب رخصت کرو۔ گھر سے نکلی بڑی دیر ہوئی۔

حسن آرا : آج تم دونوں نہ جانے پاؤ گی۔ ابھی آئے کتنی دیر ہوئی؟

جانی : نظیر بیگم کو چاہے نہ جانے دو، میں تو جاؤں گی ہی۔ میاں کے آنے کا یہی وقت ہے۔ مجھے میاں کا جتنا ڈر ہے، اتنا اور کسی کا نہیں۔ نظیر کی آنکھوں کا تو پانی مر گیا ہے۔

نظیر : اس میں کیا شک، تم بے چاری بڑی غریب ہو۔

اسی طرح آپس میں بہت دیر تک ہنسی دل لگی ہوتی رہی۔ مگر جانی بیگم نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اُٹھ کر چلی گئیں۔

(82)

ثریّا بیگم چوری کے بعد بہت غمگین رہنے لگیں۔ ایک دن عبّاسی سے بولیں— عبّاسی، دل کو ذرا تسکین نہیں ہوتی۔ اب ہم سمجھ گئے کہ جو بات ہمارے دل میں ہے وہ حاصل نہ

ہو گی۔

شیشہ ہاتھ آیا نہ ہم نے کوئی ساگر پایا
ساقیا لے تیری محفل سے چلے بھر پایا

ساری خدائی میں ہمارا کوئی نہیں۔

عبّاسی نے کہا— بی بی، آج تک میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ، جس کے لیے آپ رویا کرتی ہیں، کون ہیں؟ اور یہ جو آزاد آئے تھے، یہ کون ہیں۔ ایک دن بانکی عورتوں کے بھیس میں آئے، ایک دن گوسائی بن کے آئے۔

ثریّا بیگم نے کچھ جواب نہ دیا۔ دل ہی دل میں سوچی کہ جیسا کیا ویسا پایا۔ آخر حسن آرا میں کون سی بات ہے جو ہم میں نہیں۔ فرق یہی ہے کہ وہ نیک چلن ہیں اور میں بدنام۔

یہ سوچ کر ان کی آنکھیں بھر آئیں، جی بھاری ہو گیا۔ گاڑی تیار کرائی اور ہوا کھانے چلیں۔ راستے میں سلارو اور اس کے وکیل صاحب نظر پڑے۔ سلارو کہہ رہا تھا— جناب، ہم وہ نوکر ہیں جو باپ بن کے مالک کے یہاں رہتے ہیں۔ آپ کو ہماری عزّت کرنی چاہیے۔ اتفاق سے وکیل صاحب کی نظر اس گاڑی پر پڑی۔ بولے— خیر، باپ پیچھے بن لینا، ذری جا کر دیکھو تو، اس گاڑی میں کون سوار ہے؟ سلارو نے کہا، حضور، میں پھٹے حالوں ہوں، کیا جاؤں! آپ بھاری بھرکم آدمی ہیں، کپڑے بھی اچھے اچھے پہنے ہیں۔ آپ ہی جائیں۔ وکیل صاحب نے نزدیک آکر کوچوان سے پوچھا— کس کی گاڑی ہے؟ کوچوان پنجاب کا رہنے والا پٹھان تھا۔ جھلّا کر بولا— تم سے کیا واسطہ، کسی کی گاڑی ہے!

سلارو بولے— ہاں جی، تم کو اس سے کیا واسطہ کہ کس کی گاڑی ہے؟ ہٹ جاؤ راستے سے۔ دیکھتے ہیں کہ سواریاں ہیں، مگر ڈٹے کھڑے ہیں۔ ابھی جو کوئی ان کا عزیز ساتھ ہوتا تو اتر کے اتنا ٹھوکتا کہ سٹی پٹی بھول جاتی۔ تم وہاں کھڑے ہونے والوں کون ہو؟

وکیل صاحب کو ایک تو یہی غصّہ تھا کہ کوچوان نے ڈپٹا، اس پر سلارو نے پاجی بنایا۔ لال لال آنکھوں سے گھور کر رہ گئے، پاتے تو کھا ہی جاتے۔

سلارو: یہ تو نہ ہوا کہ کوچوان کو ایک ڈنڈا رسید کرتے۔ الٹے مجھ پر بگڑ رہے ہو۔

کوچوان چاہتا تھا کہ اتر کر وکیل صاحب کی گردن ناپے، مگر ثریّا بیگم نے کوچوان کو روک لیا اور کہا— گھر لوٹ چلو۔

بیگم صاحب جب گھر پہنچی تو داروغہ جی نے آکر کہا کہ حضور، گھر سے آدمی آیا ہے۔ میرا پوتا بہت بیمار ہے۔ مجھے حضور رخصت دیں)۔ یہ لالہ خوش وقت رائے میرے پرانے دوست ہیں، میری عوض کام کریں گے۔

ثریا بیگم نے کہا— جایئے، مگر جلد آیئے گا۔

دوسرے دن ثریا بیگم نے لال خوش وقت رائے سے حساب مانگا۔ لالہ صاحب پرانے فیشن کی دستار باندھے، چپکن پہنے ہاتھ میں قلمدان لیے آپہنچے۔

ثریا بیگم: لالہ، کیا سردی معلوم ہوتی ہے، یا جوڑی آتی ہے، لحاف دوں!

لالہ صاحب: حضور، بارھوں مہینے اسی پوشاک میں رہتا ہوں۔ نواب صاحب کے وقت میں ان کے درباریوں کی یہی پوشاک تھی۔ اب وہ زمانہ کہاں،ء وہ بات کہاں، وہ لوگ کہاں۔ میرے والد 6 روپیہ ماہواری طلب پاتے تھے۔ مگر برکت ایسی تھی کہ ان کے گھر کے سب لوگ بڑے آرام سے رہتے تھے۔ دروازے پر دو دستے مقرر تھے۔ بیس جوان۔ اصطبل میں دو گھوڑے۔ فیل خانے میں ایک مادہ ہاتھی! ایک زمانہ وہ تھا کہ دروازے پر ہاتھی جھومتا تھا۔ اب ایک کونے میں جان بچائے بیٹھے ہیں۔

یہ کہتے کہتے لالہ صاحب، نواب صاحب کی یاد کرکے رونے لگے۔

یکا یک مہری نے آکر کہا— حضور، آج پھر لُٹ گئے۔ لالہ صاحب بھی پگڑی سنبھالتے ہوئے چلے۔ ثریا بیگم جھپٹیں کہ چل کر دیکھیں تو، مگر مارے رنج کے چلنا مشکل ہوگیا۔ جس کوٹھری میں لالہ صاحب سوئے تھے اس میں سیند لگی ہے۔ سیند دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ رو کر بولیں— بس اب کمر ٹوٹ گئی۔ محلّے میں ہلچل مچ گئی۔ پھر تھانے دار صاحب آ پہنچے، تحقیقات ہونے لگی۔

تھانے دار: رات کو اس کوٹھری میں کون سویا تھا؟

لالہ صاحب: میں! گیارہ بجے سے صبح تک۔

تھانے دار: تمھیں کس وقت معلوم ہوا کہ سیند لگی؟

لالہ صاحب: دن چڑھے۔

تھانے دار: بڑے تعجب کی بات ہے کہ رات کو کوٹھری میں آدمی سوئے، اس کے کلّے پر سیند دی جائے اور اس کو ذرا بھی خبر نہ ہو۔ آپ کتنے دنوں سے یہاں نوکر ہیں؟ آپ کو پہلے

کبھی نہ دیکھا۔

لالہ صاحب : میں ابھی دو ہی دن کا نوکر ہوں۔ پہلے کیسے دیکھتے۔

ثریا بیگم کی روح کانپ رہی تھی کہ خدا ہی خیر کرے۔ مال کا مال ہو گیا اور یہ کم بخت عزّت کا الگ گاہک ہے۔ خیر، تھانے دار صاحب تو تحقیقات کر کے لمبے ہوئے۔ اِدھر ثریا بیگم مارے غم کے بیمار پڑ گئی۔ کئی دن تک علاج ہوتا رہا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک دن گھبرا کر حسن آرا کو ایک خط لکھوایا جس میں اپنی بے قراری کا رونا رونے کے بعد آزاد کا پتہ پوچھا تھا اور حسن آرا کو اپنے یہاں ملاقات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ حسن آرا بیگم کے پاس یہ خط پہنچا تو دنگ ہو گئیں۔ بہت سوچ سمجھ کر خط کا جواب لکھا۔

'بیگم صاحب کی خدمت میں آداب!

آپ کا خط آیا، افسوس! تم بھی اسی مرض میں گرفتار ہو۔ آپ سے ملنے کا شوق تو ہے، مگر آ نہیں سکتی، اگر تم آ جاؤ تو دو گھڑی غم غلط ہو۔ آزاد کا حال اتنا معلوم ہے کہ روم کی فوج میں افسر ہیں۔ ثریا بیگم، سچ کہتی ہوں کہ اگر بس چلتا تو اسی دم تمھارے پاس جا پہنچتی۔ مگر خوف ہے کہ کہیں مجھے لوگ ڈھیٹ نہ سمجھنے لگیں۔

تمھاری، حسن آرا

یہ خط لکھ کر عبّاسی کو دیا۔ عبّاسی خط لے کر ثریا بیگم کے مکان پر پہنچی، تو دیکھا کہ وہ بیٹھی رو رہی ہیں۔

اب سنیے کہ وکیل صاحب نے ثریا بیگم کی ٹوہ لگا لی۔ دنگ ہو گئے کہ یا خدا، یہ یہاں کہاں۔ گھر جا کر سلارو سے کہا۔ سلارو نے سوچا، میاں پاگل تو ہیں ہی، کسی عورت پر نظر پڑی ہوگی، کہہ دیا شبّو جان ہیں۔ بولا— حضور، پھر کچھ فکر کیجیے۔ وکیل صاحب نے فوراً خط لکھا—

'شبّو جان، تمھارے چلے جانے سے دل پر جو کچھ گزری، دل ہی جانتا ہے۔ افسوس، تم بڑی بے مروّت نکلیں۔ اگر جانا ہی تھا تو مجھ سے پوچھ کر گئی ہوتیں۔ یہ کیا کہ بلا کہے سنے چل دیں، اب خیر اسی میں ہے کہ چپکے سے چلی آؤ۔ جس طرح کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور تم چل دیں، اسی طرح اب بھی کسی سے کہو نہ سنو، چپ چاپ چلی آؤ۔ تم خوب جانتی ہو کہ میں نامی گرامی وکیل ہوں۔

تمھارا، وکیل

سلارو نے کہا— میاں، خوب غور کر کے لکھنا اور نہیں ہم ایک بات بتاویں۔ ہم کو بھیج دیجیے، میں کہوں گا، بی بی، وہ تو مالک ہیں، پہلے ان کے غلام سے تو بحث کر لو۔ گو پڑھا لکھا نہیں ہوں، مگر عمر بھر لکھنؤ میں رہا ہوں!

وکیل صاحب نے سلارو کو ڈانٹا اور خط میں اتنا اور بڑھا دیا، اگر چاہوں تو تم کو پھنسا دوں۔ لیکن مجھ سے یہ نہ ہوگا۔ ہاں، اگر تم نے بات نہ مانی تو ہم بھی دِق کریں گے۔

یہ خط لکھ کر ایک عورت کے ہاتھ ثریّا بیگم کے پاس بھیج دیا۔ بیگم نے لالہ صاحب سے کہا— ذرا یہ خط پڑھیے تو۔ لالہ صاحب نے خط پڑھ کر کہا، یہ تو کسی پاگل کا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ وہ تو خط پڑھ کر باہر چلے گئے اور ثریّا بیگم سوچنے لگیں کہ اب کیا کیا جائے؟ یہ موذی بے طرح پیچھے پڑا۔ سویرے لالہ خوش ونت رائے ثریّا بیگم کی ڈیوڑھی پر آئے تو دیکھا کہ یہاں کہرام مچا ہوا ہے۔ ثریّا بیگم اور عبّاسی کا کہیں پتہ نہیں۔ سارا محل چھان ڈالا گیا، مگر بیگم صاحب کا پتہ نہ چلا۔ لالہ صاحب نے گھبرا کر کہا— ذرا اچھی طرح دیکھو، شاید دل لگی میں کہیں چھپ رہی ہوں۔ غرض سارے گھر میں تلاش کی، مگر بے فائدہ۔

لالہ صاحب : یہ تو عجیب بات ہے، آخر دونوں چلی کہاں گئیں؟ ذرا اسباب وسباب تو دیکھ لو، ہے یا سب لے دے کے چل دیں۔

لوگوں نے دیکھا کہ زیور کا نام بھی نہ تھا۔ جواہرات اور قیمتی کپڑے سب ندارد۔

(83)

شہزادہ ہمایوں فر بھی شادی کی تیّاریاں کرنے لگے۔ سوداگروں کی کوٹھیوں میں جاجا کر سامان خریدنا شروع کیا۔ ایک دن ایک نواب صاحب سے ملاقات ہو گئی۔

بولے — کیوں حضرت، یہ تیّاریاں!

شہزادہ : آپ کے مارے کوئی سودا نہ خریدے؟

نواب : جناب،

چتونوں سے تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے۔

شہزادہ : آپ کو یقین ہی نہ آئے تو کیا علاج؟

نواب : خیر، اب یہ فرمایئے، حیدر کو پٹنہ سے بلوایئے گا یا نہیں؟ بھلا دو ہفتے تک تو دھما

چوکڑی رہے۔ مگر استاد، طائفے نوک کے ہوں۔ رڈی کلاونت ہوں گے تو ہم نہ آئیں گے۔ بس، یہ انتظام کیا جائے کہ دو محفلیں ہوں۔ ایک رئیسوں کے لیے اور ایک قدروں کے لیے۔

اِدھر تو یہ تیاریاں ہو رہی تھیں، ادھر بڑی بیگم کے یہاں یہ خط پہنچا کہ شہزادہ ہمایوں فر کو گُردے کے درد کی بیماری ہے اور دمہ بھی آتا ہے۔ کئی بار وہ جوئے کی علّت میں سزا پا چکا ہے۔ اس کو کسی نشے سے پرہیز نہیں۔

بڑی بیگم نے یہ خط پڑھوا کر سنا تو بہت گھبرائیں۔ مگر حسن آرا نے کہا، یہ کسی دشمن کا کام ہے۔ آج تک کبھی تو سنتے کہ ہمایوں فر جوئے کی علّت میں پکڑے گئے۔ بڑی بیگم نے کہا— اچھا، ابھی جلدی نہ کرو۔ آج ڈومنیاں نہ آئیں۔ کل پرسوں دیکھا جائے گا۔

دوسرے دن عبّاسی یہ خط لے کر شہزادہ ہمایوں فر کے پاس گئی۔ شہزادہ نے خط پڑھا تو چہرہ سرخ ہو گیا۔ کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ تب اپنے صندوق سے ایک خط نکال کر دونوں کی لکھاوٹ ملائی۔

عبّاسی : حضور نے دستخط پہچان لیا نا؟

شہزادہ : ہاں، خوب پہچانا، پر یہ بدمعاش اپنی شرارت سے باز نہیں آتا، اگر ہاتھ لگا تو ایسا ٹھیک بناؤں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔ لو، تم یہ خط بھی بیگم صاحب کو دکھا دینا اور دونوں خط واپس لے آنا۔ یہ وہی خط تھا جو شہزادے کی کوٹھی میں آگ لگنے کے بعد آیا تھا۔

رات بھر شہزادہ کو نیند نہیں آئی، طرح طرح کے خیال دل میں آتے تھے۔ ابھی چارپائی سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ بھانڑوں کا غول آ پہنچا۔ لالہ کالی چرن نے جو ڈیوڑھی کا حساب لکھتے تھے، کھڑکی سے گردن نکال کر کہا— ارے بھائی، آج کیا......

اتنا کہنا تھا کہ بھانڑوں نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ایک بولا— ہمیں تو سوس معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا— لکھنؤ کے کمہاروں کے ہاتھ چوم لینے کے قابل ہیں۔ سچ مچ کا بن مانُس بنا کر کھڑا کر دیا۔ تیسرے نے کہا— استاد، دُم کی کسر رہ گئی۔ چوتھا بولا— پھر خدا اور انسان کے کام میں اتنا فرق بھی نہ رہے۔ لالہ صاحب جھلّائے تو ان لوگوں نے اور بھی بنانا شروع کیا۔ چوٹ کرتا ہے، ذرا سنبھلے ہوئے۔ اب اٹھا ہی چاہتا ہے۔ ایک بولا— بھلا بتاؤ تو، یہ بن مانُس یہاں کیونکر آیا؟ کسی نے کہا— چڑی مار لایا ہے۔ کسی نے کہا— راستہ بھول کر بستی کی طرف نکل آیا ہے۔ آخر ایک اشرفی دے کر بھانڑوں سے نجات ملی۔

دوسرے دن شہزادہ صبح کے وقت اٹھے تو دیکھا کہ ایک خط سرہانے رکھا ہے۔ خط پڑھا تو دنگ ہو گئے۔

'سنو جی، تم بادشاہ کے لڑکے ہو اور ہم بھی رئیس کے بیٹے ہیں۔ ہمارے راستے میں نہ پڑو، نہیں تو برا ہوگا۔ ایک دن آگ لگا چکا ہوں، اگر سپہر آرا کے ساتھ تمھاری شادی ہوئی تو جان لے لوں گا۔ جس روز میں نے یہ خبر سنی ہے، یہی جی چاہ رہا ہے کہ چھری لے کر پہنچوں اور دم کے دم میں کام تمام کر دوں۔ یاد رکھو کہ میں بے چوٹ کیے نہ رہوں گا۔'

شہزادہ ہمایوں فر اسی وقت صاحبِ ضلع کی کوٹھی پر گئے اور سارا قصّہ کہا۔ صاحب نے خفیہ پولس کے ایک افسر کو اس معاملے کی تحقیقات کرنے کا حکم دیا۔

صاحب سے رخصت ہو کر وہ گھر آئے تو دیکھا کہ ان کے پرانے دوست حاجی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ حضرت ایک ہی گھاگھ تھے، عالموں سے بھی ملاقات تھی، بانکوں سے بھی ملتے جلتے رہتے تھے۔ شہزادہ نے ان سے بھی اس خط کا ذکر کیا۔ حاجی صاحب نے وعدہ کیا کہ ہم اس بدمعاش کا ضرور پتہ لگائیں گے۔

شہسوار نے ادھر تو ہمایوں فر کو قتل کرنے کی دھمکی دی، ادھر ایک تحصیل دار صاحب کے نام سرکاری پروانہ بھیجا۔ آدمی نے جا کر دس بجے رات کو تحصیل دار کو جگایا اور یہ پروانہ دیا—

'آپ کو قلمی ہوتا ہے کہ مبلغ پانچ ہزار روپیہ اپنی تحصیل کے خزانے سے لے کر، آج رات کو کالی ڈیہہ کے مقام پر حاضر ہوں۔ اگر آپ کو فرصت نہ ہو تو پیش کار کو بھیجیے، تاکید جانیے۔'

تحصیل دار نے خزانچی کو بلایا، روپیہ لیا، گاڑی پر روپیہ لدوایا اور چار چپراسیوں کو ساتھ لے کر کالی ڈیہہ چلے۔ وہ گاؤں یہاں سے دو کوس پر تھا۔ راستے میں ایک گھنا جنگل پڑتا تھا۔ بستی کا کہیں نام نہیں۔ جب اس مقام پر پہنچے تو ایک چھولداری ملی۔ وہاں جا کر پوچھا— کیا صاحب سوتے ہیں؟

سپاہی: صاحب نے ابھی چائے پی ہے۔ آج رات بھر لکھیں گے۔ کسی سے مل نہیں سکتے۔

تحصیل دار: تم اتنا کہہ دو کہ تحصیل دار روپیہ لے کر حاضر ہے۔

چپراسی نے چھولداری میں جا کر اطلاع کی۔ صاحب نے کہا، بلاؤ۔ تحصیل دار صاحب

اندر گئے تو ایک آدمی نے ان کا منھ زور سے دبا دیا اور کئی آدمی ان پر ٹوٹ پڑے۔ سامنے ایک آدمی انگریزی کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ تحصیل دار خوب جکڑ دیے گئے تو مسکرا کر بولا— ویل تحصیل دار! تم روپیہ لایا، اب مت بولنا۔ تم بولا اور میں نے گولی ماری۔ تم ہم کو اپنا صاحب سمجھو۔

تحصیل دار : حضور کو اپنے صاحب سے بڑھ کر سمجھتا ہوں، وہ اگر ناراض ہوں گے تو درجہ گھٹا دیں گے۔ آپ تو چھری سے بات کریں گے۔

شہسوار نے تحصیل دار کو چکمہ دے کر رخصت کیا اور اپنے ساتھیوں میں ڈینگ مارنے لگا۔ دیکھا، اس طرح یار لوگ چکمہ دیتے ہیں۔ ساتھی لوگ ہاں میں ہاں ملا رہے تھے کہ اتنے میں ایک گندھی تیل کی کپّیاں اور بوتلیں لٹکائے جھول داری کے پاس آیا اور بولا— حضور، سلام کرتا ہوں۔ آج سودا بیچنے ذرا دور نکل گیا تھا، لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ آگے گھنا جنگل ہے، اگر حکم ہو تو یہیں رہ جاؤں؟

شہسوار : کس کس چیز کا عطر ہے؟ ذرا موتیے کا تو دیکھاؤ

گندھی : حضور، اوّل نمبر کا موتیا ہے، ایسا شہر میں ملے گا نہیں۔

شہسوار نے جیوں ہی عطر لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، گندھی نے سیٹی بجائی اور سیٹی کی آواز سنتے ہی پچاس ساٹھ کانسٹبل اِدھر اُدھر سے نکل پڑے اور شہسوار کو گرفتار کر لیا۔ یہ گندھی نہ تھا، انسپکٹر تھا، جسے حاکمِ ضلع نے شہسوار کا پتہ لگانے کے لیے تعینات کیا تھا۔

میاں شہسوار جب انسپکٹر کے ساتھ چلے تو راستے میں انھیں للکارنے لگے۔ اچھا بچہ، دیکھو تو سہی، جاتے کہاں ہو۔

انسپکٹر : ہس! چور کے پاؤں کتنے، چودہ برس کو جاؤ گے۔

شہسوار : سنو میاں، ہمارے کاٹے کا منتر نہیں، ذرا زبان کو لگام دو، ورنہ آج کے دسویں دن تمھارا پتہ نہ ہوگا۔

انسپکٹر : پہلے اپنی فکر تو کرو۔

شہسوار : ہم کہہ دیں گے کہ اس انسپکٹر کی ہم سے عداوت ہے۔

انسپکٹر : اجی، کڑھ کڑھ کر جیل خانے میں مروگے۔

ادھر بڑی بیگم کے یہاں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ڈومنیوں کا گانا ہو رہا تھا۔ اُدھر شہزادہ ہمایوں فر ایک دن دریا کی سیر کرنے گئے۔ گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ہوا زوروں کے ساتھ چل رہی تھی۔ شام ہوتے ہوتے آندھی آ گئی اور کشتی دریا میں چکّر کھا کر ڈوب گئی۔ ملاح نے کشتی کے بچانے کی بہت کوشش کی، مگر موت سے کسی کا کیا بس چلتا ہے۔ گھر پر یہ خبر آئی تو کہرام مچ گیا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ دروازے پر بھانڑ مبارکباد گا رہے تھے، آج بین ہو رہے ہیں، کل ہمایوں فر جامے میں پھولے نہیں ساتے تھے کہ دولہا بنیں گے، آج دریا میں غوطے کھاتے ہیں۔ کسی طرف سے آواز آتی ہے— ہائے میرے بچّے! کوئی کہتا ہے— ہیں، میرے لال کو کیا ہوا! رونے والا گھر بھر اور سمجھانے والا کوئی نہیں۔ ہمایوں فر کی ماں رو رو کر کہتی تھیں، ہائے! میں دکھیا اسی دن کے لیے اب تک جیتی رہی کہ اپنے بچّے کی میّت دیکھوں۔ ابھی تو مسیں بھی نہیں بھیگنے پائی تھیں کہ تمام بدن دریا مں بھیگ گیا۔ بہن روتی تھی، میرے بھیّا، ذری آنکھیں تو کھولو۔ ہائے، جن ہاتھوں سے میں نے مہندی رچی تھی ان سے اب سر اور چھاتی پیٹتی ہوں۔ کل سمجھتے تھے کہ پرسوں برات سجے گی، خوشیاں منائیں گے اور آج ماتم کر رہے ہیں۔ اٹھو، اماں جان تمھارے سرہانے کھڑی رو رہی ہیں۔

یہاں تو رونا پیٹنا مچا ہوا تھا، وہاں بڑی بیگم نے جیوں ہی خبر پائی، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ عبّاسی سے کہا— جاکر لڑکیوں سے کہہ دے کہ نیچے باغ میں ٹہلیں۔ کوٹھے پر نہ جائیں۔ عبّاسی نے جاکر یہ بات کچھ اس طرح کہی کہ چاروں بہنوں میں کوئی یہ نہ سمجھ سکیں۔ مگر جہاں آرا تاڑ گئی۔ اٹھ کر اندر گئی تو بڑی بیگم کو روتے دیکھا۔ بولی— اماں جان، صاف صاف بتاؤ۔

بڑی بیگم: کیا بتاؤں بیٹی، ہمایوں فر چل بسے۔

جہاں آرا: ارے!

بڑی بیگم: چپ چپ، سپہر آرا نہ سننے پائے۔ میں نے گاڑی تیار ہونے کا حکم دیا ہے، چلو باغ کو چلیں، تم ذرا بھی ذکر نہ کرنا۔

جہاں آرا: ہائے امّی جان، یہ کیا ہوا؟

بڑی بیگم : خدا کے واسطے بیٹی، چپ رہو، بڑا برا وقت جاتا ہے۔

جہاں آرا : اف، جی گھبراتا ہے، ہم کو نہ لے چلیے، نہیں سپہرآرا سمجھ جائیں گی۔ ہم سے رونا ضبط نہ ہو سکے گا، کہا مانیے، ہم کو نہ لے چلیے۔

بڑی بیگم : یہاں اتنے بڑے مکان میں اکیلی کیسی رہوگی؟

جہاں آرا : یہ منظور ہے، مگر ضبط ممکن نہیں۔

سب کی سب دل میں خوش تھیں کہ باغ کی سیر کریں گے، مگر یہ خبر ہی نہ تھی کہ بڑی بیگم کس سبب سے باغ لیے جاتی ہیں۔ چاروں بہنیں پالکی گاڑی پر سوار ہوئی اور آپس میں مزے مزے کی باتیں کرتی ہوئی چلیں۔ مگر عبّاسی اور جہاں آرا کے دل پر بجلیاں گرتی تھیں۔ باغ میں پہنچ کر جہاں آرا نے سر درد کا بہانہ کیا اور لیٹ رہیں، چاروں بہنیں چمن کی سیر کرنے لگیں۔ سپہرآرا نے موقع پا کر کہا— عبّاسی، ایک دن ہم اور شہزادے اس باغ میں ٹہل رہے ہوں گے۔ نکاح ہوا اور ہم ان کو باغ میں لے آئے۔ ہم پانچ روز یہاں ہی رہیں گے۔ عبّاسی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ دل میں کہنے لگیں، کدھر خیال ہے، کیسا نکاح اور کیسی شادی؟ وہاں جنازے اور کفن کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی۔

یکا یک سپہرآرا نے کہا— بہن، ہچکیاں آنے لگیں۔

حسن آرا : کوئی یاد کر رہا ہوگا۔

اب سنیے کہ اسی باغ کے پاس ایک شاہ صاحب کا تکیہ تھا جس میں کئی شہزادوں اور رئیسوں کی قبریں تھیں۔ ہمایوں فر کا جنازہ بھی اسی تکیے میں گیا، ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ باغ کے ایک برج سے بہنوں نے اس جنازے کو دیکھا تو سپہرآرا بولی— باجی جان، کس سے پوچھیں کہ یہ کس بے چارے کا جنازہ ہے۔ خدا اس کو بخشے۔

حسن آرا : افوہ! سارا شہر ساتھ ہے۔ اللہ، یہ کون مر گیا، کس سے پوچھیں؟

عبّاسی : حضور، جانے بھی دیں، رات کے وقت لاش نہ دیکھیں۔

حسن آرا : نہیں، گلاب مالی سے کہو، ابھی ابھی پوچھے۔

عبّاسی تھر تھر کانپنے لگی۔ گلاب مالی کے کان میں کچھ کہا۔ وہ باغ کا پھاٹک کھول کر باہر گیا، لوگوں سے پوچھا۔ پھر دونوں میں کانا پھوسی ہوئی۔ اس کے بعد عبّاسی نے اوپر جا کر کہا۔ حضور، کوئی رئیس تھے۔ بہت دنوں سے بیمار تھے۔ یہاں قضا آ پہنچی۔

گیتی آرہ : کچھ ٹھکانہ ہے! آدمیوں کا کہاں سے کہاں تک تانتا لگا ہوا ہے۔
سپہرآرا : خدا جانے، جوان تھا یا بوڑھا؟
عبّاسی نے بڑی بیگم سے جا کر جنازے کا حال کہا تو انھوں نے سر پیٹ کر کہا— تمھیں ہماری قسم ہے جو الٹے پاؤں نہ چلی جاؤ۔
حسن آرا : امّاں جان، آپ ناحق گھبراتی ہیں، آخر یہاں کھڑے رہنے میں کیا ڈر ہے؟
بڑی بیگم : اچھا، تم کو اس سے کیا مطلب۔
سپہرآرا : کسی کا جنازہ جاتا ہے۔ لاکھوں آدمی ساتھ ہیں۔
حسن آرا : خدا جانے، کون تھا بے چارہ۔
بڑی بیگم : اللہ کے واسطے چلی جاؤ!
جہاں آرا : اتنی قسمیں دیتی جاتی ہیں اور کوئی سنتا ہی نہیں۔
سپہرآرا : باجی، سنیے، کیسی دردناک غزل ہے! خدا جانے کون گا رہا ہے۔

شبِ فراق ہے اور آندھیاں ہیں آہوں کی
چراغ کو میرے ظلمت کدے میں بار نہیں
زمین پیار سے مجھ کو گلے لگاتی ہے
عذاب ہے یہ دلا گور میں فشار نہیں
پس از فنا بھی کسی طور سے قرار نہیں
ملا بہشت تو کہتا ہوں کوئے یار نہیں

عبّاسی : کوئی بوڑھا آدمی تھا۔
سپہرآرا : تو پھر کیا غم!
بڑی بیگم : تو پھر جتنے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہوں، سب کو مر جانا چاہیے؟
سپہرآرا : ایسی باتیں نہ کہیے، امّاں جان!
حسن آرا : بوڑھے اور جوان سب کو مرنا ہے ایک دن۔
بڑی بیگم اور سپہرآرا نیچے چلی گئیں۔ حسن آرا بھی جا رہی تھیں کہ قبرستان سے آواز آئی— ہائے ہمایوں فر، تم سے اس دغا کی امید نہ تھی۔
حسن آرا : ایں عبّاسی، یہ کس کا نام لیا؟

عبّاسی : حضور، بہادر مرزا کہا، کوئی بہادر مرزا ہوں گے۔
حسن آرا : ہاں، ہمی کو دھوکا ہوا۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔
جب تینوں بہنیں نیچے پہنچ گئیں، تو بڑی بیگم نے کہا— آخر تمھارے مزاج میں اتنی ضد کیوں ہیں؟
حسن آرا : امّاں جان، وہاں بڑی ٹھنڈی ہوا تھی۔
بڑی بیگم : مردہ وہاں آیا ہوا ہے اور اس وقت، بھلا سوچو تو۔
سپہرآرا : پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟
بڑی بیگم : چلو بیٹھو، ہوتا کیا ہے!
تینوں بہنیں لیٹیں تو سپہرآرا کو تو نیند آ گئی، مگر حسن آرا اور گیتی آرہ کی آنکھ نہ لگی۔ باتیں کرنے لگیں!
حسن آرا : کیا جانے، کون بے چارہ تھا؟
گیتی آرہ : کوئی اس کے گھر والوں کے دل سے پوچھے۔
حسن آرا : کوئی بڑا شہزادہ تھا۔!
گیتی آرہ : ہمیں تو اس وقت چاروں طرف موت کی شکل نظر آتی ہے۔
حسن آرا : کیا جانے، اکیلے تھے یا لڑکے بالے بھی تھے۔
گیتی آرہ : خدا جانے، مگر تھا ابھی جوان۔
حسن آرا : دیکھو بہن، سینکڑوں آدمی جمع ہیں، مگر کیسا سناٹا ہے! جو ہے، ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے!
اتنے میں سپہرآرا بھی جاگ پڑیں۔ بولیں— کچھ معلوم ہوا باجی جان، اس بے چارے کی شادی ہوئی تھی کہ نہیں؟ جو شادی ہوئی ہوگی تو ستم ہے۔
حسن آرا : خدا نہ کرے کہ کسی پر ایسی مصیبت آئے۔
سپہرآرا : بے چاری بیوہ اپنے دل میں جانے کیا سوچتی ہوگی؟
حسن آرا : اس کے سوا اور کیا سوچتی ہوگی کہ مر مٹے!
رات کو سپہرآرا نے خواب میں دیکھا کہ ہمایوں فر بیٹھے ان سے باتیں کر رہے ہیں۔
ہمایوں : خدا کا ہزار شکر ہے کہ آج یہ دن دکھایا، یاد ہے، ہم تم سے گلے ملے تھے؟

سپہر آرا : بہروپیے کے بھی کان کاٹے!

ہمایوں : یاد ہے، جب ہم نے مہتابی پر کنکوا ڈھایا تھا؟

سپہر آرا : ایک ہی ذات شریف ہیں آپ۔

ہمایوں : اچھا، تم یہ بتاؤ کہ دنیا میں سب سے زیادہ خوش نصیب کون ہے؟

سپہر آرا : ہم!

ہمایوں : اور جو میں مر جاؤں تو تم کیا کرو؟

اتنا کہتے کہتے ہمایوں فر کے چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھیں الٹ گئیں۔ سپہر آرا ایک چیخ مار کر رونے لگیں۔ بڑی بیگم اور حسن آرا چیخ سنتے ہی گھبرائی ہوئی سپہر آرا کے پاس آئیں۔ بڑی بیگم نے پوچھا— کیا ہے بیٹی، تم چلائی کیوں؟

عبّاسی : اے حضور، ذری آنکھ کھولیے۔

بڑی بیگم : بیٹا، آنکھ کھول دو۔

بڑی مشکل سے سپہر آرا کی آنکھیں کھلیں۔ مگر ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائی تھیں کہ کسی نے باغیچے کی دیوار کے پاس رو کر کہا— ہائے شہزادہ ہمایوں فر!

سپہر آرا نے رو کر کہا— امّی جان، یہ کیا ہو گیا! میرا تو کلیجہ الٹا جاتا ہے۔

دیوار کے پاس سے پھر آواز آئی— ہائے ہمایوں فر! کیا موت کو تم پر ذرا بھی رحم نہ آیا؟

سپہر آرا : ارے، کیا یہ میرے ہمایوں فر ہیں!! یا خدا، یہ کیا ہوا امّی جان!

بڑی بیگم : بیٹی صبر کرو، خدا کے واسطے صبر کرو۔

سپہر آرا : ہائے، کوئی ہمیں پیارے شہزادے کی لاش دکھا دو۔

بڑی بیگم : بیٹا، میں تمھیں سمجھاؤں کہ اس سن میں تم پر یہ مصیبت پڑی اور تم مجھے سمجھاؤ کہ اس بوڑھاپے میں یہ دن دیکھنا پڑا۔

سپہر آرا : ہائے، ہمیں شہزادے کی لاش دیکھا دو۔ امّی جان، اب صبر کی طاقت نہیں رہی، مجھے جانے دو، خدا کے لیے مت روکو، اب شرم کیسا اور حجاب کس کے لیے؟

بڑی بیگم : بیٹی، ذرا دل کو مضبوط رکھو، خدا کی مرضی میں انسان کو کیا دخل؟

سپہر آرا : کیا کہتی ہیں آپ امّی جان، دل کہاں ہے، دل کا تو کہیں پتہ ہی نہیں۔ یہاں

تو روح تک پگھل گئی۔

بڑی بیگم : بیٹی، خوب کھل کر رو لو۔ میں نصیبوں جلی یہی دن دیکھنے کے لیے بیٹھی تھی!

سپہرآرا : آنسو نہیں ہے امّی جان، روؤں کیسے؟ بدن میں جان ہی نہیں رہی، باجی جان کو بلا دو۔ اس وقت وہ بھی مجھے چھوڑ کر چل دیں؟

حسن آرا الگ جا کر رو رہی تھیں۔ آئیں، مگر خاموش۔ نہ روئی، نہ سر پیٹا، آکر بہن کے پلنگ کے پاس بیٹھ گئیں۔

سپہرآرا : باجی، چپ کیوں ہو! ہمیں تسکین تک نہیں دیتیں، واہ!

حسن آرا خاموش بیٹھی رہیں، ہاں، سر اٹھا کر سپہرآرا پر نظر ڈالی۔

سپہرآرا : باجی، بولیے، آخر چپ کب تک رہیے گا؟

اتنے میں روح افزا بھی آ گئیں، انھوں نے مارے غم کے دیوار پر سر پٹک دیا تھا۔ سپہرآرا نے پوچھا— بہن، یہ پٹی کیسی بندھی ہے؟

روح افزا : کچھ نہیں، یوں ہی۔

سپہرآرا : کہیں سر وِر تو نہیں پھوڑا؟ امّاں جان، اب دل نہیں مانتا، خدا کے لیے ہمیں لاش دکھا دو۔ کیوں امّاں جان، شہزادے کی ماں کی کیا حالت ہوگی؟

بڑی بیگم : کیا بتاؤں بیٹا—

اولاد کسی کی نہ جدا ہوئے کسی سے
بیٹی، کوئی اس داغ کو پوچھے میرے جی سے

اتنے میں ایک آدمی نے آکر کہا کہ ہمایوں فر کی ماں رو رہی ہیں اور کہتی ہیں کہ دلہن کو لاش کے قریب لاؤ۔ ہمایوں فر کی روح خوش ہوگی۔ بڑی بیگم نے کہا— سوچ لو، ایسا کبھی ہوا نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ میری بچی ڈر جائے، اس کا تو اور دل بہلانا چاہیے، نہ کہ لاش دکھانا۔ اور لوگوں سے پوچھو، ان کی کیا رائے ہے۔ میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔

آخر یہ رائے طے پائی کہ دلہن لاش پر ضرور جائیں۔

سپہرآرا چلنے کو تیار ہو گئیں۔

بڑی بیگم : بیٹا، اب میں کیا کہوں، تمھاری جو مرضی ہو وہ کرو۔

سپہرآرا : بس، ہمیں لاش دکھا دو، پھر ہم کوئی تکلیف نہ دیں گے۔

بڑی بیگم : اچھا جاؤ، مگر اتنا یاد رکھنا کہ جو مرا وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔

سپہر آرا نے عبّاسی کو حکم دیا کہ جا کر صندوق لاؤ۔ صندوق آیا تو سپہر آرا نے اپنا قیمتی جوڑا نکالا، سہاگ کا عطر ملا، قیمتی دوپٹہ اوڑھا جس میں موتیوں کی بیل لگی ہوئی تھی۔ سر پر جڑاؤ چھپکا، جڑاؤ ٹیکا، چوٹی میں سیس پھول، ناک میں نتھ، جس کے موتیوں کی قیمت اچھے اچھے جوہری نہ لگا سکے، کانوں میں پتے، بالیاں، کرن پھول، گلے میں موتیوں کی مالا، طوق، چندن ہار، چمپا کلی، ہاتھوں میں کنگن، چوڑیاں، پور پور چھلّے، پاؤں میں پازیب، چھاگل۔ اس طرح سولہوں سنگار کر کے وہ بڑی بیگم اور عبّاسی کے ساتھ پالکی میں گاڑی میں سوار ہوئیں۔ شہر میں دھوم مچ گئی کہ دلہن دولہا کے لاش پر جاتی ہیں۔ شہزادے کی ماں کو اطلاع دی گئی کہ دلہن آتی ہیں۔ ذرا دیر میں گاڑی پہنچ گئی۔ ہزاروں آدمیوں نے چھاتی پیٹنا شروع کیا۔ سپہر آرا نے گاڑی سے اترتے ہی لاش کو چھاتی لگایا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر اونچی آواز سے کہا— پیارے شہزادے، ذری آنکھ کھول کر مسکرا دو۔ بس، دو دن ہنسا کر عمر بھر رلاؤ گے؟ ذری اپنی دلہن کو تو آنکھ بھر کے دیکھ لو۔ کیوں جی، یہی محبت تھی، اسی دن کے لیے دل ملایا تھا؟

شہزادہ کی ماں نے سپہر آرا کو چھاتی سے لگا کر کہا— بیٹی، ہمایوں فر تمھارے بڑے دشمن نکلے۔ ہائے، یہ اندھیر بھی کہیں ہوتا ہے کہ دلہن لاش پر آئے۔ نکاح کے وقت وکیل اور گواہ تو دور رہے، دوسرا مقدمہ چھڑ گیا۔

سپہر آرا نے اپنی ماں کی طرف دیکھ کر کہا— امّاں جان، آپ نے ہمارے ساتھ بڑی دشمنی کی۔ پہلے ہی شادی کر دیتیں تو یوں نامراد تو نہ جاتی۔

ادھر تو یہ کہرام مچا ہوا تھا، ادھر شہر کے بے فکر اپنی کھچڑی الگ ہی پکاتے تھے۔

ایک عورت : آج جب گھر سے نکلی تھی تو کانے آدمی کا منھ دیکھا تھا۔ ادھر ڈولی میں پاؤں گیا اور ادھر پٹ سے چھینک پڑی۔

دوسرا آدمی : اجی بی بی، نہ کچھ چھینک سے ہوتا ہے، نہ کسی سے، 'کرم لیکھ نہیں مٹے کرے کوئی لاکھن چترائی۔' قسمت کے لکھے کو کوئی بھی آج تک مٹا سکا ہے؟ دیکھیے، کروڑوں روپے گھر میں بھرے ہیں، مگر کس کام کے!

مولوی : میاں، دنیا کے یہی کارخانے ہیں، انسان کو چاہیے کہ کسی سے نہ جھگڑے، نہ کسی سے فساد کرے، بس، خدا کی یاد کرتا رہے۔

ایک بڑھیا: سنتے ہیں کہ دو تین دن سے رات کو بڑے بڑے خواب دیکھتے تھے۔

مولوی: ہم اس کے قائل نہیں، خواب کیا چیز ہے!

سپہر آرا کو اس وقت وہ دن آیا، جب شہزادہ ہمایوں فر اپنی بہن بن کر ان سے گلے ملنے گئے۔ ایک وہ دن تھا اور ایک آج کا دن ہے۔ ہم نے اس ہمایوں فر کو برا بھلا کیوں کہا تھا!

بڑی بیگم نے کہا— بیٹی، اب ذری بیٹھ جاؤ، دم لے لو۔

عبّاسی: حضور، اس مرض کا تو علاج ہی نہیں ہے۔

سپہر آرا: دوا ہر مرض کی ہے۔ اس مرض کی دوا بھی صبر ہی ہے۔ صبر ہی نے ہمیں اس قابل کیا کہ ہمایوں فر کی لاش اپنی آنکھوں دیکھ رہے ہیں!

جب لوگوں نے دیکھا کہ سپہر آرا کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے تو انھیں لاش کے پاس سے ہٹا لے گئے۔ گاڑی پر سوار کیا اور گھر لے گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر سپہر آرا رونے لگیں اور بڑی بیگم سے بولیں — اماں جان، اب ہمیں کہاں لیے چلتی ہو؟

بڑی بیگم: بیٹی، میں کیا کروں، ہائے!

سپہر آرا: اماں جان، کروگی کیا، میں نے کیا کر لیا؟

عبّاسی: ہماری قسمت پھوٹ گئی، شادی کا دن دیکھنا نصیب میں لکھا ہی نہ تھا۔ آج کے دن اور ہم ماتم کریں!

سپہر آرا: اماں جان، اس وقت بے چارہ کہاں ہوگا؟

بڑی بیگم: بیٹی، خدا کے کارخانے میں کس کو دخل ہے،

(85)

ایک پرانی، مگر اجاڑ بستی میں کچھ دنوں سے دو عورتوں نے رہنا شروع کیا ہے۔ ایک نام فروزہ ہے، دوسری کا فرخندہ۔ اس گاؤں میں کوئی ڈیڑھ ہزار گھر آباد ہوں گے، مگر ان سب میں دو ٹھاکروں کے مکان عالی شان تھے۔ فروزہ کا مکان چھوٹا تھا، مگر بہت خوشنما۔ وہ جوان عورت تھی، کپڑے لتے بھی صاف ستھرے پہنتی تھی، لیکن اس کی بات چیت سے اداسی پائی جاتی تھی۔ فرخندہ اتنی حسین تو نہ تھی، مگر خوش مزاج تھی۔ گاؤں والوں کو حیرت تھی کہ یہ دونوں

عورتیں اس گاؤں میں کیسے آ گئیں اور کوئی مرد بھی ساتھ نہیں! ان کے بارے میں لوگ طرح طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ گاؤں کی صرف دو عورتیں ان کے پاس جاتیں تھیں، ایک تنبولن، دوسری بیلدارن۔ یار لوگ ٹوہ میں تھے کہ یہاں کا کچھ بھید کھلے، مگر کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ تنبولن اور بیلدارن سے پوچھتے تھے تو وہ بھی آئیں بائیں سائیں اڑا دیتی تھیں۔

ایک دن اس گاؤں میں ایک کانسٹبل آ نکلا۔ آتے ہی ایک بنیے سے شکر مانگی۔ اس نے کہا— شکر نہیں، گڑ ہے۔ کانسٹبل نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، گالی دے بیٹھا۔ بنیے نے کہا— زبان پر لگام دو۔ گالی نہ زبان سے نکالو۔ اتنا سننا تھا کہ کانسٹبل نے بڑھ کر دو گھوسے لگائے اور دکان کی چیزیں پھینک پھانک دیں۔ سامنے والا دکاندار مارے ڈر کے شکر لے آیا، تب حضرت نے کہا— کالی مرچ لاؤ۔ وہ بے چارہ کالی مرچ بھی لایا۔ تب آپ نے دو لوٹے شربت کے پیے اور کنویں کی جگت پر لیٹ کر ایک لالہ جی کو پکارا— او لالہ، صرافی پیچھے کرنا، پہلے ایک چادر تو دے جاؤ۔ لالہ بولے— ہمارے پاس اور کوئی بچھونا نہیں ہے، بس ایک بسترا ہے۔ کانسٹبل اٹھ کر دکان پر گیا۔ چادر اٹھا لی اور کنویں کی جگت پر بچھا کر لیٹا۔ لالہ بے چارے منھ تاکنے لگے۔ ابھی حضرت سو رہے تھے کہ ایک عورت پانی بھرنے آئی۔ آپ نے پاؤں کی آہٹ جو پائی تو چونک اٹھے اور غل مچا کر بولے— الگ ہٹ، چلی وہاں سے گھڑا سر پر لیے پانی بھرنے! سوجھتا نہیں کون لیٹا ہے کون بیٹھا ہے اس پر ایک آدمی نے کہا، واہ! تم تو کنویں کے مالک بن بیٹھے؟ اب تمھارے مارے کوئی پانی نہ بھرے؟ دوسرا بولا— صراف کی دکان سے چادر لائے، مفت میں شکر لی اور ڈپٹ رہے ہیں۔

ایک ٹھاکر صاحب ٹٹو پر سوار چلے جاتے تھے۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر بولے— صاحب کو ایک عرضی دے دو، بس ساری شیخی کرکری ہو جائے۔

کانسٹبل نے للکارا— روک لے ٹٹو۔ ہم چالان کریں گے۔

ٹھاکر: کیوں روک لیں، ہم اپنی راہ جا رہے ہیں، تم سے مطلب؟

کانسٹبل: کہہ دیا، روک لو، یہ ٹٹو زخمی ہے۔ چلو، تمھارا چالان ہوگا۔

ٹھاکر: تو زخمی کہاں ہے؟ ہم ایسے ویسے ٹھاکر نہیں ہیں، ہم سے بہت رعب نہ جمانا۔

اتنے میں دو ایک آدمیوں نے آکر دونوں کو سمجھایا، بھائی، جوانا چھوڑ دو، عزّت دار آدمی ہیں۔ اس گاؤں کے ٹھاکر ہیں، ان کو بے عزّت نہ کرو۔

ادھر ٹھاکر کو سمجھایا کہ روپیہ ادھیلی لے دے کر الگ کرو، کہاں کی جھنجھٹ لگائی ہے۔ مفت میں چالا کر دے گا تو گاؤں بھر میں ہنسی ہوگی۔ کچھ یہ سمجھے، کچھ وہ سمجھے۔ اٹھنی نکال کر کانسٹبل کی نظر کی، تب جا کر پیچھا چھوٹا۔

اب تو گاؤں میں اور بھی دھاک بندھ گئی۔ پن بھرنیاں مارے ڈر کے پانی بھرنے نہ آئیں، یہ اِدھر اُدھر للکارنے لگے۔ غلّے کی چند گاڑیاں سامنے سے گزریں۔ آپ نے للکارا، روک لے گاڑی۔ کیوں بے، پٹری سے نہیں جاتا، سڑک تو صاحب لوگوں کے لیے ہے۔ ایک گاڑی وان نے کہا— اچھا صاحب، پٹری پر کیے دیتے ہیں۔ آپ نے اٹھ کر ایک طمانچہ لگا دیا اور بولے، اور سنو، ایک تو جرم کریں، دوسرے ٹرّائیں۔ سب کے سب دنگ ہو گئے کہ ٹرّایا کون، اس بے چارے نے تو ان کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ حلوائی سے کہا— ہم کو سیر بھر پوری تول دو۔ وہ بھی کانپ رہا تھا کہ دیکھیں، کب شامت آتی ہے، کہا، ابھی لایا۔ تب آپ بولے کہ آلو کی ترکاری ہے؟ وہ بولا— آلو تو ہمارے پاس نہیں ہے، مگر اس کھیت سے کھدوا لاؤ تو سب معاملہ ٹھیک ہو جائے۔ کہنے بھر کی دیر تھی۔ آپ جا کر کسان سے بولے— ارے، ایک آدھ سیر آلو کھود دے۔ اس کی شامت جو آئی تو بولا— صاحب، چار آنے سیر ہوئی، چاہے لیو چاہے نہ لیو۔ سمجھ لو۔ آپ نے کہا، اچھا بھائی، لاؤ، مگر بڑے بڑے ہوں۔

کسان آلو لایا۔ ترکاری بنی، جب آپ چلنے لگے تو کسان نے پیسے مانگے۔ اس کے جواب میں آپ نے اس غریب کو پیٹنا شروع کیا۔

کسان : سیر بھر آلو لی ہس، اور اوپر سے مارتا ہے۔

مُرائن : اور الٹی گے پلوا بکت ہے، رام کرے، دیوی بھوانی کھا جائیں۔

لوگوں نے کسان کو سمجھایا کہ سرکاری آدمی کے منھ کیوں لگتے ہو۔ جو کچھ ہوا سو ہوا، اب انھیں دو سیر آلو لا دو۔ کسان آلو کھود لایا۔ آپ نے اسے رومال میں باندھا اور 8 پیسے نکال کر حلوائی کو دینے لگے۔

حلوائی : یہ بھی رہنے دو، پان کھا لینا۔

کانسٹبل : خوشی تمھاری۔ آلو تو ہمارے ہی تھے۔

حلوائی : بس، اب سب آپ ہی کا ہے۔

کانسٹبل نے کھا پی کر لمبی تانی تو دو گھنٹے تک سویا کیے۔ جب اٹھے تو پسینے میں تر تھے۔

ایک گنوار کو بلا کر کہا— پنکھا جھل۔ وہ بے چارہ پنکھا جھلنے لگا۔ جب آپ غافل ہوئے تو اس نے ان کی لٹیا اور لکڑی اٹھائی اور چلتا دھندا کیا۔ یہ ان کے بھی استاد نکلے۔

جمعدار کی آنکھ کھلی تو پنکھا جھا، والے کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو لٹیا غائب۔ لاٹھی ندارد۔ لوگوں سے پوچھ، دھمکایا ڈرایا مگر کسی نے نہ سنا۔ اور بتائے کون؟ سب کے سب تو جلے بیٹھے تھے۔ تب آپ نے چوکیداروں کو بلایا اور دھمکانے لگے۔ پھر سبھوں کو لے کر گاؤں کے ٹھاکر کے پاس گئے اور کہا— اسی دم دوڑ آئے گی۔ گاؤں بھر پھونک دیا جائے گا، نہیں تو اپنے آدمیوں سے پتہ لگواؤ۔

ٹھاکر : لے اب ہم کس کس اپاؤ کری۔ چور کا کہاں ڈھونڈھی؟

جمعدار : ہم نہیں جانتا۔ ٹھاکر ہو کر کے ایک چور کا پتہ نہیں لگا سکتا۔

ٹھاکر : تم ہو تو پولس کے نوکر ہو۔ ڈھونڈ نکالو۔

ٹھاکر صاحب سے لوگوں نے کہا— یہ سپاہی بڑا شیطان ہے۔ صاحب کو لکھ بھیجئے کہ ہماری رعایا کو ستاتا ہے۔ بس، یہ موقوف ہو جائے۔ ٹھاکر بولے— ہم سرکاری آدمیوں سے بت بڑھاؤ نہیں کرتے۔ کانسٹبل کو تین روپے دے کر دروازے سے ٹالا۔

جمعدار صاحب یہاں سے خوش خوش چلے تو ایک گھوسی کی لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگے۔ اس نے جا کر اپنے باپ سے کہہ دیا۔ وہ پہلوان تھا، لنگوٹ باندھ کر آیا اور جمعدار صاحب کو پٹک کر خوب پیٹا۔

بہت سے آدمی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جمعدار نے چوں تک نہ کی، چپکے سے جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور گاؤں کی دوسری طرف چلے۔ اتفاق سے فروزہ اپنی چھت پر کھڑی بال سلجھا رہی تھی۔ جمعدار کی نظر پڑی تو حیرت ہوئی۔ بولے— ارے، یہ کس کا مکان ہے؟ کوئی ہے اس میں؟

پڑوسی : اس مکان میں ایک بیگم رہتی ہے۔ اس وقت کوئی مرد نہیں ہے۔

جمعدار : تُو کون ہے؟ بتا اس میں کون رہتا ہے؟ اور مکان کس کا ہے؟

پڑوسی : مکان تو ایک اَہیر کا ہے، مُل اس میں ایک بیگم ٹکی ہیں۔

جمعدار : کہو، دروازے پر آویں۔ بلا لاؤ۔

پڑوسی : واہ، وہ پردے والی ہیں۔ دروازے پر نہ آئیں گی۔

جمعدار : کیا! پردہ کیسا؟ بلاتا ہے کہ گھس جاؤں گھر میں؟ پردہ لیے پھرتا ہے!

فروزہ کے ہوش اڑ گئے۔ فرخندہ سے بولی— اب غضب ہو گیا۔ بھاگ کے یہاں آئی تھی، مگر یہاں بھی وہی بلا سر پر آئی۔

فرخندہ اس کو کہاں سے خبر ہوئی؟

فروزہ : کیا بتاؤں! اس وقت کون اس سے سوال جواب کرے گا؟

فرخندہ : دیکھیے، پڑوسن کو بلاتی ہوں۔ شاید وہ کام آئیں۔

دروازہ کھلنے میں دیر ہوئی تو کانسٹبل نے دروازے پر لات ماری اور کہا— کھول دو دروازہ، ہم دوڑ لائے ہیں۔ محلّے والوں نے کہا— بھائی، تمھارے پاس نہ سمّن، نہ سفینہ۔ پھر کس کے حکم سے دروازہ کھلواتے ہو؟ ایسا بھی کہیں ہوا ہے۔ ان بے چاریوں کا جرم تو بتاؤ۔

جمعدار : جرم چل کے صاحب سے پوچھو۔ جن کے بھیجے ہم آئے ہیں۔ سمّن سفینہ دیوانی کے مذکوری جاتے ہیں۔ ہم پولس کے آدمی ہیں۔

دوسرے آدمی نے آگے بڑھ کر کہا— سنو بھئی جوان، تم اس وقت بڑا بھاری ظلم کر رہے ہو۔ بھلا اس طرح کوئی کاہے کو رہنے پائے گا۔

جمعدار نے اکڑ کر کہا— تم کون ہو؟ اپنا نام بتاؤ! تم سرکاری آدمی کو اپنا کام کرنے سے روکتے ہو۔ ہم رپٹ بولیں گے۔

یہ سن کر وہ حضرت چکرائے اور چپکے سے لمبے ہوئے۔ تب جمعدار نے غل مچا کر کہا، مخبروں نے ہمیں خبر دی ہے کہ تمھارے لڑکا ہونے والا ہے۔ ہم کو حکم ہے کہ دروازے پر پہرہ دیں۔

پڑوسن نے جو یہ بات سنی تو دانتوں تلے انگلی دبائی— اے ہے، یہ غضب خدا کا، ہمیں آج تک معلوم ہی نہ ہوا، ہم بھی سوچتے تھے کہ یہ جوان جہان عورت شہر سے بھاگ کر گاؤں میں کیوں آئی! یہ معلوم ہی نہ تھا کہ یہاں کچھ اور غل کھلنے والا ہے۔

اتنے میں فرخندہ نے کوٹھے پر جا کر پڑوسن سے کہا— ذری اپنے میاں سے کہو کہ اس سپاہی سے کل حال پوچھیں— ماجرا کیا ہے؟

پڑوسن کچھ سوچ کر بولی— بھئی، ہم اس معاملے میں دخل نہ دیں گے۔ اوہو، تمھاری بیگم نے تو اچھا جال پھیلایا تھا، ہمارے میاں کو معلوم ہو جائے کہ یہ ایسی ہیں تو محلّے سے

کھڑے کھڑے نکلوا دیں۔

اتنے میں پڑوسن کے میاں بھی آئے۔ فرخندہ ان سے بولیں، خاں صاحب، ذری اس سپاہی کو سمجھائیے، یہ ہمارے بڑی مصیبت کا وقت ہے۔

خاں صاحب : کچھ نہ کچھ تو اسے دینا ہی پڑے گا۔

فرخندہ : اچھا، آپ فیصلہ کرا دیں۔ جو مانگے وہ ہم سے اسی دم لے۔

خاں صاحب : ان پاجیوں نے ناک میں دم کر دیا ہے اور اس طرف کی رعایا ایسی بودی ہے کہ کچھ نہ پوچھو۔ سرکار ان پیادوں کو انتظام کے لیے رکھا ہے اور یہ لوگ زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔ سرکار کو معلوم ہو جائے تو کھڑے کھڑے نکال دیے جائیں۔

پڑوسن : پہلے بیگم سے یہ تو پوچھو کہ شہر سے یہاں آکر کیوں رہی ہیں؟ کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔

فرخندہ نے دو روپے دیے اور کہا، جا کر یہ دے دیجیے۔ شاید مان جائے۔ خاں صاحب نے روپے دیے تو سپاہی بگڑ کر بولا۔ یہ روپیہ کیسا؟ ہم رشوت نہیں لیتے!

خاں صاحب : سنو میاں، جو ہم سے ٹراؤ گے، تو ہم ٹھیک کر دیں گے۔ ٹکے کا پیادہ، مزاج ہی نہیں ملتا۔

سپاہی : میاں، کیوں شامتیں آئی ہیں، ہم پولس کے لوگ ہیں، جس وقت چاہیں، تم جیسوں کو ذلیل کر دیں۔ بتلاؤ تمھاری گزر بسر کیسی ہوتی ہے۔ بچہ، کسی بھلے گھر کی عورت بھگا لائے ہو اور اوپر سے ٹرّاتے ہو!

خاں صاحب : یہ دھمکیاں دوسروں کو دینا۔ یہاں تم جیسے کو انگلیوں پر نچاتے ہیں۔

سپاہی نے دیکھا کہ یہ آدمی کڑا ہے تو آگے بڑھا۔ ایک نان بائی کی دکان پر بیٹھ کر مزے سے پلاؤ اڑایا اور سڑک پر جا کر ایک گاڑی پکڑی۔ گاڑی وان کی لڑکی بیمار تھی۔ بے چارہ گڑگڑانے لگا، مگر سپاہی نے ایک نہ مانی۔ اس پر ایک بابو جی بول اٹھے— بڑے بے رحم آدمی ہو جی چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟

سپاہی : کپتان صاحب نے منگوایا ہے، چھوڑ کیسے دوں؟ یہ اسی طرح کے بہانے کیا کرتے ہیں، زمانے بھر کے جھوٹے!

آخر گاڑی وان نے سات پیسے اور ایک کدو دے کر گلا چھڑوایا۔ تب آپ نے ایک

چبوترے پر بستر جمایا اور چوکیدار سے حقہ بھروا کر پینے لگے۔ جب ذرا اندھیر ہوا، تو چوکیدار نے آ کر کہا— حولدار صاحب، بڑا اچھا شکار چلا جات ہے۔ ایک مہاجن کی مہریا بیل گاڑی پر بیٹھی چلی جات ہے۔ گہنن سے لدی ہے۔

سپاہی : یہاں سے کتنی دور ہے،

چوکیدار : کچھ دور ناہن، گھڑی بھر میں پہنچ جیہو۔ بس ایک گاڑی وان ہے اور ایک چھوکرا۔ تیسرا کوؤ نہیں۔

سپاہی : تب تو مار لیا ہے۔ آج کسی بھلے آدمی کا منھ دیکھا ہے۔ ہمارے ساتھ کون کون چلے گا۔

چوکیدار : آدمی سب ٹھیک ہیں، کہے بھر کی دیر ہے۔ حکم ہوئے تو ہم جا کے سب ٹھیک کری۔

سپاہی : ہاں ہاں اور کیا؟

اب سنیے کہ مہاجن کی گاڑی بارہ بجے رات کو ایک باغ کی طرف سے گزری جا رہی تھی ایکا ایک چھ سات آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔ گاڑی وان کو ایک ڈنڈا مارا۔ کہار کو بھی مار کے گرا دیا۔ عورت کے زیور اتار لیے اور چور چور کا شور مچانے لگے۔ گاؤں میں شور مچ گیا کہ ڈاکہ پڑ گیا۔ کانسٹبل نے جا کر تھانے میں اطلاع کی۔ تھانے دار نے چوکیدار سے پوچھا، تمھارا کس پر شک ہے! چوکیدار نے کئی آدمیوں کا نام لکھایا اور فروزہ کے پڑوسی خاں صاحب بھی انھی میں تھے۔ دوسرے دن اسی سپاہی نے خاں صاحب کے دروازے پر پہنچ کر پکارا۔ خاں صاحب نے باہر آ کر سپاہی کو دیکھا تو مونچھوں پر تاؤ دے کر بولے، کیا ہے صاحب، کیا حکم ہے؟

سپاہی : چلیے، وہاں برگد کے تلے تحقیقات ہو رہی ہے۔ داروغہ جی بلاتے ہیں۔

خاں : کیسی تحقیقات؟ کچھ سنیں تو۔

سپاہی : معلوم ہو جائے گی! چلیے تو سہی۔

خاں : سنو جی، ہم پٹھان ہیں۔ جب تک چپ ہیں تب تک چپ ہیں۔ جس دم غصہ آیا، پھر یا تم نہ ہوگے یا ہم نہ ہوں گے۔ کہاں چلیں، کہاں؟

سپاہی : مجھے آپ سے کوئی دشمنی تو ہے نہیں، مگر داروغہ جی کے حکم سے مجبور ہوں۔

چوکیدار : لودھے کو بلایا ہے، گھوسی کو اور تم کو۔

خاں : ایں، وہ تو سب ڈاکو ہیں۔

سپاہی : اور آپ بڑے ساہو ہیں! بڑی شیخی۔

خاں : کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو؟

سپاہی : اب چلیے گا یا وارنٹ آئے۔

خاں صاحب گھر میں کپڑے پہنے گئے تو بی بی نے کہا، کیسے پٹھان ہو؟ موئے پیادے کی کیا حقیقت ہے کہ دروازے پر کھوٹی کھری کہے۔ بھلا دیکھوں تو نگوڑا تمھیں کیوں کر لے جاتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ دروازے پر آکر بولیں، کیوں رے، تو انھیں کہاں لیے جاتا ہے؟ بتا، کس بات کی تحقیقات ہوگی؟ کیا تیرا باپ قتل کیا گیا ہے،

سپاہی : آپ خاں صاحب کو بھیج دیں۔ اجی خاں صاحب، آیئے گا یا وارنٹ آئے؟

بیوی : وارنٹ لے جا اپنے ہوتوں سوتوں کے یہاں۔

سپاہی : یہ عورت تو بڑی کلّہ دراز ہے۔

بیوی : میرے منھ لگے گا تو منھ پکڑ کے جھلس دوں گی۔ وارنٹ اپنے باپ دادا کے نام لے جا!

اتنے میں خاں صاحب ڈھاٹا باندھ کر باہر نکلے اور بولے— لے تجھے دائیں ہاتھ کھانا حرام ہے جو نہ لے چلے۔

سپاہی : بس، بہت بڑھ بڑھ کر باتیں نہ کیجیے، چپکے سے میرے ساتھ چلیے۔

خاں صاحب اکڑتے ہوئے چلے تو سپاہی نے فروزہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا، انھیں تو لیے جاتے ہیں، اب تمھاری باری بھی آئے گی۔

خاں صاحب برگد کے نیچے پہنچے تو دیکھا، گاؤں بھر کے بدمعاش جمع ہیں اور داروغہ جی چارپائی پر بیٹھے حقّہ پی رہے ہیں۔ بولے، کیوں جناب، ہمیں کیوں بلایا؟

داروغہ : آج گاؤں بھر کے بدمعاشوں کی دعوت ہے۔

خاں صاحب نے ڈنڈے کو تول کر کہا، تو پھر دو ایک بدمعاشوں کی ہم بھی خبر لیں گے۔

داروغہ : بہت گرمایئے نہیں، چوکیداروں نے ہم سے جو کہا وہ ہم نے کیا۔

خاں : اور جو چوکیدار آپ کو کنوئیں میں کود پڑنے کی صلاح دے؟

داروغہ تو ہم کود پڑیں۔

خاں : تو ہماری نسبت آخر کیا جرم لگایا گیا ہے؟

داروغہ : کل رات کو تم کہاں تھے؟

خاں : اپنے گھر پر اور کہاں۔

چوکیدار : حضور، بکھری میں ناہی رہے اور ایک منئی اِن کا وہی باغ کے بھیتر دیکھس رہا۔

خاں صاحب نے چوکیدار کو ایک چانٹا دیا، سؤر، ابے ہم چور ہیں؟ رات کو ہم گھر پر نہ تھے؟ داروغہ نے کہا، کیوں جی، ہمارے سامنے یہ مار پیٹ! تم بھی پٹھان ہو اور ہم بھی پٹھان ہیں۔ اگر اب کی ہاتھ اٹھایا تو تمھاری خیرت نہیں۔

اتنے میں ایک انگیر گھوڑے پر سوار ادھر سے آ نکلا۔ یہ جمگھٹ دیکھ کر داروغہ سے بولا کیا بات ہے؟ داروغہ نے کہا، غریب پرور، ایک مقدمے کی تحقیقات کرنے آئے ہیں۔ اس پٹھان کی نسبت ایک چوری کا شک ہے، مگر یہ تحقیقات نہیں کرنے دیتا۔ چوکیدار کو کئی مرتبہ پیٹ چکا ہے۔ چوکیدار نے کہا، دہائی ہے صاحب کی! دہائی ہے مارے ڈارت ہے۔

صاحب نے کہا— ویل، چلان کرو۔ ہماری گواہی لکھوا دو، ہمارا نام میجر کراس ہے۔

لیجیے، چوری اور ڈاکہ تو دور رہا، ایک نیا، جرم ثابت ہو گیا۔

اب داروغہ جی نے گواہوں کے بیان لکھنے شروع کیے۔ پہلے ایک تنبولن آئی۔ بھڑکیلا لہنگا پہنے ہوئے، مانگ چوٹی سے لیس، منھ میں گلوری دبی ہوئی، ہاتھ میں پان کے بیڑے، آکر داروغہ جی کو بیڑے دے کر کھڑی ہو گئی۔

داروغہ : تم نے خاں صاحب کو رات کے وقت کہاں دیکھا تھا؟

تنبولن : اس پورے کے پاس۔ ان کے ساتھ تین چار آدمی اور تھے۔ سب لٹھ بند۔ ایک آدمی نے کہا، چھین لو ساس سے، میں بولی کہ بوٹیاں نوچ لوں گی، میں کوئی گنوارن نہیں ہوں۔ خاں صاب نے مجھ سے کہا، تنبولن، کہو فتح ہے۔

خاں : اری تنبولن۔

تنبولن : ذری، اری تری نہ کرنا مجھ سے، میں کوئی چمارِن نہیں ہوں۔

خاں : تم نے ہم کو چور کے ساتھ دیکھا تھا؟

تنبولن : دیکھا ہی تھا۔ کیا کچھ اندھے ہیں، چور تو تم ہو ہی۔

خاں : خدا اس جھوٹ کی سزا دے گا۔

تنبولن : اس کا حال تو جب معلوم ہوگا جب بڑے گھر میں چکّی پیسوگے۔

خاں : اور وہاں گیت گانے کے لیے تم کو بلا لیں گے۔

دوسرے گواہ نے بیان کیا، میں رات کو گیارہ بجے اس پورے کی طرف جاتا تھا تو خاں صاحب مجھے ملے تھے۔

خاں : قسم خدا کی، کوئی آدمی میری ہی شکل کا رہا ہوگا۔

داروغہ : آپ نے ٹھیک کہا۔

کالے خاں : جب پٹھان ہو کے ایسی حرکتیں کرنے لگے تو اس گاؤں کا خدا ہی مالک ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سفید پوش آدمی ڈاکہ ڈالے گا۔

خاں : خدا کی قسم، جی چاہتا ہے سر پیٹ لوں، مگر خیر، ہم بھی اس کا مزہ چکھا دیں گے۔

داروغہ : پہلے اپنے گھر کی تلاشی تو کروایئے، مزہ پیچھے چکھوایئے گا۔

یہ کہہ کر داروغہ جی خاں صاحب کے گھر پہنچے اور کہا، جلدی پردہ کرو، ہم تلاشی لیں گے۔ خاں صاحب کی بیوی نے سینکڑوں گالیاں دیں، مگر مجبور ہو کر پردہ کیا۔ تلاشی ہونے لگی۔ دو بالیاں نکلیں، ایک جگنو اور ایک چھپکا! خاں صاحب کی بیوی حقّہ بکّا ہو کر رہ گئی، یہ زیور یہاں کہاں سے آئے؟ یا خدا، اب ہماری آبرو تیرے ہی ہاتھ ہے!

(86)

فروزہ بیگم اور فرخندہ رات کے وقت سو رہی تھی کہ دھماکے کی آواز ہوئی۔ فرخندہ کی آنکھ کھل گئی۔ یہ دھماکہ کیسا؟ منھ پر سے چادر اٹھائی، مگر اندھیر دیکھ کر اٹھنے کی ہمّت نہ پڑی۔ اتنے میں پاؤں کی آہٹ ملی۔ روئیں کھڑے ہوگئے۔ سوچی، اگر بولی تو یہ سب حلال کر ڈالیں گے۔ دبکی پڑی رہی۔ چور نے اسے گود میں اٹھایا اور باہر لے جا کر بولا— سنو عبّاسی، ہم کو تم خوب پہچانتی ہو؟ اگر نہ پہچان سکی ہو، تو اب پہچان لو۔

پہچانتی کیوں نہیں، مگر یہ بتاؤ کہ یہاں کس غرض سے آئے ہو؟ اگر ہماری آبرو لینی

چاہتے ہو تو قسم کھا کر کہتی ہوں، زہر کھا لوں گی۔

چور : ہم تمھاری آبر نہیں چاہتے، صرف تمھار زیور چاہتے ہیں۔ تم اپنی بیگم کو جگاؤ، ذرا ان سے ملوں گا۔ ناحق اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی ہیں، ہمارے ساتھ نکاح کیوں نہیں کر لیتیں؟

یکا یک فروزہ کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو مرزا آزاد کھڑے ہیں۔ بولی، آزاد مرزا، اگر ہمیں دِق کرنے سے تمھیں کچھ ملتا ہو تو تم کو اختیار ہے۔ ناحق کیوں ہماری جان کے دشمن ہوئے ہو؟ اس مصیبت کے وقت تم سے مدد کی امید تھی اور تم الٹے گلا ریتنے کو موجود!

عباسی : بیگم آپ کو ہمیشہ یاد کیا کرتی ہیں۔

آزاد : میرے لائق جو کام ہو، اس کے لیے حاضر ہوں، تمھارے لیے جان تک حاضر ہے۔

ثریا : آپ کو جان آپ کو مبارک رہے، ہم صرف ایک کام کو کہتے ہیں۔ یہاں ایک کانسٹبل نے ہمیں بہت دق کیا ہے، تم کسی تدبیر سے ہمیں اس کے پنجے سے چھڑاؤ، (آزاد کے کان میں کچھ کہہ کر) مجھے اس بات کا بڑا رنج ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

آزاد : وہی کانسٹبل تو نہیں ہے جو خاں صاحب کو پکڑ لے گیا ہے۔

فیروزہ : ہاں، ہاں، وہی۔

آزاد : اچھا، سمجھا جائے گا۔ کھڑے کھڑے اس سے سمجھ لوں تو سہی۔ اس نے اچھے گھر بیانا دیا۔

ثریا : کمبخت نے میری آبرو لے لی، کہیں مجھ دکھانے لائق نہ رکھا۔ یہاں بھی بلا کی طرح سر پر سوار ہو گیا۔ تم نے بھی اتنے دنوں کے بعد آج خبر لی۔ دوسروں کا درد تم کیا سمجھو گے۔ جو بے عزّتی کبھی نہ ہوئی تھی وہ آج ہو گئی۔ ایک دن وہ تھا کہ اچھے اچھے آدمی سلام کرنے آتے تھے اور آج ایک کانسٹبل میری آبرو مٹانے پر تلا ہوا ہے اور تمھارے ہوتے!

آزاد : ثریا بیگم، خدا کی قسم مجھے بالکل خبر نہ تھی، میں اسی وقت جا کر داروغہ اور کانسٹبل دونوں کو دیکھتا ہوں۔ دیکھ لینا، صبح تک ان کی لاش پھڑکتی ہوگی، ایسے ایسے کتوں کو جہنم کے گھاٹ اتار چکا ہوں۔ اس وقت رخصت کرو، کل پھر ملوں گا۔

یہ کہہ کر آزاد مرزا باہر نکلے۔ یہاں ان کے کئی ساتھی کھڑے تھے، ان سے بولے،

بھائی جوانوں! آج کوتوال کے گھر ہماری دعوت ہے، سمجھ گئے، تیار ہو جاؤ۔ اسی وقت آزاد مرزا اور لکشمی ڈاکو، گل باز، رامو اور یہ سب کے سب داروغہ کے مکان پر جاپہنچے رامو کو تو بیٹھک میں رکھا اور اور محلّے بھر کے مکانوں کی کنڈیاں بند کر کے داروغہ جی کے گھر میں سیند لگانے کی فکر کرنے لگے۔

دربان : کون! تم لوگ کون ہو، بولتے کیوں نہیں؟

آزاد : کیا بتائیں، مصیبت کے مارے ہیں، ادھر سے کوئی لاش تو نہیں نکلی؟

دربان : ہاں، نکلی تو ہے، بہت سے آدمی ساتھ تھے۔

آزاد : ہمارے بڑے دوست تھے، افسوس!

لکشمی : حضور، صبر کیجیے، اب کیا ہوسکتا ہے۔

دربان : ہاں بھائی، پرمیشور کی مایا کون جانتا ہے، آپ کون ٹھاکر ہیں؟

لکشمی : قنوجیا براہمن ہیں، بے چارے کے دو چھوٹے بچے ہیں، کون ان کی پرورش کرے گا۔

دربان کو باتوں میں لگا کر ان لوگوں نے اس کی مشکیں کس لیں اور کہا، بولے اور ہم نے قتل کیا۔ بس، منھ بند کیے پڑے رہو۔

دیوار میں سیند پڑنے لگی۔ رامو کہیں سے سرکہ لایا۔ سرکہ چھڑک چھڑک کر دیوار میں سیند دی۔ اتنے میں ایک کانسٹبل نے ہانک لگائی۔ جاگتے رہیو، اندھیری رات ہے۔

آزاد : ہمارے لیے اندھیری رات نہیں، تمھارے لیے ہوگی۔

چوکیدار : تم لوگ کون ہو؟

آزاد : تیرے باپ۔ پہچانتا ہے یا نہیں؟

یہ کہہ کر آزاد نے کرولی سے چوکیدار کا کام تمام کر دیا۔

لکشمی : بھائی، یہ تم نے برا کیا۔ کتنی بے رحمی سے اس بے چارے کی جان لی!

آزاد : بس، معلوم ہو گیا کہ تم نام کے چور ہو، بالکل کچے!

اب یہ تجویز پائی کہ مرزا آزاد سیند کے اندر جائیں۔ آزاد نے پہلے سیند میں پاؤں ڈالے، ڈالتے ہی کسی آدمی نے اندر سے تلوار جمائی، دونوں پاؤں کھٹ سے الگ۔

آزاد : ہائے مرا! ارے دوڑو۔

لکشمی : بڑا دھوکہ ہوا، کہیں کے نہ رہے!

چاروں نے مل کر آزاد مرزا کا دھڑ اٹھایا اور روتے پیٹتے لے چلے، مگر راستے ہی میں پکڑ لیے گئے۔

محلّے بھر میں جاگ ہو گئی۔ اب جو دروازہ کھولتا ہے، بند پاتا ہے۔ یہ دروازہ کون بند کر گیا؟ دروازہ کھولو! کوئی سنتا ہی نہیں۔ چاروں طرف یہی آوزیں آ رہی تھیں۔ صرف ایک دروازے میں باہر سے کنڈی نہ تھی۔ ایک بوڑھا سپاہی ایک ہاتھ میں مشال، دوسرے میں سروہی لیے باہر نکلا۔ دیکھا تو داروغہ جی کے گھر میں سیند پڑی ہوئی ہے! چور چور!

ایک کانسٹبل : خون بھی ہوا ہے۔ جلد آؤ۔

سپاہی : مار لیا ہے، جانے نہ پاوے۔

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولنے شروع کیے۔ لوگ فوراً لٹھ لے لے کر نکلے، دیکھا تو چوروں اور کانسٹبلوں میں لڑائی ہو رہی ہے۔ ان آدمیوں کو دیکھتے ہی چور تو بھاگ نکلے! آزاد مرزا اور چھمی رہ گئے۔ آزاد کی ٹانگیں کٹی ہوئی۔ چھمی زخمی۔ تھانے پر خبر ہوئی۔ داروغہ جی بھاگے ہوئے اپنے گھر آئے۔ معلوم ہوا کہ ان کے گھر کی بارن نے چوروں کو سیند دیتے دیکھ لیا تھا۔ فوراً جا کر کوٹھری میں بیٹھ رہی۔ جیوں ہی آزاد مرزا نے سیند میں پاؤں ڈالا، تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔

آزاد پر مقدمہ چلایا گیا۔ جرم ثابت ہو گیا۔ کالے پانی بھیج دیے گئے۔

جب جہاز پر سوار ہوئے تو ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ آزاد نے پوچھا، کہو بھائی، کیا کیا تھا؟ اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا، بھائی کیا بتاؤں؟ بے قصور ہوں۔ فوج میں نوکر تھا، عشق کے پھیر میں پڑ کر نوکری چھوڑی، مگر معشوق تو نہ مُلا، ہم خراب ہو گئے۔

یہ شہسوار تھا۔

(87)

خاں صاحب پر مقدمہ تو دائر ہو ہی گیا تھا، اس پر داروغہ جی دشمن تھے۔ دو سال کی سزا ہو گئی۔ تب داروغہ جی نے ایک عورت کو ثریّا بیگم کے مکان پر بھیجا۔ عورت نے آ کر سلام کیا اور بیٹھ گئی۔

ثریّا : کون ہو؟ کچھ کام ہے یہاں؟
عورت : اے حضور، بھلا بغیر کام کے کوئی بھی کسی کے یہاں جاتا ہے؟ حضور سے کچھ کہنا ہے، آپ کے حسن کا دور دور تک شہرہ ہے۔ اس کا کیا سبب ہے کہ حضور اس عمر میں، اس حالت میں زندگی بسر کرتی ہیں؟
ثریّا : بہن، میں ایک مصیبت کی ماری عورت ہوں۔
عورت : اے حضور، مجھے بہن نہ کہیں، میں لونڈی، حضور شہزادی ہیں۔ حضور پر ایسی کیا مصیبت ہے؟ حضور تو اس قابل ہیں کہ بادشاہوں کے محل میں ہوں۔
ثریّا : خدا دشمن پر بھی ایسی مصیبت نہ ڈالے۔ میں تو زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔
عورت : اللہ مالک ہے۔ کوشش یہ کرنی چاہیے کہ دنیا میں عزّت کے ساتھ رہے اور کسی کا ہو کے رہے۔
ثریّا : مگر جب خدا کو بھی منظور ہو۔ ہم نے تو بہت چاہا کہ شادی کر لیں، مگر خدا کو منظور ہی نہ تھا۔ قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے؟
عورت : حضور کا حکم ہو تو کہیں فکر کروں؟
ثریّا : ہم کو معاف کیجیے۔ ہم اب شادی نہ کریں گے۔
عورت : حضور سے میں ابھی جواب نہیں چاہتی۔ خوب سوچ لیجیے۔ دو تین دن میں جواب دیجیے گا۔ یہاں ایک رئیس زادے رہتے ہیں، بہت ہی خوبصورت، خوش مزاج اور شوقین۔ دل بہلانے کے لیے نوکری کر لی ہے۔ حکومت کی نوکری ہے۔
ثریّا : حکومت کی نوکری کیسی ہوتی ہے؟
عورت : ایسی نوکری، جس میں سب پر حکومت کریں۔ کوتوال ہیں۔
عبّاسی : اچھا، انھی تھانے دار کا پیغام لائی ہوگی۔
عورت : اے، تھانے درا کاہے کو ہیں، برائے نام نوکری کر لی، ورنہ ان کو نوکری کی کیا ضرورت ہے، وہ ایسے ایسے دس تھانے داروں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔
عبّاسی : حضور کو تو شادی کرنا منظور ہی نہیں ہے۔
عورت : واہ! کیسی باتیں کرتی ہو۔
ثریّا : تم ان کی سکھائی پڑھائی آئی ہو، ہم سمجھ گئے۔ ان سے کہہ دینا کہ ہم بے کس

عورت ہیں، ہم پر رحم کرو، کیوں ہماری جان کے دشمن ہوئے ہو، ہم نے تمھارا کیا بگاڑا ہے جو پنجے جھاڑ کے ہمارے پیچھے پڑے ہو؟

عورت : حضور کی قسم، انھوں نے نہیں بھیجا ہے۔

ثریا : اچھا تو اس میں زبردستی کاہے کی ہے۔

عورت : آپ کے اور ان کے دونوں کے حق میں یہی اچھا ہے کہ حضور انکار نہ کریں۔ وہ افسر پولس ہیں، ذرا سی دیر میں بے آبرو کر سکتے ہیں۔

ثریا : ہمرا بھی خدا ہے۔

عورت : خیر، نہ مانو۔

عورت دو چار باتیں سنا کر چلی گئی، تو عباسی اور ثریا بیگم صلاح کرنے لگیں۔

ثریا : اب یہاں سے بھی بھاگنا پڑا، اور آج ہی کل میں۔

عباسی : اس موئے کو ایسی ضد پڑ گئی کہ کیا کہیں! مگر اب بھاگ کے جائیں گے کہاں؟

ثریا : جدھر خدا لے جائے۔ کہیں سے لالہ خوش وقت رائے کو لاؤ، بڑا نمک حلال بڈھا ہے۔ کوئی ایسی تدبیر کرو کہ وہ کل صبح تک یہاں آ جائے۔

عباسی : کہیے تو کلّو کو بھیجوں، بلا لائے۔

کلّو قوم کا لوہار تھا۔ اوپر سے تو ملا ہوا تھا مگر دل میں ان کا دشمن تھا۔ عباسی نے اس کو بلا کے کہا، تم جا کے لالہ خوش ونت رائے کو لوا لاؤ۔ کلّو نے کہا، تم ساتھ چلو تو کیا مضائقہ ہے، مگر اکیلا تو میں نہ جاؤں گا۔ آخر یہی طے ہوا کہ عباسی بھی ساتھ جائے۔ شام کے وقت دونوں وہاں سے چلے۔ عباسی مردانہ بھیس میں تھی۔ کچھ دور چل کر کلّو بولا، عباسی، برا نہ مانو تو ایک بات کہوں! تم اس بیگم کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کرتی ہو؟ ان کی جمع جتھا لے کر چلی آؤ اور میرے گھر پڑ رہو۔

عباسی : تم مردوں کا اعتبار کیا۔

کلّو : ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں۔

عباسی : بھلا اب لالہ صاحب کا مکان کتنی دور ہوگا؟

کلّو : یہی کوئی دو کوس، کہو تو سواری کرائے کر لوں یا گود میں لے چلوں۔

عباسی : ایں، یا تو گھر بیٹھاتے تھے، یا گود بٹھانے لگے۔

کلّو : بھئی، بہت کہی، ایسی کہی کہ ہماری زبان بند ہو گئی۔

عبّاسی : اے، تم ایسے گنواروں کو بند کرنا کون بات ہے۔

تھوڑی دیر میں دونوں ایک مکان میں پہنچے۔ یہ کلّو کے دوست شیو دین کا مکان تھا۔ شیو دین نے کہا، آؤ یار، مزاج اچھے؟

کلّو : سب چین ہی چین ہے۔ ان کو لے آیا ہوں جو کچھ صلاح کرنی ہو، کر لو۔ سنو عباسی، شیودین کی اور ہماری یہ رائے ہے کہ تم کو اب یہاں سے نہ جانے دیں۔ بس ہمیں اپنی بیگم کے مال ٹال کا پتہ بتلا دو۔

عبّاسی : بڑی دغا دی کلّو، بڑی دغا دی تم نے۔

کلّو : اب تم رات بھر یہیں رہو۔ ہم لوگ ذرا ثریّا بیگم سے ملاقات کرنے جائیں گے۔

عبّاسی : بڑا دھوکہ دیا، کہیں کے نہ رہے۔

عبّاسی تو یہاں روتی رہی، اُدھر وہ چور کئی آدمیوں کے ساتھ ثریّا بیگم کے مکان پر جا پہنچے اور دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے۔ ثریّا بیگم کی آنکھ کھل گئی، بے چاری اکیلی مکان میں مارے ڈر کے دبکی پڑی تھی۔ بولی— کون ہے؟ عبّاسی!

کلّو : عبّاسی نہیں ہے، ہم ہیں، عبّاسی کے میاں۔

ثریّا : ہائے میرے اللہ، غضب ہو گیا!

شیو : چپّے چپّے بولو، بتاؤ روپیہ کہاں ہے؟ سب بتا دو، نہیں ماری جاؤ گی۔

کلّو : بتائیں تو اچھا، نہ بتائیں تو اچھا، ہم گھر بھر تو ڈھونڈ ہی مرے گے۔ سنا ہے کہ تمھارے پاس جواہر کے ڈھیر ہیں۔

ثریّا : امیر جب تھی تب تھی، اب تو مصیبت کی ماری ہوں۔

کلّو : تم یوں نہ بتاؤ گی، اب ہم کچھ اور ہی اُپائے کریں گے، اب بھی بتاتی ہے کہ نہیں؟

ثریّا نے مارے خوف کے ایک ایک چیز کا پتہ بتلا دیا۔ جب ساری جمع جتھا لے کر وہ سب چلنے لگے، تو کلّو ثریّا سے بولا، چل ہمارے ساتھ، اٹھ۔

ثریّا : خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ رحم کرو۔

شیو : چل، چل اٹھ، رات جاتی ہے۔

ثریّا بیگم نے ہاتھ جوڑے، پاؤں پڑی، رو رو کر کہا، خدا کے واسطے میری عزّت نہ لو۔ مگر کلّو نے ایک نہ سنی۔ کہنے لگا، تجھے کسی رئیس امیر کے ہاتھ بیچیں گے، تم بھی چین کروگی، ہم بھی چین کریں گے۔

ثریّا : میرا مال لیا، زیور لیا، اب تو چھوڑو۔

کلّو : چلو، سیدھے سے چلو، نہیں تو دھکیائی جاؤ گی۔ دیکھو منھ سے آواز نہ نکلے، ورنہ ہم چھری بھونک دیں گے۔

ثریّا : (رو کر) یا خدا میں نے کون سا گناہ کیا تھا، اس کے عوض یہ مصیبت پڑی!

کلّو : چلتی ہے کہ بیٹھی روتی ہے؟

آخر ثریّا بیگم کو اندھیری رات میں گھر چھوڑ کر ان کے ساتھ جانا پڑا۔

(88)

آدھ کوس چلنے کے بعد ان چوروں نے ثریّا بیگم کو دو اور چوروں کے حوالے کیا۔ ان میں ایک کا نام بُدھ سنگھ تھا، دوسرے کا ہُلاس۔ یہ دونوں ڈاکو دور دور تک مشہور تھے، اچھے اچھے ڈکیت ان کے نام سن کر اپنے کان پکڑتے تھے۔ کسی آدمی کی جان لینا ان کے لیے دل لگی تھی۔ ثریّا بیگم کانپ رہی تھی کہ دیکھیں آبرو بچتی ہے یا نہیں۔ ہُلاس بولا، کہو بدھ سنگھ اب کیا کرنا چاہیے؟

بدھ سنگھ : اپنی تو یہی مرضی ہے کہ کوئی منچلا بل جائے تو اسی دم پٹیل ڈالو۔

ہُلاس : میں تو سمجھتا ہوں، یہ ہمارے ساتھ رہے تو اچھے اچھے شکار پھنسے۔ سنو بیگم، ہم ڈکیت ہے، بدمعاش نہیں۔ ہم تمھیں کسی ایسے جوان کے ہاتھ بیچیں گے، جو تمھیں امیر زادی بنا کر رکھے۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلی آؤ۔

چلتے چلتے تینوں آموں کے ایک باغ میں پہنچے۔ دونوں ڈاکو تو چرس پینے لگے، ثریّا بیگم سوچنے لگی— خدا جانے، کس کے ہاتھ بیچیں، اس سے تو یہی اچھا ہے کہ قتل کر دیں۔ اتنے ہی میں دو آدمی باتیں کرتے نکلے۔

ایک : مرزا جی، دو بدمعاشوں سے یہ شہر پاک ہو گیا۔ آزاد اور شہسوار۔ دونوں ہی کالے پانی گئے۔ اب دو مُڈھ اور باقی ہیں۔

مرزا : وہ دو کون ہیں؟

پہلا : وہی ہُلاس اور بدھ سنگھ۔ ارے، وہ دونوں تو یہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیوں یارو، چرس کے دم اڑ رہے ہیں؟ تم لوگوں کے نام وارنٹ جاری ہے۔

ہُلاس : میر صاحب، آپ بھی بس وہی رہے۔ پڑوس میں رہتے ہو، پھر بھی وارنٹ سے ڈراتے ہو؟ ایسے ایسے کتنے وارنٹ روز ہی جاری ہوا کرتے ہیں۔ ہم سے اور پولس سے تو جانی دشمنی ہے، مگر قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اگر پچاس آدمی بھی گرفتار کرنے آئیں تو ہماری گرد تک نہ پائیں۔ ہم دونوں ایک پلٹن کے لیے کافی ہیں۔ کہیے، آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں۔

مرزا : اجی، ہم بھی کسی شکار ہی کی تلاش میں نکلے ہیں۔

جب میر اور مرزا چلے گئے تو دونوں چور بھی ثریّا بیگم کو لے کر چلے۔ اتفاق سے اسی وقت ایک سوار آ نکلا۔ بدھ سنگھ نے سائیس کو تو مار گرایا اور مسافر سے کہا، اگر آبرو کے ساتھ گھوڑا نذر کرو تو بہتر ہے، نہیں تو تم بھی زمین پر لوٹ رہے ہوگے۔ سوار بے چارہ اتر پڑا۔ ھُلاس نے تب ثریّا بیگم کو گھوڑے پر سوار کیا اور لگام لے کر چلنے لگا۔

ثریّا بیگم دل میں سوچتی تھی کہ اتنی ہی عمر میں ہم نے کیا کیا دیکھا۔ یہ نوبت آ پہنچی ہے کہ جان بھی بچتی دکھائی نہیں دیتی۔

ہُلاس : بی بی کیا سوچتی جاتی ہو؟ کچھ گانا جانتی ہو تو گاؤ۔ اس جنگل میں منگل ہو۔

بدھ سنگھ : اس سے کہو کہ کوئی بھجن گائے۔

ہُلاس : ان کو غزلیں یاد ہوں گی یا ٹھمری ٹھپا۔ یہ بھجن کیا جانیں!

ثریّا : نہیں میاں، ہمیں کچھ نہیں آتا، ہم بہو بیٹیاں گانا کیا جانیں۔

اتنے میں کسی کی آواز آئی۔ ہُلاس نے بدھ سنگھ سے پوچھا، یہ کس کی آواز آئی؟

بدھ سنگھ : ارے کون سا آدمی بولا تھا؟

آواز : ذرا ادھر تک آ جاؤ۔ میں مرزا ہوں، ذرا سن لو۔

ہُلاس اور بدھ سنگھ دونوں آواز کی طرف چلے، اِدھر اُدھر دیکھا کوئی نہ ملا۔ ثریّا بیگم کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ مارے ڈر کے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ دونوں کو پکارنے لگیں۔ ہائے! خدا کسی کو مصیبت میں نہ ڈالے۔ یہ دونوں ڈاکو اس کو بیچنے کی فکر میں تھے، اور اس نے مصیبت کے وقت انھیں دونوں کو پکارا۔ وہ آواز کی طرف کان لگائے ہوئے چلے تو دیکھا کہ

ایک بوڑھا آدمی گھاس پر پڑا سسک رہا ہے۔ ان کو دیکھ کر بولا، بابا، مجھ فقیر کو ذرا سا پانی پلاؤ۔ بس، میں پانی پی کر اس دنیا سے کوچ کر جاؤں گا۔ پھر کسی کو اپنا منھ نہ دکھاؤں گا۔

ہُلاس نے اسے پانی پلایا، پانی پی کر وہ بولا، بابا، خدا تمھیں اس کا بدلہ دے۔ اس کے عوض تمھیں کیا دوں۔ خیر، اگر دو گھنٹے بھی زندہ رہا تو اپنی کچھ حال تم سے بیان کروں گا اور تمھیں کچھ دوں گا بھی۔

ہُلاس : آپ کے پاس جو کچھ جمع جتھا ہو وہ ہم کو بتا دیجیے۔

بوڑھا : کہا نا کہ دو گھنٹے بھی زندہ رہا تو سب باتیں بتا دوں گا۔ میں سپاہی ہوں، لڑکپن سے یہی میرا پیشہ ہے۔

ہُلاس : آپ نے تو ایک قصہ چھیڑ دیا، مجھے خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ آپ کی جان نکل جائے تو پھر وہ روپیہ وہیں کا وہیں پڑا رہے۔

بوڑھا : (گا کر) پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو......

ہُلاس : جناب، آپ کو گانے کو سوجھتی ہے اور ہم ڈر رہے ہیں کہ کہیں آپ کا دم نہ نکل جائے۔ روپے بتا دو، ہم بڑی دھوم دھام سے تمھارا تیجہ کریں گے۔

بدھ سنگھ : پانی اور پلوا دو تو پھر خوب ٹھنڈا ہو کر بتائے گا۔

بوڑھا : میرا ایک لڑکا ہے، دنیا میں اور کوئی نہیں۔ بس یہی ایک لڑکا، جوان، خوبصورت، گھوڑے پر خوب سوار ہوتا تھا۔

ثریا : پھر اب کہاں ہے وہ؟

بوڑھا : فوج میں نوکر تھا۔ کسی بیگم پر عاشق ہوا، تب سے پتہ نہیں۔ اگر اتنا معلوم ہو جائے کہ اس کی جان نکل گئی تو قبر بنوا دوں۔

ثریا : لمبے ہیں یا ٹھگنے؟

بوڑھا : لمبا ہے۔ چوڑا سینہ، اونچی پیشانی، گورا رنگ۔

ثریا : ہائے ہائے! کیا بتاؤں بڑے میاں، میرا ان کا برسوں ساتھ رہا ہے۔ میرے ساتھ نکاح ہونے کو تھا۔

بوڑھا : بیٹا، ذرا ہمارے پاس آ جاؤ۔ کچھ اس کا حال بتاؤ۔ زندہ تو ہے؟

ثریا : ہاں، اتنا تو میں کہہ سکتی ہوں کہ زندہ ہے۔

بوڑھا : اب وہ ہے کہاں؟ ذرا دیکھ لیتا تو آرزو پوری ہو جاتی۔

ہُلاس : آپ کا سر دبا دوں، تلوے ملوں، جو خدمت کہیے کروں۔

بوڑھا : نہیں، موت کا علاج نہیں ہے۔ میں نے اپنے لڑکے کو لڑائی کے فن خوب سکھائے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ مروّت سے پیش آتا تھا۔ بس، اتنا بتا دو کہ زندہ ہے یا مر گیا؟

ثریا : زندہ ہیں اور خوش ہیں۔

بوڑھا : اب میں اپنی ساری تکلیفیں بھول گیا۔ خیال بھی نہیں کہ کبھی تکلیف ہوئی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ پچاس آدمیوں نے آکر ان لوگوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دونوں ڈاکوؤں کی مشکیں کس لی گئیں۔ بدھ سنگھ مضبوط آدمی تھا رسی توڑ کر تین سپاہیوں کو زخمی کیا اور بھاگ کر جھیل میں کود پڑا، کسی کی ہمت نہ پڑی کہ جھیل میں کود کر اسے پکڑے۔ ہُلاس بندھا رہ گیا۔

یہ پولس کا انسپکٹر تھا

ثریا بیگم حیران تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ ان لوگوں کو ڈاکوؤں کی خبر کیسے مل گئی۔ چپ چاپ کھڑی تھی کہ سپاہیوں نے اس سے ہنسی دل لگی کرنی شروع کی۔ ایک بولا، واہ واہ، یہ تو کوئی پری ہے بھائی۔ دوسرا بولا، اگر ایسی صورت کوئی دکھا دے تو مہینے کی تنخواہ ہار جاؤں۔

ہُلاس : سنتے ہو جی، اس عورت سے نہ بولو، تم کو ہم سے مطلب ہے یا اس سے۔

انسپکٹر : اس کا جواب تو یہ ہے کہ تیرے ایک بیس لگائیں اور بھول جائے تو پھر سے گنے۔ آنکھیں نیچی کر، نہیں کھود کے گاڑ دوں گا۔

صبح کے وقت شہر میں داخل ہوئے تو ثریا بیگم نے چادر سے منھ چھپا لیا۔ اس پر ایک چوکیدار بولا، ستر چوہے کھا کر بلّی حج کو چلی۔ اوڑھنی منھ پر ڈھانپتی ہے، ہٹاؤ اوڑھنی۔

ثریا بیگم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے دل پر جو گزرتی تھی، اسے کون جان سکتا ہے۔ راستے میں تماشائیوں میں باتیں ہونے لگیں!

رنگریز : بھئی، یہ دوپٹہ کتنا اچھا رنگا ہوا ہے!

نان بائی : کہاں سے آتے ہو جوانوں؟ کیا کہیں ڈاکہ پڑا تھا؟

شیخ جی : ارے یارو، یہ نازنین کون ہے؟ کیا مکھڑا ہے، قسم خدا کی، ایسی صورت کبھی نہ

دیکھی تھی۔ بس، یہی جی چاہتا ہے کہ اس سے نکاح پڑھوا لیں۔ یہ تو شبو جان سے بھی بڑھ کر ہے۔

یہ شیخ جی وکیل صاحب تھے جن کے یہاں اللہ رکھی شبو جان بن کر رہی تھی۔ سلارو بھی ساتھ تھا۔ بولا، میاں، آنکھوں والے تو بہت دیکھے، مگر آپ کی آنکھ نرالی ہے۔

وکیل : کیوں بے بدمعاش، پھر تو نے گستاخی کی۔

سلارو : جب کہیں گے، کھری کہیں گے۔ آپ تھالی کے بینگن ہیں۔

وکیل صاحب اس پر جھلا کر دوڑے۔ سلارو بھاگا، آپ منہ کے بل گرے۔ اس پر لوگوں نے قہقہہ مارا۔ ثریا بیگم سوچ رہی تھی کہ میں نے اس آدمی کو کہیں دیکھا ہے، پر یاد نہ آتا تھا۔

یہ لوگ اور آگے چلے تو طرح طرح کی افواہیں اڑنے لگیں۔ یہ ایک محلّے میں یہ خبر اڑی کہ دریا سے ایک گھوڑ مونہا آدمی نکالا گیا ہے اسی کے ساتھ ایک پری بھی نکلی ہے۔ دو تین محلّوں میں یہ افواہ اڑی کہ ایک عورت اپنے گھر سے زیور لے کر بھاگ گئی تھی، اب پکڑی گئی ہے۔ نو بجتے بجتے یہ لوگ تھانے میں جا پہنچے۔ ٹلاس اور ثریا بیگم حوالات میں بند کر دیے گئے۔ رات کو طرح طرح کے خواب دیکھائی دیے۔ پہلے دیکھا کہ اس کا بوڑھا شوہر قبر سے گردن نکال کر کہتا ہے، ثریا، وہ کیسی بری گھڑی تھی، جب تیرے ساتھ نکاح کیا اور اپنے خاندان کی عزت خاک میں ملائی۔ پھر دوسرا خواب دیکھا کہ آزاد ایک درخت کے سائے میں لیٹے اور سو گئے۔ ایک سانپ ان کے سرہانے آ بیٹھا اور کاٹنا ہی چاہتا تھا کہ ثریا بیگم کی آنکھ کھل گئی۔

سویرے اٹھ کر بیٹھی تھی کہ ایک سپاہی نے آ کر کہا، تمھارے بھائی تم سے ملنے آئے ہیں۔ ثریا بیگم نے سوچا، میرا بھائی تو کوئی پیدا ہی نہیں ہوا تھا، یہ کون بھائی بن بیٹھا۔ سوچی، شاید کوئی دور کے رشتے دار ہوں گے، بلا لیا۔ جب وہ آیا تو اس کو دیکھ کر ثریا بیگم کے ہوش اڑ گئے۔ یہ وہی وکیل صاحب تھے۔ آپ نے آتے ہی آتے کہا بہن، خیر تو ہے، یہ کیا، ہوا کیا؟ ہم سے بیان تو کرو! کچھ دوڑ دھوپ کریں؟ حکّام سے مل کر کوئی سبیل نکالیں۔

ثریا : میاں، میری تقدیر میں یہی لکھا تھا، تو تم کیا کرو گے اور کوئی کیا کرے گا۔

وکیل : خیر، اب ان باتوں کا ذکر ہی کیا۔ سچ کہتا ہوں شبو جان، تمھاری یاد دل سے کبھی

نہیں اتری، مگر افسوس کہ تم نے میری محبت کی قدر نہ کی۔ جس دن تم میرے گھر سے نکل بھاگیں، مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بدن سے جان نکل گئی۔ اب تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تمھاری طرف سے پیروی کریں گے۔ تم جانتی ہی ہو کہ ہم کیسے مشہور وکیل ہیں اور کیسے کیسے مقدمے بات کی بات میں جیت لیتے ہیں۔

ثریّا : اس وقت آپ آ گئے، اس سے دل کو بڑی تسکین ہوئی۔ تمھارے گھر سے نکلی تو پہلے ایک مصیبت میں پھنس گئی۔ بارے خدا خدا کر کے اس سے نجات پائی اور کچھ دولت بھی ہاتھ آئی تو تمھارے ہی محلّے میں مکان لیا اور بیگموں کی طرح رہنے لگی۔

وکیل : ارے، وہ ثریّا بیگم آپ ہی تھیں،

ثریّا : ہاں میں ہی تھی۔

وکیل : افسوس، اتنے قریب رہ کر بھی کبھی مجھے نہ بلایا! مگر وہ آپ کی دولت کیا ہوئی اور یہاں حوالات میں کیوں کر آئی؟

ثریّا : ہوا کیا، دو بار چوری ہو گئی، اوپر سے تھانے دار بھی دشمن ہو گیا۔ آخر ہم اپنی مہری کو لے کر چل دیے۔ ایک گاؤں میں رہنے لگی۔ مگر وہاں بھی چوری ہوئی اور ڈاکوؤں کے پھندے میں پھنسی۔

اتنے ہی میں ایک تھانے دار نے آکر وکیل صاحب سے کہا، اب آپ تشریف لے جائیے۔ وقت ختم ہو گیا۔ ثریّا بیگم نے اس تھانے دار کو دیکھا، تو پہچان گئی۔ یہ وہی آدمی تھا جس کے پاس ایک بار وہ آزاد پر رپٹ کرنے گئی تھی۔ بولی— کیوں صاحب، پہچانا؟ اب کیوں پہچانیے گا۔

تھانے دار : اللہ رکھّی، خدا کو گواہ رکھ کر کہتا ہوں کہ اس وقت مارے خوشی کے رونا آتا ہے۔ میں تو بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ مجھے اب تمھاری بھی ویسی ہی محبت جو پہلے تھی۔

رات کے وقت تھانے دار نے حوالات میں آکر اسے جگایا اور آہستہ سے کان میں کہا، بہت اچھا موقع ہے، چلو، بھاگ چلیں، میں نے چوکیداروں کو ملا لیا ہے۔

ثریّا بیگم : نے تھانے دار کو سمجھایا کہ کہیں پکڑ نہ لیے جائیں۔ مگر جب وہ نہ مانا، تو وہ اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گئی۔ باہر آکر تھانے دار نے ثریّا بیگم کو مردانہ کپڑے پہنائے اور گاڑی پر سوار کرا کے چلا۔ جب دو کوس نکل گئے تو سویرا ہوا۔ تھانے دار نے گاڑی سے دری

نکالی اور آرام سے لیٹ کر حقہ پینے لگے کہ ایک مسافر سوار نے آکر پوچھا— کیوں بھائی مسافر، ہندو ہو یا مسلمان؟ مسلمان ہو تو حقہ پلاؤ۔

تھانے دار نے خاطر سے بیٹھایا۔ لیکن جب مسافر کے چہرے پر غور سے نظر ڈالی تو کچھ شک ہوا۔ کہا— جناب میرے دل میں آپ کی طرف سے ایک شک پیدا ہوا ہے۔ کہیے عرض کروں۔ کہیے خاموش رہوں؟ آپ ہی تو جبل پور میں ایک سوداگر کے یہاں منشی تھے۔ وہاں آپ نے دو ہزار روپے کا غبن کیا اور سال بھر کی سزا پائی۔ کہیے غلط کہتا ہوں؟

مسافر: جناب، آپ کو دھوکہ ہوا ہے، یہاں خاندانی رئیس ہیں۔ غبن پر لعنت بھیجتے ہیں۔

تھانے دار: یہ چکمے کسی اور کو دیجیے گا۔ دائی سے پیٹ نہیں چھپتا۔

مسافر: اچھا مان لیجیے، آپ ہی کہنا درست ہے۔ بھلا ہم پھنس جائیں تو آپ کو کیا ملے؟

تھانے دار: پانچ سو روپے نقد، ترقی اور نیک نامی الگ۔

مسافر: بس! ہم سے ایک ہزار لے لیجے، ابھی ابھی گنا لیجیے۔ لیکن گرفتار کرنے کا ارادہ ہو تو میرے ہاتھ میں بھی تلوار ہے۔

تھانے دار: حضرت، یہ رقم بہت تھوڑی ہے ہمیں جنچتی نہیں۔

مسافر: آخر دو ہی ہزار تو میرے ہاتھ لگے تھے۔ اس کا آدھا آپ کو نذر کرتا ہوں۔ مگر گستاخی معاف ہو تو میں بھی کچھ کہوں۔ مجھے آپ کے ان دوست پر کچھ شک ہوتا ہے۔ کہیے، کیسے بھانپا۔

تھانے دار نے دیکھا کہ پردہ کھل گیا، تو جھگڑا بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ ڈرے، کہیں جا کر افسروں سے جڑ دے، تو راستے ہی میں دھر لیے جائیں۔ بولے، حضرت، اب آپ کو اختیار ہے، ہماری لاج اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔

مسافر: میری طرف سے آپ اطمینان رکھیے۔

دونوں آدمیوں میں دوستی ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد تینوں یہاں سے روانہ ہوئے، شام ہوتے ہوتے ایک ندی کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچے۔ وہاں ایک صاف ستھرا مکان اپنے لیے ٹھیک کیا اور زمین دار سے کہا کہ اگر کوئی آدمی ہمیں پوچھے تو کہنا، ہمیں نہیں معلوم۔ تینوں دن بھر کے تھکے تھے، کھانے پینے کی بھی سدھ نہ رہی۔ سوئے تو سویرا ہو گیا۔ صبح کے وقت

تھانے دار صاحب باہر آئے تو دیکھا کہ زمین دار ان کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ان کو دیکھتے ہی بولا، جناب، آپ نے اٹھتے اٹھتے نو بجا دئے۔ ایک اجنبی آدمی یہاں آپ کی تلاش میں آیا ہے۔ وردی تو نہیں پہنے ہیں، ہاں سر پر پگڑی باندھے ہیں۔ پنجابی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے کہ نہ جانے کیا آفت آئے۔

تھانے دار: کسی بہانے سے ہم کو اپنے مکان پر لے چلو اور ایسی جگہ بیٹھاؤ، جہاں سے ہم سن سکیں کہ کیا باتیں کرتا ہے۔

زمین دار: چلیے، مگر آپ کا چلنا اچھا نہیں۔ اندر ہی بیٹھیے، اگر کوئی کھٹکے کی بات ہوگی تو میں آپ کو اطلاع دوں گا۔

تھانے دار: جناب، میں نے پولس میں نوکری کی ہے، چلنے کا ڈر آپ کو ہوگا۔ میں ابھی داڑھی حجام کی نذر کرتا ہوں اور مونچھیں کتروا ڈالتا ہوں۔ چلیے، چھٹی ہوئی۔

ثریا بیگم نے سمجھایا کہ کہیں پھنس گئے تو کہیں کے نہ رہوگے۔ آپ بھی جاؤگے اور مجھے بھی لے ڈوبوگے۔ مگر تھانے دار صاحب نے ایک نہ سنی۔ فوراً نائی کو بلایا، داڑھی مڑوائی، سیاہ کنارے کی دھوتی پہنی، انگرکھا ڈاٹا، کالی مندیل سر پر رکھی اور آدھے ہندو اور آدھے مسلمان بنے ہوئے زمین دار کے پاس جا پہنچے، سلام بندگی کے بعد باتیں ہونے لگیں۔ تھانے دار نے اپنا نام شیخ بدھو بتلایا اور گھر بنگال میں۔ زمین دار کے پاس ایک پنجابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سمجھ گئے کہ یہی حضرت ہمیں گرفتار کرنے آئے ہیں! نام پوچھا تو اس نے بتلادیا شیر سنگھ۔

تھانے دار: آپ تو پنجاب کے رہنے والے ہوں گے؟

شیر سنگھ: جی ہاں، ہم خاص امبرسر میں رہتے ہیں۔

تھانے دار: آپ کہاں نوکر ہیں؟

شیر سنگھ: ہم زمین دار ہیں۔ امبرسر کے پاس ہمارے علاقہ ہے، اس کو ہمارا بھائی دیکھتا ہے، ہم گھومتے رہتے ہیں۔ آپ یہاں کس غرض سے آئے ہیں؟ اور ٹِکے آپ کہاں ہیں؟

تھانے دار: اسی گاؤں میں میں بھی ٹھہرا ہوں۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ہمارے ساتھ گھر تک چلیے۔

تھانے دار ان کو لے کر ڈیرے پر آئے۔ ثریا بیگم دوڑ کر چھپنے کو تھیں، مگر تھانے دار نے منع کیا اور کہا کہ یہ میرے بھائی ہیں۔ ان سے پردہ کرنا فضول ہے۔

شیر سنگھ : یہ آپ کی کون ہیں۔

تھانے دار : جی میرے گھر پڑ گئی ہیں۔

ثریا بیگم : اے ہٹو بھی، کیا واہیات باتیں کرتے ہو۔ حضرت یہ میرے بھائی ہیں۔ اس پر شیر سنگھ نے قہقہہ لگایا اور تھانے دار جھینپے۔

شیر سنگھ : آپ نے سنا نہیں، ایک مسلمان تھانے دار کسی بیرن کو حوالات سے لے کر بھاگے۔ بڑی تحقیقات ہو رہی ہے، مگر پتہ نہیں چلتا۔

تھانے دار : کہہ تو نہیں سکتا کہ وہ تھانے دار ہی تھا یا کوئی اور، مگر پرسوں رات کو جب ہم اور یہ آ رہے تھے تو دیکھا کہ ایک گاڑی پر کوئی فوجی آدمی سوار ہے اور کسی عورت سے باتیں کرتا جاتا ہے۔ عورت کا نام ثریا بیگم تھا۔ جو مجھے معلوم ہو کہ وہی حضرت ہیں تو کچھ لے مروں۔

شیر سنگھ : ضرور وہی تھا، اس عورت کا نام ثریا بیگم ہی تھا۔ کیا کہوں میں اس وقت نہ ہوا۔

تینوں میں بڑی دیر تک ہنسی دل لگی ہوتی رہی۔ شیر سنگھ جب چلنے لگے تو کہا، کل سے ہم بھی یہیں ٹھہریں گے، دوسرے دن تڑکے شیر سنگھ اپنا بوریا بدھنا لے کر آ پہنچے۔ تھانے دار نے کہا، حضرت، آپ ہندو اور ہم مسلمان۔ آپ کی گنگا اور ہمارا قرآن۔ آپ گنگا کی قسم اور ہم قرآن کی قسم کھائیں کہ مرتے دم تک کبھی ساتھ نہ چھوڑیں گے، ہمیشہ دوستی کا دم بھرتے رہیں گے۔ ایسے نہ ہو کہ پیچھے سے نکل جاؤ؟

شیر سنگھ : ہم اپنے ایمان کی قسم کھاتے ہیں کہ مرتے دم تک تمھاری دوستی کا دم بھریں گے۔

تھانے دار : میری کچھ شرط ہیں، ان کو قبول کیجیے۔

(1) ایک دوسرے کی بات کسی سے نہ کہیں۔ اگر ہم کسی کو مار بھی ڈالیں تو آپ نہ کہیے۔ چاہے نوکری جائے۔ چاہے آبرو جائے۔

(2) ہمارے آپس میں کوئی پردہ نہ رہے۔

(3) ہم اپنا حال آپ سے کہیں اور آپ اپنا حال ہم سے بیان کریں۔

شیر سنگھ : آپ کی سب باتیں منظور ہیں ہاتھ پر ہاتھ ماریے اور ٹوپی بدلیے۔ بس، ہم

اور آپ بھائی بھائی ہوئے۔ بھابھی صاحب، ہم غریبوں پر بھی مہربانی کی نظر رہے۔

ثریّا بیگم : اے، تھوڑی دیر میں ہم آپ کو جھک کے سلام کریں گے۔

شیر سنگھ : کیوں، تھوڑی دیر میں کیا ہوگا صاحب، بتائے!

ثریّا بیگم : (ہنس کر) گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

تھانے دار : اچھا تو اب سنیے بھائی صاحب، ہم خونی ہیں۔ اب آپ چاہے انسپکٹر کی حیثیت میں قید کیجیے۔ چاہے دوست کی حیثیت میں معاف کیجیے۔

شیر سنگھ : (دنگ ہو کر) کیا خونی؟

تھانے دار : جی ہاں، میں بنگالی نہیں ہوں۔ لکھنوی ہوں۔ چند ہی روز ہوئے، شہزادہ ہمایوں فر کو قتل کیا اور بھاگ آیا۔ اب فرمائیے؟

شیر سنگھ : خدا تجھے غارد کرے، کمبخت؟ تو تو اس قابل ہے کہ تجھ کو کھود کے دفن کر دے۔

تھانے دار : اچھا، اب ہماری کیا سزا تجویز ہوئی؟ صاف بتا دو۔

شیر سنگھ : موئے پر سوؤرّیں اور گدھے کی سواری۔ بس، اب میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا اور عمر بھر تمھاری صورت نہ دیکھوں گا۔ خدا تجھ سے سمجھے۔

تھانے دار : سنو بھائی جان، یہ فقط چکمہ تھا۔ ہم آزماتے تھے کہ دیکھیں، تم قول کے کہاں تک سچّے ہو۔ اب ہم صاف کہتے ہیں کہ ہم قاتل نہیں ہیں، لیکن مجرم ہیں۔ اب کہیے۔

شیر سنگھ : اجی، جب اتنے بڑے جرم کی سزا نہ دی تو اب کیا خوف ہے؟ کیا کہیں سے مال مار لائے ہو؟

تھانے دار : بھئی، معاف کرو تو بتا دیں۔ سنیے، ہم وہی تھانے دار ہیں جس کی تلاش میں تم نکلے ہو۔ اور یہ وہی بیڑن ہیں۔ اب چاہے باندھ لے چلو، چاہے دوستی کا حق ادا کرو۔

شیر سنگھ : اُف، بڑا جھانسا دیا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم سے میرے پاس آیا کیونکر گیا۔ میں پنجاب سے خاص اسی کام کے لیے بلوایا گیا تھا۔ یہاں دو دن سے تمھیں بھی دیکھ رہا ہوں اور بیڑن سے نوک جھونک بھی ہو رہی ہے۔ مگر ٹائیں ٹائیں فس۔

ثریّا : حضور، لے ذرا منھ سنبھال کر بات کیجیے۔ بیڑن کوئی اور ہوگی۔ بیڑن کی صورت نہیں دیکھی!

تھانے دار : یہ بیگم ہیں۔ خدا کی قسم۔ ثریا بیگم نام ہے۔

شیر سنگھ : وہ تو بات چیت سے ظاہر ہے۔ اچھا بیگم صاحب، برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ اگر اپنی اور ان کی رہائی چاہتی ہو، تو ان کو استعفیٰ دو اور ہم سے وعدہ کرو۔

تھانے دار : ان کو راضی کیجیے۔ ہم سے کیا واسطہ۔ ہم کو اپنی جان پیاری ہے۔

ثریا : اے واہ! اچھے ملے۔ تم تھانے داری کیا کرتے تھے! اچھا، دل لگی تو ہو چکی۔ اب مطلب کی بات کہو۔ ہم دونوں بھاگیں، تو بھاگ کے جائیں کہاں؟ اور بھاگیں تو رہیں کہاں؟

شیر سنگھ : ایک کام کرو۔ ہم کو واپس جانے دو۔ ہم وہاں جا کر آئیں بائیں سائیں اڑا دیں گے۔ اس کے بعد آ کر تم کو پنجاب لے جائیں گے۔

تھانے دار : اچھا تو ہے۔ ہم سب مل کر پنجاب چلیں گے۔

ثریا : تم جاؤ، ہم تو نہ جائیں گے۔ اور سنیے، واہ!

تھانے دار : ہماری بات مانیے۔ آپ گھر گھر تحقیقات کیجیے اور دو دن تک یہاں ٹکے رہیے اور وہاں جا کر کہیے کہ ملزم ترائی کی طرف نکل گیا۔

شیر سنگھ : ہاں، صلاح تو اچھی ہے۔ تو آپ یہاں رہیں، میں جاتا ہوں۔

شیر سنگھ نے دن بھر سارے قصبے میں تحقیقات کی۔ زمین داروں کو بلا کر خوب ڈانٹ پھٹکار سنائی۔ شام کو آ کر تھانے دار کے ساتھ کھانا کھایا اور صدر کو روانہ ہوئے۔ شیر سنگھ چلے گئے تو تھانے دار صاحب بولے— دنیا میں رہ کر اگر چالاکی نہ کریں تو دم بھر گزارہ نہ ہو۔ دنیا میں آٹھوں گانٹھ کمیت ہو تب کام چلے۔

ثریا : واہ! آدمی کو نیک ہونا چاہیے، نہ کہ چالاک۔

تھانے دار : نیکی سے کچھ نہیں ہوتا چالاکی بڑی چیز ہے۔ اگر ہم شیر سنگھ سے چالاکی نہ کرتے تو ان سے گلا کیسے چھوٹتا۔

دوسرے دن تھانے دار صاحب بھی روانہ ہوئے۔ دن بھر چلنے کے بعد گاڑی وان سے کہا— بھائی، یہاں سے میرڈیہہ کتنی دور ہے؟

گاڑی وان نے کہا— حضور یہی میرڈیہہ ہے۔

تھانے دار : یہاں ہم کس کے مکان میں ٹکیں گے؟

گاڑی وان : حضور، آدمی بھیج دیا گیا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے نندا نندا پکارا۔ بڑی دیر کے بعد نندا آیا اور گاڑی کو ایک ٹیل کی طرف لے چلا۔ وہیں ایک مکان میں اس نے دونوں آدمیوں کو اتارا اور تہہ خانے میں لے گیا۔

تھانے دار: کیا کچھ نیت کھوٹی ہے بھئی؟

ثریا: ہم تو اس میں نہ جانے کے۔ اللہ رے اندھیرا!

نندا آپ چلیں تو سہی۔

تھانے دار نے تلوار میان سے کھینچ لی اور ثریا بیگم کے ساتھ چلے۔

تھانے دار: ارے نندا، روشن دان تو ذرا کھول دے جاکے۔

نندا: اجی، کیا جانے، کس وقت کے بند پڑے ہیں۔

ثریا: ہے ہے! خدا جانے، کتنے برسوں سے یہاں چراغ نہیں جلا۔ یہ زینے تو ختم ہی ہونے نہیں آتے۔

نندا: کوئی ایک سو دس زینے ہیں۔

ثریا: اُف، بس اب میں مر گئی۔

نندا: اب نگیچائے آئے۔ کوئی پچیس ٹھو اور ہیں۔

بڑی مشکلوں سے زینے طے ہوئے۔ مگر تہہ میں پہنچے تو ایسی ٹھنڈک ملی کہ گلابی جاڑے کا مزہ آیا۔ دو پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ دونوں آرام سے بیٹھے۔ کھانا بھی پہلے سے ایک باورچی نے پکا رکھا تھا۔ دونوں نے کھانا کھایا اور آرام کرنے لگے۔ یہ مکان چاروں طرف سے پہاڑوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ باہر نکلنے پر پہاڑوں کی کال چوٹیاں نظر آتی تھیں۔ ان پر ہرن کلیلیں بھرتے تھے۔ تھانے دار نے کہا— بہت مقاموں کی سیر کی ہے، مگر ایسی جگہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ بس، اسی جگہ ہمارا اور تمھارا نکاح ہونا چاہیے۔

ثریا: بھئی، سنو، برا ماننے کی بات نہیں۔ میں نے دل میں ٹھان لی ہے کہ کسی سے نکاح نہ کروں گی۔ دل کا سودا صرف ایک بار ہوتا ہے۔ اب تو اسی کے نام پر بیٹھی ہوں۔ کسی اور کے ساتھ نکاح کرنے کی طرف طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

تھانے دار: آخر وہ کون صاحب ہیں جن پر آپ کا دل آیا ہے؟ میں بھی تو سنوں۔

ثریا: تم ناحق بگڑتے ہو۔ تم نے میرے ساتھ جو سلوک کیے ہیں، ان کا احسان میرے سر پر ہے، لیکن یہ دل دوسرے کا ہو چکا۔

تھانے دار : اگر یہ بات تھی تو میری نوکری کیوں لی؟ مجھے کیوں مصیبت میں گرفتار کیا؟ پہلے ہی سوچی ہوتی۔ اب سے بہتر ہے، تم اپنی راہ لو، میں اپنی راہ لوں۔

ثریا : یہ تم نے لاکھ روپے کی بات کہی ہے۔ چلیے، سستے چھوٹے۔

تھانے دار : تم نہ ہوگی تو کیا زندگی نہ ہوگی؟

ثریا : اور تم نہ ہوگے تو کیا سویرا نہ ہوگا؟

تھانے دار : نوکری کی نوکری گئی اور مطلب کا مطلب نہ نکلا—

غیر آنکھیں سینکیں اس بت سے دلِ مضطر جلے،
ہائے بیدردی کوئی تاپے کسی کا گھر جلے

ثریا : آنکھیں سینکنے والیاں اور ہوتی ہیں۔

تھانے دار : اتنے دنوں سے دنیا میں آوارہ پھرتی ہو اور کہتی ہو، ہم نیک ہیں۔ واہ ری نیکی!

ثریا : تم سے نیکی کی سند تو نہیں مانگتی؟

تھانے دار : اب اس وقت تمھاری صورت دیکھنے کو جی نہیں چاہتا!

ثریا : اچھا، آپ الگ رہیں۔ ہماری صورت نہ دیکھیے، بس چھٹی ہوئی۔

تھانے دار : ہم کو ملال یہ ہے کہ نوکری مفت گئی۔

ثریا : مجبوری!!

(89)

ثریا بیگم نے اب تھانے دار کے ساتھ رہنا مناسب نہ سمجھا۔ رات کو جب تھانے دار کھا پی کر لیٹا ثریا بیگم وہاں سے بھاگی۔ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ایک چوکیدار ملا۔ ثریا بیگم کو دیکھ کر بولا— آپ کہاں؟ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ ہی تو تھانے دار صاحب کے ساتھ اس مکان میں ٹھہری تھیں۔ معلوم ہوتا ہے، روٹھ کر چلی آئی ہو۔ میں خوب جانتا ہوں۔

ثریا : ہاں، ہے تو یہی بات، مگر کسی سے ذکر نہ کرنا۔

چوکیدار : کیا مجال، میں نوابوں اور رئیسوں کی سرکار میں رہا ہوں۔

بیگم : اچھا، میں اس وقت کہاں جاؤں؟

چوکیدار : میرے گھر۔

بیگم : مگر کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، ورنہ ہماری عزّت جائے گی۔

بیگم صاحب چوکیدار کے ساتھ چلیں اور تھوڑی دیر میں اس کے گھر جا پہنچی۔ چوکیدار کی بیوی نے بیگم کی بڑی خاطر کی اور کہا— کل یہاں میلہ ہے، آج ٹک جاؤ! دو ایک دن میں چلی جانا۔

ثریّا بیگم نے رات وہیں کاٹی۔ دوسرے دن پہر دن چڑھے میلہ جمع ہوا۔ چوکیدار کے مکان کے پاس ایک پادری صاحب کھڑے وعظ کہہ رہے تھے۔ سینکڑوں آدمی جمع تھے۔ ثریّا بیگم بھی کھڑی ہو کر وعظ سننے لگی۔ پادری صاحب اس کو دیکھ کر بھانپ گئے کہ یہ کوئی پردیسی عورت ہے۔ کہیں سے بھول بھٹک کر یہاں آ گئی ہے۔ جب وعظ ختم کر کے چلنے لگے تو ثریّا بیگم سے بولے— بیٹی، تمھارا گھر یہاں تو نہیں ہے؟

ثریّا : جی نہیں، بدنصیب عورت ہوں۔ آپ کا وعظ سن کر کھڑی ہوگئی۔

پادری : تم یہاں کہاں ٹھہری ہو؟

ثریّا : سوچ رہی ہوں کہ کہاں ٹھہروں؟

پادری : میرا مکان حاضر ہے، اسے اپنا گھر سمجھو۔ میری عمر اَسّی ورش سے زیادہ ہے۔ اکیلے پڑا رہتا ہوں۔ تم میری لڑکی بن کر رہنا۔

دوسرے دن جب پادری صاحب گرجا گھر میں آئے، تو ان کے ساتھ ایک نازک بدن مس، قیمتی انگریزی کپڑے پہنے آئی اور شان سے بیٹھ گئی۔ لوگوں کو حیرت تھی کہ یا خدا، اس بڈھے کے ساتھ یہ پری کون ہے! پادری صاحب نے اسے بھی پاس کی کرسی پر بیٹھایا۔ اس عورت کی چال ڈھال سے پایا جاتا تھا کہ کبھی صحبت میں نہیں بیٹھی ہے۔ ہر چیز کو اجنبیوں کی طرح دیکھتی تھی۔

رنگیلے جوانوں میں چپکے چپکے باتیں ہونے لگیں—

ٹام : کپڑے انگریزی ہیں، رنگ گورا، مگر زلف سیاہ ہے اور آنکھیں بھی کالی! معلوم ہوتا ہے، کسی ہندستانی عورت کو انگریزی کپڑے پہنائے ہیں۔

ڈیوس : اس قابل ہے کہ جورو بنائے۔

ٹام : پھر آؤ، ہم تم ڈورے ڈالیں، دیکھیں، کون خوش نصیب ہے۔

ڈیوس : نہ بھئی، ہم یوں ڈورے ڈالنے والے آدمی نہیں۔ پہلے معلوم تو ہو کہ ہے کون؟ چال چلن کا بھی تو کچھ حال معلوم ہو۔ پادری صاحب کی لڑکی تو نہیں ہے۔ شاید کسی عورت کو بپتسما دیا ہے۔

تین ہندستانی آدمی بھی گرجا گئے تھے۔ ان میں یوں باتیں ہونے لگیں—

مرزا : استاد، کیا مال ہے، سچ کہنا؟

لالہ : اس پادری کے تو کوئی لڑکا بالا نہیں تھا۔

منشی : وہ تھا یا نہیں تھا، مگر سچ کہنا، کیسی خوبصورت ہے!

نماز کے بعد جب پادری صاحب گھر پہنچے تو ثریا سے بولے— بیٹی، ہم نے تمھارا نام مس پالین رکھا ہے۔ اب تم انگریزی پڑھنا شروع کرو۔

ثریا : ہمیں کسی چیز کے سیکھنے کی آرزو نہیں ہے۔ بس، یہی جی چاہتا ہے کہ جان نکل جائے۔ کس کا پڑھنا اور کیسا لکھنا۔ آج سے ہم گرجہ گھر نہیں جائیں گے۔

پادری : یہ نہ کہو بیٹی! خدا کے گھر میں جانا اپنی عاقبت بنانا ہے۔ یہ خدا کا حکم ہے۔

ثریا : اگر آپ مجھے اپنا بیٹی سمجھتے ہیں تو میں بھی آپ کو اپنا باپ سمجھتی ہوں، مگر میں صاف صاف کہے دیتی ہوں کہ میں عیسائی مذہب نہ قبول کروں گی۔

رات کو جب ثریا بیگم سوئی، تو آزاد کی یاد آئی اور یہاں تک روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

پادری صاحب چاہتے تھے کہ یہ لڑکی کسی طرح عیسائی مذہب اختیار کر لے، مگر ثریا بیگم نے ایک نہ سنی۔ ایک دن وہ بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی کہ جانسن نام کا ایک انگریز آیا اور پوچھنے لگا— پادری صاحب کہاں ہیں؟

ثریا : میں انگریزی نہیں سمجھتی۔

جانسن : (اردو میں) پادری صاحب کہاں ہے؟

ثریا : کہیں گئے ہیں۔

جانسن : میں نے کبھی تم کو یہاں نہیں دیکھا تھا۔

ثریا : جی ہاں، میں یہاں نہیں تھی۔

جانسن : یہ کون سی کتاب ہے؟

ثریا : سینیکا کی نصیحتیں ہیں۔ پادری صاحب مجھے یہ کتاب پڑھاتے ہیں۔

جانسن : معلوم ہوتا ہے، پادری صاحب تمھیں بھی 'نن' بنانا چاہتے ہیں۔

ثریا : نن کسے کہتے ہیں؟

جانسن : نن ان عورتوں کو کہتے ہیں جو زندگی بھر کنواری رہ کر مسیح کی خدمت کرتی ہیں۔ ان کا سر مڑا دیا جاتا ہے اور آدمیوں سے الگ ایک مکان میں رکھ دی جاتی ہیں۔

ثریا : یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ انھیں میں شامل ہو جاؤں اور تمام عمر شادی نہ کروں۔

جانسن نے یہ باتیں سنی تو اور زیادہ بیٹھنا فضول سمجھا۔ ہاتھ ملا کر چلا گیا۔

ثریا بیگم یہاں آ تو پھنسی تھی، مگر بھاگ نکلنے کا موقع ڈھونڈتی تھی۔ اس طرح تین مہینے گزر گئے!

(90)

نیپال کی ترائی میں ریاست خیری گڑھ کے پاس ایک لق و دق جنگل ہے۔ وہاں کئی شکاری شیر کا شکار کرنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ایک ہاتھی پر دو نوجوان بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کا سن بیس بائیس برس کا ہے، دوسرے کا مشکل سے اٹھارہ کا۔ ایک کا نام ہے وجاہت علی، دوسرے کا معشوق حسین۔ وجاہت علی دہرے بدن کا مضبوط آدمی ہے۔ معشوق حسین دبلا پتلا چھریرا آدمی ہے۔ اس کی شکل وصورت اور چال ڈھال سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر اسے زنانے کپڑے پہنا دیے جائیں، تو بالکل عورت معلوم ہو۔ پیچھے پیچھے 6 ہاتھی اور آتے تھے۔ جنگل میں پہنچ کر لوگوں نے ہاتھ روک لیے تاکہ شیر کا حال دریافت کر لیا جائے کہ کہاں ہے۔ معشوق حسین نے کانپ کر کہا— کیا شیر کا شکار ہوگا؟ ہمارے تو ہوش اڑ گئے۔ اللہ کے لیے ہمیں بچاؤ۔ میری تو شیر کے نام ہی سے جان نکل جاتی ہے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ہرنی اور پاڑھے کا شکار کھیلنے چلتے ہیں۔

وجاہت علی : واہ، اسی پر کہتی تھیں کہ ہم بن بن پھرے ہیں۔ بھوت پریت سے نہیں ڈرتے۔ اب کیا ہو گیا کہ ذرا سا شیر کا نام سنا اور کانپ اٹھیں!

معشوق حسین : شیر ذرا سا ہوتا ہے! اے، وہ اسی ہاتھی کا کان پکڑ لے تو چنگھاڑ کر بیٹھ

جائے۔ نگوڑا ہاتھی بس دیکھنے ہی بھر کو ہوتا ہے۔ اس کے بدن میں خون کہاں۔ بس، پانی ہی پانی ہے۔

وجاہت علی : اول تو شیر کا شکار نہیں ہے، اور اگر شیر آیا بھی تو ہم اس مقابلہ کر سکیں گے۔ اٹھارہ اٹھارہ نشانے باز ساتھ ہیں۔ ان میں دو تین آدمی تو ایسے بڑھے ہوئے ہیں کہ رات کے وقت آواز پر تیر لگاتے ہیں۔ کیا مجال کہ نشانہ خالی جائے۔ تم گھبراؤ نہیں، ایسا لطف آئے گا کہ ساری عمر یاد کروگی۔

معشوق حسین : تمھیں قسم ہے، ہمیں یہاں سے کہیں بھیج دو۔ اللہ! کب یہاں سے چھٹکارا ہوگا۔ ایسی بری پھنسی کہ کچھ کہا نہیں جاتا۔

نواب صاحب نے مسکرا کر پوچھا— کس سے؟

معشوق حسین : اے، ہٹو بھی! تمھیں دل لگی سوجھی ہے اور ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ شیر ایسا جانور، ایک تھپڑ میں دیو کو سلا دے۔ آدمی ذری سا بھُنگا، چلے ہیں شیر کے شکار کو! ہاتھی روک لو! نہیں اللہ جانتا ہے، ہم ہاتھی پر سے کود پڑیں گے۔ بلا سے جان جائے یا رہے۔

نواب : ہیں ہیں۔ جان تمھارے دشمنوں کی جائے۔ آخر اتنے آدمیوں کو اپنی جان پیاری ہے یا نہیں؟ کوئی اور بھی چوں کرتا ہے؟

معشوق : اتنے آدمی جائیں چولہے میں۔ ان موؤں کو جان بھاری ہوئی ہے۔ یہ گھر سے لڑ کر آئے ہیں۔ جورو نے جوتیاں مار مار کر نکل دیا ہے۔ ان کی اور میری کون سی برابری۔ ہمیں اتار دو، ہم اب جائیں گے۔

نواب : ذرا ٹھہرو تو، میں بندوبست کیے دیتا ہوں۔ کسی بڑے درخت پر ایک مچان باندھ دیں گے۔ بس، وہیں سے بیٹھ کے دیکھنا۔

معشوق : واہ، ذرا سا مچان اور جنگل کا واسطہ۔ اکیلی ڈر نہ جاؤں گی؟ ہاں، تم بھی بیٹھو تو البتہ!

نواب : یہ تو بڑے شرم کی بات ہے کہ ہم مرد ہو کر مچان پر بیٹھیں اور لوگ شکار کھیلیں۔

معشوق : ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہمارے دوست کی یہی رائے ہے۔ ڈر کس بات کا ہے؟ صاف صاف کہہ دو کہ یہ عورت ہیں اور ہمارا ان کے ساتھ نکاح ہونے والا ہے۔

نواب : یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ مشہور کرنا کہ ایک کمسن عورت کو مردانہ کپڑے پہنا کر یہاں

لائے ہیں، مناسب نہیں۔

اتنے میں آدمیوں نے آکر کہا— حضور، سامنے ایک کچھار ہے۔ اس میں ایک شیرنی بچوں کے پاس بیٹھی ہے۔ اسی دم ہاتھی کو پیل دیجیے۔

اتنا سننا تھا کہ نواب صاحب نے خدمت گار کو حکم دیا— ان کو ایک شالی رومال اور پچاس اشرفیاں آج ہی دینا۔ ہاتھی کے لیے پیل کا لفظ خوب لائے! سبحان اللہ۔

اس پر مصاحبوں نے نواب صاحب کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔

1۔ سبحان اللہ، واہ میرے شہزادے! کیوں نہ ہو۔

2۔ خدا آپ کو ایک ہزار برس کی عمر دے۔ حاتم کا نام مٹا دیا۔ ریاست اسے کہتے ہیں۔

نواب : اچھا، اب سب تیار ہو اور کچھار کی طرف ہاتھی لے چلیں۔

معشوق : ارے لوگوں، یہ کیا اندھیر ہے۔ آخر اتنوں میں کسی کے جورو جانتا بھی ہے یا سب نہنگ لاڈلے، بے فکرے، اٹھاؤں، چولہے ہی جمع ہیں۔ خدا کے لیے ان کو سمجھاؤ۔ اتنی سی جان، گولی لگی اور آدمی ٹیں سے رہ گیا۔ آدمی میں ہیں کیا! اللہ کرے، شیر نہ ملے۔ موئی بلّی سے تو ڈر لگتا ہے۔ شیر کی صورت کیونکر دیکھوں گی۔ بھلا اتنا بتاؤ کہ بندھا ہوگا یا کھلا۔ تماشے میں ہم نے شیر دیکھے تھے، مگر سب کٹ گھروں میں بند تھے۔

ایکاایک دو پاسیوں نے آکر کہا کہ شیرنی کچھار سے چلی گئی۔ نواب صاحب نے وہیں ڈیرا ڈال دیا اور معشوق حسین کے ساتھ اندر آ بیٹھے۔

نواب : یہ بات بھی یاد رہے گی کہ ایک بیگم صاحب بہادری کے ساتھ شیر کا شکار کھیلنے کو گئیں۔

معشوق : اے واہ! جو شریف زادی سنے گی، اپنے دل میں یہی کہے گی کی لڑکی اور اتنی ڈھیٹ۔ بھلے مانس کی بہو بیٹی ہے کہ جنگل کے کتّے کا نام سنتے ہی بدن کے روئیں کھڑے ہو جائیں۔ اکیلے کمرے میں بلّی آئے تو تھر تھر کانپنے لگے۔ خواب میں بھی رسّی دیکھے تو چونک پڑے۔ اچھی پٹّی پڑھاتے ہو!

دوسرے دن نواب صاحب نے شکاری لباس پہنا۔ خیمے سے نکلے۔ معشوق حسین بھی پیچھے سے نکلے، مگر اس وقت بیگموں کی پوشاک میں تھے اور بیگم بھی کون؟ وہی ثریا، جو مس

پالین بنی ہوئی پادری صاحب کے ساتھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوا، کوئی پری پر کھولے چلی آتی ہے۔ نواب صاحب نے کہا—

آغاز عشق ہی میں ہمیں موت آ گئی
آگاہ بھی نہ حال سے وہ بے خبر ہوا

ثریا بیگم نے تنک کے کہا— بس، یہ منحوس باتیں ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ مرنے جینے کا کون ذکر ہے،

نواب : سنیے حضور! جو آپ آنکھیں دکھائیں گی تو ہم بھی بگڑ جائیں گے۔ اتنا یاد رکھیے۔

ثریا : خدا کے لیے ذرا حیا سے کام لو۔ ان سب کے سامنے ہمیں رسوا نہ کرو۔ وہ شریف زادی کیا، جو شرم سے منہ موڑے۔ اتنے آدمی کھڑے ہیں اور تم کچھ خیال ہی نہیں۔

خدا کا قہر بتوں کا عتاب رہتا ہے
اس ایک جان پہ کیا کیا عذاب رہتا ہے

ثریا : بس، ہم نہ جائیں گے۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

نواب صاحب نے قدموں پر ٹوپی رکھ دی، اور کہا— مار ڈالو، مگر ساتھ چلو، ورنہ گھٹ گھٹ کے جان جائے گی۔

بارے خدا خدا کر کے بیگم صاحب اٹھیں۔ اتنے میں چوکیدار نے آکر کہا— خداوند، دو شیر جنگل میں دیکھائی دیے ہیں۔ اب بھی موقع ہے، ورنہ شیرنی کی طرح وہ بھی بھاگ جائیں گے اور پھر شکار نہ ملے گا۔

بیگم : آدمی کیسے موئے جان کے دشمن ہیں!

نواب صاحب نے حکم دیا کہ ہاتھی بیٹھاؤ۔ پیل وان نے بری بری کہہ کر ہاتھی کو بیٹھایا۔ تب زینہ لگایا گیا۔ بیگم صاحب نے زینے پر قدم رکھا، مگر جھجھک کر اتر گئیں۔

نواب : پہلی بار تو بے جھجھک بیٹھ گئیں تھیں، اب کی ڈرتی ہو۔

بیگم : اے لو، اس بار کہا تھا کہ مرغابی کا شکار ہوگا۔

نواب : شیر کا شکار آسان ہے، مرغابی کا شکار مشکل ہے۔

بیگم : چلیے، رہنے دیجیے۔ ہم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ یہاں روح کانپ رہی

ہے کہ یا خدا، کیا ہوگا؟

نواب : ہوگا کیا؟ کچھ بھی نہیں۔

آخر بیگم صاحب بھی بیٹھیں۔ نواب صاحب بھی بیٹھے۔ ہوالی موالی بھی دوسرے ہاتھیوں پر بیٹھے اور ہاتھی جھومتے ہوئے چلے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگ ایک جھیل کے پاس پہنچے۔ شکاری نے کہا— جھیل میں پانی کم ہے، ہاتھی نکل جائیں گے۔

بیگم : کیا کہا! کیا اس سمندر میں سے جانا ہوگا؟

نواب : ابھی دم کے دم میں نکل جاتے ہیں۔

بیگم : کہیں نکلے نہ؟ ہمیں یہاں ڈبونے لائے ہو؟ ذرا ہاتھی کا پاؤں پھسلا اور چلیے، پانی کے اندر غوطے کھانے لگے۔

نواب صاحب نے بہت سمجھایا، تب بیگم صاحب اپنے ہاتھی کو جھیل کے اندر ڈالنے پر راضی ہوئیں۔ مگر آنکھیں بند کر لیں اور غل مچایا کہ جلدی نکل چلو۔ پانچ ہاتھی تو ساتھ ساتھ چلے، دو پیچھے تھے۔ نواب صاحب نے کہا— اب آنکھیں کھول دو، آدھی دور چلے آئے ہیں، آدھی دور چلے آئے ہیں، آدھی دور اور باقی ہے۔ بیگم نے آنکھیں کھولیں تو جھیل کے کیفیت دیکھ کر کھل اٹھیں۔ کناروں پر اونچے اونچے درخت جھوم رہے تھے۔ کوئی جھیل کے پانی کو چومتا تھا، کسی کی شاخیں جھیل کی طرف جھکی تھیں۔ بیگم نے کہا— اب ہمیں ڈر نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اللہ کرے، کوئی شیر آج نہ ملے۔

نواب : خدا نہ کرے۔

بیگم : واہ! آ جائے کیا مجال ہے۔ ہم منتر پڑھ دیں گے۔

نواب : بھلا آپ اتنی ہوئیں تو۔

بیگم : اجی، میں تم سب کو بناتی ہوں، ڈر کیسا! مگر کہیں شیر سچ مچ نکل آئے، تو غضب ہی ہو جائے۔ سنتے ہی روئیں کھڑے ہوتے ہیں۔

اس جھیل کے اس پار کچھار تھا اور کچھار میں ایک شیرنی اپنے بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔ کھیدے کے آدمیوں نے کہا— حضور، اب ہاتھی روک لیے جائیں۔ ثریا بیگم کانپ اٹھیں۔ ہائے! یہ کیا ہوا۔ یہ شیرنی کہاں سے نکل آئی۔ یا تو اس کو قضا لائی یا ہم کو۔

نواب صاحب نے حکم دیا، کھیدا کیا جائے۔ تیس آدمی بڑے بڑے کتے لے کر کچھار کی

طرف دوڑے۔ ثریا بیگم بہت سہمی ہوئی تھیں۔ پھر شکار میں ایک قسم کا لطف بھی آتا تھا۔ ایکاایک دور سے روشنی دیکھائی دی۔ بیگم نے پوچھا— وہ روشنی کیسی ہے؟ نواب بولے— شیرنی نکلی ہوگی اور شاید حملہ کیا ہو۔ اسی لیے روشنی کی گئی کہ ڈر سے بھاگ جائے۔

شیرنی نے جب آدمیوں کی آواز سنی، تو گھبرائی۔ بچوں کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں آدمی کا گزر محال تھا۔ کھیدے کے لوگ سمجھے کہ شیرنی بھاگ گئی۔ ثریا بیگم یہ خبر سن کر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ لو، اب کھیلو شکار، بڑے وہ بن کر چلے تھے! ہماری دعا اور قبول نہ ہو؟

نواب : آج بے شکار کیے نہ جائیں گے۔ لو، قسم کھائی۔

نواب صاحب رئیس تو تھے ہی، قسم کھا بیٹھے۔ ایک مصاحب نے کہا— حضور، ممکن ہے کہ شیر آج نہ ملے۔ قسم کھانا ٹھیک نہیں ہے۔

نواب : ہم ہرگز کھانا نہ کھائیں گے جب تک شیر کا شکار نہ کریں گے۔ اس میں چاہے رات ہو جائے، شیر کا جنگل میں نہ ملنا کیسا!

بیگم : خدا تمھاری بات رکھ لے۔

مصاحب : جیسی حضور کی مرضی۔

بیگم : خدا کے لیے اب بھی چلے چلو۔ کیا تم پر کوئی جن سوار ہے یا کسی نے جادو کر دیا ہے۔ اب دن کتنا باقی ہے؟

نواب : دن کتنا ہی ہو، ہم شکار ضرور کریں گے۔

بیگم : تمھیں بائیں ہاتھ کا کھانا حرام ہے جو شیر کا شکار کھیلے بغیر جاؤ۔

نواب : منظور! جب تک شیر کا شکار نہ کریں گے، کھانا نہ کھائیں گے۔

بیگم : بات تو یہی ہے، خدا تمھاری بات رکھ لے۔ اُو لوگوں، کوئی ان کو سمجھاؤ، یہ کسی کا کہنا نہیں مانتے، کوئی صلاح دینے والا بھی ہے یا نہیں؟

ایک مصاحب : حضور نے تو قسم کھا لی، لیکن ساتھ کے سب آدمی بھوکے پیاسے ہیں، ان کے حال پر رحم کیجیے، ورنہ سب ہلکان ہو جائیں گے۔

نواب : ہم کو کسی کا غم نہیں ہے، کچھ پرواہ نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ ہمارے ساتھی ہیں تو ہمارا حکم مانیے۔

بیگم : شام ہونے آئی، اور شکار کا کہیں پتہ نہیں، پھر اب یہاں ٹھہرنا بے وقوفی ہے یا

اور کچھ؟

برکت : حضور ہی کے سب کانٹے بوئے ہیں۔

اتنے میں کھیدے والوں نے کہا— خداوند اب ہوشیار رہیے۔ شیرنی آتی ہے۔ اب دیر نہیں ہے۔ کچھار چھوڑ کر پورب کی طرف بھاگی تھی۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر اس زور سے گرجی کہ ہوش اڑ گئے، اٹھائیس آدمی ساتھ تھے، اٹھائیسوں بھاگ گئے۔ اس وقت قدم جمانا محال تھا۔ شیر کا قاعدہ ہے کہ جب گولی لگتی ہے تو آگ ہو جاتا۔ پھر گولی کے باپ کو نہیں مانتا۔ اگر بم کا گولہ بھی ہو تو وہ اس طرح آئے گا جیسے توپ کا گولہ آتا ہے۔ اور شیرنی کا قاعدہ ہے کہ اگر اپنے بچوں کے پاس ہو اور ساری دنیا کے گولے کوئی لے کر آئے تو بھی ممکن نہیں کہ اس کے بچوں پر آنچ آ سکے۔

بیگم : بندھی ہے یا کھلی ہوئی ہے؟ تماشے والے شیروں کی طرح کٹ گھرے میں بند ہے نا،

مصاحب : ہاں ہاں، صاحب، بندھی ہوئی ہے۔

بیگم : بھلا اس کو باندھا کس نے ہوگا؟

اب ایک دل لگی سنیے۔ ایک ہاتھی پر دو بنگالی تھے۔ انھوں نے اتنا ہی سنا تھا کہ نواب صاحب شکار کے لیے جاتے ہیں۔ اگر معلوم ہوتا کہ شیر کے شکار کو جاتے ہیں تو کروڑ برس نہ آتے۔ سمجھتے تھے کہ جھیلوں میں چڑیوں کا شکار ہوگا۔ جب یہاں آئے اور سنا کہ شیر کا شکار ہے تو جان نکل گئی۔ ایک کا نام کالی چرن گھوش، دوسرے کا شیودیو بوس تھا۔ ان دونوں میں یوں باتیں ہونے لگیں۔

بوس : نواب ہم کو بڑا دھوکا دیا۔ ہم نہیں جانتا تھا کہ یہ لوگ ہمارا دشمن ہے۔

گھوش : ہم ان سے سمجھے گا۔ او شالا فیل بان، ہمارے کو کدھر لے جائے گا۔

فیل وان نے ہاتھی کو اور بھی تیز کیا تو دونوں صاحب چلائے۔

بوس : او شالا!

گھوش : او شالا فیل کا وان، اچھا ہم شاحب کے یہاں تمھارا نالش کرے گا۔ ارے بابا، ہم لوگ جانے نہیں مانگتا۔ شیر شالا کا مقابلہ کون کرنے سکتا؟

فیل وان : بابو جی، ڈرو نہیں۔ ابھی تو شیر دور ہے۔ جب ہودا پکڑ لے گا تب دل لگی

ہوگی، ابھی شالا شالا کہتے جاؤ۔

بوس : ارے بھائی، تم ہمارے کا باپ، ہمارے باپ کا باپ، ہم ہاتھی کو پھیرنے مانگتا۔ او شالا، تم آرام زادہ۔

فیل وان : اچھا بابو، دیتے جاؤ گالیاں۔ خدا کی قسم، شیر کے منھ میں ہاتھی نہ لے جاؤں تو پاجی۔

بوس : باپ رے باپ، ہمارے کو بچاؤ۔ ہم رشوت دے گا۔ ہمارا باپ ہے، ماں ہے، سب تم ہے۔

جتنے آدمی ساتھ تھے، سب ہنس رہے تھے۔ ان دونوں کی گھبراہٹ دیکھنے قابل تھی۔ کبھی فیل وان کے ہاتھ جوڑتے، ٹوپی اتار کر خدا سے دعا مانتے تھے، کبھی جنگل کی طرف دیکھ کر کہتے تھے— بابا، ہمارا جان لینے کو ہم یہاں آیا۔ ہمارا موت ہم کو یہاں لایا۔ ارے بابا، ہم لوگ لکھنے پڑھنے میں اچھا ہوتا ہے۔ ہم لوگ ولایت جا کر انگریزی سیکھتا ہے۔ ہم کبھی شیر کا شکار نہیں کرتا، ہمارا اپنا جان سے بیر نہیں ہے۔ او فیل کا بان، ہم خبر کے کاغذ میں تمھارا تعریپ چھاپے گا۔

فیل وان : آپ اپنی تعریف رہنے دیں۔

گھوش : نہیں، تمھارا نام ہو جائے گا۔ بڑا بڑا لوگ تمھارا نام پڑھے گا تو بولے گا، یہ فیل کا بان بڑا ہوشیار ہے، تم پچاس ساٹھ کا نوکر ہو جائے گا۔ ہم تم کو نوکر رکھا دے گا۔

فیل وان : پچاس ساٹھ! اتنے روپے میں کہاں رکھوں گا کہاں؟ اچھا دوسری شادی کر لوں گا، مگر تعریف کس بات کی لکھیے گا۔ ذرا ہاتھی دوڑاؤں؟

بوس : تم بڑا نٹکھٹ ہو۔ او شالا، تم پھر دوڑایا؟

جب جھیل کے قریب پہنچے، تو دونوں بنگالی اور بھی ،ڈرے۔ گھوس نے پوچھا— او فیل کا بان، اس جھیل میں کتنا گہرا؟

فیل وان نے کہا— ہاتھی ڈوباؤ ہے۔

گھوش : اور اس جھیل کے اندر سے ہم لوگ کو جانے ہوگا بھی۔

فیل وان : جی ہاں، اسی میں سے جانے ہوگا بھی۔

گھوش : اور جو ہاتھی کا پاؤں پھسل گئی تو ہم لوگ کا کیا......

فیل وان : اگر ہاتھی کا پاؤں پھسل گئی تو تم لوگ کا ٹانگ اور ناک ٹوٹ جائے گا۔ بس اور کچھ نہ ہوگا، اور منھ بگڑ جائے گی تم لوگ کی۔

گھوش : اور تم شالا کہاں سے بچنے سکے گا؟

فیل وان : ہم عمر بھر ہاتھی پر چڑھا کیے ہیں۔ ہاتھی پھسلے تو ڈر نہیں اور بہہ جائے تو خوف نہیں۔

گھوش : بابا، تمھاری ہاتھی پانی سے ڈرتی ہے یا نہیں؟ ہم سے شاچ شاچ کہہ دو۔

فیل وان : تم اتنا ڈرتا تھا تو آیا کیوں؟

گھوش : ارے بابا، گولی لگنے سے تو سب کوئی ڈرتا ہے۔ جان پھیر کے آنے سکے گا نہیں۔

فیل وان نے ہاتھی کو جھیل میں ڈالا، تو ان دونوں نے وہ چل پوں مچائی کہ کچھ نہ پوچھو۔ ایک بولا— ہم ڈوب گیا، تو ہمارا جاگیر کس کے پاس جائے گا۔

فیل وان مسکرا کر بولا— وہیں سے سب لکھ کے بھیج دیجیے گا۔

گھوش : او شالا، تم ہمارا جان لے گا! تم جان لے گا شالا!

فیل وان : بابو، گول مال نہ کرو، خدا کو یاد کرو۔

گھوش : ہاتھی ہلے گی ہم تم کو ڈھکیل دے گا، تم مر جائے گا۔

گھوش : ارے بابا، گھوس لے لے، ہم بہت سے روپے دینے سکتا۔

فیل وان : اچھا، ایک ہزار روپیہ دیجیے تو ہم ہاتھی کو پھیر دیں۔ بھلے آدمی، اتنا نہیں شوچتے کہ پانچ ہاتھی تو اس پار نکل گئے اور ایک ہاتھی پیچھے آ رہا ہے۔ کسی کا بال بانکا نہیں ہوا تو کیا آپ ہی ڈوب جائے گے؟ کیا جان آپ ہی کو پیاری ہے،

گھوش : ارے بابا، تم بات نہ کرے۔ تم ہاتھی کا دھیان کرے، جو پاؤں پھسلے گی تو بڑی غضب ہو جائے گا۔

فیل وان : اجی، نہ پاؤں پھسلے گی، نہ بڑی غضب ہوگا۔ بس چپ چاپ بیٹھے رہیے۔ بولیے، چالیے نہیں۔

گھوش : کس مافق نہیں بولے گا، ضرور کر کے بولے گا۔ او شالا! تمھارا باپ آج ہی مر جائے۔

فیل وان : ہمارا باپ تو کب کا مر چکا، اب تمھاری نانی مرنے کی باری ہے۔

فیل وان نے مارے شرارت کے ہاتھی کو دو تین بار اَنکش لگایا، تو دونوں آدمی سمجھے کہ بس، اب جان گئی۔ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

گھوش : آمی دوئی جانی ڈوبی جابو۔

بوس : ای، ہاتھی بالا بڑو بورو۔

گھوش : جونی آئے بچی آج، تیکھے دلی کورا آم آر شکار کھیلنے جاوے نا۔

بوس : تمنی امائے جابردستی نیے ایچھو۔

گھوش : ہمارا پران بھوائے آچے۔

گھوش : ہاتھی روک لے او شالا۔

فیل وان : بابو جی، اب ہاتھی ہمارے مان کا نہیں۔ اب اس کا پاؤں پھسلا چاہتا ہے، ذرا سنبھلے رہیے گا۔

نواب صاحب نے ان دونوں آدمیوں کا رونا چیخنا سنا تو مہاوت سے بولے— خبردار جو ان کو ڈرائے گا تو تو جانے گا۔

گھوش : نواب شاب، ہمارا مدد کرو، اب ہم جاتا ہے بیکنٹھ۔

مہاوت نے آہستہ سے کہا— بیکنٹھ جا چکے، نرک میں جاؤ گے۔

اس پر گھوش بابو بہت بگڑے اور گالیاں دینے لگے۔ تم شالا کو پانی کے باہر جا کے ہم مار ڈالے گا۔

مہاوت نے کہا— جو پانی کے باہر جا سکو نا۔

گھوش : نواب شاب، یہ شالا ہمارے کو گالی دیتا۔

نواب : گالی کیسی بابو، آپ اتنا گھبراتے کیوں ہیں؟

گھوش : ہمارے کو یہ شالا گالی دیتے ہیں۔

نواب : کیوں بے، خبردار جو گالی گلوج کی۔

فیل وان : حضور، میں ایسی سواری سے درگزرا، ان کو چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہے۔ انھیں آپ شکار میں کیوں لائے ہیں؟

بوس : ارے شالے کا شالا، تم بات کرے گا، یا ہاتھی کو دیکھے گا، ارے بابا، اب ہم ایسی

سواری پر نہ آئے گا۔

بارے ہاتھی اس پار پہنچا، تو ان دونوں کی جان میں جان آئی۔ بوس بابو بولے— نواب شاب، ہم اس کا ساتھ بڑا تکلیف پایا۔ یہ مہاوت ہمارا اس جنم کا بیری ہے بابا، ہم ایسا شکار نہیں کھیلنا چاہتا۔ اب ہم ہاتھی پر سے اتر جائے گا۔

نواب صاحب نے فیل وان کو حکم دیا کہ ہاتھی کو بیٹھاؤ اور بابو لوگوں سے کہا— اگر آپ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے تو اتر جایئے۔ اس پر گھوش اور بوس دونوں سر پیٹنے لگے— ارے بابا، اس جنگل کے بیچ میں تم ہم کو چھوڑ کر بھاگنا مانگتا۔ ہم جائے گا کہاں؟ اِدھر جنگل اُدھر جنگل۔ ہمارے کو گھر پہنچا دو۔

نواب صاحب نے کہا— اگر ایک ہاتھی کو اکیلا بھیج دوں تو شاید شیر یا سور یا کوئی جانور حملہ کر بیٹھے، ہاتھی کا ہاتھی زخمی ہو جائے تو مہاوت کی جان پر آ بنے۔ آپ لوگ گولی چلانے سے رہے، پھر کیا ہو؟

گھوش: آپ کو اپنا ہاتھی پیارا، فیل کا بان پیارا، ہمارا جان پیارا نہیں۔ فیل کا بان سات آٹھ روپے کا نوکر، ہم لوگ ہیڈ کلرکی کرتا اور کیا بات کرے گا۔ ہم جان نہیں رکھتا، وہ جان رکھتا ہے؟

نواب: اچھا، پھر بیٹھے رہو، مگر ڈرو نہیں۔

گھوش: اچھا، اب نہ بولے گا۔

بوس: کیسے نہ بولے گا، تم نہ بولے گا؟ تم نہ بولے گا تو ہم بولے گا۔

گھوش: تم شالا سور ہے۔ تم کیا بولے گا؟ بولے گا تو ہم تم کو قتل کر ڈالے گا۔ شالا ہمارے کو پھانس کے لایا اور اب جان لینا مانگتا ہے۔

بوس: (دھوتی سنبھال کر) تم دوشٹ چپ رہے۔ تم نیچ قوم ہے۔

گھوش: بولے گا تو ہم حلال کرے گا۔

بوس: (دانت دکھا کر) ہم تم کو دانت کاٹ لے گا۔

گھوش: ارے تم بکے جائے شالا، بودذات، دوشٹ۔

بوس: تم نیچ کوم، چھوٹا کوم، بھیک مانگنے والا سور۔

دونوں میں خوب تکرار ہوئی۔ کبھی گوش نے گھونسا تانا، کبھی بوس نے پینترا بدلا، مگر

دونوں میں کوئی وار نہ کرتا تھا۔ دونوں کندے تول تول کر رہ جاتے تھے۔ نواب صاب نے یہ حال دیکھا تو چاہا کہ دونوں کو الگ الگ ہاتھیوں پر بیٹھائیں، مگر گھوش نے منظور نہ کیا، بولے — یہ ہمارے دیش کا، ہم اس کے دیش کا، اور کوئی ہمارا دیش کا نہیں۔

اتنے میں آدمیوں نے للکار کر کہا — خبر دار، شیرنی نکلی جاتی ہے۔ حکم ہوا کہ ہاتھی اس طرف بڑھاؤ۔ سب ہاتھی بڑھائے گئے۔ ایک درخت کی آڑ میں شیرنی دو بچے لیے ہوئے دبکی کھڑی تھی۔ نواب صاحب نے فوراً گولی سر کی، وہ خالی گئی۔ نواب نے پھر بندوق سر کی، اب کی گولی شرینی کے کلّے پر جا پڑی۔ گولی کھانا تھا کہ وہ جھلا کر پلٹ پڑی اور توپ کے گولے کی طرح جھپٹی۔ آتے ہی اس نے ایک ہاتھی کو تھپڑ لگایا تو وہ چنگھاڑ کر بھاگا۔ نواب صاحب نے پھر بندوق چلائی، مگر نشانہ خالی گیا۔ شیرنی اسی ہاتھی کو جسے تھپڑ مارا تھا، کان پکڑ کر بیٹھا دیا۔ بارے چوتھا نشانہ ایسا پڑا کہ شیرنی تڑپ کر گر پڑی۔

ادھر تو یہ کیفیت ہو رہی تھی، ادھر دونوں بنگالی بابو ہودے کے اندر اوندھے پڑے تھے۔ آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کر لی تھیں۔ بیگم صاحب نے انھیں حودے میں بیٹھے نہ دیکھا تو پوچھا — کیا وہ دونوں بابو بھاگ گئے؟

فیل وان: نہیں خداوند، میں ہاتھی بڑھائے لاتا ہوں۔

ہاتھی قریب آیا تو نواب صاحب دونوں بنگالیوں کو دیکھ کر اتنا ہنسے کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

نواب: اب اٹھوگے بھی یا سوتے ہی رہوگے؟ بابو جی تو بولتے ہی نہیں۔
بیگم: کیا اچھے آدمی تھے بے چارے!
نواب: مگر چل بسے۔ ابھی باتیں کر رہے تھے۔
بیگم: اب کچھ کفن دفن کی فکر کروگے یا نہیں۔

فیل وان نے کندھا پکڑ کر ہلایا تو بوس بابو اٹھے۔ اٹھتے ہی شیرنی کی لاش دیکھی، تو کانپ کر بولے — نواب شاب، شاچ شاچ بولو کہ یہ مٹی کا شیر ہے یا ٹھیک شیر ہے؟ ہم سمجھ گیا کہ مٹی کا ہے۔

نواب: آپ تو ہیں پاگل۔
گھوش: آپ لوگ جان کو کچھ نہیں سمجھتا؟

بوس : یہ لوگ گنوار ہیں۔ ہم لوگ ایم۔اے۔ بی۔اے۔ پاس کرتا ہے۔ ہم لوگ بہت سا بات ایسا کرتا ہے کہ آپ لوگ نہیں کرنے سکتا۔

نواب : اچھا، اب ہاتھی سے تو اترو۔

فیل وان : بابو صاحب، شیرنی تو مر گئی، اب کیا ڈر ہے۔

دونوں بابوؤں نے ہاتھی سے اتر کر شیرنی کی طرف دیکھنا شروع کیا، مگر آگے کوئی نہیں بڑھتا۔

بوس : آگے بڑھو مہاشائی۔

گھوش : تمھیں بڑھو، تم بڑا مرد ہے تو تم بڑھے۔

نواب : بڑھنا نہیں۔ خبردار، بڑھے اور شیر کھا گیا۔

گھوش : بابا، اب چاہے جان جاتا رہے، پر ہم اس کے پاس ضرور کر کے جائے گا۔

یہ کہہ کر آپ آگے بڑھے، مگر پھر اٹلے پاؤں بھاگے اور پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

(91)

جب رات کو سب لوگ کھا پی کر لیٹے، تو نواب صاحب نے، دونوں بنگالیوں کو بلایا اور بولے۔ خدا نے آپ دونوں صاحبوں کو بہت بچایا، ورنہ شیرنی کھا جاتی۔

بوس : ہم ڈرتا نہیں تھا، ہم شالا ایش فیل کا بان کو مارنا چاہتا تھا کہ ہم ایش ویش کا آدمی نہیں ہے۔ اس مافق ہمارے کو ڈرانے سکتا اور ہاتھی کو بودجاتی سے ہلانے مانگے۔ جب تو ہم لوگ بڑا غصہ ہوا کہ ارے سب لوگوں کا ہاتھی ہلنے نہیں مانگتا۔ تم کیوں ہلنے مانگتا ہے اور ہم سے بولا کہ بابو شاب، اب تو مرے گا۔ ہاتھی کا پاؤں پھسلے گی اور تم مر جائیں گے۔ ہم بولا۔ ارے، جو ہاتھی کی پاؤں پھسل جائے گی تو تم شالے کا شالا کہاں بچ جائے گا؟ تم بھی تو ہمارا ایک ساتھ مرے گا۔

نواب : اچھا، جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب یہ بتلایئے کہ کل شکار کھیلنے جایئے گا یا نہیں؟

بوس : جائے گا تو ضرور کر کے، مگر فیل کا بان بود جاتی کرے گا، تو ہم آپ کا برائی چھپوا دے گا۔ ہمارے ہاتھی پر بیگم شاب بیٹھے تو ہم چلا جائے گا۔

ثریا : بیگم صاحب تو تجھ ایسوں کو اپنا سایہ تک نہ چھونے دیں۔ پہلے منہ تو بنوا!

بوس : اب ہمارے کو ڈر پاس نہیں آتے، ہم خوب سمجھ گیا کہ جان جانے والا نہیں ہے۔

نواب : اچھا جایئے، کل آیئے گا۔

جب نواب اور ثریا اکیلے رہ گئے تو نواب نے کہا۔ دیکھو ثریا بیگم، اس زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ شہزادہ ہمایوں فر کے نکاح کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور آج ان کی قبر بن رہی ہے۔ اس لیے انسان کو چاہیے کہ زندگی کے دن ہنسی خوشی سے کاٹ دے۔ یہاں تو صرف یہی خواہش ہے کہ ہم ہوں اور تم ہو۔ مجھے کسی سے مطلب نہ سروکار۔ اگر تم ساتھ رہو تو خدا گواہ ہے، بادشاہی کی حقیقت کو نہ سمجھوں۔ اگر یقین نہ آئے تو آزما لو۔

بیگم : آپ صاف صاف اپنا منشا بتلایئے۔ میں آپ کی بات کچھ نہیں سمجھی۔

نواب : صاف صاف کہتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

بیگم : نہیں یہ کیا بات ہے، آپ کہیں تو۔

نواب : (دبی زبان سے) نکاح!

بیگم : سنیے، مجھے نکاح میں کوئی عذر نہیں۔ آپ اوّل تو کم سن، دوسرے رئیس زادے، تیسرے خوبصورت، پھر مجھے نکاح میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ عرض کروں گی کہ کس سبب سے مجھے منظور نہیں۔

نواب : ہائے، ہائے! تم نے یہ کیا ستم ڈھایا؟

بیگم : میں مجبور ہوں اس کی وجہ پھر بیان کروں گی۔

نواب : اگر منظور نہیں تو ہمیں قتل کر ڈالو۔ بس چھٹی ہوئی۔ اب زندگی اور موت تمھارے ہاتھ ہے۔

دوسرے دن نواب صاحب سو ہی رہے تھے کہ خدمت گار نے آ کر کہا۔ حضور، اور سب لوگ بڑی دیر سے تیار ہیں، دیر ہو رہی ہے۔

نواب صاحب نے شکاری لباس پہنا اور ثریا بیگم کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو چلے۔

بیگم : وہ بابو آج کہاں ہیں؟ مارے ڈر کے نہ آتے ہوں گے۔

بوس : ہم تو آج شبھو سے ہی سات ساتھ ہے گا۔ اب ہمارے کو کچھ خوف لگتی نہیں۔

بیگم : تمھارے کو ہاتھی تو نہیں ہلتی؟

گھوش : نہ، آج ہاتھی نہیں ہلتی۔ کل کا بات کل کے ساتھ گیا۔

ہاتھی چلے۔ تھوڑی دور جانے پر لوگوں نے اطلاع دی کہ شیر یہاں سے آدھ میل پر ہے اور بہت بڑا شیر ہے۔ نواب صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ ہاتھیوں کو دوڑا دو۔ بابوؤں کے فیل بان نے جو ہاتھی تیز کیا، تو بابو منھ کے بل زمین پر آ رہے۔

گھوش : ارے شالا، زمین پر گرا دیا۔

فیل بان : چپ چپ، غل نہ مچایئے، میں ہاتھی روکے لیتا ہوں۔

گھوش : غل نہ مچایئے تو پھر کیا مچایئے؟

فیل بان : وہ دیکھیے، بابو صاحب اٹھ بیٹھے، چوٹ نہیں آئی۔

گھوش : مہاشائی، لاگے نے تو؟

بوس : بڑے بود لوگ۔

گھوش : اپنا سماچار بولو۔

بوس : اپنا سماچار کی بول بو بابا!

مسٹر بوس جھاڑ پونچھ کر اٹھے اور مہاوت کو ہزاروں گالیاں دیں۔

بوس : مہاشائی، تم ایش کو مارو، مارو ایش دوشٹ کو۔

گھوش : او شالا، تمھارا شر پر بال نہیں، ہم پٹے پکڑ کر تم کو مار ڈالنے مانگتا۔

فیل بان ہنس دیا۔ اس پر بوس آگ ہو گئے۔ اور کئی ڈھیلے چلائے، مگر کوئی ڈھیلا فیل بان تک نہ پہنچا۔ فیل بان نے کہا۔ حضور، اب ہاتھی پر بیٹھ لیں، تو ہم نواب صاحب کے ہاتھیوں سے ملا دیں۔ بوس بولے۔ ہم ڈرپوک آدمی نہیں ہیں۔ ہم مہاراجہ بڑودا کے یہاں قسم قسم کا جانور دیکھ چکا ہے۔

گھوش : اب باتیں کب تک کرے گا۔ آ کے بیٹھ جا۔

فیل بان : حضور، قرآن کی قسم کھا کر کہتا ہوں، میرا قصور نہیں۔ آپ کبھی ہاتھی پر سوار تو ہوئے نہیں۔ ہودے پر لٹک کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھی جو ہلا تو آپ بھد سے گر پڑے۔

بوس : ہمارا دل میں آئی کہ تمھارا کان نوچ ڈالیں۔ ہم کبھی ہاتھی پر نہیں چڑھا۔ تم بولتا ہے۔ تمھارا باپ کے سامنے ہم ہاتھی پر چڑھا تھا۔ تم کیا جانے گا۔

جب شیر تھوڑی دور پر رہ گیا اور نواب صاحب نے دیکھا کہ بابو والا ہاتھی نہیں ہے تو

ڈرے کہ نہ جانے ان بے چاروں کی کیا حالت ہوگی۔ حکم دیا کہ سب ہاتھی روک لیے جائیں اور دھرتی دھمک کو دوڑا کر لے جاؤ۔ دیکھو، ان بے چاروں پر کیا تباہی آئی۔

دھرتی دھمک روانہ ہوا اور کوئی دس بارہ منٹ میں بابو صاحبوں کا ہاتھی دور سے نظر آیا۔ جب ہاتھی قریب آیا تو نواب صاحب نے پوچھا۔ بابو صاحب، خیریت تو ہے؟ ہاتھی کہاں رہ گیا تھا؟ بابو صاحبوں نے کچھ جواب نہ دیا، مگر فیل بان بولا۔ حضور، یہ دونوں بابو لوگ آپس میں لڑتے تھے، اسی سے دیر ہوگئی۔

اب بوس بابو سے نہ رہا گیا۔ بگڑ کر بولے۔ او شالا، تم ہمارے منہ پر جھوٹ بولتا ہے۔ تم شالا بنا کہے ہاتھی کو دوڑا دیے، ہم تو غافل پڑا تھا۔

اتنے میں آدمیوں نے اطلاع دی کہ شیر سامنے کی جھیل کے کنارے لیٹا ہوا ہے۔ لوگ بندوقیں سنبھال کر آگے بڑھے تو دیکھا، ایک بنیلا سور اونچی اونچی گھاس میں چھپا بیٹھا ہے۔ سب کی صلاح ہوئی کہ چاروں طرف سے خالی نشانے لگائے جائیں تاکہ گھبرا کر نکلے، مگر نواب صاحب کے دل میں ٹھن گئی کہ ہم اس پتاور میں ہاتھی ضرور لے جائیں گے۔ ثریا بیگم اب تک تو سیر دیکھتی تھیں، مگر پتوار میں جانا بہت اکھرا۔ بولیں۔ نواب، تمھارے سر کی قسم، اب ہم نہ جائیں گے۔ پتوار تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ہمیں کسی اور ہاتھی پر بیٹھا دو۔

نواب نے دو شکاریوں کو اپنے ہاتھی پر بیٹھا لیا اور ثریا بیگم کو دوسرے ہاتھی پر بیٹھا دیا گیا۔ ایک اور ہاتھی ان کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ تب نواب صاحب پتاور میں پہونچے۔ جب سور نے دیکھا کہ دشمن چلا آرہا ہے تو اٹھا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ نواب صاحب نے گولی چلائی۔ پھر اور شکاریوں نے بھی بندوقیں سر کیں۔ سور تڑپ کر جھیل کی طرف جھپٹا۔ اتنے میں تیسری گولی آئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ اب کام تمام ہوگیا۔ نواب صاحب کو شوق چرایا کہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کریں۔ ہاتھی سے اتر کر تلوار میان سے نکالی اور ساتھیوں کو جھیل کے کنارے سے ادھر اُدھر ہٹا دیا کہ سور سمجھے، سب چل دیے ہیں۔ جب سور نے دیکھا کہ میدان خالی ہے تو آہستہ آہستہ جھیل سے نکلا۔ نواب صاحب گھات میں تھے ہی، تاک کر ایسا ہاتھ دیا کہ بنیلا بول گیا۔ لوگوں نے چاروں طرف سے واہ۔ واہ کا شور مچانا شروع کیا۔

(1) حضور، یہ کرامات ہے۔

(2) سبحان اللہ، کیا تُلا ہوا ہاتھ لگایا کہ بولا تک نہیں۔

(3) تلوار کے دھنی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ایک ہی ہاتھ میں چورنگ کر دیا۔ کیا ہاتھ پڑا ہے، واہ!

(4) دھوم پڑ گئی، دھوم پڑ گئی۔ کیا کمال ہے، ایک ہی بار میں ٹھنڈا ہو گیا!

نواب : ارے بھئی، دیکھتے ہو۔ برسوں شکار کی نوبت نہیں آتی، مگر لڑکپن سے شکار کھیلا ہے۔ وہ بات کہاں جا سکتی ہے۔ ذرا کسی صورت سے بیگم صاحب کو یہاں لاتے اور ان کو دکھاتے کہ ہم نے کیسا شکار کیا ہے۔

بیگم صاحب کا ہاتھی آیا تو بگھیلے کو دیکھ کر ڈر گئی۔ اللہ جانتا ہے، تم لوگوں کو جان کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ اور جو پھر پڑتا تو کیسی ٹھرتی!

نواب : تعریف نہ کی، کتنی جواں مردی سے اکیلے آدمی نے شکار کیا۔ لاش تو دیکھو، کہاں سے کہاں تک ہیں!

ایک مصاحب : حضور نے وہ کام کیا جو ساری دنیا میں کسی سے نہیں ہو سکتا۔ دس پانچ آدمی ملا کر تو جسے چاہے مار لیں۔ مگر ایک آدمی کا تلوار لے کر بگھیلے سے بھیڑنا ذرا مشکل ہے۔

بیگم : اے ہے، تم اکیلے شکار کرنے گئے تھے۔ قسم خدا کی، بڑے ڈھیٹ ہو۔ میرے تو روئیں کھڑے ہوئے جاتے ہیں۔

نواب : اب تو ہماری بہادری کا یقین آیا کہ اب بھی نہیں؟

یہاں سے پھر شکار کے لیے روانہ ہوئے۔ بگھیلے کا شکار تو گھاتے میں تھا۔ جھیل کے قریب پہنچے، تو ہاتھی زور زور سے زمین پر پاؤں پٹکنے لگا۔

فیل بان : شیر یہاں سے بیس قدم پر ہے۔ بس یہی سمجھیے کہ اب نکلا، اب نکلا۔ کاشی سنگھ، ہاتھی پر آ جاؤ۔ دل رام سے بھی کہو، بہت آگے نہ بڑھے۔

کاشی سنگھ : ہنہ، سہر کے منئی، نیولا دیکھے ڈر جائے، ہم کا راہ دیکھاوت ہیں۔ وہ سیر تو ہم سوا سیر۔

نواب : یہ اُجڑپن اچھا نہیں۔ کاشی سنگھ، آ جاؤ۔ دلا رام، تم بھی کسی اور ہاتھی پر چلے جاؤ۔ مانو کہنا۔

دلارام : حضور، چار برس کی عمر سے باگھ مارتا چلا آوت ہو، کھا جائی، سسُر کھا جائے۔

بیگم : اے ہے، بڑھے ڈھیٹ ہیں۔ نواب، تم اپنا ہاتھی سب ہاتھیوں کے بیچ میں رکھو۔ ہمارے کلیجے کی دھڑکن کو تو دیکھو۔

اب سنیے کی اتفاق سے ایک شکاری نے شیر دیکھ لیا۔ ایک درخت کے نیچے چت سو رہا تھا۔ انھوں نے کسی سے نہ کچھ کہا، نہ سنا، بندوق داغ ہی تو دی۔ گولی پیٹھ پر پڑی۔ شیر آگ ہو گیا اور گرجتا ہوا لپکا، تو کھلبلی مچ گئی۔ آتے ہی کاشی سنگھ کو ایک تھپڑ دیا، دوسرا تھپڑ دینے ہی کو تھا کہ کاشی سنگھ سنبھلا اور تلوار لگائی۔ تلوار ہاتھ پر پڑی۔ تلوار کھاتے ہی ہاتھی کی طرف جھپٹا، اور نواب صاحب کے ہاتھی کے دونوں کان پکڑ لیے۔ ہاتھی نے ٹھوکر دی تو شیر 5-6 قدم پر گرا۔ ادھر ہاتھی، ادھر شیر، دونوں گرجے۔ بابو صاحبوں نے دوہائی دینی شروع کی۔

بوس : ارے، ہمارا نانی مر گیا۔ ارے بابا، ہم تو کال ہی سے روتا تھا کہ ہم نہیں جائے گا۔

گھوش : او بھائی، تم شیر کو روک لینا جلدی سے۔

بوس : ہم نیچے ہوتا تو ضرور کر کے روک لیتا۔

دو ہاتھی تو شیر کی گرج سن کر بھاگے، مگر بابو کا ہاتھی ڈٹا کھڑا تھا۔ اس پر بوس نے روک کر کہا۔ او شالا ہمارا ہاتھی، ارے تم کس مافق بھاگتا نہیں! تمھارا بھائی لوگ بھاگے جاتا ہے، تم کیوں کھڑا ہے؟

شیر نے جھپٹ کر نواب صاحب کے ہاتھی کے مستک پر ایک ہاتھ دیا تو گوشت کھینچ آیا۔ نواب صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک شکاری جو ان کے پیچھے بیٹھا تھا، نیچے گر پڑا۔ شیر نے پھر تھپڑ دیا۔ اتنے میں ایک چوکی دار نے گولی چلائی۔ گولی سر توڑ کر باہر نکل گئی اور شیر گر پڑا۔ مگر نواب صاحب ایسے بدحواس تھے کہ اب تک گولی نہ چلائی۔ لوگ سمجھے، شیر مر گیا۔ دو آدمی نزدیک گئے اور دیکھ کر بولے، حضور اب اس میں جان نہیں ہے، مر گیا۔ نواب صاحب ہاتھی سے اترنے ہی کو تھے کہ شیر گرج اٹھا اور ایک چوکیدار کو چھاپ بیٹھا۔ چاروں طرف ہولڑ مچ گیا۔ کوئی بندوق چھتیاتا ہے، کوئی للکارتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ تلوار لے کر دس بارہ آدمی پہنچ جاؤ، اب شیر نہیں اٹھ سکتا۔

نواب : کیا کوئی گولی نہیں لگا سکتا!

(1) : حضور، شیر کے ساتھ آدمی کی بھی جان جائے گی۔

نواب : تم تو اپنی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اب وہ نشانے بازی کہاں گئی؟ لگاؤ گولی۔

گولی پیٹھ کو چھوتی ہوئی نکل گئی۔ شکاری نے ایک اور گولی لگائی تو شیر کا کام تمام ہو گیا۔ مگر یہ گولی اس استادی سے چلائی تھی کہ چوکیدار پر آنچ نہ آنے پائی۔ سب لوگوں نے تعریف کی۔ شیر اوپر تھا اور چوکیدار نیچے۔ سات آدمی تلواریں لے کر جھپٹے اور شیر پر وار کرنے لگے۔ جب خوب یقین ہو گیا کہ شیر مر گیا تو لاش کو ہٹایا۔ دیکھا کہ چوکیدار مر رہا ہے۔

نواب : غضب ہو گیا یارو، ہاں! افسوس۔

بیگم : ہاتھی یہاں سے ہٹا لے چلو۔ کہتے تھے کہ شکار کو نہ چلو۔ تم نے میرا کہنا نہ مانا۔

نواب : فیل بان، ہاتھی بیٹھا دے، ہم اتریں گے۔

بیگم : اترنے کا نام بھی نہ لینا۔ ہم نہ جانے دیں گے۔

نواب: بیگم، تم تو ہم کو بالکل ڈرپوک ہی بنایا چاہتی ہو۔ ہمارا آدمی مر رہا ہے، مجھے دور سے تماشہ دیکھنا مناسب نہیں۔

بیگم نے نواب کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ اچھی بات ہے، جایئے، اب یا تو ہم تم دونوں گریں گے یا یہیں رہیں گے۔

نواب دل میں بہت خوش ہوئے کہ بیگم کو مجھ سے اتنی محبت ہے۔ آدمیوں سے کہا۔ ذرا دیکھو، اس میں کچھ جان باقی ہے۔ آدمیوں نے کہاں۔ حضور، اتنا بڑا شیر، اتنی دیر تک چھاپے بیٹھا رہا۔ بے چارا گھٹ گھٹ کے کبھی مر گیا ہوگا۔

بیگم : اب پھر تو کبھی شکار کو نہ آوگے۔ ایک آدمی کی جان مفت میں لی۔

نواب : ہم نے کیوں جان لی، جو ہمیں کو شیر مار ڈالتا۔

بیگم : کیا منحوس باتیں زبان سے نکالتے ہو، جب دیکھو، اپنے کو کوسا کرتے ہو۔

خیمہ پہنچ کر نواب صاحب نے واپسی کی تیاریاں کیں اور راتوں رات گھر پہنچ گئے۔

(92)

آج تو قلم کی باچھیں کھلی جاتیں ہیں۔ نوجوانوں کے مزاج کی طرح اٹھکھیلیوں پر ہے۔ ثریا بیگم خوب نکھر کے بیٹھی ہیں۔ لونڈیاں مہریاں بناو چناؤ کیے گھیرے کھڑی ہیں۔ گھر

میں جشن ہو رہا ہے۔ نہ جانے ثریا بیگم اتنی دولت کہاں سے لائیں۔ یہ ٹھاٹ تو پہلے بھی نہیں تھا۔

مہری : اے بی سیدانی، آج تو مزاج ہی نہیں ملتے۔ اس گلابی جوڑے پر اتنا اترا گئی۔

سیدانی : ہاں، کبھی بابا راج کاہے کو پہنا تھا۔ آج پہلے پہل ملا ہے۔ تم اپنے جوڑے کا حال تو کہو۔

مہری : تم تو بگڑنے لگیں۔ چلو، تمھیں سرکار یاد کرتی ہیں۔

سیدانی : جاؤ، کہہ دو، ہم نہیں آتے، آئی وہاں سے چودھرائن بن کے۔ اب گھورتی کیا ہو، جاؤ، کہہ دو نہ۔

مہری نے آکر ثریا بیگم سے کہا۔ حضور، وہ تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔ میں نے اتنا کہا کہ سرکار نے یاد کیا ہے کہ مجھے سیکڑوں باتیں سنائی۔

ثریا بیگم نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو مہری کے پیچھے سیدانی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ مہری پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

سیدانی : ہاں، ہاں کہو، اور کیا کہتی ہو۔ میں نے تمھیں گالیاں دیں، کوسا اور بھی کچھ!

ثریا بیگم کی ماں بیٹھی ہوئی شادی کا انتظام کر رہی تھیں۔ ان کے سامنے ثریا بیگم کی بہن جعفری بیگم بھی بیٹھی تھیں۔ مگر یہ ماں اور بہن آئیں کہاں سے۔ ان دونوں کا تو کہیں پتا ہی نہ تھا۔ ماں تو کب کی مر چکی۔ بہنوں کا ذکر ہی نہیں سنا۔ مزا یہ کہ ثریا بیگم کے ابا جان بھی باہر بیٹھے شادی کا انتظام کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ماں، باپ، بہن کہاں سے نکل پڑے۔ اس کا قصہ یوں ہے کہ نواب وجاحت علی نے ثریا بیگم سے کہا۔ اگر یوں ہی نکاح پڑھوا لیا گیا تو ہمارے رشتہ دار لوگ تم کو حقیر سمجھیں گے کہ کسی بیسوا کو گھر ڈال لیا ہوگا۔ بہتر ہے کہ کسی بھلے آدمی کو تمھیں اپنی لڑکی بنانے پر راضی کر لیا جائے۔

ثریا بیگم کو یہ بات پسند آئی۔ دوسرے دن ثریا بیگم ایک سید کے مکان پر گئی۔ سید صاحب کو مفت کے روپے ملے، انھیں نواب صاحب کے سسُر بننے میں کیا انکار ہوتا۔ قسمت کھل گئی۔ پڑوسی حیرت میں تھے کہ یہ سید صاحب ابھی کل تک تو جوتیاں چٹکاتے پھرتے تھے۔ آج اتنا روپیہ کہاں سے آیا کہ ڈومنیاں بھی ہیں، ناچ رنگ بھی، نوکر چاکر بھی اور سب کے سب نئے جوڑے پہنے ہوئے۔ ایک پڑوسی نے سید صاحب سے یوں بات چیت کی۔

پڑوسی: آج تو آپ کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ مگر آپ چاہے آدھی بات نہ کریں، میں تو چھیڑ کے بولوں گا۔

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں

سید: حضرت، بڑے فکر میں ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ شادی جھنجھٹ سے خالی نہیں۔ خدا کرے، خیریت سے کام پورا ہو جائے۔

پڑوسی: جناب، خدا بڑا کارساز ہے۔ کہاں شادی ہو رہی ہے؟

سید: نواب وجاحت علی کے یہاں، یہی سامنے محل ہے، بڑی کوشش کی، جب میں نے منظور کیا۔ میرا تو منشا یہی تھا کہ کسی شریف اور غریب کے یہاں بیاہوں۔

پڑوسی: کیوں؟ غریب کے یہاں کیوں بیاہتے؟ آپ کا خاندان مشہور ہے۔ باقی رہا روپیہ۔ یہ ہاتھ کا میل ہے۔ مگر اب یہ فرمایئے کہ سب بندوبست کر لیا ہے نا، میں آپ کا پڑوسی ہوں، میرے لائق جو خدمت ہو اس کے لیے حاضر ہوں۔

سید: اے حضرت، آپ کی مہربانی کافی ہے۔ آپ کی دعا اور خدا کی عنایت سے میں نے حیثیت کے موافق بندوبست کر لیا ہے۔

ادھر تو یہ باتیں ہوتی تھیں۔ ادھر نواب کے دوست بیٹھے آپس میں چہل کر رہے تھے۔

ایک دوست: حضرت، اس بارے میں تو آپ قسمت کے دھنی ہیں۔

نواب: بھئی، خدا کی قسم، آپ نے بہت ٹھیک کہا، اور سید صاحب کو تو بالکل فقیر ہی سمجھیے۔ ان کی دعا میں تو ایسا اثر ہے کہ جس کے واسطے جو دعا مانگی، فوراً قبول ہو گئی۔

دوست: جبھی تو آپ جیسے عالی خاندان شریف زادے کے ساتھ لڑکی کا نکاح ہو رہا ہے۔ اس وقت شہر میں آپ کا سا رئیس اور کون ہے؟

میر صاحب: اجی، شہزادوں کے یہاں سے جو نہ نکلے وہ آپ کے یہاں ہے۔

لالا: اس میں کیا شک، لیکن یہاں ایک ایک شہزادہ ایسا پڑا ہے جس کے گھر میں دولت لونڈی بنی پھرتی ہے۔

میر صاحب: کچھ بیدھا ہو کے تو نہیں آیا ہے۔ بڑھ کر دوسرا کون رئیس ہے شہر میں، جس کے یہاں ہے یہ ساز سامان؟

لالا : تم خوشامد کرتے ہو اور بندہ صاف صاف کہتا ہے۔

میر صاحب : جا، پہلے منھ بنوا، چلا وہاں سے بڑا صاف گو بن کے۔

دوست : ایسے آدمی کو تو کھڑے کھرے نکلوا دے، تمیز تو چھو ہی نہیں گئی۔ گو کھے پن کے سوا اور کوئی بات نہیں۔

نواب : بدتمیز آدمی ہے، شریفوں کی صحبت میں نہیں بیٹھا۔

میر صاحب : بڑا کھرا بنا ہے، کھرا کا بچّا۔

نواب : اجی، سخت بدتمیز ہے۔

گھر میں ثریا بیگم کی ہمجولیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔ فیروزہ بیگم نے چھیڑنا شروع کیا۔ آج تو حضور کا دل امنگوں پر ہے۔

ثریّا بیگم : بہن، چپ بھی رہو، کوئی بڑی بوڑھی آ جائیں تو اپنے دل میں کیا کہیں، آج کے دن معاف کرو، پھر دل کھول کے ہنس لینا۔ مگر تم مانوگی کا ہے کو!

فیروزہ : اللہ جانتا ہے، ایسا دولہا پایا ہے کہ جسے دیکھ کر بھوک پیاس بند ہو جائے۔

اتنے میں ڈومنیوں نے یہ غزل گانی شروع کی۔

دل کسی طرح چین پا جائے،
غیر کی آئی ہم کو آ جائے۔
دیدہ و دل ہیں کام کے دونوں،
وقت پر جو مزہ دکھا جائے
شیخ صاحب برائیاں مے کی
اور جو کوئی چیت جما جائے
جان تو کچھ گزر گئی اس پر،
منھ چھپاکے جو کوستا جائے
لاش اٹھے گی جبھی کہ ناز کے ساتھ،
پھیر کر منھ وہ مسکرا جائے۔
پھر نشانِ لحد رہے نہ رہے،
آکے دشمن بھی خاک اڑا جائے۔

وہ ملیں گے گلے سے خلوت میں،

مجھ کو ڈر ہے حیا نہ آ جائے۔

فیروزہ بیگم نے یہ غزل سن کر کہا۔ کتنا پیارا گلا ہے۔ لیکن لے اچھا نہیں۔

ثریا بیگم نے ڈومنیوں کو اشارہ کر دیا کہ یہ بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کر رہی ہیں۔ ذرا ان کی خبر لینا۔ اس پر ایک ڈومنی بولی۔ اب حضور ہم لوگوں کو لے سکھا دیں۔

دوسری : یہ تو مجرے کو جایا کریں تو کچھ پیدا کر لائیں۔

تیسری : بہن، ایسی کڑی نہ کہو۔

اتنے میں ایک عورت نے آ کر کہا۔ حضور، کل بارات نہ آئے گی۔ کل کا دن اچھا نہیں۔ اب پرسوں بارات نکلے گی۔

(93)

ثریا بیگم کے یہاں وہی دھما چکوڑی مچی تھی۔ پریوں کا جھرمٹ، حسینوں کا جم گھٹ آپس کی چہل اور ہنسی سے مکان گلزار بنا ہوا تھا۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ مہری نے آ کر کہا۔ حضور، رام نگر سے اصغر میاں کی بی بی آئی ہیں۔ ابھی ابھی بہلی سے اتری ہیں۔ جانی بیگم نے پوچھا۔ اصغر میاں کون ہیں؟ کوئی دیہاتی بھائی ہیں؟ اس پر حشمت بہو نے کہا، بہن وہ کوئی ہوں۔ اب تو ہمارے مہمان ہیں۔ فیروزہ بیگم بولیں۔ ہاں ہاں، تمیز سے بات کرو، مگر وہ جو آئی ہیں، ان کا نام کیا ہے؟ مہری نے آہستہ سے کہا۔ فیضن۔ اس پر دو تین بیگموں نے ایک دوسرے کے طرف دیکھا۔

حشمت بہو : واہ، کیا پیارا نام ہے۔ فیضن، کوئی میراثن ہے کیا؟

ثریا بیگم : تم آج لڑواؤ گی۔ جانی بیگم کون سا اچھا نام ہے۔

فیروزہ : دیہات کے تو یہی نام ہیں، کوئی زینب ہے، کوئی زینت، کوئی فیضن۔

ثریا بیگم : فیضن بڑی اچھی عورت ہے۔ نہ کسی کے لینے میں، نہ دینے میں۔

اتنے میں بی فیضن تشریف لائیں اور مسکرا کر بولیں۔ مبارک ہو۔

یہاں جتنی بیگم بیٹھی تھیں سب منہ پھیر پھیر مسکرائیں۔ بی فیضن کے پہناوے سے ہی دیہاتی پن برستا تھا۔

فیضن : بہن، آج ہی بارات آئے گی نا، کون کون رسم ہوئی؟ ہم تو پہلے ہی آتے، مگر ہمارے دیور کی طبیعت اچھی نہ تھی۔

فیروزہ : بہن، تمھارا نام کیا ہے؟

فیضن : فیضن۔

فیروزہ : اور تمھارے میاں کا نام؟

فیضن : ہمارے یہاں میاں کا نام نہیں لیتے۔ تم اپنے میاں کا نام بتاؤ۔

فیروزہ بیگم نے تڑ سے کہا۔ اصغر میاں۔ اس پر وہ فرمائیشی قہقہہ پڑا کہ دور تک آواز گئی۔ فیضن دنگ ہو گئی اور دل ہی دل میں سوچنے لگیں کہ اس شہر کی عورتیں بڑی ڈھیٹ ہیں۔ میں ان سے پیش نہ پاؤں گی۔

حشمت بہو : تو اصغر میاں بی فیضن کے میاں ہیں یا تمھارے میاں، پہلے اس کا فیصلہ ہو جائے۔

فیروزہ : اے ہے، اتنا بھی نہ سمجھیں، پہلے ان سے نکاح ہوا تھا، پھر ہم سے ہوا اور اب اصغر میاں کے دو محل ہیں۔ ایک تو یہ بیگم، دوسرے ہم۔

اس پر پھر قہقہہ پڑا، فیضن کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ اب اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ زبان کھول سکیں۔ جانی بیگم نے کہا۔ کیوں فیضن بہن، تمھارے یہاں کون کون رسمیں ہوتی ہیں؟ ہمارے یہاں تو دولہا لڑکے کے گھر جا کر دیکھ آتا ہے، بس پھر بات طے ہو جاتی ہے۔

فیضن : کیا یہاں میاں پہلے ہی دیکھ لیتے ہیں؟ ہمارے یہاں تو نو برس بھی ایسا نہ ہو۔

فیروزہ : یہ نو برس کیا، کیا یہ بھی کوئی ٹٹکا ہے؟ نو برس کی قید موئی کیسی!

فیضن : بہن، ہم موئی ٹوئی کیا جانیں۔

یہ سن کر ہمجولیاں اور بھی ہنسی۔

فیروزہ : یہ مہری موئی ٹوئی کہاں چلی گئی؟ ایک بھی موئی ٹوئی دیکھائی نہیں دیتی۔

حشمت بہو: ہم کا معلوم ہے، مگر ہم نہ بتاؤب۔

فیروزہ : ارے موئی ٹوئی پنکھیاں کہاں غائب ہو گئی؟

حشمت بہو : جس موئی ٹوئی کو گرمی معلوم ہو وہ ڈھونڈ لے۔

اتنے میں جلوس سجا اور دلہن کے ہاتھ دولہا کے لیے سہرہ گیا۔ چاندی کی خوشنما کشتیوں میں پھولوں کے ہار، بدھیاں اور جڑاؤں سہرا، اس کے بعد ڈومنیوں کا گانا ہونے لگا۔ فیضن نے کہا۔ ہم نے تو یہاں کی ڈومنیوں کی بڑی تعریف سنی ہے۔ اس پر ایک بوڑھی عورت نے پوپلے منھ سے کہا۔ اے حضور، اب تو نام ہی نام ہے، نہیں تو ہمارے لڑکپن میں ڈومنیوں کا محلہ بڑی رونق پر تھا۔ یہ محبوبن جو سامنے بیٹھی ہیں۔ ان کی دادی کا وہ دور دورہ تھا کہ اچھے اچھے شہزادے سر ٹیک کر آتے تھے۔ ایک بار بادشاہ تک ان کے یہاں آئے تھے۔ ہاتھی وہاں تک نہیں جا سکتا تھا۔ حکم دیا کہ مکان گرا دیے جائے اور چوگنا روپیہ مالکوں کو دیا جائے۔ ایک بوڑھی عورت جس کی بھویں تک سفید تھی، ہاتھی کی سونڈ پکر کر کھڑی ہوگئی اور کہا۔ میں ہاتھی کو آگے نہ بڑھنے دوں گی۔ میرے بزرگوں کی ہڈیاں کھود کے پھینک دی گئی۔ یہ مکان میرے بزرگوں کی ہڈی ہے۔ بادشاہ نے اس کے بزرگوں کے نام سے ایک خیرات خانہ جاری کر دیا۔ جب بادشاہ کا گھوڑا محبوبن کی دادی کے مکان پر پہونچا، تو دس بارہ ہزار آدمی گلی میں کھڑے تھے۔ مگر واہ ری ظہورن! اتنا سب کچھ ہوتے بھی غرور چھو نہ گیا تھا۔ برسات کے دن تھے، بادشاہ نے کہاں۔ ظہورن، جب جانیں کی مینہ برسا دو۔ مسکرا کر کہا۔ حضور، لونڈی ایک ادنیٰ سی ڈومنی ہے۔ مگر خدا کے نزدیک کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ کہہ کر تان لی۔

''آیو بدرا کارے، کارے رہی بجلی چمک مورے آنگن میں''

بس، پچھم طرف کے جھومتی ہوئی گھٹا اٹھی۔ سیاہی چھلکنے لگی۔ ظہورن کو خدا بخشے، پھر تان لگائی اور موسلادھار مینہ برسنے لگا، ایسا برسا کہ دریا بڑھ گیا اور تالاب سے دریا تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ جب تو یہاں کی ڈومنیاں مشہور ہیں۔ اور اب تو خدا کا نام ہے۔ اتنی ڈومنیاں بیٹھی ہیں، کوئی گائے تو؟

خدارا جلد لے آکر خبر تو اے میرے عیسیٰ
تیرے بیمار کا اب کوئی دم میں دم نکلتا ہے
نصیحت دوستوں کرتے ہو پر اتنا تو بتلاؤ،
کہیں آیا ہوا دل بھی سنبھالے سے سنبھلتا ہے۔

محبوب : بڑی گلے باز ہیں آپ، اور کیوں نہ ہو، کن کی کن کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ہم کیا جانیں۔

حیدری : ہم لوگوں کے گلے اسی سن میں کام نہیں کرتے، جب ان کی عمر کو پہونچے گے تو خدا جانے، کیا حال ہوگا۔

بڑھیا قبر میں ایک پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ سر ہلتا تھا، لٹھیا ٹیک کے چلتی تھی، مگر طبیعت ایسی رنگین کہ جوانوں کو مات کرتی تھی۔ سویرے ابٹنا نہ ملے تو چین نہ آئے۔ پٹیاں ضرور جماتی تھی، یوں تو بہت ہی خوش مزاج اور ہنس مکھ تھی، مگر جہاں کسی نے اس کو بوڑھی کہا، بس، پھر اپنے آپ میں نہیں رہتی تھی۔ فیروزہ نے چھیڑنے کے لیے کہا۔ تم نے جو زمانہ دیکھا ہے ہم لوگوں کو کہاں نصیب ہوگا۔ کوئی سو برس کا سن ہوگا، کیوں؟

بڑھیا نے پوپلے منھ سے کہا۔ اب اس کا میں کیا جواب دوں، بوڑھی میں کاہے سے ہو گئی، بالوں پر نزلا گرا، سفید ہو گئے، اس سے کوئی بڑھا ہو جاتا ہے۔

شام سے آدھی رات تک یہی کیفیت، یہی مزاق، یہی چھل پہل رہی۔ نئی دلہن گوری گوری گردن جھکائے، پیارا پیارا مکھڑا چھپائے، ادب اور حیا کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ہمجولیاں چپکے چپکے چھیڑتی جاتی تھیں۔ آدھی رات کے وقت دلہن کو بیسن مل مل کر نہلایا گیا۔ حنا کا عطر، سہاگ، کیوڑا اور گلاب بدن میں ملا گیا۔ اس کے بعد جوڑا پہنایا گیا۔ ہرے بافتے کا پاجاما، سوہے کی کرتی، سوہے کی اُڑھنی، بسنتی رنگ کا کاشمیری دوشالا اڑھایا گیا۔ بھاوجوں نے میڑھیاں گونتھی تھیں، اب زیور پہنانے بیٹھیں۔ سونے کے پازیب، چھاگل اور کڑے، دسوں پوروں میں چھلے، ہاتھوں میں چوہے دنتیاں، جڑاؤں کنگن، سونے کے کڑے، گلے میں موتیوں کا ہار، کانوں میں کرن پھول اور بالے، سر پر چھپکا اور سیس پھول، مانگ میں موتیوں کی لڑی دیکھ کر نظر کا پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ جواہرات کی چمک دمک سے گمان ہوتا تھا کہ زمین پر چاند نکل آیا ہے۔

جانی بیگم : چوتھی کے دن اور ٹھاٹ ہوں گے، آج کیا ہے۔

فیضن : آج کچھ ہوئی نہیں۔ ایسا مہکوا عطر کبھی نہیں سونگھا۔

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

حشمت بہو : بی فیضن کی باتوں سے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔

فیروزہ : کیسی کچھ اور چنچل کیسی ہیں، رگ رگ میں شوخی بھری ہے۔

جانی بیگم : بہن فیضن، ہم تمھارے میاں کے ساتھ نکاح پڑھوا لیں، برا تو نہ مانوگی؟

فیروزہ : دو دل راضی تو کیا کرے گا قاضی۔

حشمت بہو : بہن، تمھاری آنکھوں کا پانی بالکل ڈھل گیا۔ حیا بھُون کھائی۔

مہری : حضور، یہی تو دن ہنسی مذاق کے ہیں۔ جب ہم ان سنوں کے تھے تو ہماری بھی یہی کیفیت تھی۔

اتنے میں ایک ہمجولی نے آکر کہا۔ فیروزہ بیگم، وہ آئی ہیں مبارک محل۔ ان کے سامنے ذری ایسی باتیں نہ کرنا، وہ بڑی نازک مزاج ہیں۔ اتنی بے لحاظی اچھی نہیں ہوتی۔

فیروزہ : تو تم جا کے ادب سے بیٹھوں۔ تمھارا وظیفہ آج سے بندھ جائے گا۔

مبارک محل آئیں اور سب سے گلے مل کر ثریا بیگم کے پاس جا بیٹھیں۔

مبارک محل : ہم نے ثریا بیگم کو آج ہی دیکھا، خدا مبارک کرے۔

فیروزہ : اے ثریا بیگم، ذرا گردن اونچی کرو، واہ یہ تو اور جھکی جاتی ہیں۔ ہم تو سینہ تان کے بیٹھے تھے، کیا کسی کا ڈر پڑا ہے۔

حشمت : تم تو اندھیر کرتی ہو، نئی دلہن کہیں اکڑ کر بیٹھتی ہے؟

مہری : اے ہاں حضور، دلہن کہیں تن کر بیٹھتی ہے۔ کیا کچھ نئی ریتی ہے!

فیروزہ : اچھا صاحب، یوں ہی سہی، ذری اور جھک جاؤ۔

ایک ایک باجے کی آواز آئی۔ دولہا کے یہاں سے دلہن کا سہرہ بڑے ٹھاٹ سے آرہا تھا۔ جب سہرہ اندر آیا تو ثریا بیگم کی ماں نے کہاں، اب اس وقت کوئی چھینکے، مینکے نہیں، سہرہ اندر آتا ہے۔

سہرہ اندر آیا۔ دولہا کے بہنوئی نے سالی کے سر پر سہرہ باندھا اور ساس نے نیگ مانگا۔

ساس: ہاں، ہاں باندھ لو، اس وقت تمھارا حق ہے۔

بہنوئی : ان چکمو میں نہ جاؤں گا۔ لایئے، نیگ لایئے۔

حشمت : ہاں، بے جھگڑے نہ ماننا دولہا بھائی۔

بہنوئی : مان چکا، توڑوں کے منھ کھولیے۔ اب دیر نہ کیجیے۔

ثریا بیگم کی ماں نے پانچ اشرفیاں دیں۔ وہ تو لے کر باہر گئے۔ ادھر دولہا کے یہاں کی اوڑھی دلہن کو اُڑھائی گئی۔ پاجامے کی ناڑے کی اکیس گرہیں دی گئی۔ پردا ڈالا گیا۔ دلہن ایک پلنگ پر بیٹھی۔ پھولوں کے طوق اور بدھیاں پہنائی گئیں۔ پھولوں کا طرہ باندھا گیا۔ اب

بارات کے آنے کا انتظار تھا۔

فیروزہ : کیوں بہن فیضن ، سچ کہنا، اس وقت دلہن پر کیسا جوبن ہے!

فیضن : وہ تو یوں ہی خوبصورت ہے۔

فیروزہ : بارات بڑے دھوم دھام سے آئے گی۔ ہم نے چاہا تھا کہ منے میاں کے یہاں سے بارات کا ٹھاٹ دیکھیں۔

حشمت بہو : اے تو بارات یہیں سے کیوں نہ دیکھو۔ مہری، جا کے دیکھو، چکیں سب درست ہیں نا۔

مہری : حضور، سب سامان لیس ہے۔

فیروزہ بیگم اس کمرے کی طرف چلیں جہاں سے بارات دیکھنے کا بندوبست تھا۔ لیکن جب کمرے میں گئیں اور نیچے جھانک کے دیکھا تو سہم کر بولیں، افوہ، اتنا اونچا کمرہ، میں تو مارے ڈر کے گر پڑی ہوتی۔ جانی بیگم نے جب سنا کہ وہ ڈر گئیں تو آڑے ہاتھوں لیا۔ ہم نے سنا آپ، اس وقت سہم گئیں، واہ!

فیروزہ : خدا گواہ ہے، دل لگی نہ کرو، میرے ہوش ٹھکانے نہیں۔

جانی بیگم : چلو، بس زیادہ منھ نہ کھلواؤ۔

فیروزہ : اچھا، جا کے جھانکو تو معلوم ہو۔

جانی بیگم : چلو جھانکنے چل کے، دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

حشمت بہو : ہم بھی چلتے ہیں۔ ہم بھی جھانکیں گے۔

مہری : نہ بی بی، میں جھانکنے کو نہ کہوں گی۔ ایک بار کا ذکر سنو کہ میں تاج بی بی کا روزہ دیکھنے گئی۔ اللہ ری تیاری، تو روضہ کیا سچ مچ بہشت ہے۔ فرنگی تک جب آتے ہیں تو مارے رعب کے ٹوپی اُتار لیتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک بیگم بھی تھیں، جب روضہ کے پھاٹک پر پہنچے تو مجاور باہر چلے گئے۔ مالیوں کو حکم ہوا کہ پیٹھ پھر کر کام کریں۔ گنواروں سے پردا کیا۔

فیروزہ : اونہہ، پردا دل کا۔

حشمت : پھر مجاوروں کو کیوں ہٹایا؟

مہری : وہ آدمی ہیں اور مالی جانور، بھلا ان مزدوروں سے کون پردا کرتا ہے۔ اچھا، یہ تو بتاؤ کہ دلہن کو کہاں سے بارات دکھاؤ گی؟

حشمت : ہمارے یہاں کی دلہنیں بارات نہیں دیکھا کرتیں۔

فیروزہ : واہ، کیا انوکھی دلہن ہیں۔

جانی بیگم : جس دن تم دلہن بنی تھیں۔ اس دن بارات دیکھی ہوگی۔

فیروزہ : ہاں ہاں، نہ دیکھنا کیا معنی۔ ہم نے امّاں جان سے کہا کہ ہم کو دولہا دکھا دو، نہیں ہم شادی نہ کریں گے۔ انھوں نے کہا، اچھا جھروکے سے بارات دیکھو، ہم نے دیکھی۔ ہمارے میاں گھوڑے پر اکڑے بیٹھے تھے۔ ایک پھول ان کے سر پر مارا۔

حشمت : کیوں نہیں شاباش، کیا کہنا۔

جانی بیگم : پھول ناحق مارا، ایک جوتا کھینچ مارا ہوتا۔

فیروزہ : خوب یاد دلایا، اب سہی۔

جانی بیگم : اچھا مہری، تم نے ان بیگم صاحب کا ذکر چھیڑا تھا جن کے ساتھ تاج بی بی کا روضہ دیکھنے گئی تھی۔ پھر کیا ہوا؟

مہری : ہاں، خوب یاد آیا۔ ہم لوگ ایک برج پر چڑھ گئے، میں کیا کہوں حضور، کم سے کم ہوں گے تو کوئی سات آٹھ سو زینے ہوں گے۔

فیروزہ : اقوہ، اتنا جھوٹ اچھا پھر کیا ہوا کہتی جاؤ۔

مہری : خیر، دم لے لے کر پھر چڑھے، جب دُھر پر پہنچے تو دم نہیں باقی رہا کہ ذرا ہل بھی سکیں۔ بیگم صاحب نے اوپر سے نیچے کو جھانکا تو غش آگیا۔ دھم سے گریں۔

حشمت بہو : ہائے، ہائے! مریں کہ بچیں؟

مہری : بچ جانے کی ایک ہی کہی۔ ہڈی پسلی چور ہوگئی۔

فیروزہ : میں نے کہا تو کسی کو یقین نہیں آیا۔ اللہ جانتا ہے، اتنے اونچے پر سے جو سڑک دیکھی تو ہوش اڑ گئے۔

جانی بیگم : جانے دو بھئی، اب اس کا ذکر نہ کرو، چلو دلہن کے پاس بیٹھو۔

خبریں آنے لگیں کہ آج تک اس شہر میں ایسی بارات کسی نے نہیں دیکھی تھی ایک نئی بات یہ ہے کہ گوروں کا باجا ہے۔ ہزاروں آدمی گوروں کا باجا سننے آئے ہیں۔ چھتیں پھٹی پڑتی ہیں، ایک ایک کمرہ چوک میں آج دو دو اشرفیاں کرائے پر نہیں ملتا۔ سنا کہ بارات کے ساتھ نئی روشنی ہے جس کو گیس لائٹ بولتے ہیں۔

فیروزہ : اُس روشنی اور اِس روشنی میں کیا فرق ہے؟
مہری : اے حضور، زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن ہے۔

(94)

آزاد پولینڈ کی شہزادی سے رخصت ہو کر راتوں رات بھاگے۔ راستے میں روسیوں کی کئی فوجیں ملیں۔ آزاد کو گرفتار کرنے کی زوروں سے کوشش ہو رہی تھی، مگر آزاد کے ساتھ شہزادی کا جو آدمی تھا وہ انھیں سپاہیوں کی نظریں بچا کر ایسے انجان راستوں سے لے گیا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔ دونوں آدمی رات کو چلتے تھے اور دن کو کہیں چھپ کر پڑے رہتے تھے۔ ایک ہفتے تک بھاگا بھاگ چلنے کے بعد آزاد پلونا پہنچ گئے۔ اس مقام کو روسی فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ آزاد کے آنے کی خبر سنتے ہی پلونا والوں نے کئی ہزار سوار روانہ کیے کہ آزاد کو روسی فوجوں سے بچا کر نکال لائیں۔ شام ہوتے ہوتے آزاد پلونا والوں سے جا ملے۔

پلونا کی حالت یہ تھی کہ قلعے کے چاروں طرف روسی فوج کے پیچھے ترکوں کی فوج تھی۔ رات کو قلعے سے توپیں چلنے لگیں۔ ادھر روسیوں کی فوج بھی دونوں طرف گولے اتار رہی تھی۔ قلعے والے چاہتے تھے کہ روسی فوج دو طرف سے گھر جائے، مگر یہ کوشش کارگر نہ ہوئی۔ روسیوں کی فوج بہت زیادہ تھی۔ گولوں سے کام نہ چلتے دیکھ کر آزاد نے ترکی جنرل سے کہا۔ اب تو تلوار سے لڑنے کا وقت آ پہنچا، اگر آپ اجازت دیں تو میں روسیوں پر حملہ کروں۔

افسر : ذرا دیر اور ٹھہریے، اب مار لیا ہے۔ دشمن کے چھکّے چھوٹ گئے ہیں۔
آزاد : مجھے خوف ہے کہ روسی توپوں سے قلعے دیواریں نہ ٹوٹ جائیں۔
افسر : ہاں، یہ خوف تو ہے۔ بہتر ہے، اب ہم لوگ تلوار لے کر بڑھیں۔

حکم کی دیر تھی۔ آزاد نے فوراً تلوار نکال لی۔ ان کی تلوار کی چمک دیکھتے ہی ہزاروں تلوار میان سے نکل پڑیں۔ ترکی جوانوں نے داڑھیاں منہ میں دبائیں اور اللہ اکبر کہہ کر روسی فوج پر ٹوٹ پڑے۔ روسی بھی ننگی تلواریں لے کر مقابلے کے لیے نکل آئے۔ پہلے دو ترکی کمپنیاں بڑھیں، پھر کچھ فاصلے پر 6 کمپنیاں اور تھیں۔ سب سے پیچھے خاص فوج کی چودہ کمپنیاں تھیں۔ ترکوں نے یہ چالاکی کی تھی کہ صرف فوج کے ایک حصّے کو آگے بڑھایا تھا، باقی

کالموں کو اس طرح آڑ میں رکھا کہ روسیوں کو خبر نہ ہوئی۔ قریب تھا کہ روسی بھاگ جائیں، مگر ان توپ خانے نے ان کی آبرو رکھ لی۔ اس کے سوا ترکی فوج منزلیں مارے چلی آتی تھیں اور روسی فوج تازہ تھی۔ اتفاق سے روسی فوج کا سردار ایک گولی کھا کر گرا، اس کے گرتے ہی روسی فوج میں کھلبلی مچ گئی، آخر روسیوں کو بھگانے کے سوا کچھ نہ بن پڑی۔ ترکوں نے 6 ہزار روسی گرفتار کر لیے۔

جس وقت ترکی فوج پلونا میں داخل ہوئی، اس وقت کی خوشی بیان نہیں کی جا سکتی۔ بوڑھے اور جوان سبھی پھولے نہ سماتے تھے۔ لیکن یہ خوشی دیر تک قائم نہ رہی۔ ترکوں کے پاس نہ رسد کا سامان کافی تھا، نہ گولا بارود۔ روسی فوج نے پھر قلعے کو گھیر لیا۔ ترک حملوں کا جواب دیتے تھے، مگر بھوکے بھوکے سپاہی کہاں تک لڑتے۔ روسی غالب آتے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکوں کو پلونا چھوڑنا پڑے گا۔ پچیس ہزار روسی تین گھنٹے تک قلعے کی دیواروں پر گولے برساتے رہے۔ آخر دیوار پھٹ گئی اور ترکوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آپس میں صلاح ہونے لگی۔

فوج کا افسر : اب ہمارا قدم نہیں ٹھہر سکتا، اب بھاگ چلنا ہی مناسب ہے۔

آزاد : ابھی نہیں، ذرا اور صبر کیجیے، جلدی کیا ہے۔

افسر : کوئی نتیجہ نہیں۔

قلعے کی دیوار پھٹتے ہی روسیوں نے ترکی فوج کے پاس پیغام بھیجا، اب ہتھیار رکھ دو، ورنہ مفت میں مر جاؤ گے۔

لیکن اب بھی ترکوں نے ہتھیار رکھنا منظور نہ کیا۔ ساری فوج قلعے سے نکل کر روسی فوج پر ٹوٹی پڑی۔ روسیوں کے دل بڑھے ہوئے تھے کہ اب میدان ہمارے ہاتھ میں رہے گا، اور ترک کو جان پر کھیل گئے تھے۔ مگر مجبور ہو کر ترکوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اسی طرح ترکوں نے تین دھاوے کیے اور تینوں مرتبہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ ترکی جنرل پھر دھاوا کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ بادشاہی حکم ملا۔ فوجیں ہٹا لو، صلح کی بات چیت ہو رہی ہے۔ دوسرے دن ترکی فوجیں ہٹ گئیں اور لڑائی ختم ہو گئی۔

جس دن آزاد قسطنطنیہ پہنچے، ان کی بہت عزت ہوئی۔ بادشاہ نے ان کی دعوت کی اور انھیں پاشا کا خطاب دیا۔ شام کو آزاد ہوٹل میں پہنچے اور گھوڑے سے اترے ہی تھے کہ یہ آواز آئی، بھلا گیدی، جاتا کہاں ہے۔ آزاد نے کہا۔ ارے بھائی، جانے دو۔ آزاد کی آواز سن کر خوجی بے قرار ہو گئے۔ کمرے سے باہر آئے اور ان کے قدموں پر ٹوپی رکھ کر کہا۔ آزاد خدا گواہ ہے، اس وقت تمھیں دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا، منھ مانگی مراد پائی۔

آزاد : خیر، یہ تو بتلاؤ۔ مس میڈا کہاں ہے؟

خوجی: آ گئی، اپنے گھر پر ہیں۔

آزاد : اور بھی کوئی ان کے ساتھ ہے؟

خوجی : ہاں، مگر اس پر نظر نہ ڈالیے گا۔

آزاد : اچھا یہ کہیے۔

خوجی : ہم تو پہلے ہی سمجھ گئے تھے کہ آزاد بھاوج بھی ٹھیک کر لائے، مگر اب یہاں سے چلنا چاہیے۔

آزاد : اس پری کے ساتھ شادی تو کر لو۔

خوجی : اجی، شادی جہاز پر ہوگی۔

مس میڈا اور کلاریسا کو آزاد کے آنے کی جیوں ہی خبر ملی، دونوں ان کے پاس آ پہنچیں۔

میڈا : خدا کا ہزار شکر ہے، یہ کس کو امید تھی کہ تم جیتے جاگتے لوٹو گے۔ اب اس خوشی میں ہم تمھارے ساتھ ناچیں گے۔

آزاد : میں ناچنا کیا جانوں۔

کلاریسا : ہم تم کو سکھا دیں گے۔

خوجی : تم ایک ہی استاد ہو۔

آزاد : مجھے بھی وہ گر یاد ہیں کہ چاہوں تو پری کو اتار لوں۔

خوجی : بھئی، کہیں شرمندہ نہ کرنا۔

تین دن تک آزاد قسطنطنیہ میں رہے۔ چوتھے دن دونوں لیڈیوں کے ساتھ جہاز پر سوار ہو کر ہندستان چلے۔

(96)

آزاد، مئیڈا، کلاریسا اور خوجی جہاز پر سوار ہیں۔ آزاد لیڈیوں کا دل بہلانے کے لیے لطیفے اور چٹکلے کہہ رہے ہیں۔ خوجی بھی بیچ بیچ میں اپنا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔

خوجی : ایک دن کا ذکر ہے، میں ہولی کے دن بازار سے نکلا۔ لوگوں نے منع کیا کہ آج باہر نہ نکلیے، رونہ رنگ پڑ جائے گا۔ میں ان دنوں بالکل گینڈا بنا ہوا تھا۔ ہاتھی کی دم پکڑ لی تو ہمس نہ سکا۔ چیں سے بول کر چاہا کہ بھاگے، مگر کیا مجال! جس نے دیکھا، دانتوں انگلی دبائی کہ واہ پٹھے۔

آزاد : ایں، تب تک آپ پٹھے ہی تھے۔

خوجی : میں آپ سے نہیں بولتا۔ سنو مس مئیڈا، ہم بازار میں آئے تو دیکھا، ہڑبونگ مچا ہوا ہے۔ کوئی سو آدمی کے قریب جمع تھے اور رنگ اچھل رہا تھا۔ میرے پاس پیش قبض اور طمنچہ بس کا کہوں۔

آزاد : مگر کرولی نہ تھی۔

خوجی : بھئی، میں نے کہہ دیا، میری بات نہ کاٹو۔ للکار کر بولا، یارو، دیکھ بھال کے، مردوں پر رنگ ڈالنا دل لگی نہیں ہے۔ ایک پٹھان نے آگے بڑھ کے کہاں۔ خاں صاحب آپ سپاہی آدمی ہیں، اتنا غصہ نہ کیجیے، ہولی کے دن رنگ کھیلنا معاف ہے۔ میں نے کہاں، سنو بھائی تم مسلمان ہو کے ایسی باتیں کہتے ہو؟ پٹھان بولا، حضرت ہمارا ان لوگوں سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اتنے میں دو لونڈوں نے پچکاری تانی اور رنگ ڈال دیا، اوپر سے اسی پٹھان نے پیچھے سے تان کے ایک جوتا دیا تو کھوپری پلپلی ہو گئی۔ پھر کے دیکھتا ہوں تو ڈبل جوتا، سمجھاون بوجھاون مسکرا کر آگے بڑھا۔

آزاد : ایں، جوتا کھا کے آگے بڑھے۔

مئیڈا : اور اس زمانے میں سپاہی بھی تھے۔ اور بات بھی دل لگی کی تھی۔ مسکراتے نہ تو

کیا روتے؟

خوجی : میں تو سپاہی ہوں، تلوار سے بات کرتا ہوں، جوتے سے کام نہیں لیتا۔ کہاں تلوار، کہاں جوتی پیزار۔

کلاریسا : ایک حاکم نے گواہ سے پوچھا کہ مدعی کی ماں تمھارے سامنے روتی تھی یا نہیں؟ گواہ نے کہا، جی ہاں، بائیں آنکھ سے روتی تھی۔

خوجی : یہ تو کوئی لطیفہ نہیں، مجھے رہ رہ کے خیال آتا ہے اس آدمی نے ہولی میں بے ادبی کی تھی۔ اسے پا جاؤں تو خوب مرمت کروں۔

آزاد : اچھا، اب گھر پہنچ کر سب سے پہلے اس کی مرمت کیجیے گا۔ یہ لیجیے سوئج کی نہر۔

مس میڈا نے کہا : ہم ذرا یہاں کی سیر کریں گے۔ آزاد کو بھی یہ بات پسند آئی۔ اسکندریہ کے اسی ہوٹل میں ٹھہرے، جہاں پہلے ٹکے تھے۔ خوجی اکڑتے ہوئے ان کے پاس آئے اور کہا، اب یہاں ذرا ہمارے ٹھاٹ دیکھیے گا۔ پہلے تو لوگوں سے دریافت کر لو کہ ہم نے کشتی نکالی تھی یا نہیں؟ مارا چاروں شانے چت، اور کس کو؟ اس پہلوان کو جو سارے مصر میں ایک تھا۔ جس کا نام لے کر مصر کے پہلوانوں کے استاد کان پکڑتے تھے۔ اس کو دیکھو تو آنکھ کھل جائے۔ کسی کا بدن چور ہوتا ہے۔ اس کا قد چور ہے۔ پہلے تو مجھے ریلتا ہوا اکھاڑے کے باہر لے گیا اور میں بھی چپ چاپ چلا گیا، بس بھائی، پھر تو میں نے قدم جما کے جو ریلا دیا تو بول گیا۔ اب پیچ ہونے لگیں، مگر وہ استاد تو میں جگت استاد! اس نے پیچ کیا، میں نے توڑ کیا۔ اس نے دستی کھینچی، میں بغلی ہوا۔ اس نے ڈنڈا لگایا، میں نے اچک کے کاٹ کھایا۔

آزاد : سبحان اللہ، یہ پیچ سب سے بڑھ کر ہے۔ آپ نے اتنی تکلیف کیوں کی، بیٹھ کے کوسنا کیوں نہ شروع کر دیا؟

دونوں لیڈیاں ہنسنے لگیں تو خوجی بھی مسکرائے، سمجھے کہ میری بہادری پر دونوں خوش ہو رہی ہیں۔ بولے بس جناب، دو گھنٹے تک برابر کی لڑائی رہی، وہ کڑیل جوان، موٹا تازہ، پنچ ہتھا۔ اس کا قد کیا بتاؤں۔ بس جیسے حسین آباد کا ست کھنڈا۔ اس میں قوت اور یہاں استادی کرتب، میں نے اسے ہپا ہپا کے مارا، جب اس کا دم ٹوٹ گیا تو چرّ مرّ کر ڈالا۔ بس جناب،

کلا جنگ کے پیچ پر مارا تو چاروں شانے چت۔ کوئی پچاس ہزار آدمی دیکھ رہے تھے۔ تمام شہر میں مشہور تھا کہ ہند کا پہلوان آیا۔

آزاد : بھائی جان، سنو، اپنے منھ میاں مٹھو بننے کی سند نہیں۔ جب جانیں کہ ہمارے سامنے پٹکنی دو اور پہلے اس پہلوان کو بھی دیکھ لیں کہ کیسا ہے۔ تمھاری اس کی جوڑ ہے یا نہیں۔

خوجی : کچھ عجب آدمی ہیں آپ، کہتا جاتا ہوں کہ گرانڈیل پنچ ہتھا جوان ہے، آپ کو یقین ہی نہیں آتا، ہم اس کو کیا کریں۔

اتنے میں ہوٹل کے دو ایک آدمی خوجی کو دیکھ کر جمع ہو گئے۔ خوجی نے پوچھا، کیوں بھائی، ہم نے یہاں ایک کشتی نکالی تھی یا نہیں؟

ایک آدمی : واہ، ہمارے ہوٹل کے بونے نے تو اٹھا دے پٹکا تھا، چلے وہاں سے کشتی نکالنے!

خوجی : او گیدی، جھوٹ بولنا اور سور کھانا برابر ہے۔

دوسرا آدمی : ہاتھ پاؤں توڑ کے دھر دے گا۔ آپ اور کشتی !

خوجی : جی ہاں، ہم اور کشتی! کوئی آئے تب نہ! (تال ٹھوک کر) بلواؤ اس پہلوان کو۔

اتنے میں بونا سامنے آ کھڑا ہوا اور آتے ہی خوجی کو چڑھانے لگا۔ خواجہ صاحب نے کہا۔ یہی پہلوان ہے جس کو ہم نے پٹکا تھا۔ آزاد بہت ہنسے، بس ! ٹائے ٹائیں فس۔ بونے سے کشتی نکالی تو کیا۔ کسی برابر والے سے کشتی نکالتے تو جانتے۔ اسی پر گھمنڈ تھا۔

خوجی : صاحب، کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے، اگر اس سے ہاتھ ملائیں تو ظاہر ہو جائے۔

بونا تال ٹھونک کے سامنے آ کھڑا ہوا اور خوجی بھی پینترے بدل کر پہنچے۔ آزاد، میڈا اور ہوٹل کے بہت سے آدمی ان دونوں کے گرد ٹھٹ لگا کے کھڑے ہو گئے۔

خوجی : آؤ، آؤ بچا۔ آج بھی گدّا دوں گا۔

بونا : آج تمھاری کھوپڑی ہے اور میرا جوتا۔

خوجی : ایسا گدّا دوں کہ عمر بھر یاد رہے۔

بونا : انعام تو ملے گا ہی، پھر ہمارا کیا ہرج ہے؟

اب سنیے کہ دونوں پہلوان گتھ گئے۔ خوجی نے گھونسا تانا، بونے نے منہ چڑھایا۔ خوجی نے چپت جمائی، بونے نے دھول لگائی۔ دونوں کی چاند گھٹی گھٹائی، چکنی تھی۔ اس زور کی آواز آتی تھی کہ سننے والوں اور دیکھنے والوں کا جی خوش ہو جاتی تھا۔

میڈا: خوب آواز آئی، تڑاق! ایک اور!

کلاریسا: اُف، مارے ہنسی کے پیٹ مین بل پڑ گئے۔

خوجی: ہنسی کیوں نہ آئے گی۔ جس کی کھوپڑی پر پڑتی ہے اسی کا دل جانتا ہے۔

آزاد: ارے یار، ذرا زور سے چپت بازی ہو۔

خوجی: دیکھیے تو، دم کے دم میں بے دم کیے دیتا ہوں کہ نہیں۔

آزاد: مگر یار، یہ تو بالکل بونا ہے۔

خوجی: ہائے افسوس، تم ابھی بالکل لونڈے ہو۔ ارے کمبخت، اس کا قد چور ہے، یوں دیکھنے میں کچھ نہیں معلوم ہوتا، مگر اکھاڑے میں چٹ اور لنگوٹ باندھ کر کھڑا ہوا، بس پھر دیکھیے، بدن کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ بالکل گینڈا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی کہتا ہے، دُم کٹا بھینسا ہے، کوئی کہتا ہے، ہاتھی کا پاٹھا ہے، کوئی ناگوری بیل بتاتا ہے، کوئی کہتا ہے، جمنا پاری بکرا ہے، مگر مجھے اس کا غم نہیں۔ جانتا ہوں کہ کوئی بولا اور میں نے اٹھا کے دے مارا۔

خوجی نے کئی بار جھلا جھلا کر چپتیں لگائیں۔ ایک بار اتفاق سے اس کے ہاتھ ان کی گردن آ گئی، خواجہ صاحب نے بہت ہاتھ پیر مارے، بہت کچھ زور لگائے، مگر اس نے دونوں ہاتھوں سے گردن پکڑ لی اور لٹک گیا۔ خوجی کچھ جھکے، ان کا جھکنا تھا کہ اس نے زور سے مکّا دیا اور دو تین لپڑ لگا کے بھاگا۔ خوجی اس کے پیچھے دوڑے، اس نے کمرے میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ خوجی نے چپٹ کھائیں تو لوگ ہنسے اور مس کلاریسا نے تالیاں بجائیں۔ تب تو آپ بہت ہی جھلائے، آسمان سر پر اٹھا لیا، او گیدی، اگر شریف کا بچہ ہے تو باہر آ جا۔ گرا تو بھاگ کھڑا ہوا؟

آزاد: ارے میاں، یہ ہوا کیا؟ کون گرا، کون جیتا؟ ہم تو اس طرف دیکھ رہے تھے! معلوم نہیں ہوا، کس نے دے مارا۔

خوجی: ایسی بات آپ کاہے کو دیکھنے لگے تھے؟ انجر پنجر ڈھیلے کر دیے گیدی کے، واللہ، کشتی دیکھنے کے قابل تھی۔ میں نے ایک نیا پیچ کیا تھا۔ اس کے گرنے کے وقت ایسی آواز

آئی کہ یہ معلوم ہوتا تھا، جیسے پہاڑ پھٹ پڑا، آپ نے سنا ہی ہوگا۔

آزاد : وہ ہے کہاں؟ کیا کھود کے زمین میں گاڑ دیا آپ نے؟

خوجی : نہیں بھائی، ہارے ہوئے پر ہاتھ نہیں اٹھاتا، اور قسم ہے، پورا زور نہیں کیا، ورنہ میرے مقابلے میں کیا ٹھہرتا۔ ہاتھ پاؤں توڑ کے چرمر کر ڈالتا۔ نانی ہی تو مرگئی کمبخت کی، بس روتا ہوا بھاگا۔

آزاد : مگر خواجہ صاحب، گرا تو وہ اور یہ آپ کی پیٹھ پر اتنی گرد کیوں لگی ہے؟

خوجی : بھئی، یہاں پر ہم بھی قائل ہو گئے۔

کلاریسا : اسی طرح اس دفعہ بھی تم نے کشتی نکالی تھی؟

میڈا : بڑے شرم کی بات ہے کہ ذرا سا بونا تم سے نہ گرایا گیا۔

خوجی : جی چاہتا ہے، دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹوں۔ کہتا جاتا ہوں کہ اس گیدی کا قد چور ہے۔ آخر میرا بدن چور ہے یا نہیں، اس وقت میرے بدن پر انگرکھا نہیں ہے۔ خاصا دیو بنا ہوا ہوں، ابھی کپڑے پہن لوں تو پدّی معلوم ہونے لگوں۔ بس یہی فرق سمجھو۔ اوّل تو میں گرا نہیں، اپنے ہی زور میں آپ آ گیا۔ دوسرے اس کا قدر چور ہے، پھر آپ کیسے کہتے ہیں کہ ذرا سا بونا تھا؟

دوسرے دن آزاد دونوں لیڈیوں کو لے کر بازار کی ایک کوٹھی سے باہر آتے تھے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ خوجی افیم کی پینک میں اونگھتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ سامنے سے ساٹھ ستر ڈُمبے جاتے تھے۔ ڈُمبے والے نے پکارا۔ ہٹو ہٹو، بچو بچو وہ آپے میں ہوں تو بچیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ڈُمبے سے دھکا لگا تو دھم سے سڑک پر آ رہے اور گرتے ہی چونک کر غل مچایا۔ کوئی ہے؟ لانا کرولی۔ آج اپنی جان اور اس جان ایک کروں گا۔ خدا جانے، اس کو میرے ساتھ کیا عداوت پڑ گئی۔ ارے واہ بے بہروپیے، آج ہمارے مقابلے کے لیے سانڈیاں لایا ہے۔ ا..بے، یہاں ہر وقت چوکنے رہتے ہیں۔ اس دفعہ بزاز کی دوکان پر آئے تو مٹھائی کھانے میں آئی، آج یہ ہاتھ پاؤں توڑ ڈالنے سے کیا ملا۔ گھٹنے لہو لہان ہوگئے۔ اچھا بچا، اب تو میں ہوشیار ہو گیا ہوں، اب کی سمجھوں گا۔

ثریا بیگم کا مکان پری خانہ بنا ہوا تھا۔ ایک کمرے میں وزیر ڈومنی ناچ رہی تھی۔ دوسرے میں شہزادی کا مجرا ہوتا تھا۔

فیروزہ : کیوں فیضن بہن، تم کو اس اجڑے ہوئے شہر کی ڈومنیوں کا گانا کاہے کو اچھا لگتا ہوگا؟

جانی بیگم : ان کے لیے دیہات کی میراثنیں بلوا دو۔

فیضن : ہاں، پھر دیہاتی تو ہم ہیں ہی، اس کا کہنا کیا؟

اس فقرے پر وہ قہقہہ پڑا کہ گھر بھر گونج اٹھا اور فیضن بہت شرمائیں۔

جانی بیگم نے کہا: بس یہی بات تو ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ ایک تو بے چاری اتنی دیر کے بعد بولی، اس پر بھی سب نے مل کر ان کو بنا ڈالا۔

فہمین ڈومنی مجرا کرنے لگی۔ اس کے ساتھ دو عورتیں سارنگی لیے تھیں۔ ایک طبلہ بجا رہی تھی اور ایک مجیرے کی جوڑی۔ اس کے گانے کی شہر میں دھوم تھی۔

بندروار باندھو سب مل کے مالیبیاں

اس کو اس نے اس طرح ادا کیا کہ جس نے سنا، لٹو ہو گیا۔

جانی بیگم : چوتھی کے دن تیس چالیس طوائفوں کا ناچ ہوگا۔

نظیر بیگم : کشمیری نہیں آتے، ہمیں ان کی باتوں میں بڑا مزہ آتا ہے۔

حشمت بہو : نواب صاحب کو زنانے میں ناچ کرانے کی چڑھ ہے۔

فیروزہ : سنو بہن۔ جو عورت بدی پر آئے تو اس کی بات ہی اور ہے، نہیں تو شریف زادی کے لیے سب سے بڑا پردہ دل کا ہے۔

فیضن : فہمین، یہ گیت گاؤ۔

''ڈال گئیو کوؤ ٹونا رے۔''

فیروزہ : کیا گاؤ گیت! گیت کنڈے والیاں گاتی ہیں۔

جانی : اور ان کو ٹھمری، ٹپے، غزل سے کیا مطلب۔ نکٹا گاؤ۔

فیروزہ اور جانی بیگم کی باتیں سن کر مبارک محل بگڑ گئیں۔

فیروزہ : بہن، ہماری باتوں سے برا نہ ماننا۔

مبارک : برا مان کر کر ہی کیا لوں گی۔

جانی : ایسی باتوں سے آپس میں فساد ہو جاتا ہے۔

فیروزہ : یہ لڑواتی ہیں بہن، سچ کہتی ہوں۔

مبارک : تم دونوں ایک سی ہو۔ جیسے تم ویسے وہ، نہ تم کم، نہ وہ کم، شریفوں میں بیٹھنے لائق نہیں ہو۔ پڑھ لکھ کر بھی یہ باتیں سیکھیں۔

جانی : دیکھیے تو سہی، اب دل میں کٹ گئی ہوں گی۔

مبارک : میں ایسوں سے بات تک نہیں کرتی۔

فیروزہ : (تنک کر) جتنا دبو، اتنا اور دباتی ہیں، تم بات نہیں کرتیں، یہاں کون تم سے بات کرنے کے لیے بے قرار ہے۔

مبارک : مہری، ہماری پالکی منگواؤ، ہم جائیں گے۔

بیگم صاحب کو خبر ہوئی تو انھوں نے دونوں کو سمجھا بجھا کر راضی کر دیا۔ شام ہوئی، روشنی کا انتظام ہونے لگا۔ بیگم نے کہا۔ فرّاشوں کو حکم دو کہ بارہ دری کو جھاڑ کنول سے سجائیں، کمرے اور دلانوں میں صاف چاندنیاں بچھیں، ان پر اونی اور چینی غالیچیں ہوں۔ مہری نے باہر جا کر آغا صاحب سے یہ باتیں کہیں۔ بولے، ہاں ہاں صاحب سنا۔ بیگم صاحب سے کہو کہ یہ تو ہم کو انتظام کرنے دیں یا خود ہی باہر چلی آئیں۔ آخر ہم کو کوئی گنوار سمجھی ہیں۔ کل سے انتظام کرتے کرتے ہم شل ہو گئے اور جب بارات آنے کا وقت آیا تو حکم دینے لگیں کہ یہ کرو، وہ کرو۔ جا کر کہہ دو کہ باہر کا انتظام ہمارے تعلق ہے۔ آپ کیوں دخل دیتی ہیں۔ ہم اپنے بندوبست کر لیں گے۔

مہری نے اندر جا کر بیگم صاحب سے کہا۔ حضور، باہر کا سب انتظام ٹھیک ہے۔ بارہ دری کے پھاٹک پر نوبت خانہ ہے، اس پر کارچوبی جھول پڑی ہے، کہیں کنول اور گلاس ہیں، کہیں ہری اور لال ہاڈیاں۔ رنگ برنگ کے قمقمیں بڑی بہار دکھاتے ہیں۔

حشمت بہو : دروازے پر یہ شور کیسا ہو رہا ہے؟

مہری : حضور، شور کی نہ پوچھیں، آدمیوں کی اتنی بھیڑ لگی ہوئی ہے کہ شانے سے شانہ چھلتا ہے۔ دکانیں بھی بہت سے آئی ہیں۔ طنبولی لال کپڑے پہنے دکانوں پر بیٹھے ہیں۔

ہاتھوں میں چاندی کے کڑے، تھالیوں میں سفید پان، ایک تھالی میں چھوٹی الائچیاں، ایک میں ڈلیاں، کتھا عطر میں بسا ہوا، صفائی کے ساتھ گلوریاں بنا رہا ہے۔ ایک طرف ساکنوں کی دکانیں ہیں۔ بگڑے دل دموں پر دم لگاتے ہیں، بے فکرے ٹوٹے پڑتے ہیں۔

فیروزہ : سنتی ہو فیضن بہن، چلو ذرا باہر کی بہار دیکھ آئیں، یہ ناک بھوں کیوں چڑھائے بیٹھی ہو۔ کیا گھر سے لڑ کر آئی ہو؟

فیضن : ہمارے پیچھے کیوں پڑی ہو، ہم نہ کسی سے بولیں، نہ چالیں۔

حشمت بہو : ہاں فیروزہ، یہ تم میں بڑی بری عادت ہے۔

فیروزہ : لڑواؤ، وہ تو سیدھی سادی ہیں، شاید تمھارے بھروں میں آجائیں۔

جانی: فیروزہ بیگم جس محفل میں نہ ہوں وہ بالکل سونی معلوم ہو۔

فیروزہ : ہمیں افسوس یہی ہے کہ ہم سے مبارک محل بہن خفا ہوگئیں۔ اب کوئی میل کروا دے۔

مبارک : بہن، تم بڑی منہ پھٹ ہو۔

فیروزہ : اب صاف صاف کہوں تو برا مانو، ذرا ذرا سی بات میں چٹکتی ہو۔ آپس میں ہنسی، دل لگی ہوا ہی کرتی ہے۔ اس میں بگڑنا کیا؟ فیضن برا مانیں تو ایک بات بھی ہے، یہ بے چاری دیہات میں رہتی ہیں، یہاں کے راہ رسم کیا جانیں، مگر تم شہر کی ہو کر بات بات میں روئے دیتی ہو۔ رہی میں، میں تو حاضر جواب ہوں ہی۔ ہاں، جانی بیگم کی طرح زبان دراز نہیں۔

جانی : اب میری طرف جھکیں۔

حشمت : چونکھا لڑتی ہیں، اف ری شوخی!

اب دولہا کے یہاں کا ذکر سنیے۔ وہاں اس سے بھی زیادہ دھوم دھام تھی۔ نوجوان شہزادے اور نواب زادے جمع تھے۔ دل لگی ہو رہی تھی۔

ایک : یار، آج تو بے سرور جمائے جانا مناسب نہیں۔

دوسرا : معلوم ہوتا ہے، آج پی کے آئے ہو۔

پہلا : ارے میاں، خدا سے ڈرو، پینے والے کی ایسی تیسی۔

دولہا : ضرور پی کے آئے ہو۔ آپ ہماری بارات کے ساتھ نہ چلیے۔

دیوان خانے میں بزرگ لوگ بیٹھے پرانے زمانے کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب بولے۔ نہ اب وہ لوگ ہیں، نہ زمانہ۔ اب کس کے پاس جائیں، کوئی ملنے کے قابل ہی نہیں۔ علم کی تو اب قدر ہی نہیں۔ اب تو وہ زمانہ ہے کہ گالی کھائے، مگر جواب نہ دے۔

خواجہ صاحب : اب آپ دیکھیں کہ اس زمانے میں دس، بیس، تیس کی تیاریاں تھیں، مگر واہ رے برکت۔ ایک بھائی گھر میں نوکر ہے اور دس بھائی چین کر رہے ہیں۔

رات کے دس بجے نواب صاحب محل میں نہانے گئے۔ چاروں طرف بندنواریں بندھی ہوئی تھیں۔ آم، امرود اور نارنگیاں لٹک رہی تھیں۔ نیچے ایک سو ایک کورے گھڑے تھے، ایک مٹکے پر اکیس ٹوٹی کا بدھنا رکھا تھا اور بدھنے میں جَو لگے ہوئے تھے۔ دولہا کی ماں نے کہا— کوئی چھینکے وینکے نہیں، خبردار کوئی چھینکنے نہ پائے۔ گھر بھر میں بچوں کو منع کر دو کہ جس کو چھینک آئے، ضبط کرے۔ اب دل لگی دیکھیے کہ اس ٹوکنے سے سب کو چھینک آنے لگی۔ کسی نے ناک کو انگلی سے دبایا، کوئی لپک کے باہر چلا گیا۔ دولہا نے لنگی باندھی، بدن میں ابٹن ملا گیا۔ بہنیں سر پر پانی ڈالنے لگیں۔

دولہا : کتنا سرد پانی ہے۔ ٹھٹھرا جاتا ہوں۔

مہری : پھر حضور، شادی کرنا کچھ دل لگی ہے

بہن : دل میں تو خوش ہوں گے۔ آج تمھیں بھلا سردی لگے گی۔

نہا کر دولہا نے کھڑاؤں پہنی۔ کمرے میں آئے، کپڑے پہنے مشرو پائجاما، جامدانی کا انگرکھا، سر پر پگڑی کے ارد گرد موتی ٹکے ہوئے، بیچ میں پکھراج کا رنگین نگینہ، کمر میں شالی پٹکا، پگڑی پر پھولوں کا سہرہ، ہاتھ میں لال ریشمی رومال اور کندھے پر ہرا دوشالا، پیروں میں پھندنے دار بوٹ۔

جب دولہا باہر گیا تو بیگم صاحب نے لڑکیوں سے کہا۔ اب چلنے کی تیاری کرو۔ ہم کو بارات سے پہلے پہنچ جانا چاہیے۔ دولہا کی بہنیں اپنے اپنے جوڑے پہننے لگیں۔ مہریوں لونڈیوں کو بھی حکم ہوا کہ کپڑے بدلو۔ ذرا دیر میں سکھ پال اور جھپان دروازے پر لا کر لگا دیے گئے۔ دونوں بہنیں چلیں۔ دائیں بائیں مہریاں، مشالچیوں کے ہاتھ میں مشالیں، سپاہی اور خدمت لال پھندے دار پگڑیاں باندھے ساتھ چلے۔ جس طرف سے سواری نکل گئی، گالیاں عطر کی مہک سے بس گئیں۔ یہی معلوم ہوتا تھا کہ پریوں کا اڑن کھٹولا ہے۔

جب دو بہنیں سمدھیانے پہنچ گئیں، تو نواب صاحب کی ماں بھی چلیں۔ وہاں دلہن کی ماں نے ان کی پیشوائی کی۔عطر پان سے خاطر ہوئی اور ڈومنیوں کا ناچ ہونے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد دولہا کے یہاں سے بارات چلی، سب کے آگے ہاتھی پر نشان تھا۔ ہاتھی کے سامنے آنار اور ہزارے چھوٹ رہے تھے۔ ہاتھیوں کے پیچھے انگریزی باجے والوں کی دھوم تھی۔ پھر سجے ہوئے گھوڑے سر سے پاؤں تک زیور سے لدے چلے جاتے تھے۔ سائس ان کی باگ پکڑے ہوئے تھے اور دو سپاہی ادھر اُدھر قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ دولہا کے سامنے شہنائی بج رہی تھی۔ تماشہ دیکھنے والے یہ ٹھاٹ باٹ دیکھ کر دنگ ہو رہے تھے۔

ایک : بھئی، اچھی بارات سجائی، اور خوب آتش بازی بنائی ہے۔ آتش بازی کیا بنوائی ہے، یوں کہیے کہ چاندی گلوائی ہے۔

دوسرا : انار تو آسمان کی خبر لاتا ہے، مگر دھواں آسمان کے بھی پار ہو جاتا ہے۔

تخت ایسے تھے کہ جو دیکھتا، دانتوں انگلی دباتا۔ ایک ہاتھی ایسا نادر بنا تھا کہ نقل کو اصل کر دکھایا تھا۔ بعض بعض تخت آدمیوں کو مغالطہ دیتے تھے، خاص کر چنڈو بازوں کا تخت تو ایسا بنایا تھا کہ چنڈو والوں کو شرمایا۔ ایک چنڈو باز نے جھلا کر کہا۔ ان کمہاروں کو ہم سے عداوت ہے۔ خدا ان سے سمجھے۔ ایک محفل کی تصویر بہت ہی خوبصورت تھی۔ فرش پر بیٹھے لوگ ناچ دیکھ رہے ہیں، بیچ میں مسند بچھی ہے، دولہا تکیے لگائے بیٹھا ہے اور سامنے ناچ ہو رہا ہے۔ سب کے پیچھے ایک آدمی ہاتھی پر بیٹھا روپے لٹاتا آتا تھا اور شہدے غل مچاتے تھے۔ ایک ایک روپے پر دس دس گرے پڑتے تھے۔ جان پر کھیل کر پلے پڑتے تھے۔

یہ وہی ثریا بیگم ہیں جو ابھی کل تک ماری ماری پھرتی تھیں۔ جن کو ساری دنیا میں کہیں ٹھکانہ نہ تھا، وہی ثریا بیگم آج شان سے دلہن بنی بیٹھی ہیں اور اس دھوم دھام سے ان کی بارات آتی ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن سبھی مفت میں مل گئے۔ اس وقت ان کے دل میں طرح طرح کے خیال آتے تھے۔ یہاں کسی کو معلوم نہ ہو جائے کہ یہی سرائے میں رہتی تھی، اسی کا نام اللہ رکھی بھٹیاری تھا، پھر تو کہیں کی نہ رہوں۔ اس خیال سے انھیں اتنی گھبراہٹ ہوئی کہ ادھر دروازے پر بارات آئی اور ادھر وہ بے ہوش ہو گئی۔ سب نے دلہن کو گھیر لیا۔ ارے، خیر تو ہے۔ یہ ہوا کیا، کسی نے پانی کے چھینٹے دیے، کسی نے مٹی پر پانی ڈال کر سنگھایا۔ دلہن کی ماں ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔

حشمت : اے، یہ ہوا کیا اماں جان؟

فیروزہ : ابھی اچھی خاصی بیٹھی ہوئی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے غش آ گیا۔

باہر دلہا نے یہ خبر سنی تو اپنی مہری کو بلوایا اور سمجھایا کہ جا کے پوچھو، اگر ضرورت ہو تو ڈاکٹر کو بلوا لوں۔ مہری نے آ کر کہا۔ حضور، اب طبیعت بحال ہے، مگر پسینہ آرہا ہے اور پانی پانی کرتی ہیں۔ نواب صاحب کی جان میں جان آئی۔ بار بار طبیعت کا حال پوچھتے تھے۔ جب دلہن کی حالت درست ہو گئی تو ہمجولیوں نے دق کرنا شروع کیا۔

جانی : آخر اس غش کا سبب کیا تھا؟ ہاں، اب سمجھی۔ ابھی صورت دیکھی نہیں اور غش آنے لگے۔

فیروزہ : اے نہیں، کیا جانے اگلی پچھلی کون بات یاد آ گئی۔

جانی : صورت سے تو خوشی برستی ہے، وہ ہنسی آئی۔ اے، لو وہ پھر گردن جھکا لی۔

حشمت : یہاں تو پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔

فیروزہ : مزہ تو جب آتا کہ نکاح کے وقت غش آتا، میاں کو بناتے تو، کہ اچھے سبز قدم ہو۔

اب سنیے کہ محل سے برابر خبریں آ رہی ہیں کہ طبیعت اچھی ہے، مگر نواب صاحب کو چین نہیں آتا۔ آخر ڈاکٹر صاحب کو بلوا ہی لیا۔ ان کا محل میں داخل ہونا تھا کہ ہمجولیوں نے ان پر آوازیں کسنے شروع کیں۔

ایک : موا سونس ہے کہ آدمی، اچھے بھد بھد کو بلایا۔

دوسری : توند کیا، چار آنے والا فروخ آبادی تربوز ہے؟

تیسری : تمباکو کا پنڈا ہے یا آدمی ہے؟

چوتھی : کہہ دو، کوئی اچھا حکیم بلاویں، اس جنگلی ہوش کی سمجھ میں کیا خاک آئے گا۔

پانچویں : خدا کی مار ایسے موئے پر۔

ڈاکٹر صاحب کرسی پر بیٹھے، نئے آدمی تھے، اردو واجبی ہی واجبی سمجھتے تھے۔ بولے۔ دارود ہوتے کون جاگو؟

مہری : نہیں ڈاکٹر صاحب، درود تو نہیں بتاتیں، مگر دیکھتے دیکھتے غش آ گیا۔

ڈاکٹر : گاس کس کو بولتے ؟

مہری : حضور میں سمجھتی نہیں۔ گھاس کیا؟

ڈاکٹر : گاس کس کو بولتے ؟ تم لوگ کیا گول مال کرنے مانگتا ہم زبان دیکھے۔

فیروزہ : نوج ایسا حکیم ہو۔ ڈاکٹر کی دم بنا ہے۔

جانی : کہو نبض دیکھے۔

ڈاکٹر : نابوض کیسا بات ہے۔ ہم لوگ نابوض دیکھنا نہیں مانگتا، زبان دکھائے، زبان اس موافق۔

ڈاکٹر صاحب نے منہ کھول کر زبان باہر نکالی۔

فیروزہ : منہ کاہے کو گھنٹہ بیگ، کی گڑھیا ہے

جانی : ارے مہری، دیکھتی کیا ہے، منہ میں دھول جھونک دے۔

حشمت : ایک دفعہ پھر منہ کھولے تو میں پنکھے کی ٹھنڈی حلق میں ڈال دوں۔

ڈاکٹر : جس موافق ہم زبان دکھایا، اس موافق ہم دیکھنا مانگتا۔ سب مائی لوگ ہنسی کرتا۔ زبان دیکھانے میں کیا بات ہے۔

فیروزہ : نواب صاحب سے کہو، پہلے اس کے دماغ کا علاج کریں۔

ثریا بیگم جب کسی طرح زبان دکھانے پر راضی نہ ہوئیں تو ڈاکٹر صاحب نے نبض دیکھ کر نسخہ لکھا اور چلتے ہوئے۔ ثریا کا جی کچھ ہلکا ہوا۔ مگر اسی وقت مہمانوں کے ساتھ انھوں نے ایک ایسی عورت کو دیکھا جو ان سے خوب واقف تھی، وہ میکے میں ان کے ساتھ برسوں رہ چکی تھی۔ ہوش اڑ گئے کہ کہیں یہ پورا حال سب سے کہہ دے تو کہیں کی نہ رہوں۔ اس عورت کا نام ممولا تھا۔ وہ ایک ہی شریر، آوازیں کسنے لگی۔ ایک لڑکے کو گود میں لے کر اس کے ساتھ کھیلنے لگی اور باتوں باتوں میں ثریا بیگم کو ستانے لگی ہم خون پہچانتے ہیں۔ سرائے میں بھی دیکھا تھا۔ محل میں بھی دیکھا تھا۔ اللہ رکھی نام تھا۔ ان فقروں نے ثریا بیگم کو اور بھی بے چین کر دیا، چہرے پر زردی چھا گئی۔ کمرے میں جا کر لیٹ رہیں۔ ادھر ممولا نے بھی سمجھا کی اگر زیادہ چھیڑتی ہوں تو دلہن دشمن ہو جائے گی۔ چپ ہو رہی۔

باہر محفل جمی ہوئی تھی۔ دولہا جیوں ہی مسند پر بیٹھا، ایک حسینہ نزاکت کے ساتھ قدم اٹھاتی محفل میں آئی۔ یاروں نے منہ مانگی مراد پائی۔ ایک بوڑھے میاں نے پوپلے منہ سے کہا۔ خدا خیر کریں۔ اس پر محفل بھر نے قہقہہ لگایا اور وہ پری بھی مسکرا کر بولی۔ بوڑھے منہ منہا سے، اس بڑھوتی میں چھیڑ چھاڑ کی سوجھی۔ آپ نے ہنس کر جواب دیا۔ بی بی، ہم بھی

کبھی جوان تھے، بوڑھے ہوئے تو کیا، دل تو وہی ہے۔

یہ پری ناچنے کھڑی ہوئی تو ایسا ستم ڈھایا کہ ساری محفل لوٹ پوٹ ہو گئی۔ نوجوانوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہونے لگیں۔

ایک : بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس کے قدموں پر سر رکھ دوں۔

دوسرا : کل ہی پرسوں ہمارے گھر نہ پڑ جائے تو اپنا نام بدل ڈالوں، دیکھ لینا۔

تیسرا : قسم خدا کی، میں تو اس کی غلامی کرنے کو حاضر ہوں، پوچھو تو کہاں سے آئی ہے۔

چوتھا : شین قاف سے درست ہے۔

پانچواں : ہم سے پوچھو۔ مرادآباد سے آئی ہے۔

حسینہ نے سریلی آواز میں ایک غزل گائی۔ اس غزل نے محفل کو مست کر دیا۔ ایک صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ چلے، یہ وہی صاحب تھے جنھوں نے کہا تھا کہ ہم اسے گھر ڈال لیں گے۔ لوگوں نے سمجھایا۔ بھئی، اس رونے دھونے سے کیا مطلب نکلے گا۔ یہ کوئی شریف کی بہو بیٹی تو ہے نہیں ہم کل ہی شپّا لڑا دیں گے۔ مگر اس وقت تو خدا کے واسطے آنسو نہ بہاؤ، ورنہ لوگ ہنسیں گے۔ انھوں نے کہاں بھائی، دل کو کیا کروں، میں تو خود چاہتا ہوں کہ دل کا حال ظاہر نہ ہو، مگر وہ مانتا ہی نہیں تو میرا کیا قصور ہے۔

یہ حضرت تو رو رہے تھے اور لوگ اس کی تعریف کر رہے تھے۔ ایک نے کہا یہ ہمارے شہر کی ناک ہیں۔ دوسرا بولا۔ اس میں کیا شک۔ آپ بہت ہی ملنسار، نیک، خوش مزاج ہیں۔ تیسرے صاحب بولے، اے حضرت، دور دور تک شہرت ہے ان کی۔ اب اس شہر میں جو کچھ ہیں یہی ہیں۔

اس جلسے میں دو چار دیہاتی بھی بیٹھے تھے۔ ان کو یہ باتیں ناگوار لگیں۔ منّے میاں بولے۔ واہ، اچھا دستور ہے شہر کا، پتریاں کو سامنے بٹھا لیا۔

چھٹّن : ہمارے دیش میں اگر پتریاں کو کوئی بیچ میں بٹھائے تو حقہ پانی بند ہو جائے۔

گجراج : پتریاں بیٹھے کاہے کو، پنہی نہ کھائے،

نواب : جی ہاں، شہر والے بڑے ہی بے شرم ہوتے ہیں۔

آغا : دیہاتیوں کی لیاقت ہم بے چارے کہاں سے لائیں۔

گجراج : ہئی ہے، ہم لوگ عزت دار ہیں۔ کوئی ننگے لچے نہیں ہیں۔

آغا : تو جناب، آپ شہر کی مجلس میں کیوں آئے؟

گجراج : کاہے کو بلایا، کیا ہم لوگ بن بلائے آئے؟

آغا : اچھا، اب غصے کو تھوک دیجیے۔

جب یہ لوگ ذرا ٹھنڈے ہوئے، تو اس حسینہ نے ایک فارسی غزل گائی، اس پر ایک کمسن نواب زادے نے جو پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھا، اونچی آواز سے کہا۔ واہ جان من کیوں نہ ہو۔ اس لڑکے کے باپ بھی محفل میں بیٹھے تھے۔ مگر اس لڑکے کو ذرا بھی شرم نہ آئی۔

اس کے بعد طائفہ بدلی گئی۔ یہ آکر محفل میں بیٹھ گئی اور اس کے پیچھے سازندے بھی بیٹھ گئے۔

نواب : اے، خیریت تو ہے؟ اے صاحب، ناچیے گائیے۔

حسینہ : کل سے طبیعت خراب ہے۔ دو ایک چیزیں آپ کی خاطر سے کہیے تو گا دوں۔

نواب : مزہ کرکرا کر دیا۔ تمھارے ناچ کی بڑی تعریف سنی ہے۔

حسینہ : کیا عرض کروں۔ آج تو ناچنے کے قابل نہیں ہوں۔

یہ کہہ کر اس نے ایک ٹھمری شروع کر دی۔ ادھر بڑے نواب صاحب محل میں گئے اور جہاں دُلہن کا پلنگ تھا، وہاں بیٹھے۔ خواص نے چکنی ڈلی، الائچی، گلوریاں پیش کیں۔ عطر کی شیشیاں سامنے رکھیں۔ بڑے نواب صاحب حقہ پینے لگے۔

ثریا کی ماں پردے کی آڑ سے بولیں۔

بڑے نواب : بندگی، خدا کرے، اس کی اولاد دیکھو۔

بیگم : خدا آپ کی دعا قبول کریں۔ شکر ہے کہ اس شادی کی بدولت آپ کی زیارت ہوئی۔

بڑے نواب : دُلہن سے پوچھوں : کیوں بیٹی، میرے لڑکے سے تمھارا نکاح ہوگا۔ تم اسے منظور کرتی ہو؟

ثریا بیگم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بڑے نواب صاحب نے کئی مرتبہ یہی سوال پوچھا، مگر دُلہن نے سر اوپر نہ اٹھایا۔ آخر جب حشمت بہو نے آکر کہا۔ کیا سب کو دق کرتی ہو،

جی تو چاہتا ہوگا کہ بے نکاح ہی چل دو، مگر نخروں سے باز نہیں آتی ہو۔ تب ثریا بیگم نے آہستہ سے کہا۔ ہوں۔

بڑی بیگم : آپ نے سنا؟

بڑے نواب : جی نہیں ذرا بھی نہیں سنا۔

بڑی بیگم نے کہا۔ آپ لوگ ذرا خاموش ہو جائیں تو نواب صاحب لڑکی کی آواز سن لیں۔ جب سب خاموش ہو گئیں تو دلہن نے پھر آہستہ سے کہا۔ ہوں۔

اُدھر نوشا کے دوست اس سے مذاق کر رہے تھے۔

ایک : آپ سے جو پوچھا جائے کہ نکاح منظور ہے یا نہیں، تو آپ گھنٹے بھر تک جواب نہ دیجیے گا۔

دوسرا : اور نہیں تو کیا، ہاں کہہ دیں گے؟

تیسرا : جب لوگ ہاتھ پیر جوڑنے لگیں، تب آہستہ سے کہنا، منظور ہے۔

چوتھا : ایسا نہ ہو، تم فوراً منظور کر لو اور ادھر والے ہماری ہنسی اڑائیں۔

دولہا : دولہا تو نہیں بنے، مگر باراتیں تو بہت دیکھی ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی یہی مرض ہے تو میں دو گھنٹے میں منظور کروں گا۔

اب مہر پر تکرار ہونے لگی۔ دلہن کے بھائی نے کہا۔ مہر چار لاکھ سے کم نہ ہوگا۔ بڑے نواب صاحب بولے۔ بھائی، اور بھی بڑھا دو، چار لاکھ میری طرف سے پورے آٹھ لاکھ کا مہر بندھے۔

نکاح کے بعد کشتیاں آئیں۔ کسی میں دوشالا، کسی میں بھاری بھاری ہار، طشتریوں میں چکنی ڈلی، الائچی، پان، شیشیوں میں عطر۔ کسی کشتی میں مٹھائیاں اور مصری کے کوزے۔ جب قاضی صاحب رخصت ہو گئے تو دولہا نے پانچ اشرفیاں نذر دکھائی۔ نواب صاحب باہر آئے۔ تھوڑی دیر کے بعد محل سے شربت آیا۔ نواب صاحب نے اکیس اشرفیاں دیں۔ دلہن کے خدمت گار نے پانچ اشرفیاں پائیں۔ پہلے تو دوشالا مانگتا رہا، مگر لوگوں کے سمجھانے سے انعام لے لیا۔ دلہن کے لیے جھوٹا شربت بھیجا گیا۔ محفل والوں نے شربت پیا، ہار گلے میں ڈالا، عطر لگایا اور پان کھا کر گانا سننے لگے۔ اتنے میں اندر سے آدمی دولہا کو بلانے آیا۔ دولہا یہاں سے خوش خوش چلا۔ جب ڈیوڑھی میں پہنچا تو اس کی بہنوں نے آنچل ڈالا اور لے جا کر دلہن

کے پاس مسند پر بیٹھا دیا۔ ڈومنیوں نے ریت رسم شروع کی۔ پہلے آرسی کی رسم ادا کی۔

فیروزہ : کہیے، بی بی منھ کھولو! میں تمھارا غلام ہوں۔

نواب : بی بی منھ کھولو، میں تمھارے غلام کا غلام ہوں۔

حشمت : جب تک ہاتھ نہ جوڑو گے، منھ نہ کھولے گی۔

مبارک محل : اوپر کے دل سے غلام بنتے ہو، دل سے کہو تو آنکھیں کھول دیں۔

نواب : یا خدا، اب اور کیوں کر کہوں، بی بی تمھارا غلام ہوں۔ خدا کے لیے ذرا صورت دکھا دو۔

دولہا نے ایک دفعہ جھوٹ موٹ غل مچا دیا، وہ آنکھیں کھولیں۔ سکھیوں نے کہا جھوٹ کہتے ہو، کون کہتا ہے آنکھ کھولی۔

ڈومنی : بیگم صاحب، اب آنکھیں کھولیے، بے چارے غلام بنتے بنتے تھک گئے۔ آپ فقط آنکھ کھول دیں۔ وہ آپ کو دیکھیں۔ آپ چاہے انھیں نہ دیکھیں۔

فیروزہ : واہ، دولہا تو چاہے پیچھے دیکھے، یہ پہلے ہی گھور لیں گی۔

آخر ثریا بیگم نے ذرا سر اٹھا اور نواب سے چار آنکھیں ہوتے ہی شرما کر گردن نیچے کر لی۔

نواب : کہیے۔ اب آنکھیں کھولیں یا اب بھی نہیں کھولیں۔

فیروزہ : ابھی ناحق آنکھیں کھولیں، جب قدموں پر ٹوپی رکھتے تب آنکھیں کھولتیں۔

دولہا نے اکیس پان کی بیڑا کھایا، پائجامے میں ایک ہاتھ سے اِزار بند ڈالا اور تب ساس کو سلام کیا۔ ساس نے دعا دی اور گلے میں موتیوں کا ہار ڈال دیا۔ اب مصری چنوانے کی رسم ادا ہوئی۔ دلہن کے کندھے ، گھٹنے، ہاتھ وغیرہ پر مصری سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھے گئے اور دولہا نے جھک جھک کر کھائے۔ ثریا بیگم کو گدگدی معلوم ہو رہی تھی۔ سالیاں دولہا کو چھیڑ رہی تھیں۔ کسی نے چٹکی لی، کسی نے گدی پر ہاتھ پھیرا، یہ بے چارے اِدھر اُدھر دیکھ کر رہ جاتے تھے۔

جانی : فیروزہ بیگم جیسی چربانک سالی بھی نہ دیکھی ہوگی۔

نواب : ایک چربانک ہو تو کہوں یہاں تو جو ہے آفت کا پرکالا ہے اور فیروزہ بیگم کا تو کہنا ہی کیا، سوار کو گھوڑے پر سے اتار لیں۔

فیروزہ : کیا تعریف کی ہے، واہ۔ واہ!

جانی : کیا کچھ جھوٹ ہے؟ تمھاری زبان کیا کترنی ہے۔

فیروزہ : اور تم اپنی کہو، دولہا کو تو اسی وقت سے گھور رہی ہو۔ ان کی نظر بھی پڑتی ہے تمھیں پر۔

جانی : پھر پڑا ہی چاہے، پہلے اپنی صورت تو دیکھو۔

فیروزہ : ثریا بیگم گاتی خوب ہیں اور بتانے میں تو استاد ہیں، کوئی کتھک ان کے سامنے کیا ناچے گا۔ کہو ایک گھنگھرو بولے، کہو دونوں بولیں اور تلوار پر تو ایسا ناچتی ہیں کہ بس کچھ نہ پوچھو۔

جانی : سنا، کسی کتھک نے دل لگا کے ناچنا سکھا ہے۔ نواب صاحب کی چاندی ہے، روز مفت کا ناچ دیکھیں گے۔

حشمت : بھئی، اتنی بے حیائی اچھی نہیں، ہنسی دل لگی کا بھی ایک موقع ہوتا ہے۔

فیروزہ : ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ وہ کون سا موقع ہوتا ہے، بارات کے دن نہ ہنسے بولیں تو پھر کس دن ہنسے بولیں؟

اس طرح ہنسی دل لگی میں رات کٹ گئی۔ سویرے چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دلہن کی ماں بہنیں سب کی سب رونے لگیں۔ ماں نے سمدھن سے کہا۔ بہن لونڈی دیتی ہوں، اس پر مہربانی کی نگاہ رہے۔ وہ بولیں، کیا کہتی ہو؟ اولاد سے زیادہ ہے۔ جس طرح اپنے لڑکوں کو سمجھتی ہوں اسی طرح اس کو بھی سمجھوں گی اس کے بعد دولہا نے دلہن کو گود میں اٹھا کر سکھپال پر سوار کیا۔ سمدھن گلے مل کر رخصت ہوئی۔

جب بارات دولہا کے گھر پر آئی، تو ایک بکرا چڑھایا گیا، اس کے بعد کہاریاں پالکی کو اٹھا کر زنانی ڈیوڑھی پر لے گئیں۔ تب دولہا کی بہن نے آکر دلہن کے پاؤں دودھ سے دھوئے اور تلوے میں چاندی کے ورق لگائے۔ اس کے بعد دولہا نے دلہن کے دامن پر نماز پڑھی پھر کھیر آئی۔ پہلے دلہن کے ہاتھ پر رکھ کر دولہا کو کھلائی گئی، پھر دولہا کے ہاتھ پر کھیر رکھی گئی اور دلہن سے کہا گیا کہ کھاؤ، تو وہ شرمانے لگی۔ آخر دولہا کی بہنوں نے دولہا کا ہاتھ دلہن کے منھ کی طرف بڑھا دیا۔ اس طرح یہ رسم ادا ہوئی، پھر منھ دکھاوے کی رسم پوری ہوئی اور دولہا باہر آیا۔

(98)

شہزادہ ہمایوں فر کی موت جس نے سنی، کلیجہ ہاتھوں سے تھام لیا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ سپہر آرا یہ صدمہ برداشت نہ کر سکے گی اور سسک سسک کر شہزادے کی یاد میں جان دے دیں گی۔ گھر میں کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ سپہر آرا کو سمجھائے یا تسکین دے۔ اگر کسی نے ڈرتے ڈرتے سمجھایا بھی تو وہ اور رونے لگتیں اور کہتیں۔ کیا اب تمھاری یہ مرضی ہے کہ میں روؤں بھی نہ، دل ہی میں گھٹ گھٹ مروں۔ دو تین دن تک وہ قبر پر جا کر پھول چنتی رہی۔ کبھی قبر کو چومتی، کبھی خدا سے دعا مانگتی کہ اے خدا، شہزادے بہادر کی صورت دکھا دے، کبھی آپ ہی آپ مسکراتی، کبھی قبر کی چٹ چٹ بلائیں لیتی۔ ایک آنکھ سے ہنستی، ایک آنکھ سے روتی۔ چوتھے دن وہ اپنی بہنوں کے ساتھ وہاں گئیں۔ چمن میں ٹہلتے ٹہلتے اسے آزاد کی یاد آ گئی۔ حسن آرا سے بولی۔ بہن، اگر دولہا بھائی آ جائیں تو ہمارے دل کو تسکین ہو۔ خدا نے چاہا تو وہ دو چار دن میں آنا ہی چاہتے ہیں۔

حسن آرا: اخباروں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ لڑائی ختم ہو گئی۔

سپہر آرا: کل میں اماں جان کو بھی لاؤں گی۔

ایک استانی جی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ استانی جی سے کسی فقیر نے کہا تھا کہ جمعرات کے دن شہزادہ جی اٹھے گا اور کسی کو تو اس بات کا یقین نہ آیا تھا مگر استانی جی کو اس کا پورا یقین تھا بولیں۔ کل نہیں پرسوں بیگم صاحب کو لانا۔

سپہر آرا: استانی جی اگر میں یہیں دس پانچ دن رہوں تو کیسا ہو؟

استانی: بیٹا، تم ہو کس فکر میں؟ جمعرات کے دن دیکھو تو، اللہ کیا کرتا ہے، پرسوں ہی تو جمعرات ہے، دو دن تو بات کرتے کٹتے ہیں۔

سپہر آرا: خوشی کا تو ایک مہینہ بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا، مگر رنج کی ایک رات پہاڑ ہو جاتی ہے۔ خیر دو دن اور سہی، شاید آپ ہی کا کہنا سچ نکلے۔

حسن آرا: استانی جی جو کہیں گی۔ سمجھ بوجھ کر کہیں گی۔ شاید اللہ کو اس غم کے بعد خوشی دکھانی منظور ہو۔

سپہر آرا نے قبر پر چڑھانے کے لیے پھول توڑتے ہوئے کہا۔ پھول تو دو ایک دن ہنس

بھی لیتے ہیں، مگر کلیاں بن کھلے مرجھا جاتی ہیں، ان پر ہمیں ترس آتا ہے۔

استانی : جو کھلے وے بھی مرجھا گئے، جو نہیں کھلے وہ بھی مرجھا گئے۔ انسان کا بھی یہی خال ہے، آدمی سمجھتا ہے کہ موت کبھی آئے گی ہی نہیں۔ مکان بنواوے گا تو سوچے گا کہ ہزار برس تک اس کی بنیاد ایسی ہی رہے لیکن یہ خبر ہی نہیں کہ 'سب ٹھاٹ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بجارا' سب سے اچھے وہ لوگ ہے جن کو نہ خوشی سے خوشی ہوتی ہے نہ غم سے غم۔

حسن آرا : کیوں استانی جی، آپ کو اس فقیر کی بات کا یقین ہے؟

استانی : اب صاف صاف کہہ دوں، آج کے دوسرے دن ہمایوں فر یہاں نہ بیٹھے ہوں تو سہی۔

حسن آرا : تمھارے منہ میں گھی شکر، کل بھی کچھ دور نہیں ہیں، کل کے بعد ہی تو پرسوں آئے گا۔

سپہرآرا : باجی جان، مجھے تو ذرا بھی یقین نہیں آتا۔ بھلا آج تک کسی نے یہ بھی سنا ہے کہ مردہ قبر سے نکل آیا؟

یہ بات ہوتی ہی تھی کہ قبر کے پاس ہنسی کی آواز آئی، سب کو حیرت تھی کہ یہ قہقہہ کس نے لگایا۔ کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔

دس بجتے بجتے سب کی سب گھر لوٹ آئیں۔ یہاں پہلے ہی سے ایک شاہ صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں بہنوں کو دیکھتے ہی مہری نے آکر کہا۔ حضور، یہ بڑے پہنچے ہوئے فقیر ہیں، یہ ایسی باتیں کہتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ صاحب کے بارے میں لوگوں کو دھوکا ہوا تھا۔ وہ مرے نہیں ہے بلکہ زندہ ہیں۔ استانی جی نے شاہ صاحب کو اندر بلایا اور بولی۔ آپ کو اس وقت بڑی تکلف ہوئی، مگر ہم ایسی مصیبت میں گرفتار ہیں کہ خدا ساتویں دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

شاہ صاحب : خدا کی کارسازی میں دخل دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ مگر میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شہزادہ ہمایوں فر زندہ ہیں۔ یوں تو یہ بات محال معلوم ہوتی ہے، لیکن انسان کیا، اور اس کو سمجھ کیا۔ اتنا تو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ ہم کون ہیں، پھر کوئی خدا کی باتوں کو کیا سمجھے گا؟

استانی : آپ ابھی تو نہیں رہیں گے؟

شاہ صاحب : میں اس وقت یہاں سے جاؤں گا، جب دولہا کے ہاتھ میں دلہن کا ہاتھ ہوگا۔

استانی : مگر دلہن کو تو اس بات کا یقین ہی نہیں آتا۔ آپ کچھ کمال دکھائیں تو یقین آئے۔

شاہ صاحب : اچھا تو دیکھیے۔

شاہ صاحب نے تھوڑی سی ارد منگوائی اور اس پر کچھ پڑھ کر زمین پر پھینک دی۔ آدھ گھنٹے بھی نہ گزرا تھا کہ وہاں کی زمین پھٹ گئی۔

بڑی بیگم : اب اس سے بڑھ کر کیا کمال ہو سکتا ہے۔

سپہر آرا : اماں جان، اب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ شاید شاہ صاحب ٹھیک کہتے ہوں۔ (حسن آرا سے) باجی، اب تو آپ فقیروں کے کمال کی قائل ہوئی۔

استانی : ہاں بیٹا اس میں شک کیا ہے۔ فقیروں کا کوئی آج تک مقابلہ کر سکا ہے؟ وہ لوگ بادشاہی کی کیا حقیقت سمجھتے ہیں۔

شاہ صاحب : فقیروں پر شک انھیں لوگوں کو ہوتا ہے جو کامل فقیروں کی حالت سے واقف نہیں۔ ورنہ فقیروں نے مردوں کو زندہ کر دیا ہے۔ منزلوں سے آپس میں باتیں کی ہیں اور آگے کا حال بتا دیا ہے۔

بیگم صاحب نے اپنے رشتہ داروں کو بلایا اور یہ خبر سنائی۔ اس پر لوگ طرح طرح کے شبہے کرنے لگے۔ انھیں یقین ہی نہ تھا کہ مردہ کبھی زندہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے دن بیگم صاحب نے خوب تیاریاں کیں۔ گھر بھر میں صرف حسن آرا کے چہرے سے رنج ظاہر ہوتا تھا باقی سب خوش تھے کہ منہ مانگی مراد پائی۔ حسن آرا کو خوف تھا کہیں سپہر آرا کی جان کے لالے نہ پڑ جائیں۔

تمام شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی اور جمعرات کو چار گھڑی دن رہے سے میلا جمع ہونے لگا۔ وہ بھیڑ ہو گئی کہ کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ لوگوں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔

ایک : مجھے تو یقین ہے کہ شہزادے آج زندہ ہو جائیں گے۔

دوسرا : بھلا فقیروں کی بات کہیں غلط ہوتی ہے؟

تیسرا : اور ایسے کامل فقیر کی۔

چوتھا : وِندھیاچل پہار کی چوٹی پر برسوں نیم کی پتیاں ابال کر نمک کے ساتھ کھائی ہیں۔ قسم خدا کی، اس میں ذرا جھوٹ نہیں۔

پانچواں : سلطان علی کی بہو تین ن تک خون تھوکا کیں، ویدھ بھی آئے، حکم بھی آئے، پر کسی سے کچھ نہ ہوا۔ تب میں جا کے اُنھیں شاہ صاحب کو بلا لایا۔ جا کر ایک نظر اس کو دیکھا اور بولے، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سب لوگ یہاں سے ہٹ جائیں، صرف میں اور یہ لڑکی رہے۔ لڑکی کے باپ کو شاہ صاحب پر پورا بھروسہ تھا۔ سب آدمیوں کو ہٹانے لگا۔ یہ دیکھ کر شاہ صاحب ہنسے اور کہا، اس لڑکی کو خون نہیں آتا۔ یہ تو بالکل اچھی ہے۔ یہ کہہ کر شاہ صاحب نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھا، تب سے آج تک اسے خون نہیں آیا۔ فقیروں ہی سے دنیا قائم ہے۔

اتنے میں خبر ہوئی کہ دلہن گھر سے روانہ ہو گئی ہیں۔ تماشہ دیکھنے والوں کی بھیڑ اور بھی زیادہ ہو گئی۔ ادھر سپہر آرا نے گھر سے باہر پاؤں نکالا تو بڑی بیگم نے کہا۔ خدا نے چاہا تو آج فتح ہے، اب ہمیں ذرا بھی شک نہیں رہا۔

سپہر آرا : اماں جان بس اب ادھر یا ادھر یا تو شہزادہ کو لے کے آؤں گی، یا وہیں میری بھی قبر بنے گی۔

بیگم : بٹی، اس وقت بدشگونی کی باتیں نہ کرو۔

سپہر آرا : اماں جان، دودھ تو بخش دو، یہ آخری دیدار ہے۔ بہن کہا سنا معاف کرنا، خدا کے لیے میرا ماتم نہ کرنا۔ میری تصویر آبنوس کے صندوق میں ہے، جب تم سب ہنسو بولو تو میری تصویر بھی سامنے رکھ لیا کرنا۔ اے اماں جان، تم روتی کیوں ہو؟

بہار بیگم : کیسی باتیں کرتی ہو سپہر آرا واہ!

روح افزا : بہن، جو ایسا ہی ہے تو نہ جاؤ۔

بڑی بیگم : حسن آرا، بہن کو سمجھاؤ۔

حسن آرا کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔ مشکل سے بولی۔ کیا سمجھاؤں۔

سپہر آرا : اماں جان آپ سے ایک عرض ہے، میری قبر بھی شہزادے کی قبر کے پاس ہی بنوانا۔ جب تک تم اپنے منھ سے نہ کہو گی، میں قدم باہر نہ رکھوں گی۔

بڑی بیگم : بھلا بٹی، میرے منھ سے یہ بات نکلے گی! لوگوں، اس کو سمجھاؤ، اسے کیا ہو

گیا ہے۔

استانی : آپ اچھا کہہ دیں، بس۔

سپہرآرا : میں اچھا اچھا نہیں جانتی، جو میں کہوں وہ کہیے۔

استانی : پھر دل کو مضبوط کر کے کہہ دو صاحب۔

بڑی بیگم : نا، ہم سے نہ کہا جائے گا۔

حسن آرا : بہن، جو تم کہتی ہو وہی ہوگا۔ اللہ وہ گھڑی نہ دیکھائے، اب ہٹھ نہ کرو۔

سپہرآرا : میری قبر پر کبھی کبھی آنسو بہا لیا کرنا باجی جان۔ میں سوچتی ہوں کہ تمھارا دل کیسے بہلے گا۔

یہ کہہ کر سپہرآرا بہنوں سے گلے ملی اور سب کی سب روانہ ہوئیں۔ اب سواریاں قلعے کے پھاٹک پر پہنچی تو شاہ صاحب نے حکم دیا کہ دلہن گھوڑے پر سوار ہو کر اندر داخل ہو۔ بیگم صاحب نے حکم دیا، گھوڑا لایا جائے۔ سپہرآرا گھوڑے پر سوار ہوئی اور گھوڑے کو اڑاتی ہوئی قبر کے پاس پہنچ کر بولی۔ اب کیا حکم ہوتا ہے؟ خود آؤگے یا ہم کو بھی یہیں سلاؤگے۔ ہم ہر طرح راضی ہیں۔

سپہرآرا کا اتنا کہنا تھا کہ سامنے روشنی نظر آئی۔ ایسی تیز روشنی تھی کہ سب کی نظر جھپک گئی اور ایک لمحے میں شہزادہ ہمایوں فر گھوڑے پر سوار آتے ہوئے دکھائی دیے۔ انھیں دیکھتے ہی لوگوں نے اتنا غل مچایا کہ سارا قلعہ گونج اٹھا۔ سب کو حیرت تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ وہ مردہ جس کی قبر بن گئی ہو اور جس کو مرے ہوئے ہفتوں گزر گئے ہوں۔ وہ کیوں کر جی اٹھا۔

حسن آرا اور شہزادہ کی بہن خورشید میں باتیں ہونے لگیں۔

حسن آرا : کیا کہوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا!

خورشید : ہماری عقل بھی کچھ کام نہیں کرتی۔

حسن آرا : تم اچھی طرح کہہ سکتی ہو کہ ہمایوں فر یہی ہیں؟

خورشید : ہاں صاحب، یہی ہیں۔ یہی میرا بھائی ہے۔

اور لوگوں کو بھی یہی حیرت ہو رہی تھی۔ اکثر آدمیوں کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ شہزادہ ہیں۔

ایک آدمی : بھائی، خدا کی ذات سے کوئی بات بعید نہیں۔ مگر یہ ساری کرامات شاہ

صاحب کی ہے۔
تیسرا : جبھی تو دعا میں اتنی طاقت ہے۔

(99)

نواب وجاحت حسین صبح کو جب دربار میں آئے تو نیند سے آنکھیں جھکی پڑتی تھیں۔ دوستوں میں جو آتا تھا، نواب صاحب کو دیکھ کر پہلے مسکراتا تھا۔ نواب صاحب بھی مسکرا دیتے تھے۔ ان دوستوں میں رونق الدولہ اور مبارک حسین بہت بے تکلف تھے۔ انھوں نے نواب صاحب سے کہا۔ بھائی، آج چوتھی کے دن ناچ نہ دکھاؤ گے؟ کچھ ضروری ہے کہ جب کوئی طائفہ بلوایا جائے تو بدی ہی دل میں ہو؟ ارے صاحب، گانا سنیے، ناچ دیکھیے، ہنسیے، بولیے، شادی کو دو دن بھی نہیں ہوئے اور حضور ملاّ بن بیٹھے۔ مگر یہ مولوی پن ہمارے سامنے نہ چلنے پائے گا۔ اور دوستوں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ یہاں تک کہ مبارک حسین جا کر کئی طائفے بلا لائے، گانا ہونے لگا۔ رونق الدولہ نے کہا۔ کوئی فارسی غزل کہیے تو خوب رنگ جمے۔

حسینہ : رنگ جمانے کی جس کو ضرورت ہو وہ یہ فکر کرے، یہاں تو آ کے محفل میں بیٹھنے بھر کی دیر ہے۔ رنگ آپ ہی آپ جم جائے گا۔ گا کر رنگ جمایا تو کیا جمایا؟

رونق : حسن کا بھی بڑا غرور ہوتا ہے، کیا کہنا۔

حسینہ : ہوتا ہی ہے۔ اور کیوں نہ ہو، حسن سے بڑھ کر کون دولت ہے۔

بگڑے دل : اب آپس ہی میں دانہ بدلوّل ہوگا یا کسی کی سنو گی بھی، اب کچھ گاؤ۔

رونق : یہ غزل شروع کرو۔

بہار آئی ہے بھر دے بادۂ گلگوں سے پیمانہ
رہے ساقی تیرا لاکھوں برس آباد مے خانہ

اتنے میں محل سرا سے دولہا کی طلبی ہوئی۔ نواب صاحب محل میں گئے تو دلہن اور دولہا کو آمنے سامنے بیٹھایا گیا۔ دسترخوان بچھا، چاندی کی لگن رکھی گئی۔ ڈومنیاں آئیں اور انھوں نے دلہن کو دونوں ہاتھوں میں دولہا کے ہاتھ سے ترکاری دی، پھر دلہن کے ہاتھوں سے دولہا کو ترکاری دی، تب گانا شروع کیا۔

اب ترکاریاں اچھلنے لگیں۔ دولہا کی سالی نے نارنگی کھینچ ماری، حشمت بہو اور جانی بیگم

حےنے دولہا کو بہت دق کیا۔ آخر دولہا نے بھی جھلا کر ایک چھوٹی سی نارنگی بیگم کو تاک کر لگائی۔

جانی بیگم : تو جھیپ کاہے کی ہے۔ شرماتی کیا ہو؟

مبارک محل : ہاں، شرمانے کی کیا بات ہے، اور ہے بھی تو تم کو شرم کاہے کی۔ شرمائے تو وہ جس کو کچھ حیا ہو۔

حشمت بہو : تم بھی پھینکو فیروزہ بہن! تم تو ایسی شرمائی کہ اب ہاتھ ہی نہیں اٹھتا۔

فیروزہ : شرماتا کون ہے، کیوں جی پھر میں بھی ہاتھ چلاؤں؟

دولہا : شوق سے حضور ہاتھ چلایئے، ابھی تک تو زبان ہی چلتی تھی۔

فیروزہ : اب کیا جواب دوں، جاؤ چھوڑ دیا تم کو۔

اب چاروں طرف سے میوے اچھلنے لگے۔ سب دولہے پر تاک تاک کر نشانہ مارتی تھیں۔ مگر دولہا نے بس ایک فیروزہ کو تاک لیا تھا۔ جو میوہ اٹھایا انھیں پر پھینکا۔ نارنگی پر نارنگی پڑنے لگی۔

تھوڑی دیر تک چہل پہل رہی۔

فیروزہ : ایسے ڈھیٹ دولہا بھی نہیں دیکھے۔

دولہا : اور ایسی چنچل بیگم بھی نہیں دیکھی۔ اچھا یہاں اتنی ہیں کوئی کہہ دے کہ تم جیسی شوخ اور چنچل عورت کسی نے آج تک دیکھی ہے؟

فیروزہ : ارے، یہ تم ہمارا نام کہاں سے جان گئے صاحب؟

دولہا : آپ مشہور عورت ہیں یا ایسی ویسی۔ کوئی ایسا بھی ہے جو آپ کو نہ جانتا ہو؟

فیروزہ : تمھیں قسم ہے، بتاؤ ہمارا نام کہاں سے جان گئے؟

مبارک محل : بڑی ڈھیٹ ہیں۔ اس طرح باتیں کرتی ہیں، جیسے برسوں کی بے تکلفی ہو۔

فیروزہ : اے تو تم کو اس سے کیا اس کی فکر ہوگی تو ہمارے میاں کو ہوگی تم کاہے تو کانپتی جاتی ہو۔

دولہا : آپ کے میاں سے اور ہم سے بڑا یارانہ ہے۔

فیروزہ : یارانہ نہیں وہ ہے۔ وہ بے چارے کسی سے یارانہ نہیں رکھتے، اپنے کام سے کام ہے۔

دولہا : بھلا بتاؤ تو ان کا نام کیا ہے۔ نام لو تو جانیں کہ بڑی بے تکلف ہو۔

فیروزہ : ان کا نام، ان کا نام ہے نواب وجاحت حسین۔

دولہا : بس، اب ہم ہار گئے، خدا کی قسم ہار گیا۔

مبارک محل : ان سے کوئی جیت ہی نہیں سکتا۔ جب مردوں سے ایسی بے تکلفی ہیں تو ہم لوگوں کی بات ہی کیا، مگر اتنی شوخی نہیں چاہیے۔

فیروزہ : اپنی اپنی طبیعت، اس میں بھی کسی کا اجارہ ہے۔

دولہا : ہم تو آپ سے بہت خوش ہوئے، بڑی ہنس مکھ ہو۔ خدا کرے، روز دو دو باتیں ہو جایا کریں۔

جب سب رسمیں ہو چکیں تو اور عورتیں رخصت ہوئیں۔ صرف دولہا اور دلہن رہ گئے۔

نواب : فیروزہ بیگم تو بڑی شوخ معلوم ہوتی ہیں۔ بعض بعض موقعے پر میں شرما جاتا تھا، پر وہ نہ شرماتی تھیں۔ جو میری بی بی ایسی ہوتی تو مجھ سے دم بھر نہ بنتی۔ غضب خدا کا۔ غیر مرد سے اس بے تکلفی سے باتیں کرنا برا ہے۔ تم نے تو پہلے انھیں کاہے کو دیکھا ہوگا۔

ثریا : جیسے مفت کی ماں مل گئی اور مفت کی بہنیں بن بیٹھیں، ویسے ہی یہ بھی مفت مل گئیں۔

نواب : مجھے تو تمھاری ماں پر ہنسی آتی تھی کہ بالکل اس طرح پیش آتی تھیں جیسے کوئی خاص اپنے داماد کے ساتھ پیش آتا ہے۔

ثریا : آپ بھی تو فیروزہ بیگم کو خوب گھور رہے تھے۔

نواب : کیوں مفت میں الزام لگاتی ہو، بھلا تم نے کیسے دیکھ لیا؟

ثریا : کیوں؟ کیا مجھے کم سوجھتا ہے؟

نواب : گردن جھکائے دلہن بنی تو بیٹھی تھیں، کیسے دیکھ لیا کہ میں گھور رہا تھا، اور ایسی خوبصورت بھی تو نہیں ہیں۔

ثریا : مجھ سے خود اس نے قسمیں کھا کر یہ بات کہی۔ اب سنیے، اگر میں نے سن پایا کہ آپ نے کسی سے دل ملایا، یا ادھر ادھر سیر سپاٹے کرنے لگے تو مجھ سے دم بھر بھی نہ بنے گی۔

نواب : کیا مجال، ایسی بات ہے بھلا!

ثریا : ہاں خوب یاد آیا، بھول ہی گئی تھی۔ کیوں صاحب، یہ نارنگیاں کھینچ مارنا کیا حرکت

تھی؟ ان کی شوخی کا ذکر کرتے ہو اور اپنی شرارت کا حال نہیں کہتے۔

نواب : جب اس نے دق کیا تو میں بھی مجبور ہو گیا۔

ثریا : کس نے دق کیا؟ وہ بھلا بے چاری کیا دق کرتی تم کو! تم مرد اور وہ عورت ذات۔

نواب : اجی، وہ سوا مرد ہے۔ مرد اس کے سامنے پانی بھرے۔

ثریا : تم بھی چھٹے ہوئے ہو۔

اسی کمرے میں کچھ اخبار پڑے تھے، ثریا بیگم کی نگاہ ان پر پڑی تو بولی۔ ان اخباروں کو پڑھتے پڑھاتے بھی ہو یا یوں ہی رکھ چھوڑے ہیں؟

نواب : کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں۔ یہ دیکھو، تازہ اخبار ہے۔ اس میں آزاد نام کے ایک آدمی کی خوب تعریف چھپی ہے۔

ثریا : ذرا مجھے تو دینا، ابھی دے دوں گی۔

نواب : پڑھ رہا ہوں ذرا ٹھہر جاؤ۔

ثریا : اور ہم چھین لیں تو۔ اچھا زور زور سے پڑھو، ہم بھی سنیں۔

نواب : انھوں نے لڑائی میں ایک بڑی فتح پائی ہے۔

ثریا : سناؤ، سناؤ۔ خدا کریں، وہ سرخرو ہو کر آئیں۔

نواب : تم ان کو کہاں سے جانتی ہو۔ کیا کبھی دیکھا ہے؟

ثریا : واہ، دیکھنے کی اچھی کہی۔ ہاں، اتنا سنا ہے کہ ترکوں کی مدد کرنے کے لیے روم گئے تھے۔

(100)

شہزادہ ہمایوں فر کے جی اٹھنے کی خبر گھر گھر مشہور ہو گئی۔ اخباروں میں اس کا ذکر ہونے لگا۔ ایک اخبار نے لکھا، جو لوگ اس معاملے میں کچھ شک کرتے ہیں انھیں سوچنا چاہیے کہ خدا کے لیے کسی مردے کو جلا دینا کوئی مشکل بات نہیں۔ جب ان کی ماں اور بہنوں کو پورا یقین ہے تو پھر شک کی گنجائش نہیں رہتی۔

دوسرے اخبار نے لکھا ...... ہم دیکھتے ہیں کہ سارا زمانہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ اگر سرکار ہمارا

کہنا مانے تو ہم اس کو صلاح دیں گے کہ ایک سرے سے پاگل خانے بھیج دے۔ غضب خدا کا، اچھے اچھے پڑھے آدمیوں کو پورا یقین ہے کہ ہمایوں فر زندہ ہو گئے۔ ہم ان سے پوچھتے ہیں، یارو، کچھ عقل بھی رکھتے ہو۔ کہیں مردے بھی زندہ ہوتے ہیں؟ بھلا کوئی عقل رکھنے والا آدمی یہ بات مانے گا کہ ایک فقیر کی دعا سے مردہ جی اٹھا۔ قبر بنی کی بنی ہی رہی اور ہمایوں فر باہر موجود ہو گئے۔ جو لوگ اس پر یقین کرتے ہیں ان سے زیادہ احمق کوئی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ سرکار اس معاملے میں پوری تحقیقات کریں۔ بہت ممکن ہے کہ کوئی آدمی شہزادی بیگم کو بہکا کر ہمایوں فر بن بیٹھا ہو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شہزادی بیگم کی جائداد کا مالک ہو گیا۔

ضلع کے حکام کو بھی اس معاملے میں شک پید ہوا۔ کلکٹر نے پولس کے کپتان کو بلا کر صلاح کی کہ ہمایوں فر سے ملاقات کی جائے۔ یہ فیصلہ کر کے دونوں گھوڑے پر سوار ہوئے اور دن سے شہزادی بیگم کے مکان پر جا پہنچے۔ ہمایوں فر کے بھائی نے سب سے ہاتھ ملایا اور عزت کے ساتھ بیٹھایا۔ زنانے میں خبر ہوئی تو شہزادی بیگم نے کہا۔ ہم شاہ صاحب کے حکم کے بغیر ہمایوں فر کو باہر نہ جانے دیں گے۔

لیکن جب شاہ صاحب سے پوچھا گیا تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہمایوں فر محل سرا سے باہر نہیں نکل سکتے۔ وہ باہر آئے اور میں نے اپنا راستہ لیا۔ ہاں، صاحب کو جو کچھ پوچھنا ہو، لکھ کر پوچھ سکتے ہیں۔ آخر ہمایوں فر نے صاحب کے نام ایک رقعہ لکھ کر بھیجا۔ صاحب نے اپنی جیب سے ہمایوں فر کا ایک پرانا خط نکالا اور دونوں خطوں کو ایک سا پا کر بولے۔ اب تو مجھے بھی یقین آ گیا کہ یہ شہزادہ ہمایوں فر ہی ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا، وہ فقیر کیوں انھیں ہم سے ملنے نہیں دیتا۔ آخر انھوں نے ہمایوں فر کے بھائی سے پوچھا، آپ کو خوب معلوم ہے کہ ہمایوں فر ہیں یہیں؟ لڑکا ہنس کر بولا۔ آپ کو یقین ہی نہیں آتا تو کیا کیا جائے۔ آپ خود چل کر دیکھ لیجیے۔

شہزادی بیگم نے جب دیکھا کہ حکام ٹالے نہ ٹالیں گے تو انھوں نے شہزادہ کو ایک کمرے میں بیٹھا دیا۔ حکام برامدے میں بیٹھائے گئے۔ صاحب نے پوچھا۔ ویل شہزادہ ہمایوں فر، یہ سب کیا بات ہے؟

شہزادہ : خدا کے کارخانے میں کسی کو دخل نہیں۔

صاحب : آپ شہزادہ ہمایوں فر ہی ہیں یا کوئی اور ؟

شہزادہ : کیا خوب، اب تک شک ہے؟

صاحب : ہم نے آپ کو کچھ دیا تھا، آپ نے پایا یا نہیں؟

شہزادہ : مجھے یاد نہیں۔ آخر وہ کون چیز تھی؟

صاحب : یاد کیجیے۔

صاحب نے ہمایوں فر سے اور کئی باتیں پوچھیں، مگر وہ ایک کا بھی جواب نہ دے سکے۔ تب تو صاحب کو یقین ہو گیا کہ یہ ہمایوں فر نہیں ہے۔

(101)

آزاد پاشا کو اسکندریہ میں کئی دن رہنا پڑا۔ ہیضے کی وجہ سے جہازوں کا آنا جانا بند تھا۔ ایک دن انھوں نے خوجی سے کہا۔ بھائی، اب تو یہاں سے رہائی پانی مشکل ہے۔

خوجی : خدا کا شکر کرو کہ بچ کے چلے آئے، اتنی جلدی کیا ہے؟

آزاد : مگر یار، تم نے وہاں نام نہ کیا، افسوس کی بات ہے۔

خوجی : کیا خوب، ہم نے نام نہیں کیا تو کیا تم نے نام کیا؟ آخر آپ نے کیا کیا، کچھ معلوم تو ہو، کون گڑھ فتح کیا، کون لڑائی لڑے، یہاں تو دشمن کو کھدیڑ کھدیڑ کے مارا۔ آپ بس مسوں پر عاشق ہوئے، اور تو کچھ نہیں کیا۔

آزاد : آپ بھی تو بوا زعفران پر عاشق ہوئے تھے؟

میڈا : اجی، اب باتوں کو جانے دو، کچھ اپنے ملک کے رئیسوں کا حال بیان کرو، وہاں کیسے رئیس ہیں؟

خوجی : بالکل تباہ، پھٹے حال، ان پڑھ، ان کے شوق دنیا سے نرالے ہیں۔ پتنگ بازی پر مٹے ہوئے، طرح طرح کے پتنگ بنتے ہیں، گوٹ، ماہی جال، مانگ دار، بھیڑیا، توکیہ، خربوزیا، لنگوٹیا، تکّل، لل پتّا، کل پتّا۔ دس دس اشرفیوں کے پیچ ہوتے ہیں۔ تماشائیوں کی وہ بھیڑ ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ! پتنگ باز اپنے فن کے استاد۔ کوئی ڈھیل لڑانے کا استاد ہے، کوئی گھسیٹ لڑانے کا ایکتا۔ ادھر پیچ پڑا، ادھر غوطہ دیتے ہی کہا، وہ کاٹا! لوٹنے والوں کی چاندی ہے۔ ایک ایک دن میں دس دس سیر ڈور لوٹتے ہیں۔

آزاد : کیوں صاحب، یہ کوئی اچھی عادت ہے؟

خوجی : تم کیا جانو، تم تو کتاب کے کیڑے ہو۔ سچ کہنا، پتنگ لڑایا ہے کبھی؟

آزاد : ہم نے پتنگ کی اتنی قسمیں بھی نہیں سنی تھیں۔

خوجی : اسی سے تو کہتا ہوں، جانگلو ہو۔ بھلا پیٹا جانتے ہو، کسے کہتے ہیں؟

آزاد : ہاں، ہاں، جانتا کیوں نہیں، پیٹا اسی کو کہتے ہیں نہ کہ کسی کی ڈور توڑ لی جائے۔

خوجی : بھئی، نرے گاؤدی ہو۔

میڈا : اچھا بولو، کرتے کیا ہیں، کیا سارا دن پتنگ ہی اڑایا کرتے ہیں؟

خوجی : نہیں صاحب، افیم اور چنڈو کثرت سے پیتے ہیں۔

آزاد : اور کبوتر بازی کا تو حال بیان کرو۔

کلاریسا : ہم نے سنا ہے کہ ہندستان کی عورتیں بالکل جاہل ہوتی ہیں۔

آزاد : مگر حسن آرا کو دیکھو تو خوش ہو جاؤ۔

کلاریسا : ہم تو بے شک خوش ہوں گے، مگر خدا جانے، وہ ہم کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں یا نہیں۔

میڈا : نہیں، امید نہیں کہ ہم دونوں کو دیکھ کر خوش ہوں۔ جب ہم کو اور تم کو دیکھیں گی تو ان کو بڑا رنج ہوگا۔

کلاریسا : مجھے کیوں ناحق بدنام کرتی ہو، مجھے آزاد سے مطلب؟ میں تمھاری طرح کسی پر پھسل پڑنے والی نہیں۔

میڈا : ذرا ہوش کی باتیں کرو۔ جب انھوں نے کروڑوں بار ناک رگڑی تب میں نے منظور کیا۔ رونہ ان میں ہے کیا؟ نہ حسین، نہ جوان، نہ رنگیلے۔

خوجی : اور ہم؟ ہم کو کیا سمجھتی ہو آخر؟

میڈا : تم بڑے طرح دار جوان ہو، اور تو اور، ڈیل ڈول میں تو کوئی تمھارا ثانی نہیں۔

آزاد : ہم بھی کسی زمانے میں خواجہ صاحب ہی کی طرح شہ زور تھے، مگر اب وہ بات کہاں، اب تو مرے بوڑھے آدمی ہیں۔

خوجی : اجی، ابھی کیا ہے، جوانی میں ہم کو دیکھیے گا۔

آزاد : آپ کی جوانی شاید قبر میں آئے گی۔

خوجی : اجی، کیا بکتے ہو، ابھی ہمیں شادی کرنی ہے بھائی!

میڈا : تم مس کلاریسا کے ساتھ شادی کرلو۔

کلاریسا : آپ ہی کو مبارک رہے۔

آزاد : بھئی، یہاں تمھاری شادی ہو جائے تو اچھی بات ہے، نہیں تو لوگوں کو شک ہوگا کہ انھیں کسی نے نہیں پوچھا۔

خوجی : واللہ، یہ تو تم نے ایک ہی سنائی۔ اب ہمیں شادی کی ضرورت آ پڑی۔

آزاد : مگر تمھارے لیے تو کوئی خوبصورت چاہیے جس پر سب کی نگاہ پڑے۔

خوجی : جی ہاں، جس میں آپ کو بھی گھورا گھاری کرنے کا موقع ملے۔ یہاں ایسے احمق نہیں ہیں۔ جورو کے معاملے میں بندہ کسی سے یارانا نہیں رکھتا۔

آزاد تو سیر کرنے چلے گئے۔ خوجی نے مس کلاریسا سے کہا۔ ہمارے لیے کوئی ایسی بی بی ڈھونڈو جس پر ساری دنیا کے شہزادے جان دیتے ہوں۔ آزاد کا کھٹکا ضرور ہے، یہ آدمی بھانجی مارنے سے باز نہ آئے گا۔ یہ تو اس کی عادت میں داخل ہے کہ جو عورت ہمارے اوپر ریجھے گی اس کو بہکائے گا! لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ جو عورت ایک بار ہمیں دیکھ لے گی، اسے آزاد کیا، آزاد کے باپ بھی نہ بہکا سکیں گے۔ مجھے دیکھ دیکھ کر یہ حضرت جلا کرتے ہیں۔

کلاریسا : تمھاری سی جوانی کہاں سے لائیں؟

خوجی : بس بس، خدا تم کو سلامت رکھے۔ خدا کرے، تم کو میرا سا شوہر ملے۔ اس سے زیادہ اور کیا دعا دوں۔

کلاریسا : کہیں تمھاری شامت تو نہیں آئی ہے؟

خوجی : کیوں، کیا ہوا؟ آخر ہم میں کون بات نہیں ہے، کچھ معلوم ہو، اندھا ہوں، کانا ہوں، لولہ ہوں، لنگڑا ہوں۔ آخر مجھ میں کون سی بات نہیں ہے؟

کلاریسا : پہلے جا کر منھ بنواؤ۔ چلے ہمارے ساتھ شادی کرنے، کچھ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟

خوجی : پاگل! ٹھیک، میرے پاگل پنے کا حال مصر، عدن، روس، ہندستان کی عورتوں سے جا کر پوچھ لو، آخر کچھ دیکھ کر ہی تو وہ سب مجھ پر عاشق ہوئی تھیں۔

اتنے میں میاں آزاد نے آ کر پوچھا۔ کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ کلاریسا، تم ان کے پھیر

میں نہ آنا۔ یہ بڑے چالاک آدمی ہیں۔ یہ باتوں ہی باتوں میں اپنا رنگ جما لیتے ہیں۔

خوجی : خیر، اب تو تم نے ان سے کہہ ہی دیا، ورنہ آج ہی شادی ہوتی۔ خیر، آج نہیں، کل سہی۔ بنا شادی کیے تو اب مانتا نہیں۔

کلاریسا : تو آپ اپنے کو اس قابل سمجھنے لگے؟

خوجی : قابل کے بھروسے نہ رہیے گا۔ میری زبان میں جادو ہے۔

آزاد : تمھارے لیے تو بوا زعفرن کی سی عورت چاہیے۔

خوجی : اگر مس کلاریسا نے منظور کیا تو اور کہیں ٹپّا لگائیں گے۔ مگر مجھے تو امید ہے کہ مس کلاریسا آج کل میں ضرور منظور کر لیں گی۔

آزاد : اجی، میں نے تمھارے لیے وہ عورت تلاش کر رکھی ہے کہ دیکھ کر پھڑک اٹھو، وہ تم پر جان دیتی ہے۔ بس، کل شادی ہو جائے گی۔

خوجی بہت خوش ہوئے۔ دوسرے دن آزاد نے ایک گاڑی منگوائی۔ آپ دونوں مسوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے، خوجی کو کوچ بکس پر بیٹھایا اور شادی کرنے چلے۔ خوجی اوپر سے ہٹو بچو کی ہانک لگاتے جاتے تھے۔ ایک جگہ ایک بہرا گاڑی کے سامنے آگیا۔ یہ غل مچاتے ہی رہے اور گاڑی اس کے کلّے پر پہنچ گئی۔ آپ بہت ہی بگڑے، بھلا بے گیدی، جب اور کچھ بس نہ چلا تو آج جان دینے آگیا۔

آزاد : کیا ہے بھائی، خیریت تو ہے؟

خوجی : اجی، آج وہ بہروپیا بھیش بدل کر آیا، ہم گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے ہیں اور وہ سنتا ہی نہیں۔ تب میں سمجھا کہ ہو نہ ہو بہروپیا ہے۔ گاڑی کے سامنے اڑ جانے سے اس کا مطلب تھا کہ ہمیں پکڑا دے۔ وہ تو دو چار دن میں لوٹ پوٹ کے چنگا ہو جاتا، مگر ہماری گاڑی پکڑ جاتی۔ اب پوچھو کہ تم کو کیا فکر ہے، ہم لوگ بھی تو سوار ہیں۔ اس کا جواب ہم سے سنیے۔ مسیں تو عورت بن کر چھوٹ جاتیں، رہے ہم اور تم۔ تو جس کی نظر پڑتی، ہمیں پر پڑتی۔ تم کو لوگ خدمت گار سمجھتے، ہم رئیس کے دھوکے میں دھر لیے جاتے ہیں۔ بس، ہمارے ماتھے جاتی۔

اتنے میں دس بارہ دمبے سامنے سے آئے۔ خوجی نے چرواہے کو اس تیکھی چتون سے دیکھا کہ کھا ہی جائیں گے۔ اسے ان کا کینڑا دیکھ کر ہنسی آگئی۔ بس آپ آگ ہی تو ہو گئے۔

کوچ مین کو ڈانٹ بتائی۔ روک لے، روک لے۔

آزاد : اب کیا مصیبت پڑی

خوجی : اس بدمعاش سے کہو، باگ روک لے، میں اس چرواہے کو سز دے آؤں تو بات کروں۔ بدمعاش مجھے دیکھ کر ہنس دیا، کوئی مسخرہ سمجھا ہے۔

آزاد : کون تھا کون، ذرا نام تو سنوں۔

خوجی : اب راہ چلتے کا نام میں کیا جانوں۔ کہیے، اٹکر لیس کوئی نام بتا دوں۔ مجھے دیکھا تو ہنسے آپ، میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

آزاد : ارے یار، تمھیں دیکھ کر مارے خوشی کے ہنس پڑا ہوگا۔

خوجی : بھئی، تم نے سچ کہا، یہی بات ہے۔

آزاد : اب بتاؤ، ہو گدھے کہ نہیں، جو میں نہ سمجھاتا تو پھر؟

خوجی : پھر کیا، ایک بے گناہ کا خون میری گردن پر ہوتا۔

ایکا ایک کوچوان نے گاڑی روک لی۔ خوجی گھبرا کر کوچ بکس سے اترے تو پائیدان سے دامن اٹکا اور منھ کے بل گرے، مگر جلدی سے جھاڑ پونچھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آزاد اور دونوں عورتیں ہنسنے لگیں۔

آزاد : اجی، گرد ورد پونچھو، ذرا آدمی بنو۔ جو دلہن والے دیکھ لیں تو کیسی ہو؟

خوجی : ارے یار، گرد ورد تو جھاڑ چکا، مگر یہ تو بتاؤ کہ یہ کس کی شرارت ہے، میں تو سمجھتا ہوں، وہی بہروپیا میری آنکھوں میں دوھول جھونک کر مجھے گھسیٹ لے گیا۔ خیر، شادی ہو لے۔ پھر بی بی کی صلاح سے بدمعاش کو نیچے دیکھاؤں گا۔

آزاد تو دونوں مسوں کے ساتھ گاڑی سے اترے اور خوجی کی سسرال کے دروازے پر آئے خوجی گاڑی کے اندر بیٹھے رہے۔ جب اندر سے آدمی انھیں بلانے آیا تو انھوں نے کہا۔ ان سے کہہ دو کہ میری اغوانی کرنے کے لیے کسی کو بھیج دیں۔

آزاد نے اندر جا کر ایک پنچ ہتھی موٹی تازی عورت بھیج دی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، خوجی کو گاڑی سے اتارا اور گود میں اٹھ کر اندر لے چلی۔ خوجی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے انھیں لے جا کر آنگن میں دے مارا اور اوپر سے دبانے لگی۔ خوجی چلا چلا کر کہنے لگے۔ اماں جان، معاف کرو، ایسی شادی پر خدا کی مار، میں کنوارا ہی رہوں گا۔

آزاد : کیا ہے بھئی، یہ رو کیوں رہے ہو؟

خوجی : کچھ نہیں بھائی جان، ذرا دل لگی ہو رہی تھی۔

آزاد : اماں جان کا لفظ کسی نے کہا تھا؟

خوجی : تو یہاں تمھارے سوا ہندوستانی اور کون ہے؟

آزاد : اور آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟

خوجی : میں ترک ہوں۔

آزاد : اچھا، جا کر دلہن کے پاس بیٹھو۔ وہ کب سے گردن جھکائے بیٹھی ہے بے چاری، اور آپ سنتے ہی نہیں۔

خوجی اوپر گئے تو دیکھا، ایک کونے میں دوشالا اوڑھے دلہن بیٹھی ہے۔ آپ اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ کلاریسا اور میڈا بھی ذرا فاصلے پر بیٹھی تھیں۔ خواجہ صاحب دون کی لینے لگے۔ ہمارے ابا جان سید تھے اور اماں جان کابل کے ایک امیر لڑکی تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں اگر آپ دیکھتیں تو ڈر جاتیں۔ اچھے اچھے پہلوان ان کا نام سن کر کان پکڑتے تھے۔ سینہ شیر کا سا تھا، کمر چیتے کی سی، رنگ بالکل جیسے شلجم، آنکھوں میں خون برستا تھا۔ ایک دفعہ رات کو گھر میں چور آیا، میں تو مارے ڈر کے سناٹا کھینچے پڑا رہا۔ مگر واہ ری اماں جان، چور کی آہٹ پاتے ہی اس بدمعاش کو جا پکڑا۔ مین نے پکار کر کہا، امّاں جان جانے نہ پائے، میں بھی آ پہنچا۔ اتنے میں ابا جان کی آنکھ کھل گئی۔ پوچھا۔ کیا ہے؟ میں نے کہا۔ اماں جان سے اور ایک چور سے پکڑ ہو رہی ہے۔ ابا جان بولے۔ تو پھر دبکے پڑے رہو، اس نے چور کو قتل کر ڈالا ہوگا۔ میں جو جا کے دیکھتا ہوں تو لاش پھڑک رہی ہے۔ جناب، ہم ایسوں کے لڑکے ہیں۔

آزاد : تبھی تو ایسے دلیر ہو، سوروں کے سور ہی ہوتے ہیں۔

خوجی : (ہنس کر) مس کلاریسا ہماری باتوں پر ہنس رہی ہیں۔ ابھی ہم ان کی نظروں میں نہیں جچتے۔

آزاد : دلہن آج بہت ہنستی ہے۔ بڑی ہنس مکھ بی بی پائی۔

خوجی: اردو تو یہ کیا سمجھتی ہوگی۔

آزاد : آپ بھی بس چونگا ہی رہے۔ ارے بے وقوف انھیں ہندی اردو سے کیا تعلق۔

خوجی : بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں جس گلی کوچے میں نکل جائیں، سب کی نظر پڑا چاہے اور لوگ مجھ سے جلا ہی چاہیں، اس کو میں کیا کروں۔ اگر ان کو سیر کرانے ساتھ نہ لے چلوں تو نہیں بنتی۔ کہیں مجھ پر کسی پرچھم کی نگاہ پڑے اور وہ گھور گھور کر دیکھے، تو یہ سمجھیں کہ کوئی خاص وجہ ہے۔ اب کہیے، کیا کیا جائے؟

آزاد : دلہن منہ بند کیے کیوں بیٹھی ہیں، ناک کو تو خیر ہے؟

خوجی : کیا بکتے ہو میاں، مگر اب مجھے بھی شک ہو گیا۔ تم لوگ ذرا سمجھا دو بھائی کہ ناک تو دیکھا دیں۔

مس کلاریسا نے دلہن کو سمجھایا، تو اس نے چہرے کو چھپا کر ذرا سی ناک دکھا دی۔ خوجی نے جا کر ناک کو چھونا چاہا تو اس نے اس زور سے چپت دی کہ خوجی بلبلا اٹھے۔

آزاد : خدا کی قسم، بڑے بے ادب ہو۔

خوجی : ارے میاں، جاؤ بھی۔ یہاں ہوش بگڑ گئے تم کو ادب کی پڑی ہے، مگر یار، یہ برا سگن ہوا۔

آزاد : ارے گاؤدی، یہ نخرے ہیں، سمجھا۔

خوجی : (ہنس کر) واہ رے نخرے!

آزاد : اچھا بھائی، تم کبھی لڑائی پر بھی گئے ہو؟

خوجی : اونہہ، کبھی کی ایک ہی کہی، کیا ننھے بنے جاتے ہیں؟ ارے میاں، شاہی میں گل چلے مشہور تھے، اب بھی جو چاند ماری ہوئی، اس میں ہمی بیس رہے۔

آزاد : مس میڈا ہنس رہی ہیں، گویا تم جھوٹے ہو۔

خوجی : یہ ابھی چھوکری ہیں، یہ باتیں کیا جانیں۔ ابا جان کو خدا بخشے۔ دو ایسے گر بتا گئے ہیں جو ہر جگہ کام آتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کسی سے لڑائی ہو تو پہلا وار خود کرنا، بات کرتے ہی چانٹا دینا۔

آزاد : آپ تو کئی جگہ اس نصیحت کو کام میں لا چکے ہیں۔ ایک تو بوا زعفران پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ دوسرے زبین کی ناک میں دم کر دیا تھا۔

خوجی : اب میں اپنا سر پیٹ لوں، کیا کروں! جس جس جگہ اپنی بھل منسی سے شرمندہ ہوا تھا، انھیں کا ذکر کرتے ہو۔ وہ تو کہیے، خیریت ہے کہ دلہن اردو نہیں سمجھتیں، ورنہ نظروں

سے گر جاتا۔

یہ فقرہ سن کر دلہن مسکرائی تو خواجہ صاحب اکڑ کر بولے۔ واللہ، وہ ہنس مکھ بی بی پائی ہے کہ جی خوش ہو گیا۔ بات نہیں سمجھتی، مگر ہنسنے لگت ہے۔ بھئی، ذرا آنکھیں دیکھ لینا۔

آزاد : جناب، دونوں آنکھیں ہیں اور بالکل ہاتھی کی سی!

خوجی : بس یہی میں بھی چاہتا ہوں، وہ کیا جس کی بڑی بڑی آنکھیں ہوں۔ تعریف یہ ہے کہ ذرا ذرا سی آنکھیں ہوں اور ہنسنے کے وقت بالکل بند ہو جائیں، مگر یار، گلا کیسا ہے؟

آزاد : ایں کیا ہندستان میں گانے کی تعلیم دو گے؟

خوجی : اے ہے، سمجھتے تو ہو ہی نہیں، مطلب یہ کہ گردن لمبی ہے یا چھوٹی، پہلے سمجھ لو پھر اعتراض جڑو۔

آزاد : گردن، سر اور دھڑ سب سپاٹ ہے۔

خوجی : یہ کیا، تو کیا چھوٹی گردن کی تعریف ہے؟

آزاد : اور کیا، سنا نہیں چھوٹی گردن، تنگ پیشانی، حسین عورت کی یہی نشانی۔ کیا محاورے بھی بھول گئے؟

خوجی : محاورے کوئی ہم سے سیکھے، آپ کیا جانیں، مگر خدا کے لیے ذرا مجھ سے ادب سے باتیں کیجیے، ورنہ یہاں میری کرکری ہوگی، اور یہ آپ اُن کے قریب کیوں بیٹھے ہیں، ہٹ کے بیٹھیے ذرا۔

آزاد : کیوں صاحب، آپ اپنی سسرال میں ہماری بے عزتی کرتے ہیں؟ اچھا! خیر، دیکھا جائے گا۔

خوجی : آپ تو دل لگی میں برا مان جاتے ہیں اور میری عادت کمبخت ایسی خراب ہے کہ بے چہل کیے رہا نہیں جاتا۔

آزاد : خیر چلو، ہوگا کچھ۔ مگر یار، یہاں ایک عجیب رسم ہے، دلہن اپنے دلہا کے دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے۔

خوجی : یہ تو بری بات ہے، قسم خدا کی، اگر تم نے ان سے ایک بات بھی کی ہوگی تو کرولی لے کر ابھی کام تمام کر دوں گا۔

آزاد : سن تو لو، ذرا سنو تو سہی۔

خوجی : اجی بس، سن چکے۔ اس وقت آنکھوں میں خون اتر آیا، ایسی دلہن کی ایسی تیسی، اور کیسی دبکی دبکائی بیٹھی ہیں، گویا کچھ جانتی ہی نہیں۔

آزاد : ہر ملک کی رسم الگ الگ ہے۔ اس میں آپ خواہ مخواہ بگڑ رہے ہیں۔

خوجی : تو آپ آنکھیں کیا دکھاتے ہیں؟ کچھ آپ کا محتاج یا غلام ہوں؟ لوٹ کا روپیہ میرے پاس بھی ہے، یہاں سے ہندستان تک اپنی بی بی کے ساتھ جا سکتا ہوں۔ اب آپ تو جائیں۔ میں ذرا ان سے دو دو باتیں کرلوں، پھر شادی کی رائے پیچھے دی جائے گی۔

آزاد اٹھنے ہی کو تھے کہ دلہن نے پاؤں سے دامن دبا دیا۔

آزاد : اب بتاؤ، اٹھنے نہیں دیتیں، میں کیا کروں۔

خوجی : (ڈپٹ کر) چھوڑ دو۔

آزاد : چھوڑ دو صاحب، دیکھو تمھارے میاں خفا ہوتے ہیں۔

خوجی : ابھی مجھے میاں نہ کہیے، شادی بیاہ نازک معاملہ ہے۔

آزاد : پہلے آپ کی ان سے شادی ہو جائے، پھر اگر بندہ آنکھ اٹھا کے دیکھے تو گناہ گار۔

خوجی : اچھا منظور، مگر اتنا سمجھا دینا کہ یہ بڑے کڑے خاں ہے، ناک پر مکھی بھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ مگر آپ کیوں سمجھائیں گے۔ میں خود ہی کیوں نہ کہہ دوں۔ سنو بی صاحب، ہمارے ساتھ چلتی ہو تو دو شرطیں ماننی ہوں گی۔ ایک یہ کہ کسی غیر آدمی کو صورت نہ دیکھاؤ۔ دوسری یہ کہ مجھے جو کوئی عورت دیکھتی ہے، پہروں گھورا کرتی ہے، ٹکٹکی بندھ جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمھیں سوتیہ ڈاہ ہونے لگے۔ بھئی آزاد، ذرا ان کو ان کی زبان میں سمجھا دو۔

آزاد : آپ ذرا ایک منٹ کے لیے باہر چلے جایئے تو میں سب باتیں سمجھا دوں۔

خوجی : جی، درست، یہ بھرّے لونڈوں کو دیجیے گا، آپ ایسے چھوکڑے میری جیب میں پڑے ہیں، اور سنیے، کیا الو سمجھا ہے۔ اب تم جاؤ، ہم ان سے دو دو بات کرلیں۔

آزاد باہر چلے گئے تو خوجی پلنگ پر دلہن کے پاس بیٹھے اور بولے۔ بھئی، اب تو گھونگھٹ اٹھا لو، جب ہم تمھارے ہو چکے تو ہم سے کیا شرم، کیوں ترساتی ہو۔

جب دلہن نے اب بھی گھونگھٹ نہ کھولا تو خوجی ذرا اور آگے کھسک گئے۔ جان من اس وقت شرم کو بھون کھاؤ، کیوں ترساتی ہو۔ ارے، اب کب لگ ترسائے رکھیو جی! کب لگ

ترسائے رکھیو جی!

دو تین منٹ تک خوجی نے گا گا کر رجھایا، مگر جب یوں بھی دلہن نے نہ مانا تو آپ نے اس کے گھونگھٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یکا یک دلہن نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اب آپ لاکھ زور مارتے ہیں، مگر ہاتھ نہیں چھوٹتا۔ تب آپ خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ چھوڑ دو بھائی، بھلا کسی غریب کا ہاتھ توڑنے سے تمھیں کیا ملے گا، اور یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ میں تم سے زور نہ کروں گا۔ پھر کیوں دق کرتی ہو، میرا تو کچھ نہ بگڑے گا، مگر تمھارے ملائم ہاتھ دکھنے لگیں گے۔

یہ کہہ کر خوجی دلہن کے پیروں پر گر پڑے اور ٹوپی اتار کر اس کے قدموں پر رکھ دی۔ ان کی حرکت پر دلہن کو ہنسی آ گئی۔

خوجی: وہ ہنسی آئی، ناک پر آئی، بس اب مار لیا ہے، اب اسی بات پر گلے لگ جاؤ۔

دلہن نے ہاتھ پھیلا دیے۔ خوجی گلے ملے تو دلہن نے اتنے زور سے دبایا کہ آپ چیخ پڑے۔ چھوڑ دو، چھوڑ دو، دیکھو، چوٹ آ جائے گی۔ مگر اب کی دلہن نے انھیں اٹھا کر دے مارا اور چھاتی پر سوار ہو گئی۔ میاں خوجی اپنی بدنصیبی پر رونے لگے۔ ان کو روتے دیکھ کر اس نے چھوڑ دیا، تب آپ سوچے کی بلا اپنی جواں مردی دیکھائے، اس پر رعب نہ جمے گا۔ بہت ہوگا، مار ڈالے گی، اور کیا۔ آپ نے کپڑے اتارے اور پینترا بدل کر بولے۔ سنو جی، ہم شہزادے ہیں۔ تلوار کے دھنی، بات کے شور، ناک پر مکھی بیٹھ جائے تو تلوار سے ناک اڑا دیں، سمجھی؟ اب تک میں دل لگی کرتا تھا۔ تم عورت، میں مرد، اگر اب کی تم نے ذرا بھی گستاخی کی تو آگ ہو جاؤں گا۔ لے اب گھونگھٹ اٹھا دو، ورنہ خیریت نہیں ہے۔ یہ کہیں اونچا تو نہیں سنتی؟ (تالیاں بجا کر) اجی سنتی ہو، برقع اٹھاؤ۔

خواجہ صاحب بکا کیے، مگر وہاں کچھ اثر نہ ہوا۔ تب آپ بگڑ گئے اور پھر پینترا بدلنے لگے۔ اب کی دلہن نے انھیں بغل میں دبا لیا، اب آپ تڑپ رہے ہیں، دانت پیستے ہیں، مگر گردن نہیں چھوٹتی۔ تب آپ نے جھلا کر دانت کاٹ کھایا۔ کاٹنا تھا کہ اس نے زور سے ایک تھپڑ دیا۔ خواجہ صاحب کا منہ پھر گیا۔ تب آپ کوسنے لگے۔ خدا کرے، تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ ہائے، اگر اس وقت خدا ایک منٹ کے لیے زور دے دے تو سرمہ بنا ڈالوں۔

مس کلاریسا اور میڈا ایک جھروکھے سے یہ کیفیت دیکھ رہی تھیں، جب خوجی پٹ پٹا

کر باہر نکلے تو کلاریسا نے کہا۔ مبارک ہو۔

آزاد : کہیے، دلہن کیسی ہے؟ یار، ہو خوش نصیب!

خوجی : خدا کرے آپ بھی ایسے ہی خوش نصیب ہوں۔

آزاد : ہم نے تو بڑی تعریف سنی تھی، مگر تم کچھ رنجیدہ معلوم پڑتے ہو، اس کا کیا سبب؟

خوجی : بھائی جان، وہاں تو فوج داری ہو گئی۔ عورت کیا، دیونی ہے، واللہ، کچومر نکل گیا۔

آزاد : آپ تو ہیں پاگل، یہ اس ملک کا رواج ہے کہ پہلے دن دو گھنٹے تک دلہن میاں کو مارتی ہے، کاٹ کھاتی ہے، پھر میاں باہر آتا ہے اور پھر جاتا ہے۔

خوجی : اجی، وہاں تو مار پیٹ تک ہو گئی، جی میں تو آیا تھا کہ اٹھا کر دے ماروں، مگر عورت کے منہ کون لگے۔ دیکھیں، اب کی کیسی گزرتی ہے، یا تو وہی نہیں یا ہمی نہیں۔

آزاد : کیا سچ مچ فوج داری ہی پر آمادہ ہو؟ بھائی، کرولی اپنے ساتھ نہ لے جانا، اور جو ہو سو ہو۔

خوجی : اجی، یہاں ہاتھ کیا کم ہیں! کرولی مرد کے لیے ہے، عورت کے لیے کرولی کی کیا ضرورت؟

آزاد : بس، اب کی جاکے میٹھی میٹھی باتیں کرو۔ ہاتھ جوڑو، پیر دباؤ، پھر دیکھیے، کیسی خوش ہوتی ہیں۔ اب دیر ہوتی ہے، جایئے۔

خواجہ صاحب کمرے میں گئے اور دلہن کے پاؤں دبانے لگے۔

دلہن : ہم کو چھوڑ کر چلے تو نہ جاؤ گے؟

خوجی : ارے، یہ تو اردو بول لیتی ہیں، یہ کیا ماجرا ہے!

دلہن : میاں، کچھ نہ پوچھو۔ ہم کو ایک حبشی بہکا کر بیچنے کے لیے لیے جاتا تھا۔ بارے خدا خدا کر کے یہ دن نصیب ہوا۔

خوجی اب تک تم ہم سے صاف صاف نہ بولیں؟ خواہ مخواہ کسی بھلے آدمی کو دق کرنے سے فائدہ؟

دلہن : تمھارے ساتھی آزاد نے ہمیں جیسا سکھایا ویسا ہم نے کیا۔

خوجی : اچھا آزاد! ٹھہر جاؤ بچہ، جاتے کہاں ہو۔ دیکھو تو کیسا بدلا لیتا ہوں۔

یہ کہہ کر خوجی نے اپنی ٹوپی دلہن کے قدموں پر رکھ دی اور بولے۔ بی بی، بس اب یہ سمجھو کہ میاں نہیں، خدمت گار ہیں۔ مگر اب تک؟ جب تک ہماری ہو کر رہو۔ ادھر آپ نے تیور بدلے، ادھر ہم بگڑ کھڑے ہوئے۔ مجھ سے بڑھ کر مروت دار کوئی نہیں، مگر مجھ سے بڑھ کر شریر بھی کوئی نہیں، اگر کسی نے مجھ سے دوستی کی تو اس کا غلام ہو گیا، اور اگر کسی نے ہیکڑی جتائی تو مجھ سے زیادہ پاجی کوئی نہیں۔ ڈنڈے سے بات کرتا ہوں۔ دیکھنے میں دبلا ہوں، مگر آج تک کسی نے مجھے زیر نہیں کیا۔ سیکڑوں پہلوانوں سے لڑا، اور ہمیشہ کشتیاں نکالیں۔

دلہن : تمھارے پہلوان ہونے میں شک نہیں، وہ تو ڈیل ڈول ہی سے ظاہر ہے۔

خوجی : اسی بات پر اب گھونگھٹ ہٹا دو۔

دلہن : یہ گھونگھٹ نہیں ہے جی، کل سے ہماری مونچھ میں درد ہے۔

خوجی : کاہے میں درد ہے، کیا کہا؟

دلہن : اے، مونچھ تو کہا، کانوں کی ٹھیٹھیاں نکال!

خوجی : مونچھ کیا! بکتی کیا ہو؟ عورت ہو یا مرد؟ خدا جانے، تم مونچھ کس کو کہتی ہو۔

دلہن : (خوجی کی مونچھ پکڑ کر) اسے کہتے ہیں، یہ مونچھ نہیں ہے؟

خوجی : اللہ جانتا ہے، بڑی دل لگی باز ہو، میں بھی سوچتا تھا کہ کیا کہتی ہیں۔

دلہن : اللہ جانتا ہے، میری مونچھوں میں درد ہے۔

خواجہ صاحب نے غور کر کے دیکھا تو ذرا ذرا سی مونچھیں۔ پوچھا۔ آخر بتاؤ تو جانِ من، یہ مونچھ کیا ہے؟

دلہن : دیکھتے نہیں، آنکھیں پھوٹ گئیں ہیں کیا؟

خوجی : ایک تو بی بی، آخر یہ مونچھ کیسی؟ کہتا تو کہتا، سنتا سیڑی ہو جاتا ہے۔ عورت ہو یا مرد؟ خدا جانے، تم مونچھ کسے کہتی ہو؟

دلہن : تو تم اتنا گھبراتے کیوں ہو؟ میں مردانی عورت ہوں۔

خوجی : بھلا عورت اور مونچھ سے کیا واسطہ؟

دلہن : اے ہے، تم تو بالکل اناڑی ہو، ابھی تم نے عورتیں دیکھیں کہاں؟

خوجی : ایسی عورتوں سے باز آئے۔

یکایک دلہن نے گھونگھٹ اٹھا دیا تو خوجی کی جان نکل گئی۔ دیکھا تو وہی بہروپیا۔ بولے۔ جی چاہتا ہے کہ کرولی بھونک دوں، قسم خدا کی، اس وقت یہی جی چاہتا ہے۔

بہروپیا : پہلے اس پارسل کے روپے لائیے جس کا لفافہ آپ نے اپنے نام لکھوا لیا تھا۔ بس، اب دائیں ہاتھ سے روپے لائیے۔

خوجی : او گیدی، بس الگ ہی رہنا، تم ابھی میرے غصے سے واقف نہیں ہو۔

بہروپیا : خوب واقف ہوں۔ کمزور، مار کھانے کی نشانی۔

خوجی : ہم کمزور ہیں؟ ابھی چاہوں تو گردن توڑ کے رکھ دوں۔ جا کر ہوٹل والوں سے تو پوچھو کہ کس جواں مردی کے ساتھ مصر کے پہلوانوں کو اٹھا کے دے مارا۔

بہروپیا : اچھا، اب تمھاری قضا آئی ہے۔ خواہ مخواہ ہاتھ پاؤں کے دشمن ہوئے ہو۔

خوجی : سچ کہتا ہوں، ابھی تم نے میرا غصہ نہیں دیکھا، مگر ہم تم پردیسی ہیں، ہم کو مل جل کر رہنا چاہیے۔ تم نہ جانے کیسے ہندوستانی ہو کہ ہندوستانی کا ساتھ نہیں دیتے۔

بہروپیا : پارسل کا روپیہ داہنے ہاتھ سے دلوائیے تو خیر۔

خوجی : اجی، تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو، 'حسابِ دوستاں در دل اگر وہ بے وفا سمجھے'۔ پارسل کا ذکر کیسا، بزاز کی دوکان پر ہم بھی تو تمھاری طرف سے کچھ پوچ آئے تھے؟ کچھ تم سمجھے، کچھ ہم سمجھے۔

اتنے میں آزاد دونوں لیڈیوں کے ساتھ اندر آئے۔

آزاد : بھائی، شادی مبارک ہو۔ یار، آج ہماری دعوت کرو۔

خوجی : زہر کھلاؤ اور دعوت مانگو۔ یہ جو ہم نے آپ کو لاکھوں خطروں سے بچایا اس کا یہ نتیجہ نکلا۔ اب ہم یا تو یہیں نوکری کر لیں گے۔ یا پھر روم واپس جائیں گے۔ وہاں کے لوگ قدر داں ہیں، دو چار شعر بھی کہہ لیں گے تو کھانے بھر کو بہت ہے۔ خیر، آدمی کچھ کھو کر سیکھتا ہے۔ ہم بھی کھو کر سیکھے، اب دنیا میں کسی کا بھروسہ نہیں رہا۔

کلاریسا : یہ مٹھائیاں نہ دینے کی باتیں ہیں، یہ چکمے کسی اور کو دینا، ہم بے دعوت لیے نہ رہیں گے۔

خوجی : ہاں صاحب، آپ کو کیا۔ خدا کرے، جیسی بی بی ہم نے پائی، ویسا ہی شوہر تم

پاؤ، اب اس کے سوا اور کیا دعا دوں۔

مَیڈا : ہم نے تو بہت سوچ سمجھ کر تمھاری شادی تجویز کی تھی۔

خوجی : اجی، رہنے بھی دو۔ ہمیں آپ لوگوں سے کوئی شکایت نہیں، مگر آزاد نے بڑی دغا دی، ہندستان سے اتنی دور آئے۔ جب موقع پڑا، ان کے لیے جان لڑا دی۔ پولینڈ کی شہزادی کے یہاں ہمی کام آئے، ورنہ پڑے پڑے سڑ جاتے۔ ان سب باتوں کا انجام یہ ہوا کہ ہمیں پر چکمے چلنے لگے۔ اب چاہے جو ہو، ہم آزاد کی صورت نہ دیکھیں گے۔

(102)

چوتھی کے دن رات کو نواب صاحب نے ثریا بیگم کو چھیڑنے کے لیے کئی بار فیروزہ کی تعریف کی۔ ثریا بیگم بگڑنے لگیں اور بولیں۔ عجب بے ہودہ باتیں ہیں تمھاری، نہ جانے کن لوگوں میں رہے ہو کہ ایسی باتیں زبان سے نکلتی ہیں۔

نواب : تم ناحق بگڑتی ہو، میں تو صرف ان کے حسن کی تعریف کرتا ہوں۔

ثریا : اے، تو کوئی ڈھونڈھ کے ویسی ہی کی ہوتی۔

نواب : تمھارے یہاں کبھی کبھی آیا جایا کرتی ہیں؟

ثریا : مجھے اس گھر کا حال کیوں کر معلوم ہو۔ مگر جو تمھارے یہی لچھن ہیں تو خدا ہی مالک ہے۔ آج ہی سے یہ باتیں شروع ہو گئیں۔ ہاں سچ ہے، گھر کی مرغی ساگ برابر۔ خیر، اب تو میں آ کر پھنس ہی گئی، مگر مجھے وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ ہاں، اب تمھاری محبت البتہ جاتی رہی۔

نواب : تم اتنی سمجھ دار ہو کر ذرا سی بات پر اتنی روٹھ گئیں۔ بھلا اگر میرے دل میں یہی ہوتا تو تمھارے سامنے ان کی تعریف کرتا، مجھے کوئی پاگل سمجھا ہے؟ مطلب یہ تھا کہ دو گھڑی کی دل لگی ہو، مگر تم کچھ اور ہی سمجھیں۔ خوب یاد رکھنا کہ جب تک میری اور تمھاری زندگی ہے، کسی اور عورت کو بری نظر سے نہ دیکھوں گا۔ اگر دیکھوں تو شریف نہیں۔

ثریا : وہ عورت کیا جو اپنے شوہر کے سوا کسی مرد کو بری نظروں سے دیکھے اور وہ مرد کیا جو اپنی بیوی کے سوا پرائی بہو بیٹی پر نظر ڈالے۔

نواب : بس، یہی ہماری بھی رائے ہے اور جو لوگ دس دس شادیاں کرتے ہیں ان کو

میں احمق سمجھتا ہوں۔

ثریا : دیکھنا ان باتوں کو بھول نہ جانا۔

صبح کو دلہن کے میکہ سے مہری آئی اور عرض کی کہ آج سالی نے دلہا اور دلہن کو بلایا ہے، پہلا چالا ہے۔

بیگم : (نواب صاحب کی ماں) تمھارے یہاں وہ لڑکی تو بڑے غضب کی ہے، فیروزہ، کسی سے دبتی ہی نہیں۔

مہری : حضور، اپنا اپنا مزاج ہے۔

بیگم : ارے، کچھ تو شرم حیا کا خیال ہو۔ بے چاری فیضن کو بات بات پر بناتی تھی۔ وہ لاکھ گنواروں کی سی باتیں کرے، پھر اس سے کیا، جو اپنے یہاں آئے اس کی خاطر کرنی چاہیے، نہ کہ ایسا بنائے کہ وہ کبھی پھر آنے کا نام ہی نہ لے۔

خورشید : (نواب کی بہن) ہم کو تو ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ (دبے دانتوں) نیک نہیں، آگے خدا جانے۔

بیگم : یہ نہ کہو بیٹا، ابھی تم نے دیکھا کیا ہے۔

نواب : (اشارہ کر کے) ان کی مہری بیٹھی ہے، اس کے سامنے کچھ نہ کہو۔

بیگم صاحب نے ثریا بیگم کو اسی وقت رخصت کیا۔ شام کو دلہا بھی چلا۔ مصاحبوں نے اس کی ریاست اور ٹھاٹ باٹ کی تعریف کرنی شروع کی۔

ببر علی : حضور اس وقت ایران کے شہزادے معلوم ہوتے ہیں۔

نور خاں : اس میں کیا شک ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شہزادہ مسند لگائے بیٹھا ہے۔

ببر علی : حضور، آج ذرا چوک کی طرف چلیے گا۔ ذرا ادھر اُدھر کمروں سے تعریف کی آواز تو نکلے۔

نواب : کیا فائدہ، جس کے بیوی ہو، اس کو ان باتوں میں نہ پڑنا چاہیے۔

نور خاں : اے حضور، یہ تو ریاست کا تمغہ ہی ہے۔

عیدو : اے حضور، یہ تو غریب آدمیوں کے لیے ایک سے زیادہ نہ ہو، دوسری بیوی کو کیا کھلائے گا، خاک! مگر امیروں کا تو یہ جوہر ہے۔ بادشاہوں کے آٹھ آٹھ نو نو سے زیادہ محل ہوتے تھے، ایک دو کی کون کہے۔ جسے خدا دیتا ہے وہی اس قابل سمجھا جاتا ہے۔

ان لوگوں نے نواب صاحب کو ایسا چنگ پر چڑھایا کہ چوک ہی سے لے گئے، مگر نواب صاحب نے گردن جو نیچی کی تو چوک بھر میں کسی کمرے کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ اس پر مصاحبوں نے حاشیے چڑھائے۔ اے حضور، ایک نظر تو دیکھ لیجیے، کیسا کٹاؤ ہو رہا ہے۔ ساری خدائی کا حال تو کون جانے، مگر اس شہر میں تو کوئی جوان حضور کے چہرے مہرے کو نہیں پاتا۔ بس، یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیر کچھار سے چلا آتا ہے۔

نواب صاحب دل میں سوچتے جاتے تھے کہ ان خوشامدیوں سے بچنا مشکل ہے۔ ان کے پھندے میں پھنسے اور داخل جہنم ہوئے۔ ہم نے ٹھان لی ہے کہ اب کسی عورت کو بری نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔ یوں ہنسی دل لگی کی اور بات ہے۔

نواب صاحب سسرال میں پہنچے، تو باہر دیوان خانے میں بیٹھے۔ ناچ شروع ہوا اور مصاحبوں نے طوائفوں کی تعریف کے پل باندھ دیے۔ جناب، ایسی گانے والی اب دوسری شہر میں نہیں ہے، اگر شاہی زمانہ ہوتا، تو لاکھوں روپے پیدا کر لیتی اور اب بھی ہمارے حضور کے سے جوہر شناس بہت ہیں، مگر پھر بھی کم ہیں۔ کیوں حضور، ہولی گانے کو کہوں؟

نواب : جو جی چاہے، گائیں۔

مصاحب : حضور فرماتے ہیں، یہ جو گائیں گی، اپنا رنگ جما لیں گی، مگر ہولی ہو تو اور بھی اچھا۔

نواب : ہم نے یہ نہیں کہا، تم لوگ ہمیں ذلیل کرا دوگے۔

مصاحب : کیا مجال حضور، حضور کا نمک کھاتے ہیں، ہم غلاموں سے یہ امید؟ چاہے سر جاتا رہے، مگر نمک کا پاس ضرور رہے گا، اور یہ تو حضور، دو گھڑی ہنسنے بولنے کا وقت ہی ہے۔

غنیمت جان اس مل بیٹھنے کو

جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

اس کے بعد نواب صاحب اندر گئے اور کھانا کھایا۔ سالی نے ایک بھاری خلعت بہنوئی کو اور ایک قیمت جوڑا بہن کو دیا۔ دوسرے دن دلہا دلہن رخصت ہو کر گھر گئے۔

(103)

کچھ دن تک میاں آزاد مصر میں اس طرح رہے جیسے اور مسافر رہتے ہیں، مگر جب

کوانسل کو ان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اس نے انھیں اپنے یہاں بلا کر ٹھہرایا اور باتیں ہونے لگیں۔

کوانسل : مجھے آپ سے سخت شکایت ہے کہ یہاں آئے اور ہم سے نہ ملے۔ ایسا کون ہے جو آپ کے نام سے واقف نہ ہو، جو اخبار آتا ہے اس میں آپ کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ وہ آپ کے ساتھ مسخرہ کون ہے؟ وہ بونا خوجی؟

آزاد نے مسکرا کر خوجی کی طرف اشارہ کیا۔

خوجی : جناب، وہ مسخرے کوئی اور ہوں گے اور خوجی خدا جانے، کس بھکوئے کا نام ہے۔ ہم خواجہ صاحب ہیں اور بونے کی ایک ہی کہی۔ ہائے، میں کس سے کہوں کہ میرا بدن چور ہے!

آزاد : کیا اخباروں میں خواجہ صاحب کا ذکر رہتا ہے؟

کوانسل : جی ہاں، ان کی بڑی دھوم ہے مگر ایک مقام پر تو سچ مچ انھوں نے بڑا کام کر دکھایا تھا۔ آپ کا دولت خانہ کس شہر میں ہے جناب؟ مجھے حیرت تو یہ ہے کہ اتنے ننھے ننھے تو آپ کے ہاتھ پاؤں لڑائی میں آپ کس برتے پر گئے تھے!

خوجی : (مسکرا کر) یہی تو کہتا ہوں حضرت کہ میرا بدن چور ہے، دیکھیے، ذرا ہاتھ ملایئے۔ ہیں فولاد کی انگلیاں یا نہیں؟ اگر ابھی زور کروں تو آپ کی ایک آدھ انگلی توڑ کر رکھ دوں۔

تھوڑی دیر تک وہاں بات چیت کر کے آزاد چلے تو خوجی نے کہا۔ یہ آپ کی عجب عادت ہے کہ غیروں کے سامنے مجھے ذلیل کرنے لگتے ہیں۔ اگر مجھے غصّہ آ جاتا اور میں میاں کوانسل کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتا تو بتاؤ، کیسی ٹھہرتی؟ میں مارے مروت کے طرح دیتا جاتا ہوں، ورنہ میاں کی سٹی پٹی بھول جاتی۔

آزاد : اجی، ایسی مروت بھی کیا جس سے ہمیشہ جوتیاں کھانی پڑیں۔ کئی جگہ آپ پٹے، مگر مروت نہ چھوڑی، ایک دن اس مروت کی بدولت آپ کہیں قاضی ہاؤس نہ بھیجے جایئے۔ اچھا، اب یہ پوچھتا ہوں کہ جب سارے زمانے میں میرا حال سنا تو کیا حسن آرا نے نہ سنا ہوگا؟

خوجی : ضرور سنا ہوگا بھائی، اب آج کے آٹھویں دن شادی لو۔ مگر استاد، دو ایک دن

بمبئی میں ضرور رہنا۔ ذرا بیگم صاحب سے باتیں ہوں گی۔

آزاد : بھائی، اب تو بیچ میں ٹھہرنے کا جی نہیں چاہتا۔

خوجی : یہ نہیں ہو سکتا، اتنی بے وفائی کرنا مناسب نہیں، وہ بے چاری ہم لوگوں کی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔

آزاد : اچھا تو یہ سوچ لو کہ اگر انھوں نے پوچھا کہ خوجی کے ساتھ کوئی عورت کیوں نہیں آئی تو کیا جواب دو گے؟ ہماری تو صلاح ہے کہ کسی کو یہیں سے پھانس لے چلو۔

خوجی : نہیں جناب، مجھے یہاں کی عورتیں پسند نہیں۔ ہاں، اپنے وطن میں ہو تو مضائقہ نہیں۔

آزاد : اچھا، کیسی عورت چاہتے ہو؟

خوجی : بس یہی کہ عمر زیادہ نہ ہو۔ اور شکل صورت اچھی ہو۔

آزاد : ایسی عورت تو حسن آرا کے مکان کے پاس ہے۔ اسی درزی کی بیوی ہے جو ان کے مکان کے سامنے رہتا ہے۔ رنگت سانولی ہے، مگر ایسی نمکین کہ آپ سے کیا کہوں اور ابھی کم سن۔ بہت بہت تو کوئی 40-42 کی ہوگی۔

خوجی : بھلا میڈا میں اور اس میں کیا فرق ہے؟

آزاد : یہ اس سے دو چار برس کمسن ہے، بس، اور تو کوئی فرق نہیں۔ ہاں، یہ گوری ہیں اور اس کا رنگ سانولا ہے۔

خوجی : بھلا نام کیا ہے۔

آزاد : نام ہے شتاب جان۔

خوجی : تب تو بھائی، ہم حاضر ہیں۔ مگر پکی پوڑھی بات تو ہو لے پہلے۔

آزاد : آپ کو اس سے کیا واسطہ؟ کچھ تو سمجھ کے ہم نے کہا ہے! ہمارے پاس اس کا خط آیا تھا کہ اگر خواجہ صاحب منظور کریں تو میں حاضر ہوں۔

خوجی : تب تو بھائی، بنی بنائی بات ہے، خدا نے چاہا تو آج کے آٹھویں دن شتاب جان ہماری بغل میں ہوں گی۔

آزاد : شام کو کوانسل سے مل کر چلے چلو آج ہی۔

خوجی : کوانسل؟ ہم کو شتاب جان کی پڑی ہے، ہمارے سامنے خط لکھ کے بھیج دو۔

مضمون ہم بتائیں گے۔

آزاد قلم دوات لے کر بیٹھے۔ خوجی نے خط لکھوایا اور جا کر اسے ڈاکخانے میں چھوڑ آئے۔ تب مس میڈا سے جا کر بولے۔ اب ہماری خوشامد کیجیے۔ آج کے آٹھویں دن ہمارے یہاں آپ کی دعوت ہوگی۔ اچھے سے اچھے قسم کی برانڈی طے کر رکھیے۔ شتاب جان کے ہاتھ پلواؤں گا۔

میڈا : شتاب جان کون! کیا تمھاری بہن کا نام ہے؟

خوجی : ارے توبہ! شتاب جان سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اس نے مجھے بھیجا تھا کہ روم جا کر نام کرو تو پھر نکاح ہوگا۔ اب میں وہاں سے نام کر کے لوٹا ہوں، پہنچتے پہنچتے شادی ہوگی۔

میڈا : کیا سن ہوگا؟ بیوہ تو نہیں ہیں؟

خوجی : خدا نہ کرے، درزی ابھی زندہ ہے۔

میڈا : کیا میاں والی ہے اور آپ اس کے ساتھ نکاح کریں گے؟ سن کیا ہے؟

خوجی : ابھی کیا سن ہے، کل کی لڑکی ہے، کوئی پینتالیس برس کی ہو شاید!

میڈا : بس، پینتالیس ہی برس کی؟ تب تو اسے پالنا پڑے گا!

خوجی : ہم تو قسمت کے دھنی ہیں۔

میڈا : بھلا شکل صورت کیسی ہے؟

خوجی : یہ آزاد سے پوچھو۔ چاند میں میل ہے، اس میں میل نہیں، میں تو آزاد کو دعائیں دیتا ہوں جن کی بدولت شتاب جان ملیں۔

یہاں سے خوجی ہوٹل والوں کے پاس پہنچے اور ان سے بھی وہی چرچا کی۔ اجی، بالکل سانچے کی ڈھلی ہے، کوئی دیکھے تو بے ہوش ہو جائے۔ اب آزاد کے سامنے اسے تھوڑا ہی آنے دوں گا، ہرگز نہیں۔

خانساماں : تم سے بات چیت بھی ہوئی یا دور ہی سے دیکھا؟

خوجی : جی ہاں، کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ باتیں کیا کرتی ہیں، مصری کی ڈلی گھولتی ہیں۔

ہوٹل والوں نے خوجی کو خوب بنایا۔ اتنی دیر میں آزاد نے جہاز کا بندوبست کیا اور ایک روز دونوں پریوں اور خواجہ صاحب کے ساتھ جہاز پر سوار ہوئے۔ سوار ہوتے ہی خوجی نے

گانا شروع کیا۔

ارے ملاح لگا کشتی میرا محبوب جاتا ہے
شتابوں کی تمنا میں مجھے دل لے کے آتا ہے
مگر چھوڑا ودیشی ہو کے خواجہ نے گئے لڑنے
شتابوں کے لیے جی میرا کل سے تلملاتا ہے

آزاد نے شہ کے دے دے کر اور چنگ پر چڑھایا۔ جیوں جیوں ان کی تعریف کرتے تھے، وہ اور اکڑتے تھے۔ جہاز تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ ایک ملاح نے کہا۔ لوگوں، ہوشیار! طوفان آ رہا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی کتنوں ہی کے تو ہوش اڑ گئے اور میاں خوجی تو دوہائی دینے لگے۔ جہاز کی دوہائی! بڑے کی دوہائی! سمندر کی دوہائی! ہاء شتاب جان، ارے میری پیاری شتاب دعا مانگ۔

یہ کہہ کر آپ نے اکڑ کر آزاد کی طرف دیکھا۔ آزاد کچھ تاڑ گئے کہ اس فقرے کی داد چاہتے ہیں۔ کہاں۔ سبحان اللہ، شتاب جان کے لیے شتاب، کیا خوب۔

خوجی : اس فن میں کوئی میری برابری کیا کرے گا بھلا۔ استاد ہوں، استاد۔

آزاد : اور لطف یہ ہے کہ ایسے نازک وقت میں بھی نہیں چوکتے۔

خوجی : یا خدا، میری سن لے۔ یارو، رو رو کر اس کی درگاہ سے دعا مانگو کہ خواجہ بچ جائیں اور شتاب جان سے بیاہ ہو۔ خوب روؤ۔

آزاد : جناب، یہ کیا سبب ہے کہ آپ صرف اپنے لیے دعا مانگتے ہیں، اور بے چاروں کا بھی تو خیال رکھیے۔

اتنے میں آندھی آ گئی۔ آزاد تو جہاز کے کپتان کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ خوجی نے سوچا، اگر جہاز ڈوب گیا تو شتاب جان کیا کرے گی؟ فوراً افیم کی ڈبیا لی اور خوب کس کر کمر میں باندھ کر بولے۔ لو یاروں، ہم تو تیار ہیں۔ اب چاہے آندھی آئے یا بگولا۔ طوفان نہیں، طوفان کا باپ آئے تو کیا غم ہے!

جہاز والے تو گھبرائے ہوئے تھے کہ نہیں معلوم طوفان کیا گل کھلائے، مگر خواجہ صاحب تان لگا رہے تھے۔

شتابوں کی تمنّا میں میرا دل تلملاتا ہے۔

آزدا : خواجہ صاحب، آپ تو بے وقت کی شہنائی بجاتے ہیں۔ پہلے تو روئے چلائے اور اب تان لگانے لگے۔

ایک ٹھاکر صاحب بھی جہاز پر سوار تھے۔ خوجی کو گاتے دیکھ کر سمجھے کہ یہ کوئی بڑے ولی ہیں۔ قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور بولے۔ سائیں جی، ہمارے حق میں دعا کیجیے۔

خوجی : خوش رہو بابا، بیڑا پار ہے۔

آزاد نے خوجی کے کان میں کہا۔ یار، یہ تو اچھا الو پھنسا۔ راستے میں خوب دل لگی رہے گی۔

ٹھاکر صاحب بار بار خوجی سے سوال کرتے تھے اور میاں خوجی اناپ شناپ جواب دیتے تھے۔

ٹھاکر : سائیں جی، جمعہ کے دن سفر کرنا کیسا ہے؟

خوجی : بہت اچھا دن ہے۔

ٹھاکر : اور جمعرات؟

خوجی : اس سے بھی اچھا۔

آزاد : ٹھاکر صاحب، آپ کب سے سفر کر رہے ہیں؟

ٹھاکر : جناب، کوئی چالیس برس ہوئے۔

آزاد : چالیس برس سفر کرتے ہو گئے اور ابھی تک آپ اچھے اور برے دن پوچھتے جاتے ہیں۔

ٹھاکر : سنیچر کے دن آپ سفر کر کے دیکھ لیں۔

خوجی : ہم نے اس بارے میں بہت غور کیا ہے۔ بری ساعت کا سفر کبھی پورا نہیں ہوتا۔

ٹھاکر : سائیں جی، کچھ اور نصیحت کیجیے، جس سے میرا بھلا ہو۔

خوجی : اچھا سنو، پہلی بات تو یہ ہے کہ جس دن چاہو، سفر کرو، مگر پہر رات رہے سے، تمھاری منزل دونی ہو جائے گی۔ دوسری نصیحت یہ ہے کہ ایک بیوی سے زیادہ کے ساتھ شادی نہ کرنا، اگر وہ مر جائے تو دوسری شادی کا خیال بھی دل میں نہ لانا۔ تیسری بات یہ ہے کہ رات کو دو گھنٹے تک ٹھنڈے پانی میں رہ کر خدا کی یاد کرنا۔ گرمی، جاڑا، برسات تینوں

موسموں میں اس کا خیال رکھنا۔ چوتھی نصیحت یہ ہے کہ اچھے کھانے اور اچھے کپڑے سے پرہیز رکھنا۔ کھانے کو جو کی روٹی اور پینے کو اوٹا ہوا پانی کافی ہے۔

خوجی نے یہ نصیحتیں کچھ اس طرح کیں، گویا وہ پہنچے ہوئے فقیر ہیں۔ ٹھاکر نے اپنی نوٹ بک پر یہ سب باتیں لکھ لیں اور بولا۔ سائیں جی، آپ سے ملاقات کرنا چاہوں تو کیسے کروں؟

خوجی : بس، لکھنؤ میں شتاب جان کا مکان پوچھتے ہوئے چلے آنا۔

ٹھاکر : شتاب جان کون ہیں؟

خوجی : کوئی ہو، تمھیں اس سے مطلب؟

یوں ہی ٹھاکر صاحب کو بناتے ہوئے راستہ کٹ گیا اور ممبئ سامنے نظر آنے لگا۔ خوجی کی باچھیں کھل گئیں، چلا کر کہا۔ یارو، ذرا دیکھنا، شتاب جان کی سواری تو نہیں آئی ہے۔ کریم بخش نامی مہری ساتھ ہوگی۔ اتلس کا لہنگا ہے، کہاروں کی پگڑیاں رنگی ہوئی ہیں، مچھلیاں ضرور لٹک رہیں ہوں گی۔ ارے مہری، مہری! کیا بہری ہے؟

لوگوں نے سمجھایا کہ صاحب، ابھی بندرگاہ تو آنے دو؟ شتاب جان یہاں سے کیوں کر سن لیں گی؟ بولے۔ اجی، ہٹو بھی، تم کیا جانو۔ کبھی کسی پر دل آیا ہو تو سمجھو؟ ارے نادان، عشق کے کان دو کوس تک کی خبر لاتے ہیں، کیاں شتاب جان نے آواز نہ سنی ہوگی؟ واہ، بھلا کوئی بات ہے! مگر جواب کیوں نہ دیا؟ اس میں ایک لِم ہے، وہ یہ کہ اگر آواز کے ساتھ ہی آواز کا جواب دیں تو ہماری نظروں سے گر جائیں۔ مزہ جب ہے کہ ہم بوکھلائے ہوئے ادھر ادھر ڈھونڈھتے اور آواز دیتے ہوں اور وہ ہمیں پیچھے سے ایک دھول جمائیں اور تن کر کہیں۔ مڑی کاٹا، آنکھوں کا اندھا نام نین سکھ، غل مچاتا پھرتا ہے، اور ہم دھول کھا کر کہیں کہ دیکھیے سرکار، اب کی دھول لگائی تو خیر، جواب لگائی تو بگڑ جائے گی۔ اس پر وہ جھلا کر اس گھٹی ہوئی کھوپڑی پر تراتڑ دو چار اور جما دیں، تب میں ہنس کر کہوں، تو پھر دو ایک جوتے بھی لگا دو، اس بغیر طبیعت بے چین ہے۔

آزاد : بالفعل کہیے تو میں ہی لگا دوں۔

خوجی : اجی نہیں، آپ کو تکلیف ہوگی۔

آزاد : واللہ، کس بھکوئے کو ذرا بھی تکلیف ہو۔

خوجی : میاں، پہلے منھ دھو آؤ، ان کھونپڑیوں کے سہلانے کے لیے پریوں کے ہاتھ چاہیے، تم جیسے دیوں کے نہیں۔

اتنے میں سمندر کا کنارہ نظر آیا تو خوجی نے غل مچا کر کہا۔ شتاب جان صاحب، آپ کا یہ غلام فرازندانہ آداب عرض......۔

آزاد سے پوچھا کہ اس بے موقع ہنسی کا کیا سبب ہے؟ آزاد نے کہا۔ اس کا سبب ہے آپ کی حماقت۔ کیا آپ شتاب کے بیٹے ہیں جو ان کو فرزندانہ آداب بجا لاتے ہیں، جورو کو کوئی اس طرح سلام کرتا ہے؟

خوجی : (گالوں پر تھپڑ لگا کر) ار رر، غضب ہو گیا، برا ہوا۔ واللہ اتنا ذلیل ہوا کہ کیا کہوں۔ بھائی، عشق میں ہوش حواس کب ٹھیک رہتے ہیں، اناپ شناپ باتیں منھ سے نکل ہی جاتی ہیں، مگر خیر! اب تو پالکی صاف صاف نظر آتی ہے۔ وہ دیکھیے، مہری سامنے ڈٹی کھڑی ہے۔ اخواہ، اب تو مہری بھی باڑھ پر ہے۔

جہاز نے لنگر ڈالا اور لوگ اترنے لگے۔ خواجہ صاحب دور ہی سے شتاب جان کو ڈھونڈنے لگے۔ آزاد دونوں لیڈیوں کو لے کر خشکی پر آئے تو بمبئی کے مرزا صاحب نے دوڑ کر انھیں گلے لگایا۔ پھر دونوں پریوں کو دیکھ کر تعجب سے بولے۔ ان دونوں کو کہاں سے لائے، کیا پرستان کی پریاں ہیں؟

آزاد نے ابھی جواب نہ دیا تھا کہ خوجی کفن پھاڑ کر بول اٹھے۔ ادھر شتاب جان، ادھر، او کرم بخش کرم پھوڑ، کمبختی کے نشان، یہاں کیوں نہیں آتی دور ہی سے بتے بتاتی ہے۔

مرزا : کس کو پکارتے ہو خواجہ صاحب، میں بلا لوں۔ کیا بیاہ لائے ہو کوئی پری؟ مگر استاد، نام تو ہندستان کا ہے، ذرا دکھا تو دو۔

آزاد نے خیر و عافیت پوچھی اور دونوں آدمیوں سے شہزادہ ہمایوں فر کی چرچا ہونے لگی۔ پھر لڑائی کا ذکر چھڑ گیا۔

ادھر خواجہ صاحب نے افیم گھولی اور چسکی لگا کر غل مچایا۔ شتاب جان پیاری، میں تیرے واری، جلدی سے آ ری، صورت دکھا ری، آنسو ہیں جاری۔ جان من، جس بستر پر تم سوئی تھیں اس کو ہر روز سونگھ لیا کرتا ہوں اور اسی کی خوشبو پر زندگی دارو مدار ہے

تیری سی نہ بو کسی میں پائی

سارے پھولوں کو سونگھتا ہوں

مرزا صاحب نے کہا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ جناب خواجہ صاحب، کیا سفر میں عقل بھی کھو آئے، یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ اگر سچے عاشق ہو تو فریاد کیسی؟

خوجی : جناب، کہنے اور کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

کب اپنے منھ سے عاشق شکوۂ بے داد کرتے ہیں،
دہانے غیر سے وہ مثل نے فریاد کرتے ہیں۔

خوجی : مجھ سے کہیے تو ایسے دو کروڑ شعر پڑھ دوں، عاشقی دوسری چیز ہے، شاعری دوسری چیز۔

مرزا : دو کروڑ شعر تو دس کروڑ برس تک بھی آپ سے نہ پڑھے جائیں گے۔ آپ دو ہی چار شعر فرمائیں۔

خوجی : اچھا تو سنیے اور گنتے جایئے، آپ بھی کیا کہیں گے۔

یہی کہہ کہہ کے ہجرِ یار میں فریاد کرتے ہیں
وہ بھولے ہم کو بیٹھے ہیں جنھیں ہم یاد کرتے ہیں
اسیرانِ کہن پر تازہ وہ بے داد کرتے ہیں
رہی طاقت نہ جب اڑنے کی تب آزاد کرتے ہیں
رقم کرتا ہوں جس دم کاٹ تیری تیغ ابرو کی
گریباں چاک اپنا جامۂ فولاد کرتے ہیں
صفت ہوتی ہے جاناں جس غزل میں تیرے ابرو کی
تو ہم ہر بیت پر آنکھوں سے اپنی صاد کرتے ہیں

اب بھی نہ کوئی شرمائے تو اندھیر ہے، دو کروڑ شعر نہ پڑھ کر سناؤں تو نام بدل ڈالوں۔ ہاں، اور سنیے۔

نہیں ہم یاد سے رہتے ہیں غافل ایک دم ہمدم،
جو بت کو بھول جاتے ہیں خدا کو یاد کرتے ہیں۔

آزاد : اس وقت تو مرزا صاحب کو آپ نے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔

خوجی : اجی، یہاں کوئی ایک شعر پڑھے تو ہم دس کروڑ شعر پڑھتے ہیں۔ جانتے ہو

کہاں کے رہنے والے ہیں ہم! بمبئی والوں کو ہم سمجھتے کیا ہیں۔

اتنے میں ایک عورت نے خوجی کو اشارے سے بلایا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ بولے۔ کیا حکم ہے حضور؟

عورت : اے دور حضور کے بچے! کچھ لایا بھی ہے وہاں سے، یا خالی ہاتھ جھلاتا چلا آتا ہے۔

خوجی : پہلے تم اپنا نام تو بتاؤ؟

عورت : اے لو، پہروں سے نام رٹ رہا ہے اور اب پوچھتا ہے، نام بتا دو۔ (دھپ جما کر) اور نام پوچھے گا؟

خوجی : اے تم نے تو دھپ لگانی شروع کی، جو کہیں اب کی ہاتھ اٹھایا تو بہت ہی بے ڈھب ہوگی۔

آزاد : ارے یار، یہ کیا ماجرا ہے؟ بے بھاؤ کی پڑھنے لگی۔

خوجی : اجی، محبت کے یہی مزے ہیں بھائی جان۔ تم یہ باتیں کیا جانو۔

مرزا : یہ آپ کی بیاہتا ہیں یا صرف ملاقات ہے؟

شتاب : ہمارے بزرگوں سے یہ رشتہ چلا آتا ہے۔

مرزا : تو یہ کہو کہ تم ان کی بہن ہو۔

خوجی : جناب، ذرا سنبھل کر فرمائیے گا۔ میں آپ کا بڑا لحاظ کرتا ہوں۔

شتاب : اے، تو کچھ جھوٹ بھی ہے۔ آخر آپ میرے ہیں کون؟ مفت میں میاں بننے کا شوق چرایا ہے؟

خوجی : ارے تو نکاح تو ہو لے۔ قسم خدا کی، لڑائی کے میدان میں بھی دل تمھاری ہی طرف رہتا تھا۔

آزاد : ہمیشہ یاد کرتے تھے بے چارے!

جب آزاد لیڈیوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے تب مرزا نے خوجی سے کہا۔ چلیے، وہ لوگ جا رہے ہیں۔

خوجی : جا رہے ہیں تو جانے دیجیے۔ اب مدت کے بعد معشوق سے ملاقات ہوئی ہے، ذرا باتیں کرلوں۔ آپ چلیے، میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

وہ لوگ ادھر روانہ ہوئے۔ ادھر شتاب جان نے خوجی کو دوسری گاڑی میں سوار کرایا اور گھر چلیں۔ خواجہ صاحب خوش تھے کہ دا لگی میں معشوق ہاتھ آیا۔ گھر پہنچ کر شتاب جان نے خوجی سے کہا۔ اب کچھ کھلوایئے، بہت ہوک لگی ہے۔

خوجی : بھئی واہ، میں سپاہی آدمی، میرے پاس سوا ڈھال تلوار، برچھی، کٹار کے اور کیا ہے؟ یا تمغے ہیں، سو وہ میں کسی کو دے نہیں سکتا۔

شتاب : کمائی کرنے گئے تھے وہاں، یا راستہ ناپنے؟ تمغے لے کر چاٹوں، تلوار سے اپنی گردن مار لوں، چھری بھونک کے مر جاؤں؟ چھری تلوار سے کہیں پیٹ بھرتا ہے؟

خوجی : ابھی کچھ کھلاؤ پلاؤ، جب ہم رسالداری کریں گے تو تم کو مال و مال کر دیں گے۔ اب پروانہ آیا چاہتا ہے۔ لڑائی میں میں نے جو بڑے بڑے کام کیے وہ تو تم سن ہی چکی ہوگی۔ دس ہزار سپاہیوں کی ناک کاٹ ڈالی۔ ادھر دشمن کی فوج نے شکست پائی، ادھر میں نے کرولی اٹھائی اور میدان میں کھٹ سے داخل۔ جس کو دیکھا کہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے، اس کی ناک اڑا دی۔ جب تک لڑائی ہوتی رہتی تھی، بندہ چھپا بیٹھا رہتا تھا، کبھی پیڑ پر چڑھ گیا، کبھی کسی جھونپڑے میں لُک گیا۔ مفت میں جان دینا کون سی عقلمندی ہے۔ مگر لڑائی ختم ہوتے ہی میدان میں جا پہنچتا تھا۔ جس شہر میں جاتا تھا، شہر بھر کی عورتیں میرے پیچھے پڑ جاتی تھیں، مگر میں کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ غرض کی لڑائی میں میں نے بڑا نام کیا، یہ میری ہی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ آزاد پاشا بن بیٹھے۔ یہ تو جانتے بھی نہ تھے کہ لڑائی کس چڑیا کا نام ہے۔

شتاب : مگر یہ تو بتاؤ کہ بندوق سے ناک کیوں کر کاٹی جاتی ہے؟

خوجی : تم ان باتوں کو کیا جانو، یہ سپاہیوں کے سمجھنے کی باتیں ہیں۔

ادھر آزاد مرزا صاحب کے گھر پہنچے تو بیگم صاحب پھولی نہ سمائیں۔ خدمت گار نے آزاد کو جھک کر سلام کیا۔ دونوں دوست کمرے میں جا کر بیٹھے۔ مرزا صاحب نے گھر میں جا کر دیکھا تو بیگم صاحب پلنگ پر پڑی تھیں۔ مہری سے پوچھا تو معلوم ہوا، آج طبیعت کچھ خراب ہے۔ باہر آ کر آزاد سے کہا۔ گھر میں سوتی ہیں اور طبیعت بھی اچھی نہیں۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا۔ آزاد سمجھے کی بیماری محض بہانہ ہے، ہم سے کچھ ناراض ہیں۔

اتنے میں ایک چپراسی نے آ کر مرزا صاحب کو ایک لفافہ دیا۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے

کچھ صلاح کرنے کے لیے انھیں بلایا تھا۔ مرزا صاحب بولے۔ بھائی، اس وقت تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔ مدت کے بعد ایک دوست آئے ہیں، ان کی خاطر تواضع میں لگا ہوا ہوں۔ مگر جب آزاد نے کہا کہ آپ جائیے، شاید کوئی ضروری کام ہو، تو مرزا صاحب نے گاڑی تیار کرائی اور رجسٹرار سے ملنے گئے۔

اِدھر آزاد کے پاس زیبن نے آکر سلام کیا۔

آزاد : کہو زیبن، اچھی رہیں؟

زیبن : حضور کے جان مال کو دعا دیتی ہوں۔ حضور تو اچھے رہے؟

آزاد : بیگم صاحب کیا ابھی آرام ہی میں ہیں؟ اگر اجازت ہو تو سلام کر آؤں۔

زیبن : حضور کے لیے پوچھنے کی ضرورت نہیں، چلیے!

آزاد زیبن کے ساتھ اندر گئے تو کمرے میں قدم رکھتے ہی مہری نے کہا۔ وہیں بیٹھیے، کرسی آتی ہے۔

آزاد : سرکار کہاں ہیں؟ بیگم صاحب کی خدمت میں آداب عرض ہے۔

بیگم : بندگی۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو کہیے، مجھے زیادہ باتیں کرنے کی فرصت نہیں۔

آزاد : خدا خیر کرے، آخر کس جرم میں یہ خفگی ہے؟ کون سا گناہ ہوا؟

بیگم : بس زبان نہ کھلوائیے، غضب خدا کا، ایک خط تک بھیجنا قسم تھا، کوئی اس طرح اپنے عزیزوں کو تڑپاتا ہے؟

آزاد : قصور معاف کیجیے، بے شک گناہ تو ہوا، مگر میں نے سوچا کہ خط بھیج کر مفت میں محبت بڑھانے سے کیا فائدہ، نہ جانے زندہ آؤں یا نہ آؤں، اس لیے ایسی فکر کروں کہ ان کے دل سے بھول ہی جاؤں۔ اگر زندگی باقی ہے تو چٹکیوں مُیں گناہ معاف کرا لوں گا۔

اس فقرے نے بیگم صاحب کے دل پر بڑا اثر کیا۔ سارا غصہ ہوا ہو گیا۔ زیبن کو نیچے بھیجا کہ حقہ بھر لاؤ، خواص کو حکم دیا کہ پان بنواؤ۔ تب میدان خالی پا کر چک اٹھا دی اور بولیں۔ وہ کہاں گئے ہیں؟

آزاد : کسی صاحب نے بلایا ہے، ان سے ملنے گئے ہیں۔ خدا نے مجھے یہ خوب موقع دیا۔

بیگم : کیا کہا، کیا کہا! ذرا پھر تو کہیے گا، ذرا سنوں تو کس چیز کا موقع ملا؟

آزاد : یہی حضور کو سلام کرنے کا۔

بیگم : ہاں، یوں باتیں کیجیے، ادب کے ساتھ۔ حسن آرا کے نام تم نے کوئی خط بھیجا تھا؟ مجھے لکھا ہے کہ جس دن آئیں، فوراً تار سے اطلاع دینا۔

آزاد : اب تو یہی دھن ہے کہ کسی طرح وہاں پہنچوں اور زندگی کے ارمان پورے کروں۔

بیگم : جی نہیں، پہلے آپ کا امتحان ہوگا۔ آپ رنگین آدمی ٹھہرے، آپ کا اعتبار ہی کیا ہے؟

آزاد : افوہ! یہ بدگمانی۔ خیر صاحب، اختیار ہے، مگر ہمارے ساتھ چلنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟

بیگم : نہیں صاحب، یہ ہمارے یہاں کا دستور نہیں۔ بہنوئی کے ساتھ جوان سالیاں سفر نہیں کرتیں۔ وقت پر ان کے ساتھ آ جاؤں گی۔

آزاد : خیر، اتنی عنایت کیا کم ہے۔ اب آپ جا کر پردے میں بیٹھیے، میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔

بیگم : کیوں صاحب، یہی آپ کا عشق ہے؟ اسی بوتے پر امتحان دیجیے گا؟

بیگم صاحب نے وہاں زیادہ دیر تک بیٹھنا مناسب نہ سمجھا۔ آزاد بھی باہر چلے گئے۔ خدمت گار نے حقہ بھر دیا۔ پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پینے لگے تو خیال آیا کہ آج مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، اگر مرزا صاحب مجھے گھورتے دیکھ لیتے تو اپنے دل میں کیا کہتے۔ اب یہاں زیادہ ٹھہرنا غلطی ہے۔ خدا کرے، آج کے چوتھے دن وہاں پہنچ جاؤں۔ بیگم صاحب نے مجھے حقارت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا۔

وہ ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ زیبن نے بیگم صاحب کا ایک خط لا کر انھیں دیا۔ لکھا تھا۔ ابھی ابھی میں نے سنا ہے کہ آپ کے ساتھ دو لیڈیاں آئی ہیں۔ دونوں کمسن ہیں اور آپ بھی جوان۔ آگ اور پھوس کا ساتھ کیا؟ اگر واقعی تم نے ان دونوں کے ساتھ شادی کر لی ہے تو بڑا غضب کیا، پھر امید نہ رکھنا کہ حسن آرا تم کو منھ لگائیں گی۔ تم نے ساری کی کرائی محنت خاک میں ملا دی، اور اگر شادی نہیں کی تو یہاں لائے کیوں؟ تمھیں شرم نہیں آتی؟ حسن آرا غریب تو تمھاری محبت کی آگ میں جلے اور تم سوتوں کے ساتھ لاؤ۔

کیا قہر ہے کیونکر نہ اٹھے درد جگر میں
میری تو بغل خالی ہے اور آپ کے بر میں
ایک آن بھی مجھ سے نہ ملو آٹھ پہر میں
گھر چھوڑ کے اپنا رہو یوں اور کے گھر میں

تم اور غیروں کو ساتھ لاؤ، تمھاری طرح حسن آرا بھی اب تک شادی کر لیتی تو تم کیا بنا لیتے؟ تم کو اتنا بھی خیال نہ رہا کہ حسن آرا کے دل پر کیا اثر ہوگا۔ تمھارے ہزاروں چاہنے والے ہیں تو اس کے گراہک بھی اچھے اچھے شہزادے ہیں۔ میں نے ٹھان لی ہے کہ حسن آرا کو آپ کے حال سے اطلاع دوں، اور کہہ دوں کہ اب وہ آزاد نہیں رہے، اب دو دو بغل میں رہتی ہیں، اس پر بہو بیٹیوں پر بری نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر تم نے میرا اطمنان نہ کر دیا تو پچھتاؤ گے۔

یہ خط پڑھ کر آزاد نے زبین سے کہا۔ کیوں، تم ادھر کی ادھر لگا لگا کر آپس میں لڑواتی ہو؟ تم نے ان سے جا کے کیا کہہ دیا، مجھ سے بھی پوچھ لیا ہوتا۔

زبین : اے حضور، تو میرا اس میں کیا قصور۔ مجھ سے جو سرکار نے پوچھا، وہ میں نے بیان کر دیا۔ اس میں بندی نے کیا گناہ کیا؟

آزاد : خیر، جو ہوا سو ہوا، لاؤ قلم دوات۔

آزاد نے اسی وقت اس خط کا جواب لکھا۔ بیگم صاحب کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں۔ آپ مجھ پر بے وفائی کا الزام لگاتی ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے گا، مگر اکثر مقاموں پر ایسی ایسی پریاں مجھ پر ریجھی ہیں کہ اگر حسن آرا کا سچا عشق نہ ہوتا تو میں ہندستان میں آنے کا نام نہ لیتا، مگر افسوس ہے کہ میری محنت بے کار گئی۔ میرا خدا جانتا ہے، جن جن جنگلوں، پہاڑوں پر میں گیا، کوئی کم گیا ہوگا۔ ہفتوں ایک اندھیری کوٹھری میں قید رہا، جہاں کسی جاندار کی صورت نظر نہ آتی تھی، اور یہ سب اس لیے کہ ایک پری مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور میں انکار کرتا تھا کہ حسن آرا کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ یہ دونوں لیڈیاں جو میرے ساتھ ہیں، انھوں نے مجھ پر بڑے بڑے احسان کیے ہیں۔ گاڑھے وقت میں کام آئی ہیں، ورنہ آج آزاد یہاں نہ ہوتا۔ مگر اتنے پر بھی آپ ناراض ہو رہی ہیں، اسے اپنی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہوں۔ خدا کے لیے کہیں حسن آرا کو نہ لکھ بھیجنا، اور اگر یہی چاہتی ہو کہ میں جان

دوں تو صاف صاف کہہ دو۔ حسن آرا کو لکھنے سے کیا فائدہ، اور کیا لکھوں۔ طبیعت بے چین ہے۔

بیگم صاحب نے یہ خط پڑھا تو غصہ ٹھنڈا ہو گیا، چھم چھم کرتی ہوئی پردے کے پاس کھڑی ہوئیں تو دیکھا۔ آزاد سر پر ہاتھ رکھ کر رو رہے ہیں۔ آہستہ سے پکارا۔ آزاد!

زیبن : حضور، دیکھیے کون سامنے کھڑا ہے۔ ذرا ادھر نگاہ تو کیجیے۔

بیگم: آزاد، جو روئے تو ہمیں کو ہے ہے کرے۔ زیبن، ذرا صراحی تو اٹھا لا، منھ پر دو چھینٹے دے۔

زیبن : حضور، کیا غضب کر رہے ہیں، وہ سامنے کون کھڑا ہے؟

آزاد : (بیگم صاحب کی طرف رخ کر کے) کیا حکم ہے؟

بیگم : میرا تو کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔

آزاد : کوئی بات نہیں۔ خدا جانے، اس وقت کیا یاد آیا۔ آپ کو تکلیف ہوتی ہے، آپ جائیں، میں بالکل اچھا ہوں۔

بیگم : اب چونچلے رہنے دو، منھ دھو ڈالو۔ واہ، مرد ہو کر آنسو بہاتے ہو؟ تم سے تو چھوکریاں اچھی۔ یہ تم لڑائی میں کیا کرتے تھے؟

آزاد : جلاؤ اور اس پر طعنے دو۔

بیگم : کیا خوب، جلانے کی ایک ہی کہی۔ جلاتے تم ہو یا میں؟ ایک چھوڑ دو دو وہاں سے لائے، اوپر سے باتیں بناتے ہو، منھ دکھانے قابل نہیں رکھا اپنے کو۔ حسن آرا نے اڑتی خبر پائی تھی کہ آزاد نے کسی عورت کو بیاہ لیا تو پچھاڑے کھانے لگی۔ ایک تم ہو کہ جوڑی کی جوڑی ساتھ لائے اور اوپر سے کہتے ہو، جلاؤ۔ تمھیں شرم بھی نہیں آتی؟

آزاد : کیا ٹیڑھی کھیر ہے، نہ کھاتے بنے، نہ چھوڑتے بنے۔

بیگم : تو پھر صاف صاف کیوں نہیں بتا دیتے؟

آزاد : بیاہتا بیوی ہیں دونوں، اور کیا کہیں۔

بیگم : اچھا صاحب، بیاہتا بیوی نہیں، دونوں آپ کی بہنیں سہی، اب خوش ہوئے؟ برسوں بعد آئے تو ایک کانٹا ساتھ لے کے۔ بھلا سوچو، میں چپکی ہو رہوں تو حسن آرا کیا کہیں گی کہ واہ بہن، تم نے ہم کو لکھا بھی نہیں۔ لیکن دو میں کیا فائدہ ہوگا تمھیں۔

آزاد : آپ دل لگی کرتی ہیں اور میں چپ ہوں۔ پھر میری بھی زبان کھلے گی۔

بیگم : تم ہم کو صرف اتنا بتلا دو کہ یہ دونوں یہاں کس لیے آئی ہیں، تو میں چپ ہو رہوں۔

آزاد : تو ان دونوں کو یہاں بلا لاؤں؟

بیگم : ان کو آنے دو، ان سے صلاح لے کے جواب دوں گی۔

آزاد : تو کیا آپ ہم میں اور ان میں کوئی فرق سمجھتی ہیں۔ میں تم کو اور حسن آرا کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں۔

بیگم : بس، اب میں کہہ بیٹھوں گی۔ بڑے بے شرم ہو، چھٹے ہوئے بے حیا۔

اتنے میں زیبن نے آکر کہا۔ مرزا صاحب آ گئے۔ بیگم صاحب جھپٹ کر کوٹھے پر ہو رہیں اور آزاد بارہ دری میں آکر لیٹ رہے۔

مرزا : آپ نے ابھی تک حمام کیا یا نہیں؟ بڑی دیر ہو گئی ہے۔ جس طرف جاتا ہوں، لوگ گاڑی روک روک آپ کا حال پوچھنے لگتے ہیں۔ کل شام کو سب لوگ آپ سے ٹاؤن ہال میں ملنا چاہتے ہیں۔ ہاں، یہ تو فرمائیے، یہ دونوں پریاں کون ہیں؟ ایک تو ان میں سے کسی اور ملک کی معلوم ہوتی ہے۔

آزاد : ایک تو روس کی ہیں اور دوسری کوہ قاف کی۔

مرزا : یار، برا کیا۔ حسن آرا سنے گی تو کیا کہے گی؟

اِدھر تو یہ باتیں ہو رہیں تھیں، اُدھر شتاب جان نے خوجی سے کہا۔ ذرا اکیلے میں چلیے، آپ سے کچھ کہنا ہے۔ خوجی نے کہا۔ خدا کی قدرت ہے کہ معشوق تک ہم سے اکیلے میں چلنے کو کہتے ہیں۔ جو حکم ہو، بجا لاؤں۔ اگر توپ کے مہرے پر بھیج دو تو ابھی چلا جاؤں۔ یہ تو کہو، تمھارے سبب سے چپ ہوں، نہیں اب تک دس پانچ کو قتل کر چکا ہوتا۔

یہ کہہ کر خواجہ صاحب جھپٹ کر باہر نکلے۔ اتفاق سے ایک گاڑی وان آہستہ آہستہ گاڑی ہانکتا چلا جاتا تھا۔ خوجی اسے گالیاں دینے لگے۔ بھلا بے گیدی، بھلا، خبردار جو آج سے یہ بے ادبی کی۔ تو جانتا نہیں، ہم کون ہیں؟ ہمارے مکان کی طرف سے گاتا ہوا نکلتا ہے۔ ہمیں بھی رعایا سمجھ لیا ہے۔ بھلا بی شتاب جان گاڑی کی گھڑگھڑاہٹ سنیں گی تو ان کے کانوں کو کتنا ناگوار لگے گا! گاڑی والا پہلے تو گھبرایا کہ یہ ماجرا کیا ہے! گاڑی روک کر خوجی کی طرف

گھورنے لگا۔ مگر جب خواجہ صاحب جھپٹ کر گاڑی کے پاس پہنچے، اور چاہا کہ لکڑی جمائیں کہ اس نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔ اب آپ بٹ پٹا رہے ہیں اور وہ چھوڑتا ہی نہیں۔

خوجی : کہہ دیا، خیر اسی میں ہے کہ ہمارا ہاتھ چھوڑ دو، ورنہ بہت پچھتاؤ گے۔ میں جو بگڑوں گا تو ایک پلٹن کے منائے بھی نہ مانوں گا۔

گاڑی وان : ہاتھ تو اب تمھارے چھڑائے نہیں چھوٹ سکتا۔

خوجی : لانا تو میری کرولی۔

گاڑی وان : لانا تو میرا ڈھائی تلے والا چمرودھا۔

خوجی : شریفوں میں ایسی باتیں نہیں ہوتیں۔

گاڑی وان : شریف کبھی تمھارے باپ بھی تھے کہ تمھیں شریف ہوئے؟

خوجی : اچھا، ہاتھ چھوڑ دو۔ ورنہ اتنی کرولیاں بھوکوں گا کہ عمر بھر یاد کرو گے۔

گاڑی وان نے اس پر جھلا کر خوجی کا ہاتھ مروڑنا شروع کیا۔ خوجی کی جان پر بن آئی، مگر کیا کریں! سب سے زیادہ خیال اس بات کا تھا کہ کہیں شتاب جان نہ دیکھ لیں، نہیں تو بالکل نظروں سے گر جاؤں۔

خوجی : کہتا ہوں، ہاتھ چھوڑ دے، میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔

گاڑی وان : میں تو اپنا گاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ آپ نے گالیاں کیوں دیں؟

خوجی : ہمارے گھر کی طرف سے کیوں گاتے جاتے تھے؟

گاڑی وان : آپ منع کرنے والے کون؟ کیا کسی کی زبان بند کر دیجیے گا؟

بارے کئی آدمیوں نے گاڑی وان کو سمجھ کر خوجی کا ہاتھ چھڑایا۔ خوجی جھاڑ پونچھ کر اندر گئے اور شتاب جان سے بولے۔ میں بات پیچھے کرتا ہوں، کرولی پہلے بھونکتا ہوں۔ پاجی گاتا ہوا جاتا تھا۔ میں نے پکڑ کر اتنی چپتیں لگائیں کہ بھُرتا ہی بنا دیا۔ میرے منھ سے آگ برستی ہے۔ اچھا، اب یہ فرمایئے کہ جس نیک بخت بدنصیب سے تمھاری شادی پہلے ہوئی تھی وہ اب کہاں ہے اور کیسا آدمی تھا؟

شتاب جان : یہ تو میں پیچھے بتلاؤں گی۔ پہلے یہ فرمایئے کہ اس کو نیک بخت کہا تو بدنصیب کیوں کہا؟ جو نیک بخت ہے وہ بدنصیب کیسے ہو سکتا ہے؟

خوجی : قسم خدا کی، میری باتیں جواہرات میں تولنے کے قابل ہیں۔ نیک بخت اس لیے کہاں کہ تم جیسی بیوی پائی۔ بدنصیب اس لیے کہا کہ یا تو وہ مر گیا یا تم نے اسے نکال باہر کیا۔

شتاب جان : اچھا سنیے، پہلے میری شادی ایک خوبصورت جوان کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس کی نظر اس پر پڑی، رتجھ گیا۔

خوجی : یہاں بھی تو وہی حال ہے۔ گھر سے نکلنا مشکل ہے۔

شتاب جان : حاضر جواب ایسا تھا کہ بات کی بات میں غزلیں کہہ ڈالتا تھا۔

خوجی : یہ بات مجھ میں بھی ہے۔ دس ہزار شعر ایک منٹ میں کہہ دوں، ایک کم نہ ایک زیادہ!

شتاب جان : میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم اس سے کسی بات میں کم ہو۔ اول تو جوان گبھرو، ابھی مسیں بھیکتی ہیں۔ آدمی کیا، شیر معلوم ہوتے ہو۔ پھر سپاہی آدمی ہو، اس پر شاعر بھی ہو۔ بس ذرا جھلّے ہو، اتنی خرابی ہے۔

خوجی : اگر میرا حکم مانتی ہو تو موم ہو جاؤں گا۔ ہاں، لڑوگی تو ہمارا مزاج بے شک جھلا ہے۔

شتاب جان : میاں، میں لونڈی بن کے رہوں گی۔ مجھ سے لڑائی جھگڑے سے واسطہ؟ مگر یہ بتاؤ کہ رہو گے کہاں؟ میں بمبئی میں رہوں گی۔ تمھارے ساتھ ماری ماری نہ پھروں گی۔

خوجی : تم جہاں رہوگی، وہیں میں رہوں گا، مگر......

شتاب جان : اگر مگر میں کچھ نہیں جانتی۔ ایک تو تم کو افیم نہ کھانے دوں گی۔ تم نے افیم کھائی اور میں نے کسی بہانے سے زہر کھلا دیا۔

خوجی : اچھا نہ کھائیں گے۔ کچھ ضروری ہے کہ افیم کھائے ہی۔ نہ کھائی، پی لی، چلو چھٹی ہوئی۔

شتاب جان : پینے بھی نہ دوں گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ نوکری ضرور کرو، بغیر نوکری کے گزرا نہیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ میرے دوست اور رشتے دار جو آتے ہیں، بدستور آیا کریں گے۔

خوجی : واہ، کہیں آنے نہ دوں۔ ان بدمعاشوں کو پھٹکنے نہ دوں گا۔

شتاب جان : اچھا تو کل میرے گھر چلو، وہیں ہمارا نکاح ہوگا۔

دوسرے دن خوجی شتاب جان کے ساتھ اس کے گھر چلے۔ بمبئ کے کئ اسٹیشن کے بعد شتاب جان گاڑی سے اتر پڑیں اور خوجی سے کہا۔ اب آپ کے پاس جتنے روپے پیسے ہوں، چپکے سے نکال کر رکھ دو۔ میرے گھر والے بنا نذرانہ لیے شادی نہ کریں گے۔

خوجی نے دیکھا کہ یہاں برے پھنسے۔ اب اگر کہتے ہیں کہ پاس روپے نہیں ہیں تو ہتھی ہوتی ہے۔ انھوں نے سمجھا تھا کہ شادی کا دو گھڑی مذاق رہے گا، مگر اب جو دیکھا کہ سچ مچ شادی کرنی پڑے گی تو چوکنے ہوئے۔ بولے۔ میں تو دل لگی کرتا تھا جی۔ شادی کیسی اور بیاہ کیسا؟ کچھ اوپر ساٹھ برس کا تو میرا سن ہے، اب بھلا شادی کیا کروں گا۔ تم ابھی جوان ہو، تم کو سینکڑوں جوان مل جائیں گے۔

شتاب جان : تم کو اس سے مطلب کیا! اس کی مجھے کتنی فکر ہونی چاہیے۔ جب میرا تم پر دل آیا اور تم بھی نکاح کرنے پر راضی ہوئے تو اب انکار کرنا کیا معنی۔ اچھے ہو تو میرے، برے ہو تو میرے۔

میاں خوجی گھبرائے، سٹی پٹی بھول گئی۔ اپنی عقل پر بہت پچھتائے اور اسی وقت آزاد کے نام خط لکھا۔ میرے بڑے بھائی صاحب، سلامت۔ میری آنکھ سے اب غفلت کا پردہ اٹھ گیا۔ میں کچھ اوپر ساٹھ برس کا ہوں گا۔ اس سن میں نکاح کا خیال سرا سر غیر مناسب ہے مگر شتاب جان مجھ پر بری طرح عاشق ہو گئیں ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جس طرح میرا جسم چور ہے اسی طرح میری صورت بھی چور ہے۔ مجھے کوئی دیکھے تو سمجھے کہ ہڈیاں تک گل گئی ہیں، مگر آپ خوب جانتے ہیں کہ انھیں ہڈیوں کے بل پر میں نے مصر کے نامی پہلوان کو لڑا دیا اور بوا زعفران جیسی دیونی کی لاتیں سہیں۔ دوسرا ہوتا، تو کچومر نکل جاتا۔ اسی طرح میری صورت میں بھی یہ بات ہے کہ جو دیکھتا ہے، عاشق ہو جاتا ہے۔ میں خود سوچتا ہوں کہ یہ کیا بات ہے، مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر، اب آپ سے یہ عرض ہے کہ خط دیکھتے میری مدد کے لیے دوڑو، ورنہ موت کا سامنا ہے۔ سوچا تھا کہ شادی نہ ہوگی تو لوگ ہنسیں گے کہ آزاد تو دو دو ساتھ لائے اور خواجہ صاحب موچی کے موچی رہے۔ لیکن یہ کیا معلوم تھا کہ یہ شادی میرے لیے زہر ہوگی۔ ذرا شرطیں سنیے۔ افیم چھوڑ دو اور نوکری کر لو۔ اب بتائیے کہ افیم چھوڑ دوں تو زندہ کیسے رہوں؟ اب رہی نوکری۔ یہاں لڑکپن سے فقرے بازوں کی صحبت میں

رہے۔ گپیں اڑانا، باتیں بنانا، افیم کی چسکی لگانا ہمارا کام ہے۔ بھلا ہم سے نوکری کیا ہوگی، اور کرنا بھی چاہیں تو کس کی نوکری کریں۔ سرکاری نوکری تو ملنے سے رہی، وہاں تو آدمی پچپن سال کا ہوا اور نکالا گیا، اور یہاں پچپن اور دس پینسٹھ برس کے ہیں۔ ہم تو اسی کام کے ہیں کہ کسی نواب زادے کی صحبت میں رہیں اور اس کو ایسا پکا رئیس بنا دیں کہ وہ بھی یاد کرے، چنڈوں کا قوام ہم سے بنوالیں افیم ایسی پلائیں کہ عمر بھر یاد کریں۔ رہا یہ ہے کہ ہم جمع خرچ لکھیں، یہ ہم سے نہ ہوگا، جس کو اپنا کام غارت کرانا ہو وہ ہمیں نوکر رکھے۔ اس لیے اگر میرا گلا یہاں سے چھڑا دو تو بڑا احسان ہو۔ خدا جانے، تم لوگ مجھے کیوں خاک میں ملاتے ہو، تمھارے ساتھ روم گیا، تمھاری طرف سے لڑا بھڑا، وقت بے وقت کام آیا اور اب تم مجھے ذبح کیے دیتے ہو۔

یہ خط لکھ کر شتاب جان کو دیا کہ آزاد کے پاس جلد پہنچا دو۔ شادی کے معاملے ان سے صلاح کرنی ہے۔

شتاب جان : صلاح کی کیا ضرورت ہے بھلا؟

خوجی : شادی بیاہ کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے، ذرا آدمی کو اس بارے میں اونچ نیچ سوچ لینی چاہیے، میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ تمھاری شرطیں منظور کروں یا نہیں۔

شتاب جان : اچھا جاؤ، میں کوئی شرط نہیں کرتی۔

خوجی : تب منظور، دل سے منظور، مگر یہ خط تو بھیج دو۔

اب سنیے کہ شتاب جان کے ساتھ ایک خاں صاحب بھی تھے۔ مالوے کے رہنے والے۔ انھوں نے خوجی کو دو دن میں اتنی افیم پلا دی، جتنی وہ چار دن میں بھی نہ پیتے۔ سفر میں صحت بھی کچھ بگڑ گئی تھی۔ دو ہی دن میں چر مر ہو گئے۔ لیٹے لیٹے خاں صاحب سے بولے۔ جناب، دوسرا اتنی افیم پیتا تو بول جاتا، کیا مجال کہ اس شہر میں کوئی میرا مقابلہ کر سکے، اور اس شہر پر کیا موقوف ہے، جہاں کہیے، مقابلے کے لیے تیار ہوں، کوئی تولے بھر پیے تو میں سیر بھر پی جاؤں۔

خان صاحب : مگر استاد، آج کچھ انجر پنجر ڈھیلے نظر آتے ہیں، شاید افیم زیادہ ہوگئی۔

خوجی : واہ، ایسا کہیں کہیے گا بھی نہیں۔ جب چاہے، ساتھ بیٹھ کر پی لیجیے۔

شام تک خوجی کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ شتاب جان نے انھیں دق کرنا شروع

کیا۔ اے آگ لگے تیرے سونے پر مردوئے، کب تک سوتا رہے گا۔

خوجی : سونے دو، سونے دو۔

شتاب : بھلا خیر، ہم تو سمجھے تھے، خبر آ گئی۔

خان : کہتی کس سے ہو، وہ پہنچے خدا گنج۔

شتاب : اے پھر پینک آ گئی، ابھی تو زندہ ہو گیا تھا۔

خان : (کان کے پاس جا کر) خواجہ صاحب!

خوجی : ذرا سونے دو بھائی۔

شتاب : میرے یہاں پینک والوں کا کام نہیں ہے۔

خان : خواجہ صاحب، ارے خواجہ صاحب، اے بولتے ہی نہیں! چل بسے!

خواجہ صاحب کی حالت جب بہت خراب ہو گئی، تو ایک حکیم صاحب بلائے گئے۔ انھوں نے کہا۔ زہر کا اثر ہے۔ نسخہ لکھا۔ بارے کچھ رات جاتے جاتے نشہ ٹوٹا۔ خوجی کی آنکھیں کھلیں۔

شتاب : میں تو سمجھی تھی، تم چل بسے۔

خوجی : ایسا نہ کہو بھائی، جوانی کی موت بری ہوتی ہے۔

شتاب : مرمڑی کاٹے، ابھی جوان بنا ہے۔

خوجی : بس زبان سنبھالو، ہم سمجھ گئے کہ تم کوئی بھٹیاری ہو۔ میں اگر اپنے حالات بیان کروں تو آنکھیں کھل جائیں۔ ہم امیر کبیر کے لڑکے ہیں۔ لڑکپن میں ہمارے دروازے پر ہاتھی بندھتا تھا، تم جیسی بھٹیاریوں کو میں کیا سمجھتا ہوں۔

یہ کہہ کر آپ مارے غصے کے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ سمجھتے تھے کہ شتاب جان مجھ پر عاشق ہے ہی، اس سے بھلا کیسا رہا جائے گا، ضرور مجھے تلاش کرنے آئے گی، لیکن جب بہت دیر گزر گئی اور شتاب جان نے خبر نہ لی تو آپ لوٹے۔ دیکھا تو شتاب جان کا کہیں پتہ نہیں، گھر کا کونا کونا ٹٹولا، مگر شتاب جان وہاں کہاں؟ اسی محلے میں ایک حبشن رہتی تھی۔ خوجی نے جا کر اس سے اپنا سارا قصہ کہا، تو وہ ہنس کر بولی۔ تم بھی کتنے احمق ہو۔ شتاب جان بھلا کون ہے؟ تم کو مرزا صاحب اور آزاد نے چکما دیا ہے۔

خوجی کو آزاد کی بے وفائی کا بہت ملال ہوا۔ جس کے ساتھ اتنے دنوں تک جان جوکھم

کرکے رہے، اس نے ہندستان میں لاکے انھیں چھوڑ دیا۔ خوب روئے، تب حبشن سے باتیں کرنے لگے۔

خوجی : قسمت کہاں سے ہمیں کہاں لائی؟

حبشن : آپ کا گھونسلا کس جھاڑی میں ہے؟

خوجی : ہم خوجستان کے رہنے والے ہیں۔

حبشن : یہ کس جگہ کا نام لیا؟ خوجستان تو کسی جگہ کا نام نہیں معلوم ہوتا۔

خوجی : تو کیا ساری دنیا تمھاری دیکھی ہوئی ہے؟ خوجستان ایک صوبہ ہے، شکرقند اور جلیبستان کے قریب۔ بتاشا ندی اسے سیراب کرتی ہے۔

حبشن : بھلا شکرقند بھی کوئی دیس ہے؟

خوجی : ہے کیوں نہیں، سمرقند کا چھوٹا بھائی ہے۔

حبشن : وہاں آپ کس محلے میں رہتے تھے؟

خوجی : حلوہ پور میں۔

حبشن : تب تو آپ بڑے میٹھے آدمی ہیں۔

خوجی : میٹھے تو نہیں، ہیں تو تیکھے، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، مگر میٹھی نظر کے عاشق ہیں۔

خواہش نہ قند کی ہے، نہ طالب شکر کے ہیں
چسکے پڑے ہوئے تیری میٹھی نظر کے ہیں

حبشن : تو آپ بھی میرے عاشقوں میں ہیں؟

خوجی : عاشق کوئی اور ہوں گے، ہم معشوقوں کے معشوق ہیں۔ ساری دنیا چھان ڈالی، پر جہاں گیا، معشوقوں کے مارے ناک میں دم ہو گیا۔ بوا زعفران نامی ایک عورت ہم پر اتنی ریجھی کہ پٹے پکڑ کے دے جوتا دے جوتا مار کے اڑا دیا۔ مگر ہماری بہادری دیکھو کہ اُف تک نہ کی۔

حبش : ہم کو یقین کیونکر آئے؟ ہم تو جب جانیں کہ سر جھکاؤ اور ہم دو چار لگائیں، پھر دیکھیں، کیسے نہیں اُف کرتے۔

خوجی : ہاں، ہم حاضر ہیں، مگر آج ابھی افیم یوں ہی سی پی ہے۔ جب نشے جمے تب

البتہ آزمالو۔

حبشن : اے ہے، پھر نگوڑی افیم کا نام لیا، مرتے مرتے بچے اور اب تک افیم ہی افیم کہتے جاتے ہو؟

خوجی : تم اس کے مزے کیا جانو۔ افیم کھانا فقیری ہے۔ غرور کو تو یہ خاک میں ملا دیتی ہے۔ میں کتنی ہی جگہ پٹا، کبھی جوتیاں کھائی، کبھی کوئی کانجی ہاوس لے گیا، مگر ہم نے کبھی جواب نہ دیا۔

حبشن چلی گئی تو خوجی صاحب نے ایک ڈولی منگوائی اور اس میں بیٹھ کر چنڈو خانے پہنچے۔ لوگوں نے انھیں دیکھا تو چکرائے کہ یہ نیا پنچھی کون پھنسا۔

خوجی : سلام علیکم بھائیوں!

امامی : علیکم بھائی، علیکم۔ کہاں سے آنا ہوا؟

خوجی : ذرا ٹکنے دو، پھر کہوں۔ دو برس لڑائی پر رہا، جب دیکھا مورچابندی، مر مٹا، مگر نام بھی وہ کیا کہ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔

امامی : لڑائی کیسی؟ آج کل تو کہیں لڑائی نہیں ہے۔

خوجی : تم گھر میں بیٹھے بیٹھے دنیا کا کیا حال جانو۔

قادر : کیا روم روس کی لڑائی سے آتے ہو کیا؟

امامی : اجی، یہ نہ کہیے، ان کو ساری دنیا کا حال معلوم رہتا ہے۔ کوئی بات ان سے چھپی تھوڑی ہے۔

قادر : روم والے نے روس کے بادشاہ سے کہا کہ جس طرح تمھارا چچا حکیمی کوڑی دیتا تھا، اسی طرح تم بھی دیا کرو، مگر اس نے نہ مانا۔ اسی بات پر تکرار ہوئی، تو روم والے نے کہا، اچھا، اپنے چچا کی قبر میں چلو اور پوچھ دیکھو، کیا آواز آتی ہے۔ بس جناب، سننے کی بات ہے کہ روم والے نے نہ مانا، روم کے بادشاہ کے پاس حضرت سلیمان کی انگوٹھی تھی۔ انھوں نے جو اسے ہوا میں اچھالا، تو سینکڑوں جن حاضر ہو گئے۔ بادشاہ نے کہاں کہ روم میں چاروں طرف آگ لگا دو۔ چاروں طرف آگ لگ گئی۔ تب روس کے بادشاہ نے وزیروں کو جمع کر کے کہا، آگ بجھاؤ، بس سوا کروڑ بھشتی مشکیں بھر بھر کے دوڑے۔ ایک ایک مشک میں دو دو لاکھ من پانی آتا تھا۔

خوجی : کیوں صاحب، یہ آپ سے کس نے کہا ہے؟

امامی : اجی، یہ نہ پوچھو، ان سے فرشتے سب کہہ جاتے ہیں۔

قادر : بس صاحب، سننے کی باتیں ہیں کہ سوا دو کروڑ مشکیں ملک کے چاروں کونوں پر پڑتی تھیں، مگر آگ بڑھتی ہی جاتی تھی۔ تب بادشاہ نے حکم دیا کہ دو کروڑ لاکھ بھشتے کام کریں اور مشکوں میں چھبیس چھبیس کروڑ من پانی ہو۔

خوجی : او گیدی، کیوں اتنا جھوٹ بولتا ہے؟

شبراتی : میاں سننے دو بھائی، عجب آدمی ہو۔

خوجی : اجی، میں تو سنتے سنتے پاگل ہو گیا۔

قادر : آپ لکھنؤ کے مہین آدمی، ان ملکوں کا حال کیا جانیں۔ روم، روس، توران، انوپ شہر کا حال ہم سے سنیے۔

امامی : وہاں کے لوگ بھی دیو ہوتے ہیں دیو!

قادر : روس کے بادشاہ کی خوراک کا حال سنو تو چکرا جاؤ۔ سویرے منھ اندھیرے 6 بکروں کی یخنی، چار بکروں کے کباب، دس مرغ کا پلاؤ اور دو مرلیے ترکیب سے کھاتے ہیں، اور 9 بجے کے وقت سو مرغوں کا شوربہ اور دس سیر ٹھنڈا پانی، بارہ بجے جواہرات کا شربت، کبھی پچاس من، کبھی ساٹھ من، چار بجے دو کچے بکرے، دو کچے ہرن، شام کو شربت کا ایک پیپا اور پہر رات گئے گوشت کا ایک چھکڑا۔

امامی : جب تو طاقتیں ہوتی ہیں کہ سو سو آدمیوں کو ایک آدمی مار ڈالتا ہے۔ ہندستان کا آدمی کیا کھا کر لڑے گا۔

شبراتی : ہندستان میں اگر ہاضمے کی طاقت کچھ ہے تو چنڈو کے سبب سے، نہیں تو سب کے سب مر جاتے۔

امامی : سنا، روس والے ہاتھی سے اکیلے لڑ جاتے ہیں۔

قادر : ہم سے سنو، دس ہاتھی ہوں اور ایک روسی تو وہ دسوں کو مار ڈالے گا۔

خوجی : آپ روس کبھی گئے ہیں؟

قادر : اجی ہم گھر بیٹھے ساری دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔

خوجی : ہم تو ابھی لڑائی کے میدان سے آتے ہیں، ہم نے تو وہاں ایک ہاتھی بھی نہ

دیکھا۔

قادر : روم والوں نے جب آگ لگا دی، تو وہ گیارہ برس، گیارہ مہینے، گیارہ دن، گیارہ گھنٹے جلا کی۔ اب جاکے ذری ذری آگ بجھی ہے، نہیں تو عجب نقشہ تھا کہ سارا ملک جل رہا ہے اور پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔ روم والے جب رات کو سوتے ہیں تو ہر مکان میں دو دیوں کا پہرہ رہتا ہے۔

خوجی : ارے یارو، اس جھوٹ پر خدا کی مار، ہم برسوں رہے، ایک دیو بھی نہ دیکھا۔

قادر : آپ کی تو صورت ہی کہے دیتی ہے کہ آپ ضرور گئے ہوں گے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو گھر کے باہر قدم نہیں رکھا۔

خوجی سمجھے تھے کہ چنڈو خانے میں چل کر اپنے سفر کا حال بیان کریں گے اور سب کو بند کر دیں گے، چنڈو خانے میں ان کی طوطی بولنے لگے گی، مگر یہاں جو آئے تو دیکھا کہ ان کے بھی چچا موجود ہیں۔ جھلا کر پوچھا، بتلاؤ تو، روم کے پائے تخت کا کیا نام ہے؟

قادر : واہ، اس میں کیا رکھا ہے، بھلا سا نام تو ہے، ہاں مرض بان۔

خوجی : اس نام کا تو وہاں کوئی شہر ہی نہیں۔

قادر : اجی، تم کیا جانو۔ مرض بان وہ شہر ہے جہاں پہاڑوں پر پریاں رہتی ہیں۔ وہاں پہاڑوں پر بادل پانی پی پی کر جاتے ہیں اور سب کو پانی پلاتے ہیں۔

خوجی : تو وہ کوئی دوسرا روم ہوگا۔ جس روم سے میں آتا ہوں وہ اور ہے۔

قادر : اچھا بتاؤ، روم کے بادشاہ کا کیا نام ہے؟

خوجی : سلطان عبد الحمید خان۔

قادر : بس بس، رہنے دیجیے، آپ نہیں جانتے، اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم روم سے آتے ہیں۔ بھلا لڑائی کا کیا نتیجہ ہوا، یہی بتائیے؟

خوجی : پلونا کی لڑائی میں ترک ہار گئے اور روسیوں نے فتح پائی۔

قادر : کیا بکتا ہے بے ہودہ، خبردار جو ایسا کہا ہوگا تو اتنے جوتے لگاؤں گا کہ بھرکس ہی نکل جائے گا۔

امامی : ہمارے بادشاہ کے حق میں بری بات نکالتا ہے، بے ادب کہیں کا۔ بچہ، یہاں ایسی باتیں کروگے تو پٹ جاؤگے۔

خوجی : سنو جی ہم فوجی آدمی ہیں۔

قادر : اب زیادہ بولو گے تو اٹھ کر کچومر ہی نکال دوں گا۔

شبراتی : یہ ہیں کہاں کے، ذرا صورت تو دیکھو، معلوم ہوتا ہے، قبر سے نکل بھاگا ہے۔

خوجی کو سب نے مل کر ایسا ڈپٹا کہ بے چارے کرولی اور طمنچہ بھول گئے۔ گئے تو بڑے زعم میں تھے کہ چنڈو خانے میں خوب ڈینگ ہانکیں گے، مگر وہاں لینے کے دینے پڑ گئے۔ چپکے سے چنڈو کے چھینٹے اڑائے اور لمبے ہوئے۔ راستے میں کیا دیکھتے ہیں کہ بہت سے آدمی ایک جگہ کھڑے ہیں۔ آپ نے گھس کر دیکھا تو ایک پہلوان بیچ میں بیٹھا ہے اور لوگ کھڑے اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہے ہیں۔ خوجی نے سمجھا کہ ہم نے بھی تو مصر کے پہلوان کو پٹکا تھا، ہم کیا کسی سے کم ہیں؟ اس زعم میں آپ نے پہلوان کو للکارا۔ بھائی پہلوان، ہم اس وقت اتنے خوش ہیں کہ پھولے نہیں ساتے۔ مدت کے بعد آج اپنا جوڑ دار پایا۔

پہلوان : تم کہاں کے پہلوان ہو بھائی صاحب؟

خوجی : یار، کیا بتائیں۔ اپنے ساتھیوں میں اب کوئی رہا ہی نہیں۔ اب تو کوئی پہلوان جچتا ہی نہیں۔

پہلوان : استاد، کچھ ہم کو بتاؤ۔

خوجی : اجی، تم خود استاد ہو۔

پہلوان : آپ کس کے شاگرد ہیں؟

خوجی : شاگرد تو بھائی، کسی کے نہیں ہوئے۔ مگر ہاں، اچھے اچھے استادوں نے لوہا مان لیا۔ ہندستان سے روم تک اور روم سے روس تک سیر کر آیا۔ تم آج کل کہاں رہتے ہو؟

پہلوان : آج کل ایک نواب صاحب کے یہاں ہیں۔ تین روپیہ روز دیتے ہیں اور ایک بکرا، آٹھ سیر دودھ اور دو سیر گھی بندھا ہے۔ نواب امجد علی نام ہے۔

خوجی : بھلا وہاں چنڈو کی بھی چچا رہتی ہے؟

پہلوان : کچھ مت پوچھیے بھائی صاحب، دن رات۔

خوجی : بھلا وہاں مستیا بیگ بھی ہیں؟

پہلوان : جی ہاں ہیں، آپ کیسے جان گئے؟

خوجی : اجی، وہ کون سا نواب ہے جس کی ہم نے مصاحبی نہ کی ہو۔ نواب امجد علی کے

یہاں برسوں رہا ہوں۔ بٹیروں کا اب بھی شوق ہے یا نہیں؟

پہلوان : اجی، ابھی تک سف شکر، کا ماتم ہوتا ہے۔

خوجی : تمھارا کب تک جانے کا ارادہ ہے؟

پہلوان : میں تو آج ہی جا رہا ہوں۔

خوجی : تو بھائی، ہم کو بھی ضرور لیتے چلو۔ ہم اپنا کرایہ دے دیں گے۔

پہلوان : تو چلیے، میرا اس میں حرج ہی کیا ہے۔ ہم کو نواب صاحب نے صرف دو دن کی چھٹی دی تھی۔ کل یہاں داخل ہوئے، آج دنگل میں کشتی نکالی اور شام کو ریل پر چل دیں گے۔ ہمارے ساتھ مستیا بیگ بھی ہیں۔

شام کو پہلوان کے ساتھ خوجی اسٹیشن پر آئے۔ پہلوان نے کہا۔ وہ دیکھیے مرزا صاحب کھڑے ہیں، جا کر مل لیجیے، خواجہ آہستہ آہستہ گئے اور پیچھے سے مرزا صاحب کی آنکھیں بند کر لیں۔

مرزا : کون ہے بھائی، موئی مسمات ہیں کیا؟ ہاتھ تو ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔

پہلوان : کچھ سمجھ میں نہیں آتا، مگر ہیں کوئی مسمات۔

خوجی : بھلا گیدی، بھلا، ابھی سے بھول گیا، کیوں؟

مرزا : اخواہ، خواجہ صاحب ہیں! کہو بھائی خوجی، اچھے تو رہے؟

خوجی : خوجی کہیں اور رہتے ہوں گے۔ اب ہمیں خواجہ صاحب کہا کرو۔

مرزا : ارے کمبخت، گلے تو مل لے۔

خوجی : سرکار کیسے ہیں، گھر میں تو خیر و عافیت ہے؟

مرزا : ہاں، سب خدا کا فضل ہے، بیگم صاحب پر کچھ آسیب تھا، مگر اب اچھی ہیں۔ کہوں، تم نے تو خوب نام پیدا کیا۔

خوجی : نام، ارے ہم میجر تھے۔

مرزا : سرکار کو اس لڑائی کے زمانے میں اخبار سے بڑا شوق تھا۔ آزاد کو تو سب جانتے ہیں، مگر تمھارا حال جب سے پڑھا تب سے سرکار کو اخباروں کا اعتبار جاتا رہا۔ کہتے تھے کہ سمندر کی صورت دیکھ کر اس کا جگر کیوں نہ پھٹ گیا۔ بھلا اسے لڑائی سے کیا واسطہ۔

خوجی : اب اس کا حال تو ان لوگوں سے پوچھو جو مورچوں پر ہمارے شریک تھے۔ تم

مزے سے بیٹھے بیٹھے ٹکڑے اڑایا کیے، تم کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ مگر بھائی، نشوں میں نشہ شراب کا۔ ادھر ڈنکے پر چوٹ پڑی، ادھر سپاہی کمر کس کر تیار ہو گئے۔

مرزا : اب سرکار کے سامنے نہ کہنا کہ شراب پی تھی، نہیں کھڑے کھڑے نکال دیے جاؤ گے۔

خوجی : اجی، اب تو سرکار کے باپ کے نکالے بھی نہیں نکل سکتے۔

مرزا : ایک بار تو اخبار میں لکھا تھا کہ خوجی نے شادی کر لی ہے۔

خوجی : ارے یار، اس کا حال نہ پوچھو، اپنی شکل وصورت کا حال تو ہم کو باہر جا کر معلوم ہوتا۔ جس شہر میں نکل گئے، کروڑوں عورتیں ہم پر عاشق ہو گئیں۔ خاص کر ایک کمسن نازنین نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا۔

مرزا : تو آپ کی صورت پر سب عورتیں جان دیتی تھیں؟ کیا کہنا ہے، تم نے بہادری کے کام بھی تو خوب کیے۔

خوجی : بھائی جان، مورچہ پر میری بہادری دیکھتے تو دنگ ہو جاتے۔ خیر، اس پری پر میرے سوا پچاس ترکی افسر بھی عاشق تھے۔ یہ رائے طے پائی کہ جس سے وہ پری راضی ہو اس سے نکاح کرے۔ ایک روز سب بن ٹھن کر آئے، مگر اس شوخ کی نظر آپ کے خادم ہی پر پڑتی تھی۔

مرزا : اے کیوں نہیں، ہزار جان سے عاشق ہو گئی ہوگی۔

خوجی : آو دیکھا نہ تاؤ، اٹھلاتی ہوئی آئی اور میرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اب سنیے، ان سبھوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑکی، کہنے لگے، یوں ہم نہ مانیں گے، جو اس سے نکاح کرے وہ پہلے پچاسوں آدمیوں سے لڑے۔ ہم نے کہا، خیر! تلوار کھینچ کر جو چلا، تو وہ وہ چوٹیں لگائیں کہ سب کے سب بلبلانے لگے۔ بس پری ہم کو مل گئی۔ اب دربار کے رنگ ڈھنگ بیان کرو۔

مرزا : سب تمھاری یاد کیا کرتے ہیں۔ جھمن نے وہ چغل خوری پر کمر باندھی ہے کہ سینکڑوں خدمت گار اور کتنے ہی مصاحبوں کو موقوف کرا دیا۔

خوجی : ایک ہی پاجی آدمی ہے۔ ہم روم گئے، فرانس گئے، ساری دنیا کے رئیس دیکھ ڈالے، مگر نواب سا بھولا بھالا رئیس کہیں نہ دیکھا۔ غضب خدا کا کہ ایک بدمعاش نے جو کہہ

دیا، اس کا یقین ہو گیا، اب کوئی لاکھ سمجھائے، وہ کسی کی سنتے ہی نہیں۔

مرزا: میرا تو اب وہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔

خوجی: اجی، اس جھگڑے کو چولہے میں ڈالو۔ اب ہم تم چل کر اپنا رنگ جمائیں گے۔ تم میری ہوا باندھنا اور ہم دونوں ایک جان دو کابل ہو کر رہیں گے۔

مرزا: میں کہوں گا، خداوند، اب یہ سب مصاحبوں کے سرتاج ہوئے، ساری دنیا میں حضور کا نام کیا۔ مگر تم ذرا اپنے کو لیے رہنا۔

خوجی: اجی، میں تو ایسا بنوں کہ لوگ دنگ ہو جائیں۔

جب گھنٹی بجی اور مسافر چلے تو خوجی بھی پہلوان کی طرح اکڑ کر چلنے لگے۔ ریل کے دو چار ملازموں نے ان پر آوازیں کسنا شروع کیا۔

1۔ آدمی کیا گینڈا ہے، ماشا اللہ، کیا ہاتھ پاؤں ہیں!

2۔ کیوں صاحب، آپ کتنے ڈنڈ پیل سکتے ہیں؟

خوجی: اجی، بیماری نے توڑ دیا، نہیں تو میں ایک پوری ریل پر لد کے جاتا تھا۔

3۔ اس میں کیا شک ہے، ایک ایک ران دو دو من کی ہے۔

خوجی: قسم کھا کے عرض کرتا ہوں کہ اب آدھا نہیں رہا۔ یہ پہلوان ہمارے اکھاڑے کا خلیفہ ہے، اور باقی سب شاگرد ہیں۔ سب ملا کے ہمارے چالیس بیالیس ہزار شاگرد ہوں گے۔

ایک مسافر: دور دور سے لوگ شاگرد کرنے آتے ہوں گے؟

خوجی: دور دور سے۔ اب آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ہندستان سے لے کر روس تک میرے لاکھوں شاگرد ہیں۔ مصر میں ایسا ہوا کہ ایک پہلوان کی شامت آئی، ایک میلے میں ہم کو ٹوک بیٹھا۔ ٹوکنا تھا کہ بندہ بھی چٹ لنگوٹ کس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ لاکھوں ہی آدمی جمع تھے۔ اس کا سامنے آنا ہی تھا کہ میں اسی دم جٹ گیا، داؤں پیچ ہونے لگے۔ اس کے مصری داؤں تھے۔ اور ہمارے ہندستانی داؤں تھے۔ بس دم کی دم میں میں نے اسے اٹھا پٹکا۔

اتنے میں دوسری گھنٹی ہوئی۔ خوجی ایسے بوکھلائے کہ زنانے درجے میں دھنس پڑے۔ وہاں لینا لینا کا غل مچا۔ بھاگے تو پہلے درجے میں گھس گئے، وہاں ایک انگریز نے ڈانٹ

بتائی۔ بارے نکل کر تیسرے درجے میں آئے۔ تھکے ماندے بہت تھے، سوئے تو ساری رات کٹ گئی۔ آنکھ کھلی تو لکھنؤ آ گیا تھا۔ شام کے وقت نواب صاحب کے یہاں داخل ہوئے۔

خوجی : آداب عرض ہے حضور۔

نواب : اخواہ، خوجی ہے! آؤ بھائی آؤ۔

خوجی : حاضر ہوں خداوند، خدا کا شکر ہے کہ آپ کی زیارت ہوئی۔

غفور : خوجی میاں، سلام۔

خوجی : سلام بھائی، سلام، مگر ہم کو خوجی میاں نہ کہنا، اب ہم فوج کے افسر ہیں۔

جھمن : آپ بادشاہ ہوں یا وزیر، ہمارے تو خوجی ہی ہو۔

خوجی : ہاں بھائی، یہ تو ہے ہی۔ حضور کے نمک کی قسم، ملکوں ملکوں اس دربار کا نام کیا۔

نواب : شاباش! ہم نے اخباروں میں تمھاری بڑی بڑی تعریفیں پڑھیں۔

خوجی : حضور، غلام کس لائق ہے۔

جھمن : بھلا یار، تم سمندر میں جہاز پر کیسے سوار ہوئے؟

خوجی : واہ، تم جہاز کی لیے پھرتے ہو۔ یہ مورچوں پر بڑے بڑے میجروں اور جنرلوں سے بھڑ بھڑ پڑے ہیں۔ حضور، پلونا کی لڑائی میں کوئی دس لاکھ آدمی ایک طرف تھے اور ستر سواروں کے ساتھ غلام دوسری طرف تھا، پھر یہ ملاحظہ کیجیے کہ چودہ دن تک برابر مقابلہ کیا اور سب کے چھکے چھڑا دیے۔

جھمن : اتنا جھوٹ، ادھر دس لاکھ، ادھر ستر بھلا کوئی بات ہے۔

خوجی : تم کیا جانو، وہاں ہوتے تو ہوش اڑ جاتے۔

نواب : بھائی، اس میں تو شک نہیں کہ تم نے بڑا نام کیا۔ خبردار آج سے ان کو کوئی خوجی نہ کہے۔ پاشا کے لقب سے پکارے جائیں۔

خوجی : آداب حضور! جھمن گیدی نے منھ کی کھائی نہ آخر۔ رئیسوں کی صحبت میں ایسے پاجیوں کا رہنا مناسب نہیں۔

نواب : کیوں صاحب، ہندستان کے باہر بھی ہم کو کوئی جانتا ہے؟ سچ سچ بتانا بھائی۔

خوجی : حضور، جہاں جہاں غلام گیا، حضور کا نام بادشاہوں سے زیادہ مشہور ہو گیا۔

آزاد ممبئ سے چلے تو سب سے پہلے زینت اور اختر سے ملاقات کرنے کی یاد آئی۔ اس قصبے میں پہنچے تو ایک جگہ میاں خوجی کی یاد آ گئی۔ آپ ہی آپ ہنسنے لگے۔ اتفاق سے ایک گاڑی پر کچھ سواریاں چلی جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہنس کر کہا۔ واہ رے بھلے مانس، کیا دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے کیا؟ آزاد رنگین مزاج آدمی تو تھے ہی۔ آہستہ سے بولے۔ آج ایسی ایسی پیاری صورتیں نظر آئیں تو آدمی کے ہوش ہواس کیوں کر ٹھکانے رہیں۔ اس پر وہ نازنین تنک کر بولی۔ ارے، یہ تو دیکھنے ہی کو دیوانہ معلوم ہوتے تھے، اپنے مطلب کے بڑے پکے نکلے۔ کیوں میاں، یہ کیا صورت بنائی ہے، آدھا تیتر اور آدھا بیٹر؟ خدا نے تم کو وہ چہرہ مہرا دیا ہے کہ لاکھ میں ایک ہو۔ مگر اس شکل و صورت پر جو لمبے لمبے بال ہوں، بالوں میں سولہ روپے والا تیل پڑا ہو، باریک شربتی کا انگرکھا ہو، جالی لوٹ کے کرتے سے گورے گورے ڈنڈ نظر آئیں، چست گھٹنا ہو، پیروں میں ایک اشرفی کا ٹاٹ بافی بوٹ ہو، انگرکھے پر کام دانی کی صدری ہو، سر سے پیر تک عطر میں بسے ہو، مصاحبوں کی ٹولی ساتھ ہو، خدمت گاروں کے ہاتھ میں کابکیں اور بٹریں ہوں اور اس ٹھاٹ کے ساتھ چوک میں نکلو، تو انگلیاں اٹھیں کہ وہ رئیس جا رہا ہے، تب لوگ کہیں کہ اس سج دھج، نک سکھ، کلّے ٹھلّے کا گبھرو جوان دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ سب چھوڑ پٹے کترواکے لنڈور ہو گئے، اے واہ ری آپ کی عقل!

آزاد: ذرا میں تو جانوں کہ کس کی زبان سے یہ باتیں سن رہا ہوں۔ انسان ہم بھی ہیں، پھر انسان سے کیا پردہ؟

نازنین: اچھا، تو آپ بھی انسان ہونے کا دم بھرتے ہیں۔ میڈھکی بھی چلی مداروں کو۔

آزاد: خیر صاحب، انسان نہ سہی۔

نازنین: (پردہ ہٹا کر) اے صاحب لیجیے، بس اب تو چار آنکھیں ہوئیں، اب کلیجے میں ٹھنڈک پہنچی؟

آزاد نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ یہ صورت تو کہیں دیکھی ہے اور اب خیال آتا ہے کہ آواز بھی کہیں سنی ہے۔ مگر اس وقت یاد نہیں آتا کہ کہاں دیکھا تھا۔

نازنین: پہچانا؟ بھلا آپ کیوں پہچاننے لگے! رتبہ پا کر کون کسے پہچانتا ہے؟

آزاد : اتنا تو یاد آتا ہے کہ کہیں دیکھا ہے، پر یہ خیال نہیں آتا کہ کہاں دیکھا ہے۔

نازنین : اچھا، ایک پتہ دیتے ہیں، اب بھی نہ سمجھو تو خدا تم سے سمجھے۔ یاد ہے، کس نے یہ غزل گائی تھی؟

کوئی مجھ سا دیوانہ پیدا نہ ہوگا
ہوا بھی تو پھر ایسا رسوا نہ ہوگا
نہ دیکھا ہو جس نے کہے اس کے آگے
ہمیں لن ترانی سنانا نہ ہوگا

آزاد : اب سمجھ گیا! ظہورن، وہاں کی خیر و عافیت بیان کرو۔ انھیں دونوں بہنوں سے ملنے کے لیے ممبئی سے چلا آرہا ہوں۔

ظہورن : سب خدا کا فضل ہے۔ دونوں بہنیں آرام سے ہیں، اختر کے میاں تو ان کا زیور کھا پی کر بھاگ گئے، اب انھوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ زینت بیگم خوش ہیں۔

آزاد : تو اب ہم ان کے میکے جائیں یا سسرال؟

ظہورن : سسرال نہ جایئے، میکے میں چلیے اور وہاں سے کسی مہری کے زبانی پیغام بھیجئے۔ ہم نے تو حضور کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

آزاد : ہم کو ان دونوں بہنوں کا حال بہت دنوں سے نہیں معلوم ہوا۔

ظہورن : یہ تو حضور، آپ ہی کا قصور ہے، کبھی آپ نے ... پرزہ تک نہ بھیجا۔ جس دن زینت بیگم کے میاں نے ان سے کہا کہ لو، آزاد واپس آتے ہیں تو مارے خوشی کے کھل اٹھیں۔ تو اب آنا ہو آیئے، شام ہوتی ہے۔

تھوڑی دیر میں آزاد زینت بیگم کے مکان پر جا پہنچے۔ ظہورن نے جا کر ان کی چاچی سے آزاد کے آنے کی اطلاع کی۔ اس نے آزاد کو فوراً بلا لیا۔

آزاد : بندگی عرض کرتا ہوں۔ آپ تو اتنے ہی دنوں میں بوڑھی ہو گئیں۔

چاچی : بیٹا، اب ہمارے جوانی کے دن تھوڑے ہی ہیں۔ تم تو خیر و عافیت کے ساتھ آئے؟ آنکھیں تمھیں دیکھنے کو ترس گئیں۔

آزاد : جی ہاں، میں خیریت سے آ گیا۔ دونوں شہزادیوں کو بلوایئے۔ سنا، زینت کی بھی شادی ہو گئی ہے۔

چاچی : ہاں، اب تو دونوں بہنیں آرام سے ہیں۔ اختری کا پہلا میاں تو بالکل نالائق نکلا۔ زیور، گہنا پاتا، سب بیچ کر کھا گیا اور خدا جانے، کدھر نکل گیا۔ اب دوسری شادی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر ہیں۔ ساٹھ تنخواہ ہے اور اوپر سے کوئی چار روپیہ روز ملتا ہے۔ زینت کے میاں اسکول میں پڑھاتے ہیں۔ دوسو کی طلب ہے۔ تمھارے چچا جان تو مجھے چھوڑ کر چل دیے۔

ادھر مہری نے جا کر دونوں بہنوں کو آزاد کے آنے کی خبر دی۔ زینت نے اپنی آپا کو ساتھ لیا اور میکے کی طرف چلی۔ گھر کے اندر قدم رکھتے ہی آزاد سے ہاتھ ملا کر بولی۔ واہ رے بے مروت کے بادشاہ! کیوں صاحب، جب سے گئے ایک پرزہ تک بھیجنے کی قسم کھا لی؟

آزاد : یہ تو نہ کہوں گی کہ سب سے پہلے تمھارے ہی دروازے پر آیا۔ یہ تو فرمائیے کہ یہ پوشاک کب سے اختیار کی؟

زینت : جب سے شادی ہوئی۔ انھیں انگریزی پوشاک بہت پسند ہے۔

آزاد : زینت، خدا گواہ ہے کہ اس وقت جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ ایک تو تم کو دیکھا اور دوسرے یہ خوشخبری سنی کہ تمھارے میاں پڑھے لکھے آدمی ہیں اور تمھیں پیار کرتے ہیں۔ میاں بیوی میں محبت نہ ہو تو زندگی کا لطف ہی کیا۔

اتنے میں اختری بھی آ گئی اور آتے ہی کہا۔ مبارک!

آزاد : آپ کو بڑی تکلیف ہوئی معاف کرنا۔

اختر : میں نے سنا تھا کہ تم نے وہاں کسی سائیسن سے شادی کر لی۔

آزاد : اور تمھیں اس کا یقین بھی ہو گیا؟

اختر : یقین کیوں نہ آتا۔ مردوں کے لیے یہ کوئی نئی بات تھوڑی ہے۔ جب لوگ ایک چھوڑ، چار چار شادیاں کرتے ہیں تو یقین کیوں نہ آتا۔

آزاد : وہ پاجی ہے جو ایک کے سوا دوسری کا خیال بھی دل میں لائے۔

زینت : ایسے میاں بیوی کا کیا کہنا، مگر یہاں تو وہی پاجی نظر آتے ہیں جو بیوی کے ہوتے بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے۔

آزاد : اگر بیوی سمجھدار ہو تو میاں کبھی اس کے قابو سے باہر نہ ہو۔

اختر : یہ تو ہم مان چکے۔ خدا نہ کرے کہ کسی بھلے مانس کا پالا شہدے میاں سے پڑے۔

زینت : جس کے مزاج میں پاجی پن ہو اس سے بیوی کی کبھی نہ پٹے گی۔ میاں صبح سے جائیں تو رات کے ایک بجے گھر میں آئے اور وہ بھی کسی روز آئے، کسی روز نہ آئے۔ بیوی بے چاری بیٹھی اس کی راہ دیکھ رہی ہے۔ بعض تو ایسے بے رحم ہوتے ہیں کہ بات ہوئی اور بیوی کو مار بیٹھے۔

آزاد : یہ تو دوھنیا، جولاہوں کی بات ہیں۔

زینت : نہیں جناب، جو لوگ شریف کہلاتے ہیں ان میں بھی ایسے مردوں کی کمی نہیں ہے۔

اختر : اے چولہے میں جائیں ایسے مرد، جبھی تو بے چاریاں کنویں میں کود پڑتی ہیں، زہر کھا کے سو رہتی ہیں۔

زینت : مجھے خوب یاد ہے کہ ایک عورت اپنے میاں کو ذرا سی بات پر ہاتھ پھیلا پھیلا کوس رہی تھی کہ کوئی دشمن کو بھی نہ کوسے گا۔

آزاد : جہاں ایسے مرد ہیں وہاں ایسی عورتیں بھی ہیں۔

اختر : ایسی بیوی کا منہ لے کے جھلس دے۔

زینت : میرے تو بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے۔

آزاد : میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے میاں اور بیوی میں میل جول کیسے ہو جاتا ہے۔

اس طرح باتیں کرتے کرتے یورپین لیڈیوں کی بات چل پڑی۔ زینت اور اختر نے ہندوستانی عورتوں کی طرف داری کی اور آزاد نے یورپین لیڈیوں کی۔

آزاد : جو آرام یورپ کی عورتوں کو حاصل ہے وہ یہاں کی عورتوں کو کہاں نصیب، دھوپ میں اگر میاں بیوی ساتھ چلتے ہوں تو میاں چھتری لگائے گا۔

اختر : یہاں بھی مہاجنوں کو دیکھو۔ عورتیں دس دس ہزار کا زیور پہن کر نکلتی ہیں اور میاں لنگوٹا لگائے دوکان پر مکھیاں مارا کرتے ہیں۔

آزاد : یہاں کی عورتوں کو تعلیم سے چڑ ہے۔

زینت : اس کا الزام بھی مردوں ہی کی گردن پر ہے۔ وہ خود عورتوں کو پڑھاتے ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ ان کی برابری نہ کرنے لگیں۔

آزاد : ہمارے مکان کے پاس ایک مہاجن رہتے تھے۔ میں لڑکپن میں ان کے گھر کھیلنے جایا کرتا تھا۔ جیسے ہی میاں باہر سے آتا، بیوی چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھ جاتی۔ اگر تم سے کوئی کہے کہ میاں کے سامنے گھونگھٹ کر کے جاؤ تو منظور کرو یا نہیں؟

اختر : واہ، یہاں تو گھر میں قید نہ رہا جائے، گھونگھٹ کیسا؟

آزاد : یورپین لیڈیوں کو گھر کے انتظام کا جو سلیقہ ہوتا ہے، وہ ہماری عورتوں کو کہاں؟

زینت : ہندوستانی عورتوں میں جتنی وفا ہوتی ہے وہ یورپین لیڈیوں میں تلاش کرنے سے بھی نہ ملے گی۔ یہاں ایک پیچھے ستی ہو جاتی ہیں، وہاں مرد کے مرتے ہی دوسری شادی کر لیتی ہیں۔

(105)

وہاں دو دن اور رہ کر آزاد ان لیڈیوں کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور انھیں ہوٹل میں چھوڑ کر نواب صاحب کے مکان پر آئے۔ ادھر وہ گاڑی سے اترے، ادھر خدمت گاروں نے غل مچایا کہ خداوند، محمد آزاد پاشا آ گئے۔ نواب صاحب مصاحبوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ آزاد رپ رپ کرتے ہوئے ترکی وردی ڈاٹے چلے آتے ہیں۔ نواب صاحب جھپٹ کر ان کے گلے لپٹ گئے اور بولے۔ بھائی جان، آنکھیں تمھیں ڈھونڈتی تھیں۔

آزاد : شکر ہے کہ آپ کی زیارت نصیب ہوئی۔

نواب : اجی، اب یہ باتیں نہ کرو، بڑے بڑے انگریز حکام تم سے ملنا چاہتے ہیں۔

مصاحب : بڑا نام کیا۔ واللہ، کروڑوں آدمی ایک طرف اور حضور ایک طرف۔

خوجی : غلام بھی آداب عرض کرتا ہے۔

آزاد : تم یہاں کب آ گئے خواجہ صاحب؟

نواب : سنا، آپ نے تین تین کروڑ آدمیوں سے اکیلے مقابلہ کیا۔

غفور : اللہ کی دین ہے حضور!

نواب : ارے بھائی [illegible] حقہ بھر لاؤ آپ کے واسطے، آزاد پاشا کو ایسا ویسا نہ سمجھنا۔ ان کی تعریف کمشنر تک کی زبان سے سنی۔ سنا، آپ سے روس کے بادشاہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ بھائی، تم نے وہ درجہ حاصل کیا ہے کہ ہم اگر حضور کہیں تو بجا ہے۔ کہاں روس

کے بادشاہ اور کہاں ہم!

خوجی : خداوند، مورچہ پر ان کو دیکھتے تو دنگ رہ جاتے۔ جیسے شیر کچھار میں ڈکارتا ہے۔

نواب : کیوں بھائی آزاد، انھوں نے وہاں کوئی کشتی نکالی تھی؟

آزاد : میرے سامنے تو سینکروں ہی بار چپتیایے گئے اور ایک بونے تک نے ان کو اٹھا کے دے مارا۔

مصاحب : بھائی، اس وقت تو بھمبھاڑا پھوٹ گیا۔

آزاد : کیا یہ گپ اڑاتے تھے کہ میں نے کشتیاں نکالیں؟

مستیا بیگ : اے حضور، جب سے آئے ہیں، ناک میں دم کر دیا۔ بات ہوئی اور کرولی نکالی۔

غفور : پرسوں تو کہتے تھے کہ مصر میں ہم نے آزاد کے برابر کے پہلوان کو دم بھر میں آسمان دکھا دیا۔

آزاد : کیا خوب! ایک بونے تک نے تو اٹھا کے دے مارا، چلے وہاں سے دون کی لینے۔

اتنے میں نواب صاحب کے یہاں ایک منشی صاحب آئے اور آزاد کو دیکھ کر بولے۔ واللہ، آزاد پاشا صاحب ہے، آپ نے تو بڑا نام پیدا کیا، سبحان اللہ۔

نواب : اجی، کمشنر صاحب ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ عزت اور کیا ہوگی۔

خوجی : صاحب، لڑائی کے میدان میں کوئی ان کے سامنے ٹھرتا ہی نہ تھا۔

منشی : آپ نے بھی بڑا ساتھ دیا خواجہ صاحب، مگر آپ کی بہادری کا ذکر کہیں سننے کو نہیں آیا۔

خوجی : آپ ایسے گیدیوں کو میں کیا سمجھتا ہوں، میں نے وہ وہ کام کیے ہیں کہ کوئی کیا کرے گا۔ کرولی ہاتھ میں لے لی اور صفوں کی صفیں صاف کر دیں۔

منشی : آپ تو نواب صاحب کے یہاں بنے ہیں نا؟

خوجی : بنے ہوں گے آپ، بنتا کیسا! کیا میں کوئی چرکٹا ہوں۔ قسم ہے حضور کے قدموں کی، ساری دنیا چھان ڈالی، مگر آج تک ایسا بدتمیز دیکھنے میں نہیں آیا۔

آزاد : جناب خواجہ صاحب نے جو باتیں دیکھیں ہیں وہ اوروں کو کہاں نصیب ہوئی۔
آپ جس جگہ جاتے تھے وہاں کی ساری عورتیں آپ کا دم بھرنے لگتی تھیں۔ سب سے پہلے بوا زعفران عاشق ہوئیں۔

خوجی : تو پھر آپ کو برا کیوں لگتا ہے؟ آپ کیوں جلتے ہیں؟

نواب : بھئی آزاد، یہ قصہ ضرور بیان کرو۔ اگر آپ نے اسے چھپا رکھا تو واللہ، مجھے بڑا رنج ہوگا، اب فرمائیے، آپ کو میرا زیادہ خیال ہے یا اس گیدی کا؟

خوجی : حضور، مجھ سے سنیے۔ جس روز آزاد پاشا اور ہم پلونا کے لیے قلعے میں تھے، اس روز کی کارروائی دیکھنے کے لائق تھی۔ قلعہ پانچوں طرف سے گھرا ہوا تھا۔

مصاحب : یہ پانچواں کون طرف ہے صاحب؟ یہ نئی طرف کہاں سے لائے؟ جو بات کہو گے وہی انوکھی۔

خوجی : تم ہو گدھے، کسی نے بات کی اور تم نے کاٹ دی، یوں نہیں وہ، وہ نہیں یوں۔ ایک طرف دریا تھا اور خشکی بھی تھی۔ اب ہوئیں پانچ طرفیں یا نہیں، مگر تم ایسے گوکھوں کا حال کیا معلوم۔ کبھی لڑائی پر گئے ہو؟ کبھی توپ کی صورت دیکھی ہے؟ کبھی دھواں تک تو دیکھا نہ ہوگا اور چلے ہیں وہاں سے بڑے سپاہی بن کر! تو بس جناب، اب کریں تو کیا کریں۔ ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے کہ اب جائیں تو کدھر جائیں اور بھاگیں تو کدھر بھاگیں۔

نواب : سچ مچ وقت بڑا نازک تھا۔

خوجی : اور روسیوں کی یہ کیفیت کہ گولے برسا رہے تھے۔ بس آزاد پاشا نے مجھ سے کہا کہ بھائی جان، اب کیا سوچتے ہو، مروگے یا نکل جاؤگے! میرے بدن میں آگ لگ گئی۔ بولا، نکلنا کسے کہتے ہیں جی! اتنے میں قلعے کی دیواریں چلنی ہوگئیں۔ اب میں نے دیکھا کہ اب فوج کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی، تو تلوار ہاتھ میں لی اور اپنے عربی گھوڑے پر بیٹھ کر نکل پڑا اور اسی وقت دو لاکھ روسیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔

مصاحب : اس جھوٹ پر خدا کی مار۔

خوجی : اچھا، آزاد سے پوچھیے، بیٹھے تو ہیں سامنے۔

نواب : حضرت، سچ سچ کہیے گا۔ بس فقط اتنا بتا دیجیے، یہ بات کہاں تک سچ ہے؟

آزاد : جناب، پلونا کا جو کچھ حال بیان کیا وہ تو سب ٹھیک ہے، مگر دو لاکھ آدمیوں کا

سر کاٹ لینا محض گپ ہے۔ لطف یہ ہے کہ پلونا کی تو انھوں نے صورت بھی نہ دیکھی۔ ان دنوں تو یہ خاص قسطنطنیہ میں تھے۔

اس پر بڑے زور کا قہقہہ پڑا۔ بیگم صاحب نے قہقہے کی آواز سنی تو مہری سے کہا۔ جا دیکھ، یہ کیسی ہنسی ہو رہی ہے۔

مہری : حضور، وہ آئے ہیں میاں آزاد، وہ گورے گورے سے آدمی، بس وہی ہنسی ہو رہی ہے۔

بیگم : اخواہ ، آزاد آ گئے، جاکے خیر و عافیت تو پوچھ! ہماری طرف سے نہ پوچھنا! وہاں کہیں ایسی بات نہ کرنا۔

مہری : واہ حضور، کوئی دیوانی ہوں کیا؟ سنتی ہوں، اس ملک میں بڑا نام کیا۔ تم نے کبھی توپ دیکھی ہے غفورن۔

غفورن : اے خدا نہ کرے حضور!

مہری : ہم نے تو توپ دیکھی ہے، بلکہ روز ہی دیکھتی ہوں۔

بیگم : توپ دیکھی ہے! تمھارے میاں سواروں کے سائس ہوں گے۔ توپ نہیں وہ دیکھی ہے۔

مہری : حضور، یہ سامنے توپ ہی لگی ہے یا کچھ اور؟

محل میں رحیمن نام کی ایک مہری اور سبھوں سے موٹی تازی تھی۔ مہری نے جو اس کی طرف اشارہ کیا تو بیگم صاحب کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔

رحیمن : کیا پڑا پایا ہے بہن غفورن؟

غفورن : آج ایک نئی بات دیکھنے میں آئی ہے بہن۔

رحیمن : ہم کو بھی دیکھاؤ۔ دیکھیں کوئی مٹھائی ہے یا کھلونا؟

غفورن : توپ کی توپ اور عورت کی عورت۔

رحیمن : (بات سمجھ کر) تمھیں لوگوں نے تو مل کر ہمیں نظر لگا دی۔

بیگم : اے آگ لگے، اب اور کیا موٹی ہوتی، پھول کے کپّا تو ہو گئی ہے!

ادھر خوجی نے دیکھا کہ یار لوگ رنگ نہیں جمنے دیتے تو موقع پا کر آزاد کے قدموں پر ٹوپی رکھ دی اور کہا۔ بھائی آزاد، برسوں تمھارا ساتھ دیا ہے، تمھارے لیے جان تک دینے کو

تیار رہا ہوں۔ میری دو دو باتیں سن لو۔

آزاد : میں آپ کا مطلب سمجھ گیا، مگر کہاں تک ضبط کروں؟

خوجی : اس دربار میں ذلیل کرنے سے اگر آپ کو کچھ ملے تو آپ کو اختیار ہے۔

آزاد : جناب، آپ میرے بزرگ ہیں، بھلا میں آپ کو ذلیل کروں گا؟

خوجی : ہائے افسوس، تمھارے لیے جان لڑا دی اور اب اس دربار میں، جہاں روٹیوں کا سہارا ہے، آپ ہم کو الو بناتے ہیں، جس میں روٹیوں سے بھی جائیں۔

آزاد : بھائی معاف کرنا، اب تمھاری ہی سی کہیں گے۔

خوجی : مجھے رنگ تو باندھنے دو ذرا۔

آزاد : آپ رنگ جمائیں، میں آپ کی تائید کروں گا۔

خواجہ صاحب کا چہرہ کھل گیا کہ اب گپ کی پل باندھ دوں گا اور جب آزاد میرا کلمہ پڑھنے لگیں گے تو پھر کیا پوچھنا۔

نواب : خواجہ صاحب یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں ہم سے چھپ چھپا کر؟

خوجی : خداوند، ایک معاملے پر بحث ہو رہی تھی۔

نواب : کیسی بحث، کس معاملے پر؟

خوجی : حضور، میری رائے ہے کہ اس ملک میں بھی نہریں جاری ہونی چاہیے اور آزاد پاشا کی رائے ہے کہ نہروں سے آب پاشی تو ہوگی، مگر ملک کی آب و ہوا خرب ہو جائے گی۔

مستیا بیگ : اخواہ، تو یہ کہیے کہ آپ شہر کے اندیشے میں دبلے ہیں۔

خوجی : تم گوکھے ہو، یہ باتیں کیا جانو۔ پہلے یہ تو بتاؤ کہ ایک باڑی میں کتنی توپیں ہوتی ہیں؟ چلے وہاں سے بقراط کی دم بن کے۔

نواب : خوجی ہے تو بڑی سیڑی، مگر باتیں کبھی کبھی ٹھکانے کی کرتا ہے۔

آزاد : ان باتوں کا انھیں اچھا تجربہ ہے۔

غفور : حضور، ان کو بڑی بڑی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔

آزاد : صاحب، سفر بھی تو اتنا دور دراز کا کیا تھا! کہاں ہندوستان، کہاں روم! خیال تو کیجیے۔

میر صاحب : کیوں خواجہ صاحب، پہاڑ تو آپ بہت دیکھے ہوں گے؟

خوجی : ایک دو نہیں، کروڑوں آسمان سے باتیں کرنے والے۔
نواب : بھلا آسمان وہاں سے کتنی دور رہ جاتا ہے۔
خوجی : حضور، بس ایک دن کی راہ۔ مگر زینہ کہاں؟
نواب : اور کیوں صاحب، وہاں سے تو خوب معلوم ہوتا ہوگا کہ مینہ کس جگہ سے آتا ہے؟
خوجی : جناب، پہاڑ کی چوٹی پر میں تھا اور مینہ نیچے برس رہا تھا۔
نواب : کیوں صاحب، یہ سچ ہے؟ عجیب بات ہے بھائی!
آزاد : جی ہاں، یہ تو ہوتا ہی ہے، پہاڑ پر سے نیچے مینہ کا برسنا صاف دکھائی دیتا ہے۔
مستیا بیگ : اور جو یہ مشہور ہے کہ بادل تالابوں میں پانی پیتے ہیں؟
خوجی : یہ تم جیسے گدھوں میں مشہور ہوگا۔
نواب : بھئی، یہ تجربے کار لوگ ہیں، جو بیان کریں وہ سہی ہے۔
خوجی : حضور نے دریا ڈینیوب کا نام تو سنا ہوگا اتنا بڑا دریا ہے کہ اس کے آگے سمندر بھی کوئی چیز نہیں۔ اتنا بڑا دریا اور ایک رئیس کے دیوان خانے کے احاطے سے نکلا ہے۔
میر صاحب : ایں، ہمیں تو یقین نہیں آتا۔
خوجی : آپ لوگ کوئیں کے میڈھک ہیں۔
نواب : مکان کے احاطے سے! جیسے ہمارے مکان کا یہ احاطے؟
خوجی : بلکہ اس سے بھی چھوٹا۔ حضور، خدا کی خدائی ہے، اس میں بندے کو کیا دخل۔ اور خداوند، ہم نے استنبول میں ایک عجائب خانہ دیکھا۔
میر صاحب : تم کو تو کسی نے دھوکے میں بند نہیں کر دیا۔
خوجی : بس، ان جنگلوؤں کو اور کچھ نہیں آتا۔
نواب : اجی، تم اپنا مطلب کہو، اس عجائب خانے میں کوئی نئی بات تھی؟
خوجی : حضور، ایک تو ہم نے بھینسا دیکھا۔ بھینسا کیا، ہاتھی کا پاٹھا تھا اور ناک کے اوپر ایک سینگ۔ اتفاق سے جس مکان میں وہ بند تھا اس کی تین چھڑیں ٹوٹ گئیں تھیں۔ اسے راستہ ملا تو سمٹ سمٹ کر نکلا۔ بس جناب، کچھ نہ پوچھیے، دو ہزار آدمی گر بڑ ایک کے اوپر ایک

اس طرح گرے کہ بے ہوش۔ کوئی چار پانچ سو آدمی زخمی ہوئے۔ میں نے یہ کیفیت دیکھی تو سوچا، اگر تم بھی بھاگتے ہوتو ہنسی ہوگی۔ لوگ کہیں گے کہ یہ فوج میں کیا کرتے تھے۔ ذرا سے بھینسے کو دیکھ کر ڈر گئے۔ بس ایک بار جھپٹ کے جو جاتا ہوں تو گردن ہاتھ آئی، بس بائیں ہاتھ سے گردن دبائی اور دبوچ کے بیٹھ گیا، پھر لاکھ لاکھ زور اس نے مارے، مگر میں نے ہمسنے نہ دیا۔ ذرا گردن ہلائی اور میں نے دبوچا۔ جتنے آدمی کھڑے تھے سب دنگ ہو گئے کہ واہ رے پہلوان! آخر جب میں نے دیکھا کہ اس کا دم ٹوٹ گیا تو گردن چھوڑ دی۔ پھر اس نے بہت چاہا کہ اٹھے، مگر ہمس نہ سکا۔ مجھ سے لوگ منتیں کرنے لگے کہ اسے کھٹکھرے میں میں ڈال دو، ایسا نہ ہو کہ بپھرے تو ستم ہی کرڈالے۔ اس پر میں نے اسے ایک تھپڑ جو لگایا تو چوندھیا کر تڑ سے گرا۔

مستیا بیگ : اس کے کیا مطلب۔ آپ کے خوف کے مارے لوٹا تھا ہی، پھر لیٹے لیٹے کیوں گر پڑا۔

خوجی : واہی ہو۔ بس حضور، میں نے کان پکڑا تو اس طرح ساتھ ہولیا جیسے بکری۔ اسی کھٹکھرے میں پھر بند کر دیا۔

نواب : کیوں صاحب، یہ قصہ سچ ہے؟

آزاد : میں اس وقت موجود نہ تھا، شاید سچ ہو۔

میر صاحب : بس بس، قلعی کھل گئی، غضب خدا کا، جھوٹ بھی تو کتنا۔اس وقت جی چاہتا ہے، اٹھ کے ایسا گدّا دوں کہ دس گز زمین میں دھنس جائے۔

خوجی : قسم ہے خدا کی، جو اب کی کوئی بات منھ سے نکالی تو اتنی کرولیا بھوکوں گا کہ عمر بھر یاد کرے گا۔ تو اپنے دل میں سمجھتا کیا ہے! یہ سوکھی ہڈیاں لوہے کی ہیں۔

نواب : اتنے بڑے جانور سے انسان کیا مقابلہ کر سکتا ہے؟

آزاد : حضور، بات یہ ہے کہ بعض آدمیوں کو یہ قدرت ہوتی ہے کہ ادھر جانور کو دیکھا، ادھر اس کی گردن پکڑی۔ خواجہ صاحب کو یہ بھی ترکیب معلوم ہے۔

نواب : بس، ہم کو یقین آ گیا۔

مستیا بیگ: ہاں خداوند، شاید ایسا ہی ہو۔

مصاحب : جب حضور کی سمجھ میں ایک بات آگئی تو آپ کس کھیت کے مولی ہیں۔

میر صاحب : اور جب ایک کی لم بھی دریافت ہوگئی تو پھر اس میں انکار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

نواب : کیوں صاحب، لڑائی میں تو آپ نے خوب نام پیدا کیا ہے، بتائیے کہ آپ کے ہاتھ سے کتنے آدمیوں کا خون ہوا ہوگا؟

خوجی : غلام سے پوچھیے، انھوں نے کل ملا کر دو کروڑ آدمیوں کو مارا ہوگا۔

نواب : دو کروڑ۔

خوجی : جبھی تو روم اور شام، توران اور ملتان، آسٹریا اور انگلستان، جرمنی اور فرانس میں ان کا نام ہوا ہے۔

نواب : افوہ، خوجی کو اتنے ملکوں کے نام یاد ہیں!

آزاد : حضور، اب انھیں وہ خوجی نہ سمجھیے۔

خوجی : خداوند، میں نے ایک دریا پر اکیلے ایک ہزار آدمیوں کا مقابلہ کیا۔

نواب : بھائی، مجھے تو یقین نہیں آتا۔

مستیا بیگ : حضور، تین حصے جھوٹ اور ایک حصہ سچ۔

میر صاحب : ہم تو کہتے ہیں، سب ڈینگ ہے۔

آزاد : نواب صاحب، اس بات کی تو ہم بھی گواہی دیتے ہیں۔ اس لڑائی میں میں شریک نہ تھا، مگر میں نے اخباروں میں ان کی تعریف دیکھی تھی اور وہ اخبار میرے پاس موجود ہے۔

نواب : تو اب ہم کو یقین آ گیا، جب جنرل آزاد پاشا نے گواہی دی تو پھر سہی ہے۔

خوجی : وہ موقع ہی ایسا تھا۔

آزاد : نہیں نہیں بھائی، تم نے وہ کام کیا کہ بڑے بڑے جنرلوں نے دانتوں انگلی دبائی۔ وہیں تو صف شکن بھی تمھیں نظر آئے تھے؟

خوجی : حضور، یہ کہنا تو میں بھول ہی گیا۔ جس وقت میں دشمنوں کو سٹھراؤ کر رہا تھا، اسی وقت صف شکن کو ایک درخت پر بیٹھے دیکھا۔

نواب : لو صاحبوں، سنو، میرے صف شکن روم کی فوج میں بھی جا پہنچے۔

مصاحب : سبحان اللہ، واہ رے صف شکن، بہادر ہو تو ایسا ہو۔

خوجی : خداوند، اس ڈانٹ ڈپٹ کا بٹیر بھی کم دیکھا ہوگا۔

نواب : دیکھا ہی نہیں، کم کیسا؟ ارے میاں غفور، ذرا گھر میں اطلاع کرو کہ صف شکن خیریت سے ہیں۔

غفور ڈیوڑھی پر آیا۔ وہاں خدمت گار دربان، چپراسی سب نواب کی سادگی پر کھلکھلا کر ہنس رہے تھے۔

خدمت گار : ایسا الو کا پٹھا بھی کہیں نہ دیکھا ہوگا۔

غفور : نرا پاگل ہے، واللہ، نرا پاگل۔

چپراسی : ابھی دیکھیے تو کیا کیا قصے گڑھے جاتے ہیں۔

مہری نے یہ خبر بیگم صاحب کو دی تو انھوں نے قہقہہ لگایا اور کہا۔ ان پاجیوں نے نواب کو انگلیوں پر نچانا شروع کیا۔ جاکے کہہ دو کہ ذری کھڑے کھڑے بلاتی ہیں۔

نواب صاحب اٹھے، مگر اٹھتے ہی پھر بیٹھ گئے اور کہا۔ بھائی، جانے کو تو میں جاتا ہوں، مگر کہیں انھوں نے مسلسل حال پوچھا تو؟

آزاد : خواجہ صاحب سے ان کا حال پوچھیے، انھیں خوب معلوم ہے۔

خوجی: ساتھ تو سچ پوچھیے تو میرا ہی ان کا بہت رہا۔ ان کے انگریزی لباس سے چکراتے تھے۔

نواب : بھلا کسی مورچہ پر گئے تھے یا نہیں، یا دور ہی سے دعا دیا کیے؟

خوجی : خداوند، غلام جو عرض کرے گا، کسی کو یقین نہ آئے گا، اس پر میں جھلاؤں گا اور مفت کی ٹھائیں ٹھائے ہوگی۔

نواب : کیا مجال، خدا کی قسم، اب تم میرے خاص مصاحب ہو، تم نے جو تجربہ حاصل کیا ہے وہ اوروں کو کہاں نصیب۔ تمھارا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟

خوجی : یہ حضور کے اقبال کا اثر ہے، ورنہ میں تو کسی شمار میں نہ تھا۔ بات یہ ہوئی کہ غلام ایک ندی کے کنارے افیم گھول رہا تھا کہ جس درخت کی طرف نظر ڈالتا ہوں، روشنی چھائی ہوئی ہے۔ گھبرایا کہ یا خدا، یہ کیا ماجرا ہے، اسی فکر میں پڑا تھا کہ حضور صف شکن نہ جانے کدھر سے آکر میرے ہاتھ پر بیٹھ گئے۔

نواب : خدا کا شکر ہے، تم تو بڑے خوش ہوئے ہوگے؟

خوجی : حضور، جیسے کروڑوں روپے مل گئے۔ پہلے حضور کا حال بیان کیا۔ پھر شہر کا ذکر کرنے لگے۔ دنیا کی سبھی باتیں ان پر روشن تھیں۔ بس حضور، پھر تو یہ کیفیت ہوئی کہ دشمن کسی لڑائی میں جم ہی نہ سکے۔ ادھر روسیوں نے توپوں پر بتی لگائی، ادھر میرے شیر نے کیل ٹھونک دی۔

نواب : واہ واہ، سبحان اللہ، کچھ سنتے ہو یارو؟

مستیا بیگ : خداوند، جانور کیا، جادو ہے!

خوجی : بھلا ان کو کوئی بٹیرے کہہ سکتا ہے۔ اور جانور تو آپ خود ہیں۔ آپ ان کی شان میں اتنا سخت اور بے ہودہ لفظ منھ سے نکالتے ہیں۔

نواب : مستیا بیگ، اگر تم کو رہنا ہے تو اچھی طرح رہو، ورنہ اپنے گھر کا راستہ لو۔ آج تو صف شکن کو جانور بنایا، کل کو مجھے جانور بناؤ گے۔

مصاحب : خداوند، یہ نرے پھوہڑ ہیں۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔

غفور : اچھا تو اب خاموش ہی رہیے صاحب، قصور ہوا۔

خوجی : نہیں، سارا حال تو سن چکے، مگر تب بھی اپنی ہی سی کہے جائیں گے، دوسرا اگر اس وقت جانور کہتا تو گلپھڑے چیر کر دھر دیتا، نہ ہوئی کرولی!

نواب : جانے بھی دو، بے شعور ہے۔

خوجی : خداوند، خشکی میں تو سبھی لڑ سکتے ہیں، مگر تری میں لڑنا مشکل ہے۔ سو حضور، تری کی لڑائی میں صف شکن سب سے بڑھ کر رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک چھوٹا سا دریا تھا۔ اس طرف ہم، اس طرف دشمن۔ مورچہ بندی ہو گئی، گولیاں چلنے لگیں، بس کیا دیکھتا ہوں کہ صف شکن نے ایک کنکری لی اور اس پر کچھ پڑھ کر اس زور سے پھینکی کہ ایک توپ کے ہزار ٹکڑے ہو گئے۔

نواب : کیا پوچھنا ہے، ایک ذرا سی کنکری کی یہ کرامات!

خوجی : اب سنیے کہ دوسری کنکری کو پڑھ کر پھینکی تو ایک اور توپ پھٹی اور بہتر ٹکڑے ہو گئے۔ کوئی تین چار ہزار آدمی کام آئے۔

نواب : اس کنکری کو دیکھیے گا۔ اللہ اللہ! ایک ہزار ٹکڑے توپ کے اور تین تین ہزار آدمی غائب۔ واہ رے میرے صف شکن۔

خوجی : اس طرح کوئی چودہ توپیں اڑا دیں اور جتنے آدمی تھے سب بھن گئے۔ کچھ نہ پوچھیے حضور، آج تک کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا۔ اگر ایک گولا بھی پڑا ہوتا تو لوگ سمجھتے، اس میں کوئی ایسا مسالہ رہا ہوگا، مگر کنکری تو کسی کو معلوم بھی نہیں ہوئی۔

نواب : بلا کی کنکر تھی کہ توپ کے ہزاروں ٹکڑے کر ڈالے اور ہزاروں آدمیوں کی جان لی۔ بھئی، ذرا کوئی جا کر صف شکن کی کابک تو لاؤ۔

اتنے میں مہری نے پھر آ کر کہا۔ حضور، بڑا ضروری کام ہے، ذرا چل کر سن لیں۔ نواب صاحب خوجی کو لے کر زنان خانے میں چلے۔ خوجی کی آنکھوں میں دہری پٹی باندھی گئی اور وہ ڈیوڑھی میں کھڑے کیے گئے۔

بیگم : کیا صف شکن کا کوئی ذکر تھا، کہاں ہے آج کل؟

نواب : یہ کچھ نہ پوچھو، روم جا پہنچے۔ وہاں کئی لڑائیوں میں شریک ہوئے اور دشمنوں کا قافیہ تنگ کر دیا۔ خدا جانے، یہ سب کس سے باتیں سیکھا ہے؟

بیگم : خدا کی دین ہے سیکھنے سے بھی کہیں ایسی باتیں آتی ہیں۔

نواب : واللہ، سچ کہتی ہو بیگم صاحب! اس وقت تم سے جی خوش ہو گیا۔ کہاں توپ، کہاں صف شکن، ذرا خیال تو کرو۔

بیگم : اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو صف شکن کو ہزار پردوں میں چھپا کر رکھتی۔ ہاں، خوب یاد آیا، وہ تو ابھی جیتے جاگتے ہیں اور تم نے ان کی قبر بنوا دی۔

نواب : واللہ، خوب یاد دلایا۔ سبحان اللہ!

بیگم : یہ تو کوسنا ہوا کسی بے چارے کو۔

نواب : اگر کہیں یہاں آ جائیں، اور پڑھے لکھے تو ہیں ہی۔ کہیں قبر پر نظر پڑ گئی، اس وقت یہی کہیں گے کہ یہ لوگ میری موت منا رہے ہیں، کیا جھپاکے سے قبر بنوا دی۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ کھدوا ڈالوں۔

بیگم : جہنم میں جائے۔ اس اپنچی کو گھر کے اندر لانے کیا ضرورت تھی۔

نواب : اجی، یہ وہی ہیں جن کو ہم لوگ خوجی خوجی کہتے تھے۔ لڑائی کے میدان میں صف شکن انھیں سے ملے تھے۔ اگر کہو تو یہاں بلا لوں۔

بیگم : اے جہنم میں جائے مُوا، اور سنو، اس اپنچی کو گھر کے اندر لائیں گے۔

نواب : سن تو لو۔ پہلے تو بوڑھا، پیٹ میں آنت نہ منھ میں دانت، دوسرے ماتور، تیسرے دہری پٹی بندھی ہے۔

بیگم : ہاں، اس کا مضائقہ نہیں، مگر میں ان مُوئے لنگاڑوں کے نام سے جلتی ہوں، انھیں کی صحبت میں تمھارا یہ حال ہوا۔

نواب : ایں، کیا خوب!

خوجی : خداوند، غلام حاضر ہے۔

مہری : میں تو سمجھی کہ کنویں میں سے کوئی بولا۔

بیگم : کیا یہ ہردم پینک میں رہتا ہے؟

نواب : خواجہ صاحب، کیا سو گئے؟

دربان : خواجہ صاحب، دیکھو سرکار کیا فرماتے ہیں؟

خوجی : کیا حکم ہے خدوند!

بیگم : دیکھو، خدا جانتا ہے، اونگھ رہا تھا۔ میں تو کہتی ہی تھی۔

نواب : بھائی، ذرا صف شکن کا حال تو کہہ چلو؟

خوجی : خداوند، تو اب آنکھیں تو کھلوا دیجیے۔

بیگم : کیا کتیا کے پلّے کی آنکھ ہے جو اب بھی نہیں کھلتیں۔

نواب : پہلے حال تو بیان کرو۔ ذرا توپ والا ذکر پھر کرنا، وہاں کسی کو یقین ہی نہیں آتا۔

خوجی : حضور، کیونکر یقین آئے، جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں گے، کبھی نہ مانیں گے۔

نواب : تو بھائی، ہم نے کیونکر مان لیا، اتنا تو سوچو۔

خوجی : خدا نے سرکار کو دیکھنے والی آنکھیں دی ہیں۔ آپ نہ سمجھیں تو کون سمجھے۔ حضور، یہ کیفیت ہوئی کہ دریا کے دونوں طرف آمنے سامنے توپیں چڑھیں ہوئی تھیں۔ بس صف شکن نے ایک کنکری اٹھا کر، خدا جانے کیا جادو پھونک دیا کہ ادھر کنکری پھینکی اور ادھر توپ کے دو سو ٹکڑے اور ہر ٹکڑے نے سو سو روسیوں کی جان لی۔

بیگم : اس جھوٹ کو آگ لگے۔ افیم پی پی کے نگوڑوں کو کیا کیا سوجھتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے

ایک کنکری سے توپ کے سو ٹکڑے ہو گئے۔ خدا کا ڈر ہی نہیں۔

نواب : تمھیں یقین ہی نہ آئے تو کیا کرے۔

بیگم : چلو، بس خاموش رہو۔ ذرا سا مُوا بٹیر اور کنکری سے اس نے توپ کے دو سو ٹکڑے کر ڈالے۔ خدا جانتا ہے، تم اپنی فسد کھلواؤ۔

نواب : اب خدا جانے، ہمیں جنون ہے یا تمھیں۔

خوجی : خداوند، بحث سے کیا فائدہ! عورتوں کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آ سکتیں۔

بیگم : مہری، ذرا دربان سے کہہ، اس نگوڑے اینچی کو جوتے مار کر نکال دے۔ خبردار جو اس کو کبھی ڈیوڑھی میں آنے دیا۔

خوجی : سرکار تو ناحق خفا ہوتی ہیں۔

بیگم : معلوم ہوتا ہے، آج میرے ہاتھوں تم پٹو گے، ارے مہری، کھڑی سنتی کیا ہے، جا کے دربان کو بلا لا۔

حسینی دربان نے آ کر خوجی کے کان پکڑے اور چپتیاتا ہوا لے چلا۔

خوجی : بس بس، دیکھو، کان وان کی دل لگی اچھی نہیں۔

محبوبن : اب چلتا ہے یا مچلتا ہے؟

خوجی : (ٹوپی زمین سے اٹھا کر) اچھا، اگر آج جیتے بچ جاؤ تو کہنا۔ ابھی ایک تھپڑ دوں تو دم نکل جائے۔

اتنا کہنا تھا کہ دوسری مہری آ پہنچی اور کان پکڑ کر چپتیانے لگی۔ خوجی بہت بگڑے، مگر سوچے کہ اگر سب لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مہریوں کی جوتیاں کھائیں تو بے ڈھب ہوگی۔ جھاڑ پونچھ کر باہر آئے اور ایک پلنگ پر لیٹ رہے۔

خوجی کے جانے کے بعد بیگم نے نواب کو خوب ہی آڑے ہاتھوں لیا۔ ذرا سوچو تو کہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔ کہاں بٹیر اور کہاں توپ، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بلّو کھا گئی ہو۔ یا انھیں مصاحبوں میں سے کسی نے نکال کر بیچ لیا ہوگا اور تمھیں پٹی پڑھا دی کہ وہ صف شکن تھے۔ آخر تم کسی اپنے دوست سے پوچھو۔ دیکھو، اور لوگوں کی کیا رائے ہے؟

نواب : خدا کے لیے میرے مصاحبوں کو نہ کوسو، چاہے مجھے برا بھلا کہہ لو۔

بیگم : ان مفت خوروں سے خدا سمجھے۔

نواب : ذرا آہستہ آہستہ بولو، کہیں وہ سب سن لیں، تو سب کے سب چلتے ہوں اور میں اکیلا مکھیاں مارا کروں۔

بیگم : اے ہے، ایسے بڑے کھرے ہیں! تم جوتیاں مار کر نکالو تو بھی یہ چوں نہ کریں۔ جو سب نکل جائیں تو ہوگا کیا؟ وہ کل جاتے ہوں تو آج ہی جائیں۔

مہری : حضور تو چونک گئیں، ذری اس مُوئے خوجی کی کہانی تو سنی ہوتیں۔ ہنستے ہنستے لوٹ جاتیں۔

بیگم : سچ، اچھا تو اس کو بلاؤ ذری، مگر کہہ دینا کہ جھوٹ بولا اور میں نے خبر لی۔

نواب : یا خدا، یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ جھوٹ ہی بولے گا۔ اتنے دنوں سے دربار میں رہتا ہے، کبھی جھوٹ نہیں بولا تو اب کیوں جھوٹ بولنے لگا؟ اور آخر اتنا تو سمجھو کہ جھوٹ بولنے سے اس کو مل کیا جائے گا؟

بیگم : اچھا، بلاؤ۔ میں بھی ذرا صف شکن کا حال سنوں۔

مہری نے جا کر خوجی کو بلایا۔ خواجہ صاحب جھلّائے ہوئے پلنگ پر پڑے تھے۔ بولے۔ جا کر کہہ دو۔ اب ہم وہ خوجی نہیں ہیں جو پہلے تھے، آنے والے اور جانے والے، بلانے والے اور بلوانے والے، سب کو کچھ کہتا ہوں۔

آخر لوگوں نے سمجھایا تو خواجہ صاحب ڈیوڑھی میں آئے اور بولے۔ آداب عرض کرتا ہوں سرکار، اب کیا پھر کچھ مہربانی کی نظر غریب کے حال پر ہوگی؟ ابھی کچھ انعام باقی ہو تو اب مل جائے۔

بیگم : صف شکن کا کچھ حال معلوم ہو تو ٹھیک ٹھیک کہہ دو۔ اگر جھوٹ بولے تو تم جانوگے۔

خوجی : واہ ری قسمت، ہندستان سے بمبئی گئے، وہاں سب کے سب 'حضور، حضور' کرتے تھے۔ ترکی اور روس میں کوہ قاف کی پریاں ہاتھ باندھے حاضر رہتی تھیں۔ مس روز ایک ایک بات پر جان دیتی تھی، اب بھی اس کی یاد آجاتی ہے تو رات بھر اچھے اچھے خواب دیکھا کرتا ہوں۔

خواب میں ایک نور آتا ہے نظر
یاد میں تیری جو سو جاتے ہیں ہم

بیگم : اب بتاؤ، ہے پکّا افیچی یا نہیں، مطلب کی بات ایک نہ کہی۔ واہی تباہی بکنے لگا۔

خوجی : ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ پہاڑ کے اوپر تو روسی اور نیچے ہماری فوج۔

ہم کو معلوم نہیں کہ روسی موجود ہیں۔ وہیں پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ فوج تو کھانے پینے کا انتظام کرنے لگی اور میں افیم گھولنے لگا کہ یکا یک پہاڑ پر سے تالیوں کی آواز آئی۔ میں پیالی ہونٹوں تک لے گیا تھا کہ اوپر سے روسیوں نے باڑہ ماری۔ ہمارے سینکڑوں آدمی گھائل ہو گئے۔ مگر واہ رے میں، خدا گواہ ہے، پیالی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ یکا یک دیکھتا ہوں کہ صف شکن اڑے چلے جاتے ہیں، آتے ہی میرے ہاتھ پیر بیٹھ کر چونچ افیم سے تر کی، اور اس کے دو قطرے پہاڑ پر گرا دیے۔ بس دھماکے کی آواز ہوئی اور پہار پھٹ گیا۔ روس کی ساری فوج اس میں سما گئی۔ مگر ہماری طرف کا ایک آدمی بھی نہ مرا۔ میں نے صف شکن کا منہ چوم لیا۔

بیگم : بھلا صف شکن باتیں کس زبان میں کرتے ہیں؟

خوجی : حضور، ایک زبان ہو تو کہوں۔ اردو، فارسی، ترکی، انگریزی۔

بیگم : کیا اور زبانوں کے نام نہیں یاد ہیں؟

خوجی : اب حضور سے کون کہے۔

نواب : اب یقین آیا کہ اب بھی نہیں؟ اور کچھ پوچھنا ہو، پوچھ لو۔

بیگم : چلو، بس چپکے بیٹھو رہو۔ مجھے رنج ہوتا ہے کہ ان حرام خوروں کے پاس بیٹھے بیٹھے تم کہیں کے نہ رہے۔

نواب : ہائے افسوس، تمھیں یقین ہی نہیں آتا، بھلا سوچو تو، یہ سب کے سب مجھ سے جھوٹ بولیں گے۔ خوجی کو میں کچھ انعام دیتا ہوں یا کوئی جاگیر لکھ دی ہے اس کے نام؟

خوجی : خداوند، اگر اس میں ذرا بھی شک ہو تو آسمان پھٹ پڑے۔ جھوٹ بات تو زبان سے نکلے گی ہی نہیں، چاہے کوئی مار ڈالے

بیگم : اچھا، ایمان سے کہنا کہ کبھی مورچہ پر بھی گئے یا جھوٹ موٹھ کے فقرے ہی بنوایا کرتے ہو؟

خوجی : حضور، مالک ہیں، جو چاہیں، کہہ دیں، مگر غلام نے جو بات اپنی آنکھوں دیکھی، وہ بیان کی۔ اگر فرق ہو تو پھانسی کا حکم دے دیجیے۔

ایک بوڑھی مہری نے خوجی کی باتیں سننے کے بعد بیگم سے کہا۔ حضور، اس میں تعجب کی کون بات ہے، ہمارے محلّے میں ایک بڑا کالا کتا رہا کرتا تھا۔ محلّے کے لڑکے اسے مارتے، کان پکڑ کر کھینچتے، مگر وہ چوں بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن محلّے کے چوکیدار نے اس پر ایک ڈھیلا پھینکا۔ ڈھیلا اس کے کان میں لگا اور کان سے خون بہنے لگا۔ چوکیدار دوسرا ڈھیلا مارنا ہی چاہتا تھا کہ ایک جوگی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا، کیوں جان کا دشمن ہوا ہے بابا۔ یہ کتا نہیں ہے۔ اسی رات کو چوکیدار نے خواب دیکھا کہ کتا اس کے پاس آیا! اور اپنا گھاؤ دکھا کر کہا۔ یا تو ہمی نہیں، یا تمھی نہیں۔ سویرے چوکیدار اٹھا تو اس نے پاس پڑوس والوں سے خواب کا ذکر کیا۔ مگر اب دیکھتے ہیں کہ کتے کا کہیں پتہ ہی نہیں۔ دوپہر کو چوکیدار کنوئیں پر پانی بھرنے گیا تو پانی دیکھتے ہی بھونکنے لگا۔

بیگم : سچ؟

مہری : حضور، واللہ بچائے اس بلا سے، کتے کے بھیس میں کیا جانے کون تھا۔

نواب : اب اس کو کیا کہو گی بھائی، اب بھی صف شکنؔ کے کمال کو نہ مانو گی؟

بیگم : ہاں، ایسی باتیں تو ہم نے بھی سنی ہیں، مگر...

خوجی : اگر مگر کی گنجائش نہیں، غلام آنکھوں دیکھی کہتا ہے۔ ایک قصہ اور سنیے، آپ کو شاید اس کا بھی یقین نہ آئے۔ صف شکن میرے سر پر آکر بیٹھ گئے اور کہا، روسیوں کی فوج میں دھنس پڑو۔ میرے ہوش اڑ گئے۔ بولا، صاحب آپ ہیں کہاں؟ میری جان جائے گی، آپ کے نزدیک دل لگی ہے، مگر وہ سنتے کس کی ہیں۔ کہا، چلو تو تم! آدھی رات تھی، گھٹا چھائی ہوئی تھی، مگر مجبوراً جانا پڑا۔ بس، روسی فوج میں جا پہنچا۔ دیکھو، کوئی گاتا ہے، کوئی سوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں، مگر ہمیں کوئی نہیں دیکھتا۔ صف شکن اصطبل کی طرف چلے اور پھدک کے ایک گھوڑے کی گردن پر جا بیٹھے۔ گھوڑا دھم سے جا گرا، اب جس گھوڑے کی گردن پر بیٹھتے ہیں، زمین پر لیٹنے لگتا ہے۔ اس طرح کوئی سات ہزار گھوڑے اسی دم دھم دھم کرکے لوٹ گئے۔ فوج سے نکلے تو آپ نے پوچھا، کہو، آج کی دل لگی دیکھی، کتنے سوار بیکار ہوئے۔

میں۔ حضور، پورے سات ہزار!

صف شکن : آج اتنا ہی بہت ہے، کل پھر دیکھی جائے گی، چلو، اپنے پڑاؤ پر چلیں۔ چلتے چلتے جب تھک جاؤ تو ہم سے کہہ دو۔

میں : کیوں، آپ سے کہہ دوں؟

صف شکن : اس لیے کہ ہم اتر جائیں۔

میں : واہ، مٹھی بھر کے آپ، بھلا آپ کے بیٹھنے سے کیا میں تھک جاؤں گا؟ آپ کیا اور آپ کا بوجھ کیا؟

اتنا سننا تھا کہ خدا جانے ایسا کون سا جادو کر دیا کہ میرا قدم اٹھانا محال ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا، سر پر پہاڑ کا بوجھا لدا ہوا ہے۔ بولا، حضور، اب تو بہت ہی تھک گیا، پیر ہی نہیں اٹھتے۔ بس، فر سے اڑ گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سر سے دس بیس کروڑ من بوجھ اتر گیا۔

نواب : یہ تو بھائی، نئی نئی باتیں معلوم ہوتی جاتی ہیں۔ واہ رے صف شکن!

خوجی : حضور، خدا جانے، کس اولیا نے یہ بھیس بدلا ہے۔

بیگم صاحب نے اس وقت تو کچھ نہ کہا، مگر ٹھان لی کہ آج رات کو نواب صاحب کوخوب آڑے ہاتھ لوں گی۔ نواب صاحب نے سمجھا کہ بیگم صاحب کو صف شکن کے کمال کا یقین آ گیا۔ باہر آ کر بولے۔ واللہ، تم نے ایسا سماں باندھ دیا کہ اب بیگم صاحب کو عمر بھر شک نہ ہوگا۔

خوجی : حضور، سب آنکھوں دیکھی بات بیان کی ہے۔

نواب : یہی تو مشکل ہے کہ وہ سچی باتوں کو بھی بناوٹ سمجھتی ہیں۔

خوجی : سمجھ میں نہیں آتا، مجھ سے کیوں اتنی ناراض ہیں۔

نواب : ناراض نہیں ہیں جی، مطلب یہ کہ اب اس بات کو سوا پڑھے لکھے آدمی کے اور کون سمجھ سکتا ہے اور بھئی، میں سوچتا ہوں کہ آخر کوئی جھوٹ کیوں بولے گا۔ جھوٹ بولنے میں کسی کو فائدہ کیا ہے۔

خوجی : اے سبحان اللہ، کیا بات حضور نے پیدا کی ہے! سچ مچ کوئی جھوٹ کیوں بولنے لگا۔ ایک تو جھوٹا کہلائے، دوسرے بے آبرو ہو۔

نواب : بھائی، ہم انسان کو خوب پہچانتے ہیں۔ آدمی کا پہچانا کوئی ہم سے سیکھے۔ مگر دو کو ہم نے بھی نہیں پہچانا۔ ایک تم کو، دوسرے صف شکن کو۔

خوجی : خداوند، میں یہ نہ مانوں گا، حضور کی نظر بڑی باریک ہے۔

نواب صاحب خوجی کی باتوں سے اتنے خوش ہوئے کہ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیے

باہر آئے۔ مصاحبوں نے جو اتنی بے تعلقی دیکھی تو جل مرے، آپس میں اشارے ہونے لگے۔

مستیا بیگ : ایں، میاں خوجی نے تو جادو کر دیا یارو۔

غفور : ضرور کسی ملک میں جادو سیکھ آئے ہیں۔

مستیا بیگ : تجربہ کار ہوگیا نا، اب اس کا رنگ جم گیا۔

غفور : کیسا کچھ، اب تو سولہوں آنے کے مالک ہیں۔

مرزا : ارے میاں، دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر نکلے، واہ ری قسمت! مگر یہ خوش کس بات پر ہوئے؟

غفور : ان کو ابھی تک یہی نہیں معلوم، بتایئے صاحب!

مستیا بیگ : میاں، عجب کوڑھ مغز ہو، کہنے لگے، خوش کس بات پر ہوئے۔ صف شکن کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ سوجھ ہی تو ہے، اب لاکھ چاہیں کہ اس کا رنگ پھیکا کر دیں، ممکن نہیں۔

مرزا : اس وقت تو خوجی کا دماغ چوتھے آسمان پر ہوگا۔

مستیا بیگ : اجی، بلکہ اور اس کے بھی پار، ساتویں آسمان پر۔

غفور : میں باغ میں گیا تھا، دیکھا، نواب صاحب موڑھے پر بیٹھے ہیں اور خوجی تپائی پر بیٹھا ہوا، خاص سرکار کی گڑگڑی پی رہا ہے۔

مرزا : سچ، تمھیں خدا کی قسم!

غفور : چل کر دیکھ لیجیے نا، بس جادو کر دیا۔ یہ وہی خوجی ہیں جو چلمیں بھرا کرتے تھے، مگر جادو کا زور، اب دوست بنے ہوئے ہیں۔

مرزا : خوجی کو سب کے سب ملا کر مبارک باد دو اور ان سے بڑھیا دعوت لو۔ اب اس سے بڑھ کر کون درجہ ہے؟

اتنے میں نواب صاحب خوجی کو لیے ہوئے دربار میں آئے، مصاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ صاحب کو سرکار نے اپنے قریب بٹھایا اور آزاد سے بولے۔ حضرت، آپ کی صحبت میں تو خواجہ صاحب پارس ہو گئے۔

آزاد : جناب، یہ سب آپ کی خدمت کا اثر ہے۔ میری صحبت میں تو تھوڑے ہی دنون

سے ہیں، آپ کی شاگردی کرتے برسوں گزر گئے۔

نواب : واہ، اب تو خواجہ صاحب میرے استاد ہیں جناب!

مستیا بیگ : خداوند، یہ کیا فرماتے ہیں۔ حضور کے سامنے خوجی کی کیا ہستی ہے؟

نواب : کیا بکتا ہے؟ خوجی کی تعریف سے تم سب کیوں جل جاتے ہو؟

مرزا : خداوند، یہ مستیا بیگ دوسروں کو دیکھ کر ہمیشہ جلتے رہتے ہیں۔

غفور : یہ پرلے سرے کے گستاخ ہیں، بات تو سمجھے نہیں، جو کچھ منھ میں آیا، بک دیے۔ آخر خواجہ صاحب بے چارے نے ان کا کیا بگاڑا!

نواب : مجھ سے سنو، دل میں پرانی کدورت ہے۔

مصاحب : سبحان اللہ! حضور، بس یہی بات ہے۔

خوجی : حضور اس کا خیال نہ کریں۔ یہ لوگ جو چاہیں، کہیں۔ بھائی غفور، ذرا سا پانی پئیں گے۔

نواب : ٹھنڈا پانی لاؤ خواجہ صاحب کے واسطے۔

خدمت گار صراحی کا جھلا ٹھنڈا پانی لایا۔ چاندی کے کٹورے میں پانی دیا۔ جب خواجہ صاحب پی چکے تو نواب صاحب نے پاندان سے دو گلوریاں نکال کر خاص اپنے ہاتھ سے ان کو دیں۔

مرزا : میں نے مستیا بیگ سے ہزار بار کہا کہ بھائی، تم کسی کو دیکھ کے جلے کیوں مرتے ہو، کوئی تمھارا حصہ نہیں چھین لے جاتا، پھر خواہ مخواہ کے لیے اپنے کو کیوں ہلکان کرتے ہو۔

نواب : مجھے اس وقت اس کی باتیں بہت ناگوار معلوم ہوئیں۔

مصاحب : جانتے ہیں کہ اس دربان میں خوشامدیوں کی دال نہیں گلتی، پھر بھی اپنی حرکت سے باز نہیں آتے۔

مصاحب لوگ تو باہر بیٹھے صلاحیں کر رہے تھے، ادھر دربان میں نواب صاحب، آزاد اور خوجی میں یورپ کے رئیسوں کا ذکر ہونے لگا۔ آزاد نے یوروپ کے رئیسوں کی خوب تعریف کی۔

نواب : کیوں صاحب، ہم لوگ بھی ان رئیسوں کی طرح کر سکتے ہیں؟

آزاد : بے شک، اگر انھیں کی راہ پر چلیے۔ آپ کی صحبت میں چنڈو باز، مدکیے، چرسیے

اس کثرت سے ہیں کہ شاید ہی کوئی ان سے خالی ہو۔ یورپ کے رئیسوں کے یہاں ایسے آدمی پھٹکنے بھی نہ پائیں۔

نواب : کہیے تو خواجہ صاحب کے سوا اور سب کو نکال دوں۔

خوجی : نکالیے چاہے رہنے دیجیے، مگر اتنا حکم ضرور دے دیجیے کہ آپ کے سامنے دربان میں نہ کوئی چنڈو کی چھینٹے اڑائے، نہ مد کے دم لگائے اور نہ افیم گھولے۔

آزاد : دوسری بات یہ ہے کہ یہ خوشامدی لوگ آپ کی جھوٹی تعریفیں کر کر کے خوش کرتے ہیں۔ ان کو جھڑک دیجیے اور ان کی خوشامد پر خوش نہ ہو جیے۔

نواب : آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ واللہ، آپ کی بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ یہ سب بھرّے دے دے کر مجھے بلٹائے دیتے ہیں۔

آزاد : آپ کو خدا نے اتنی دولت دی ہے، یہ اس واسطے نہیں کہ آپ خوشامدیوں پر لٹائیں۔ اس کو اس طرح کام میں لائیں کہ ساری دنیا میں نہیں تو ہندستان بھر میں آپ کا نام ہو جائے۔ خیرات خانہ قائم کیجیے، ہسپتال بنوایئے، عالموں کی قدر کیجیے۔ میں نے آپ کے دربار میں کسی عالم فاضل کو نہیں دیکھا۔

نواب : بس، آج ہی سے انھیں نکال باہر کرتا ہوں۔

آزاد : اپنی عادتیں بھی بدل ڈالیے، آپ دن کو گیار بجے سو کر اٹھتے اور ہاتھ منھ دھو کر چنڈو کے چھینٹے اڑاتے ہیں۔ اس کے بعد ان فقرے بازوں سے چہل ہوتی ہے۔ صبح کا کھانا آپ کو تین بجے نصیب ہوتا ہے۔ آپ پھر آرام کرتے ہیں تو شام سے پہلے نہیں اٹھتے۔ پھر وہی چنڈ اور مدک کا بازار گرم ہوتا ہے۔ کوئی دو بجے رات کو آپ کھانا کھاتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجیے کہ دنیا میں آپ کون سا کام کرتے ہیں۔

نواب : ان بدمعاشوں نے مجھے تباہ کر دیا۔

آزاد : سویرے اٹھیے، ہوا کھانے جایئے۔ اخبار پڑھیے، بھلے آدمیوں کی صحبت میں بیٹھیے، اچھی اچھی کتابیں پڑھیے، ضروری کاغذوں کو سمجھیے، پھر دیکھیے کہ آپ کی زندگی کتنی سدھر جاتی ہے۔

نواب : خدا کی قسم، آج سے ایسا ہی کروں گا، ایک ایک حرف کی تعمیل نہ ہو تو سمجھ لیجیے گا بڑا جھوٹا آدمی ہے۔

خوجی : حضور، مجھے تو برسوں اس دربار میں ہو گئے، جب سرکار نے کوئی بات ٹھان لی تو پھر چاہے زمین اور آسمان ایک طرف ہو جائے، آپ اس کے خلاف کبھی نہ کریں گے۔ برسوں سے یہی دیکھتا آتا ہوں۔

آزاد : ایک اشتہار دے دیجیے کہ لوگ اچھی اچھی کتابیں لکھیں، انھیں انعام دیا جائے گا۔ پھر دیکھیے، آپ کا کیسا نام ہوتا ہے!

نواب : مجھے کسی بات میں عذر نہیں ہے۔

ادھر مصاحبوں میں اور ہی بات ہو رہی تھیں۔

مستیا بیگ : واللہ، آج تو اپنا خون پی کر رہ گیا یارو!

مرزا : دیکھتے ہو، کس طرح جھڑک دیا؟

مستیا بیگ : جھڑک کیا دیا، بس کچھ نہ پوچھو، میں جان بوجھ کر چپ ہو رہا، نہیں بے ڈھب ہو جاتی۔ کسی نے اپنی عزت نہیں بیچی ہے۔ اور اب آپس میں صلاحیں ہو رہی ہیں۔ خوجی نے سب کو بلٹایا۔

مستیا بیگ : کوئی لاکھ کہے، ہم نہ مانیں گے، یہ سب جادو کا کھیل ہے۔

غفور : میاں اس میں کیا شک ہے، یہ جادو نہیں تو ہے کیا؟

مرزا : اجی، الو کا گوشت نواب صاحب کو نہ کھلا دیا ہو، تو ناک کٹوا ڈالوں ان سب لوگوں نے مل کر الو کا گوشت کھلوا دیا ہے جبھی تو الو بن گئے، اب ان سے کہے کون؟

مستیا بیگ : کہہ کے بہت خوش ہوئے کہ اب کسی دوسرے کو ہمت ہوگی۔

غفور : اب تو کچھ دن خوجی کی خوشامد کرنی پڑے گی۔

مستیا بیگ : ہماری جوتی اس پاجی کی خوشامد کرتی ہے۔

مرزا : پھر نکالے جاؤ گے، یہاں رہنا ہے تو خوجی کو باپ بناؤ۔ دریا میں رہنا اور مگر سے بیر؟

مستیا بیگ : دو چار دن رہ کے یہاں کا رنگ ڈھنگ دیکھتے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو ہمارا استعفیٰ ہے، ایسی نوکری سے باز آئے۔ برابر والوں کی خوشامد ہم سے نہ ہو سکے گی۔

میر صاحبؔ : برابر والے کون؟ تمھارے برابر والے ہوں گے۔ ہم تو خوجی کو ذلیل سمجھتے ہیں۔

غفور : ارے صاحب، اب تو یہ سب کے افسر ہیں اور ہم تو انھیں گڑ گڑی پلا چکے۔ آپ لوگ انھیں مانیں یا نہ مانیں، ہمارے تو مالک ہیں۔

مرزا : سو برس بعد گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ بھائی جان، کسی کو اس کا گمان بھی تھا کہ خوجی کو سرکار اس تپاک سے اپنے پاس بیٹھائیں گے، مگر اب آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔

نواب صاحب باہر آئے تو اس ڈھنگ سے کہ ان کے ہاتھ میں سے ایک چھوٹی سی گڑگڑی اور خواجہ صاحب پی رہے ہیں۔ مصاحبوں کے رہے سہے ہوش بھی اڑ گئے۔ افوہ، سرکار کے ہاتھ میں گڑگڑی اور یہ ٹکرچا، رئیس بنا ہوا دم لگا رہا ہے۔ نواب صاحب مسند پر بیٹھے تو خوجی کو بھی اپنے برابر بیٹھایا۔ مصاحب سناٹے میں آ گئے۔ کوئی چوں تک نہیں کرتا، سب کی نگاہ خوجی پر ہے۔ بارے میر صاحب نے ہمت کر کے بات چیت شروع کی۔

میر صاحب : خدواند، آج کتنی بہار کا دن ہے، چمن سے کیسی بھینی بھینی خوشبو آ رہی ہے۔

نواب : ہاں، آج کا دن اسی لائق ہے کہ کوئی علمی بحث ہو۔

میر صاحب : خداوند، آج کا دن تو گانا سننے کے لیے بہت اچھا ہے۔

نواب : نہیں، کوئی علمی بحث ہونی چاہیے۔ خواجہ صاحب، آپ کوئی بحث شروع کیجیے۔

مستیا بیگ : (دل میں) ان کے باپ نے بھی کبھی علمی بحث کی تھی؟

مرزا : حضور، خواجہ صاحب کی لیاقت میں شک ہے، مگر ...

نواب : اگر مگر کے کیا معنی ؟ خواجہ صاحب کے عالم ہونے میں آپ لوگوں کو کچھ شک ہے؟

مرزا : کس علم کی بحث کیجیے گا خواجہ صاحب؟ علم کا نام تو معلوم ہو۔

خوجی : ہم علم زالوجی میں بحث کرتے ہیں، بتلائیے، اس علم کا کیا مطلب ہے۔

مرزا : کس علم کا نام لیا آپ نے، زالوجی! یہ زالوجی کیا بلا ہے؟

نواب : جب آپ کو اس علم کا نام تک نہیں معلوم تو بحث کیا خاک کیجیے گا۔ کیوں خواجہ صاحب، سنا ہے کہ دریا میں جہازوں کے ڈبو دینے کے اوزار بھی انگریزوں نے نکالے ہیں۔ یہ تو خدائی کرنے لگے۔

خوجی : اس اوزار کا نام تارپیڈو ہے۔ دو جہاز ہمارے سامنے ڈبو دیے گئے۔ پانی کے

اندر ہی اندر تارپیڈ چھوڑا جاتا ہے، بس جیسے ہی جہاز کے نیچے پہنچا ویسے ہی پھٹا۔ پھر تو جناب، جہاز کے کروڑوں ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔

مستیا بیگ : اور کیوں صاحب، یہ بم کا گولا کتنی دور دور کا توڑ کرتا ہے؟

خوجی : بم کے گولے کئی قسم کے ہوتے ہیں، آپ کس قسم کا حال دریافت کرتے ہیں؟

مستیا بیگ : اجی، یہی بم کے گولے۔

خوجی : آپ تو یہی یہی کرتے ہیں، اس کا نام تو بتلایئے؟

نواب : کیوں جناب، لڑائی کے وقت آدمی کے دل کا کیا حال ہوتا ہوگا؟ چاروں طرف موت ہی موت نظر آتی ہوگی؟

مرزا : میں عرض کروں حضور لڑائی کے میدان میں آکر ذرا...

نواب : چپ رہو صاحب، تم سے کون پوچھتا ہے، کبھی بندوق کی صورت بھی دیکھی ہے یا لڑائی کا حال ہی بیان کرنے چلے!

خوجی : جناب، لڑائی کے میدان میں جان کا ذرا بھی خوف نہیں معلوم ہوتا۔ آپ کو یقین نہ آئے گا، مگر میں صحیح کہتا ہوں کہ ادھر فوجی باجا بجا اور ادھر دلوں میں جوش امڑنے لگا۔ کیسا ہی بزدل ہو، ممکن نہیں کہ تلوار کھینچ کر فوج کے بیچ میں دھنس نہ جائے۔ ننگی تلوار ہاتھ میں لی اور دل بڑھا۔ پھر اگر دو کروڑ گولے بھی سر پر آئے تو کیا مجال کہ آدمی ہٹ جائے۔

خوجی یہی باتیں کر رہے تھے کہ خدمت گار نے آکر کہا۔ حضور، باہر ایک صاحب آئے ہیں، اور کہتے ہیں، نواب صاحب کو ہمارا سلام دو، ہمیں ان سے کچھ کہنا ہے۔ نواب صاحب نے کہا۔ خواجہ صاحب، آپ ذرا جا کر دریافت کیجیے کہ کون صاحب ہیں۔ خوجی بڑے غرور کے ساتھ اٹھے اور باہر جا کر صاحب کو سلام کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ پولس کا افسر ہے، ضلع کے حاکم نے اسے آزاد کا حال دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے۔

خوجی : آپ صاحب سے جا کر کہہ دیجیے، آزاد پاشا نواب صاحب کے مہمان ہیں اور ان کے ساتھ خواجہ صاحب بھی ہیں۔

افسر : تو صاحب اس سے ملنے والا ہے۔ اگر آج اس کو فرست ہو تو اچھا، نہیں تو جب اس کا جی چاہے۔

خوجی : میں ان سے پوچھ کر آپ کو لکھ بھیجوں گا۔

انسپکٹر صاحب چلے گئے تو مستیا بیگ نے کہا۔ کیوں صاحب، یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے آزاد پاشا سے اسی وقت کیوں نہ پوچھ لیا۔ ایک عہدے دار کو دق کرنے سے کیا فائدہ؟ خوجی نے تیوریاں بدل کر کہا۔ تم سے ہزار بار منع کیا کہ اس بارے میں نہ بولا کرو، مگر تم سنتے ہی نہیں۔ تم تو ہو عقل کے دشمن، ہم چاہتے ہیں کہ آزاد پاشا جب کسی حاکم سے ملیں تو برابر کی ملاقات ہو۔ اس وقت یہ وردی نہیں پہنے ہیں۔ کل جب یہ فوجی وردی پہن کر اور تمغے لا کر حاکمِ ضلع سے ملیں گے تو وہ کھڑا ہو کر تعظیم کرے گا۔

نواب : اب سمجھے یا اب بھی گدھے ہی بنے ہو؟ خواجہ صاحب کو تولنے چلے ہیں! واللہ، خواجہ صاحب، آپ نے خوب سوچی۔ اگر اس وقت کہہ دیتے کہ آزاد وہ کیا بیٹھے ہیں تو کتنی کرکری ہوتی۔

اتنے میں کھانے کا وقت آ پہنچا۔ کھانا چنا گیا، سب لوگ کھانے بیٹھے، اس وقت خوجی نے ایک قصہ چھیڑ دیا۔ حضور، ایک بار جب انگریزوں کی ڈچ لوگوں سے مٹھ بھیڑ ہوئی تو انگریزی افسر نے کہا، اگر کوئی آدمی دوسری طرف کے جہازوں کو لے آئے تو ہماری فتح ہو سکتی ہے، نہیں تو ہمارا بیڑا تباہ ہو جائے گا۔ اتنا سنتے ہی بارہ ملاح پانی میں کود پڑے۔ ان کے ساتھ پندرہ سال کا ایک لڑکا بھی پانی میں کودا۔

نواب : سمندر میں، اُفوہ!

خوجی : خداوند، ان سے بڑھ کر دلیر اور کون ہو سکتا ہے؟ بس افسر نے ملاحوں سے کہا، اس لڑکے کو روک لو۔ لڑکے نے کہا، واہ، میرے ملک پر اگر میری جان قربان ہو جائے تو کیا مضائقہ؟ یہ کہہ کر وہ لڑکا تیرتا ہوا نکل گیا۔

نواب : خواجہ صاحب، کوئی ایسی فکر کیجیے کہ ہماری آپ کی دوستی ہمیشہ اسی طرح قائم رہے۔

خوجی : بھائی سنو، ہمیں خوشامد کرنی منظور نہیں، اگر صاحب سلامت رکھنا ہے تو رکھیے، ورنہ آپ اپنے گھر خوش اور میں اپنے گھر خوش۔

نواب : یار، تم تو بے وجہ بگڑ کھڑے ہوتے ہو۔

خوجی : صاف تو یہ ہے کہ جو تجربہ ہم کو حاصل ہوا ہے اس پر ہم جتنا غرور کریں، بجا ہے۔

نواب : اس میں کیا شک ہے جناب۔
خوجی : آپ خوب جانتے ہیں کہ عالم لوگ کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ مجھے دنیا میں کسی سے دب کے چلنا ناگور ہے، اور ہم کیوں کسی سے دبیں؟ لالچ ہمیں چھونہیں گیا، ہمارے نزدیک بادشاہ اور فقیر دونوں برابر۔ جہاں کہیں گیا، لوگوں نے سر اور آنکھوں پر بیٹھایا۔ روم مصر، روس وغیرہ ملکوں میں میری جو قدر ہوئی وہ سارا زمانہ جانتا ہے۔ آپ کے دربار میں عالموں کی قدر نہیں۔ وہ دیکھیے، نالائق مستیا بیگ آپ کے سامنے چنڈو کا دم لگا رہا ہے۔ ایسے بدمعاشوں سے مجھے نفرت ہے۔
نواب : کوئی ہے، اس نالائق کو نکال دو یہاں سے۔
مصاحب : حضور تو آج ناحق خفا ہوتے ہیں، اس دربار میں تو روز ہی چنڈو کے دم لگا کرتے ہیں۔ اس نے کیا تو گناہ کیا؟
نواب : کیا بکتے ہو، ہمارے یہاں چنڈو کا دم کوئی نہیں لگاتا۔
خوجی : ہمیں یہاں آتے اتنے دن ہوئے، ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ چنڈو پینا شریفوں کا کام ہی نہیں۔
مرزا : تم تو غضب کرتے ہو خوجی، زمانہ بھر کے چنڈو باز، افیچی، اب آئے ہو وہاں سے بڑھ بڑھ کے باتیں بنانے۔ ذرا سرکار نے منھ لگایا تو زمین پر پاؤں ہی نہیں رکھتے۔
نواب : غفور، ان سب بدمعاشوں کو نکال باہر کرو۔ خبردار جو آج سے کوئی یہاں آنے پایا۔
میر صاحب : خداوند! بس، اب کچھ نہ کہیے، ہم لوگوں نے اپنی عزت نہیں بیچی ہے۔
نواب : نکالو ان سبوں کو، ابھی ابھی نکال دو۔
خواجہ صاحب شہ پاکر اٹھے اور ایک کٹار لے کر مستیا بیگ پر جمایا۔ وہ تو جھلّایا تھا ہی، خوجی کو ایک چانٹا دیا، تو گر پڑے، اتنے میں کئی سپاہی آگئے، انھوں نے مستیا بیگ کو پکڑ لیا اور باقی سب بھاگ کھڑے ہوئے۔ خوجی جھاڑ پونچھ کر اٹھے اور اٹھتے ہی حکم دیا کہ مستیا بیگ کو ایک درخت میں باندھ کر دو سو کوڑے لگائے جائیں، نمک حرام اپنے مالک کے دوستوں سے لڑتا ہے۔ بدن میں کیڑے نہ پڑیں تو سہی۔
ادھر میاں آزاد صاحب سے مل کر لوٹے تو دیکھا کہ دربار میں سناٹا چھایا ہوا ہے۔

نواب صاحب انھیں دیکھتے ہی بولے حضرت آج سے ہم نے آپ کی صلاحوں پر چلنا شروع کر دیا ہے۔

آزاد : دربار کے لوگو کہاں غائب ہو گئے؟

خوجی : سب کے سب نکال دیے گئے، اب کوئی یہاں پھٹکنے بھی نہ پائے گا۔

نواب : اب ہم حکام سے ملا کریں گے اور کوشش کریں.کہ ہر ایک قسم کی کمیٹی میں شریک ہوں۔ واہی تباہی آدمیوں کی صحبت میں آپ دیکھیں تو میرے کان پکڑیے گا۔

آزاد: اب آپ ہر قسم کی کتابیں پڑھا کیجیے۔

نواب : آپ جو کچھ فرماتے ہیں، بجا ہے، میرا پچیس واں سال ہے، ابھی مجھے پڑھنے لکھنے کا بہت موقع ہے، اور مجھے کرنا ہی کیا ہے۔

آزاد : خدا آپ کی نیت میں برکت دے۔

خوجی : بس، آج سے آپ کو عالموں کی صحبت رکھنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو، اس وقت تو سب کچھ تکرار کر لیجیے اور کل سے پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔

نواب : خدا نے چاہا تو یہ سب باتیں اب نام کو بھی نہ دیکھیے گا۔

دوسرے دن آزاد سیر کرنے نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک جگہ کئی آدمی ایک چھت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ آزاد کو دیکھتے ہی ایک آدمی نے آکر ان سے کہا۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو، تو ذرا میرے ساتھ آیئے۔ آزاد اس کے ساتھ چھت پر پہنچے تو ان آدمیوں میں سے ایک کی صورت اپنی صورت سے ملتی جلتی پائی۔ اس نے آزاد کی تعظیم کی اور کہا۔ آیئے، آپ سے کچھ باتیں کروں۔ آپ نے اپنی صورت تو آئینے میں دیکھی ہوگی۔

آزاد : ہاں، اور اس وقت تو بغیر آئینہ کے دیکھ رہا ہوں۔ آپ کا نام؟

آدمی : مجھے آزاد مرزا کہتے ہیں۔

آزاد : تب تو آپ میرے ہم نام بھی ہیں۔ آپ نے مجھے کیونکر پہچانا؟

مرزا : میں نے آپ کی تصویریں دیکھی ہیں اور اخباروں میں آپ کا حال پڑھتا رہا ہوں۔

آزاد : اس وقت آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

مرزا : اور ابھی اور بھی خوشی ہوگی۔ ثریا بیگم کو تو آپ جانتے ہیں؟

آزاد : ہاں ہاں، آپ کو ان کا کچھ حال معلوم ہے؟

مرزا : جی ہاں، آپ کے دھوکے میں میں ان کے یہاں پہنچا تھا، اور اب تو وہ بیگم ہیں۔ ایک نواب صاحب کے ساتھ ان کا نکاح ہوگیا۔

آزاد : کیا اب دور سے بھی ملاقات نہ ہوگی؟

مرزا : ہرگز نہیں۔

آزاد : بے اختیار جی چاہتا ہے کہ مل کر باتیں کروں۔

مرزا : کوشش کیجیے، شاید ملاقات ہو جائے، مگر امید نہیں۔

(106)

آزاد ثریا بیگم کی تلاش میں نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک باغ میں کچھ لوگ ایک رئیس کی صحبت میں بیٹھے گپیں اڑا رہے ہیں۔ آزاد نے سمجھا، شاید ان لوگوں سے ثریا بیگم کے نواب صاحب کا کچھ پتہ چلے۔ آہستہ آہستہ ان کے قریب گئے۔ آزاد کو دیکھتے ہی وہ رئیس چونک کر کھڑا ہوگیا اور ان کی طرف دیکھ کر بولا۔ واللہ، آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ شکر ہے کہ گھر بیٹھے مراد پوری ہوئی۔ فرمایئے، آپ کی کیا خدمت کروں؟

مصاحب : حضور، جنڈل صاحب کو کوئی ایسی چیز پلایئے کہ روح تک تازہ ہو جائے۔

خاں صاحب : مجھے پار سال سبل وایو کا مرض ہو گیا تھا۔ دو مہینے ڈاکٹر کا علاج ہوا۔ خاک فائدہ نہ ہوا۔ بیس دن تک حکیم صاحب نے نسخے پلائے، مرض اور بھی بڑھ گیا۔ پڑوس میں ایک بید راج رہتے ہیں، انھوں نے کہا، میں دو دن میں اچھا کر دوں گا۔ دس دن تک ان کا علاج رہا، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ آخر ایک دوست نے کہا۔ بھائی، تم سب کی دوا چھوڑ دو، جو ہم کہیں وہ کرو۔ بس حضور، دو بار برانڈی پلائی۔ دو چھٹانک شام کو، دو چھٹانک صبح کو، اس کا یہ اثر ہوا کہ چوتھے دن میں بالکل چنگا ہو گیا۔

رئیس : برانڈی کے بڑے بڑے فائدے لکھے ہیں۔

دیوان : سرکار، پیشاب کے مرض میں تو برانڈی اکسیر ہے۔ جتنی دیتے جایئے اتنی ہی فائدہ کرتی ہے۔

خاں صاحب : حضور، آنکھوں دیکھی کہتا ہوں۔ ایک سوار کو مرگی آتی تھی، سینکڑوں علاج

کیے، کچھ اثر نہ ہوا، آخر ایک آدمی نے کہا، حضور حکم دیں تو ایک دوا بتاؤں۔ دعویٰ کرکے کہتا ہوں کہ کل ہی مرگی نہ رہے۔ خداوند، دو چھٹانک شراب لیجیے اور اس میں اس دونا پانی ملائیے، اگر ایک دن میں فائدہ نہ ہو تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

نواب: یہ صفت ہے اس میں!

مصاحب: حضور، گنواروں نے اسے جھوٹ موٹ بدنام کر دیا ہے۔ کیوں جنڈیل صاحب، آپ کو کبھی اتفاق ہوا ہے؟

آزاد: واہ، کیا میں مسلمان نہیں ہوں۔

نواب: کیا خوب جواب دیا ہے، سبحان اللہ!

اتنے میں ایک مصاحب جن کو اوروں نے سکھا پڑا کر بھیجا تھا، چوگا پہنے اور لگام باندھے آپہونچے۔ لوگوں نے بڑے تپاک سے ان کی تعظیم کی اور بلا کر بیٹھایا۔

نواب: کیسے مزاج ہے مولانا صاحب؟

مولانا: خدا کا شکر ہے۔

مصاحب: کیوں مولانا صاحب، آپ کے خیال میں شراب حلال ہے یا حرام؟

مولانا: اگر تمھارا دل صاف نہیں تو ہزار بار حج کرو، کوئی فائدہ نہیں۔ ہر ایک چیز نیت کے لحاظ سے حلال یا حرام ہوتی ہے۔

آزاد: جناب، ہم نے ہر قسم کے آدمی دیکھے۔ کسی صحبت سے پرہیز نہیں کیا، آپ لوگ شوق سے پیئں، میرا کچھ خیال نہ کریں۔

نواب: نیت کی صفائی اسی کو کہتے ہیں۔ حضرت آزاد، آپ کی جتنی تعریف سنی تھی، اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔

ایک صاحب نیچے سے شراب، سوڈا کا بوتلیں اور برف لائے اور دور چلنے لگے۔ جب سرور جما تو گپیں اڑنے لگیں۔

خاں صاحب، خداوند، ایک بار نیپال کی ترائی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ چودہ آدمی ساتھ تھے، وہاں جنگل میں شہد بکثرت سے ہے اور شہد کی مکھیوں کی عجب خاصیت ہے کہ بدن پر جہاں کہیں بیٹھتی ہیں، درد ہونے لگتا ہے۔ میں نے وہاں کے باشندوں سے پوچھا، کیوں بھائی، اس کی کچھ دوا بھی ہے؟ کہا، اس کی دوا شراب ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں کئی براہمن

بھی تھے۔ وہ شراب کو چھو نہ سکتے تھے۔ ہم نے دوا کے طور پر پی، ہمارا درد تو جاتا رہا اور وہ سب ابھی تک جھینک رہے ہیں۔

نواب : واللہ، اس کے فائدے بڑے بڑے ہیں، مگر حرام ہے، اگر حلال ہوتی تو کیا کہنا تھا۔

مصاحب : خداوند، اب تو سب حلال ہے۔

خاں صاحب : خداوند، ہیضے کی دوا، پیچش کی دوا، بواسیر کی دوا، دمے کی دوا، یہاں تک کہ موت کی بھی دوا۔

دیوان : او ہو ہو، موت کی دوا!

نواب : خبردار، سب کے سب خاموش، بس کہہ دیا۔

دیوان : خاموش! خاموش!

خاں صاحب : تپ کی دوا، سر درد کی دوا، بڑھاپے کی دوا۔

نواب : یہ تم لوگ بہکتے کیوں ہو؟ ہم نے بھی تو پی ہے۔ حضرت، مجھے ایک عورت نے نصیحت کی تھی۔ تب سے کیا مجال کہ میری زبان سے ایک بے ہودہ بات بھی نکلے۔ (چپراسی کو بلا کر) رمضانی، تم خاں صاحب اور دیوان جی کو یہاں سے لے جاؤ۔

دیوان : علم کی قسم، اگر اتنی گستاخی ہماری شان میں کروگے تو ہم سے جوتی بیزار ہو جائے گی۔

نواب : کوئی ہے؟ جو لوگ بہک رہے ہوں انھیں دربار سے نکال دو اور پھر بھول کے بھی نہ آنے دینا۔

لالہ : ابھی نکال دو سب کو!

یہ کہہ کر لالہ صاحب نے رمضان خاں پر ٹیپ جمائی۔ وہ پٹھان آدمی، ٹیپ پڑتے ہی آگ ہو گیا۔ لالہ صاحب کے پٹے پکڑ کر دو چار دھپیں زور زور سے لگا بیٹھا۔ اس پر دو چار آدمی اور اِدھر اُدھر سے اٹھے۔ لپا لنگی ہونے لگی۔ آزاد نے نواب صاحب سے کہا۔ میں تو رخصت ہوتا ہوں۔ نواب صاحب نے کہا۔ آزاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور باغ میں لا کر بولے۔ حضرت، میں بہت شرمندہ ہوں کہ ان پاجیوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی۔ کیا کہیں، اس عورت نے ہمیں وہ نصیحت کی تھی کہ اگر ہم آدمی ہوتے تو ساری عمر آرام کے ساتھ بسر

کرتے۔ مگر ان مصاحبوں نے خدا سمجھے، ہمیں پھر گھیر گھار کے پھندے میں پھنسا لیا۔
نواب : بھائی، صاحب، یہی باتیں اس عورت نے بھی سمجھائی تھیں۔
آزاد : آخر وہ عورت کون تھی اور آپ سے اس سے کیا تعلق تھا؟
نواب : حضرت، عرض کیا نا کہ ایک دن دوستوں کے ساتھ ایک باغ میں بیٹھا تھا کہ ایک عورت سفید دولائی اوڑھے نکلی۔ دو چار بگڑے دلوں نے اسے چکما دے کر بلایا۔ وہ تکلفی کے ساتھ آکر بیٹھی تو مجھ سے بات چیت ہونے لگی۔ اس کا نام اللہ رکھی تھا۔
اللہ رکھی کا نام سنتے ہی آزاد نے ایسا منہ بنا لیا گویا کچھ جانتے ہی نہیں، مگر دل میں سوچے کہ واہ ری اللہ رکھی، جہاں جاؤ، اس کے جاننے والے نکل ہی آتے ہیں۔ کچھ دیر بعد نواب صاحب نشے میں چور ہی ہوگئے اور آزاد باہر نکلے تو ایک پرانے جان پہچان کے آدمی سے ملاقات ہوگئی۔ آزاد نے پوچھا کہیے حضرت، آج کل آپ کہاں ہیں؟
آدمی : آج کل تو نواب واجد حسین کی خدمت میں ہوں۔ حضور تو خیریت سے رہے؟ حضور کا نام تو ساری دنیا میں روشن ہو گیا۔
آزاد : بھائی، جب جانیں کہ ایک بار ثریا بیگم سے دو دو باتیں کرا دو۔
آدمی : کوشش کروں گا حضور، کسی نہ کسی حیلے سے وہاں تک آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔
یہ معاملہ ٹھیک ٹھاک کر کے آزاد ہوٹل میں گئے تو دیکھا کہ خوجی بڑی شان سے بیٹھے گپیں اڑا رہے ہیں اور دونوں پریاں ان کی باتیں سن سن کر کھلکھلا رہی ہیں۔
کلاریسا : تم اپنی بیوی سے ملے، بڑی خوشی ہوئی ہوگی؟
خوجی : جی ہاں، محلّے میں پہنچتے ہی مارے خوشی کے لوگوں نے تالیاں بجائی۔ لونڈوں نے ڈھیلے مار مار کر غل مچایا کہ آئے آئے۔ اب کوئی گلے ملتا ہے، کوئی مارے محبت کے اٹھاکے دے مارتا ہے۔ سارا محلّہ کہہ رہا ہے تم نے تو روم میں وہ کام کیا کہ جھنڈے گاڑ دیے۔ گھر میں جو خبر ہوئی تو لونڈی نے آکر سلام کیا۔ حضور آیئے، بیگم صاحب بڑی دیر سے انتظار کر رہی ہیں۔ میں نے کہا، کیونکر چلوں؟ جب یہ اتنے بھوت چھوڑے بھی۔ کوئی ادھر گھسیٹ رہا ہے، کوئی ادھر اور وہاں جان عذاب میں ہے۔
میڈا : گھر کا حال بیان کرو۔ وہاں کیا باتیں ہوئیں؟
خوجی : دلان تک بیوی ننگے پاؤں اس طرح دوڑی آئی کہ ہانپ گئی۔

میڈا : ننگے پاؤں کیوں؟ کیا تم لوگوں میں جوتا نہیں پہنتے؟
خوجی : پہنتے کیوں نہیں، مگر جوتا تو ہاتھ میں تھا۔
میڈا : ہاتھ سے اور جوتے سے کیا واسطہ؟
خوجی : آپ ان باتوں کو کیا سمجھیں۔
میڈا : تو آخر کچھ کہوگے بھی؟
خوجی : اس کا مطلب یہ ہے کہ میاں اندر قدم رکھیں اور ہم کھوپڑی سہلا دیں۔
میڈا : کیا یہ بھی کوئی رسم ہے؟
خوجی : یہ سب ادائیں ہم نے سکھائی ہیں۔ ادھر ہم گھر میں گھسے، ادھر بیگم صاحب نے جوتیاں لگائیں۔ اب ہم چھپے تو کہاں چھپے، کوئی چھوٹا موٹا آدمی ہو تو اِدھر اُدھر چھپ رہے، ہم یہ ڈیل ڈول لے کے کہاں جائیں؟
کلاریسا : سچ تو ہے، قد کیا ہے، تاڑ ہے۔
میڈا : کیا تمھاری بیوی بھی تمھاری ہی طرح اونچے قد کی ہیں؟
خوجی : جناب، مجھ سے پورے دو ہاتھ اونچی ہیں۔ آکر بولیں، اتنے دنوں کے بعد آئے تو کیا لائے ہو؟ میں نے تمغہ دکھا دیا تو کھل گئیں۔ کہا، ہمارے پاس آج کل باٹ نہ تھے، اب اس سے ترکاری تولا کروں گی۔
میڈا : کیا پتھر کا تمغہ ہے؟ کیا خوب قدر کی ہے۔
کلاریسا : اور تمھیں تمغہ کب ملا؟
خوجی : کہیں ایسا کہنا بھی نہیں۔
اتنے میں آزاد پاشا چپکے سے آگے بڑھے اور کہا۔ آداب عرض ہے۔ آج تو آپ سے خاصے رئیس بنے ہوئے ہیں؟
خوجی : بھائی جان، وہ رنگ جمایا کہ اب خوجی ہی خوجی ہیں۔
آزاد : بھئی، اس وقت ایک بڑی فکر میں ہوں۔ اللہ رکھی کا حال تو جانتے ہی ہو۔ آج کل وہ نواب واجد حسین کے محلے میں ہے۔ اس سے ایک بار ملنے کی دھن سوار ہے۔ بتلاؤ، کیا تدبیر کروں؟
خوجی : اجی، یہ لٹکے ہم سے پوچھو۔ یہاں ساری زندگی یہی کیا کیے ہیں۔ کسی چوڑی

والی کو کچھ دے دلا کر راضی کر لو۔

آزاد کے دل میں بھی یہ بات جم گئی۔ جا کر ایک چوڑی والی کو بلا لائے۔

آزاد : کیوں بھلے مانس، تمھاری پیٹھ تو بڑے بڑے گھروں میں ہوگی۔ اب یہ بتلاؤ کہ ہمارے بھی کام آؤ گی؟ اگر کوئی کام نکلے تو کہیں، ورنہ بیکار ہے۔

چوڑی والی : ارے، تو کچھ منھ سے کہیے بھی؟ آدمی کا کام آدمی ہی سے تو نکلتا ہے۔

آزاد : نواب واجد حسین کو جانتی ہو؟

چوڑی والی : اپنا مطلب کہیے۔

آزاد : بس انھیں کے محل میں ایک پیغام بھیجنا ہے۔

چوڑی والی : آپ کا تو وہاں گزر نہیں ہوسکتا۔ ہاں، آپ کا پیغام وہاں تک پہنچا دوں گی۔ معاملہ جوکھم کا ہے، مگر آپ کے خاطر کر دوں گی۔

آزاد : تم ثریا بیگم سے اتنا کہہ دو کہ آزاد نے آپ کو سلام کہا ہے۔

چوڑی والی : آزاد آپ کا نام یا کسی اور کا؟

آزاد : کسی اور کا نام یا پیغام سے ہمیں کیا واسطہ۔ میری یہ تصویر لے لو، موقع ملے تو دکھا دینا۔

چوڑی والی نے تصویر ٹوکرے میں رکھی اور نواب واجد حسین کے گھر چلی۔ ثریا بیگم کوٹھے پر بیٹھی دریا کی سیر کر رہی تھیں۔ چوڑی والی نے جا کر سلام کیا۔

ثریا : کوئی اچھی چیز لائی ہو یا خالی خولی آئی ہو؟

چوڑی والی : حضور، وہ چیز لائی ہوں کہ دیکھ کر خوش ہو جایئے گا، مگر انعام بھرپور لوں گی۔

ثریا : کیا ہے، ذرا دیکھوں تو؟

چوڑی والی نے بیگم صاحب کے ہاتھوں میں تصویر رکھ دی۔ دیکھتے ہی چونک کے بولیں۔ سچ بتانا، کہاں پائی؟

چوڑی والی : پہلے یہ بتلائے کہ یہ کون صاحب ہیں اور آپ سے کبھی کی جان پہچان ہے کہ نہیں؟

ثریا : بس یہ نہ پوچھو، یہ بتلاؤ کہ تصویر کہاں پائی؟

چوڑی والی : جن کی یہ تصویر ہے، ان کو آپ کے سامنے لاؤں تو کیا انعام پاؤں۔

ثریا : اس بارے میں میں کوئی بات چیت کرنا نہیں چاہتی۔ اگر وہ خیریت سے لوٹ آئیں ہیں تو خدا انھیں خوش رکھے اور ان کے دل کی مرادیں پوری ہوں۔

چوڑی والی : حضور، یہ تصویر انھوں نے مجھ کو دی۔ کہا، اگر موقع ہو تو ہم بھی ایک نظر دیکھ لیں۔

ثریا : کہہ دینا کہ آزاد، تمھارے لیے دل سے دعا نکلتی ہے، مگر پچھلی باتوں کو جانے دو، ہم پرائے بس میں ہیں اور ملنے میں بدنامی ہے۔ ہمارا دل کتنا ہی صاف ہو، مگر دنیا کو تو نہیں معلوم ہے، نواب صاحب کو معلوم ہو گیا، تو ان کا دل کتنا دکھے گا۔

چوڑی والی : حضور، ایک دفعہ مکھڑا تو دکھا دیجیے، ان آنکھوں کی قسم، بہت ترس رہے ہیں۔

ثریا : چاہے جو ہو، جو بات خدا کو منظور تھی، وہ ہوئی اور اسی میں اب ہماری بہتری ہے۔ یہ تصویر یہیں چھوڑ جاؤ، میں اسے چھپا کر رکھوں گی۔

چوڑی والی : تو حضور، کیا کہہ دوں۔ صاف ٹکا سا جواب؟

ثریا : نہیں، تم سمجھا کر کہہ دینا کہ تمھارے آنے سے جتنی خوشی ہوئی، اس کا حال خدا ہی جانتا ہے۔ مگر اب تم یہاں نہیں آ سکتے اور نہ میں ہی کہیں جا سکتی ہوں، اور پھر اگر چوری چھپے ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیا تو کیا فائدہ۔ پچھلی باتوں کو اب بھول جانا ہی مناسب ہے۔ میرے دل میں تمھاری بڑی عزت ہے۔ پہلے میں تم سے غرض کی محبت کرتی تھی۔ اب تمھاری پاک محبت کرتی ہوں۔ خدا نے چاہا تو شادی کے دن حسن آرا بیگم کے یہاں ملاقات ہوگی۔

یہ وہی اللہ رکھی ہیں جو سرائے میں چمکتی ہوئی نکلتی تھیں۔ آج انھیں پردے اور حیا کا اتنا خیال ہے۔ چوڑی والی نے جا کر یہاں کی ساری داستان آزاد کو سنائی۔ آزاد بیگم کی پاکدامنی کی گھنٹوں تعریف کرتے رہے۔ یہ سن کر انھیں بڑی تسکین ہوئی کہ شادی کے دن وہ حسن آرا بیگم کے یہاں ضرور آئیں گی۔

(107)

میاں آزاد سیلانی تو تھے ہی، حسن آرا سے ملاقات کرنے کے بدلے کئی دن تک شہر میں

مٹرگشت کرتے رہے، گویا حسن آرا کی یاد ہی نہیں رہی۔ ایک دن سیر کرتے کرتے وہ ایک باغ میں پہنچے اور ایک کرسی پر بیٹھے۔ یکا یک ان کے کان میں آواز آئی۔

چلے ہم اے جنوں جب فصلِ گل میں سیر گلشن کو
عوض پھولوں کے پتھر سے بھرا گلچیں نے دامن کو
سمجھ کر چاند ہم نے یار تیرے روئے روشن کو
کہا بالے کو ہالہ اور مہ نو تاکے گردن کو
جو وہ تلوار کھینچے تو مقابل کر دوں میں دل کو
لڑاؤں دوست سے اپنے میں اس پہلو کے دشمن کو
کروں آہیں تو منہ کو ڈھانپ کر وہ شوخ کہتا ہے
ہوا سے کچھ نہیں ہے ڈر چراغِ زیرِ دامن کو
تواضع چاہتے ہو زاہدوں کیا بدخواروں سے
کہیں جھکتے بھی دیکھا ہے بھلا شیشے کی گردن کو

آزاد کے کان کھڑے ہوئے کہ یہ کون گا رہا ہے۔ اتنے میں ایک کھڑکی کھلی اور ایک چاند سی صورت ان کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ مگر اتفاق سے اس کی نظر ان پر نہیں پڑی۔ اس نے اپنا رنگین ہاتھ ماتھے پر رکھ کر کسی ہمجولی کو پکارا، تو آزاد نے یہ شیر پڑھا۔

ہاتھ رکھتا ہے وہ بت اپنی بھوؤں پر اس طرح
جیسے مہراب پر اللہ لکھا ہوتا ہے

اس نازنین نے آواز سنتے ہی ان پر نظر ڈالی اور دریچہ بند کر لیا۔ ڈوپٹے کو جو ہوا نے اڑا دیا تو آدھا کھڑکی کے ادھر اور آدھا ادھر۔ اس پر اس شوخ نے جھلّا کر کہا، یہ نگوڑا دوپٹہ بھی میرا دشمن ہوا ہے۔

آزاد : اللہ رے غضب، دوپٹے پر بھی غصہ آتا ہے۔
صنم : اخواہ، یہ تو کوئی سڑی سا معلوم ہوتا ہے۔
آزاد : یا خدا، یہ آدم زاد ہیں یا کوہ قاف کی پریاں۔
صنم : تم یہاں کہاں سے بھٹک کے آ گئے؟
آزاد : بھٹکتے کوئی اور ہوں گے، ہم تو اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

صنم : منزل پر پہنچنا دل لگی نہیں ہے، ابھی دلی دور ہے۔

آزاد : یہ کہاں کا دستور ہے کہ کوئی زمین پر ہو، کوئی آسمان پر؟ آپ سوار، میں پیدل، بھلا کیونکر بنے!

صنم : اور سنو، آپ تو پیٹ سے پاؤں نکالنے لگے، اب یہاں سے بوریا بدھنا اٹھاؤ اور چلتا دھندھا کرو۔

آزاد : اتنا حکم دو کہ قریب سے دو دو باتیں کر لیں۔

صنم : وہ کام کیوں کریں جس میں فساد کا ڈر ہے؟

سہیلی : اے بلا لو، بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ (آزاد سے) چلے آیئے صاحب، چلے آیئے۔

آزاد خوش خوش اٹھے اور کوٹھے پر جا پہنچے۔

صنم : واہ بہن واہ، ایک اجنبی کو بلا لیا۔ تمھاری بھی کیا باتیں ہیں۔

آزاد : بھئی، ہم بھی آدمی ہیں۔ آدمی کو آدمی سے اتنا بھاگنا نہیں چاہیے۔

صنم : حضرت، آپ کے بھلے ہی کے لیے کہتی ہوں، یہ بڑے جوکھم کی جگہ ہے، ہاں، اگر سپاہی آدمی ہو تو تم خود تاڑ لوگے۔

آزاد نے جو یہ باتیں سنیں تو چکر میں آئے کہ ہندستان سے روس تک ہو آئے اور کسی نے چوں تک نہ کی، اور یہاں سے اس طرح کی دھمکی دی جاتی ہے۔ سوچے کہ اگر یہ سن کر یہاں سے بھاگ جاتے ہیں تو یہ دونوں دل کھول کر ہنسیں گی اور اگر ٹھہر جائیں تو آثار برے نظر آتے ہیں۔ باتوں باتوں میں اس نازنین سے پوچھا۔ یہ کیا بھید ہے؟

صنم : یہ نہ پوچھو بھئی، ہمارا حال بیان کرنے کے قابل نہیں۔

آزاد : آخر کچھ معلوم تو ہو، تمھیں کیا تکلیف ہے؟ مجھے تو کچھ دال میں کالا ضرور معلوم ہوتا ہے۔

صنم : جناب یہ جہنم ہے اور ہماری جیسی کتنی ہی عورتیں اس جہنم میں رہتی ہیں۔ یوں کہیے کہ ہمیں سے یہ جہنم آباد ہے۔ ایک کندن نامی بڑھیا برسوں سے یہی پیشہ کرتی ہے خدا جانے اس نے کتنے گھر تباہ کیے۔ اگر مجھ سے پوچھو کہ تیرے ماں باپ کہاں ہیں، تو میں کیا جواب دوں، مجھے اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ بڑھیا مجھے کسی گاؤں سے پکڑ لائی تھی۔ میرے ماں

باپ نے بہت تلاش کی، مگر اس نے مجھے گھر سے نکلنے نہ دیا۔ اس وقت میرا سن چار پانچ سال سے زیادہ نہ تھا۔

آزاد : تو کیا یہاں سب ایسے ہی جمع ہیں۔

صنم : یہ جو میری سہیلی ہیں، کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہیں۔ کندن ان کے یہاں آنے جانے لگی اور ان سبھوں سے اس طرح کی سانٹھ گانٹھ کی کہ عورتیں اسے بلانے لگیں۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ کندن کے یہ ہتھ کنڈے ہیں۔

آزاد : بھلا کندن سے میری ملاقات ہو تو اس سے کیسی باتیں کروں؟

صنم : وہ اس کا موقع ہی نہ دے گی کہ تم کچھ کہو۔ جو کچھ کہنا ہوگا، وہ خود کہہ چلے گی۔ لیکن جو تم سے پوچھے کہ تم یہاں کیونکر آئے؟

آزاد : میں کہہ دوں گا کہ تمھارا نام سن کر آیا۔

صنم : ہاں، اس ترکیب سے بچ جاؤگے جو ہمیں دیکھتا ہے، سمجھتا ہے کہ یہ بڑی خوش نصیب ہیں۔ پہننے کے لیے اچھے اچھے سے کپڑے، کھانے کے لیے اچھے سے اچھے کھانے، رہنے کے لیے بڑی سے بڑی حویلیاں، دل بہلاوئے کے لیے ہمجولیاں، سب کچھ ہیں، مگر دل کو خوشی اور چین نہیں۔ بڑی خوش نصیب وہ عورتیں ہیں جو ایک میاں کے ساتھ تمام عمر کاٹ دیتی ہیں۔ مگر ہم بدنصیب عورتوں کے ایسے نصیب کہاں۔ اس بڑھیا کو خدا غارت کرے جس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

آزاد : مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ یہاں سب چین ہی چین ہے، مگر اب معلوم ہوا کہ معاملہ اس کا الٹا ہے۔

صنم : ہزاروں آدمیوں سے بات چیت ہوتی ہے، مگر ہمارے ساتھ شادی کرنے کو کوئی پتیاتا ہی نہیں۔ کندن سے سب ڈرتے ہیں۔ شہدے لچّوں کی بات کا اعتبار کیا، دو ایک نے نکاح کا وعدہ کیا بھی تو پورا نہ کیا۔

یہ کہہ کر وہ نازنین رونے لگی۔

آزاد نے سمجھایا کہ دل کو ڈھارس دو اور یہاں سے نکلنے کی حکمت سوچو۔

صنم : خدا بڑا کارساز ہے، اس کو کام کرتے دیر نہیں لگتی، مگر اپنے گناہوں کو جب دیکھتے ہیں تو دل گواہی نہیں دیتا کہ ہمیں یہاں سے چھٹکارا ملے گا۔

آزاد : میں تو اپنی طرف سے ضرور کوشش کروں گا۔

صنم : تم مردوں کی بات کا اعتبار کرنا فضول ہے۔

آزاد : واہ! کیا پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں؟

اتنے میں ایک اور حسین آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا نام نورجان تھا۔ آزاد نے اس سے کہا۔ تم بھی اپنی کچھ حال کہو۔ یہاں کیسے آ پھنسی؟

نور : میاں، ہمارا کیا حال پوچھتے ہو، ہمیں اپنا حال خود ہی نہیں معلوم۔ خدا جانے، ہندو کے گھر جنم لیا یا مسلمان کے گھر پیدا ہوئی۔ اس مکان کی مالک ایک بڑھیا ہے، اس کے کاٹے کا منتر نہیں، اس کا یہی پیشہ ہے کہ جس طرح ہو، کمسن اور خوبصورت لڑکیوں کو پھسلا کر لے آئے۔ سارا زمانہ اس کے ہتھ کنڈوں کو جانتا ہے، مگر کسی سے آج تک بندوبست نہیں ہو سکا۔ اچھے اچھے مہاجن اور بیوپاری اس کے مکان پر ماتھا رگڑتے ہیں، بڑے بڑے شریف زادے اس کا دم بھرتے ہیں۔ شہزادوں تک کے پاس اس کی پہنچ ہے، سنتے تھے کہ برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے، مگر خدا جانے، بڑھیا کو ان بڑے کاموں کی سزا کیوں نہیں ملتی؟ اس چڑیل نے خوب روپے جمع کیے ہیں اور اتنا نام کمایا ہے کہ دور دور تک مشہور ہو گئی ہے۔

آزاد : تم سب کی سب مل کر بھاگ کیوں نہیں جاتیں؟

صنم : بھاگ جائیں تو پھر کھائیں کیا، یہ تو سوچو۔

آزاد : اس نے اپنی مکاری سے اس قدر تم سب کو بے وقوف بنا رکھا ہے۔

صنم : بے وقوف نہیں۔ بنایا ہے، یہ بات سہی ہے، کھانے بھر کا سہارا تو ہو جائے۔

آزاد : تمھاری آنکھ پر غفلت کی پٹی باندھ دی ہے۔ تم اتنا نہیں سوچتی کہ تمھارے بدولت اس نے اتنا سارا روپیہ پیدا کیا اور تم کھانے کو محتاج رہو گی؟ جو پسند ہو اس کے ساتھ شادی کر لو اور آرام سے زندگی بسر کرو۔

صنم : یہ سچ ہے، مگر اس کا رعب مارے ڈالتا ہے۔

آزاد : اف رے رعب، یہ بڑھیا بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

صنم : اس طرح کی میٹھی میٹھی باتیں کرے گی تم بھی اس کا کلمہ پڑھنے لگو گے۔

آزاد : اگر مجھے حکم دیجیے تو میں کوشش کروں۔

صنم : واہ، نیکی اور پوچھ پوچھ؟ آپ کا ہمارے اوپر بڑا احسان ہوگا۔ ہماری زندگی برباد

ہو رہی ہے۔ ہمیں ہر روز گالیاں دیتی ہے اور ہمارے ماں باپ کو کوسا کرتی ہے۔ گو انھیں آنکھوں سے نہیں دیکھا، مگر خون کا جوش کہاں جائے؟

اس فقرے سے آزاد کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں، انھوں نے ٹھان لی کہ اس بڑھیا کی ضرور سزا کرائیں گے۔

اتنے میں سہیلی نے آکر کہا۔ بڑھیا آگئی ہے، دھیرے دھیرے باتیں کرو۔ آزاد نے صنم کے کان میں کچھ کہہ دیا اور دونوں کی دونوں چلی گئیں۔

کندن : بیٹا، آج ایک اور شکار کیا، مگر ابھی بتائیں گے نہیں۔ یہ دروازے پر کون کھڑا تھا؟

صنم : کوئی بہت بڑے رئیس ہیں، آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

کندن : اچھا بیٹھو۔ آج کل بے فصل کی بارش سے بڑی تکلیف ہوتی ہے، اچھی وہ فصل کی ہر چیز وقت پر ہو، برسات ہو تو مینہ برسے، سردی کے موسم میں سردی خوب ہو اور گرمی میں لُو چلے، مگر جہاں کوئی بات بے موسم کی ہوئی اور بیماری پیدا ہو گئی۔

آزاد : جی ہاں، قاعدے کی بات ہے۔

کندن : اور بیٹا، ہزار بات کی ایک بات یہ ہے کہ آدمی برائی سے بچے۔ آدمی کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن اس کو منہ دکھانا ہے، جس نے اسے پیدا کیا۔ برا آدمی کس منہ سے منہ دکھائے گا؟

آزاد : کیا اچھی بات آپ نے کہی ہے، ہے تو یہی بات!

کندن : میں نے تمام عمر اسی میں گزاری کہ لاوارث بچوں کی پرورش کروں، ان کو کھلاؤں پلاؤں اور اچھی اچھی باتیں سکھاؤں۔ خدا مجھے اسُ کا بدلا دے تو واہ واہ، ورنہ اور کچھ فائدہ نہ سہی، تو اتنا فائدہ تو ہے کہ ان بیکسوں کو میری ذات سے پرورش ہوئی۔

آزاد : خدا ضروری اس کا ثواب دے گا۔

کندن : تم نے میرا نام کس سے سنا؟

آزاد : آپ کے نام کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔

کندن : واہ، میں تو کبھی کسی سے اپنی تعریف ہی نہیں کرتی۔ جو لڑکیاں میں پالتی ہوں ان کو بالکل اپنے خاص بیٹی کی طرح سمجھتی ہوں۔ کیا مجال کہ ذرا بھی فرق ہو۔ جب دیکھا کہ

وہ سیانی ہوئیں تو ان کو کسی اچھے گھر بیاہ دیا، مگر خوب دیکھ بھال کے۔ شادی مرد اور عورت کی رضامندی سے ہونی چاہیے۔

آزاد : یہی شادی کے معنی ہیں۔

کندن : تمھاری عمر دراز ہو بیٹا، آدمی جو کام کرے، عقل سے، ہر پہلو کو دیکھ بھال کے۔

آزاد : بغیر اس کے میاں بیوی میں محبت نہیں ہو سکتی اور یوں زبردستی کی تو بات ہی اور ہے۔

کندن : میرا قاعدہ ہے کہ جس آدمی کو پڑھا لکھا دیکھتی ہوں اس کے سوا اور کسی سے نہیں بیاہتی اور لڑکی سے پوچھ لیتی ہوں کہ بیٹا، اگر تم کو پسند ہو تو اچھا، نہیں کچھ زبردستی نہیں ہے۔

یہ کہہ کر اس نے مہری کو اشارہ کیا۔ آزاد نے اشارہ کرتے تو دیکھا، مگر ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے کیا معنی ہیں۔ مہری فوراً کوٹھے پر گئی اور تھوڑی ہی دیر میں کوٹھے سے گانے کی آوازیں آنے لگی۔

کندن : میں نے سب کو گانا بھی سکھایا ہے، گو یہاں اس کا رواج نہیں۔

آزاد : تمام دنیا میں عورتوں کو گانا بجانا سکھایا جاتا ہے۔

کندن : ہاں، بس ایک اس ملک میں نہیں۔

آزاد : یہ تو تین کی آوازیں معلوم ہوتی ہے، مگر ان میں سے ایک کا گلا بہت صاف ہے۔

کندن : ایک تو ان کا دل بہلتا ہے، دوسرے جو سنتا ہے اس بھی دل بہلتا ہے۔

آزاد : مگر آپ نے کچھ پڑھایا بھی ہے یا نہیں؟

کندن : دیکھو بلواتی ہوں، مگر بیٹا، نیت صاف رہنی چاہیے۔

اس ٹھگوں کو بڑھیا نے سب سے پہلے نور کو بلایا۔ وہ لجاتی ہوئی آئی اور بڑھیا کے پاس اس طرح گردن جھکائے بیٹھی جیسے کوئی شرمیلی دلہن۔

آزاد : اے صاحب، سر اونچا کر کے بیٹھو، یہ کیا بات ہے؟

کندن : بیٹا، اچھی طرح سر اٹھا کر۔ (آزاد سے) ہماری سب لڑکیاں شرمیلی اور حیادرا

ہیں۔

آزاد : یہ آپ اوپر کیا گا رہی تھیں؟ ہم بھی کچھ سنیں۔

کندن : بیٹی نور، وہی غزل گاؤ۔

نور : امّاں جان، ہمیں شرم آتی ہے۔

کندن : کہتی ہے، ہمیں شرم آتی ہے، شرم کی کیا بات ہے، ہماری خاطر سے گاؤ۔

نور : (کندن کے کان میں) امّاں جان، ہم سے نہ گایا جائے گا۔

آزاد : یہ نئی بات ہے۔

اکڑتا ہے کیا دیکھ دیکھ آئینہ
ہنسیں گرچہ ہے تو پر اتنا گھمنڈ

کندن : لو، انھوں نے گا کے سنا دیا۔

مہری : کہیے حضور، دل کا پردہ کیا کم ہے کہ آپ مارے شرم کے منھ چھپائے لیتی ہیں۔ اے بی بی گردن اونچی کرو، جس دن دلہن بنوگی، اس دن اس طرح بیٹھنا تو کچھ مضائقہ نہیں ہے۔

کندن : ہاں، بات تو یہی ہے، اور کیا؟

آزاد : شکر ہے، آپ نے ذرا گردن تو اٹھائی۔

بات سب ٹھیک ٹھاک ہے، پر ابھی
کچھ سوال و جواب باقی ہیں

کندن : (ہنس کر) اب تم جانو اور یہ جانے۔

آزاد : اے صاحب، ادھر دیکھیے۔

نور : امّاں جان، اب ہم یہاں سے جاتے ہیں۔

کندن نے چٹکی لے کر کہا۔ کچھ بولو جس میں ان کا بھی دل خوش ہو، کچھ جواب دو، یہ کیا بات ہے۔

نور : امّاں جان، کس کو جواب دوں؟ نہ جان، نہ پہچان۔

کندن ان کاموں میں آٹھوں گانٹھ کُمَیت، کسی بہانے سے ہٹ گئی۔ نور نے بھی بناوٹ کے ساتھ چاہا کہ چلی جائے، اس پر کندن نے ڈانٹ بتائی۔ ہیں ہیں، یہ کیا، بھلے مانس ہیں یا

کوئی نیچ قوم؟ شریفوں سے اتنا ڈر! آخر نور شرما کر بیٹھ گئی۔ اُدھر کندن نظر سے غائب ہوئی، اِدھر مہری بھی چمپت۔

آزاد : یہ بڑھیا تو ایک ہی کائیاں ہے۔

نور : ابھی دیکھتے جاؤ، یہ اپنے نزدیک تم کو عمر بھر کے لیے غلام بنائے لیتی ہے، جو ہم نے پہلے سے اس کا حال نہ بیان کر دیا ہوتا تو تم بھی چنگ پر چڑھ جاتے۔

آزاد : بھلا یہ کیا بات ہے کہ تم اس کے سامنے اتنا شرماتی رہیں؟

نور : ہم کو سکھایا ہے وہ کہتے ہیں، کیا کریں؟

آزاد : اچھا، ان دونوں کو کیوں نہ بلایا؟

نور : دیکھتے جاؤ، سب کو بلائے گی۔

اتنے میں مہری پان، الائچی اور عطر لے کر آئی۔

آزاد : مہری صاحب، یہ کیا اندھیر ہے؟ آدمی سے بولتا ہے یا نہیں؟

مہری : اے بی بی، تم نے کیا بولنے کی قسم کھا لی ہے؟ لے اب ہم سے تو بہت نہ اڑو۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو بات چیت تک نوبت آچکی ہوگی اور ہمارے سامنے گھونگھٹ کی لیتی ہیں۔

آزاد : گردن تک تو اونچی نہیں کرتیں، بولنا چالنا کیسا، یا تو بنتی ہیں یا اماں جان سے ڈرتی ہیں۔

مہری : واہ واہ، حضور واہ، بھلا یہ کاہے سے جان پڑا کہ بنتی ہیں؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آنکھوں کی حیا کے سبب سے لجاتی ہوں؟

آزاد : واہ، آنکھیں کہہ دیتی ہیں کہ نیت کچھ اور ہے۔

نور : خدا کی سنوار جھوٹے پر۔

مہری : شاباش، بس یہ اسی بات کی منتظر تھیں۔ میں تو سمجھے ہی بیٹھی تھی کہ جب یہ زبان کھولیں گی، پھر بند ہی کر چھوڑیں گی۔

نور : ہمیں بھی کوئی گنوار سمجھا ہے کیا؟

آزاد : واللہ، اس وقت ان کا تیوری چڑھانا عجب لطف دیتا ہے۔ ان کے جوہر تو اب کھلے۔ ان کی اماں جان کہاں چلی گئیں؟ ذرا ان کو بلوائیے تو!

مہری : حضور، ان کا قاعدہ ہے کہ اگر دو دل مل جاتے ہیں تو پھر نکاح پڑھوا دیتی ہیں، مگر مرد بھلا مانس ہو، چار پیسے پیدا کرتا ہو۔ آپ پر تو کچھ بہت ہی مہربان نظر آتی ہیں کہ دو باتیں ہوتے ہی اٹھ گئیں، ورنہ مہینوں جانچ ہوا کرتی ہے، آپ کی شکل وصورت سے ریاست برستی ہے۔

نور : واہ، اچھی پھبتی کہی، بے شک ریاست برستی ہے۔

یہ کہہ نور نے آہستہ آہستہ گانا شروع کیا۔

آزاد : میں تو ان کی آواز پر عاشق ہوں۔

نور : خدا کی شان، آپ کیا اور آپ کی قدردانی کیا!

آزاد : دل میں تو خوش ہوئی ہوں گی، کیوں مہری؟

مہری : اب یہ آپ جانیں اور وہ جانیں، ہم سے کیا؟

یکا یک نور اٹھ کر چلی گئی۔ آزاد اور مہری کے سوا وہاں کوئی نہ رہا، تب مہری نے آزاد سے کہا۔ حضور نے مجھے پہچانا نہیں، اور میں حضور کو دیکھتے ہی پہچان گئی، آپ ثریا بیگم کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔

آزاد : ہاں، اب یاد آیا، بے شک میں نے تم کو ان کے یہاں دیکھا تھا۔ کہو، معلوم ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟

مہری : حضور، اب وہ وہاں ہیں جہاں چڑیاں بھی نہیں جا سکتی، مگر کچھ انعام دیجیے تو دکھا دوں۔ دور ہی سے بات چیت ہوگی۔ ایک رئیس آزاد نام کے تھے، انھیں کے عشق میں جوگن ہو گئی۔ جب معلوم ہوا کہ آزاد نے حسن آرا سے شادی کر لی تو مجبور ہو کر ایک نواب سے نکاح پڑھوا لیا۔ آزاد نے یہ بہت برا کیا۔ جو اپنے اوپر جان دے، اس کے ساتھ ایسی بے وفائی نہ کرنی چاہیے۔

آزاد : ہم نے سنا ہے کہ آزاد انھیں بھٹیاری سمجھ کر نکل بھاگے۔

مہری : اگر آپ کچھ دلوائیں تو میں بیڑا اٹھاتی ہوں کہ ایک نظر اچھی طرح دکھا دوں گی۔

آزاد : منظور، مگر بے ایمانی کی سند نہیں۔

مہری : کیا مجال، انعام پیچھے دیجیے گا، پہلے ایک کوڑی بھی نہ لوں گی۔

مہری نے آزاد سے یہاں کا سارا کچا چٹھا کہہ سنایا۔ میاں، یہ بڑھیا جنتی اوپر ہے، اتنی

ہی نیچے ہے، اس کے کاٹے کا منتر نہیں۔ پر آزاد کو ثریا بیگم کی دھن تھی۔ پوچھا۔ بھلا ان کا مکان ہم دیکھ سکتے ہیں؟

مہری : جی ہاں، یہ کیا سامنے ہے۔

آزاد : اور یہ جتنی یہاں ہے، سب اسی فیشن کی ہوں گی؟

مہری : کسی کو چرا لائی ہیں، کسی کو مول لیا ہے، بس کچھ نہ پوچھیے؟

اتنے میں کسی نے سیٹی بجائی اور مہری فوراً ادھر چلی گئی ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں کندن آئی اور کہا۔ ایں، یہاں تم بیٹھے ہو، توبہ توبہ مگر لڑکیوں کو کیا کروں، اتنی شرمیلی ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ (مہری کو پکار کر) اے، ان کو بلاؤ، کہو، یہاں آ کر بیٹھیں۔ یہ کیا بات ہے؟ جیسے کوئی کاٹے کھاتا ہے۔

یہ سنتے ہی صنم چھم چھم کرتی ہوئی آئی۔ آزاد نے دیکھا تو ہوش اڑ گئے، اس مرتبہ غضب کا نکھار تھا۔ آزاد اپنے دل میں سوچے کہ یہ صورت اور یہ پیشہ۔ ٹھان لی کہ کسی موقع پر ضلعے کے حاکم کو ضرور لائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ خدا کے لیے ان پریوں کو اس مکار عورت سے بچاؤ۔

کندن نے صنم کے ہاتھوں میں ایک پنکھا دے دیا اور جھلنے کو کہا۔ پھر آزاد سے بولی۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیان کر دو۔

آزاد : اس وقت دل وہ مزے لوٹ رہا ہے جو بیان سے باہر ہے۔

کندن : میرے یہاں صفائی کا بہت انتظام ہے۔

آزاد : آپ کے کہنے کی ضرورت نہیں۔

کندن : یہ جتنی ہیں سب ایک سے ایک بڑھی ہوئی ہیں۔

آزاد : ان کے شوہر بھی انھیں کے سے ہوں تو بات ہے۔

کندن : اس میں کسی کے سکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان کے لیے ایسے لوگوں کو چنوں گی جن کا کہیں ثانی نہ ہو۔ ان کو کھلایا، پلایا، گانا سکھایا، اب ان پر ظلم کیسے برداشت کروں گی؟

آزاد : اور تو اور، مگر ان کو تو آپ نے خوب ہی سکھایا۔

کندن : اپنا اپنا دل ہے، میری نگاہ میں تو سب برابر، آپ دو چار دن یہاں رہیں، اگر

ان کی طبیعت نے منظور کیا تو ان کے ساتھ آپ کا نکاح کر دوں گی، بس اب تو خوش ہوئے۔

مہری : وہ شرطیں تو بتا دیجیے!

کندن : خبردار، بیچ میں نہ بول اٹھا کرو، سمجھی؟

مہری : ہاں حضور، خطا ہوئی۔

آزاد : پھر اب تو شرطیں بیان کر دیجیے نہ۔

کندن : اطمینان کے ساتھ بیان کروں گی۔

آزاد ء (صنم سے) تم نے تو ہمیں اپنا غلام ہی بنا لیا۔

صنم نے کوئی جواب نہ دیا۔

آزاد : اب ان سے کیا کوئی بات کرے۔

گوارہ نہیں ہے جنھیں بات کرنا
سنیں گے وہ کاہے کو قصہ ہمارا

کندن : ایک ہاں، یہ تم میں کیا عیب ہے؟ باتیں کرو بیٹا!

صنم : اماں جان، کوئی بات ہو تو کیا مضائقہ اور یوں خواہ مخواہ ایک اجنبی سے باتیں کرنا کون سی دانائی ہے۔

کندن : خدا گواہ کر کے کہتی ہوں کہ یہ سب کی سب بڑی شرمیلی ہیں۔

آزاد کو اس وقت یاد آیا کہ ایک دوست سے ملنے جانا ہے، اس لیے کندن سے رخصت مانگی اور کہا کہ آج معاف کیجیے، کل حاضر ہوں گا، مگر اکیلے جاؤں، یا دوستوں کو بھی ساتھ لیتا آؤں؟ کندن نے کھانا کھانے کے لیے بہت ضد کی، مگر آزاد نے نہ مانا۔

آزاد نے ابھی باغ کے باہر بھی قدم نہیں رکھا تھا کہ مہری دوڑی آئی اور کہا۔ حضور کو بی بی بلاتی ہیں۔ آزاد اندر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کندن کے پاس صنم اور اس کی سہیلی کے سوا ایک اور کامنی بیٹھی ہوئی ہے اور آن بان میں ان دونوں سے بڑھ کر ہے۔

کندن : یہ ایک جگہ گئی ہوئی تھیں، ابھی ڈولی سے اتری ہیں۔ میں نے کہا، تم کو ذرا دکھا دوں کہ میرا گھر سچ مچ پرستان ہے، مگر بدی قریب نہیں آنے پاتی۔

آزاد : یہ تو سبھوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

کندن : بیٹا، سبھی گھر گرہست کی بہو بیٹیاں ہیں، کہیں آئیں نہ جائیں، نہ کسی سے ہنسی، نہ دل لگی۔

آزاد : بے شک، ہمیں آپ کے یہاں کا قرینہ بے حد پسند آیا۔

کندن : بولو بیٹا، منھ سے کچھ بولو، دیکھو، ایک شریف آدمی بیٹھے ہیں اور تم نہ بولتی ہو، نہ چالتی ہو۔

پری : کیا کروں، آپ ہی آپ بکوں؟

کندن : ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے، وہ تمھاری طرف منھ کر کے بات چیت کریں تب بولو۔ لیجیے صاحب، اب تو آپ ہی کا قصور ٹھہرا۔

آزاد : بھلا سنیے تو، مہمانوں کی خاطر داری بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟

کندن : ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے، اب بتاؤ بیٹا؟

پری : اماں جان، ہم تو سب کے مہمان ہیں؛ ہماری جگہ سب کے دل میں ہیں، ہم بھلا کسی کی خطر داری کیوں کریں؟

کندن : اب فرمایئے حضرت، جواب پایا؟

آزاد : وہ جواب پایا کہ لاجواب ہو گیا۔ خیر صاحب، خاطرداری نہ سہی، کچھ غصہ ہی کیجیے۔

پری : اس کے لیے بھی قسمت چاہیے۔

میاں آزاد بڑے بولکڑ تھے، مگر اس وقت سٹی پٹی بھول گئے۔

کندن : اب کچھ کہیے، چپ کیوں بیٹھے ہیں؟

پری : اماں جان، آپ کی تعلیم ایسی ویسی نہیں ہے کہ ہم بند رہیں۔

کندن : مگر میاں صاحب کی قلعی کھل گئی۔ ارے، کچھ تو فرمایئے حضرت

کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں

آج 'غالب' غزل سرا نہ ہوا

آزاد : آپ شعر بھی کہتی ہیں؟

نور : اے واہ، ایسے گھبرائے کہ 'غالب' کا تخلص موجود ہے اور آپ پوچھتے ہیں کہ آپ شعر بھی کہتی ہیں؟

پری : آدمی میں حواس ہی حواس تو ہیں، اور ہے کیا؟
صنم : ہم جو گردن جھکائے بیٹھے تھے تو آپ بہت شیر تھے، مگر اب ہوش اڑے ہوئے ہیں۔
سہیلی : تم پر ریجھے ہوئے ہیں بہن، دیکھتی ہو، کن آنکھوں سے گھور رہے ہیں۔
پری : اے ہٹو بھی، ایڑی چوٹی پر قربان کر دوں۔
آزاد : یا خدا، اب ہم ایسے گئے گزرے ہو گئے؟
پری : اور آپ اپنے کو سمجھے کیا ہیں!
کندن : یہ ہم نہ مانیں گے، ہنسی دل لگی اور بات ہے، مگر یہ بھی لاکھ دو لاکھ میں ایک ہیں۔
پری : اب اماں جان کل تک تعریف کیا کریں گی۔
آزاد : پھر جو تعریف کے قابل ہوتا ہے، اس کی تعریف ہوتی ہی ہے۔
نور : اوں ہوں، گھر کی پھلکی باسی ساگ۔
آزاد : جلن ہوگی کہ ان کی تعریف کیوں کی۔
نور : یہاں تعریف کی پرواہ نہیں۔
کندن : یہ تو خوب کہی، اب اس کا جواب دیجیے۔
آزاد : حسینوں کو کسی کی تعریف کب پسند آتی ہیں؟
نور : بھلا خیر، آپ اس قابل تو ہوئے کہ آپ کے حسن سے لوگوں کے دل میں جلن ہونے لگی۔
کندن : (صنم سے) تم نے ان کو سب کچھ سنایا نہیں بیٹا؟
صنم : ہم کیا کچھ ان کے نوکر ہیں؟
آزاد : خدا کے لیے کوئی پھڑکتی ہوئی غزل گاؤ، بلکہ اگر کندن صاحب کا حکم ہو تو سب مل کر گئیں۔
صنم : حکم، حکم تو ہم بادشاہ وزیر کا نہ مانیں گے۔
پری : اب اسی بات پر جو کوئی گائے۔
کندن : اچھا، حکم کہا تو کیا گناہ کیا، کتنی ڈھیٹ لڑکیاں ہیں کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے

دیتیں۔

صنم : اچھا بہن، آؤ، مل مل کر گائیں۔

اے عشق قمر دل کا جلانا نہیں اچھا۔

پری : یہ کہاں سے بوڑھی غزل نکالی؟ یہ غزل گاؤ۔

گیا یار آفت پڑی اس شہر پر
اداسی برسنے لگی بام و در پر
صبا نے بھری دن کو ایک آہ ٹھنڈی
قیامت ہوئی یا دلِ نوحہ گر پر
میرے بھاویں گلشن کو آتش لگی ہے
نظر کیا پڑے خاک گلہائے تر پر
کوئی دیو تھا یا کہ جن تھا وہ کافر
مجھے غصہ آتا ہے پچھلے پہر پر

یکایک کسی نے باہر سے آواز دی۔ کندن نے دروازے پر جا کر کہا۔ کون صاحب ہیں؟

سپاہی : داروغہ جی آئے ہیں، دروازہ کھول دو۔

کندن : اے تو یہاں کس کے پاس تشریف لائے ہیں؟

سپاہی : کندن کٹنی کے یہاں آئے ہیں۔ یہی مکان ہے یا اور؟

دوسرا سپاہی : ہاں ہاں جی، یہی ہے، ہم سے پوچھو۔

ادھر کندن پولس والوں سے باتیں کرتی تھی، ادھر آزاد تینوں عورتوں کے ساتھ باغ میں چلے گئے اور دروازہ بند کر دیا۔

آزاد : یہ ماجرا کیا ہے بھئی؟

صنم : دوڑ آئی ہے میاں، دروازہ بند کرنے سے کیا ہوگا، کوئی تدبیر ایسی بتاؤ کہ اس گھر سے نکل بھاگیں۔

پری : ہمیں یہاں ایک دم کا رہنا پسند نہیں۔

آزاد : کسی کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟

نور : اے ہے! یہ کیا غضب کرتے ہو، آہستہ سے بولو۔

آزاد : آخر یہ دوڑ کیوں آئی ہے، ہم بھی تو سنیں۔

صنم : کل ایک بھلے مانس آئے تھے۔ ان کے پاس ایک سونے کی گھڑی، سونے کی زنجیر، ایک بیگ، پانچ اشرفیاں اور کچھ روپے تھے۔ یہ بھانپ گئی۔ اس کو شراب پلا کر ساری چیزیں اڑا دیں۔ صبح کو جب اس نے اپنی چیزوں کی تلاش کی تو دھمکایا کہ لڑاؤ گے تو پولس کو اطلاع کر دوں گی۔ وہ بے چارہ سیدھا سادہ آدمی، چپ چاپ چلا گیا اور داروغہ سے شکایت کی، اب وہ دوڑ آئی ہے۔

آزاد : اچھا! یہ ہتھکنڈے ہیں۔

صنم : کچھ پوچھو نہ، جان عذاب میں ہے۔

نور : اب خدا ہی جانے، کس کس کا ناش وہ کرے گی، کیا آگ لگائے گی۔

صنم : اجی، وہ کسی سے دبنے والی نہیں ہے۔

پری : وہ نہ دبیں گی صاحب تک سے، یہ داروغہ لیے پھرتی ہیں!

صنم : ذرا سنو تو کیا ہو رہا ہے۔

آزاد نے دروازے کے پاس سے کان لگا کر سنا تو معلوم ہوا کہ بی بی کندن پولس والوں سے بحث کر رہی ہیں کہ تم میرے گھر بھر کی تلاشی لو۔ مگر یاد رکھنا، کل ہی تو نالش کروں گی۔ مجھے اکیلی عورت سمجھ کے دھمکا لیا ہے۔ میں عدالت چڑھوں گی۔ لینا ایک نہ دینا دو، اس پر یہ اندھیر! میں صاحب سے کہوں گی کہ اس کی نیت خراب ہے، یہ رعایا کو دق کرتا ہے اور پرائی بہو بیٹی کو تاکتا ہے۔

صنم : سنتی ہو، کیسا ڈانٹ رہی ہیں پولس والوں کو۔

پری : چپ چپ، ایسا نہ ہو، سب ادھر آ جائیں۔

ادھر کندن نے مسافر کو کوسنا شروع کیا۔ اللہ کرے، اس اٹھوارے میں اس کا جنازہ نکلے۔ موئے نہ آکے میری جان عذاب میں کر دی۔ میں نے تو غریب مسافر سمجھ کر ٹکا لیا تھا۔ موعا الٹا لیے پڑتا ہے۔

مسافر : داروغہ جی، اس عورت نے سینکڑوں کا مال مارا ہے۔

سپاہی : حضور، یہ پہلے غلام حسین کے پل پر رہتی تھی۔ وہاں ایک اہیرین کی لڑکی کو

پھسلا کر گھر لائی اور اسی دن مکان بدل دیا۔ اہیر نے تھانے پر رپٹ لکھائی۔ ہم جو جاتے ہیں تو مکان میں تالا پڑا ہوا، بہت تلاش کی، پتا نہ ملا۔ خدا جانے، لڑکی کسی کے ہاتھ بیچ ڈالی یا مر گئی۔

کندن : ہاں ہاں، بیچ ڈالی، یہی تو ہمارا پیشہ ہے۔

داروغہ : (مسافر سے) کیوں حضرت، جب آپ کو معلوم تھا کہ یہ کٹنی ہے تو آپ اس کے یہاں ٹکے کیوں؟

مسافر : بیدھا تھا، اور کیا، دو ڈھائی سو پر پانی پھر گیا، مگر شکر ہے کہ مار نہیں ڈالا۔

کندن : جی ہاں، صاف بچ گئے۔

داروغہ : (کندن سے) تو ذرا بھی نہیں شرماتی؟

کندن : شرماؤں کیوں؟ کیا چوری کی ہے؟

داروغہ : بس، خیریت اسی میں ہے کہ ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔

کندن : دیکھیے، اب کسی دوسرے گھر کا ڈاکہ ڈالوں تو ان کے روپے ملیں۔

سپاہی : حضور، اسے پکڑ کے تھانے لے چلیے، اس طرح یہ نہ مانے گی۔

کندن : تھانے میں کیوں جاؤں؟ کیا عزت بیچنی ہے! یہ نہ سمجھنا کہ اکیلی ہے۔ ابھی اپنے داماد کو بلا دوں تو آنکھیں کھل جائیں۔

یہ سنتے ہی آزاد کے ہوش اڑ گئے۔ بولے، اس مردار کو سوجھی کیا!

مہری : ذرا دروازہ کھولیے۔

آزاد : خدا کی مار تجھ پر۔

کندن : اے بیٹا، ذرا ادھر آؤ۔ مرد کی صورت دیکھ کر شاید یہ لوگ اتنا ظلم نہ کریں۔

داروغہ : اخواہ، کیا توپ ساتھ ہیں؟ ہم سرکاری آدمی اور تمھارے داماد سے دب جائیں! اب تو بتاؤ، ان کے روپے ملیں یا نہیں؟

کندن ایک سپاہی کو الگ لے گئی اور کہا۔ میں اسی وقت داروغہ جی کو اس شرط پر ستر روپے دیتی ہوں کہ وہ اس معاملے کو دبا دیں۔ اگر تم یہ کام پورا کر دو تو دس روپیہ تمھیں بھی دوں گی۔

داروغہ نے دیکھا کہ یہ مکار عورت جھانسا دینا چاہتی ہے تو اسے ساتھ لے کر تھانے

چلے گئے۔

آزاد : بڑی بلا اس وقت ٹلی۔ عورت کیا، سچ مچ بلا ہے۔

صنم : آپ کو ابھی اس سے کہاں سابقہ پڑا ہے۔

آزاد : میں تو اتنے ہی میں اوب اٹھا۔

صنم : ابھی یہ سمجھنا کہ بلا ٹل گئی، ہم سب باندھے جائیں گے۔

آزاد : ذرا اس شرارت کو تو دیکھو کہ مجھے تھانے دار سے لڑوائے دیتی تھی۔

صنم : خوش تو نہ ہو گے کہ داماد بنا دیا۔

آزاد : ہم ایسی ساس سے باز آئے۔

صنم : اس گلی سے کوئی آدمی بنا لٹے نہیں جا سکتا۔ ایک عورت کو تو اس نے زہر دلوا دیا تھا۔

نور : پڑوسن سے کوئی جا کر کہہ دے کہ تم اپنی لڑکی کا کیوں ستیاناس کرتی ہو۔ جو کچھ روکھا سوکھا اللہ دے وہ کھاؤ اور پڑی رہو۔

مہری : ہاں اور کیا، ایسے پلاؤ سے ڈال دلیا ہی اچھی۔

صنم : تم جا کے بلا لاؤ تو یہ سمجھا دیں حیلے سے۔

مہری جا کر پڑوسن کو بلا لائی۔ آزاد نے کہا۔ تمھاری پڑوسن کو تو سپاہی لے گئے۔ اب یہ مکان ہمیں سونپ گئی ہیں۔ پڑوسن نے ہنس کر کہا۔ میاں، ان کو سپاہی لے جا کر کیا کریں گے؟ آج گئیں کل چھوٹ آئیں گی۔

اتنے میں ایک آدمی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ مہری نے دروازہ کھولا تو ایک بوڑھے میاں دکھائی دیے۔ پوچھا۔ بی کندن کہاں ہیں؟ مہری نے کہا۔ ان کو تھانے کے لوگ لے گئے۔

صنم : ایک سرے سے اتنے مقدمے، ایک دو تین۔

نور : ہر روز ایک نیا پنچھی پھنساتی ہے۔

بوڑھے میاں : بس، اب پیالہ بھر گیا۔

صنم : روز تو یہی سنتی ہوں کہ پیالہ بھر گیا۔

بوڑھے میاں : اب موقع پا کے تم سب کہیں چل کیوں نہیں دیتی ہو؟ اب اس وقت تو

وہ نہیں ہے۔

صنم : جائیں تو بے سوچے سمجھے کہاں جائیں؟

آزاد : بس اسی اتفاق کو ہم لوگ قسمت کہتے ہیں اور اسی کا نام اقبال ہے۔

بوڑھے میاں : جی ہاں، آپ تو نئے آئے ہیں، یہ عورت خدا جانے، کتنے گھر تباہ کر چکی ہے۔ پولس میں بھی گرفتار ہوئی۔ مجسٹریٹی بھی گئی۔ سب کچھ ہوا، سزا پائی، مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ان میں سے جس کا جی چاہے، میرے ساتھ چلی چلے۔ کسی شریف کے ساتھ نکاح پڑھوا دوں گا، مگر کوئی راضی نہیں ہوتی۔

یکایک کسی نے پھر دروازے پر آواز دی، مہری نے دروازہ کھولا تو ممن اور گل باز اندر داخل ہوئے۔ دونوں ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ مہری انھیں اشارے سے بلا کر باغ میں لے گئی۔

ممن : کندن کہاں ہیں؟

مہری : وہ تو آج بڑی مصیبت میں پھنس گئیں۔ پولس والے پکڑ لے گئے۔

ممن : ہم تو آج اور ہی منصوبے باندھ کر آئے تھے۔ وہ جو مہاجن گلی میں رہتے ہیں، ان کی بہو اجمیر سے آئی ہے۔

مہری : ہاں، میرا جانا ہوا ہے۔ بہت سے روپے لائی ہے۔

گل باز : مہاجن گنگا نہانے گیا ہے۔ پرسوں تک آ جائے گا۔ ہم نے کئی آدمیوں سے کہہ دیا تھا۔ سب کے سب آتے ہوں گے۔

ممن : کندن نہیں ہے، نہ سہی! ہم اپنے کام سے کیوں غافل رہیں۔ آؤ ایک آدھ چکر لگائیں۔

اتنے میں باغ کے دروازے کی طرف سیٹی کی آواز آئی۔ گل باز نے درواہ کھول دیا اور بولا۔ کون ہے، دلبر؟

دلبر : بس اب دیر نہ کرو۔ وقت جاتا ہے بھائی۔

گل باز : ارے یار، آج تو معاملہ بچ گیا۔

دلبر : ایں! ایسا نہ کہو۔ دو لاکھ نقد رکھا ہوا ہے۔ اس میں ایک بھی کم ہو، تو جو جرمانہ کہو، دوں۔

ممن : اچھا، تو کہیں بھاگا جاتا ہے؟

دلبر : یہ کیا ضروری ہے کہ کندن ضرور ہی ہو۔

ممن : بھائی جان، ایک کندن کے نہ ہونے سے کہیں یار لوگ چوکتے ہیں، اور بھی کئی سبب ہیں۔

دلبر : ایسے معاملے میں اتنی سستی!

ممن : یہ سارا قصور گل باز کا ہے۔ چنڈو خانے میں پڑے چھینٹے اڑایا کیے، اور سارا کھیل بگاڑ دیا۔

دلبر : آج تک اس معاملے میں ایسے لونڈے نہیں بنے تھے۔ وہ دن یاد ہے کہ جب ظہورن کی گلی میں چھری چلی تھی؟

گل باز : میں اس دن کہاں تھا؟

دلبر : ہاں، تم تو مرشد آباد چلے گئے تھے۔ اور یہاں ظہون نے ہمیں اطلاع دی کہ سلطان مرزا چل بسے۔ سلطان مرزا کے محلّے میں سب موٹے روپے والے، مگر ان کے مارے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ ان کے محلّے میں جائے۔

ممن : وہ تو اس فن کا استاد تھا۔

دلبر : بس جناب، ادھر سلطان مرزا مرے، ادھر ظہورن نے ہمیں بلوایا۔ ہم لوگ جا پہنچے۔ اب سنیے کہ جس طرف جاتے ہیں، کوئی گا رہا ہے، کوئی گھر ایسا نہیں، جہاں روشنی اور جاگ نہ ہو۔

ممن : کسی نے پہلے سے محلّے والوں کو ہوشیار کر دیا ہوگا۔

دلبر : جی ہاں، سنتے تو جائیے۔ پیچھے کھلا نہ۔ ہوا یہ کہ جس وقت ہم لوگوں نے ظہورن کے دروازے پر آواز دی، تو ان کی ماما نے پڑوسن کے مکان میں کنکری پھینکی۔ اس پڑوسن نے دوسرے مکان میں۔ اس طرح محلّے بھر میں خبر ہو گئی۔

یہاں تو یہ باتیں ہو رہی تھیں، ادھر بوڑھے میاں اور آزاد میں کندن کو سزا دلانے کے لیے صلاحیں ہوتی تھیں۔

آزاد : جن جن لڑکیوں کو اس نے چوری سے بیچ لیا ہے، ان سبھوں کا پتہ لگائیے۔

بوڑھے میاں : اجی، ایک دو ہوں، تو پتہ لگاؤں۔ یہاں تو شمار ہی نہیں۔

آزاد : میں آج ہی حاکمِ ضلع سے اس کا ذکر کروں گا۔

ان لوگوں سے رخصت ہو کر آزاد مجسٹریٹ کے بنگلے پر آئے۔ پہلے اپنے کمرے میں جا کر منھ ہاتھ دھویا، اور کپڑے بدل کر اس کمرے میں گئے، جہاں صاحب مہمانوں کے ساتھ ڈِنر کھانے بیٹھے تھے۔ ابھی کھانا چنا ہی جا رہا تھا کہ آزاد کمرے میں داخل ہوئے۔ آپ شام کو آنے کا وعدہ کر گئے تھے۔ 9 بجے پہنچے تو سب نے مل کر قہقہہ لگایا۔

میم : کیوں صاحب، آپ کے یہاں اب شام ہوئی؟

صاحب : بڑی دیر سے آپ کا انتظار تھا۔

میڈا : کہیں شادی تو نہیں طے کر آئے؟

صاحب : ہاں، دیر ہونے سے تو ہم سب کو یہی شک ہوا تھا۔

میم : جب تک آپ دیر کی وجہ نہ بتائیں گے، یہ شک نہ دور ہوگا۔ آپ لوگوں میں تو چار شادیاں ہو سکتی ہیں۔

کلاریسا : آپ چپ کیوں ہیں، کوئی بہانہ سوچ رہے ہیں؟

آزاد : اب میں کیا بیان کروں۔ یہاں تو سب لال بوجھکڑ ہی بیٹھے ہیں۔ کوئی چہرے سے تاڑ جاتا ہے، کوئی آنکھوں سے پہچان لیتا ہے، مگر اس وقت میں جہاں تھا، وہاں خدا کسی کو نہ لے جائے۔

صاحب : جواریوں کا اڈا تو نہ تھا؟

آزاد : نہیں، وہ اور ہی معاملہ تھا۔ اطمینان سے کہوں گا۔

لوگ کھانا کھانے لگے۔ صاحب کے زور دینے پر بھی آزاد نے شراب نہ پی۔ کھانا ہو جانے پر لیڈیوں نے گانا شروع کیا اور صاحب بھی شریک ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے آزاد سے کچھ گانے کو کہا۔

آزاد : آپ کو اس میں کیا لطف آئے گا؟

میم : نہیں، ہم ہندوستانی گانا پسند کرتے ہیں، مگر جو سمجھ میں آئے۔

آزاد نے بہت حیلہ کیا، مگر صاحب نے ایک نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کر یہ غزل گائی۔

جان سے جاتی ہیں کیا کیا حسرتیں
کاش وہ بھی دل میں آنا چھوڑ دے

'داغ' سے میرے جہنم کو مثال
تو بھی واعظ دل جلانا چھوڑ دے
پردے کی کچھ حد بھی ہے پردہ نشیں
کھل کے مل بس منہ چھپانا چھوڑ دے

میم : ہم کچھ کچھ سمجھے۔ وہ جہنم کا شعر اچھا ہے۔

صاحب : ہم تو کچھ نہیں سمجھے۔ مگر کانوں کو اچھا معلوم ہوا۔

دوسرے دن آزاد تڑکے کندن کے مکان پر پہنچے اور مہری سے بولے۔ کیوں بھائی، تم ثریا بیگم کو کسی طرح دکھا سکتی ہو؟

مہری : بھلا میں کیسے دکھا دوں؟ اب تو میری وہاں پہنچ ہی نہیں۔

آزاد : خدا گواہ ہے، فقط ایک نظر بھر دیکھنا چاہتا ہوں۔

مہری : خیر، اب آپ کہتے ہی ہیں تو کوشش کروں گی۔ اور آج ہی شام کو یہیں چلے آیئے گا۔

آزاد : خدا تم کو سلامت رکھے، بڑا کام نکلے گا۔

مہری : اے میاں، میں لونڈی ہوں۔ تب تمھارا ہی نمک کھاتی تھی، اور اب بھی......۔

آزاد : اچھا، اتنا بتا دو کہ کس ترکیب سے ملوں گا؟

مہری : یہاں ایک شاہ صاحب رہتے ہیں۔ ثریا بیگم ان کی مرید ہیں۔ ان کے میاں نے بھی حکم دے دیا ہے کہ جب ان کا جی چاہے، شاہ صاحب کے یہاں جائیں۔ شاہ جی کا سن کوئی دو سو برس کا ہوگا۔ اور حضور، جو وہ کہہ دیتے ہیں، وہی ہوتا ہے۔ کیا مجال جو فرق پڑے۔

آزاد : ہاں صاحب، فقیر ہیں، نہیں تو دنیا قائم کیسے ہے!

مہری : میں شاہ جی کو ایک اور جگہ بھیج دوں گی۔ آپ ان کی جگہ جا کے بیٹھ جایئے گا۔ شاہ صاحب کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے آپ کو یہ خوف بھی نہیں ہے کہ ثریا بیگم پہچان جائیں گی۔

آزاد : بڑا احسان ہوگا۔ عمر بھر نہ بھولوں گا۔ اچھا، تو شام کو آؤں گا۔

شام کو آزاد کندن کے گھر پہنچ گئے۔ مہری نے کہا۔ لیجیے، مبارک ہو۔ سب معاملہ چوکس

ہے۔

آزاد : جہاں تم ہو، وہاں کس بات کی کمی۔ تم سے آج ملاقات ہوئی تھی؟ ہمارا ذکر تو نہیں آیا؟ ہم سے ناراض تو نہیں ہیں؟

مہری : اے حضور، اب تک روتی ہیں۔ اکثر فرماتی ہیں کہ جب آزاد سنیں گے کہ اس نے ایک امیر کے ساتھ نکاح کر لیا، تو اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

شاہ صاحب شہر کے باہر ایک املی کے پیڑ کے نیچے رہتے تھے۔ مہری آزاد کو وہاں لے گئی اور درخت کے نیچے والی کوٹھری میں بیٹھ کر بولی۔ آپ یہیں بیٹھیے، بیگم صاحب اب آتی ہی ہوں گی۔ جب وہ آنکھ بند کر کے نظر دکھائیں تو لے لیجیے گا۔ پھر آپ میں اور ان میں خود ہی باتیں ہوں گی۔

آزاد : ایسا نہ ہو کہ مجھے دیکھ کر ڈر جائے۔

مہری : جی نہیں، دل کی مضبوط ہیں۔ بنوں جنگلوں میں پھر آئی ہیں۔

اتنے میں کسی آدمی کے گانے کی آواز آئی۔

بت ظالم نہیں سنتا کسی کی

غریبوں کا خدا فریاد رس ہے

آزاد : یہ اس وقت اس ویرانے میں کون گا رہا ہے؟

مہری : سڑی ہے۔ خبر پائی ہوگی کہ آج یہاں آنے والی ہیں۔

آزاد : بابا صاحب کو اس کا حال معلوم ہے یا نہیں؟

مہری : سبھی جانتے ہیں۔ دن رات یوں ہی بکا کرتا ہے، اور کوئی کام ہی نہیں۔

آزاد : بھلا یہ تو بتاؤ کہ ثریّا بیگم کے ساتھ کون کون ہوگا؟

مہری : دو ایک مہریاں ہوں گی، مولائی بیگم ہوں گی اور دس بارہ سپاہی۔

آزاد : مہریاں اندر ساتھ آئیں گی یا باہر ہی رہیں گی؟

مہری : اس کمرے میں کوئی نہیں آسکتا۔

اتنے میں ثریّا کی سواری دروازہ پر آ پہنچی۔ آزاد کا دل دھک دھک کرتا تھا۔ کچھ تو اس بات کی خوشی تھی کہ مدت کے بعد اللہ رکھی کو دیکھیں گے اور کچھ اس بات کا خیال کہ کہیں پردہ نہ کھل جائے۔

آزاد : ذرا دیکھو، پالکی سے اتریں یا نہیں۔

مہری : باغ میں ٹہل رہی ہیں۔ مولائی بیگم بھی ہیں۔ چل کے دیوار کے پاس کھڑے ہوکر آڑ سے دیکھیے۔

آزاد : ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں دیکھ نہ لیں۔

آخر آزاد سے نہ رہا گیا۔ مہری کے ساتھ آڑ میں کھرے ہوئے تو دیکھا کہ باغ میں کئی عورتیں چمن کی سیر کر رہی ہیں۔

مہری : جو ذرا بھی ان کو معلوم ہو جائے کہ آزاد کھڑے دیکھ رہے ہیں تو خدا جانے، دل کا کیا حال ہو۔

آزاد : پکاروں؟ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ پکاروں۔

اتنے میں بیگم دیوار کے پاس آئی اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔

ثریا : اس وقت تو گانا سننے کو جی چاہتا ہے۔

مولائی : دیکھیے، یہ سودائی کیا گا رہا ہے۔

ثریا : ارے! اس موئے کو اب تک موت نہ آئی؟ اسے کون میرے آنے کی خبر دے دیا کرتا ہے۔ شاہ جی سے کہوں گی کہ اس کو موت آئے۔

مولائی : اے۔ نہیں۔ کاہے کو موت آئے بے چارے کو۔ مگر آواز اچھی ہے۔

ثریا : آگ لگے اس کی آواز کو۔

اتنے میں زور سے پانی برسنے لگا۔ سب کی سب ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ آخر ایک مالی نے کہا کہ حضور، سامنے کا بنگلہ خالی کر دیا ہے، اس میں بیٹھیے۔ سب کی سب اس بنگلے میں گئی۔ جب کچھ دیر تک بادل نہ کھلا تو ثریا بیگم نے کہا۔ بھئی، اب تو کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے۔

ممولا نام کی ایک مہری ان کے ساتھ تھی۔ بولی۔ شاہ جی کے یہاں سے کچھ لاؤں؟ مگر فقیروں کے پاس دال روٹی کے سوا اور کیا ہوگا۔

ثریا : جاؤ، کچھ ہو ملے، لے آؤ۔ ایسا نہ ہو کہ وہاں کوئی بے تکی بات کہنے لگو۔

مہری نے ڈوپٹے کو لپیٹ کر اوپر سے ڈولی کا پردہ اوڑھا۔ دوسری مہری نے مشالچی کو حکم دیا کہ مشال جلا۔ آگے آگے مشالچی، پیچھے پیچھے دونوں مہریاں دروازے پر آئیں اور آواز

دی۔ آزاد اور مہری نے سمجھا کہ بیگم صاحب آ گئی، مگر دروازہ کھولا تو دیکھا کہ مہریاں ہیں۔

مہری : آؤ، آؤ۔ کیا بیگم صاحب باغ ہی میں ہیں؟

ممولا : جی ہاں۔ مگر ایک کام کیجیے۔ شاہ صاحب کے پاس بھیجا ہے۔ یہ بتاؤ کہ اس وقت کھانے کو ہے؟

مہری نے شاہ جی کے باورچی خانے سے چار موٹی موٹی روٹیاں اور ایک پیالہ مسور کی دال لا کر دیا۔ دونوں مہریاں کھانا لے کر بنگلے میں پہنچی تو ثریا بیگم نے پوچھا۔ کہو، بیٹا کہ بیٹی؟

ممولا : حضور، فقیروں کے دربار سے بھلا کوئی خالی ہاتھ آتا ہے؟ لیجیے، یہ موٹے موٹے ٹکڑے ہیں۔

مولائی : اس وقت یہی غنیمت ہے۔

ممولا : بیگم صاحب، آپ سے ایک عرض ہے۔

ثریا : کیا ہے، کہو۔ تمھاری باتوں سے ہمیں الجھن ہوتی ہے۔

ممولا : حضور، جب ہم کھانا لے کے آتے تھے تو دیکھا کہ باغ کے دروازے پر ایک بیکس، بے گناہ بے چارہ دبکا دبکایا کھڑا بھیگ رہا ہے۔

ثریا : پھر تم نے وہی پاجی پن کی لی نہ! چلو ہٹو سامنے سے۔

مولائی : بہن، خدا کے لیے اتنا کہہ دو کہ جہاں سپاہی بیٹھے ہیں، وہیں اسے بھی بلا لیں۔

ثریا : پھر مجھ سے کیا کہتی ہو؟

سپاہیوں نے دیوانے کو بلا کر بیٹھا لیا۔ اس نے یہاں آتے ہی تان لگائی۔

پس فنا ہمیں گردوں ستائے گا پھر کیا
مٹے ہوئے کو یہ ظالم مٹائے گا پھر کیا
ضعیف نالاں دل اس کا ہلا نہیں سکتا
یہ جا کے نہ عرش کا پایہ ہلائے گا پھر کیا
شریک جو نہ ہوا ایک دم کو پھولوں میں
وہ پھول آ کے لحد کے اٹھائے گا پھر کیا
خدا کو مانوں نہ بسمل کو اپنے ذبح کرو

تڑپ کے سیر وہ تم کو دکھائے گا پھر کیا

ثریا: دیکھا نہ۔ یہ کمبخت بے غل مچائے کبھی نہ رہے گا۔

مولائی: بس یہی تو اس میں عیب ہے۔ مگر غزل بھی ڈھونڈ کے اپنے ہی مطلب کی کہی ہے۔

ثریا: کمبخت بدنام کرتا پھرتا ہے۔

دونوں بیگموں نے ہاتھ دھویا۔ اس وقت وہاں مسور کی دال اور روٹی پلاؤ اور قورمے کو مات کرتی تھے۔ اس پر مالی نے کیتھے کی چٹنی تیار کراکے مہری کے ہاتھ بھجوا دی۔ اس وقت اس چٹنی نے وہ مزہ دیا کہ کوئی ثریا بیگم کی زبان سے سنے۔

مولائی: مالی نے انعام کا کام کیا ہے اس وقت۔

ثریا: اس میں کیا شک۔ پانچ روپے انعام دے دو۔

جب خدا خدا کرکے مینہ تھما اور چاندنی نکھری تو ثریا بیگم نے مہری بھیجی کہ شاہ جی کا حکم ہو تو ہم حاضر ہوں۔ وہاں مہری نے کہا۔ ہاں، شوق سے آئے، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔

ثریا بیگم نے آنکھیں بند کیں اور شاہ جی کے پاس گئیں۔ آزاد نے انھیں دیکھا تو دل کا عجب حال ہوا۔ ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی۔ ثریا بیگم گھبرائی کہ آج شاہ صاحب ٹھنڈی سانسیں کیوں لے رہے ہیں۔ آنکھیں کھول دیں تو سامنے آزاد کو بیٹھے دیکھا۔ پہلے سمجھیں کہ آنکھوں نے دھوکہ دیا، مگر قریب سے غور کر کے دیکھا تو شک دور ہو گیا۔

ادھر آزاد کی زبان بھی بند ہو گئی۔ لاکھ چاہا کہ دل کا حال کہہ سنائیں، مگر زبان کھولنا محال ہو گیا۔ دونوں نے تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کو پیار اور حسرت کی نظر سے دیکھا، مگر باتیں کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ ہاں آنکھوں پر دونوں میں سے کسی کو اختیار نہ تھا۔ دونوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ یکا یک ثریا بیگم وہاں سے اٹھ کر باہر چلی آئیں۔

مولا نے پوچھا: بیگم صاحب، آج اتنی جلدی کیوں کی؟

ثریا: یوں ہی۔

مولائی: آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں؟ شاہ صاحب سے کیا باتیں ہوئی؟

ثریا: کچھ نہیں بہن، شاہ صاحب کیا کہتے، جی ہی تو ہے۔

مولائی: ہاں، مگر خوشی اور رنج کے لیے کوئی سبب بھی تو ہوتا ہے۔

ثریا : بہن، ہم سے اس وقت سبب نہ پوچھو۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔

مولائی : اچھا، کچھ قطر بیونت کرکے کہہ دو۔

ثریا : بہن، بات ساری یہ ہے کہ اس وقت شاہ جی تک نے ہم سے چال کی۔ جی کچھ ہم نے اس وقت دیکھا، اس کے دیکھنے کی تمنا برسوں سے تھی، مگر اب آنکھیں پھر پھیر کے دیکھنے کے سوا اور کیا ہے؟

مولائی : (ثریا کے گلے میں ہاتھ ڈال کر) کیا آزاد مل گئے کیا؟

ثریا : چپ چپ! کوئی سن نہ لے۔

مولائی : آزاد اس وقت کہاں سے آ گئے۔ ہمیں بھی دکھا دو۔

ثریا : روکتا کون ہے۔ جاکے دیکھ لو۔

مولائی بیگم چلیں تو ثریا بیگم نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ خبردار، میری طرف سے کوئی پیغام نہ کہنا۔

مولائی بیگم کچھ ہچکچاتی، کچھ جھجھکتی آکر آزاد سے بولیں۔ شاہ جی، کبھی اور بھی اس طرف آئے تھے۔

آزاد : ہم فقیروں کو کہیں آنے جانے سے کیا سروکار! جدھر موج ہوئی، چل دیے۔ دن کو سفر، رات کو خدا یاد، ہاں، غم ہے تو یہ کہ خدا کو پائیں۔

مولائی : سنو شاہ جی، آپ کی فقیری کو ہم خوب جانتے ہیں۔ یہ سب کانٹے آپ ہی کے بوئے ہوئے ہیں۔ اور اب آپ فقیر بن کر یہاں آئے ہیں۔ یہ بتلائیے کہ آپ نے انھیں جو اتنا پریشان کیا تو کس لیے؟ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا؟

آزاد : صاحب صاف تو یہ ہے کہ ہم ان سے فقط دو دو باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

مولائی : واہ، جب آنکھیں چار ہوئیں تب تو کچھ بولے نہیں، اور وہ باتیں ہوئی بھی تو نتیجہ کیا؟ ان کے مزاج کو تو آپ جانتے ہیں۔ ایک بار جس کی ہو گئیں، اس کی ہو گئیں۔

آزاد : اچھا، ایک نظر تو دکھا دو۔

مولائی : اب یہ ممکن نہیں۔ کیوں مفت میں اپنی جان کو ہلکان کروگے۔

آزاد : تو بالکل دھو ڈالیں؟ اچھا چلیے، باغ میں ذرا دور ہی سے دل کے پھپھولے پھوڑیں۔

مولائی : واہ واہ! جب باغ میں ہوں بھی۔

آزاد : اچھا صاحب، لیجیے صبر کر کے بیٹھ جاتے ہیں۔

مولائی : میں جا کر کہتی ہوں، مگر امید نہیں کہ مانیں۔

یہ کہہ کر مولائی بیگم اٹھیں اور ثریا بیگم کے پاس آکر بولیں۔ بہن، اللہ جانتا ہے، کتنا خوبصورت جوان ہے۔

ثریا : ہمارا ذکر بھی آیا تھا؟ کچھ کہتے تھے؟

مولائی : تمھارے سوا اور ذکر ہی کس کا تھا؟ بے چارے بہت روتے تھے۔ ہماری ایک بات اس وقت مانوگی؟ کہوں؟

ثریا : کچھ معلوم تو ہو، کیا کہوگی؟

مولائی : پہلے قول دو، پھر کہیں گے، یوں نہیں۔

ثریا : واہ! بے سمجھے بوجھے قول کیسے دے دوں؟

مولائی : ہماری اتنی خاطر بھی نہ کروگی بہن!

ثریا : اب کیا جانیں، تم کیا اول جلول باتیں کہو۔

مولائی : ہم کوئی ایسی بات نہ کہیں گے جس سے نقصان ہو۔

ثریا : جو بات تمھارے دل میں ہے وہ میرے ناخون میں ہے۔

مولائی : کیا کہنا ہے۔ آپ ایسی ہی ہیں۔

ثریا : اچھا، اور سب باتیں مانیں گے سوا ایک بات کے۔

مولائی : وہ ایک بات کون سی ہے، ہم سن تو لیں۔

ثریا : جس طرح تم چھپاتی ہو اسی طرح ہم بھی چھپاتے ہیں۔

مولائی : اللہ کو گواہ کر کے کہتی ہوں، رو رہا ہے۔ مجھ سے ہاتھ جوڑ کر کہا ہے کہ جس طرح ممکن ہو، مجھ سے ملا دو۔ میں اتنا ہی چاہتا ہوں کہ نظر بھر کر دیکھ لوں۔

ثریا : کیا مجال، خواب تک میں صورت نہ دکھاؤں۔

مولائی : مجھے بڑا ترس آتا ہے۔

ثریا : دنیا کا بھی خیال ہے۔

مولائی : دنیا سے ہمیں کیا کام؟ یہاں ایسا کون آتا جاتا ہے۔ ڈر کاہے کا ہے، چل کے

ذرا دیکھ لو، اس کا ارمان تو نکل جائے۔
ثریا : نا، ممکن نہیں! اب یہاں سے چلوگی بھی یا نہیں؟
مولائی : ہم تو تب تک نہ چلیں گے، جب تک تم ہمارا کہنا نہ مانوگی۔
ثریا : سنو مولائی بیگم، ہر کام کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ تم کیا سوچی ہو؟
مولائی : ان کا دل خوش ہوگا۔ اس وقت وہ آپے میں نہیں ہیں، مگر جب اس معاملے پر غور کریں گے تو انھیں ضرور رنج ہوگا۔
دونوں پالیوں پر بیٹھ کر روانہ ہوئیں۔ آزاد نے مکان کی دیوار سے ثریا بیگم کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لی۔

(108)

دوسرے دن آزاد یہاں سے رخصت ہو کر حسن آرا سے ملنے چلے۔ بات بات پر باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ دماغ ساتویں آسمان پر تھا۔ آج خدا نے وہ دن دکھایا کہ روس اور روم کی منزل پوری کر کے یار کے کوچے میں پہنچ۔ کہاں روس، کہاں ہندوستان! کہاں لڑائی کا میدان، کہاں حسن آرا کا مکان! دونوں لیڈیوں نے انھیں چھیڑنا شروع کیا۔
کلاریسا : آج بھلا آزاد کے دماغ کاہے کو ملیں گے۔
میڈا : اس وقت مارے خوشی کے انھیں بات کرنا بھی مشکل ہے۔
آزاد : بڑی مشکل ہے۔ بولوں تو آوازیں کسے جائیں۔
کلاریسا : کیا اس میں کچھ جھوٹ بھی ہے؟ جس کے لیے دنیا بھر کی خاک چھانی، اس سے ملنے کا نشہ ہوا ہی چاہے۔
کلاریسا : آپ اتنے دن تک کہاں تھے خواجہ صاحب؟
خوجی : تھا کہاں، جہاں جاتا ہوں وہاں لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں: اتنی دعوتیں کھائیں کہ کیا کسی نے کھائی ہوں گی۔ ایک ایک دن میں دو دوسو بلاوے آ جاتے ہیں۔ اگر نہ جاؤں تو لوگ کہیں، غرور کرتا ہے۔ جاؤں تو اتنا وقت کہاں! اسی ادھیڑ بن میں پڑا رہا۔
آزاد : اب کچھ ہمارے بھی کام آؤ گے۔
فوجی : اور دوڑا آیا کس لیے ہوں کہو حسن آرا کو بھی خبر ہوئی یا نہیں، نہ ہوئی ہو تو

پہنچوں۔ مجھ سے زیادہ اس کام کے لائق اور کسی کو نہ پاؤگے۔ میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔

آزاد : اس میں کیا شک ہے بھائی جان! بے شک ہو۔

خوجی : تو پھر میں چلوں؟

آزاد : نیکی اور پوچھ پوچھ؟

خوجی جانے والے ہی تھے ایک آدمی ہوٹل کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کی شکل و صورت بالکل خوجی سے ملتی تھی۔ وہی ناٹا قد، وہی کالا رنگ، وہی ننھے ننھے ہاتھ پاؤں۔ خوجی کا بڑا بھائی معلوم ہوتا تھا۔

آزاد : واللہ، بالکل خوجی ہی ہیں۔

میڈا : بس، اِن کو چھپاؤ، اُن کو دکھاؤ۔ اُن کو چھپاؤ، اِن کو دکھاؤ۔ ذرا فرق نہیں۔

خوجی : تو کون ہے بے؟ کہاں چلا آتا ہے؟ کچھ بیدھا تو نہیں ہے؟ تم جیسے مسخروں کا یہاں کیا کام؟

مسخرہ : کوئی ہم سے بد کے دیکھ لے۔ بڑا مرد ہو تو آ جائے۔

خوجی : کیا کہتا ہے؟ برس پڑوں؟

مسخرہ : جا، اپنا کام کر۔ جو گرجتا ہے، وہ برستا نہیں۔

خوجی : بچہ، تمھاری قضا میرے ہی ہاتھ سے ہے۔

مسخرہ : ماشے بھر کا آدمی، بونوں کے برابر قد اور چلا ہے مجھے للکارنے!

خوجی : کوئی ہے؟ لانا تو چنڈو کی نگالی۔ لے آیئے!

مسخرہ : ہم تو جہاں کھڑے تھے، وہیں کھڑے ہیں، شیر کہیں ہٹا کرتے ہیں۔ جمے، سو جمے۔

خوجی : قضا کھیل رہی ہے تیری۔ میں اس کو کیا کروں۔ اب جو کچھ کہنا سننا ہو، کہہ سن لو، تھوڑی دیر میں لاش پھڑکتی ہوگی۔

مسخرہ : ذرا زبان سنبھالے ہوئے حضرت! ایسا نہ ہو، میں گردن پر سوار ہو جاؤں۔

ہوٹل میں جتنے آدمی تھے، ان کو شگوفہ ہاتھ آیا۔ سبھی ان دونوں بونوں کی کشتی دیکھنے کے لیے بے قرار تھے۔ دونوں کو چڑھانے لگے۔

ایک : بھئی، ہم سب تو خواجہ صاحب کی طرف ہیں۔

دوسرا : ہم بھی۔ یہ اس سے کہیں تگڑے ہیں۔

تیسرا : کون؟ کہیں ہو ں نہ! ان میں اور اس میں بیس اور سولہ کا فرق ہے۔ بولو، کیا کیا بدتے ہیں۔

مسخرہ : ایک لپوٹے میں بول جایئے تو سہی۔ بات کرتے کرتے پکڑ لاؤں اور چٹکی بجاتے چت کروں، (چٹکی بجا کر) یوں یوں!

خوجی : میں اتنی دیر نہیں لگانے کا۔

مسخرہ : ارے چپ بھی رہ ! یہ منھ کھائے چولائی۔ ایک انگلی سے وہ پیچ باندھوں کہ تڑپنے لگا۔

لیا جس نے ہمارا نام، مارا بے گناہ اس کو
نشاں جس نے بتایا، بس، وہ تیروں کا نشانہ تھا

آزاد : بڑھ گئے خواجہ صاحب، یہ آپ سے بڑھ گئے۔ اب کوئی پھڑکتا ہوا شعر کہیے تو عزت رہے۔

خوجی : اجی، اس سے اچھا شعر لیجیے۔

تڑپا نہ ذرا خنجر کے تلے
سر اپنی دیا شکوہ نہ کیا،
تھا پاسِ ادب جو قاتل کا
یہ بھی نہ ہوا وہ بھی نہ ہوا

مسخرہ : لے، اب آ۔

خوجی : دیکھ، تیری قضا آ گئی ہے۔

مسخرہ : ذرا سامنے آ۔ زمین میں سر کھونس دوں گا۔

خوجی : (تال ٹھوک کر) اب بھی کہا مان، نہ لڑ۔

مسخرہ : یا علی، مدد کر۔

قبر میں جن کو نہ سونا تھا، سلایا ان کو
پر مجھے چرخ ستم گر نے سونے نہ دیا

آزاد : بھئی خوجی، شاعری میں تم بالکل دب گئے۔

خوجی جواب دینے ہی والے تھے کہ اتنے میں مسخرے نے ان کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ قریب تھا کہ زمین پر دے پٹکے کہ میاں خوجی سنبھلے اور جھلا کر مسخرے کی گردن میں دونوں ہاتھ ڈال کر بولے۔ بس، اب تم میرے!

مسخرہ : آج تجھے جیتا نہ چھوڑوں گا۔

خوجی : دیکھو، ہاتھ ٹوٹا تو نالش کر دوں گا۔ کشتی میں ہاتھا پائی کیسی؟

مسخرہ : اپنی بڑھیا کو بلا لاؤ۔ کوئی لاش کو رونے والا تو ہو تمھاری!

خوجی : یا تو قتل ہی کریں گے یا قتل ہوں گے۔

مسخرہ : اور ہم قتل ہی کر کے چھوڑیں گے۔

خواجہ صاحب نے ایک انٹی بتائی تو مسخرہ گرا۔ ساتھ ہی خوجی بھی منھ کے بل زمین پر آرہے۔ اب نہ یہ اٹھتے ہیں نہ وہ۔ نہ وہ ان کی گردن چھوڑتا ہے، نہ یہ اس کو چھوڑتے ہیں۔

مسخرہ : مار ڈال، مگر گردن نہ چھوڑوں گا۔

خوجی : تو گردن مروڑ ڈال، مگر میں ادھ مرا کر کے چھوڑں گا۔ ہائے ہائے! گردن گئی! پسلیاں چر چر بول رہی ہیں۔

مسخرہ : جو کچھ ہو سو ہو، کچھ پرواہ نہیں ہے۔

خوجی : یہاں کس کو پرواہ ہے، کوئی رونے والا بھی نہیں ہے۔

اب کی خوجی نے گردن چھڑا لی، ادھر مسخرہ بھی نکل بھاگا۔ دونوں اپنی اپنی گردن سہلانے لگے۔ یار لوگوں نے پھر فقرے چست کیے۔ بھئی، ہم تو خوجی کے دم کے قائل ہیں۔

دوسرا بولا : واہ! اگر کچی آدھ گھڑی اور کشتی رہتی تو وہ مار لیتا۔

تیسرے نے کہا : اچھا، پھر اب کی سہی۔ کسی کا دم تھوڑے ٹوٹا ہے۔

یار لوگ تو ان کو تیار کرتے تھے، مگر ان میں دم نہ تھا۔ آدھ گھنٹے تک دونوں ہانپا کیے، مگر زبان چلی جاتی تھی۔

خوجی : ذرا اور دیر ہوتی تو پھر دل لگی دیکھتے۔

مسخرہ : ہاں، بے شک۔

خوجی : تقدیر تھی، بچ گئے، ورنہ منھ بگاڑ دیتا۔

مسخرہ : اب تم اس فکر میں ہو کہ میں پھر اٹھوں۔

آزاد : بھئی، اب زیادہ بکھیڑا مت بڑھاؤ۔ بہت ہو چکی۔
مسخرہ : حضور، میں بے نیچا دکھائے نہ مانوں گا۔
خوجی : (مسخرے کی گردن پکڑ کر) آؤ، دکھاؤ نیچا۔
مسخرہ : ابے، تو گردن تو چھوڑ دے ہماری۔
خوجی : اب کی ہمارا داؤں ہے!
مسخرہ : (تھپڑ لگا کر) ایک دو۔
خوجی : (چپت دے کر) تین۔
مسخرہ : (گدا جما کر) چار پانچ۔
فقرے باز : سو تک گن جاؤ یوں ہی۔ ہاں، پانچ ہوئی۔
دوسرا : ایسے ایسے جوان اور پانچ ہی تک گن کے رہ گئے؟
خوجی : (چپت دے کر) چھ چھ، اور نہیں تو۔ لوگ بڑی دیر سے چھ کا انتظار کر رہے تھے۔

اب کی وہ گھماسان لڑائی ہوئی کہ دونوں بے دم ہو کر گر پڑے اور رونے لگے۔
خوجی : اب موت قریب ہے۔ بھئی آزاد، ہماری قبر کسی پوستے کے کھیت کے قریب بنوانا۔
مسخرہ : اور ہماری قبر شاہ فصیح کے تکیے میں بنوائی جائے جہاں ہمارے والد خواجہ ولیگ دفن ہیں۔
خوجی : کون کون؟ ان کے والد کا کیا نام تھا؟
آزاد : خواجہ ولیگ کہتے ہیں۔
خوجی : (روکر) ارے بھائی، ہمیں پہچانا؟ مگر ہماری تمھاری یوں ہی بدی تھی۔
مسخرے نے جو ان کا نام سنا تو سر پیٹ لیا۔ بھئی، یہ کیا غضب ہوا! سگا بھائی سگے بھائی کو مارے؟

دونوں بھائی گلے مل کر روئے۔ بڑے بھائی نے اپنا نام میاں رئیس بتلایا۔ بولے۔ بیٹا، تم مجھ سے کوئی بیس برس چھوٹے ہو۔ تم نے والد کو اچھی طرح سے نہیں دیکھا تھا۔ بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ ہم کو روز دوکان پر لے جایا کرتے تھے۔

آزاد : کاہے کی دوکان تھی حضرت؟

رئیس : جی، ٹال تھی۔ لکڑیاں بیچتے تھے۔

خوجی نے بھائی کی طرف گھور کر دیکھا۔

رئیس : کچھ دن کنپوں میں صاحب لوگوں کے یہاں خانساماں رہے تھے۔

خوجی نے بھائی کی طرف دیکھ کر دانت پیسا۔

آزاد : بس حضرت، قلعی کھل گئی۔ ابا جان خانساماں تھے اور آپ رئیس بنتے ہیں۔

آزاد چلے گئے تو دونوں بھائیوں میں خوب تکرار ہوئی۔ مگر تھوڑے ہی دیر میں میل ہو گیا اور دونوں بھائی ساتھ ساتھ شہر کی سیر کو گئے۔ ادھر اُدھر مٹرگشت کر کے میاں رئیس تو اپنے اڈے پر گئے اور خوجی حسن آرا بیگم کے مکان پر جا پہنچے۔ بوڑھے میاں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

خوجی : آداب عرض ہے۔ پہچانا یا بھول گئے؟

بوڑھے میاں : بندگی عرض۔ میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔

خوجی : تم بھلا ہمیں کیوں پہچانو گے۔ تمھاری آنکھ میں تو چربی چھائی ہوئی ہے۔

بوڑھے میاں : آپ تو کچھ عجب پاگل معلوم ہوتے ہیں۔ جان نہ پہچان، تیوریاں بدلنے لگے۔

خوجی : اجی، ہم تو سنائیں بادشاہ کو، تم کیا مال ہو۔

بوڑھے میاں : اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟

خوجی : کوئی محل سرا میں حسن آرا بیگم کو اطلاع دو کہ مسافر آئے ہیں۔

بوڑھے میاں : (کھڑے ہو کر) اخواہ خواجہ صاحب تو نہیں ہیں آپ! معاف کیجیے گا۔ آیئے گلے مل لیں۔

بوڑھے میاں نے آدمی کو حکم دیا کہ حقہ بھر دو، اور اندر جا کر بولے۔ لو صاحب، خوجی داخل ہو گئے۔

چاروں بہنیں باغ میں گئیں اور چق کی آڑ سے خوجی کو دیکھنے لگیں۔

نازک ادا : او ہو ہو! کیسا گراں ڈیل جوان ہے۔

جانی : اللہ جانتا ہے، ایسا جوان نہیں دیکھنے میں آیا تھا۔ اونٹ کی تو کوئی کل شاید درست

بھی ہو، اس کی کوئی کل درست نہیں۔ ہنسی آتی ہے۔

خوجی ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے۔ اتنے میں بوڑھے میاں آ گئے۔

خوجی : حضرت، اس مکان کی عجیب خاصیت ہے۔

بوڑھے میاں : کیا کیا؟ اس مکان میں کوئی نئی بات آپ نے دیکھی ہے؟

خوجی : آوازیں آتی ہیں۔ میں بیٹھا ہوا تھا، ایک آواز آئی، پھر دوسری آواز آئی۔

بوڑھے میاں : آپ کیا فرماتے ہیں، ہم نے تو کوئی بات ایسی نہیں دیکھی۔

جانی بیگم کی رگ رگ میں شوخی بھری ہوئی تھی۔ خوجی کو بنانے کی ایک ترکیب سوجھی۔ بولیں۔ ایک بات ہمیں سوجھی ہے۔ ابھی ہم کسی سے کہیں گے نہیں۔

بہار بیگم : ہم سے تو کہہ دو۔

جانی نے بہار بیگم کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔

بہار : کیا حرج ہے، بوڑھا ہی تو ہے۔

سپہر آرا : آخر کچھ کہو تو باجی جان! ہم سے کہنے میں کچھ حرج ہے؟

بہار : جانی بیگم کہہ دیں تو بتا دوں۔

جانی : نہیں، کسی سے نہ کہو۔

جانی بیگم اور بہار بیگم دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ یہاں ان سب کو حیرت ہو رہی تھی کہ یا خدا! ان سبھوں کو کون ترکیب سوجھی ہے، جو اتنا چھپا رہی ہیں۔ اپنی اپنی عقل دوڑانے لگیں۔

نازک : ہم سمجھ گئے۔ افیمی آدمی ہے۔ اس کی ڈبیا چرانے کی فکر ہوگی۔

حسن آرا : یہ بات نہیں، اس میں چوری کیا تھی؟

اتنے میں بہار بیگم نے آکر کہا۔ چلو، باغ میں چل کر بیٹھیں۔ خواجہ صاحب پہلے ہی باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گبھرو جوان سامنے سے اینٹھتا اکڑتا چلا آتا ہے۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگیں۔ جالی لوٹ کا کرتا، اس پر شربتی کا کٹاؤدار انگرکھا، سر پر بانکی پگیہ اور ہاتھ میں کٹار۔

حسن آرا : یہ کون ہے اللہ؟ ذرا پوچھنا تو۔

سپہرآرا : افوہ ! باجی جان، پہچانوں تو بھلا۔

حسن آرا : ارے! بڑا دھوکا دیا۔

نازک : سچ مچ! بے شک بڑا دھوکا دیا! افوہ!

سپہرآراہ : میں تو پہلے سمجھی ہی نہ تھی کچھ۔

اتنے میں وہ جوان خوجی کے قریب آیا تو وہ چکرائے کہ اس باغ میں اس کا گزر کیسے ہوا۔ اس کی طرف تاک ہی رہے تھے کہ بہار بیگم نے غل مچا کر کہا۔ اے! یہ کون مردوا باغ میں آ گیا۔ خواجہ صاحب، تم بیٹھے دیکھ رہے ہو اور یہ لونڈا بھیتر چلا آتا ہے۔ اسے نکال کیوں نہیں دیتے؟

خوجی : اجی حضرت، آخر آپ کون صاحب ہیں؟ پرائے زنانے میں گھسے جاتے ہو، یہ ماجرا کیا ہے؟

جوان : کچھ تمھاری شامت تو نہیں آئی ہے؟ چپ چاپ بیٹھے رہو۔

خوجی : سنیے صاحب، ہم اور آپ دونوں ایک ہی پیشے کے آدمی ہیں۔

جوان : (بات کاٹ کر) ہم نے کہہ دیا، چپ رہو، ورنہ ابھی سر اڑا دوں گا۔ ہم حسن آرا بیگم کے عاشق ہیں۔ سنا ہے کہ آزاد یہاں ہیں، اور حسن آرا کے پاس نکاح کا پیغام بھیجنے والے ہیں۔ بس، اب یہی دھن ہے کہ ان سے دو دو ہاتھ چل جائے۔

خوجی : آزاد کا مقابلہ تم کیا خاک کروگے۔ اس نے لڑائیاں سر کی ہیں۔ تم ابھی لونڈے ہو۔

جوان : تو بھی تو انھیں کا ساتھی ہے۔ کیوں نہ پہلے تیرا ہی کام تمام کر دوں۔

خوجی : (پینترے بدل کر) ہم کسی سے دبنے والے نہیں ہیں۔

جوان : آج ہی کا دن تیری موت کا تھا۔

خوجی : (پیچھے ہٹ کر) ابھی کسی مرد سے پالا نہیں پڑا ہے۔

جوان : کیوں ناحق غصہ دلاتا ہے۔ اچھا، لے سنبھال۔

جوان نے تلوار گھمائی تو خوجی گھبرا کر پیچھے ہٹے اور گر پڑے۔ بس کرولی کی یاد کرنے لگے۔ عورتیں تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگیں۔

جوان : بس، اسی برتے پر پھولا تھا۔

خوجی : اجی، میں اپنے زعم میں آپ آ رہا۔ ابھی تو قیامت برپا کر دوں۔

جوان : جا کر آزاد سے کہنا کہ ہوشیار رہیں۔

خوجی : بہتوں کا ارمان نکل گیا۔ ان کی صورت دیکھ لو، تو بخار آ جائے۔

جوان : اچھا، کل دیکھوں گا۔

یہ کہہ کر اس نے بہار بیگم کا ہاتھ پکڑا اور بے دھڑک کوٹھے پر چڑھ گیا۔ چاروں بہنیں بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر چلی گئیں۔

خوجی یہاں سے چلے تو دل میں سوچتے جاتے تھے کہ آزاد سے چل کر کہتا ہوں، حسن آرا کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر ہانک لگاتے تھے، گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔ اتفاق سے راستے میں اسی ہوٹل کا خانساماں مل گیا، جہاں آزاد ٹھہرے تھے۔ بولا۔ ارے بھائی! اس وقت کہاں لپکے ہوئے جاتے ہو؟ خیر تو ہے؟ آج تو آپ غریبوں سے بات ہی نہیں کرتے۔

خوجی : گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

خانساماں : بھئی واہ! ساری دنیا گھوم آئے، مگر کینڈا وہیں ہے۔ ہم سمجھے تھے کہ آدمی بن کر آئے ہوں گے۔

خوجی : تم جیسوں سے باتیں کرنا ہماری شان سے خلاف ہے۔

خانساماں : ہم دیکھتے ہیں، وہاں سے تم اور بھی گاؤدی ہو کر آئے ہو۔

تھوڑی دیر میں آپ گرتے پڑتے ہوٹل میں داخل ہوئے اور آزاد کو دیکھتے ہی منہ بنا کر سامنے کھڑے ہو گئے۔

آزاد : کیا خبر لائے؟

خوجی : (کرولی کو دائیں ہاتھ سے بائے ہاتھ میں لا کر) ہوں!!

آزاد : ارے بھائی، گئے تھے وہاں؟

خوجی : (کرولی کو بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں لے کر) ہوں!!

آزاد : ارے، کچھ منہ سے بولو بھی تو میاں!

خوجی : گھری دو میں مرلیا باجے گی۔

آزاد : کیا؟ کچھ سنک تو نہیں گئے! میں پوچھتا ہوں، حسن آرا بیگم کے یہاں گئے تھے؟

کسی سے ملاقات ہوئی؟ کیا رنگ ڈھنگ ہے؟

خوجی : وہاں نہیں گئے تھے کیا جہنم میں گئے تھے؟ مگر کچھ دال میں کالا ہے۔

آزاد : بھائی صاحب، ہم نہیں سمجھے۔ صاف صاف کہو، کیا بات ہوئی؟ کیوں الجھن میں ڈالتے ہو۔

خوجی : اب وہاں آپ کی دال نہیں گلنے کی۔

آزاد : کیا؟ کیسی دال؟ یہ بکتے کیا ہو؟

خوجی : بکتا نہیں، سچ کہتا ہوں۔

آزاد : خوجی، اگر صاف صاف نہ بیان کروگے تو اس وقت بری ٹھہرے گی۔

خوجی : الٹے مجھی کو ڈانٹتے ہو۔ میں نے کیا بگاڑا؟

آزاد : وہاں کا مفصل حال کیوں نہیں بیان کرتے؟

خوجی : تو جناب صاف صاف یہ ہے کہ حسن آرا کے ایک اور چاہنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ حسن آرا بیگم اور ان کی بہنیں باغ کے بنگلے میں بیٹھی تھیں کہ ایک جوان اندر آ پہنچا اور مجھے دیکھتے ہی غصے سے لال ہو گیا۔

آزاد : کوئی خوبصورت آدمی ہے؟

خوجی : نہایت حسین، اور کمسن۔

آزاد : اس میں کچھ بھید ہے ضرور۔ تمھیں الّو بنانے کے لیے شاید دل لگی کی ہو۔ مگر ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔

خوجی : یقین تو ہمیں بھی مرتے دم تک نہیں آتا، مگر وہاں تو اسے دیکھتے ہی قہقہے پڑنے لگے۔

اب اُدھر کا حال سنیے۔ سپہر آرا نے کہا۔ اب دل لگی ہو کہ وہ جا کر آزاد سے قصہ کہے۔

حسن آرا : آزاد ایسے کچے نہیں ہیں۔

سپہرآرا : خدا جانے، وہ سڑی وہاں جا کر کیا بکے۔ آزاد کو چاہے پہلے یقین نہ آئے، لیکن جب وہ قسمیں کھا کر کہنے لگے گا تو ان کو ضرور شک ہو جائے گا۔

حسن آرا : ہاں، شک ہو سکتا ہے، مگر کیا کیا جائے۔ کیوں نہ کسی کو بھیج کر خوجی کو ہوٹل

سے بلواؤ۔ جو آدمی بلانے جائے وہ ہنسی ہنسی میں آزاد سے یہ بات کہہ دے۔

حسن آرا کی صلاح سے بوڑھے میاں آزاد کے پاس پہنچے، اور بڑے تپاک سے ملنے کے بعد بولے۔ وہ آپ کے میاں خوجی کہاں ہیں؟ ذرا ان کو بلوائیے۔

آزاد : آپ کے یہاں سے جو آئے تو غصے میں بھرے ہوئے۔ اب مجھ سے بات ہی نہیں کرتے۔

بوڑھے میاں : وہ تو آج خوب ہی بنائے گئے۔

بوڑھے میاں نے سارا قصہ بیان کر دیا۔ آزاد سن کر خوب ہنسے اور خوجی کو بلا کر ان کے سامنے ہی بوڑھے میاں سے بولے۔ کیوں صاحب آپ کے یہاں یہ کیا دستور ہے کہ کٹار بازوں کو بلا بلا کر شریفوں سے بھڑواتے ہیں۔

بوڑھے میاں : خواجہ صاحب کو آج خدا ہی نے بچایا۔

آزاد : مگر یہ تو ہم سے کہتے تھے کہ وہ جوان بہت دبلا پتلا آدمی ہے۔ ان سے اس سے اگر چلتی تو یہ اس کو ضرور نیچا دکھاتے۔

خوجی : اجی، کیسا نیچا دکھانا؟ وہ تلوار چلانا کیا جانے!

آزاد : آج اس کو بلوائیے، تو ان سے مقابلہ ہو جائے۔

خوجی : ہمارے نزدیک اسے بلوانا فضول ہے۔ مفت کی ٹھائے ٹھائے سے کیا فائدہ ہے۔ ہاں، اگر آپ لوگ اس بے چارے کی جان کے دشمن ہوئے ہیں تو بلوا لیجیے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بیرا نے آکر کہا۔ حضور، ایک گاڑی پر عورتیں آئی ہیں۔ ایک خدمت گار نے، جو گاڑی کے ساتھ ہے، حضور کا نام لیا اور کہا کہ ذرا یہاں تک چلے آئیں۔

آزاد کو حیرت ہوئی کہ عورتیں کہاں سے آ گئیں۔ خوجی کو بھیجا کہ جا کر دیکھو۔ خوجی اکڑتے ہوئے سامنے پہنچے، مگر گاڑی سے دس قدم الگ۔

خدمت گار : حضرت، ذرا سامنے یہاں تک آیئے۔

خوجی : او گیدی، خبردار جو بولا!

خدمت گار : ایں، کچھ سنک گئے ہو گیا؟

بیرا : گاڑی کے پاس کیوں نہیں جاتے بھائی! دور کیوں کھڑے ہو؟

خوجی : (کرولی تول کر) بس خبردار!

بیرا : ایں! تم کو ہوا کیا ہے! جاتے کیوں نہیں سامنے؟

خوجی : چپ رہو جی۔ جانو نہ بوجھو، آئے وہاں سے۔ کیا میری جان فالتو ہے، جو گاڑی کے سامنے جاؤں۔

اتفاق سے آزاد نے بے تکی ہانک سن لی۔ فوراً باہر آئے کہ کہیں کسی سے لڑ نہ پڑیں۔ خوجی سے پوچھا۔ کیوں صاحب، یہ آپ کس پر بگڑ رہے ہیں؟ جواب ندارد۔ وہاں سے جھپٹ کر آزاد کے پاس آئے اور کرولی گھماتے ہوئے پینترے بدلنے لگے۔

آزاد : کچھ منھ سے تو کہو۔ خود بھی ذلیل ہوتے ہو اور مجھے بھی ذلیل کرتے ہو۔

خوجی : (گاڑی کی طرف اشارہ کرکے) اب کیا ہوگا؟

خدمت گار : حضور، انھوں نے آتے ہی پینترا بدلا، اور یہ کاٹھ کا کھلونا نچانا شروع کیا۔ نہ میری سنتے ہیں، نہ اپنی کہتے ہیں۔

خوجی : (آزاد کے کان میں) میاں، اس گاڑی میں عورتیں نہیں ہیں۔ وہی لونڈا تم سے لڑنے آیا ہوگا۔

آزاد : یہ کہیے، آپ کے دل میں یہ بات جمی ہوئی تھی۔ آپ میرے ساتھ بہت ہمدردی نہ کیجیے، الگ جا کے بیٹھیے۔

مگر خوجی کے دل میں کھپ گئی تھی کہ اس گاڑی میں وہی جوان چھپ کر آیا ہے۔ انھوں نے رونا شروع کیا۔ اب آزاد لاکھ لاکھ سمجھاتے ہیں کہ دیکھو، ہوٹل کے اور مسافروں کو برا معلوم ہوگا، مگر خوجی چپ ہی نہیں ہوتے۔ آخر آپ نے کہا۔ جو لوگ اس پر سوار ہوں، وہ اتر آئیں۔ پہلے میں دیکھ لوں، پھر آپ جائیں۔ آزاد نے خدمت گار سے کہا۔ بھائی، اگر وہ لوگ منظور کریں تو یہ بوڑھا آدمی جھانک کر دیکھ لے۔ اس سڑی کو شک ہوا ہے کہ اس میں کوئی اور بیٹھا ہے۔ خدمت گار نے جا کر پوچھا، اور بولا۔ سرکار کہتی ہیں، ہاں، منظور ہے۔ چلئے، مگر دور ہی سے جھانکیے گا۔

خوجی : (سب سے رخصت ہوکر) لو یارو، اب آخری سلام ہے۔ آزاد، خدا تم کو دونوں جہان میں سرخرو رکھے۔

چھٹتا ہے مقام، کوچ کرتا ہوں میں،

رخصت اے زندگی کہ مرتا ہوں میں۔
اللہ سے لو لگی ہوئی ہے میری،
اوپر کے دم اس واسطے بھرتا ہوں میں۔

خدمت گار : اب آخر مرنے تو جاتے ہی ہو، ذرا قدم بڑھاتے نہ چلو۔ جیسے اب مرے، ویسے آدھ گھڑی کے بعد۔

آزاد : کیوں مردے کو چھیڑتے ہو جی۔

بگی سے ہنسی سے آوازیں آ رہی تھیں۔ خوجی آنکھوں میں آنسو بھرے چلے جا رہے تھے کہ ان کے بھائی نظر پڑے۔ ان کو دیکھتے ہی خوجی نے ہانک لگائی۔ آیئے بھائی صاحب! آخری وقت آپ سے خوب ملاقات ہوئی۔

رئیس : خیر تو ہے بھائی! کیا اکیلے ہی چلے جاؤ گے؟ مجھے کس کے بھروسے چھوڑے جاتے ہو؟

خوجی بھائی کے گلے مل کر رونے لگے۔ جب دونوں گلے مل کر خوب رو چکے تو خوجی نے گاڑی کے پاس جا کر خدمت گار سے کہا۔ کھول دیں۔ جیوں ہی گردن اندر ڈالی تو دیکھا، عورتیں بیٹھی ہیں۔ ان کا سر جیوں ہی اندر پہنچا، انھوں نے ان کی پگڑی اتار کر دو چپتیں لگا دیں۔ خوجی کی جان میں جان آئی۔ ہنس دیے۔ آ کر آزاد سے بولے۔ اب آپ جائیں، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ آزاد نے ہوٹل کے آدمیوں کو وہاں سے ہٹا دیا اور ان عورتوں سے باتیں کرنے لگے۔

آزاد : آپ کون صاحب ہیں؟

بگی میں سے آواز آئی۔ آدمی ہیں صاحب! سنا کہ آپ آئے ہیں، تو دیکھنے چلے آئے۔ اس طرح ملنا برا تو ضرور ہے، مگر دل نے نہ مانا۔

آزاد : اب اتنی عنایت کی ہے تو اب نقاب دور کیجیے اور میرے کمرے تک آیئے۔

آواز : اچھا، پیٹ سے پاؤں نکالے! ہاتھ دیتے ہی پہنچا پکڑ لیا۔

آزاد : اگر آپ نہ آئیں گی تو میری دل شکنی ہوگی۔ اتنا سمجھ لیجیے۔

آواز : اے، ہاں! خوب یاد آیا۔ وہ جو دو لیڈیاں آپ کے ساتھ آئی ہیں، وہ کہاں ہیں؟ پردہ کرا دو تو ہم ان سے ملیں۔

آزاد : بہت اچھا، لیکن میں رہوں یا نہ رہوں؟

آواز : آپ سے کیا پردہ ہے۔

آزاد نے پردہ کرا دیا۔ دونوں عورتیں گاڑی سے اتر پڑیں اور کمرے میں آئیں۔ مسوں نے ان سے ہاتھ ملایا، مگر باتیں کیا ہوتیں۔ مسیں اردو کیا جانیں اور بیگموں کو فرانسیسی زبان سے کیا مطلب۔ کچھ دیر تک وہاں بیٹھے رہنے کے بعد ان میں سے ایک نے، جو بہت ہی حسین اور شوخ تھی، آزاد سے کہا۔ بھئی، یہاں بیٹھے بیٹھے تو دم گھٹتا ہے۔ اگر پردہ ہو سکے تو چلئے، باغ کی سیر کریں۔

آزاد : یہاں تو ایسا کوئی باغ نہیں۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ آپ سے پہلے کب ملاقات ہوئی۔

حسینہ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ہاں صاحب، آپ کو کیوں یاد آئے گا! آپ ہم غریبوں کو کیوں یاد کرنے لگے۔ کیا یہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں، جہاں کوئی غیر نہ ہو۔ یہاں تو کچھ کہتے سنتے نہیں بنتا۔ چلئے، کسی دوسرے کمرے میں چلیں۔

آزاد کو ایک اجنبی عورت کے ساتھ دوسرے کمرے میں جاتے شرم تو آتی تھی، مگر یہ سمجھ کر کہ اسے شاید کوئی پردے کی بات کہنی ہوگی، اسے دوسرے کمرے میں لے گئے اور پوچھا۔ مجھے آپ کا حال سننے کی بڑی تمنا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔ آپ نے مجھے کہا دیکھا تھا؟

آزاد : تم مجھے بے وفا چاہے کہہ لو، پر میری یاد اس وقت دھوکا دے رہی ہے۔

عورت : ہائے افسوس! ایسا ظالم نہیں دیکھا۔

نہ کیوں کر دم نکل جائے کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
تیرا مسکرانہ کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

آزاد : میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟

عورت : دل چھین کے باتیں بناتے ہو؟ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ایک بوسہ تو لے لو۔

آزاد : یہ میری عادت نہیں۔

عورت : ہائے! دل سا گھر تو نے غارت کر دیا، اور اب کہتا ہے، یہ میری عادت نہیں۔

آزاد : اب مجھے فرصت نہیں ہے، پھر کسی روز آیئے گا۔

عورت : اچھا، اب کب ملو گے؟

آزاد : اب آپ تکلیف نہ کیجیے گا۔

یہ کہتے ہوئے آزاد اس کمرے سے نکل آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے وہ عورت بھی باہر نکلی۔ دونوں لیڈیوں نے اسے دیکھ کر کٹ گئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، چولی مسکی ہوئی۔ اس عورت نے آتے ہی آزاد کو کوسنا شروع کیا۔ تم لوگ گواہ رہنا۔ یہ مجھے الگ کمرے میں لے گئے اور ایک گھنٹے کے بعد مجھے چھوڑا۔ میری جو حالت ہے، آپ لوگ دیکھ رہی ہیں۔

آزاد : خیریت اسی میں ہے کہ آپ جائیے۔

عورت : اب میں جاؤں! اب کس کی ہو کے رہوں گی؟

کلاریسا : (فرانسیسی میں) یہ کیا ماجرا ہے آزاد :

آزاد : کوئی چھٹی ہوئی عورت ہے۔

آزاد کے تو ہوش اڑے ہوئے تھے کہ اچھے گھر بیانہ دیا اور وہ چمک کر یہی کہتی تھی۔ اچھا تمھیں قسم کھاؤ کہ تم میرے ساتھ اکیلے کمرے میں تھے یا نہیں؟

آزاد : اب ذلیل ہو کر یہاں سے جاؤ گی تم۔ عجیب مصیبت میں جان پڑی

عورت : اے ہے، اب مصیبت یاد آئی! پہلے کیا سمجھتے تھے؟

آزاد : بس، اب زیادہ نہ بڑھنا۔

عورت : گاڑی وان سے کہو۔ گاڑی برآمدے میں لائے۔

آزاد : ہاں، خدا کے لیے تم یہاں سے جاؤ۔

عورت : جاتی تو ہوں مگر دیکھو کیا ہوتا ہے۔

جب گاڑی روانہ ہوئی تو خوجی نے اندر آکر پوچھا۔ ان سے تمھاری کب کی جان پہچان تھی؟

آزاد : ارے بھائی، آج تو غضب ہو گیا۔

خوجی : منع تو کرتا تھا کہ ان سے دور رہو، مگر آپ سنتے کس کی ہیں۔

آزاد : جھوٹ بکتے ہو۔ تم نے کہہ دیا تھا کہ آپ جائیں، کچھ مضائقہ نہیں ہے۔ اور اب نکلے جاتے ہو۔

خوجی : اچھا صاحب، مجھی سے غلطی ہوئی۔ میں نے گاڑی وان کو چکمہ دے کر سارا حال معلوم کر لیا۔ یہ دونوں کندن کی چھوکریاں ہیں۔ اب یہ سارے شہر میں مشہور کریں گی کہ آزاد کا ہم سے نکاح ہونے والا ہے۔

آزاد : اس وقت ہمیں بڑی الجھن ہے بھائی! کوئی تدبیر سوچو۔

خوجی : تدبیر تو یہی ہے کہ میں کندن کے پاس جاؤں اور اسے سمجھا بجھا کر ڈھرے پر لاؤں۔

آزاد : تو پھر دیر نہ کیجیے۔ عمر بھر آپ کا احسان مانوں گا۔

خوجی تو ادھر روانہ ہوئے۔ اب آزاد نے دونوں لیڈیوں کی طرف دیکھا تو دونوں کے چہرے غصے سے تمتمائے ہوئے تھے۔ کلاریسا ایک ناول پڑھ رہی تھی اور مئیڈا سر جھکائے ہوئے تھی۔ ان دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ عورت یا تو آزاد کی بیاہتی بیوی ہے یا آشنا۔ اگر جان پہچان نہ ہوتی تو اس کمرے میں جا کر بیٹھنے کی دونوں میں سے ایک کو بھی ہمت نہ ہوتی۔ تھوڑی دیر تک بالکل سناٹا رہا، آخر آزاد نے خود ہی اپنی صفائی دینی شروع کی۔ بولے۔ کسی نے سچ کہا ہے، 'کر تو ڈر، نہ کر تو ڈر' میں نے اس عورت کی آج تک صورت بھی نہ دیکھی تھی۔ سمجھا کہ کوئی شریف زادی مجھ سے ملنے آئی ہوگی۔ مگر ایسی مکار اور بے شرم عورت میری نظر سے نہیں گزری۔

دونوں لیڈیوں نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ آزاد ہمیں چکمہ دے رہے ہیں۔ اب تو آزاد کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ کچھ دیر تک تو ضبط کیا مگر نہ رہا گیا۔ بولے۔ مس مئیڈا، تم نے اس ملک کی مکّار عورتیں ابھی نہیں دیکھیں۔

مئیڈا : مجھے ان باتوں سے کیا سروکار ہے۔

آزاد : اس کی شرارت دیکھی؟

مئیڈا : میرا دھیان اس وقت ادھر نہ تھا۔

آزاد : مس کلاریسا، تم کچھ سمجھی یا نہیں۔

کلاریسا : میں نے کچھ خیال نہیں کیا۔

آزاد : مجھ سا احمق بھی کم ہوگا۔ ساری دنیا سے آ کر یہاں چرکا کھا گیا۔

مئیڈا : اپنے کیے کا کیا علاج، جیسا کیا، ویسا بھگتو۔

آزاد : ہاں، یہی تو چاہتا تھا کہ کچھ کہو تو سہی۔ میڈا، سچ کہتا ہوں، جو کبھی پہلے اس کی صورت بھی دیکھی ہو۔ مگر اس نے وہ داؤں پیچ کیا کہ بالکل احمق بن گئے۔

میڈا : اگر ایسا تھا تو اسے الگ کمرے میں کیوں لے گئے؟

آزاد : اسی غلطی کا تو رونا ہے۔ میں کیا جانتا تھا کہ وہ یہ رنگ لائے گی۔

میڈا : یہ تو جو کچھ ہوا سو ہوا۔ اب آگے کے لیے کیا فکر کی ہے؟ اس کی بات چیت سے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ ضرور نالش کرے گی۔

آزاد : اسی کا تو مجھے بھی خوف ہے۔ خوجی کو بھیجا ہے کہ جا کر اسے دھمکائیں۔ دیکھو، کیا کر کے آتے ہیں۔

ادھر خوجی گرتے پڑتے کندن کے گھر پہنچے، تو دو تین عورتوں کو کچھ باتیں کرتے سنا۔ کان لگا کر سننے لگے۔

'بیٹا' تم تو سمجھتی ہی نہیں ہو، بدنامی کتنی بڑی ہے۔'

'تو اماں جان، بدنامی کا ایسا ہی ڈر ہو تو سبھی دب جایا کریں؟'

'دبتے ہی ہیں۔ اس فوجی افسر سے نہیں کھڑے کھڑے گنوا لیے!'

'اچھا اماں جان، تمھیں اختیار ہے، مگر نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔'

خوجی سے اب نہ رہا گیا۔ جھلاّ کر بولے۔ او گیدی، نکل تو آ۔ دیکھ تو کتنی کرولیا بھونکتا ہوں۔ بڑھ بڑھ کر باتیں بناتی ہے۔ نالش کرے گی، اور بدنام کرے گی۔

کندن نے یہ آواز سنی تو کھڑکی سے جھانکا۔ دیکھا، تو ایک ٹھگنا سا آدمی پینترے بدل رہا ہے۔ مہری سے کہا کہ دروازہ کھول کر بلا لو۔ مہری نے آکر کہا۔ کون صاحب ہیں؟ آیئے۔

خوجی اکڑتے ہوئے اندر گئے اور ایک موڑھے پر بیٹھے۔ بیٹھنا تھا کہ سر نیچے اور ٹانگیں اوپر۔ عورتیں ہنسنے لگیں۔ خیر، آپ سنبھل کر دوسرے موڑھے پر بیٹھے اور کچھ بولنا ہی چاہتے تھے کہ کندن سامنے آئی اور آتے ہی خوجی کو ایک دھکّا دے کر بولی— چولہے میں جائے ایسے میاں۔ برسوں بعد آج صورت دکھائی تو بھیس بدل کر آیا۔ نگوڑے، تیرا جنازہ نکلے۔ تو اب تک/تھا کہاں؟

خوجی : یہ دل لگی ہم کو پسند نہیں۔

کندن : (دھپ لگا کر) تو شادی کیا سمجھ کر کی تھی؟

شادی کا نام سن کر خوجی کی باچھیں کھل گئیں۔ سمجھے کہ مفت میں عورت ہاتھ آئی۔ بولے۔ تو شادی اس لیے کی تھی کہ جوتیاں کھائیں؟

کندن : آخر، تو اتنے دن تھا کہاں؟ لا، کیا کما کر لایا ہے۔

یہ کہہ کر کندن نے ان کی جیب ٹٹولی تو تین روپے اور کچھ پیسے نکلے۔ وہ نکال لیے۔ وہ بے چارہ ہاں ہاں کرتے ہی رہے کہ سبھوں نے انھیں گھر سے نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ خوجی وہاں سے بھاگے اور رونی صورت بنائے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوئے۔

آزاد نے پوچھا۔ کہوں بھائی، کیا کر آئے؟ ایں! تو تم پٹے ہوئے سے جان پڑتے ہو۔

خوجی : ذرا دم لینے دو۔ معاملہ بہت نازک ہے۔ تم تو پھنسے ہی تھے، میں بھی پھنس گیا۔ اس صورت کا برا ہو، جہاں جاتا ہوں وہیں چاہنے والے نکل آتے ہیں۔ ایک پنڈت نے کہا تھا کہ تمھارے پاس موہنی ہے۔ اس وقت تو اس کی بات مجھے کچھ نہ جچی، مگر اب دیکھتا ہوں تو اس نے بالکل سچ کہا تھا۔

آزاد : تم تو ہو سڑی۔ ایسے ہی تو بڑے حسین ہو۔ میری بابت بھی کندن سے کچھ بات چیت ہوئی یا آنکھیں ہی سینکتے رہے؟

خوجی : بڑے گھر کی تیاری کر رکھو۔ بندہ وہاں بھی تمھارے ساتھ ہوگا۔

آزاد : باز آئے آپ کے ساتھ سے۔ تمھیں کھلانا پلانا سب اکارت گیا۔ بہتر ہے، تم کہیں چلے جاؤ۔

اس پر خوجی بہت بگڑے۔ بولے۔ ہاں صاحب، کام نکل گیا نا؟ اب تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

خانساماں : کیا ہے خواجہ جی، کیوں بگڑ گئے؟

خوجی : تو چپ رہ قلی، خواجہ جی! اور سنیے گا؟

خانساماں : میں نے تو آپ کی عزت کی تھی۔

خوجی : نہیں، آپ معاف کیجیے۔ کیا خوب۔ ٹکے کا آدمی اور ہم سے اس طرح پر پیش آئے۔ مگر تم کیا کروگے بھائی، ہمارا نصیب ہی پھرا ہوا ہے۔ خیر، جو چاہو، سناؤ۔ اب ہم یہاں سے کوچ کرتے ہیں۔ جہاں ہمارے قدرداں ہیں، وہاں جائیں گے۔

خانساماں : یہاں سے بڑھ کر آپ کا کون قدرداں ہوگا؟ کھانا آپ کو دیں، کپڑا آپ کو

دیں، اس پر دوست بنا کر رکھیں، پھر اب اور کیا چاہیے۔

خوجی : سچ ہے بھائی، سچ ہے۔ ہم آزاد کے غلام تو ہیں ہی۔ انھیں سے قسم لو کہ ان کے باپ دادا ہمارے بزرگوں کے ٹکڑے کھا کر پلے تھے یا نہیں۔

آزاد : آپ کی باتیں سن رہا ہوں۔ ذرا ادھر دیکھیے گا۔

خوجی : سو سنار کی، تو ایک لوہار کی۔

آزاد : ہمارے باپ دادا آپ کے ٹکڑ خورے تھے؟

خوجی : جی ہاں، کیا اس میں کچھ شک بھی ہے۔

اتنے میں خانساماں نے دور سے کہا۔ خواجہ صاحب، ہم نے تو سنا ہے کہ آپ کے والد انڈے بیچا کرتے تھے۔

اتنا سننا تھا کہ خوجی آگ ہو گئے اور ایک توا اٹھا کر خانساماں کی طرف دوڑے۔ توا بہت گرم تھا۔ اچھی طرح اٹھا بھی نہ پائے تھے کہ ہاتھ جل گیا۔ جھجک کر توے کو جو پھینکا تو خود بھی منھ کے بل گر پڑے۔

خانساماں : یا علی، بچائیے۔

بیرا : توا تو جل رہا تھا، ہاتھ جل گیا ہوگا۔

میٹڈا : ڈاکٹر کو فوراً بلاؤ۔

خانساماں : اٹھ بیٹھو بھائی، کیسے پہلوان ہو!

آزاد : خدا نے بچا لیا، ورنہ جان ہی گئی تھی۔

خواجہ صاحب چپ چاپ پڑے ہوئے تھے۔ خانساما نے برآمدے میں ایک پلنگ بچھایا اور دو آدمیوں نے مل کر خوجی کو اٹھایا کہ برآمدے میں جائیں۔ اسی وقت ایک آدمی نے کہا۔ جب بچنا مشکل ہے۔ خوجی عقل کے دشمن تو تھے ہی۔ ان کو یقین ہو گیا کہ اب آخری وقت ہے۔ رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ خانساماں اور ہوٹل کے اور نوکر چاکر ان کو بنانے لگے۔

خانساماں : بھائی، دنیا اسی کا نام ہے۔ زندگی کا اعتبار کیا۔

بیرا : اسی بہانے موت لکھی تھی۔

محرر : اور ابھی نوجوان آدمی ہیں۔ ان کی عمر ہی کیا ہے؟

آزاد : کیا، حال کیا ہے؟ نبض کا کچھ پتہ ہے؟

خانساماں : حضور، اب آخری وقت ہے۔ اب کفن دفن کی فکر کیجیے۔ یہ سن کر خوجی جل بھن گئے۔ مگر آخری وقت تھا، کچھ بول نہ سکے۔

آزاد : کسی مولوی کو بلاؤ۔

محرر : حضور، یہ نہ ہوگا۔ ہم نے کبھی ان کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔

آزاد : بھئی، اس وقت یہ ذکر نہ کرو۔

محرر : حضور مالک ہیں، مگر یہ مسلمان نہیں ہیں۔

خوجی کا بس چلتا تو محرر کی بوٹیاں نوچ لیتے، مگر اس وقت وہ مر رہے تھے۔

خانساماں : قبر کھدوایئے، اب ان میں کیا ہے؟

بیرا : اسی سامنے والے میدان میں ان کو توپ دو۔

خوجی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کمبخت کہتا ہے، توپ دو۔ یہ نہیں کہتا ہے کہ آپ کو دفن کر دو۔

آزاد : بڑا اچھا آدمی تھا بے چارہ۔

خانساماں : لاکھ سڑی تھے، مگر تھے نیک۔

بیرا : نیک کیا تھے۔ ہاں، یہ کہو کہ کسی طرح نبھ گئی۔

خوجی اپنا خون پی کے رہ گئے، مگر مجبور تھے۔

محرر : اب ان کو مل کے توپ ہی دیجیے۔

آزاد : گھڑی دو میں مرلیا باجے گی۔

بیرا : خواجہ صاحب، کہیے، اب کتنی دیر میں مرلیا باجے گی؟

آزاد : اب اس وقت کیا بتائیں بے چارے، افسوس ہے!

خانساماں : افسوس کیوں حضور، اب مرنے کے تو دن ہی تھے۔ جوان جوان مرتے جاتے ہیں۔ یہ تو اپنی عمر تمام کر چکے۔ اب کیا عاقبت کے بورے بٹوریں گے؟

آزاد : ہاں، ہے تو ایسا ہی مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ آدمی چاہے دو سو برس کا ہو کے مرے، مگر مرتے وقت یہی جی چاہتا ہے کہ دس برس اور زندہ رہتا۔

خانساماں : تو حضور، یہ تمنا تو اس کو ہو، جس کا کوئی رونے والا ہو۔ ان کے کون بیٹھا

ہے۔

اتنے میں ہوٹل کا ایک آدمی ایک چپراسی کو حکیم بنا کر لایا!

آزاد : کرسی پر بیٹھیے حکیم صاحب۔

حکیم : یہ گستاخی مجھ سے نہ ہوگی۔ حضور بیٹھیں۔

آزاد : اس وقت سب معاف ہے۔

حکیم : یہ بے ادبی مجھ سے نہ ہوگی۔

آزاد : حکیم صاحب، مریض کی جان جاتی ہے اور آپ تکلف کرتے ہیں۔

حکیم : چاہے مریض مر جائے، مگر میں ادب کو ہاتھ سے جانے نہ دوں گا۔

خوجی کو حکیم کی صورت سے نفرت ہو گئی۔

آزاد : آپ تکلف تکلف میں مریض کی جان لے لیں گے۔

حکیم : اگر موت ہے تو مرے گا ہی، میں اپنی عادت کیوں چھوڑوں؟

آزاد نے خوجی کے کان میں زور سے کہا۔ حکیم صاحب آئے ہیں۔

خوجی نے حکیم صاحب کو سلام کیا اور ہاتھ بڑھایا۔

حکیم : (نبض پر ہاتھ رکھ کر) اب کیا باقی ہے، مگر ابھی تین چار دن کی نبض ہے، اس وقت اُن کو ٹھنڈا پانی سے نہلایا جائے تو بہتر ہے، بلکہ اگر پانی میں برف ڈال دیجیے تو اور بھی بہتر ہے۔

آزاد : بہت اچھا۔ ابھی لیجیے۔

حکیم : بس، ایک دو من برف کافی ہوگی۔

اتنے میں مِس میڈا نے آزاد سے کہا۔ تم بھی عجیب آدمی ہو۔ دو چار ہوٹل والوں کو لے کر ایک غریب کا خون اپنی گردن پر لیتے ہو۔ خوجی کی چارپائی ہمارے کمرے کے سامنے بچھوا دو اور ان آدمیوں سے کہہ دو کہ کوئی خوجی کے قریب نہ آئے۔

اس طرح خوجی کی جان بچی۔ آرام سے سوئے۔ دوسرے دن گھومتے گھامتے ایک چنڈو خانے میں جا پہنچے اور چھینٹے اڑانے لگے۔ یکا یک حسن آرا کا ذکر سن کر ان کے کان کھڑے ہوئے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ حسن آرا پر ایک شہزادے عاشق ہوئے ہیں، جن کا نام قمرالدولہ ہے۔ خوجی بگڑ کر بولے۔ خبردار، جو اب کسی نے حسن آرا کا نام پھر لیا۔ شریف

زادیوں کا نام بد کرتا ہے بے!

ایک چنڈو باز : ہم تو سنی سنائی کہتے ہیں صاحب۔ شہر بھر میں یہ خبر مشہور ہے، آپ کس کس کی زبان روکیے گا۔

خوجی : جھوٹ ہے، بالکل جھوٹ۔

چنڈو باز : اچھا، ہم جھوٹ کہتے ہیں تو عیدو سے پوچھ لیجیے۔

عیدو : ہم نے تو یہ سنا تھا کہ بیگم صاحب نے اخبار میں کچھ لکھا تو وہ شہزادے نے پڑھا اور عاشق ہو گئے، فوراً بیگم صاحب کے نام سے خط لکھا اور شاید کسی بانکے کو مقرر کیا ہے کہ آزاد کو مار ڈالے۔ خدا جانے، سچ ہے یا جھوٹ۔

خوجی : تم نے کس سے سنی ہے یہ بات؟ اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تھانے پر چل کر گواہی دینی ہوگی۔

عیدو : حضور کیا آزاد کے دوست ہیں؟

خوجی : دوست نہیں ہوں، استاد ہوں۔ میرا شاگرد ہے۔

عیدو : آپ کے کتنے شاگرد ہوں گے؟

خوجی : یہاں سے لے کر روم اور شام تک۔

خوجی شہزادے کا پتہ پوچھتے ہوئے لال کنویں پر پہنچے۔ دیکھا تو سینکڑوں آدمی پانی بھر رہے ہیں۔

خوجی : کیوں بھائی، یہ کنواں تو آج تک دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

بھشتی : کیا کہیں باہر گئے تھے؟

خوجی : ہاں بھائی، بڑا لمبا سفر کر کے لوٹا ہوں۔

بھشتی : اسے بنے تو چار مہینے ہو گئے۔

خوجی : اہا ہا! یہ کہو، بھلا کس نے بنوایا ہے؟

بھشتی : شہزادہ قمر الدولہ نے۔

خوجی : شہزادہ صاحب رہتے کہاں ہیں؟

بھشتی : تم تو معلوم ہوتا ہے اس شہر میں آج ہی آئے ہو۔ سامنے انھیں کی برادری تو ہے۔

خوجی یہاں سے محل کے چوبدار کے پاس پہنچے اور علیک سلیک کر کے بولے۔ بھائی، کوئی نوکری دلواتے ہو۔

دربان : داروغہ صاحب سے کہیے، شاید مطلب نکلے۔

خوجی : ان سے کب ملاقات ہوگی؟

دربان : ان کے مکان پر جایئے، اور کچھ چٹایئے۔

خوجی : بھلا شہزادے تک رسائی ہوسکتی ہے یا نہیں؟

دربان : اگر کوئی اچھی صورت دکھاؤ تو پو بارہ ہیں۔

اتنے میں اندر سے ایک آدمی نکلا۔ دربان نے پوچھا کدھر چلے شیخ جی؟

شیخ : حکم ہوا ہے کہ کسی رمّال کو بہت جلد حاضر کرو۔

خوجی : تو ہم کو لے چلئے۔ اس فن میں ہم اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

شیخ : ایسا نہ ہو، آپ وہاں چل کر بے وقوف بنیں۔

خوجی : اجی، لے تو چلئے۔ خدا نے چاہا تو سرخ رو ہی رہوں گا۔

شیخ صاحب ان کو لے کر برادری میں پہنچے۔ شہزادہ صاحب مسند لگائے پیچ وان پی رہے تھے اور مصاحب لوگ انھیں گھیرے بیٹھے ہوئے تھے۔ خوجی نے ادب سے سلام کیا اور فرش پر جا بیٹھے۔

آغا : حضور، اگر حکم ہو تو تارے آسمان سے اتار لوں۔

منّے : حق ہے۔ ایسا ہی رعب ہے ہمارے سرکار کا۔

مرزا : خداوند، اب حضور کی طبیعت کا کیا حال ہے؟

آغا : خدا کا فضل ہے۔ خدا نے چاہا تو صبح شام شپا لڑا ہی چاہتا ہے۔ حضور کا نام سن کر کوئی نکاح سے انکار کرے گا بھلا!

خوجی : خدا گواہ ہے کہ شہر میں دوسرا رئیس ٹکر کا نہیں ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔

مرزا : سبحان اللہ! واہ! خان صاحب واہ! سچ ہے۔

شیخ : خان صاحب نہیں، خواجہ صاحب کہیے۔

مرزا : اجی، وہ کوئی ہوں، ہم تو انصاف کے لوگ ہیں۔ خدا کو منھ دکھانا ہے۔ کیا بات

کہی ہے۔ خواجہ صاحب، آپ تو پہلی مرتبہ اس صحبت میں شریک ہوئے ہیں۔ رفتہ رفتہ دیکھیے گا کہ حضور نے کیسا مزاج پایا ہے۔

شیخ : بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان۔

خوجی : مجھ سے کہتے ہو۔ شہر میں کون رئیس ہے، جس سے میں واقف نہیں؟

آغا : بھائی مرزا، اب فتح ہے۔ ادھر کا رنگ پھیکا ہو رہا ہے۔ اب تو ادھر ہی جھکی ہوئی ہیں۔

مرزا : واللہ! ہاتھ لگائے گا۔ مردوں کا وار خالی جائے؟

آغا : یہ سب حضور کا اقبال ہے۔

قمرالدولہ : میں تو تڑپ رہا تھا، زندگی سے بے زار تھا۔ آپ لوگوں کی بدولت اتنا تو ہو گیا۔

خوجی حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ حسن آرا کو یہ کیا ہو گیا کہ قمرالدولہ پر ریجھی! کبھی یقین آتا تھا، کبھی شک ہوتا تھا۔

آغا : حضور، کا دور دور تک نام ہے۔

مرزا : کیوں نہیں، لندن تک۔

خوجی : کہہ دیا نا بھائی جان، کہ دوسرا نظر نہیں آتا۔

شہزادہ : (آغا سے) یہ یہاں رہتے ہیں اور کون ہیں؟

خوجی : جی، غریب کا مکان مرغی بازار میں ہے۔

آغا : جبھی آپ کڑک رہے تھے۔

مرزا : ہاں، انڈے بیچتے تو ہم نے بھی دیکھا تھا۔

خوجی : جبھی آپ صدر بازار میں ٹاپا کرتے ہیں۔

شہزادہ : خواجہ صاحب ضلعے میں طاق ہیں۔

خوجی : آپ کی قدردانی ہے۔

باتوں باتوں میں یہاں کا ٹوہ لے کر خوجی گھر چلے۔ ہوٹل میں پہنچے تو آزاد کو بوڑھے میاں سے باتیں کرتے دیکھا۔ للکار کر بولے۔ لو، میں بھی آ پہنچا۔

آزاد : غل نہ مچاؤ۔ ہم لوگ نہ جانے کیسی صلاح کر رہے ہیں۔ تم کو کیا، بے فکر ہو۔

کچھ بسنت کی بھی خبر ہے؟ یہاں ایک نیا گل کھلا ہے!

خوجی : اجی، ہمیں سب معلوم ہے۔ ہمیں کیا سکھاتے ہو۔

آزاد : تم سے کس نے کہا؟

خوجی : اجی، ہم سے بڑھ کر ٹوہیا کوئی ہو تو لے۔ ابھی انھیں قمرالدولہ کے یہاں جا پہنچا۔ پورے ایک گھنٹے تک ہم سے ان سے بات چیت رہی۔ آدمی تو خبتی سا ہے اور بالکل جاہل۔ مگر اس نے حسن آرا کو کہاں سے دیکھ لیا؟ چھوکری ہے چلبلی۔ کوٹھے پر گئی ہوگی، بس اس کی نظر پڑ گئی ہوگی۔

بوڑھے میاں : ذرا زبان سنبھال کر!

خوجی : آپ جب دیکھو، ترچھے ہی ہو کر باتیں کرتے ہیں؟ کیا کوئی آپ کا دیا کھاتا ہے یا آپ کا دبیل ہے؟ بڑے عقلمند آپ ہی تو ہیں ایک!

اتنے میں فٹن پر ایک انگریز آزاد کو پوچھتا ہوا آ پہنچا۔ آزاد نے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ فوجی افسر ہے۔ آزاد کو ایک جلسے کا چیرمین بننے کے لیے کہنے آئے ہیں۔

آزاد : اس کے لیے آپ نے کیوں اتنی تکلیف کی؟ ایک خط کافی تھا۔

صاحب : میں چاہتا ہوں کہ آپ اسی وقت میرے ساتھ چلیں۔ لکچر کا وقت بہت قریب ہے۔

آزاد صاحب کے ساتھ چلے دیے۔ ٹاؤن ہال میں بہت سے آدمی جمع تھے۔ آزاد کے پہنچتے ہی لوگ انھیں دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اور جب وہ بولنے کے لیے میز کے سامنے کھڑے ہوئے تو چاروں طرف سماں بندھ گیا۔ جب وہ بیٹھنا چاہتے تو لوگ غل مچاتے تھے، ابھی کچھ اور فرمایئے۔ یہاں تک کہ آزاد ہی کے بولتے بولتے وقت پورا ہو گیا اور صاحب بہادر کے بولنے کی نوبت نہ آئی۔ شہزادہ قمرالدولہ بھی مصاحبوں کے ساتھ جلسے میں موجود تھے۔ جیوں ہی آزاد بیٹھے، انھوں نے آغا سے کہا۔ سچ کہنا، ایسا خوبصورت آدمی کبھی دیکھا ہے؟

آغا : بالکل شیر معلوم ہوتا ہے۔

شہزاد : ایسا جوان دنیا میں نہ ہوگا۔

آغا : اور تقریر کتنی پیاری ہے!
شہزادہ : کیوں صاحب، جب ہم مردوں کا یہ حال ہے، تو عورتوں کا کیا حال ہوتا ہوگا؟
آغا : عورت کیا، پری عاشق ہو جائے۔
شہزادہ صاحب جب یہاں سے چلے تو دل میں سوچا۔ بھلا آزاد کے سامنے میری دال کیا گلے گی؟ میرا اور آزاد کا مقابلہ کیا؟ اپنی حماقت پر بہت شرمندہ ہوئے۔ جیوں ہی مکان پر پہنچے، مصاحبوں نے بے پر کی اڑانی شروع کی۔
مرزا : خداوند، آج تو منہ میٹھا کرائیے۔ وہ خوشخبری سناؤں کہ پھڑک جائیے۔ حضور، ان کے یہاں ایک مہری نوکر ہے۔ وہ مجھ سے کہتی تھی کہ آج آپ کے سرکار کی تصویر کا آزاد کی تصویر سے مقابلہ کیا اور بولیں۔ میری تو شہزادے پر جان جاتی ہے۔
اور مصاحبوں نے بھی خوشامد کرنی شروع کی، مگر نواب صاحب نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر تک بیٹھے رہے۔ پھر اندر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مصاحبوں نے آغا سے پوچھا۔ ارے میاں! بتاؤ تو، کیا ماجرا؟ کیا سبب ہے کہ سرکار آج اتنے اداس ہیں؟
آغا : بھئی، کچھ نہ پوچھیے۔ بس، یہی سمجھ لو کہ سرکار کی آنکھیں کھل گئیں۔

(109)

آزاد کے آنے کے بعد ہی بڑی بیگم نے شادی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ بڑی بیگم چاہتی تھیں کہ برات خوب دھام دھام سے آئے۔ آزاد دھوم دھام کے خلاف تھے۔ اس پر حسن آرا کی بہنوں سے باتیں ہونے لگیں۔
بہار بیگم : یہ سب دکھانے کی باتیں ہیں۔ کسی سے دو ہاتھی مانگا، کسی سے دو چار گھوڑے، کہیں سے سپاہی آئے، کہیں سے برچھی بردار! لو صاحب، برات آئی ہے۔ مانگیں تانگے کی برات سے فائدہ؟
بڑی بیگم : ہم کو یہ تمنا نہیں ہے کہ برات دھوم ہی سے دروازے پر آئے۔ مگر کم سے کم اتنا تو ضرور ہونا چاہیے کہ جگ ہنسائی نہ ہو۔
جانی بیگم : ایک کام کیجیے، ایک خط لکھ بھیجئے۔
گیتی : ہمارے خاندان میں کبھی ایسا ہوا ہی نہیں۔ ہم نے تو آج تک نہیں سنا۔ دھنیے

جولاہوں کے یہاں تک تو انگریزی باجا برات کے ساتھ ہوتا ہے۔

بہار : ہاں صاحب، برات تو وہی ہے، جس میں 50 ہاتھی، بلکہ فیل خانے کا فیل خانہ ہو، سانڈنیوں کی قطار دو محلّے تک جائیں۔ شہر بھر کے گھوڑے اور ہولدار اور تام دان ہوں اور کئی رسالے، بلکہ توپ خانہ بھی ضرور ہو۔ قدم قدم پر آتش بازی چھوٹتی ہو اور گولے دغتے ہوں۔ معلوم ہو کہ برات کیا، قلعہ فتح کیا جاتا ہے۔

نازک : یہ سب بری باتیں ہیں، کیوں؟

بہار : جی نہیں، انھیں بری کون کہے گا بھلا۔

نازک : اچھا، وہ جانیں، ان کا کام جانے۔

حسن آرا نے جب دیکھا کہ آزاد کی ضد سے بڑی بیگم ناراض ہوئی جاتی ہیں تو آزاد کے نام ایک خط لکھا۔

پیارے آزاد،

مانا کہ تمھارے خیالات بہت اونچے ہیں، مگر راہ رسم میں دخل دینے سے کیا نتیجہ نکلے گا۔ امّاں جان ضد کرتی ہیں، اور تم انکار، خدا ہی خیر کرے۔ ہماری خاطر سے مان لو، اور جو وہ کہے سو کرو۔

آزاد نے اس کا جواب لکھا۔ جیسی تمھاری مرضی۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔

حسن آرا نے یہ خط پڑھا تو تسکین ہوئی۔ نازک ادا سے بولیں۔ لو بہن، جواب آ گیا۔

نازک : مان گئے یا نہیں؟

حسن آرا : کیسے نہ مانتے۔

نازک : چلو، اب امّاں جان کو بھی تسکین ہوگئی۔

بہار : مٹھائیاں بانٹو۔ اب اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کیا بات ہوگی؟

نازک : آخر پھر روپیہ اللہ نے کس کام کے لیے دیا ہے؟

بہار : واہ ری عقل! بس، روپیہ اس لیے ہے کہ آتش بازی میں پھونکے یا سجاوٹ میں لٹائے۔ اور کوئی کام ہی نہیں؟

نازک : اور آخر کیا کام ہے؟ کیا پرچون کی دوکان کرے؟ چنے بیچیں؟ کچھ معلوم تو ہو کہ روپیہ کس کام میں خرچ کیا جائے؟ دل کا حوصلہ اور کیسے نکالے۔

بہار : اپنی اپنی سمجھ ہے۔

نازک : خدا نہ کرے کہ کسی کی ایسی الٹی سمجھ ہو۔ لو صاحب، اب برات بھی گناہ ہے۔ ہاتھی، گھوڑے، باجا سب عیب میں داخل۔ جو برات نکالتے ہیں، سب گدھے ہیں۔ ایک تم اور دوسرے میاں آزاد دو آدمیوں پر عقل ختم ہو گئی۔ ذرا آنے تو دو میاں کو، ساری شیخی نکل جائے گی۔

دوسرے دن بڑی دھوم دھام سے مانجھے کی تیاری ہوئی۔ آزاد کی طرف خوجی مہتمم تھے۔ آپ نے پرانے ڈھنگ کی جامدانی کی اچکن پہنی، جس میں قیمتی بیل ٹکی ہوئی تھی۔ سر پر ایک بہت بڑا شملہ۔ کندھے پر کشمیر کا ہرا دوشالا۔ اس ٹھاٹ سے آپ باہر آئے تو لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اس پر آپ بہت ہی خفا ہو کر بولے۔ یہ تالیاں ہم پر نہیں بجاتے ہو۔ یہ اپنے باپ داداؤں پر تالیاں بجاتے ہو۔ یہ خاص ان کا لباس ہے۔ کئی لونڈوں نے ان کے منھ پر ہنسنا شروع کیا، مگر انتظام کے دھن میں خوجی کو اور کچھ نہ سوجھتا تھا۔ کڑک کر بولے۔ ہاتھیوں کو اس طرف رہنے دو۔ بس، اسی لائن میں لا لا کر ہاتھی لگاؤ۔

ایک فیل بان : یہاں کہیں جگہ بھی ہے؟ سب کا بھرتا بنائیں گے آپ؟

خوجی : چپ رہ، بدمعاش!

مرزا صاحب بھی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بولے۔ بھئی، اس فن میں تو تم استاد ہو۔

خوجی : (مسکرا کر) آپ کی قدردانی ہے۔

مرزا : آپ کا رعب سب مانتے ہیں۔

خوجی : ہم کس لائق ہیں بھائی جان! دوستوں کا اقبال ہے۔

غرض اس دھوم دھام سے ماجھا دلہن کے مکان پر پہنچا کہ سارے شہر میں شور مچ گیا۔ سواریاں اتریں۔ میراشنوں نے سمدھنوں کو گالیاں دیں۔ میاں آزاد باہر سے بلوائے گئے اور ان سے کہا گیا کہ مڑھے کے نیچے بیٹھیے۔ آزاد بہت انکار کرتے رہے، مگر عورتوں نے ایک نہ سنی۔ نازک بیگم نے کہا۔ آپ تو ابھی سے بچکنے لگے۔ ابھی تو ماجھے کا جوڑا پہنانا پڑے گا۔

آزاد : یہ مجھ سے نہیں ہونے کا۔

جانی بیگم : اب چپ چاپ پہن لو، بس!

آزاد : کیا فضول رسم ہے!

جانی : لے، اب پہنتے ہو کہ تکرار کرتے ہو، ہم سے جنرلی نہ چلے گی۔

بیگم : بھلا، یہ بھی کوئی بات ہے کہ ماجھے کا جوڑا نہ پہنیں گے؟

آزاد : اگر آپ کی خاطر اسی میں ہے تو لائیے، ٹوپی دے لوں۔

نازک بیگم : جب تک ماجھے کا پورا جورا نہ پہنوگے، یہاں سے اٹھنے نہ پاؤ گے۔

آزاد نے بہت ہاتھ جوڑا، گڑگڑا کر کہا کہ خدا کے لیے مجھے اس پیلے جوڑے سے بچاؤ۔ مگر کچھ بس نہ چلا۔ سالیوں نے انگرکھا پہنایا، کنگن باندھا۔ ساری باتیں رسم کے مطابق پوری ہوئیں۔

جب آزاد باہر گئے تو سب بیگمیں مل کر باغ کی سیر کرنے چلیں۔ گیتی آرا نے ایک پھول توڑ کر جانی بیگم کی طرف پھینکا۔ اس نے وہ پھول روک کر ان پر تاک کے مارا تو آنچل سے لگتا ہوا چمن میں گرا۔ پھر کیا تھا، باغ میں چاروں طرف پھولوں کی مار ہونے لگی۔ اس کے بعد نازک ادا نے یہ غزل گائی —

واقف نہیں ہیں قاصد میرے غمِ نہاں سے
وہ کاش حال میرا سنتے میری زباں سے

کیوں تیوریوں پر بل ہے، ماتھے پر کیوں شکن ہے
کیوں اس قدر ہو برہم، کچھ تو کہو زباں سے

کوئی تو آشیانا صیاد نے جلایا
کالی گھٹائیں رو کر پلٹی ہیں بوستاں سے

جانے کو جاؤ لیکن، یہ تو بتاتے جاؤ
کس طرح بارِفرقت اٹھے گا ناتواں سے

بہار : جی چاہتا ہے، تمھاری آواز کو چوم لوں۔

نازک : اور میرا جی چاہتا ہے کہ تمھاری تعریف چوم لوں۔

بہار : ہم تمھاری آواز کے عاشق ہیں۔

نازک : آپ کی مہربانی۔ مگر کوئی خوبصورت مرد عاشق ہو تو بات ہے۔ تم ہم پر ریجھیں تو کیا، کچھ بات نہیں۔

بہار : بس، انھیں باتوں سے لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں۔ اور تم نہیں چھوڑتیں۔

جانی : سچی آواز بھی کتنی پیاری ہوتی ہے۔

نازک : کیا کہنا ہے! اب دو ہی چیزوں میں تو اثر ہے، ایک گانا، دوسرے حسن۔ اگر ہم کو اللہ نے حسن نہ دیا ہوتا، تو ہمارے میاں ہم پر کیوں ریجھتے۔

بہار : تمھارا حسن تمھارے میاں کو مبارک ہو۔ ہم تو تمھاری آواز پر مٹے ہوئے ہیں۔

نازک : اور میں تمھارے حسن پر جان دیتی ہوں۔ بس میں بھی بناؤ چناؤ کرنا تم سے سیکھوں گی۔

نازک : بہن، اب تم جھینپتی ہو۔ جب کبھی تم ملیں، تمھیں بنتے، اُٹھتے دیکھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑی ہو، مگر بارہ برس کی بنی رہتی ہو۔ ہیں تمھارے میاں قسمت کے دھنی۔

بہار : سنو بہن، ہماری رائے یہ ہے کہ اگر عورت سمجھدار ہو، تو مرد کی طاقت نہیں کہ اُسے باہر کا چسکا پڑے۔

ساچک کے دن جب چاندی کا پٹارہ باہر آیا، تو خوجی بار بار پٹارے کا ڈھکنا اٹھاکر دیکھنے لگا کہ کہیں شیشیاں نہ گرنے لگیں۔ موتیوں کا عطر خدا جانے، کن دقتوں سے لایا ہوں۔ یہ وہ عطر ہے، جو عاصف الدولہ کے یہاں سے بادشاہ کی بیگم کے لیے گیا تھا۔

ایک آدمی نے ہنس کر کہا : اتنا پُرانا عطر حضور کو کہاں سے مل گیا؟

خوجی : ہوں! کہاں سے مل گیا! مل کہاں سے جاتا؟ مہینوں دوڑا ہوں، تب جاکے یہ چیز ہاتھ لگی ہے۔

آدمی : کیوں صاحب، یہ برسوں کا عطر چٹک نہ گیا ہوگا؟

خوجی : واہ! عقل بڑی کی بھینس؟ بادشاہی کوٹھوں کے عطر کہیں چٹکا کرتے ہیں؟ یہ بھی ان گندھیوں کا تیل ہوا، جو پھیری لگاتے پھرتے ہیں۔

آدمی : اور کیوں صاحب، کیوڑا کہاں کا ہے؟

خوجی : کیوڑستان ایک مقام ہے، کجلی ون کے پاس۔ وہاں کے کیوڑوں سے کھینچا گیا ہے۔

آدمی : کیوڑستان! یہ نام تو آج ہی سنا۔

خوجی : ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے؟ کیوڑستان کا نام ہی سن کر گھبرا گئے۔

آدمی : کیوں حضور، یہ کجلی وَن کون سا ہے؟ وہی نا، جہاں گھوڑے بہت ہوتے ہیں۔

خوجی : (ہنس کر) : اب بناتے ہیں آپ۔ کجلی وَن میں گھوڑے نہیں، خاص ہاتھیوں کا جنگل ہے۔

آدمی : کیوں جناب، کیوڑستان سے تو کیوڑا آیا، اور گلاب کہاں کا ہے۔ شاید گلابستان کا ہوگا؟

خوجی : شاباش! یہ ہماری صحبت کا اثر ہے کہ اپنے پروں آپ اڑنے لگے۔ گلابستان کامرو کچھا کے پاس ہے، جہاں کا جادو مشہور ہے۔

رات کو جب ساچک کا جلوس نکلا تو خوجی نے ایک پنشاخے والی کا ہاتھ پکڑا اور کہا — جلدی جلدی قدم بڑھا۔

وہ بگڑ کر بولی : دور موئے! داڑھی جھلس دوں گی، ہاں۔ آیا وہاں سے بارات کا داروغہ بن کے، سوا مہرے پن کے دوسری بات نہیں۔

خوجی : نکال دو اس حرام زادی کو یہاں سے۔

عورت : نکال دو اس موڑی کاٹے کو۔

خوجی : اب میں چھری بھونک دوں گا، بس!

عورت : اپنے پنشاخے سے منھ جھلس دوں گی۔ مُوا دیوانہ، عورتوں کو راستے میں چھیڑتا چلتا ہے۔

خوجی : ارے میاں کانسٹیبل، نکال دو اس عورت کو۔

عورت : تو خود نکال دے، پہلے۔

جلوس کے ساتھ کئی بگڑے دل بھی تھے۔ انھوں نے خوجی کو چکما دیا — جناب، اگر اس نے سزا نہ پائی تو آپ کی بڑی کرکری ہوگی۔ بدرعبی ہو جائے گی۔ آخر، یہ فیصلہ ہوا، آپ کمر کس کر بڑے جوش کے ساتھ پنشاخے والی کی طرف جھپٹے۔ جھپٹتے ہی اس نے پنشاخہ سیدھا کیا اور کہا — اللہ کی قسم! نہ جھلس دوں، تو اپنے باپ کی نہیں۔

لوگوں نے خوجی پر پھبتیاں کسنی شروع کیں۔

ایک : کیوں میجر صاحب، اب تو ہاری مانی!

دوسرا : اے! کرولی اور چھری کیا ہوئی۔

تیسرا : ایک پنشانے والی سے نہیں جیت پاتے، بڑے سپاہی کے دم بنے ہیں۔

عورت : کیا دل لگی ہے ذرا جگہ سے بڑھا اور میں نے داڑھی اور مونچھ دونوں جھلس دیا۔

خوجی : دیکھو، سب کے سب دیکھ رہے ہیں کہ عورت سمجھ کر اس کو چھوڑ دیا۔ ورنہ کوئی دیو بھی ہوتا تو ہم بے قتل کیے نہ چھوڑتے اس وقت۔

جب ساچک دلہن کے گھر پہنچی، تو دلہن کی بہنوں نے چندن سے سمدھن کی مانگ بھری۔ حسن آرا کا نکھار آج دیکھنے کے قابل تھا۔ جس نے دیکھا، پھڑک گئی۔ دلہن کو پھولوں کا گہنہ پہنایا گیا۔ اس کے بعد چھڑیوں کی مار ہونے لگی۔ نازک ادا اور جانی بیگم کے ہاتھ میں پھولوں کی چھڑیاں تھیں۔ سمدھنوں پر اتنی چھڑیاں پڑیں کہ بیچاری گھبرا گئی۔

جب ماجھو اور ساچک کی رسم ادا ہوچکی تو مہندی کا جلوس نکلا۔ دلہن کے یہاں محفل بجی ہوئی تھیں۔ ڈومنیاں گا رہی تھیں۔ کمرے کی دیواریں اس طرح رنگی ہوئی تھیں کہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ چھت گیر کی جگہ سرخ زربفت لگایا گیا تھا۔ اس نے سنہری کلابتو کی جھالر تھی۔ فرش بھی سرخ مخمل کا تھا۔ جھاڑ اور کنول، مردنگ اور ہاڑیاں سب سرخ۔ کمرا شیش محل ہو گیا تھا۔ بیگمیں بھاری بھاری جوڑے پہنے چہکتی پھرتی تھیں۔ اتنے میں ایک سُکھ پال لے کر مہریاں صحن میں آئی۔ اس پر سے ایک بیگم صاحب اتریں، ان کا نام پری بانو تھا۔

سپہر آرا بولی : ہاں، اب نازک ادا بہن کی جواب دینے والی آگئی۔ برابر کی جوڑ ہے۔ یہ کم نہ وہ کم۔

روح افزا : نام بڑا پیارا ہے۔

نازک : پیارا کیوں نہ ہو۔ ان کے میاں نے یہ نام رکھا ہے۔

پری بانو : اور تمھارے میاں نے تمھارا نام کیا رکھا ہے چرباک محل۔

اس پر بڑی ہنسی اڑی۔ بارہ بجے رات کو مہندی روانہ ہوئی۔ جب جلوس سج گیا تو خواجہ صاحب آ پہنچے اور آتے ہی غل مچانا شروع کیا — سب چیزیں قرینے کے ساتھ لگاؤ اور میرے حکم کے بغیر کوئی ایک قدم بھی آگے نہ رکھے۔ ورنہ برا ہوگا۔

سجاوٹ کے تحت بڑے بڑے کاریگروں سے بنوائے گئے تھے۔ جس نے دیکھا، دنگ ہو گیا۔

ایک : یوں تو سبھی چیزیں اچھی ہیں، مگر تخت سب سے بڑھ کر ہیں۔

دوسرا : بڑا روپیہ انھوں نے صرف کیا ہے صاحب۔

تیسرا : ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ کے پھول کھلے ہیں۔

چوتھا : ذرا چنڈوبازوں کے تخت کو دیکھیے۔ او ہو! سب کے سب اوندھے پڑے ہوئیں ہیں! آنکھوں سے نشہ ٹپکا پڑتا ہے۔ کمال اسے کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے، سچ مچ چنڈو خانہ ہی ہے۔ وہ دیکھیے، ایک بیٹھا ہوا کس مزے سے پونڈا چھیل رہا ہے۔

اس کے بعد ترک سواروں کا تخت آیا۔ جوان لال بانات کی کرتیاں پہنے، سر پر بانکی ٹوپیاں دیے، بوٹ چڑھائے، ہاتھ میں ننگی تلواریں لیے، بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ رسالے نے اب دھاوا کیا۔

جب جلوس دلہا کے یہاں پہنچا تو بیگمیں پالکیوں سے اتریں۔ دلہا کی بہنیں اور بھاوجیں دروازے تک انھیں لینے آئیں۔ جب سمدھنیں بیٹھیں تو ڈومنیوں نے مبارکباد گائی۔ پھر گالیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ آزاد کو جب یہ خبر ہوئی تو بہت ہی بگڑے، مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ اب آزاد کے ہاتھوں میں مہندی لگانے کی باری آئی۔ ان کا ارادہ تھا کہ ایک ہی انگلی میں مہندی لگائیں، مگر جب ایک طرف سپہرآرا اور دوسری طرف روح افزا بیگم نے دونوں ہاتھوں میں منہدی لگانی شروع کی تو ان کی ہمت نہ پڑی کہ ہاتھ کھینچ لیں۔

ہنسی ہنسی میں انھوں نے کہا— ہندوؤں کی دیکھا دیکھی ہم لوگوں نے یہ رسم سیکھی ہے۔ نہیں تو عرب میں کون منہدی لگاتا ہے۔

سپہرآرا : جن ہاتھوں سے تلوار چلائی۔ ان ہاتھوں کو کوئی ہنس نہیں سکتا۔ سپاہی کو کون ہنسے گا بھلا؟

روح افزا : کیا بات کہی ہے! جواب دو تو جانیں۔

دو بجے رات کو روح افزا بیگم کو شرارت جو سوجھی تو گیرو گھول کر سوتے میں مہریوں کو رنگ دیا اور لگے ہاتھ کئی بیگموں کے منھ بھی رنگ دیے۔ صبح کو جانی بیگم اٹھیں تو ان کو دیکھ کر سب کی سب ہنسنے لگیں۔ چکرائیں کہ ماجرا کیا ہے۔ پوچھا— ہمیں دیکھ کر ہنس رہی ہو کیا!

روح افزا : گھبراؤ نہیں، ابھی معلوم ہو جائے گا۔

نازک : کچھ اپنے چہرے کی خبر ہے؟

جانی : تم اپنے چہرے کی تو خبر لو۔

دونوں آئینے کے پاس جا کے دیکھتی ہیں، تو منھ رنگا ہوا۔ بہت شرمندہ ہوئیں۔

روخ افزا : کیوں بہن، کیا یہ بھی کوئی سنگار ہے؟

جانی : اچھا، کیا مضائقہ ہے، مگر اچھے گھر بیانا دیا۔ آج رات ہونے دو۔ ایسا بدلہ لوں کہ یاد ہی کرو۔

روح افزا : ہم دروازے بند کر کے سو رہیں گے۔ پھر کوئی کیا کرے گا۔

جانی : چاہے دروازہ بند کر لو، چاہے دس من کا تالا ڈال دو، ہم اس سیاہی سے منھ رنگیں گے۔ جس سے جوتے صاف کیے جاتے ہیں۔

روح افزا : بہن، اب تو معاف کرو۔ اور یوں ہم حاضر ہیں۔ جوتوں کا ہار گلے میں ڈال دو۔

اس طرح چہل پہل کے ساتھ مہندی کی رسم ادا ہوئی۔

(110)

خوجی نے جب دیکھا کہ آزاد کی چاروں طرف تعریف ہو رہی ہے، اور ہمیں کوئی نہیں پوچھتا، تو بہت جھلّائے اور کل شہر کے افیمچیوں کو جمع کر کے انھوں نے بھی جلسہ کیا اور یوں اسپیچ دی—— بھائیوں! لوگوں کا خیال ہے کہ افیم کھا کر آدمی کسی کام کا نہیں رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں، بالکل غلط۔ میں نے روم کی لڑائی میں جیسے جیسے کام کیے، اس پر بڑے سے بڑا سپاہی بھی ناز کر سکتا ہے۔ میں نے اکیلے دو دو لاکھ آدمیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ توپوں کے سامنے بے دھڑک چلا گیا ہوں۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو نیچا دکھا دیا ہے۔ اور میں وہ آدمی ہوں، جس کے یہاں ستر پشتوں سے لوگ افیم کھاتے آئے ہیں۔

لوگ : سبحان اللہ! سبحان اللہ!!

خوجی : رہی عقل کی بات، تو میں دنیا کے بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے فلاسفر کو چنوتی دیتا ہوں کہ وہ آ کر میرے سامنے کھڑا ہو جائے۔ اگر ایک ڈپٹ میں بھگا نہ دوں تو اپنا نام بدل ڈالوں۔

لوگ : کیوں نہ ہو۔

خوجی : مگر آپ لوگ کہیں گے کہ تم افیم کی تعریف کرکے اسے اور گراں کر دوگے، کیونکہ جس چیز کی مانگ زیادہ ہوتی ہے، وہ مہنگی بکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس شک کو دل میں نہ آنے دیجیے، کیونکہ سب سے زیادہ ضرورت دنیا میں غلّے کی ہے۔ اگر مانگ کے زیادہ ہونے سے چیزیں مہنگی ہو جاتیں تو غلّہ اب تک دیکھنے کو بھی نہ ملتا۔ مگر اتنا سستا ہے کہ کوری چمار، دھنیا جولا ہے سب خریدتے اور کھاتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جب لوگوں نے دیکھا کہ غلّے کی ضرورت زیادہ ہے، تو غلّہ زیادہ بونے لگے۔ اسی طرح جب افیم کی مانگ ہوگی، تو غلّے کی طرح بوئی جائے گی اور سستی بکے گی۔ اس لیے ہر ایک سچے افیمچی کا فرض ہے کہ وہ اس کے فائدوں کو دنیا پر روشن کر دے۔

ایک : کیا کہنا ہے! کیا بات پیدا کی!

دوسرا : کمال ہے، کمال!

تیسرا : آپ اس فن کے خدا ہیں۔

چوتھا : میری تسلّی نہیں ہوئی۔ آخر، افیم دن دن کیوں مہنگی ہوتی جاتی ہے؟

پانچواں : چپ رہ! نامعقول! خواجہ صاحب کی بات پر اعتراض کرتا ہے! جا کر خواجہ صاحب کے پیروں پر گر اور کہو کہ قصور معاف کیجیے۔

خوجی : بھائیوں! کسی بھائی کو ذلیل کرنا میری عادت نہیں۔ گو کہ خدا نے مجھے بڑا رتبہ دیا ہے اور میرا نام ساری دنیا میں روشن ہے، مگر آدمی نہیں، آدمی کا جوہر ہے۔ میں اپنی زبان سے کسی کو کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے یہی کہنا چاہیے کہ میں دنیا میں سب سے نالائق، سب سے زیادہ بدنصیب اور سب سے زیادہ ذلیل ہوں۔ میں نے مصر کے پہلوان کو پٹکنی نہیں دی تھی، اسی نے اٹھا کے مجھے دے مارا تھا۔ جہاں گیا، پٹ آیا۔ گو دنیا جانتی ہے کہ خواجہ صاحب کا جوڑ نہیں، مگر اپنی زبان سے میں کیوں کہوں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ بوا زعفران نے مجھے پیٹ لیا اور میں نے اف تک نہ کی۔

ایک : خدا بخشے آپ کو۔ کیا کہنا ہے استاد!

دوسرا : پٹ گئے اور اف تک نہ کی؟

خوجی: بھائیوں گو کہ میں اپنی شان میں عزت کے بڑے بڑے خطاب پیش کر سکتا ہوں، مگر جب مجھے کہنا ہوگا تو یہی کہوں گا کہ میں جھک مارتا ہوں۔ اگر اپنا ذکر کروں گا تو

یہی کہوں گا کہ پاجی ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھے ذلیل سمجھیں تاکہ مجھے غرور نہ ہو۔

لوگ : واہ واہ! کتنی عاجزی ہے! جبھی تو خدا نے آپ کو یہ رتبہ دیا۔

خوجی : آج کل زمانہ نازک ہے! کسی نے ذرا ٹیڑھی بات کی اور دھر لیے گئے۔ کسی کو ایک دھول لگائی اور چلان ہو گیا۔ حاکم نے 10 روپیہ جرمانہ کردیا یا دو مہینے کی قید۔ اب بیٹھے ہوئے چکی پیس رہے ہیں۔ اس زمانے میں اگر نباہ ہے، تو عاجزی میں۔ اور افیم سے بڑھ کر عاجزی کا سبق دینے والی دوسری چیز نہیں۔

لوگ : کیا دلیلیں ہیں! سبحان اللہ!

خوجی : بھائیوں، میری اتنی تعریف نہ کیجیے، ورنہ مجھے غرور ہو جائے گا۔ میں وہ شیر ہوں، جس نے جنگ کے میدان میں کروڑوں کو نیچا دکھایا۔ مگر اب تو آپ کا غلام ہوں۔

ایک : آپ اس قابل ہیں کہ ڈبیا س بند کر دیں۔

دوسرا : آپ کے قدموں کی خاک لے کر تعویذ بنانی چاہیے۔

تیسرا : اس آدمی کی زبان چومنے کے قابل ہے۔

چوتھا : بھائی، یہ سب افیم کے دم کا ظہورہ ہے۔

خوجی : بہت ٹھیک۔ جس نے یہ بات کہی، ہم اسے اپنا استاد مانتے ہیں۔ یہ میری خاندانی صفت ہے۔ ایک نقل سنیے— ایک دن بازار میں کسی نے چڑی مار سے ایک الو کے دام پوچھے۔ اس نے کہا، آٹھ آنے۔ اسی کے بغل میں ایک اور چھوٹا الو بھی تھا۔ پوچھا، اس کی کیا قیمت ہے؟ کہا، ایک روپیہ۔ تب تو گاہک نے کان کھڑے کیے اور کہا— اتنے بڑے الو کے دام آٹھ آنے اور ذرا سے جانور کا مول ایک روپیہ؟ چڑی مار نے کہا— آپ تو ہیں الو۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ اس بڑے الو میں صرف یہ صفت ہے کہ یہ الو ہے اور اس چھوٹے میں دو صفتیں ہیں، ایک یہ کہ خود الو ہے، دوسرے الو کا پٹھا ہے۔ تو بھائیوں! آپ کا یہ غلام صرف الو نہیں، بلکہ الو کا پٹھا ہے۔

ایک : ہم آج سے اپنے کو الو کی دم فاختہ لکھا کریں گے۔

دوسرا : ہم تو جاہل آدمی ہیں، مگر اب اپنا نام لکھیں گے تو گدھے کا نام بڑھا دیں گے۔ آج سے ہم عاجزی سیکھ گئے۔

خوجی : سنیے، اس الو کے پٹھے نے جو جو کام کیا، کوئی کرے تو جانے، اس کی ٹانگ کی

راہ نکل جائے۔ پہاڑوں کو ہم سے کاٹا اور بڑے بڑے پتھر اٹھا کر دشمن پر پھینکے۔ ایک دن 44 من کا ایک پتھر کا ایک ہاتھ سے اٹھا کر روسیوں پر مارا تو دو لاکھ پچیس ہزار سات سو انسٹھ آدمی کچل کے مرے گئے۔

ایک : افوہ! ان دبلے ہاتھ پاؤں پر یہ طاقت!

خوجی : کیا کہا؟ دبلے پتلے ہاتھ پاؤں! یہ ہاتھ پاؤں دبلے پتلے نہیں۔ مگر بدن چور ہیں۔ دیکھنے میں تو معلوم ہوتا ہے کہ مارا ہوا آدمی ہے، مگر کپڑے اتارے اور دیو معلوم ہونے لگا۔ اسی طرح میرے قد کا حال ہے۔ گنوار آدمی دیکھے تو کہے کہ بونا ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا قد کتنا اونچا ہے۔ روم میں جب دو ایک گنواروں نے مجھے بونا کہا، تو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ یہ خدا کی دین ہے کہ ہوں تو میں اتنا اونچا، مگر کوئی گل ٹیگ کی کھونٹی کہتا ہے، کوئی بونا بناتا ہے۔ ہوں تو شریف زادہ، مگر دیکھنے والے کہتے ہیں کہ یہ کوئی پاجی ہے۔ عقل اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ اگر افلاطون زندہ ہوتا، تو شاگردی کرتا۔ مگر جو دیکھتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ گدھا ہے۔ یہ درجہ افیم کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ اگر کوئی آدمی میرے سر کو جوتوں سے پیٹے، تو اف نہ کروں۔ اگر کسی نے کہا کہ خواجہ گدھا ہے، تو ہنس کر جواب دیا کہ میں ہی نہیں، میرے باپ اور میرے دادا بھی ایسے ہی تھے۔

ایک : دنیا میں ایسے ایسے اولیا پڑے ہوئے ہیں۔

خوجی : مگر اس عاجزی کے ساتھ دلیر بھی ایسا ہوں کہ کسی نے بات کہی اور میں نے چانٹا جڑا۔ مصر کے نامی پہلوان کو مارا۔ یہ بات کسی اپنچی میں نہیں دیکھی۔ میرے والد بھی تولوں افیم پیتے تھے اور دن بھر دکانوں پر چلمیں بھرا کرتے تھے۔ مگر یہ بات ان میں بھی نہ تھی۔

لوگ : آپ نے اپنے باپ کا نام روشن کر دیا۔

خوجی : اب میں آپ لوگوں سے چنڈو کی صفت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بغیرے چنڈو پیے آدمی میں انسانیت آ نہیں سکتی۔ آپ لوگ شاید اس کی دلیل چاہتے ہوں گے۔ سنیے— بغیر لیٹے ہوئے کوئی چنڈو پی نہیں سکتا اور لیٹنا اپنے کو خاک ملانا ہے۔ بابا سعدی نے کہا ہے۔

خاک شو پیش ازاں کہ خاک شبیں

(مرنے سے پہلے خاک ہو جائیں)۔

چنڈو کی دوسری صفت یہ ہے کہ ہر دم لو لگی رہتی ہے۔ اس سے آدمی کا دل روشن ہو جاتا ہے۔ تیسری صفت یہ ہے کہ پینک میں فکر قریب نہیں آنے پاتی۔ چسکی لگائی اور غوطے میں آئے۔ چوتھی صفت یہ ہے کہ افیمچی کو رات بھر نیند نہیں آتی۔ اور یہ بات پہنچے ہوئے فقیر ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ پانچویں صفت یہ ہے کہ افیمچی تڑکے ہی اٹھ بیٹھتا ہے۔ سویرا ہوا اور آگ لینے دوڑے۔ اور زمانہ جانتا ہے کہ سویرے اٹھنے سے بیماری نہیں آتی۔

اس پر ایک پرانے خرانٹ افیمچی نے کہا— حضرت، یہاں مجھے ایک شک ہے۔ جو لوگ چین گئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ وہاں تیس برس سے زیادہ عمر کا آدمی ہی نہیں۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ افیمیوں کی عمر کم ہوتی ہے۔

خوجی : یہ آپ سے کس نے کہا؟ چین والے کسی کو اپنے ملک میں نہیں جانے دیتے۔ اصل بات یہ ہے کہ چین میں تیس برس کے بعد لڑکا پیدا ہوا ہے۔

لوگ : کیا، تیس برس کے بعد لڑکا پیدا ہوتا ہے! اس کا تو یقین نہیں آتا۔

ایک : ہاں، ہاں، ہوگا۔ اس میں یقین نہ آنے کی کون بات ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب عورت تیس برس کی ہو جاتی ہے، تب کہیں لڑکا پیدا ہوتا ہے۔

خوجی : نہیں نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لڑکا تیس برس تک حمل میں رہتا ہے۔

لوگ : بالکل جھوٹ! خدا کی مار اس جھوٹ پر۔

خوجی : کیا کہا؟ یہ آواز کدھر سے آئی؟ ارے، یہ کون بولا تھا؟ یہ کس نے کہا کہ جھوٹ ہے؟

ایک : حضور، اس کونے سے آواز آئی۔

دوسرا : حضور، یہ غلط کہتے ہیں۔ انھی کی طرف سے آواز آئی تھی۔

خوجی : ان بدمعاشوں کو قتل کر ڈالو۔ آگ لگا دو۔ ہم، اور جھوٹ! مگر نہیں، ہمیں چوکے۔ مجھے اتنا غصہ نہ چاہیے۔ اچھا صاحب، ہم جھوٹے، ہم گپی، بلکہ ہمارے باپ بے ایمان، جال ساز اور زمانے بھر کے دغاباز۔ آپ لوگ بتلائیں، میری کیا عمر ہوگی؟

ایک : آپ کوئی پچاس کے پیٹ میں ہوں گے۔

دوسرا : نہیں نہیں، آپ ستر کے ہوں گے۔

خوجی : ایک ہوئی، یاد رکھیے حضرت۔ ہمارا سن نہ پچاس کا نہ ساٹھ کا۔ ہم دو اوپر سو برس کے ہیں۔ جس کو یقین نہ آئے وہ کافر۔

لوگ : افوہ، دو اوپر سو کا سن ہے۔!

خوجی : جی ہاں، دو اوپر سو برس کا سن ہے۔

ایک : اگر یہ سہی ہے تو یہ اعتراض اٹھ گیا کہ افیمیوں کی عمر کم ہوتی۔ اب اگر کوئی افیم نہ پیے، تو بدنصیب ہے۔

خوجی : دو اوپر سو برس کا سن ہوا اور اب تک وہی خم دم۔ کہو، ہزار سے لڑیں، کہو، لاکھ سے۔ اچھا اب آپ لوگ بھی اپنے اپنے تجربے بیان کریں۔ میری تو بہت سن چکے، اب کچھ اپنی بھی کہیے۔

اس پر گٹو نام کا ایک افیمچی اٹھ کر بولا— بھائی پنچو، میں کلوار ہوں۔ مول شراب ہمارے یہاں نہیں بکتی۔ ہم جب لڑکے سے تھے، تب سے ہم افیم پیتے ہیں۔ ایک بار ہولی کے دن ہم گھر سے نکلے۔ اے بس، ایک جگہ پچاس ہوں، پینتالیس ہوں، اتنے آدمی کھڑے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں لوٹا، کسی کے ہاتھ میں پچکاری۔ ہم ادھر سے جو چلے، تو ایک آدمی نے پیچھے سے جوتا دیا، تو کھوپڑی بھنا گئی۔ اگر چاہتا تو ان سب کو ڈپٹ لیتا مگر چپ ہو رہا۔

خوجی : شاباش ہم تم سے بہت خوش ہوئے گٹو۔

گٹو : حضور کی دعا سے یہ سب ہے۔

اس کے بعد نور خاں نام کا ایک افیمچی اٹھا۔ کہا— پنچو! ہم ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ ہم نے کئی سال سے افیم، چنڈو پینا شروع کیا ہے۔ ایک دن ہم ایک چنے کے کھیت میں بیٹھے بوٹ کھا رہے تھے۔ کسان تھا دل لگی باز۔ آیا اور میرا ہاتھ ہاتھ پکڑ کر کانی حوض لے چلا۔ میں کان دبائے ہوئے اس کے ساتھ چلا آیا۔

اس کے بعد کئی افیمچیوں نے اپنے اپنے حال بیان کیے۔ آخر میں ایک بوڑھے جوغادری افیمی نے کھڑے ہو کر کہا— بھائیوں۔ آج تک افیمیوں میں سے کسی نے ایسا کام نہیں کیا تھا۔ اس لیے ہمار فرض ہے کہ ہم اپنے سردار کو کوئی خطاب دیں۔ اس پر سب لوگوں نے مل کا تالیاں بجائیں اور خوجی کو گیدی کا خطاب دیا۔ خوجی نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور مجلس برخواست ہوئی۔

آج بڑی بیگم کا مکان پرستان بنا ہوا ہے۔ جدھر دیکھیے، سجاوٹ کی بہار ہے۔ بیگمیں دھما چوکڑی مچا رہی ہیں۔

جانی : دلہا کے یہاں تو آج میراسنوں کی دھوم ہے۔ کہاں تو میاں آزاد کو ناچ گانے سے اتنی چڑھ تھی کہ مجال کیا، کوئی ڈومنی گھر کے اندر قدم رکھنے پائے۔ اور آج سنتی ہوں کہ طبلے پر تھاپ پڑ رہی ہے اور غزلیں، ٹھمریاں، ٹپے گائے جاتے ہیں۔

نازک : سنا ہے، آج ثریا بیگم بھی آنے والی ہیں۔

بہار : اس مال زادی کا ہمارے سامنے ذکر نہ کیا کرو۔

نازک : (دانتوں تلے انگلی دبا کر) ایسا نہ کہو، بہن۔

جانی : ایسی پاک دامن عورت ہے کہ اس کا سا ہونا مشکل ہے۔

نازک : یہ لوگ خدا جانے، کیا سمجھتے ہیں ثریا بیگم کو۔

بہار : اے ہے! سچ کہنا، ستر چوہے کھاکے بلی حج کو چلی۔

اتنے میں ایک پالکی سے ایک بیگم صاحب اتریں۔ جانی بیگم نازک ادا میں اشارے ہونے لگے۔ یہ ثریا بیگم تھیں۔

ثریا : ہم نے کہا، چل کے ذری دلہن کو دیکھ آئیں۔

روح افزا : اچھی طرح آرام سے بیٹھیے۔

ثریا : میں بہت اچھی بیٹھی ہوں۔ تکلف کیا ہے۔

نازک : یہاں تو آپ کو ہمارے اور جانی بیگ کے سوا کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔

ثریا : میں تو ایک بار حسن آرا سے مل چکی ہوں۔

سپہر آرا : اور ہم سے بھی؟

ثریا : ہاں، تم سے بھی ملے تھے، مگر بتائیں گے نہیں۔

سپہر آرا : کب ملے تھے اللہ! کس مکان میں تھے؟

ثریا : اجی، میں مزاق کرتی تھی۔ حسن آرا بیگم کو دیکھ کر دل شاد ہو گیا۔

نازک : کیا ہم سے زیادہ خوبصورت ہیں؟

ثریا : تمھارا تو دنیا کے پردے پر جواب نہیں ہیں۔
نازک : بھلا دلہا سے آپ سے بات چیت ہوئی تھی؟
ثریا : بات چیت آپ سے ہوئی ہوگی۔ میں نے تو ایک دفعہ راہ میں دیکھا تھا۔
نازک : بھلا دوسرا نکاح بھی منظور کرتے ہیں وہ۔
ثریا : یہ تو ان سے کوئی جا کے پوچھے۔
نازک : تمھیں پوچھ لو بہن، خدا کے واسطے۔
ثریا : اگر منظور ہو دوسرا نکاح، تو پھر کیا؟
نازک : پھر کیا، تم کو اس سے کیا مطلب؟
روح افزا : آخر دوسرے سے نکاح کے لیے کیسے تذبذب ہے؟
نازک : ہم خود اپنا پیغام کریں گے۔
روح افزا : بس، حد ہو گئی نازک ادا بہن! افوہ ہو۔
نازک : (آہستہ سے) ثریا بیگم، تم نے غلطی کی۔ دھیرج نہ رکھ سکیں۔
ثریا :

ہم جان فدا کرتے، گر وعدہ وفا ہوتا،
مرنا ہی مقدر تھا، وہ آتے تو کیا ہوتا!

نازک ہاں، ہے تو یہی بات۔ خیر، جو ہوا، اچھا ہی ہوا، مصلحت بھی یہی تھی۔
حسن آرا نے یہ شعر سنا اور نازک بیگم کی باتوں کو تولا، تو سمجھ گئیں کہ ہو نہ ہو، ثریا بیگم یہی ہیں۔ کنکھیوں سے دیکھا اور گردن پھیر کر اشارے سے سپہرآرا کو بلا کر کہا— ان کو پہچانا؟ سوچو تو، یہ کون ہیں؟
سپہرآرا : اے باجی، تم تو پہیلیاں بجھواتی ہو۔
حسن آرا : تم ایسی طبیعت دار، اور اب تک نہ سمجھ سکیں؟
سپہرآرا : تو کوئی اڑتی چڑیا تو نہیں پکڑ سکتا۔
حسن آرا : اس شعر پر غور کرو۔
سپہرآرا : اخواہ، (ثریا بیگم کی طرف دیکھ کر) اب سمجھ گئی۔
حسن آرا : ہے عورت حسین۔

سپہر آرا: ہاں ہے، مگر تم سے کیا مقابلہ۔

حسن آرا: سچ کہنا، کتنی جلد سمجھ گئی ہوں۔

سپہر آرا: اس میں کیا شک ہے، مگر یہ تم سے کب ملیں تھیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا۔

حسن آرا: خدا جانے۔ اللہ رکھی بن کے آنے نہ پاتی، جوگن کے بھیس میں کوئی پھٹکنے نہ دیتا۔ شبو جان کا یہاں کیا کام؟

سپہر آرا: شاید مہری وہری بن کے گزر ہوا ہو۔

حسن آرا: سچ تو یہ ہے کہ ہم کو ان کا آنا بہت کھٹکتا ہے۔ انھیں تو یہ چاہیے تھا کہ جہاں آزاد کا نام سنتیں، وہاں سے ہٹ جاتیں، نہ کہ ایسی جگہ آنا۔

سپہر آرا: ان سے یہاں تک آیا کیونکر گیا؟

حسن آرا: ایسا نہ ہو کہ یہاں کوئی گل کھلے۔

سپہر آرا نے جاکر بہار بیگم سے کہا— جو بیگم ابھی آئی ہیں، ان کو تم نے پہچانا؟ ثریا بیگم یہی ہیں۔ تب تو بہار بیگم کے کان کھڑے ہوئے۔ غور سے دیکھ کر بولیں۔ ماشا اللہ! کتنی حسین عورت ہے! ایسی نمکین بھی کم دیکھنے میں آئی۔

سپہر آرا: باجی کو خوف ہے کہ کوئی گل نہ کھلائیں۔

بہار: گل کیا کھلائیں گی۔ اب تو ان کا نکاح ہو گیا۔

سپہر آرا: اے ہے، باجی! نکاح پر نہ جانا۔ یہ وہ کھلاڑ ہے کہ گھونگھٹ کے آڑ میں شکار کھیلیں۔

بہار: اے نہیں، کیوں بے چاری کو بدنام کرتی ہو۔

سپہر آرا: واہ! بدنامی کی ایک ہی کہی۔ کوئی پیشہ، کوئی کرم ان سے چھوٹا؟ لگاوٹ بازی میں ان کی دھوم ہے۔

بہار: ہم جب اس ڈھب پر آنے بھی دیں۔

ادھر نازک ادا بیگم نے باتوں باتوں میں ثریا بیگم سے پوچھا— بہن، یہ بات اب تک نہ کھلی کہ تم پادری کے یہاں سے کیوں نکل آئی۔ ثریا بیگم نے کہا— بہن، اس ذکر سے رنج ہوتا ہے۔ جو ہوا، وہ ہوا، اب اس کا گھڑی گھڑی ذکر کرنا فضول ہے۔ لیکن جب نازک ادا بیگم نے بہت ضد کی تو انھوں نے کہا— بات یہ ہوئی کہ بے چارے پادری نے مجھ پر ترس

کھا کر اپنے گھر میں رکھا اور اس طرح کوئی خاص اپنی بیٹیوں سے پیش آتا ہے، اسی طرح مجھ سے پیش آتے۔ مجھے پڑھایا لکھایا، مجھ سے روز کہتے کہ تم عیسائی ہو جاؤ، لیکن میں ہنس کے ٹال دیا کرتی تھی۔ ایک دن پادری صاحب تو چلے گئے تھے کسی کام کو، ان کا بھتیجا، جو فوج میں نوکر ہے، ان سے ملنے آیا۔ پوچھا— کہاں گئے ہیں؟ میں نے کہا— کہیں باہر گئے ہیں۔ اتنا سننا تھا کہ وہ گاڑی سے اتر آیا اور اپنی جیب سے بوتل نکال کر شراب پی۔ جب نشہ ہوا تو مجھے سے کہنے لگا، تم بھی پیو۔ اس نے سمجھا میں راضی ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں اس سے اپنا ہاتھ چھڑانے لگی۔ مگر وہ مرد، میں عورت! پھر فوجی جوان، کچھ کرتے دھرتے نہیں بنتی تھی۔ آخر بولی— صاحب، تم فوج کے جوان ہو۔ میں بھلا تم سے کیا جیت پاؤں گی؟ میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ اس پر ہنس کر بولا— ہم بنا پلائے نہ مانیں گے۔ میرا تو خون سوکھ گیا۔ اب کروں تو کیا کروں۔ اگر کسی کو پکارتی ہوں، تو یہ اس وقت مار ہی ڈالے گا۔ اور بے عزت کرنے پر تو تلا ہی ہوا ہے۔ چاہا کہ جھپٹ کے نکل جاؤں، پر اس نے مجھے گود میں اٹھا لیا اور بولا— ہم سے شادی کیوں نہیں کر لیتی؟ میرا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا کہ یا خدا، آج کیسے عزت بچے گی، اور کیا ہوگا۔ مگر آبرو کا بچانے والا اللہ ہے۔ اسی وقت پادری صاحب آپہنچے۔ بس، اپنا سا منھ لے کر رہ گیا۔ چپکے سے کھسک گیا۔ پادری صاحب اس کو تو کیا کہتے۔ جب برابر کا لڑکا یا بھتیجا کماتا دھماتا ہو، تو بڑا بوڑھا اس کا لحاظ کرتا ہی ہے۔ جب وہ بھاگ گیا، تو میرے پاس آکر بولا— مس پالین، اب تم یہاں نہیں رہ سکتیں۔

میں : پادری صاحب، اس میں میرا ذرا قصور نہیں۔

پادری : میں نے خود دیکھا کہ تم اور وہ ہاتھا پائی کرتے تھے۔

میں : وہ مجھے زبردستی شراب پلانا چاہتے تھے۔

پادری : اجی، میں خوب جانتا ہوں۔ میں تم کو بہت نیک سمجھتا تھا۔

میں : پوری بات تو سن لیجیے۔

پادری : اب تم میری آنکھوں سے گر گئی۔ بس، اب تمھارا نباہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ کل تک تم اپنا بندوبست کر لو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تمھارے یہ ڈھنگ ہیں۔

اسی دن رات کو میں وہاں سے بھاگی۔

ادھر بڑی بیگم صاحب کا انتظام کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ بات بات پر کہتی جاتی تھیں

کہ اللہ! آج تو بہت تھکی۔ اب میرا سن تھوڑا ہے کہ اتنے چکر لگاؤں۔ استانی جی ہاں میں ہاں ملاتی جاتیں تھیں۔

بڑی بیگم : استانی جی، اللہ گواہ ہے، آج بہت شل ہوگئی۔

استانی : ارے تو حضور دوڑتی بھی کتنی ہیں! ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔

مہری : دوسرا ہو تو بیٹھ جائے۔

استانی : اس سن میں اتنی دوڑ دھوپ مشکل ہے۔

مہری : ایسا نہ ہو، دشمنوں کی طبیعت خراب ہو جائے۔ آخر ہم لوگ کس لیے ہیں؟

بڑی بیگم : ابھی دو تین دن تو نہ بولو، پھر دیکھا جائے گا۔ اس کے بعد کرنا ہی کیا ہے؟

استانی : یہ کیوں؟ خدا سلامت رکھے، پوتے پوتیاں نہ ہوں گے؟

بڑی بیگم : بہن، زندگانی کا کون ٹھکانہ ہے۔

اب برات کا حال سنیے۔ کوئی پہر رات گئے دھوم دھام سے برات روانہ ہوئی۔ سب کے آگے نشان کا ہاتھی جھومتا ہوا جاتا تھا۔ ہاتھی کے سامنے قدم قدم پر انار چھوٹتے تھے۔ مہتاب کی روشنی سے چاند کا رنگ فق تھا۔ چرخی کی آن بان سے آسمان کا کلیجہ شق تھا۔ تماشائیوں کی بھیڑ سے دونوں طرف کے کمرے پھٹے پڑتے تھے۔ جس وقت گوروں کا باجا چوک میں پہنچا اور انھوں نے بینڈ بجایا تو لوگ سمجھے کہ آسمان کے فرشتے باجا بجاتے اتر آئے ہیں۔

اتنے میں میاں خوجی اِدھر اُدھر پھدکتے ہوئے آئے۔

خوجی : او شہنائی والو! منھ نہ پھیلاؤ بہت۔

لوگ : آیئے، آیئے، بس آپ ہی کی کسر تھی۔

خوجی : ارے، ہم کیا کہتے ہیں؟ منھ نہ پھیلاؤ بہت۔

لوگ : کوئی آپ کی سنتا ہی نہیں۔

خوجی : یہ تو نوسیکھیے ہیں۔ میری باتیں کیا سمجھیں گے۔

لوگ : ان سے کچھ فرمائش کیجیے۔

خوجی : اچھا، واللہ! وہ سماں باندھوں کہ دنگ ہو جایئے! یہ چیز چھیڑنا بھائی۔

کریجوا میں درد اٹھی

کاسے کہوں نندی مورے رام
سوتی تھی میں اپنے مندل میں
اچانک چونک پڑی مورے رام
(کریجوا میں درد اٹھی)

لوگ : سبحان اللہ! آپ اس فن کے استاد ہیں۔ مگر شہنائی والے اب تک آپ کا حکم نہیں مانتے۔

خوجی : نہیں بھئی، حکم تو مانیں دوڑتے ہوئے اور نہ مانیں تو میں نکال دوں۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اناڑی ہیں۔ بس، ذرا مجھے آنے میں دیر ہوئی اور سارا کام بگڑ گیا۔

اتنے میں ایک دوسرے آدمی نے خوجی کے نزدیک جا کر ذرا کندھے کا اشارہ کیا تو خوجی لڑکھڑائے اور ان کے چیلے افیمی بھائیوں نے بگاڑنا شروع کیا۔

ایک : ارے میاں! کیا آنکھوں کے اندھے ہو؟

دوسرا : اینٹ کی عینک لگاؤ میاں۔

تیسرا : اور خواجہ صاحب بھی دھکا دیتے تو کیسی ہوتی؟

چوتھا : منھ کے بل گرے ہوتے اور کیا۔

پانچواں : اجی، یوں کہو کہ ناک سلپٹ ہو جاتی۔

خوجی : ارے بھائی، اب اس سے کیا واسطہ۔ ہم کسی سے لڑتے جھگڑتے تھوڑے ہی ہیں۔ مگر ہاں، اگر کوئی گیدی ہم سے بولے تو اتنی کرولیاں بھونکی ہوں کہ یاد کرے۔

جب برات دلہن کے گھر پہنچی تو دولہے کو دروازے کے سامنے لائے اور دلہن کا نہایا ہوا پانی گھوڑے کے سموں سے نیچے ڈالا۔ اس کے بعد گھی اور شکر ملا کر گھوڑے کے پاؤں میں لگایا۔ دولہا محل میں آیا۔ دولہا کی بہنیں اس پر دوپٹے کا آنچل ڈالے ہوئے تھیں۔ دلہن کی طرف سے عورتیں بیڑا ہر قدم پر ڈالتی جاتی تھیں۔ اس طرح دولہا مڑوے کے نیچے پہنچا۔ اسی وقت ایک عورت اٹھی اور رومال سے آنکھیں پوچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔ یہ ثریا بیگم تھیں۔

آزاد مڑوے کے نیچے اس چوکی پر کھڑے کیے گئے جس پر دلہن نہائی تھی۔ میراثنوں نے دلہن کے ابٹن کا، جو مانجھے کے دن سے رکھا ہوا تھا، ایک بھیڑ اور ایک شیر بنایا اور دولہا سے کہا — کہیے، دولہا بھیڑ، دلہن شیر۔

آزاد : اچھا صاحب، ہم شیر، وہ بھیڑ، بس؟

ڈومنی : اے واہ، یہ تو اچھے دولہا آئے۔ آپ بھیڑ، وہ شیر۔

آزاد : صاحب، یوں سہی۔ آپ بھیڑ، وہ شیر۔

ڈومنی : اے حضور، کہیے، یہ شیر، میں بھیڑ۔

آزاد : اچھا صاحب، میں بھیڑ، وہ شیر۔

اس پر خوب قہقہہ پڑا۔ اسی طرح اور بھی کئی رسمیں ادا ہوئیں، اور تب دولہا محفل میں گیا۔ یہاں ناچ گانا ہو رہا تھا۔ ایک نازنین بیچ میں بیٹھی تھی، مزاق ہو رہا تھا۔ ایک نواب صاحب نے یہ فقرہ کسا— بی صاحب، آپ نے غضب کا گلا پایا ہے۔ اس کی تعریف کرنا فضول ہے۔

نازنین : کوئی سمجھدار تعریف کرے تو خیر، عطائی اناڑی نے تعریف کی تو کیا؟

نواب : اے صاحب، ہم تو خود تعریف کرتے ہیں۔

نازنین : تو آپ اپنا شمار بھی سمجھداروں میں کرتے ہیں؟ بتلایئے، یہ بہاگ کا وقت ہے یا دھنا کھری کا۔

نواب : یہ کسی داڑھی بچے سے پوچھو جاکے۔

نازنین : اے لو! جو اس فن کے نکتے سمجھے، وہ ڈاڑھی بچا کہلائے۔ واہ ری عقل، وہ امیر نہیں، گنوار ہے، جو دو باتیں نہ جانتا ہو— گانا اور پکانا۔ آپ کے سے دو ایک گھامڑ رئیس شہر میں اور ہوں تو سارا شہر بس جائے۔

نازنین نے یہ غزل گائی۔

لگا نہ رہنے دے جھگڑے کو یار تو باقی
رکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلوٗ باقی
جو ایک رات بھی سویا وہ گل گلے مل کر
تو بھینی بھینی مہینوں رہی ہے بو باقی
ہمارے پھول اٹھا کے وہ بولا گج دہن
ابھی تلک ہے محبت کی اس میں بو باقی
فنا سب کے لیے مجھ پر کچھ نہیں موقوف

یہ رنج ہے کہ اکیلا رہے گا تو باقی
جو اس زمانے میں رہ جائے آبرو باقی

نواب : ہاں یہ سب سے زیادہ مقدم چیز ہے۔

نازنین : مگر حیاداروں کے لیے۔ بگڑ بازوں کو کیا؟

اس پر اس زور سے قہقہہ پڑا کہ نواب صاحب جھینپ گئے۔

نازنین : اب کچھ اور فرمائیے حضور! چہرے کا رنگ کیوں فق ہو گیا؟

مرزا : آپ سے نواب صاحب بہت ڈرتے ہیں۔

نواب : جی ہاں، حرم زادے سے سبھی ڈرتے ہیں۔

نازنین : اے ہے، جبھی آپ اپنے ابا جان سے اتنا ڈرتے ہیں۔

اس پر پھر قہقہہ پڑا اور نواب صاحب کی زبان بند ہو گئی۔

ادھر دلہن کو سات سہاگنوں نے مل کر اس طرح سنوارا کہ حسن کی آب اور بھی بھڑک اٹھی۔ نکاح کی رسم شروع ہوئی۔ قاضی صاحب اندر آئے اور دو گواہوں کو ساتھ لائے۔ اس کے بعد دلہن سے پوچھا گیا کہ آزاد پاشا کے ساتھ نکاح منظور ہے؟ دلہن نے شرم سے سر جھکا لیا۔

بڑی بیگم : اے بیٹا، کہہ دو۔

روح افزا : حسن آرا، بولو بہن۔ دیر کیوں کرتی ہو؟

نازک : بس، تم ہاں کہہ دو۔

جانی : (آہستہ سے) بجرے پر سیر کر چکیں، ہوا کھا چکیں اور اب اس وقت نخرے بگھارتی ہیں۔

آخر بڑی کوشش کے بعد حسن آرا نے دھیرے سے 'ہوں' کہا۔

بڑی بیگم : لیجیے، دلہن نے ہوں کاری بھری۔

قاضی : ہم نے تو آواز سنی نہیں۔

بڑی بیگم : ہم نے سن لیا، بہت سے گواہ ہیں۔

قاضی صاحب نے باہر آ کر دولہا سے بھی یہ یہی سوال کیا۔

آزاد : جی ہاں، بالکل قبول ہے۔

قاضی صاحب چلے گئے اور محفل میں طوائفوں نے مل کر مبارکباد گائی اس کے بعد ایک پری نے یہ غزل گائی۔

تڑپ رہے ہیں شب انتظار سونے دے
نہ چھیڑ ہم کو دلِ بے قرار سونے دے
قفس میں آنکھ لگی ہے ابھی اسیروں کی
گرج نہ باغ میں ابرِ بہار سونے دے
ابھی تو سوئے ہیں یادِ چمن میں اہل قفس
جگا نہ ان کو نسیم بہار سونے دے
تڑپ رہے ہیں دلِ بے قرار سونے دے

شربت پلائی کے بعد دولہا اور دلہن ایک ہی پلنگ پر بیٹھائے گئے۔ گیتی آرا نے کہا— بہن، جوتی تو چھلاؤ۔

جانی: واہ! یہ تو سمٹی سمٹائی بیٹھی ہیں۔

بہار: آخر حیا بھی تو کوئی چیز ہے!

نازک: ارے، جوتی کندھے پر چھلا دو بہن، واہ!

استانی: اگلے وقتوں میں تو سر پر پڑتی تھیں۔

نازک: اس جوتی کا مزہ کوئی مردوں کے دل سے پوچھے۔

جب دلہن نے ذرا بھی جنبش نہ کی تو بہار بیگم نے دلہن کے داہنے پیر کی جوتی دلہا کے کندھے پر چھلا دی۔

نازک: کہیے، آپ کی ڈولی کے ساتھ چلوں۔

روح افزا: اور جوتیا جھار کے دھروں گا۔

جانی: اور سراہی ہاتھ میں لے چلوں گا۔

آزاد: اے! کیوں نہیں، ضرور کہوں گا۔

نازک: اے واہ! اچھا رنگ لائے۔

جانی: رنڈیوں نے نخرے بہت سیکھے ہیں۔

اس فقرے پر ایسا قہقہہ پڑا کہ میاں آزاد شرما گئے۔ جانی بیگم اکیس پان کا بیڑا لائیں

اور اسے کئی بار آزاد نے منھ تک لا لا کر ہٹانے کے بعد کھلا دیا۔

سپہر آرا سہاگ لائیں اور دولہا کے کان میں کہا— کہو، سونے میں سہاگ، موتیوں میں دھاگہ اور بنے کا جی بنی سے لاگا۔

اس کے بعد آرسی کی رسم ادا ہوئی۔

جانی : بنو، جلدی آنکھ نہ کھولنا۔

نازک : جب تک اپنے منھ سے غلام نہ بنیں۔

حیدری : کہیے، بیوی، میں آپ کا غلام ہوں۔

آزاد : بیوی، میں آپ کا بن داموں غلام ہوں۔

بڑی بیگم : بیٹا، اب تو کہوا لیا، اب آنکھیں کھول دو۔

جانی : ایک ہی بار تو کہا۔

حیدری : اے حضور، خوشامد تو کیجیے۔

آزاد : یہ خوشامد سے نہ مانے گی۔

حیدری : جو کہا ہے، اس کا خیال رہے۔ بیوی کے غلام بنے رہیے گا۔

آخری بڑی مشکلوں سے دلہن نے آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ بے اختیار رونے لگیں۔ لوگ سمجھاتے سمجھاتے عاری ہو گئے، مگر آنسو نہ تھمے۔ تب آزاد نے سر جھکا کر کان میں کہا— یہ کیا کرتی ہو، دل کو مضبوط رکھو۔

روح افزا : بہن، خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ اس کا کون سا موقع ہے؟

بہار : اماں جان، آپ ہی سمجھائیں۔ ناحق اپنے کو ہلکان کرتی ہیں حسن آرا۔

استانی : تر کپڑے سے منھ پوچھو۔

جب حسن آرا کا جی بحال ہوا تو آزاد نے سہاگ پڑے سے مسالہ نکال کر دلہن کی مانگ بھری۔ تب دلہن کو گود میں اٹھا کر سوکھ پال پر بیٹھا دیا۔ وہاں جتنی عورتیں تھیں، سب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڑی بیگم تو پچھاڑے کھانے لگیں۔ جب برات رخصت ہو گئی تو باتیں ہونے لگیں۔

روح افزا : اللہ کرے، آزاد نے جتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں، اتنا ہی آرام بھی پائیں۔

عباسی : اللہ ایسی ہی کرے گا۔

جانی : مگر آزاد کا سا دولہا بھی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔
نازک : لاکھوں کوؤں کا پانی پی چکے ہیں۔
بہار : بڑے خوش مزاج آدمی معلوم ہوتے ہیں۔
جانی : اس وقت حسن آرا کے دل کا کیا حال ہوگا؟
نازک : چوتھی کے دن ہم تاک تاک نشانے لگائیں گے۔
روح افزا : آزاد سے کوئی نہ جیت پائے گا۔
جانی : کون! دیکھ لینا بہن، اگر ہاری نہ بولیں جبھی کہنا۔ وہ اگر تیز ہیں، تو ہم بھی کم نہیں۔

اَنت

پرِیے پاٹھک،شاستر انوسار نائک اور نائکہ کے سنیوگ کے ساتھ ہی کتھا کا انت ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہم بھی اب لیکھنی کو وشرام دیتے ہیں۔ پر کداچت کچھ پاٹھکوں کو یہ جاننے کی اِچھا ہوگی کہ خواجہ صاحب کا کیا حال ہوا اور مِس میڈا اور مِس کلاریسا پر کیا بیتی۔ ان تینوں پاتروں کے سوا ہمارے وچار میں تو اور کوئی ایسا پاتر نہیں ہے جس کے وِشے میں کچھ کہنا باقی رہ گیا ہو۔ اچھا سنیے۔ میاں خوجی مرتے دم تک آزاد کے وفادار دوست بنے رہے۔ افیم کی ڈبیا اور کرولی کی دھن نے کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ مِس میڈا اور مِس کلاریسا نے اردو اور ہندی پڑھی اور دونوں تھیاسوفسٹ ہوگئیں۔ دونوں ہی نے اِستریوں کی سیوا کرنی ہی اپنے جیون کا اُدّیشیہ بنا لیا۔ کلاریسا تو کلکتہ کی طرف چلی گئیں، میڈا بمبئی سے لوٹ کر آزاد سے ملنے آئی تو آزاد نے ہنس کر کہا— اب تو تھیاسوفسٹ ہیں آپ؟

میڈا : جی ہاں، خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس نے ہدایت کی۔

آزاد : تو یہ کہیے کہ اب آپ پر خدا کا نور نازل ہوا۔ اس مذہب میں کون کون عالم شریک ہیں؟

میڈا : افسوس ہے آزاد، کہ تم تھیاسوفی سے بالکل واقف نہیں ہو اس میں بڑے بڑے نامی عالم اور فلاسفر شریک ہیں، جن کے نام کے اس وقت دنیا میں جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ یورپ کے اکثر عالموں کا جھکاؤ اسی طرف ہے۔

آزاد : ہم نے سنا ہے کہ تھیاسوفیس والے روح سے باتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو یہ شوبدے بازی معلوم ہوتی ہے۔

مئیڈا : تم اسے شوبدے بازی سمجھتے ہو؟

آزاد : شوبدا نہیں تو اور کیا ہے، مداریوں کا کھیل؟

مئیڈا : اگر اسی کا نام شوبدا ہے تو نیوٹن اور ہرشیل بھی بڑے شوبدے باز تھے؟

آزاد : واہ، کہاں نیوٹن اور کہاں تھیاسوفی! ہم نے سنا ہے کہ تھیاسوفسٹ لوگ غیب کا حال بتا دیتے ہیں۔ بمبئی میں بیٹھے ہوئے امریکہ والوں سے بنا کسی وسیلے کے باتیں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک صاحب جو تھاسوفسٹوں میں بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں وہ ڈاک سے خط نہ بھیج کر جادو سے بھیجتے ہیں۔ وہ خط لکھ کر میز پر رکھ دیتے ہیں اور جن لوگ اٹھا کر پہنچا دیتے ہیں۔

مئیڈا : تو اس میں تعجب کی کون بات ہے؟ جو لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے وہ دو آدمیوں کے حرفوں سے باتیں کرتے دیکھ کر ضرور دل میں سوچیں گے کہ جادوگر ہیں۔ جس طرح آپ کو تعجب ہوتا ہے کہ میز پر رکھا ہوا خط کیسے پہنچ گیا اسی طرح ان جنگلی آدمیوں کو بھی حیرت ہوتی ہے کہ دو آدمی چپ چاپ کھڑے ہیں نہ بولتے ہیں، نہ چالتے ہیں، اور لکیروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ افریقہ کے حبشیوں سے کہا جائے کہ ایک منٹ میں ہم لاکھوں میل بیٹھے ہوئے آدمیوں کے پاس خبریں بھیج سکتے ہیں تو وہ کبھی نہ مانیں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ تار کے کھٹکانے سے کیسے اتنی دور خبریں پہنچ جاتی ہیں۔ اسی طرح تم لوگ تھیاسوفی کی کرامات کو شوبدا سمجھتے ہو۔

آزاد : تم مِسمرزم کو مانتی ہو؟

مئیڈا : میں سمجھتی ہوں، جسے ذرا بھی سمجھ ہوگی وہ اس سے انکار نہیں کرسکتا۔

آزاد : خدا تم کو سیدھے راستے پر لائے، بس اور کیا کہوں۔

مئیڈا : مجھے تو سیدھے راستے پر لایا۔ اب میری دعا ہے کہ خدا تم کو بھی سیدھے ڈھرے پر لگائے۔

آزاد : آخر اس مذہب میں نئی کون سی بات ہے؟

مئیڈا : سمجھاتے سمجھاتے تھک گئی، مگر تم نے مذہب کہنا نہ چھوڑا۔

آزاد : خطا ہوئی، معاف کرنا، لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ بلا کسی وسیلے کے ایک دوسرے کے دل کا حال کیونکر معلوم ہو سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ میڈم بلے ویٹسکی خطوں کو بغیر کھولے پڑھ لیتی ہیں۔

میڈا : ہاں ہاں، پڑھ لیتی ہیں، ایک نہیں، ہزاروں بار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور خدا نے چاہا تو کچھ دنوں میں میں بھی وہی کر کے دکھا دوں گی۔

آزاد : خدا کرے، وہ دن جلد آئے۔ میں برابر دعا کروں گا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ بیرا نے اندر آکر ایک کارڈ دیا۔ آزد نے کارڈ دیکھ کر بیرا سے کہا— نواب صاحب کو دیوان خانے میں بیٹھاؤ، ہم ابھی آتے ہیں۔

میڈا نے پوچھا— کون نواب صاحب ہیں،

آزاد : مرزا ہمایوں فر کے چھوٹے بھائی ہیں، جن کے ساتھ سپہر آرا کی شادی ہوئی ہے۔

میڈا : تو یوں کہیے کہ آپ کے ساڑھو ہیں۔ تو پھر جائیے۔ میں بھی ان سے ملوں گی۔

آزاد : میں انھیں یہیں لاؤں گا۔

یہ کہتے ہوئے آزاد دیوان خانے کی طرف چلے گئے۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں
مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے
بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ
عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی
وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا
ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلمینٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ
شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔
اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں
مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔
مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔
1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام
زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی
میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی
حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے
ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین
اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن
ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس
کے علاوہ ڈیلی ٹربیون چنڈی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے
1982 میں سبکدوش ہوئے۔

ISBN 81-7587-009-5